تاریخ شیعیانِ علیؑ

مؤلفہ علی حسین رضوی

تاریخ شیعیانِ علیؑ
مؤلفہ علی حسین رضوی
تاریخ شیعیانِ علیؑ

تاریخ
شیعیانِ
علیؑ

ایک تحقیقی دستاویز

تاریخ
شیعیانِ علیؑ

مؤلفہ

علی حُسین رضوی

مطبوعہ

امامیہ اکیڈمی کراچی

تاریخ شیعیانِ علیؑ

اشاعت اوّل	:	۱۹۹۲ء
اشاعت چہارم	:	۲۰۰۶ء
کمپوزنگ	:	سید گرافکس
پرنٹنگ با اہتمام	:	سید اینڈ سید (پبلشرز) کراچی
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	280 روپے

سول ایجنٹ

محفوظ بک ایجنسی

مارٹن روڈ کراچی

انتساب

دور ابتلاء کے لامتناہی تسلسل میں پروان چڑھنے والی قوم کی تاریخ لکھنا کچھ آسان نہ تھا مگر توفیقات الہٰی کے سہارے نوحہ گروں کی مستند داستان پیش کر رہا ہوں، معترف ہوں کہ حق ادا نہیں ہوا اس لئے معنون کرتا ہوں:۔

ان ارباب حل و عقد کے نام

جو تشنہ رہ جانے والے گوشوں کا مواد فراہم کر سکیں

ان نوجوان قارئین کے نام

جو میرے بعد اپنی تاریخ کا ترمیم شدہ ایڈیشن شائع کر سکیں

مولف

نقش اول

"ہمارے عقائد: ہماری تاریخ" کا آخری باب حضرت حجتؑ کی غیبت پر بند ہو گیا تھا لیکن محبان علی کا دور ابتلاء بدستور کھلا رہا۔ بنی امیہ کے بعد بنی عباس کے نصف سے زائد عہد تک شیعہ اسی حالت میں رہے پھر انحطاطی عہود میں ان کو قدرے اطمینان کی سانس لینے کا موقع ملا اس کے بعد غزنوی، سلجوقی، ایوبی اور ترکان عثمانی کی سنگلاخ زمینوں پر مجبور شیعوں کے کارواں گزرنے لگے اور زمانے کا ستم آفریں سلسلہ صحرائے نجد سے جا کر مل گیا۔

بنی عباس نے جب بنی امیہ کی نسلوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالا تھا خلفاء کی قبروں کو کھود کر ہڈیاں تک باہر نکال پھینکی تھیں تب بھی ہم نے اسے درندگی قرار دیا تھا پھر جب وہ بنی امیہ کے عملی جانشین بن گئے تب بھی ہم انہیں برا کہتے رہے اور جب نجدیوں نے اکابر ملت کی قبریں زمین کے برابر کر دیں تب بھی ہم نے ان کے خلاف آوازیں بلند کیں ۔ یہ فلسفہ کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ ظالم بھی مقدس اور مظلوم بھی مقدس ۔ اس کا شاید بڑا سبب یہی ہے کہ ہم مظلوم کے ماننے والے ہیں اور ہر زمانے میں خود بھی نشانہ ستم بنتے رہے ہیں ۔

عجیب اتفاق ہے کہ جب کبھی ہم نے کسی مسلم حکومت کے استقرار پر شادیانے بجائے تو اسی حکومت نے ہم سے اپنوں کی صف ماتم بچھوا دی، ایسا ہی کچھ ہندوستان میں بھی مغل سلطنت کے بیشتر ادوار میں پیش آیا اور اورنگزیب عالمگیر نے تو منصور کی یاد تازہ کر دی ۔

ماضی بعید میں اگر سادات کے خون کا گارا بنایا جاتا تھا تو اس کا ایک سبب تھا کہ غاصب حکومت اصل حقدار کو ختم کئے بغیر اپنے کو محفوظ تصور نہ کرتے لیکن اس کے بعد آل رسول کے ماننے والوں سے دشمنی کیوں؟ اور یہ دشمنی ثبوت کی محتاج نہیں۔ بعض سنی مورخین نے خود لکھا ہے کہ فلاں فلاں بادشاہ کو شیعوں سے سخت نفرت تھی۔ جو اللہ کو نہیں مانتا، جو رسولؐ کو نہیں مانتا، جو اسلام کو نہیں مانتا، اس سے کوئی عناد نہیں مگر شیعہ گردن زدنی ہیں کیونکہ وہ امام منصوص من اللہ کا عقیدہ رکھتے ہیں، انسان ساز خلافت کے قائل نہیں اس لئے ان سے ہر زمانے میں بحیثیت شیعہ زندہ رہنے کا حق چھین لیا گیا۔

نسلوں پر نسلیں گزرتی چلی گئیں، تقیہ میں رہنے والا اپنے بڑے بیٹے کو بھی بتا نہ سکا کہ اس کا عقیدہ کیا ہے؟ شیعہ خاندان کے خاندان جادہ سادات سے ہٹ کر مسلک شاہی پر چلنے لگے۔ قبیلے کے قبیلے ترک وطن کر گئے اور جو زد پر آگیا وہ تلوار کے گھاٹ اتر گیا۔ ان حالات کے باوجود عالم اسلام میں شیعوں کی آبادی کا تناسب ایک پانچ ہے اس کے اسباب و عوامل تحیر خیز ہیں۔

ارباب علم سے جب کبھی استفسار کیا گیا تو کسی نے صوفیاء کو بتادیا، کسی نے علماء کا حوالہ دیدیا، کسی نے بعض حکومتوں کے نام لے لئے لیکن صوفی عموماً نہ سنی ہوتے تھے، نہ شیعہ، وہ تو صرف نعرہ اہل بیت لگاتے تھے لہٰذا اس حد تک ان کی خدمات کا اعتراف ہے۔ رہ گئے علماء تو سب سے پہلے زبانیں انہیں کی قطع ہوتیں، دار پر وہی چڑھائے جاتے، ان کے لئے کھلی تبلیغ کے مواقع کم تھے البتہ انہوں نے نہایت خاموشی سے ذخیرہ روایات اور افکار آل محمدؐ کا اتنا مواد یکجا کر دیا ہے کہ وہ نہ ہوتا تو ہمیں اپنے دعوے ہی کے دلائل نہ ملتے۔

چھوٹی بڑی حکومتوں اور شخصیات کی حد تک ہمارے لئے بڑی دشواری یہ آپڑی کہ بعض قدیم تاریخوں میں تو کچھ ملتا ہے کہ کس علاقے کا حکمراں شیعہ تھا لیکن

وہ تاریخیں کہاں ہیں؟ بہت پڑھے لکھے لوگ نام تو بتا سکتے ہیں، تاریخیں نہیں دکھا سکتے پھر وہ عربی میں ہیں اور پچھلی کئی صدیوں سے تو جو تاریخی کام کیا گیا ہے اس میں ہمارا کوئی ذکر نہیں ہے اور شخصیات میں سے تو ہم کسی کو شیعہ کہہ ہی نہیں سکتے کیونکہ وہ سب کے سب تقیہ میں زندگیاں گزارتے چلے گئے۔

اور فی زمانہ تو یہ ستم ڈھایا جارہا ہے کہ جن کتابوں سے ہمارا تعلق نہیں ہے ان میں بھی اہل بیت کے حق میں اگر کوئی روایت ہے تو وہ نئے ایڈیشنوں میں نکالی جارہی ہے اور کہا یہ جارہا ہے کہ الحاقی ہے، شیعوں نے شامل کرادی، کتاب کس زمانے میں لکھی گئی، اور اس زمانے میں شیعوں کی کیا حالت تھی، وہ کہیں تھے بھی یا نہیں؟ اس بارے میں کوئی کچھ نہیں سوچتا مگر یہ کام ہمارے علمائے کرام کا ہے وہ کوئی راستہ نکالیں گے کہ اس حربے کا دفاع کیونکر کیا جائے؟

دوسرا عام انداز یہ ہے کہ شیعہ مشاہیر کو سنی بتایا جارہا ہے، بیرم خان سنی تھا، ٹیپو سلطان سنی تھا، غالب سنی تھا، یہ بات ہے تاریخ کی اور اسی کے لئے زیر نظر کتاب لکھی گئی ہے۔

بڑا مشکل کام تھا ان اسباب و عوامل کو یکجا کرنا جو ہماری بقاء کی ضمانت بنے اور اس سے زائد مشکل تھا تاریخ کے انسانی جنگل سے محبان علیؑ کو چھانٹ نکالنا جو تقیہ میں برسرعمل رہے پھر بھی توفیقات الہٰی کے سہارے ہزاروں منتشر صفحات کا نچوڑ چند سو صفحات میں سمو کر پیش کر رہا ہوں جس کی حیثیت نقش اول کی ہے مگر اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ اپنے بیشتر تاریخی کردار روشنی میں آجائیں گے اور واضح ہو جائے گا کہ کون محب اہل بیت تھا اور کون دشمن علیؑ؟

بلاشبہ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ ہم میں سے کوئی اقتدار کے لئے خروج نہیں کرے گا تو آپ کے جانشینان برحق میں سے کسی نے اس مقصد کے لئے تلوار نہیں اٹھائی لیکن کربلا میں امام حسینؑ نے ایک راستہ یہ بھی دکھایا تھا کہ مجبور بن کر سروں کو کٹوا دینا ہی شیوہ مردانگی نہیں ہے بلکہ حق کی خاطر ناطاقتی کا احساس کئے

بغیر قلم کے پہاڑوں سے ٹکرا جانا بھی عین شجاعت ہے۔ اس نظیر سے وقت کے مادی تقاضوں کے تحت بعض طالع آزماؤں نے فائدہ اٹھایا اور ظلم کے استیصال کے لئے میدانوں میں نکل پڑے۔ یقیناً ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے مگر حضرت مختار ثقفی نے ہمارے مقاصد کو پورا کیا ہے لہذا آج بھی ہمارا سر عقیدت سے ان کے ذکر پر جھک جاتا ہے۔ آگے چل کر بعض اقبال مند لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لئے ابھر کر سامنے آئے اور انہوں نے لوح تاریخ پر:

لہو کی دھار سے عنواں لکھا فسانے کا
ہوائے تیغ سے الٹا ورق زمانے کا

علماء و فقہاء اور صوفیائے کرام مجموعی حیثیت سے شیعیت کو سربلند کرتے رہے ہیں، ہمارے منارہ ہائے ہدایت نے کرامات و معجزات سے ذہنوں کو منقلب کیا ہے، نجف و کربلا و مشہد کے گنبدوں سے طلوع ہونے والا نور آج بھی جلا بخش قلوب ہے اور مجلسیں اور جلوس ہائے عزاء تو حشر تک ہمارا نشان عظمت ہیں لہذا ان سب کو دامن کتاب میں جگہ دی گئی ہے پھر بھی بہت کچھ باقی ہے، کتاب کی تنگ دامانی نے جس کی اجازت نہیں دی۔

پھر یہ خیال بھی پیش نظر ہے کہ قارئین کرام مطالعہ کے لئے کتنا وقت نکال سکیں گے لہذا کم سے کم پر اکتفاء کی گئی ہے، خدا کرے، یہ حقیر کاوش قلم مقاصد تحریر کو پورا کر سکے۔

مولف

ترتیب کتاب

شیعیت اور بساط اسلام

شیعیت کی اساس

اسلام میں گروہ بندی

اسلام کے مسالک فقہ

آغاز تاریخ

پیغمبری یا فرمانروائی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شیعیت اور بساط اسلام

علامہ سیوطی تفسیر در منثور میں ابن عساکر جابر ابن عبداللہ سے روایت کرتے ہیں۔

"ہم رسالت مآب کی خدمت میں حاضر تھے کہ سامنے سے علیؑ نمودار ہوئے۔ پیغمبرؐ نے علی کو دیکھ کر فرمایا: قسم ہے اس پاک پروردگار کی جو میری جان کا مالک ہے کہ قیامت میں یہ اور ان کے شیعہ ہی کامیاب رہیں گے۔"

علامہ ابن حسن نجفی نے صواعق محرقہ صفحہ ۹۳ اور الفصول المہمہ صفحہ ۱۲۲ کا تائیدی حوالہ دیا ہے اور ابن عباس کا قول ابن عدی کی زبان سے نقل کیا ہے کہ حضرت ختمی مرتبت نے علی ابن ابی طالب سے ارشاد فرمایا:

"اس سے مراد تم اور تمہارے شیعہ ہیں جو قیامت میں خوش و خرم ہوں گے۔"

ابن مردویہ نے خود حضرت علیؑ سے سن کر اس روایت کو نقل کیا ہے۔ ابن حجر مکی نے جناب ام سلمہ سے حدیث کو لیا ہے۔ ابن اثیر نے بسلسلہ لفظ "قمح" لکھا ہے کہ رسول کریم نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

"بارگاہ ایزدی میں جب حاضری ہوگی تو تمہارے ساتھ تمہارے شیعہ بھی شاد کام آئیں گے اور دشمنوں کا یہ حشر ہوگا کہ غضب میں مبتلا اور ہاتھ پس گردن سے بندھے ہوں گے۔" اس کے بعد آنحضرت نے اپنے دونوں ہاتھوں کو گردن کے پیچھے لے جا کر بتایا کہ دیکھو، "یوں بندھے ہوں گے۔"

زمخشری کی ربیع الابرار، مسند احمد ابن حنبل اور خصائص نسائی میں بھی ایسی روایتیں ملتی ہیں جن سے علی کے شیعوں کی تخصیص ہو جاتی ہے اور اس میں

کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کہ علم باری میں ایک گروہ تھا جو شیعان علی کہے جانے کا مستحق تھا اور جس کی تصدیق خود آنحضرت نے فرمائی تھی ۔ اس طرح اس طبقۃ کا وجود حضور کی زندگی میں مسلم ہو جاتا ہے اور وہ طبقۃ بھی متعین ہو جاتا ہے جو شیعۂ علی نہ تھا لیکن سب کے سب بارگاہ نبوی کے مقرب تھے اور سرور کائنات ہر ایک کو شیعۂ علی بن جانے کی ترغیب دیتے رہتے تھے ۔ "صحاح ستہ" میں باب فضائل علی میں جتنی بھی احادیث نقل کی گئی ہیں اور دوسری کتب میں ترجمان مشیت کی زبان سے علیؑ کے لئے جو ارشادات گرامی موجود ہیں ، وہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں ۔

ان تمام روایتوں کو چھوڑ کر مرزا محمد جعفر نے صرف ایک روایت کو "معیار ایمان و نفاق" بنایا ہے ۔

"جو علی سے محبت کرے وہ مومن اور بغض رکھے تو منافق ۔" (۱)

علی کے لئے فرمودات رسالت کی ایک طویل فہرست ہے اور یہ روایت تو الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ صدہا کتب میں موجود ہے جو شیعہ اور غیر شیعہ کا امتیاز کرتی ہے اور قیامت تک کے لئے محبت علیؑ کو شیعیت کی میزان بنا دیتی ہے دشمن علیؑ کی جگہ کیا ہے ؟ اس کے لئے کسی صراحت کی ضرورت نہیں ۔

شیعان علی کون کون تھے ؟

رسول اکرم کے حین حیات تو اس کا فیصلہ ذرا مشکل تھا کیونکہ ہر شخص علیؑ کی برتری اور افضلیت کا قائل تھا ۔ حضورؐ نے جو کچھ فرمایا ، سب نے تسلیم کیا ۔ سورہ برات لیکر جب حضرت ابو بکر کو بھیجا گیا اور پھر واپس بلا کر علی کے ذریعہ اس کا اعلان کرایا گیا تو کسی میں چوں و چرا کرنے کی ہمت نہ تھی .... اور ہوتی بھی کیونکر ؟ علی کا علم و فضل ، علی کی طاقت و شجاعت اور علی کا کردار و جبروت ناقابل انکار تھا ۔

کہنے کے لئے حضور نے ہر موقع پر صحابہ کی یہ شکایت دور کرنے کی کوشش کی تھی کہ اپنے بھائی کو آگے بڑھا دیتے ہیں اور شاید اسی لئے " خندق " میں جب عمر

ابن عبدود نے آکر للکارا ہے تو آپ نے ایک ایک کا نام لے کر مقابلے پر جانے کی دعوت دی تھی ۔ آخر حضرت عمر کو کہنا پڑا کہ اس کے سامنے کون جائے ، اس نے تو ایک بڑے گروہ کے مقابلہ میں بچہ شتر کو سپر کی طرح ہاتھ میں لے لیا تھا اور تن تنہا سب کو مار بھگایا تھا ۔

پھر جنگ خیبر میں ایک مرتبہ حضرت ابو بکر اور دو مرتبہ حضرت عمر کو بھیجا گیا تھا اور جب یہ سب ناکام ہو کر واپس آئے تھے تب علیؑ کو علم دیا گیا تھا ۔

مکہ میں سورہ برأت کا شرف بھی حضرت ابو بکر کو دیا تھا مگر وحی الہی پر واپس بلا لیا تھا ۔ خدا کی مرضی نہیں تھی تو رسولؐ کیا کرتے !

بہر حال علیؑ کی افضلیت مسلم تھی لہذا جب حضور نے علی کا شرف بیان کیا تو ہر ایک نے سر تسلیم خم کر دیا حتی کہ غدیر خم میں سارے مسلمانوں کا مولیٰ بنایا تو حضرت عمر نے مبارک باد تک دی ۔

ان حالات میں معیار ایمان و نفاق پر افراد کو تولا نہ جا سکتا اس لئے حضور کے جیتے جی شیعہ اور غیر شیعہ کا اعلان ممکن نہ تھا ۔ ایسی کوئی کوشش کی جاتی تو سب کے سب علی کے پیچھے جا کھڑے ہوتے لیکن سنہ ۱۱ھ میں جب حضور کی حالت غیر ہوئی اور آپ نے تاکید فرمائی کہ علیؑ کے سوا ہر ایک اسامہ بن زید کے لشکر کے ساتھ جائے گا تو پہلی بار ایک اندازہ ہوا کہ شیعہ کون ہے اور غیر شیعہ کون ؟

لشکر روانہ ہو گیا اور ایک جماعت نافرمانی کی مرتکب ہو کر نہیں گئی کیونکہ علی رک رہے تھے ۔ رسول کا آخری وقت تھا ۔ ان سب کی عدم موجودگی میں علیؑ کی نیابت کا اعلان ہو جاتا اور خلافت کا منصوبہ خاک میں مل جاتا ، کہا جا سکتا ہے کہ جو چلے گئے ، وہ مطیع رسول بھی اور شیعۂ علی بھی اور جو نہیں گئے وہ باغی ۔

بعض مورخین اس کی تاویل کرتے ہیں کہ جانا خلاف مصلحت تھا ۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ اس کے بعد ہی حضرت ابو بکر اپنے گھر روانہ ہو گئے اور پلٹ کر آئے تو حضورؐ رحلت فرما چکے تھے لہذا حضرت ابو بکر حضرت عمر ، ابو عبیدہ اور دوسرے لوگوں کو لیکر سیدھے سقیفہ بنی ساعدہ چلے گئے جہاں کسی سابقہ اعلان کے مطابق لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے ۔

سقیفہ کا یک طرفہ انتخاب ایک علیحدہ موضوع ہے لیکن وہاں جو لوگ متوقع دھاندلی کو بچانے کے لئے اپنے طور پر پہنچ گئے تھے اور جنہوں نے علیؑ کی عدم موجودگی میں علیؑ کے حق میں آواز اٹھائی وہ یقیناً شیعان علیؑ تھے، جن میں سعد بن عبادہ سرفہرست ہیں۔

سقیفہ کی سازش تاریخ اسلام کا پہلا المیہ ہے جو کربلا پر جا کر منتج ہوا اور پھر اس کا سلسلہ آج تک تک پہنچتا ہے۔

بات ہے شیعان علی کی تو پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ رسولؐ کی میت کو چھوڑ کر استقرار حکومت کے لئے چلے گئے تھے، وہ علی کے شیعہ ہرگز نہ تھے۔ شیعہ تو وہ تھے جو کفن دفن میں شریک ہوئے اور جنہوں نے کھلے بندوں علی کی اہلیت کا اعلان کیا۔

افق ماضی پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی جائے تو یثرب و بطحیٰ کے علاوہ نواحی قبائل میں ہزاروں بزرگ انتخاب خلافت کے شاطرانہ نتائج پر مشتعل نظر آئیں گے ان کی مکمل فہرست مرتب کرنا ممکن نہیں ہے۔ صرف چیدہ چیدہ اصحاب رسولؐ کے نام گنوائے جائیں تو وہ سیکڑوں تک پہنچ جائیں گے ان سیکڑوں کے زیر اثر کتنے لوگ ہوں گے، اس کا تخمینہ صاحبان فہم خود کر سکتے ہیں۔

" سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد، عمار یاسر، خزیمہ، ذوالشہادتین، ابوالتیہان، حذیفہ یمانی، زبیر، فضل ابن عباس، عبداللہ ابن عباس، ہاشم بن عتبہ مرقال، ابوایوب انصاری، ابان و خالد پسران سعید بن العاص اموی، ابی بن کعب انس بن الحرث وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کے سب اکابرین وقت میں گنے جاتے ۔۔۔۔۔ سعد بن عبادہ سقیفہ سے دل شکستہ ہو کر چلے گئے تھے لیکن قیس بن سعد موجود تھے۔ ان کے علاوہ

" عثمان بن حنیف، سہل ابن حنیف، ابو سعید خدری، بریدہ اسلمی، براء ابن عازب، خباب ابن الارث، رفاعہ ابن مالک، عامر ابن واثلہ، وغیرہ تین سو اصحاب کبار تھے جو رسول کی تدفین کے بعد سے خانہ سیدہ زہراؑ پر حاضری دیتے رہتے اور پیغمبر اسلام کے نائب برحق کی چشم و ابرو کو دیکھتے رہتے لیکن وقت کا امام خاموش تھا۔ حضور کی

وصیت اس کے پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی تھی اور محسوس ہوتا تھا کہ حضور کا ہاتھ قبضہ ذوالفقار پر رکھا ہوا ہے۔" (۲)

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت علی کو چاہتی تھی تو میدان میں کیوں نہیں آ گئے؟ اس کا جواب مختلف مقامات پر دیا جا چکا ہے اور یہ واضح کرنا بے محل نہ ہوگا کہ عرب کی بھیڑیں تو صرف بنی ہاشم کے شیروں ہی کا سامنا نہ کر سکتیں اور اصحاب کبار اور صحرائی حق پرست سب یکجا ہو جاتے تو یثرب کی سرزمین ان کا بوجھ اٹھا نہ سکتی جبکہ ان میں کوئی عمر ابن عبدود یا مرحب و عنتر جیسا شجاع بھی نہ تھا۔ یقیناً بعض لوگ تھے جو کمین گاہوں سے حملہ کرنے کے ماہر تھے لیکن فریب سے تو صرف دو ہی چار کو ٹھکانے لگا سکتے تھے جس کے بعد وہ کیفر کردار کو پہنچتے تو ان کا حال عبرتناک ہوتا۔

کسی ایسی قیاسی جنگ کا انجام وہی ہوتا ہے جو غزوات نبوی کا ہوا تھا، اولاد فاطمہ کو اس کا حق مل جاتا اور علی بعد رسول اقتدار کی پہلی جنگ کے فاتح بن جاتے گر حکومت کے بھوکے عرب علی کی زبان میں مرتد بن جاتے۔

اس اندیشے کی تصدیق اس طرح بھی ہوتی ہے کہ آگے چل کر دین پیغمبر کا نام تو اسلام ہی رہا لیکن اس کی صورت اتنی بگاڑ دی گئی کہ خود سرور کائنات نے اسے دیکھا ہوگا تو پہچان نہ سکے ہوں گے کہ یہ انہیں کا دین ہے۔

بہر طور امام برحق نے اپنے دامن کو ہوس حکمرانی میں ملوث نہ ہونے دیا اور ان کے ہوا خواہ ظلم و ستم کا شکار ہوتے رہے ...... یہ سب شیعہ علی تھے اور حضورؐ کا ارشاد گرامی انہیں لوگوں کے لئے تھا۔

صابرین

ہماری تاریخ صابرین کے ناموں سے بھری ہوئی ہے۔ حسین کربلا، زینب کبریٰ اور عظیم المرتبت زین العابدین اور اسی طرح کی کتنی ہی گرانقدر شخصیتیں لیکن علی ابن ابی طالب ان میں سرفہرست ہیں۔ خیبر شکنی کی طاقت بازؤں میں موجود، برش ذوالفقار آب و تاب دکھانے کو بیقرار، رستم عصر اصحاب سرفروشی کو

تیار ، حضرموت اور دوسرے صحرائی قبائل گوش برآواز لیکن امامت کی ذمہ داریوں نے ہاتھ باندھ دیئے تھے اور علیؑ کے صبر کی آزمائش قبر رسول سے شروع ہو چکی تھی ۔

رسولؐ کا نائب ازلی اپنے شیعوں کے ایمان کو جانتا تھا ۔ اس نے ان سب کو جہاد بالسیف کے بجائے جہاد اکبر کی منزل میں لا کھڑا کیا ۔ بھرے دربار میں صدیقہ طاہرہ کو جھٹلایا گیا ۔ آگ سے ڈرنے والے بھیڑیئے باب سیدہ پر آگ لیکر پہنچ گئے ، خود علیؑ کے گلے میں رسی باندھی گئی ۔ باوفا اصحاب کے ہاتھ قبضہ شمشیر پر پہنچ گئے لیکن آپ نے آنکھوں کے اشارے سے ان سب کو روک دیا کیونکہ یہ خود ان کا اور ان کے اصحاب کے صبر کا امتحان تھا ۔

انجیل نے حضرت عیسیٰؑ کی گرفتاری کا ایک منظر پیش کیا ہے کہ ایک حواری نے مشتعل ہو کر ایک سپاہی کو تلوار مار دی تھی اور اس کا ایک کان اڑ گیا تھا پھر وہ ابن مریم کے روکنے پر رک گیا اور عیسیٰؑ کے ساتھ خود بھی پکڑ لیا گیا ۔

کتنے صابر اور صاحبان ایمان تھے شیعیان علی کہ آزمائش صبر کی منزل میں بھی ان کے پاؤں ڈگمگا نہ سکے ۔

رسول کی اولاد محرومیوں کی زد پر تھی احباب ایک ایک کر کے قتل گاہ وفا میں سرخرو ہوتے رہے تھے حتیٰ کہ مالک بن نویرہ نے شہید محبت امیر المومنین ہونے کا شرف حاصل کر لیا اور خالد بن ولید نے ان کی حسین بیوی سے نکاح کے نام پر زنا کا ارتکاب کیا اور سچے مسلمان ہونے کا ثبوت دیدیا مگر علیؑ کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی ۔

حضرت ابوذر کا ربذہ کی طرف خارج البلد ہونا امیر المومنین کے صبر کا امتحان تھا مگر اس میں بھی آپ پورے اترے اس طرح شیعیان علی کا وہ کاروان جو رسولؐ کی زندگی میں مرتب ہوا تھا ، آہستہ آہستہ ختم ہوتا رہا ۔ سلمان فارسی نے مدائن کو دائمی مستقر بنا لیا اور بچے کھچے لوگ عرصۂ صفین میں مومنیت کا ثبوت دے کر درجات شہادت پر فائز ہو گئے ، جن میں عمار یاسر اور اویس قرنی بھی تھے ۔
اب شیعیان علی کے مقابلے پر جو گروہ تھا ، اس کا نام شیعیان معاویہ رکھا گیا

لیکن یہ نام رواج نہ پا سکا ۔ بنی امیہ کی بساط سیاست کے مہرے اموی کہہ کر ہی پکارے جاتے رہے ۔

علیؑ کے محور صداقت پر اب بھی شیعوں کی کمی نہ تھی ۔ پرانے لوگوں کی جگہ نئے سرفروشوں نے لے لی تھی لیکن سیاست اسلام اور سیاست عرب کا مقابلہ تھا جس میں مکر و فریب صداقت پر بازی لے گیا اور وعدہ جنت پر یقین رکھنے والے جنت کو سدھار گئے ۔ مالک اشتر اور محمد بن ابی بکر سازشوں کا شکار ہو گئے ۔ نمایاں لوگوں میں اب صرف قیس بن سعد اور چند دوسرے بزرگ رہ گئے تھے جن کو لے کر علیؑ باطل کی سرکوبی کے لئے نکلنے والے تھے کہ والی شام کے فرستادہ ابن ملجم مرادی نے حالت نماز میں آپ کو شہید کر دیا ۔

جھوٹ کو سچ پر دوسری بار فتح حاصل ہوئی جس کے بعد حق گوئی کے لئے دار و رسن اور زنداں کے دروازے کھل گئے اور شیعیان علی کے خون کی اتنی ارزانی ہوئی کہ :

جب کوئی قصر ستم آرا بنا
خون سے سادات کے گارا بنا

باطل کا یہ غلبہ بے چارگی میں اہل ایمان کا امتحان تھا ۔ اس میں بھی اکثریت کامیاب ہوئی ۔ شاذونادر ہی کوئی نظیر ڈھونڈھنے سے ملے گی کہ کسی شیعہ نے دنیا کے لئے دین کو قربان کر دیا ہو ۔ اتنا ضرور ہوا کہ افراد کونوں کھدروں میں جا چھپے ، تقیہ کر کے گھنی آبادیوں میں روپوش ہو گئے اور ایک تعداد ترک وطن کر گئی ۔

اس طرح زندگیوں کو بچائے جانا بزدلی نہ تھی ۔ اسلام نے اسی دن کے لئے تقیہ کو جائز کیا تھا ۔

تاریخ کا یہ انقلاب اس قدر نتیجہ خیز تھا کہ عراق و شام شیعیان علی سے خالی ہو گئے ۔ کوفہ و بصرہ میں کھلے عام کوئی اہلبیت کا نام لیوا باقی نہ رہ گیا البتہ جب کربلا میں مٹھی بھر مجاہدوں نے ٹڈی دل کے مقابلے پر حریت کا آوازہ بلند کیا اور عزت نفس کی ایک نظیر قائم کی تو اندر ہی اندر بیداری کی ایک لہر دوڑنے لگی پھر بھی

منتشر اقلیت جانیں دینے کے سوا کچھ کر نہ سکی۔

وقت اپنے محور پر گھومتا رہا۔ ظلم کامیابی پر کامیابی حاصل کرتا رہا۔ تاریخ فتح و ظفر کے پرچم اڑاتی رہی ــــ یہاں تک کہ جابر فرماں رواؤں کی دوسری نسل مظلوموں کے نام کا سہارا لے کر برسراقتدار آگئی اور بنی عباس نے بنی امیہ کی جگہ لے لی مگر شیعان علیؑ کے لئے پہلے کی طرح دن رات برابر رہے۔

اب میدان عباسیوں کے ہاتھ میں تھا اور شیعہ نزدیک و دور معروف و غیر معروف بستیوں میں پڑے ہوئے تھے جور و ستم کے نئے نئے باب وا تھے مگر شاہی کا استقرار منحصر تھا محبان علیؑ کی مکمل بیخ کنی پر لہذا منصور دوانیقی نے اہل بیت کے مقابلے پر ایک دار العلوم قائم کر دیا، ہارون رشید نے امام جعفر صادقؑ کے ایک شاگرد ابو حنیفہ کو امام اعظم کا لقب دے کر خود استاد کا مد مقابل بنا دیا آگے چل کر ماموں رشید نے ابو حنیفہ کے فتاوے کو مرتب کرا کے اس کو فقہ حنفیہ کا نام دیدیا اکتفاء صرف اتنے ہی پر نہیں کی گئی بلکہ طرفہ ستم یہ ہوا کہ پیغمبرؐ اسلام کے بتائے ہوئے مسلک پر چلنے والوں کی فقہ کو فقہ جعفری کہہ کر پکارنے کا حکم بھی دیدیا گیا۔

وہ وقت ہے اور آج کا دن کہ فقہ امامیہ کو فقہ جعفری ہی کہا جاتا ہے مگر باقی رہ گیا تھا ابھی لفظ شیعہ، جس کے مقابلے پر اس وقت صرف عباسی تھے لہذا اسی عظیم خلیفہ نے معاویہؓ کا تجویز کردہ نام اہل السنت والجماعت ڈھونڈ نکالا اور اس کو شیعان علی کے مد مقابل بنا دیا۔

خلیفہ کا مسلک معتزلی تھا اور اعتزال سرکاری مذہب، جو متوکل تک جاری رہا لیکن بغداد کی شاہی کو شیعان علیؑ سے اتنی کد تھی کہ ان کی ضد میں ایک باقاعدہ فقہ مرتب کروادی، امامت کا ایک نیا سلسلہ قائم کر دیا اور ایک نئی جماعت کی مکمل تنظیم کر دی جو آج تک اہل السنت والجماعت کہلاتی ہے۔

پھر امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل کی فقہیں دیکھا دیکھی وجود میں آگئیں .... اور ایک ہزار سال بعد محمد بن عبد الوہاب کا وہابی مسلک بھی .... یہ سب اس عباسی خلیفہ کا کارنامہ ہے جو تاریخ میں مامون اعظم کہلاتا ہے۔

درحقیقت مسلمانوں میں بنیادی طور پر صرف دو گروہ تھے ایک شیعان

علی دوسرا غیر شیعہ۔ بنی امیہ کچھ دنوں تک شیعان معاویہ رہے پھر اموی بن گئے اور ان کی جگہ عباسیوں نے لے لی .... لیکن اہل السنت والجماعت کے وجود میں آنے کے بعد سے مسلسل مسالک فقہ بنتے رہے اور نت نئی فرقہ وارانہ جماعتیں سامنے آتی رہیں جن کی تعداد حدیث رسولؐ کے مطابق بہتر(۷۲) ضرور ہو جائے گی۔

صدیوں پر صدیاں گزر چکی ہیں۔ عقائد موروثی ہو چکے ہیں۔ ہر مکتبۂ فکر اپنے کو برحق سمجھتا ہے۔ ایسے میں جھوٹ سچ کا فیصلہ ممکن نہیں پھر مسلمانوں کی تاریخ متضاد روایات کا مرکب بھی بن چکی ہے جس سے صحیح مفردات کا الگ کرنا محال ہے پھر بھی چشم بینا اصل و نقل کا امتیاز کر سکتی تھی لیکن وراثت میں آیا ہوا عقیدہ اپنی حمایت میں منطقی استدلال کا سہارا لے لیتا ہے لہذا رواداری کا تقاضا یہی ہے کہ متنازعہ مسائل کو چھیڑا نہ جائے۔

شیعان علیؑ ہمیشہ سے اتحاد ملت کے خواہاں رہے ہیں اور حضرت علیؑ کی آزمائش صبر کے موقف پر قائم ہیں، کاش اسے ہماری کمزوری سمجھا نہ جائے اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا جائے!

اسلام میں گروہ بندی

کب شروع ہوئی ؟

گروہ بندی عرب میں انسان کے اجتماعی وجود سے پائی جاتی تھی ۔ تاریخ نے جب آنکھ کھول کر دیکھا تو عرب فحاشی اور فسق و فجور میں اتنے آلودہ تھے کہ انہیں ان غلاظتوں سے نکالنا کسی ہادی مطلق کا کام ہی ہو سکتا تھا اور اسی کے لئے علیم و بصیر نے اپنے آخری نبی کو مقدر کیا تھا جو بروقت اس ریگزار میں مبعوث ہوا اور اس نے ریت کے ذروں میں صداقتی شعور کی تجلیاں پیدا کر دیں ۔

جنگ و جدل صحرائی عربوں کی جبلت، قبائلی عداوت، انفرادی اور اجتماعی کینہ پروری قومی مزاج تھا ۔ مرسل برحق کی سیرت نے اثر پذیری کا وہ معجزہ دکھایا کہ ریگستان کے بھیڑیئے آہوان ختن کے سانچے میں ڈھل گئے ۔ کس نے رحمتہ لالعالمین کا کتنا اثر قبول کیا؟ یہ ذاتی صلاحیت کی بات تھی لیکن مجموعی طور پر انسان کے پیکر میں اکثر انسان ہی دکھائی دینے لگے ۔

جس طرح ہر زمین باران رحمت کا یکساں اثر قبول نہیں کرتی، اسی طرح عرب بھی فیضان اسلام سے مختلف سطحوں پر بہرہ ور ہوئے ۔ کوئی سلمان، ابوذر اور مقداد بن گیا، کوئی عبداللہ بن ابیّ، ابوسفیان اور ابولہب رہا، ہر ایک نے نفوذ دین کی سعادت بقدر ظرف حاصل کی پھر وہ وقت بھی آیا کہ مسلمان راسخ، نیم مسلمان اور منافق سب پرچم اسلام کے نیچے نظر آنے لگے ۔

اسلام میں گروہ بندی کا نقطہ آغاز اسی دور کو قرار دیا جا سکتا ہے، جب مدینے کے آفتاب رسالت کی شعاعیں دور دور تک سنگلاخ چٹانوں اور بنجر زمینوں پر پڑ رہی تھیں اور چڑھتے سورج کی پرستش عام ہو رہی تھی ابوسفیان نے فتح مکہ کے دن حضرت عباسؓ سے کہا تھا "تمہارے بھتیجے کی بادشاہت تو بڑی شاندار ہو گئی ہے؟" حضرت عباس نے جواب دیا تھا "یہ بادشاہت نہیں رسالت ہے ۔"

بادشاہت اور رسالت کے دو تصور اسی مقام سے واضح ہوتے ہیں ۔ جن لوگوں کے دلوں میں رسالت کا عقیدہ مرتسم ہو چکا تھا، وہ بھی اور جو علاقائی تسخیر کو توسیع مملکت سمجھتے تھے وہ بھی، سب اپنی اپنی سطح سے جویائے تقرب ہو گئے ۔ بادشاہ عرب کی خوشنودی اور نبی مرسل کی رضا، بیک وقت دو مطمح نظر ایک ہی سمت میں کار فرما تھے اور ہر ایک حضور کی بزم عرش منزلت میں کوئی ممتاز مقام حاصل کرنے میں کوشاں تھا، اس لئے ہر ممکن پیش کش اور انتہائی جدوجہد کر رہا تھا۔

مقربین بارگاہ کی کوئی قطعی طبقاتی تقسیم نہیں ہو سکتی اور نہ مساوات محمدی اس کی اجازت دیتی ہے لیکن ان سب میں ایک نمایاں حیثیت آل ابو طالب کو حاصل ضرور تھی جس کے عوامل میں دیرینہ اور موجودہ خدمات بھی شامل ہوں گی اور خود آنحضرتؐ کے بقول مرضی الہیٰ بھی ۔ علیؑ ہر محاذ پر پیغمبرؐ اسلام کے نمائندے، ہر جنگ میں مرد غیر فرار، ہر مقابلے میں حامل ذوالفقار تھے ۔ خود حضور نے بیٹی سے پہلے علیؑ کی پرورش شروع کی تھی اور بساط پیغمبری پر گھٹنوں چلنا سکھایا تھا لہذا اگر حضورؐ بغیر وحی بات نہ کرتے تو علی جو قدم اٹھاتے وہ صرف رضائے پیغمبرؐ کو دیکھ کر ہی ۔

ان حالات میں علیؑ کی قدر افزائی ناگزیر تھی ۔ آنحضرت نے درجہ بہ درجہ دوسروں کی تالیف قلب بھی کی لیکن اس سے مزاجوں کا تکدر دور نہ ہو سکا، حالانکہ ذرا بھی انصاف پسندی کو دخل دیا جاتا تو اس شرف نوازی کا سبب سمجھ میں آجاتا اور فداکاری و شجاعت کے آئینے میں اپنی شکلیں پہچاننے میں دقت نہ ہوتی لیکن یہ کرتا تو وہ جس کو افضل و مفضول میں فرق کرنے کی تمیز ہوتی یا جس کی حق شناسی اپنی کمتری کے اعتراف کی تاب لا سکتی لہذا ایک گروہ دل ہی دل میں فاطمہ زہراؑ کے یگانہ روزگار شوہر سے جلتا رہا۔

یہ تھا نظری خاکہ خدا کے پیغمبرؐ مرسل کی صحبت میں بیٹھنے والوں کا......

امہات المومنین کی کیفیت اس سے کچھ مختلف نہ تھی ۔ حضورؐ کی پہلی شریک حیات اپنی واحد یادگار کو شریک کار رسالت بنا کر چھوڑ گئی تھیں جو ماں کی نائب بھی تھیں

باپ کا مرکز محبت بھی اور سیرت و کردار میں مقبول مشیت بھی۔

موجودہ امہات المومنین میں اکثریت مزاج رسالت اور رضائے نبوت کی پابند تھی مگر چند ایسی بھی تھیں جو حضورؐ کو صرف چہیتی بیوی کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ ان میں حضرت عائشہ سرفہرست تھیں، آپؐ کو چاہ کے ساتھ آنحضرتؐ کی زبان پر خدیجۃ الکبریٰ کا ذکر بھی گوارانہ ہوتا اور جناب فاطمہؑ کی عزت و تکریم تو قابل برداشت تھی ہی نہیں لہذا حضرت عائشہ کا برتاؤ فاطمہ زہراؑ کے ساتھ واقعی سوتیلی ماں کا تھا جس سے عاجز ہو کر جناب فاطمہ نے دیوار میں بنا ہوا وہ روزن بند کرا لیا تھا جو آپ کے اور حضرت عائشہؓ کے حجروں کے درمیان واقع تھی اور حضورؐ حضرت عائشہؓ کی باری آنے پر جس کے قریب کھڑے ہو کر بیٹی سے بات چیت کر لیا کرتے تھے۔

فاطمہ زہراؑ کی فضیلت آیات و احادیث کی روشنی میں دلیل کی محتاج نہیں اور حضرت عائشہ سے آپ کی بیزاری پر بھی پردہ ڈالنے کی ضرورت نہیں کیونکہ جن لوگوں کو آپ نے اپنے جنازے میں شریک نہ کرنے کی وصیت کی تھی ان میں جناب عائشہؓ بھی تھیں۔

اس طرح رسول اکرمؐ کے حین حیات اندر اور باہر دونوں جگہ ایک گروہ بندی ہو رہی تھی اور اس کی بنیاد تھی علیؑ اور زہراؑ کی فضیلت۔

علیؑ کے سلسلے میں بعض لوگوں کو اعتراض تھا کہ ہر موقع پر انہیں کو آگے بڑھا دیتے ہیں لیکن حضورؐ جب کسی کو موقع دیتے تو وہ بے نیل مرام واپس آجاتا۔ کبھی یہ اعتراض کیا جاتا کہ دونوں بھائی تنہائی میں نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے رہتے ہیں؟ حضورؐ بتاتے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں، حکم خدا سے کرتے ہیں۔ اس پر شاید کسی کو یقین نہ آتا کیونکہ پھر وہی اعتراض دہرایا جاتا۔

واضح رہے کہ آنحضرتؐ نے مدینے میں ایک دوسرے کو بھائی بنا دیا تھا۔ علیؑ کو خود اپنا بھائی بنایا تھا۔ برگزیدہ صحابی یہ بھی نہ سوچتے کہ وہ جس سے حسد کر رہے ہیں، وہ حضورؐ کا بھائی ہے۔ اس پر طرفہ ستم یہ ہوا کہ قاتل المشرکین کے ہاتھوں عرب کے بڑے بڑے سورما موت کے گھاٹ اتر گئے اور قبائلی کینہ پروری

نے مختلف قبیلوں کو علیؑ کا دشمن بنا دیا جو مسلمان ہونے کے باوجود اپنے جذبۂ انتقام کو دبا نہ سکے اور علیؑ کی مخالفت کا ایک جال اندر ہی اندر بچھتا رہا۔

ایک طرف یہ گروہ بندی ہو رہی تھی، دوسری طرف آنحضرتؐ اسلام اور اہل اسلام کے مستقبل کا فیصلہ سنا رہے تھے جس سے ایک گروہ جل بھن کر کباب ہو چکا تھا مگر ایک دوسرا گروہ اور بھی تھا جس نے ایسا ہر فیصلہ برحق بڑی طمانیت کے ساتھ سنا۔ یہی دوسرا گروہ "شیعیان علی" کہلایا۔

تعداد کس کی زیادہ تھی؟ اس کا اندازہ چودہ سو برس بعد لگانا مشکل ہے مگر یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ بادشاہ عرب کی جانشینی کا فیصلہ اگر تجہیز و تکفین کے بعد طے کیا جاتا تو نتیجہ وہ نہ نکلتا جو دھینگا مشتی کر کے سقیفہ میں نکالا گیا۔ اس حقیقت کا احساس غالباً ارباب حل و عقد کو پہلے سے تھا اور انہوں نے آنحضرت کو صرف بادشاہ عرب قرار دیا تھا تب ہی تو میت کی آخری رسوم ادا ہونے سے قبل تخت نشینی کا فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہو گئے تاکہ اس سے فراغت کر کے تدفین کے فرائض انجام دیں اور فرماں روائے وقت کی میت نئے بادشاہ کے ہاتھوں قبر میں اتاری جائے۔

لیکن جس کی نظر میں آنحضرت صرف ختم المرسلین تھے، نئے بادشاہ کی واپسی سے پہلے ہی وہ آپ کو سپرد خاک کر چکا تھا۔ اس کے بعد کس میں ہمت تھی کہ ایک پیغمبر کو عرب کا بادشاہ قرار دے سکے..... سب نے اسی کے بتائے ہوئے طریقے پر فاتحہ خوانی کی اور الٹے قدم پلٹ پڑے۔

علی کا موقف

بلاشبہ خدا کے برگزیدہ نبی نے ریگزار کے بہت سے نخلستانوں کو مسخر کیا تھا اور سارے مقبوضات نے مل جل کر چھوٹی سی مملکت کی شکل اختیار کر لی تھی لیکن اس کا مقصد صرف تبلیغ دین تھا۔ اگر مشرکین کی طرف سے اشاعت اسلام میں مزاحمت نہ کی جاتی تو آنحضرت کبھی تلوار نہ اٹھاتے اور ایک بھی دفاعی جنگ وقوع میں نہ آتی۔

تمثیل میں نصارائے نجران کو لیا جا سکتا ہے جن کو حضورؐ نے ہر طرح کا

تحفظ دیا۔یہاں تک کہ گرجاؤں کی حفاظت کا ذمہ بھی لیا کیونکہ وہ آپؐ کا پیغام
بگوش ہوش سننے کو تیار تھے اور آپ کا مقصد اولین ذہنوں کی تسخیر تھا جو پورا ہو رہا
تھا اس لئے زبان کا کام تلوار سے لینے کی ضرورت نہ تھی۔کفار قریش نے یہی رویہ
اختیار کیا ہوتا تو نہ ہجرت مدینہ کی نوبت آتی اور نہ جنگ بدر و خندق واقع ہوتی۔
تلوار تو محض دفاع کا ایک ذریعہ تھی ورنہ منزل صرف اشاعت اسلام تھی اسی کے
لئے جنگ بھی کی گئی اور صلح بھی۔

یہی سبب تھا کہ جب مسلمانوں نے فرمانروائی کے لئے کسی نہ کسی طرح
اپنے قائد کا انتخاب کر لیا تو علیؑ نے تلوار کو بے نیام نہیں کیا کیونکہ دفاع کا کوئی
موقع پیدا ہی نہیں ہوا تھا لیکن جب حضرت معاویہ نے اسلام پر حملہ کیا تو خیبر میں
چمکنے والی ذوالفقار ایک بار پھر فضا میں کوندنے لگی اور علیؑ شرع کی حدود میں دین
کا تحفظ کرنے کے لئے میدان میں آگئے۔

یہ حالات بدیہی طور پر سقیفہ کے انتخاب سے پیدا ہوئے تھے۔ان سے خانہ
زہرا بے طرح متاثر ہوا تھا اور ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا تھا کہ پیغمبرؐ عرب کی زندگی
کے دو مستقل پہلو سامنے آگئے تھے۔ایک حکمرانی کا، دوسرے ہادیانہ قیادت کا۔
حکمرانی کا فیصلہ یکطرفہ ہو چکا تھا اور حضرت ابو بکر تخت خلافت پر بیٹھ چکے تھے۔
بات رہ گئی تھی مسند پیغمبری کی تو سلسلہ نبوت اختتام کو پہنچ چکا تھا، کسی نبی کو
تاقیام قیامت آنا نہیں تھا اس لئے خلیفہ کو ایسے اختیارات بھی حاصل تھے۔ہمارے
عقیدے میں ختم رسالت کے بعد نبوت کے بجائے سلسلہ امامت مقدر تھا
اور حضرت علیؑ اللہ کی طرف سے مامور تھے جنہیں اسلام کو آگے بڑھانا تھا۔یہی سبب
تھا جو علیؑ نے خلافت ظاہری کی پروا نہیں کی۔انہیں دنیا سے کیا سروکار تھا، وہ تو
دین کے لئے خلق ہوئے تھے اور یہ منصب کوئی ان سے چھین نہ سکتا۔

بادی النظر میں مسائل شریعت بھی خلیفہ وقت سے وابستہ تھے مگر یہ
سعادت بزور بازو حاصل نہ کی جا سکی اس کے لئے دینی مرحلوں میں کبھی عبداللہ
ابن مسعود کو بلایا گیا، کبھی علیؑ کے شاگرد رشید عبداللہ ابن عباس کو اور جب
بالکل ہی مجبوری ہو گئی تو امام وقت حضرت علیؑ سے رجوع کیا گیا اور جس کسی نے

خود رائی کو دخل دیا اس کے ہاتھوں شریعت کا خون ہو گیا۔

روایات شاہد ہیں کہ بعض لوگوں کو اپنے ظالمانہ عمل پر ندامت ہوئی مگر
بعد از وقت۔تاہم یہ ادوار خیر و شر کے مخلوط راستوں سے گزرتے رہے اور علیؑ
ایک مسلک خاموش میں تدوین قرآن کے ساتھ ساتھ امت کو وہ راستہ دکھاتے
رہے جو انہیں عرفان الٰہی تک لے جاتا۔

ابتدائی دنوں میں بیت فاطمہ زہرا کے دروازے آنے والوں کے لئے وا
رہتے تھے پھر حضرت علیؑ نے مسجد نبوی کو درس گاہ امامت بنا لیا۔رموز دین کے
شیدائی وقت معین پر جمع ہو جاتے اور اپنے دامن گہر علوم سے بھر کر واپس ہوتے
تھے......... یہ تھے شیعان علی جو وقت کے محور پر زمانے کے فصل کو طے کرتے رہے۔
ابتداء میں ان کے نام تھے سلمان، ابوذر، مقداد، عمار یاسر، ابوایوب انصاری،
حذیفہ یمانی، بریدہ اسلمی، خالد بن سعید، ابوالہیثم بن تیہان، عثمان بن حنیف، خزیمہ
بن ثابت، ابی بن کعب آگے چل کر مسجد کوفہ میں ان کی جگہ کچھ نئے لوگوں نے
لے لی اور بزرگ صحابہ کے دوش بدوش امیرالمومنین کا حق رفاقت ادا کرنے لگے

باوفا اصحاب رسول میں جو بقید حیات تھے، وہ کوفے آگئے انہیں کی صف
میں سلیمان بن صرد خزاعی، مالک اشتر نخعی، مسیب بن نجبہ، عدی بن حاتم،
عبداللہ بن بدیل، حجر بن عدی، مختار بن ابی عبیدہ، ہانی بن عروہ، میثم تمار کو جگہ ملی
جن کے ذیل میں ان گنت لوگ شامل تھے اور اس اعتبار سے اس زمانے میں
کوفہ و بصرہ شیعان علی کے گڑھ کہے جاتے تھے۔

ان کے مقابلے پر دمشق اور دوسرے مقامات پر جو گروہ تھا، وہ شیعان
معاویہ کہہ کر پکارا جاتا مگر شیعان علی اپنے جذبہ ایمانی اور معلومات دینی میں نمایاں
اور ممتاز تھے لہٰذا اس نام کو قبول عام حاصل ہو گیا اور معاویہ کے شیعہ "اموی"
عنوان کے تحت گنے جانے لگے جن میں مدینہ اور دوسرے علاقوں کے وہ لوگ بھی
شامل تھے، بغض علیؑ جن کی گھٹی میں پڑا تھا۔

یہی سبب تھا جو حضرت معاویہ کو اپنے حلقے کا نیا نام تجویز کرنا پڑا اور انہوں

نے اس کو اہل السنت والجماعت کا عنوان دیا لیکن یہ نام مقبول نہ ہو سکا اور مدینے سے دمشق تک ایک گروہ علی کے دوستوں کا، دوسرا دشمنوں کا باقی رہا، علی کے دوست شیعان علی کہے جاتے اور باقی غیر شیعہ۔ آگے چل کر لفظ شیعہ کا مطلب ہی محب علی ہو گیا۔

اہل السنت و الجماعت

یہ نام حاکم شام کے ذہن میں کیوں آیا؟ اس کا تجزیہ کیا جائے تو حضورؐ کی رحلت سے اس وقت تک کا پورا ماضی سامنے آجاتا ہے۔ انتخاب خلافت اگرچہ صرف نظم و نسق کے لئے نہ ہوا تھا لیکن عملی زندگی میں بدیہی طور پر خلافت و امامت کی تقسیم ہو گئی اور مسائل شریعہ کیلئے کل ایمان کی احتیاج ناگزیر ہو گئی۔ باب زہرا حیات پیغمبرؐ میں بھی ایمان کا محور تھا۔ پدر زہرا کی سرپرستی میں اجزائے ایمان تربیت پاتے رہے تھے اور آج پیغمبر کے بعد بھی اسلام اسی دروازے پر تھا۔ علی کی محتاجی ارباب سیاست کو گوارا نہ تھی مگر وہ اسلام کا جوا کاندھے سے اتارے بغیر دور نہ ہو سکتی اور یہ شاید کسی کو منظور نہ تھا۔

پھر یہ مجبوری بھی تھی کہ اسلام کا نام کچھ اور رکھ دیا جاتا تو قائد کس حلقے کے رہ جاتے اسلئے ایک خیال یہ پیدا ہوا کہ اس درہی کو پھونک دیا جائے جس سے مطلق العنانی میں فرق آتا ہے مگر مسئلہ اس سے بھی حل نہ ہوا لہذا قیاسی فیصلوں پر انحصار کیا گیا۔

استنادی طور پر حضرت ابو بکر سے کئی غلطیاں ہوئیں اور حضرت عمر نے تو اتنے جارحانہ اقدامات کئے کہ ان کا پرتو آج تک اسلام میں پایا جاتا ہے...... اسی کا نام سیرت شیخین رکھا گیا تھا جس پر نبی کے نائب ازلی سے مہر تصدیق ثبت کرانے کے لئے خلافت کی پیش کش کی گئی تھی۔ علیؑ نے نیابت پیغمبری کے منصب سے اس کی تردید کر دی۔ ایک تیسرے شیخ نے بڑھ کر اسے قبول کر لیا اور سیرت شیخین کی ایسی دھجیاں اڑائیں کہ سنت رسول بھی داغدار کر کے رکھ دی۔

جھوٹی روایات کی تخلیق اسی تیزی سے ہو رہی تھی کہ سچی روایات پر پردے

پڑتے جا رہے تھے۔ عرب کے ہادی مرسل کی سیرت میں سیرت شیخین پہلے ہی مدغم ہو چکی تھی۔ تیسرے شیخ کی طویل المدت سیرت اس میں ضم ہوئی تو وہ اسلام اور جاہلیت کے عرب ذہن کا آمیزہ بن گئی اور اس کا نام سنت رسولؐ رکھا گیا.........

بالکل اسی طرح جیسے شام کے مسلمان نبی امیہ ہی کو پیغمبرؐ عرب کا راست وارث اور صحیح جانشین سمجھتے تھے اور ان کی سیرت کو عین اسلام قرار دیتے۔

علیؑ کی آواز مدینے کی مسجد نبوی سے گونجتی رہی تھی پھر مسجد کوفہ کے وسیع و عریض صحن سے بلند ہوئی مگر ایوان دمشق کے در و دیوار سے ٹکرا نہ سکی۔ پھر حضرت معاویہ نے خانہ جنگی کی وہ صورت حال پیدا کر دی کہ اشاعت اسلام کے مواقع کم سے کم تر ہو گئے اور علیؑ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ کو اتنا وقت بھی نہ مل سکا کہ وہ شام میں پیش کی جانے والی اسلام کی مسخ شدہ تصویر کے داغ دھبے ہی دور کر سکتے۔

امام حسنؑ رسولؐ کے لب و لہجہ میں مفسر دین کا فرض ادا کرتے مگر وقت اتنا بدل چکا تھا کہ چند نفوس کے علاوہ کوئی اس کا سننے والا نہ تھا...... ستر ہزار منبروں سے علیؑ پر تبرا بھیجا جا رہا تھا۔ تاج و تخت کا ہر عمل اسلام سے تعبیر کیا جا رہا تھا اور حاکم وقت کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ حکم قرآنی کے مترادف قرار دیا جاتا تھا۔

ایسے میں دمشق کے دارالخلافہ پر ایک نام کندہ کیا گیا "اھل السنت والجماعت" یہ سنت سیرت رسولؐ سے عبارت لی گئی تھی مگر دراصل وہ مرکب تھی خلفائے ثلاثہ اور معاویہ کے اعمال کا، جماعت کا عطف اپنے گروہ کے اظہار کے لئے کیا گیا تھا لیکن یہ لفظ رواج نہ پا سکا۔ حجر بن عدی، عمرو بن حمق خزاعی اور دوسرے مقدس اصحاب رسولؐ کے خون سے اس عنوان پر اتنی تہیں جم گئیں کہ منصور دوانیقی سے لے کر مامون کے عہد تک انہیں کھرچا گیا تب وہ پڑھے جانے کے لائق ہو سکا۔

خلافت و امامت

۱۱ھ میں مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے والے کو خلیفہ کہہ کر پکارا گیا اور اللہ کی طرف سے متعین کئے ہوئے نائب رسول کو امام کہا گیا۔ اولاد رسولؐ کے

غلاموں نے نہ پہلے خلافت کو مانا تھا، نہ آج مانتے ہیں اور علیؑ کے ماننے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قصے کہانی کو تاریخ بنا کر پیش کر دینے سے اہل نظر کی آنکھوں میں دھول جھونکی نہیں جا سکتی۔ خلافت ابو سفیان کی زبان میں بادشاہت تھی جس کو اسکے بیٹے معاویہ نے ثابت کر دیا........ اور پھر یہی خلافت عباسیوں سے گزرتی ہوئی فاطمئین مصر تک اور اس کے بعد ترکوں تک پہنچی اور انجام کار اتا ترک کے ہاتھوں اختتام پذیر ہوئی۔

نیابت رسول کا یہ تقدس کہاں سے چلا کب تک باقی رہا؟ اس کا فیصلہ اب تک نہ ہو سکا۔ کوئی عبداللہ ابن زبیر کو پانچوں خلیفہ راشد قرار دیتا ہے، کوئی عمر بن عبدالعزیز کو۔ خلافت کے اس سلسلے میں چار پانچ راشد ہیں، باقی غیر راشد لیکن غیر راشد تو کسی کو کہا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ چوتھے خلیفہ راشد سے بغاوت کرنے والا بھی خطاکار نہیں تھا وہ بھی مجتہد تھا، جس سے خطائے اجتہادی سرزد ہو گئی ویسی ہی خطا جو حجر بن عدی اور دوسرے اصحاب نبی کے قتل میں سرزد ہوتی رہی۔

پھر بنی عباس کے عہد میں منصور دوانیقی اور ہارون رشید تو فقہ حنفی کے مربی ہیں اور مامون تو مدون فقہ ہے، اس کو کیونکر غیر راشد قرار دیا جا سکتا ہے .... اور خونخوار متوکل تو محسن اعظم ہے۔ اس نے پہلی بار اس فقہ کو سرکاری مسلک کا شرف دیا۔ وہ سادات کے خون سے بھرے ہوئے پیالوں کو زینت دستر خوان بنالے تب بھی مقدس اور برگزیدہ رہے گا۔ بہرحال خلافت اولاد فاطمہ کے خون میں غوطہ لگاتی ہوئی بڑھی ہو یا آل رسولؐ کی لاشوں پر سے گزرتی ہوئی مگر تھی خلافت، جس کا پہلا پتھر سقیفہ بنی ساعدہ میں رکھا گیا تھا اسی لئے جب بابائے ترکان نے اس پر آخری ضرب لگائی تو بعض سربرآوردہ مسلمان تڑپ اٹھے اور احیائے خلافت کی تحریک چلانے کے لئے میدان میں آگئے۔ جیسے اس خلافت نے اسلام اور اہل اسلام کے لئے بڑے کار نمایاں انجام دیئے ہوں۔

خلافت کا لفظ پہلے پہل نیابت رسولؐ کے مفہوم میں استعمال ہوا تھا پھر دمشق میں اس کے معنیٰ بدل گئے اور وہ عام مسلمان بادشاہ کے لئے استعمال ہونے لگا۔ زمانے کے فصل۔ سے اسی دمشق نے اس میں مطلق العنانی اور رومی و

ایرانی سطوت و جاہ کی وسعت پیدا کی، پھر بغداد پہنچ کر اس کے پھیلاؤ میں بہت اضافہ ہو گیا اور اس طرح مدینے کی دینی ٹکسال کا یہ سکہ افریقہ و یورپ میں اپنی آب و تاب اور چمک دمک بڑھاتا رہا۔ آخر کمال اتاترک کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر وقت کی بھٹی میں گلا دیا گیا۔

ہندوستان میں یہ لفظ اپنے سابقہ مفہوم میں استعمال نہیں ہوا۔ اکھاڑوں کے کنارے بیٹھے ہوئے پہلوان کو خلیفہ کہہ کر پکارتے سنا گیا، حجام کا اعزاز بڑھانے کے لئے خلیفہ کے لقب سے مخاطب کیا گیا اور جولاہوں کے چودھری کو بھی بعض لوگ خلیفہ کہنے لگے۔

دوسرے لفظ "امام" کی بے وقعتی زیادہ نہیں ہوئی، شاید مسلمانوں کو اتنا احساس تھا کہ نماز پڑھانے والے کو خلیفہ نہیں کہا جا سکتا، نماز کا قائد تو امام ہی ہوتا ہے لہذا ہر مسجد کے پیش امام کو "امام صاحب" کہا گیا، خواہ وہ جاہل مطلق ہی کیوں نہ ہوتا۔ خدا کرے، یہ لفظ اس سے زائد بگڑنے نہ پائے۔

خلافت کے اس طویل سلسلے کا آغاز یقیناً اتنا بدشکل نہ تھا کہ اس کو ہادی اسلام سے نسبت نہ دی جا سکتی مگر اس کے نتائج بڑے بھیانک نکلے۔ تاہم کوئی منزل ایسی نہیں آئی جب وہ خانوادہ رسالت کی رہنمائی سے بے نیاز رہی ہو۔ یہ خلافت کی مجبوری تھی جس کا احساس قدم قدم پر ہوتا رہا اسی لئے جب خلافت کی باگ ڈور حضرت معاویہ کے ہاتھوں میں آئی تو انہوں نے دین کا ہیولا ہی بدل ڈالا جس کے بعد خلافت کے پاؤں میں پڑی ہوئی ہدایت خواہی کی ہر زنجیر ٹوٹ گئی۔

اب اسلام اور خلافت اسلام کا مرکز دمشق تھا۔ مدینے کا کچھ احترام کیا جاتا تو صرف اس لئے کہ وہاں رسول اور اصحاب رسول کی ابدی آرام گاہیں تھیں اور خانوادہ رسول اقامت پذیر تھا جس سے بیشتر صحابہ کرام کی اولاد بھی مربوط ہو گئی تھی۔ فاطمہؑ کے دونوں بیٹے عزلت گزینی میں رقوم خمس پر گزارا کر رہے تھے جو انتہائی نامساعد حالات میں بھی بچے کھچے شیعیان علی پیش کر دیتے تھے..... بحیثیت مجموعی دمشق سے جو سلوک اہل مدینہ کے ساتھ کیا جاتا وہ مراحم خسروانہ کی تعریف میں تھا اب دمشق کی خلافت نام نہاد علماء کی مدد سے شرعی فیصلے خود کرتی۔ اس

نے مسلمانوں کے لئے اہل بیت سے وابستگی اور شرعی قیادت کو بے ضرورت بنا دیا تھا اور اس مجبوری کو دور کر لیا تھا جو ماضی کی فرماں روائی میں ناگزیر رہی تھی۔

وقت کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ نبی کے گھر کی بے وقعتی بڑھتی رہی پھر یزید بن معاویہ کے ہاتھوں سبط رسولؐ کا سر قلم ہو گیا، فاطمہ زہرا کا خاندان در بدر پھرایا گیا۔ کعبے کی بے حرمتی، مدینے کی تاراجی ہوئی اور ایسا کچھ عمل میں آیا، تاریخ بھی جس کی توقع نہ کر سکتی........ اس ظلم و شقاوت کے مرتکب بنی امیہ کہے جاتے ہیں، ان کا نام "اہل السنت والجماعت" نہیں تھا۔

پھر بھی بنی عباس نے اپنے اقتدار کے دوسرے مرحلے میں اسی نام سے زمین ہموار کی، علماء کے ایک گروہ کو منظم کیا اور ہارون رشید نے ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کو اس کا سربراہ بنایا۔

حضرت علیؑ نے اپنے مرشد کامل کی تقلید میں رشد و ہدایت کا ایک سلسلہ جاری رکھا تھا، وہ حسینؑ کے دور میں بھی باقی رہا مگر اس کی رفتار سست تھی پھر امام زین العابدینؑ کے زمانے میں بھی جمود کم نہ ہو سکا البتہ امام باقرؑ نے اس درس گاہ کو زندہ کیا جس سے حضرت نعمان بن ثابت اور حضرت مالک بن انس نے استفادہ کیا پھر امام جعفر صادقؑ کے عہد میں بھی دونوں بزرگوں نے فیض حاصل کیا۔

علی کے جانشینوں کو تدریس کے یہ مواقع صرف اس لئے مل گئے کہ بنی امیہ کی حکومت میں انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ عبداللہ ابن زبیر کے خروج اور مختار ثقفی کے انتقام کے بعد آپس کی چپقلش اور محلاتی سازشیں شروع ہو گئی تھیں۔ پھر بنی عباس نے بنو فاطمہ کے نام سے اپنی تحریک چلائی لہٰذا اموی سادات کشی پر زیادہ توجہ نہ کر سکے۔ اس کے بعد ان کا استیصال کلی ہو گیا۔

بنی عباس کے برسر اقتدار آنے کے کچھ ہی دنوں بعد نفس ذکیہ میدان میں آ گئے اور ابراہیم کے مقابلے میں منصور دوانیقی کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن علی کے پیروؤں نے مفرورین کو قتل نہیں کیا اور بھاگی ہوئی عباسی سپاہ کچھ ہی دور جا کر پلٹ پڑی........ اس اثناء میں ابراہیم اچانک ایک تیر لگنے کے سبب گھوڑے سے گر گئے اور سادات میں ایک ہراس پیدا ہو گیا۔ انجام کار فتح شکست میں بدل گئی۔

منصور دوانیقی کو جب استقرار سلطنت کی طرف سے اطمینان ہوا تو اس نے اولاد رسولؐ پر ستم رانی کا آغاز کیا۔ یہ زمانہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا تھا چنانچہ وہ قید میں ڈال دیئے گئے اور انکی عمر کا بڑا حصہ زندان تنگ و تاریک میں گزر گیا

امام محمد باقرؑ نے اپنے دادا کی جس درس گاہ کو نشاۃ ثانیہ عطا کی تھی، وہ پھر اجڑ گئی اور اپنے سرپرستوں کی طرح ایک بار اجڑ کر پھر آباد نہ ہو سکی تاہم اس درس گاہ سے نکلے ہوئے تلامذہ کے کارناموں کے سبب اس کا نام لیا جاتا رہا اور چند برسوں کے اندر تدریس کے جو چراغ روشن ہوئے تھے، ان کی روشنی پھیلتی رہی۔

ابو حنیفہ کوفے کے باشندے تھے۔ مدینے اور دوسرے مقامات کے چکر لگا کر وہ کوفے واپس آئے تو انہوں نے خود اپنی درس گاہ کھولی۔ ان کے دل میں اہل بیت کی بڑی عظمت تھی۔ انہوں نے نفس ذکیہ کے حق میں بھی فتویٰ دیا تھا جس کی سزا انہیں منصور دوانیقی کے ہاتھوں بھگتنا پڑی لیکن ان میں حکومت سے ٹکر لیتے رہنے کی طاقت نہ تھی لہٰذا اس کے بعد انہوں نے ایک مصالحانہ رویہ اختیار کر لیا اور ہارون رشید نے انہیں امام اعظم اور عالم دہر کے خطابات دے کر شعبہ دینیات کا سربراہ بنا دیا۔

حضرت علیؑ کے حلقہ بگوش پہلے دن سے اعلان کر رہے تھے کہ خلافت و امامت دنیا و دین کے علیحدہ علیحدہ مناصب ہیں مگر اس کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ آج خلیفہ ہارون رشید کا عمل اس کی تصدیق کر رہا تھا کہ شیعان علی سچے ہیں .... پھر مامون نے امام ابو حنیفہ کے شاگردوں امام ابو یوسف اور الشیبانی سے امام ابو حنیفہ کے نظریات اور فتاوے مرتب کرا کے اس کا نام فقہ حنفیہ رکھا اور اس کے پیروؤں کو اہل السنت والجماعت کہہ کر پکارنے کی ہدایت کی جبکہ مامون خود واصل بن عطا کا مقلد رہا، کئی نسلوں تک عباسی تخت خلافت سے مسلک اعتزال کی تبلیغ کی جاتی رہی۔

حکومتوں نے اسلام کے خال و خد بدل کر اس کی صورت بگاڑ دی تھی اور اس کو اہل بیت رسالت کی اجارہ داری سے نکال کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا پھر بھی امامت ان کے لئے خدائے بخشندہ کی دین تھی اور فقہ اسلامی گھر کی بات۔

مامون نے دمشق کے پہلے خلیفہ کا خواب پورا کیا اور ان دونوں امتیازات پر سیاست کا لیبل لگا کر عباسی تاج و تخت سے ہمرشتہ کر لیا اس کے بعد تاریخ نے خدا ساز آئمہ کے مقابلے میں پہلے ایک خلافت ساز امام کو ایستادہ پایا پھر ان کی تعداد بڑھنے لگی ۔ پہلی منزل پر خلافت نے امامت کے وجود ہی سے انکار کر دیا تھا مگر امامت کی ساتویں منزل پر آکر خود امامت سازی کی اور آٹھویں منزل پر تو شیعان علی کے مدمقابل ایک جماعت لاکھڑی کی جس کا نام اہل السنت والجماعت تھا ۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ مامون نہ اس جماعت کو حق پر سمجھتا تھا اور نہ اس فقہ کو صحیح قرار دیتا کیونکہ ایسا ہوتا تو وہ خود اس کی پیروی کرتا اور اس کی اشاعت میں حکومت کے ذرائع استعمال میں لاتا مگر اس نے یہ کچھ نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس وہ خود معتزلی رہا اور مسلک اعتزال کو حدود خلافت میں رائج کرتا رہا ۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ فقہ حنفی کی تدوین اور آئمہ سازی دونوں خلافت کے سیاسی کھیل تھے جو آل محمدؐ کے خلاف کھیلے گئے تھے جس کے بعد آئمہ اثنا عشر کے مقابل حکومت ساز یا خود ساختہ امام پیدا ہوتے رہے ۔ شیعان علی کے سامنے ایک گروہ اہل السنت والجماعت کے نام سے آگیا اور امام ابو حنیفہ کی قیاسی فقہ ، اس فقہ کا بدل قرار پائی جو اہل بیت نبوت سے مختص تھی پھر اس فقہ کو بھی مامون نے فقہ جعفریہ کا نام دیدیا گویا وہ بھی اسی دور کی مرتبہ تھی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس پر آنحضرت یا علی کے عہد سے عمل ہوتا رہا تھا ۔

اسلام کے مسالک فقہ

اس کو ان حالات کا کرشمہ سازی کہنا چاہئے جو بنی امیہ نے پیدا کر دیئے تھے بنگاہ غائر دیکھا جائے تو

" بنی امیہ ، جن میں بہت سے قبول اسلام کے بعد بھی دل سے مشرک رہے اپنے آباؤاجداد کی طرح قسمت کے قائل تھے ۔" وہ جہم بن صفوان کے جبریہ نظریے کے معتقد تھے یا شاید اپنا نظریہ انہوں نے جہم بن صفوان سے پیش کرایا تھا کہ " انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں کیونکہ اس کے اعمال خدا کی طرف سے ہوتے ہیں ۔ نہ اس میں عمل کی قوت فیصلہ ہوتی ہے اور نہ ارادہ کرنے کی قوت ۔ وہ اپنے اعمال میں خدا کی حاکمیت علی الاطلاق کا محکوم ہے ، نہ قوت عمل رکھتا ہے ، نہ قوت ارادی اور نہ قوت انتخاب ۔ خدا اس کے اندر اسی طرح فعلیت پیدا کرتا ہے جس طرح وہ غیر ذی روح چیزوں میں کرتا ہے ۔ انسانی اعمال کی جزا و سزا کا دارومدار خدا کی حاکمیت مطلقہ پر ہے ۔" (۳)

خدا کی ذات و صفات کے بارے میں بنی امیہ کے الگ الگ قیاسی نظریات تھے ۔ ابو سفیان نے کھلم کھلا پیغمبری کو بادشاہی قرار دیا تھا اور اسلام کو وہ سیاست کا ایک کھیل سمجھتا تھا ۔ معاویہؒ ہوشیار ، کنجوس مگر ضرورت کے وقت بڑا فیاض ، بظاہر مذہبی امور کا پابند مگر اپنی حرص و آز کی تجاویز کی تکمیل کے وقت کسی شخص یا خدائی حکم کی پرواہ نہ کرنے والا ۔" (۴) اعمال و کردار کے لحاظ سے معاویہ نے خلافت اسلام کو صرف ملوکیت سمجھا اور روایت سازی کی بدعت کو دیکھ کر تو محتاط دائرے میں انہیں مسلمان ثابت کرنا بھی مشکل ہو جائے گا ۔

یزید بن معاویہ کا قول لوح تاریخ پر نقش ہے " نہ کوئی وحی آئی ، نہ فرشتہ نازل ہوا ، پیغمبری بنی ہاشم کا ایک کھیل تھا ۔"

عمر بن عبدالعزیز کے علاوہ بنی امیہ کے بیشتر خلفاء کے ہاتھوں قرآن کی بے حرمتی، ارکان اسلام کی تضحیک، اصحاب رسولؐ اور مقدس لوگوں کا قتل، کیا کچھ نہیں ہوا اور ان سب کے نتیجے میں بنی عباس کی فاطمی تحریک کامیاب ہوئی اور عباسیوں نے ان کا قلع قمع کر دیا۔

عباسی اس بساط فقہ سے اٹھ کر آئے تھے جو پیغمبرؐ اسلام نے اساسی طور پر مدینے میں بچھائی تھی لیکن استقرار حکومت کے لئے اصل حقداروں کی بیخ کنی بھی ضروری تھی۔ پھر فرمانروائی کے نشے نے روا و ناروا اور جائز و ناجائز کی تمیز بھی ختم کرا دی۔ انہوں نے اہل بیت کے عناد میں اسلام کو بھی پامال کر دیا۔ یہی ان کا طرہ امتیاز تھا۔ عداوت کے اندھے جذبے میں انہوں نے امامت کے مقابلے میں امامت، شیعان علی کے سامنے اہل السنت والجماعت، فقہ اسلامی کو فقہئہ جعفریہ کا نام دے کر اس کے مدمقابل فقہ حنفی لا کھڑی کی پھر بھی حنفی فقہ امامیہ سے زیادہ مختلف نہ تھی اختلاف صرف خلافت اور قیاسی استدلال کا تھا تو اس سے کوئی خاص تصادم نہ ہو سکتا۔

اس کا سبب یہ تھا کہ امام ابوحنیفہ اس شریعت کے مزاج داں تھے جس کی دعوت اہل بیت نبوت کی طرف سے دی جاتی تھی۔

امام مالک نے اس کے بعد اپنے مسلک کا اعلان کیا۔ وہ مدینے کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے حضورؐ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق معلومات فراہم کیں اور امام ابوحنیفہ کے استنباط اور استخراج کو مسترد کر کے اس مسلک کو رائج کیا جس کی نظیریں سیرت رسولؐ سے ملتی تھیں۔ قدامت پرستی اس مسلک کا شیوہ امتیاز تھا۔

اسی زمانے میں امام شافعی منظر عام پر آئے۔ انہوں نے فقہ امامیہ، حنفیہ، اور مالکیہ کے نچوڑ پر اپنی فقہ کی بنیاد رکھی جس میں اصلاح پذیری کی بڑی گنجائش تھی

امام احمد بن حنبل اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ "وہ اگرچہ امام شافعی کے شاگرد تھے لیکن انہیں نہ حنفی مسلک کی فریبیانہ آزاد منشی پسند آئی، نہ مالکی مسلک

کی تنگ خیالی، نہ شافعی مسلک کی پیش پاافتادہ روش، انہوں نے مملکت اسلامیہ کے لئے ایک نیا مسلک ایجاد کیا جو تمام و کمال حدیث پر مبنی تھا۔ امام ابوحنیفہ نے بیشتر متداول حدیثوں کو مسترد کر دیا تھا، امام احمد بن حنبل نے اپنے نظام فقہ میں بہت سی متناقص، مستبعد اور عقل کو خیرہ کر دینے والی روایتیں شامل کیں جو انمل بے جوڑ تھیں اور بدیہی طور پر گڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اسی وقت سے ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے طرفداروں سے ایک شدید چپقلش شروع ہو گئی۔"

"ابن حنبل نے صفاتیہ کے انتہاء پسندانہ خیالات کو قبول کیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ذات باری کو آنکھوں سے دیکھنا ممکن ہے۔ اس کی تمام صفات اس کی ذات سے علیحدہ ہیں۔ یہ بیان کہ خدا عرش بریں پر متمکن ہے، لغوی معنوں میں صحیح ہے۔ انسان کسی لحاظ سے مختار نہیں۔ ہر فعل انسانی بلاواسطہ فعل الہٰی ہے۔ انہوں نے علوم عقلی و تجربی کو مذموم قرار دیا۔" (۵)

مسلمانوں کی یہ چوتھی فقہ متضاد ہے فقہ امامیہ سے اور معتزلی نظریات سے اور محسوس ہوتا ہے کہ اس پر دور بنی امیہ کے جہم بن صفوان کی چھاپ ہے........ اس کے برعکس حضرت علیؑ فرماتے ہیں۔

"جس نے ذات باری کے علاوہ صفات مانے، اس نے خدا کا ساتھی مان لیا اور دوئی پیدا کی۔ جس نے دوئی پیدا کی اس نے وحدہ لاشریک کے جزو مان لئے اور جس نے جزو مان لئے وہ اسے پہچان نہ سکا اور جس نے نہیں پہچانا اس نے اسے اشارے کے لائق سمجھا اور جس نے اس کی طرف اشارہ کیا اس نے اسے محدود کر دیا اور جس نے محدود کر دیا وہ اسے شمار کے قابل سمجھا۔ جس نے یہ پوچھا کہ خدا کس چیز میں ہے اس نے اس کو چیز کے ضمن میں قرار دیا اور جس نے یہ کہا کہ وہ کس چیز پر ہے اس نے دوسرے مقام کو اس سے خالی سمجھا۔" (۶)

مسئلہ قضا و قدر بھی اسی ذیل میں ہے۔ عبید بن کعب نے حضور کی ایک حدیث بیان کی ہے، آپ نے فرمایا۔

"سب سے خوشحال شخص وہ ہے جو اپنی محنت سے خوشحال بنے اور سب سے بدحال شخص وہ ہے جو اپنے اعمال کے طفیل بنے۔"

جنگ صفین سے واپسی پر ایک شخص نے حضرت علی سے پوچھا۔

"شاید قضا مسلمانوں کو ملک شام سے لائی تھی؟"

آپ نے اس کو جواب دیا۔

"تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ تقدیر ربی اٹل ہے، اللہ کا کوئی حکم بدلا نہیں جا سکتا اگر ایسا ہوتا تو جزاء و سزا کے کوئی معنی ہی نہ تھے۔ ثواب کا وعدہ اور عذاب کی دھمکی دونوں بے سود ہوتے۔ خدا کی طرف سے نہ گنہگار پر نفریں اور نہ نیکوکار پر آفرین ہوتی اور نہ نیکوکار بدکار کے مقابلے میں جزاء کا زیادہ مستحق ہوتا اور نہ بدکار نیکوکار کی بہ نسبت زیادہ سزاوار۔ تم نے جو کہا، وہ کلمہ ہے اخوان الشیاطین کا، بت پرستوں کا، خدائے رحیم و رحمن کے دشمنوں کا، ان لوگوں کا جو باطل کی تائید کرتے ہیں اور ان لوگوں کا جو اپنے معاملات میں حق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں جیسے تقدیر پرست اور مجوسی۔ خدا نے انسان کو اختیار دیا ہے اور انہیں مایوس ہونے کو منع کیا ہے۔ اس نے انسانوں پر فرائض کو جبراً عائد نہیں کیا اور نہ صرف تفنن طبع کی خاطر پیغمبر بھیجے ہیں........ ایسا عقیدہ کافروں کا ہے۔ ان پر جہنم میں عذاب الیم نازل ہوگا۔"(۷)

حضرت علیؑ کی صراحت توحید اور مسئلہ قضا و قدر میں اہل بیت کے موقف کی ترجمان ہے جو کسی طرح امام احمد بن حنبل کے نظریات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ایسا ہی کچھ نظریہ معتزلہ کا بھی تھا۔

"وہ اپنی ذات میں عالم کل ہے، اپنی ذات میں حیی و قیوم ہے، اپنی ذات میں قادر مطلق ہے۔ اس لئے نہیں کہ علم، حیات اور قدرت اس کی صفات قدیمہ کی حیثیت سے اس میں موجود ہیں کیونکہ علم، حیات اور قدرت تو اس کی ذات کے اجزاء ہیں۔ اگر بصورت دیگر ان صفات کو وجود باری کی صفات قدیمہ خیال کیا جائے تو یہ متعدد قدیم وجودوں کو تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا........ کلام اللہ مخلوق ہے اور مخلوق ہونے کی حیثیت سے الفاظ اور اصوات کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔"

خدا، قرآن، جبر و قدر کے سلسلے میں معتزلی نظریات فقہ امامیہ کے قریب

تھے لیکن اس کے علاوہ بہت کچھ اختلافی تھا جس سے اسلام کی روح متاثر ہوتی لہذا شیعان علی کے لئے قابل قبول نہ تھی۔ مامون اعظم فقہ حنفی اور اہل السنت والجماعت کا معمار تھا اور مقصدی طور پر اس نے فقہ اسلامی اور اہل اسلام میں دو مستقل دھڑے بنا دیئے تھے لیکن خود اختیار کیا تھا واصل بن عطا کا مسلک اور اسی کی اشاعت اپنی حدود د سلطنت میں بھی کرتا رہا۔

اس کے بعد عہد متوکل سے پہلے تک تمام خلفائے عباسیہ معتزلی رہے۔ متوکل نے پہلی بار امام ابو حنیفہ کی فقہ کو اپنی سرپرستی میں رواج دیا پھر یہ مسلک اقتدار کے بل پر پروان چڑھتا رہا۔

امام ابو حنیفہ کے نظریات اساسی طور پر فقہ امامیہ کے بالکل برعکس نہ تھے۔ ان میں اتنی لچک تھی کہ ہر تصادم نظر انداز ہو سکتا تھا لیکن امام احمد بن حنبل کے واثق کی قید میں مرجانے کے بعد حنبلی زاویہ ہائے نگاہ جب حنفیت پر اثر انداز ہوئے اور خدا کے تصور کے ساتھ خلق قرآن کا اختلافی نظریہ بھی درمیان آگیا تو خلیج گہری ہوتی چلی گئی۔

عہد مامون میں کہا گیا تھا کہ قرآن مخلوق نہیں ہے تو بعض علماء نے سوال اٹھایا تھا کہ مخلوق نہیں ہے تو کیا خالق اور ابدی ہے؟ اور اگر ابدی ہے تو کیا خدا کی طرح ابدی ہے؟ اس پر خون خرابے کی نوبت آگئی تھی۔ اب خدا کو قابل دید بنا دیا گیا تھا۔ رسول اکرم کی زندگی کے دو رخ پہلے پیش کئے جا چکے تھے: ایک بحیثیت پیغمبر، دوسرا بحیثیت انسان۔ اس طرح توحید، رسالت اور قرآن سب مختلف فیہ بن گئے۔ کاش اہل السنت والجماعت صرف امام ابو حنیفہ کے نظریات کے پیرو رہتے!

بنی امیہ اور بنی عباس کے تمام ادوار میں اہل بیت نبوت پر زمین سخت اور آسمان دور رہا تھا اور علی کا ہر ماننے والا تقیہ میں چھپ چھپا کر جی رہا تھا اسی طرح ان کا مذہب بھی زندہ تھا۔ سنہ ۲۶۰ھ میں جب بارھویں امام غیبت صغریٰ میں چلے گئے تو ماحول پر پوری یاسیت طاری ہو گئی۔ اب نیابت رسولؐ کی ذہنی سرپرستی کا آسرا بھی ختم ہو گیا تھا۔ اسی دور سے تحفظ مذہب کی ذمہ داری علمائے امامیہ پر آپڑی روایات و احادیث کا ذخیرہ حضرت علی کے دور سے کیا جاتا رہا تھا لیکن خود اولاد

فاطمہؑ اور پیروان اہل بیت کی جانیں تک محفوظ نہ تھیں تو علمی سرمایہ کس طرح
محفوظ رہ سکتا اور دشمنوں کو بڑی عداوت تو اسی سے تھی لہذا دشمن کو جس مقام پر
جو کچھ ملا وہ اس نے نذر آتش کر دیا پھر بھی علی کے دیوانے قید خانوں میں اور سردار
تفاصیل بیان کرتے رہے اور کوئی نہ کوئی ان کو محفوظ کرتا رہا۔

بعض خاندانوں نے نسلاً در نسل، بعض نے انفرادی طور پر روایات صحیحہ
کو قلم بند کیا جن کو محمد بن یعقوب کلینی، شیخ ابو جعفر محمد طوسی، شیخ صدوق، شیخ
مفید، سید مرتضی، سید رضی اور علامہ مجلسی وغیرہ نے جمع کر کے مرتب کیا اور
وقت کی تدریجی ترقی کے ساتھ دوسرے بزرگ اس جہاد بالقلم میں شامل ہوتے
رہے لیکن وقت اب بھی اتنا مساعد نہ تھا کہ اپنی ہوئی تلواروں کی چھاؤں سے ہٹ
کر کوئی علمی اور دینی خدمت انجام دی جا سکتی۔ تاہم آئمہ کے نقوش قدم مشعل راہ
تھے۔ علماء کا کاروان ہدایت آگے بڑھتا رہا اور قلم کے نئے مجاہد اس میں شامل ہوتے
رہے۔

اس کے برعکس حنفی فقہ دوسری فقہوں کی آمیزش کے ساتھ حکومتوں کے
زیر سایہ پھلتی پھولتی رہی پھر اس پر ابوالحسن الاشعری کی اصلاحات نے رنگ آمیزی کا
کام کیا۔ ان کا اعتقاد تھا۔

"خدا کی صفات ازلی اور اس کی ذات میں موجود ہیں لیکن وہ محض اس کی
ذات نہیں بلکہ اس پر ایک اضافہ ہیں۔"

"ہر فعل یا تو خدا کی طرف سے صادر ہوتا ہے یا اس کا کسی شخص سے
ارتکاب خدا کی طرف سے مقدر ہوتا ہے۔ چونکہ یہ شخص اکتساب کی قابلیت رکھتا
ہے اس لئے وہ فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہ فعل اولاً خدا کا فعل ہوتا ہے پھر بندے کا"

ان نظریات کی مختلف تفسیریں کی گئیں مگر ان سے وضاحت کے بجائے الجھنیں پیدا
ہوتی رہیں پھر بھی یہ مسلک اثر و نفوذ میں دوسرے مسالک سے آگے بڑھ گیا۔ اس
کا سبب یہ تھا کہ وہ امام احمد بن حنبل کی فقہ سے کافی مطابقت رکھتا تھا۔ احناف نے
بھی اس کو قبول کر لیا تھا۔ ایوبیوں نے اس کو شام و مصر میں پھیلایا، عراق سے

ابن تومروت افریقہ لے گیا جہاں مراقش میں اس کی پذیرائی ہوئی اور مالکیوں کے
علاوہ کوئی اس کا مدمقابل نہ رہ گیا۔

پھر ابو حامد امام غزالی کی قدامت پسندی جہاں دیگر مسلکوں پر اثر انداز ہوئی
وہاں اس نے اشعریت کو بھی نہ چھوڑا اور فلسفے اور تصوف کو ایک نئی شاہراہ مل
گئی لیکن عقلیت اور سائنسی افکار پر بڑا برا اثر پڑا جس نے عقلی تخلیقات کے
دھارے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ امام ابن تیمیہ کی اصلاحات اس پر مستزاد
تھیں اور امام فخرالدین رازی کا اصلاحی فلسفہ اپنی نوعیت کا ایک اضافہ۔

خالص اسلامی نقطہ نظر سے مامون کی آزاد خیالی کو سراہا نہیں جا سکتا اور
بحیثیت خلیفۃ المسلمین اس کے دور کو مفید قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن مادی زاویہ
ہائے نگاہ سے اس نے انسان اور انسانیت کی بڑی خدمت کی۔ یونانی اور سنسکرتی
علوم عربی میں منتقل کرائے۔ فلسفہ، منطق، طب اور کیمیا سے مسلمانوں کو آشنا
کرایا اور حریت فکر کو اتنا آزاد کر دیا کہ اس کے بعد ہر دس بیس آدمی کے بعد جو
شخص ملتا، وہ اپنے معتقدات میں مختلف ہوتا، جس کے نتیجے میں کوئی مانی کے نظریے
سے متاثر نظر آتا کوئی ثنویت کا قائل اور کوئی مزدک کا مقلد۔

مسالک اسلام بھی شش جہت ہو گئے۔ متوکل نے حنفی فقہ کو سرکاری
مذہب قرار دے کر کسی حد تک یکسوئی کر دی تھی مگر لوگوں کے خیالات کو
زنجیروں میں جکڑ دینا اس کے امکان سے باہر تھا۔ انجام کار کبھی عقائد میں اتنی
سستی پیدا ہوئی کہ وہ گویا ناپید ہو گئے اور کبھی اتنی تیزی کہ آپس میں ٹکرانے لگے
اور مختلف العقائد لوگوں کا خون مباح قرار دیا جانے لگا۔

ایسے میں اخوان الصفا نام کی ایک انجمن بصرہ میں قائم ہوئی جو تعلیم یافتہ
اور روشن خیال لوگوں پر مشتمل تھی۔ اس انجمن نے فلسفہ اخلاق اور سائنس پر
رسائل شائع کئے۔ تمدنی اور سیاسی مضامین لکھ کر لوگوں میں انسانیت پیدا کرنے
کی کوشش کی۔ کچھ لوگوں پر اس کا اچھا اثر پڑا مگر مذہبی بے لگامی جو پیدا ہو گئی تھی،
وہ دور نہ ہو سکی۔

اسلام ایک بار اپنے در محکم سے بہکا تو ٹھوکریں ہی کھاتا رہا، کبھی ایک در

پر گیا کبھی دوسرے پر اور آخر میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ دریوزہ گری میں جو جو ملا اس کے مرکب کا نام اسلام پڑ گیا۔

ان سب سے قطع نظر ہمارے آئمہ کی تعلیمات کو دیکھا جائے تو توحید ، رسالت اور قرآن ہر ایک کیلئے اٹل فیصلے ہیں جو پہلی منزل سے چل کر بارہویں منزل تک غیر متغیر اور مستقل پائے جاتے ہیں ۔ فلسفے کے براہین اور منطق کا استدلال بھی انہیں ڈانواڈول نہیں کر سکتا۔ مقدر ساز بھی مرضی رب کا پابند اور بے عمل قابل پاداش ، اسرار کائنات کی جستجو فریضہ انسانی ، مادے کی تحقیق منجملہ مقاصد حیات ، آدمی کہیں مجبور کہیں مختار۔

اسی لئے رموز کائنات کے مخبر ثانی نے مسجد کوفہ میں اعلان کیا تھا۔

"پوچھ لو، جو پوچھنا ہے، قبل اس کے کہ میں تم میں نہ رہوں!"

مگر پوچھنے والے نے سوال بھی کیا تو کیا........؟

"میرے سر میں کتنے بال ہیں؟"

وہ پوچھتا تو زمین کی کشش، سیاروں کی چال، ذرات کے تجزیے کا اصول، سب کچھ اسے بتا دیا جاتا پھر نہ اخوان الصفا کی ضرورت ہوتی اور نہ کوئی اشعری ذہن انسانی کے ارتقاء کو قید کرنے کی ہمت کر سکتا۔

بہر حال جو کچھ ہونا تھا وہ ہوتا رہا لیکن علیؑ کے پیروؤں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

وہ ہر ذہنی تغیر سے بے نیاز ایشیا اور افریقہ کے مختلف گوشوں میں زندگی کی سانسیں لیتے رہے ۔ موسم بار بار بدلے مگر انہوں نے صرف اس سورج کی روشنی سے حرارت لی جو فاطمہ زہرا کے گھر سے طلوع ہوا تھا، جس کی حدت میں الٰہیات کا فلسفہ بھی تھا اور طبعیات و کیمیا کی روشنی بھی لہذا جہاں انہیں کچھ موقع ملا ، وہاں انسان اور انسانیت کی خدمات انجام دیں اور توحید کے پیغامات بھی سنائے ، کبھی علی الاعلان اور کبھی چہروں پر تقیہ کے نقاب ڈال کر........!

آغاز تاریخ

شیعیان علی کی تاریخ حضرت حجتؑ کی غیبت کے بعد معتمد عباسی کے دور سے شروع ہوتی ہے لیکن اس کا نقطہ آغاز اس دن کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے جب آنحضرت اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے یا پھر ۱۵ شعبان ۳۲۹ کو عہد متقی باللہ میں جب سے غیبت کبریٰ واقع ہوئی........ اور ایک لحاظ سے یہی تاریخ صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے بعد امام سے بالواسطہ استصواب یا استفتاء کا امکان ہی ختم ہو گیا تھا اور پھر امام آخر کا کوئی نائب بھی نہ رہا۔

نائب امام کی اصطلاح ایک شرعی مسئلہ ہے اور امور فقہ بلکہ مسائل فروعیہ میں کسی عالم یا اعلم کی تقلید اس کے ذیل میں آتی ہے لیکن تاریخی طور سے یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ غیبت کے بعد شیعہ علماء نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ منظر عام پر امامؑ کی عدم موجودگی پیروان علی بلکہ سوگواران حسین کو محسوس نہ ہونے دی۔ یہ لوگ حقیقتاً نائب امام کہے جانے کے اہل ہیں ان پر حضورؐ کی یہ حدیث صادق آتی ہے کہ میرے دین کے علماء انبیائے بنی اسرائیل کے برابر ہیں۔

ان علماء کو لغوی معنیٰ میں اگرچہ تاریخ ساز نہیں کہا جا سکتا لیکن وہ محافظ تاریخ ضرور تھے ۔ انہوں نے اس صراط مستقیم پر اپنے نقوش ثبت کیے ہیں جو ازل سے حضرت مہدی آخر زماں تک آیا تھا اور ابد تک جانے والا تھا پھر وہ فقہ کی ان آندھیوں کے سامنے سینے تان کر کھڑے رہے جو امام ابن تیمیہ ، حافظ ابن قیم اور انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں محمد بن عبدالوہاب کے جلو میں اٹھیں اور جن کی راست ضرب تعلیمات رسالت اور افراد خانہ زہرا پر پڑ رہی تھی۔

قلم کا مقابلہ قلم اور تلوار کا تلوار سے ہوتا ہے ، ہمارے عالموں کے پاس صرف قلم تھا جس سے وہ خدا کے فرستادہ آئمہ کے علوم لدنی کے خاکے بناتے رہے

اور شمشیر بکف کاغذی حربوں کا جواب دیتے رہے اور جب اکثریت کی یلغار، معقولات سے عاجز ہو کر اقتدار کا سہارا لے کر آگے بڑھی تب بھی آئمہ برحق کی تاسی میں پیچھے نہیں ہٹے، ظلم و تشدد میں صبر و استقامت کا دامن ہاتھ سے نہ دیا اور ہٹ دھرم دنیا اس پر بھی باز نہ آئی تو گردنوں کی شہہ رگیں تلوار کی دھاروں پر رکھ دیں جس کا سبق کربلا کے ریگزار سے ملا تھا اور جس میں آج بھی ہماری بقاء کا راز چھپا ہوا ہے۔

ایک طویل فہرست ہے ان شہیدوں کی، جن میں شہید اول حضرت شیخ شمس الدین ابو عبداللہ محمد، شہید ثانی زین العابدین علی، شہید ثالث حضرت قاضی نور اللہ شستری وغیرہ بھی شامل ہیں۔

جہاد بالسیف اساسی طور پر جنگ بدر سے شروع ہوا تھا اور کربلا سے جا کر مسلسل ہو گیا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام اس کی درمیانی کڑی تھے لیکن آپؑ مرشد ازل کی ہدایت کے پابند تھے لہٰذا آپ نے ابتداً حصول اقتدار کے لئے تلوار نہیں اٹھائی جس کی تاسی ہمارا ہر امام کرتا رہا......... لیکن جب تحفظ اسلام ناگزیر ہو گیا تو علیؑ کے قبضہ شمشیر پر رکھا ہوا آنحضرت کا ہاتھ خود بخود ہٹ گیا اور حیدرؑ کی ذوالفقار بے نیام ہو گئی۔

یہ جنگ تخت و تاج حاصل کرنے کے لئے نہ تھی بلکہ نائب رسول پر ابو سفیان کا بیٹا حملہ آور ہوا تھا اس لئے اس کو بتانا تھا کہ پیغمبر اسلام کے جانشین حق پر آنچ آتے دیکھ نہیں سکتے۔ اسی کی تقلید امام حسنؑ اور امام حسینؑ دونوں نے کی امام حسنؑ نے اعلان کیا کہ خلافت اگر جاہ و منصب کا نام ہے تو اس پر وہ ٹھوکر مار سکتے ہیں۔ ان کا کام تو اسلام کا تحفظ ہے جس کو وہ کرتے رہیں گے۔ امام حسینؑ کا بھی یہی نظریہ تھا انہیں اس خلافت کی ضرورت نہ تھی جس پر شاہی کا اطلاق ہوتا ہو مگر دین کی حفاظت ان کا مقصد تخلیق تھا لہٰذا دنیا کو بتانا ضروری تھا کہ بنی امیہ جس دین کو اسلام کہہ رہے ہیں وہ اسلام نہیں ہے، خود ان کا ساختہ و پرداختہ مذہب ہے۔

پھر محضر کربلا کے بعد تو یہ حقیقت بالکل آئینہ ہو گئی کہ اسلام دو ہیں: ایک وہ جو خانوادہ رسالت سے پیش کیا جاتا ہے، دوسرا وہ جس کو نام نہاد خلفاء ایوان شاہی سے پیش کرتے ہیں اور جس پر زر خرید علماء سے مہر توثیق ثبت کرائی جاتی ہے۔ اول الذکر اسلام کے پیرو آج تک شیعان علی کہے جاتے ہیں۔

ان کا یہ جرم کسی عہد میں قابل معافی نہیں رہا اور نتیجے میں ان کی بے نام زندگیاں تقیہ میں گزرتی چلی گئیں لیکن اکثر انہوں نے پابہ زنجیر ہو کر دار پر چڑھنے کے بجائے میدان جنگ کی موت کو ترجیح دی، کبھی زید شہید بن کر، کبھی نفس ذکیہ کے روپ میں اور کبھی مختار ابن ابی عبیدہ ثقفی کے نام سے۔

ہمارے آئمہ سے ایسی تحریکوں کا کوئی تعلق نہ تھا، وہ پیغمبر عرب کے جانشین تھے، ان کا تاج امامت اور تخت اسلام تھا۔ صبر و شکر ان کی سیرت اور قناعت ان کا خزانہ تھا لیکن کربلا کی درس گاہ کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ ظلم جب حد سے بڑھ جائے تو میدان میں سر کٹانا ہی فرض عین ہوتا ہے۔ حسینؑ کی یہ سیرت شیعوں کے لئے شمع ہدایت تھی اس لئے وہ ہر انتشار سلطنت میں گوشوں سے نکل نکل کر باہر آتے رہے اور اپنی زنگ آلود تلواروں کے وہ جوہر دکھاتے رہے کہ ان کی شجاعت آج بھی لوح زمانہ پر ثبت ہے۔ عرب و عراق، ایران و شام، مصر و مراقش میں جا بجا بنے ہوئے مقابر شہادت دیتے ہیں کہ ان میں وہ یگانہ روزگار محو استراحت ہیں جن کی تلواروں نے ٹڈی دل فوجوں کے منہ پھرا دیئے، جن کی بہادری نے رستم و سہراب کی یاد تازہ کر دی، جن کے کٹے ہوئے گلوں سے خیبر شکن کا نام بلند ہوتا رہا، جن کی شہہ رگوں سے چھوٹتے ہوئے خون کے فواروں نے فضائے بسیط میں ایک نام لکھ دیا! حسین ابن علی!

خلافت عباسیہ کے کمزور پڑنے پر شیعان علی کا یہ عمل تیز سے تیز تر ہو گیا۔ امام آخر غیبت صغریٰ میں جا چکے تھے اور علیؑ کے نام لیوا تین سو سال میں اس نکتے کو سمجھ چکے تھے کہ رسولؐ نے اشاعت اسلام کے لئے تلوار اٹھائی تھی تو انہیں بقائے اسلام اور تحفظ حیات کے لئے اس کا استعمال کرنا چاہیئے اور یوں بھی تقیہ کی زندگی کہاں تک گزارتے لہٰذا انہوں نے حکومت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا اور متوکل

کے بعد آہستہ آہستہ اپنے مسلک کا اعلان کرنے لگے ۔

حکومت کے کسی شعبے میں ان کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی اس لئے ایک تعداد تو تقیہ میں موجود رہی مگر عام زندگی میں گروہ اہل بیت کی حیثیت سے بھی ان کا وجود ہر شہر میں پایا جاتا رہا ۔ بالخصوص بغداد میں تو انہوں نے اپنا ایک محلہ قائم کر لیا تھا: کرخ ۔

آبادی کا یہ سلسلہ بہت پہلے سے چلا آرہا تھا لیکن مامون کے دور سے مختلف الاعتقاد لوگ مختلف شہروں میں جابجا پائے جاتے لہذا کسی کو معلوم بھی نہ ہو سکا کہ کس کا عقیدہ کیا ہے ؟ اس کا اندازہ دور حاضر میں اس جگہ سے لگایا جا سکتا ہے جہاں صرف ایک دو شیعہ رہتے ہوں اور باقی سب مختلف المسلک لوگ: وہ بھی ایسے جو شیعہ کی پرچھائیں بھی برداشت نہ کر سکتے ہوں تو شیعوں کو ظلم سے بچنے کے لئے اپنا عقیدہ چھپانا پڑے گا ۔ یہی صورت حال دور عباسیہ میں بھی برسوں سے چلی آ رہی تھی ۔

مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی سلطنت عباسیہ کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا اور حکومت کی حدود ایک دائرے میں مرکز کی طرف سمٹنے لگیں تو دوسروں کی طرح بعض شیعان علی نے بھی طالع آزمائی کی ۔ تین سو سال بعد پہلی بار وہ حالات پیدا ہوئے کہ اپنی کوئی حکومت بنا کر شیعی عقائد کا اعلان کیا جا سکتا

مسلک امامیہ کے ذیلی فرقے

ان فرقوں کے وجود میں آنے کا بنیادی نکتہ اقتدار تھا مگر ختم المرسلین کے نائب برحق نے امامت کے لئے جو خدائی منشور دیا تھا، اس میں اقتدار کے لئے تلوار اٹھانے کی گنجائش ہی نہ تھی لیکن خانوادہ رسالت پر ستم رانی کا سلسلہ بند ہونے کو نہ آتا تھا ۔ انجام کار بعض جوانوں کی رگوں میں خون اس تیزی سے دوڑنے لگتا کہ ہاتھ خود بخود قبضہ شمشیر پر پہنچ جاتا' وہ اجازت طلبی کی نگاہ سے بزرگوں کی طرف

دیکھنے لگتے، کوئی ہمت افزائی نہ ہوتی تو تلملا کر رہ جاتے اور اندر کی گھٹن انہیں چین لینے نہ دیتی ۔

حضرت علی علیہ السلام کی اولاد میں کربلا کے بعد محمد حنفیہ بزرگ خاندان تھے ، مگر وہ امام نہ تھے لہذا ان سے ایسی تحریک کی اجازت ملنے کا امکان تھا ۔ کسی امید پر ایک دن حضرت محمد حنفیہ کے آزاد غلام کیسان نے ان کی امامت کا اعلان کر دیا پھر اس کے ہم خیال بھی پیدا ہو گئے جو محمد حنفیہ کے بعد ان کے بیٹے ابوالہاشم کو امام مانتے رہے ۔

ابوالہاشم کے بارے میں کہا نہیں جا سکتا کہ ان کے دل میں کیا تھا ؟ مگر وہ ہشام بن عبدالملک کے مقرب بن گئے تھے اور دمشق میں ان کے عقیدتمندوں کا ایک بڑا حلقہ تھا جس سے خود کیسانی تو فائدہ نہ اٹھا سکے لیکن عباسی تحریک کے پہلے داعی محمد بن علی نے ابوالہاشم کی اچانک موت پر دمشق ہی میں اپنی امامت کا خفیہ اعلان کر دیا .... کہا جاتا ہے کہ ابوالہاشم اپنے مقلدین سے بنو فاطمہ کے لئے بیعت لیتے تھے ۔

محمد بن علی جب ۹۶ ھ میں ایک منصوبہ بنا کر ابوالہاشم کی پناہ میں پہنچے تو انہیں دنوں ہشام نے زہر دیکر ابوالہاشم کو مار ڈالا ، محمد بن علی نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے حق میں ان کی وصیت کا اظہار کر دیا اس طرح ابوالہاشم کی خفیہ تحریک عباسیوں کے ہاتھ آ گئی ۔

شیعوں کا دوسرا فرقہ زیدیہ ہے ۔ حضرت زید امام زین العابدین علیہ السلام کے بیٹے تھے ۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ سلسلہ امامت کے جاری رہنے تک تاج و تخت سے سادات کا کوئی سروکار نہ رہے گا اور اس کو حاصل کرنے کے لئے وہی تدابیر درکار ہوں گی جو اہل سقیفہ نے اختیار کی تھیں اس لئے امام زین العابدینؑ کے بعد انہوں نے اپنی امامت کا اعلان کر دیا اور اپنے مسلک سے ان نظریات کو وابستہ کر لیا جن پر اہل سنت کے مذہب کی بنیاد رکھی ہوئی ہے ۔ پیشوا کا انتخاب شوریٰ کے ذریعے ، افضل کی موجودگی میں مفضول کی اطاعت وغیرہ لیکن ان کا ساتھ دینے والوں نے صرف خاندان رسالت کے نام پر ان کی حمایت کی اور وہ

جوار کوفہ میں امویوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے ...... حضرت زید شہید کے عقائد کا مسئلہ اختلافی ہے لیکن یہ بات مسلم ہے کہ ان کی تحریک سے امام باقرؑ کا کوئی تعلق نہ تھا۔

یحیی بن زید امام جعفر صادقؑ کی مخالفت کے باوجود میدان میں آئے اور خراسان میں قتل ہوئے۔

پھر زیدیوں کا خاندان واسط اور خراسان میں سکونت پذیر ہو گیا جہاں مختلف اوقات میں ظلم و ستم کا شکار ہوتا رہا۔ صرف اس لئے نہیں کہ حضرت زید نے بنی امیہ کے خلاف خروج کیا تھا بلکہ اس لئے کہ وہ رسولؐ کی اولاد میں تھے۔

حضرت زید کے عقائد ان کی زندگی میں بھی قبول نہیں کئے گئے اور بعد میں تو ان کے مقلدین کی اکثریت اصل مسلک امامیہ پر آ گئی۔

تیسرا باغی فرقہ عباسیوں کا تھا جنہوں نے نفس ذکیہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے تحریک بنو فاطمہ کا آغاز کیا مگر کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہی اپنی حکومت کا اعلان کر دیا عقیدہ اور مسلک امور مملکت کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ ابو العباس اور ابو جعفر منصور نفس ذکیہ اور ابراہیم کا سہارا لے کر آگے بڑھے تھے مگر تخت پر بیٹھتے ہی ان دونوں کے دشمن جانی ہو گئے۔ امام جعفر صادقؑ نے زید شہید اور یحیی شہید کی طرح نفس ذکیہ اور ابراہیم کو بھی منع کیا تھا مگر نفس ذکیہ نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا اور تھا بھی ان کا وہ کردار کہ زہد و تقویٰ کو ان پر ناز تھا اور عبادت کو ان پر فخر ہو سکتا اسی لئے حضرت نعمان بن ثابت اور حضرت مالک بن انس نے ان کے حق میں فتاوے دئے تھے مگر دونوں درجات شہادت پر فائز ہو گئے۔

چوتھا فرقہ اسمٰعیلیوں کا ہے جو امام جعفر صادق کے بیٹے اسمٰعیل سے نسبت رکھتے ہیں۔ اسماعیل حضرت جعفر صادق کے بڑے بیٹے تھے جو امامؑ کی حیات ہی میں انتقال فرما گئے تھے اس لئے آپ کے بعد آپ کے دوسرے بیٹے حضرت موسی کاظمؑ منصب امامت پر فائز ہوئے جس کو ایک گروہ نے تسلیم نہیں کیا اس نے محمد بن اسمٰعیل کو امام مانا جو محمد المکتوم کہے جاتے ہیں۔

یہ فرقہ نہایت خاموشی سے اپنی تبلیغ کرتا رہا اس کے عقائد عام شیعوں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں لیکن سلسلہ امامت امام جعفر صادقؑ کے بعد ایک نئی شاخ میں منتقل ہو جاتا ہے اور اسی مناسبت سے آگے چل کر عقیدے میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ بھی بنی عباس کا نشانہ ستم تھے اس لئے بڑی احتیاط اور لگن سے اپنے نظریات کی اشاعت کرتے تھے۔

ان کے ایک داعی "عبداللہ ابن میمون" نے شام میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی جو عیسوی غناسطیت کا مرزبوم تھا۔ وہاں انہوں نے اپنے نظریوں کے خاکے میں رنگ بھرے اور "حمدان" کو اپنا ہم عقیدہ بنایا، جو قرمط کے نام سے اسلام کی تاریخ میں رسوا ہے۔" (۸)

حمدان المعروف بہ قرمط اور اس کے قبیلے پر وقتی طور پر اسمٰعیلیت غالب آ گئی لیکن جلد ہی اس نے یہ جوا کاندھوں سے اتار پھینکا اور عجیب و غریب عقائد کے ساتھ منظر عام پر آ گیا۔ کہا نہ جا سکتا کہ یہ فرقہ عیسائی تھا یا مسلمان مگر حقیقتاً عقائد کے لحاظ سے اسمٰعیلیوں سے بہت دور چلا گیا تھا اور اہل تشیع سے تو اس کا کوئی تعلق ہو ہی نہ سکتا، حالانکہ وہ محبت اہل بیت کا دعویدار تھا لیکن اہل بیت کی تعلیمات سے اس کا کوئی سروکار نہ تھا۔

قرامطہ نے العشاء اور البحرین کو اپنا مرکز بنایا۔ بعض شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ خارجی بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ ان علاقوں میں انہوں نے کئی قلعے فتح کر لئے اور ان سے نکل نکل کر عباسی علاقوں کو تاخت کرتے رہے۔ اکثر مقابلوں میں انہوں نے بنی عباس کو شکست بھی دی اور تقریباً ایک صدی تک امن و سکون غارت کرتے رہے۔

یہ غارت گری آہستہ آہستہ مکہ تک پہنچ گئی اور وہ سنگ اسود تک اٹھا لے گئے۔ ۳۱۷ھ میں انہوں نے حج کے دوران مکے میں حجاج کا قتل عام کیا۔

یہ نتیجہ تھا سلطنت عباسیہ کی کمزوری کا قرامطہ وبائی کیڑوں کی طرح عراق و عرب میں پھیل گئے تھے۔ آخر معتضد باللہ نے کئی سال کی مسلسل جنگوں کے بعد ان کا قلع قمع کیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اسمٰعیلیت مراقش میں اپنے قدم جما کر مصر کی

طرف بڑھ رہی تھی اور اس فاطمی خلافت کی داغ بیل پڑ رہی تھی جس نے خلافت عباسیہ کی طرح علوم و فنون کے چراغ روشن کئے۔

اسمٰعیلی عقیدے کے ذیل میں ایک عقیدہ وہ بھی آتا ہے جس کی تعلیم شیخ الجبل حسن بن صباح نے دی تھی۔ یہ عقیدہ سلسلہ امامت کی ایک منزل پر پہنچ کر اسمٰعیلیوں سے مختلف ہو جاتا ہے۔ دوسرے نظریات بھی اسمٰعیلیوں سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ شیخ عالم ہونے سے زائد فلسفی تھے۔ انہوں نے مانی و مزدک کے افکار کو جزو عقائد بنا دیا۔ توحید و رسالت میں انکا عقیدہ شیعوں سے ملتا جلتا ہے مگر علی کی ذات گرامی کے سلسلے میں وہ نصیریوں کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ فی زمانہ ان کے پیرو آغاخانی یا اسمٰعیلی کہلاتے ہیں۔

ان کے علاوہ بعض فرقے مختلف اوقات میں اور پیدا ہوئے لیکن وہ چل نہ سکے اور اب تو سارے کے سارے فرقوں کے صرف نام ہی رہ گئے ہیں۔ سب آہستہ آہستہ پھر مسلک اثنا عشری اختیار کر چکے ہیں، البتہ اسمٰعیلی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں جو بوہری کہے جاتے ہیں یا خوجے جو اپنے کو آغاخانی کہتے ہیں۔

اہل السنت و الجماعت میں بھی اکثریت حنفی فقہ کی پابند ہے جو دراصل خالص فقہ حنفی نہیں ہے بلکہ اشعریت اس کا جزو غالب ہے۔ اس کے بعد مالکی اور شافعی فقہوں کے پیرو پائے جاتے ہیں پھر امام احمد بن حنبل کے اہل حدیث اور نوزائیدہ مسلک وہابیت کے مقلد۔ ان کے علاوہ علی محمد باب کے بابی اور بہاوالدین کے بہائی بھی کبھی اہل السنت تھے مگر اب ان مسالک کے ماننے والے کم ہی رہ گئے ہیں البتہ ایک فرقہ قادیانی نمایاں طور پر موجود ہے جس کو خارج از اسلام قرار دیا جا چکا ہے مگر قادیانی اب بھی اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے ہیں۔

مسالک فقہ کی فکری بنیادیں

اسلام میں گروہ بندی اور فقہی اختلافات ایک عام آدمی کے لئے تحیر خیز ہیں کیونکہ اس مذہب کے نفاذ کو ابھی صرف چودہ سو سال ہوئے کسی طویل مدت میں نظریات کا مسخ ہو جانا تو عقل میں آ سکتا ہے اور اگر کوئی مذہب ایک خطہ ارض

سے دوسرے میں منتقل ہوا ہو تو بعد مکانی کا اثر انداز ہونا خارج از فہم نہیں، جیسا کہ نصرانیت یا بدھ مت کے لئے پیش آیا مگر اسلام تو ایک محدود علاقے میں اپنے محور بدل بدل کر گھومتا رہا، اس میں تو اتنے تغیرات ہونا نہ چاہئے تھے، سامنے کا ایک سوال ہے کہ ایسا کیوں اور کیونکر ہوا؟

آنحضرت کی ایک پیشین گوئی مسلمانوں میں متفق علیہ ہے کہ میری امت میں بہتر فرقے ہوں گے جن میں ایک فرقہ ناجی ہوگا یعنی صرف وہی فرقہ حضور کی تعلیمات پر عمل کرے گا باقی صراط مستقیم سے بہک جائیں گے......... چنانچہ ہر فرقہ دعویدار ہے کہ اس کا مسلک حضورؐ کے ارشادات کے مطابق ہے۔ اگر ان ارشادات کی تحقیق ہو جائے تو غلط اور صحیح کا پتہ چل جائے گا لیکن تحقیق ہو تو کیسے ہو؟ ہر فرقے نے روایات کے مطابق ہی اپنے مذہب کو تشکیل دیا ہے۔

اور روایات اتنی متضاد ہیں کہ جن روایتوں کو ایک فرقہ معتبر کہتا ہے، دوسرا ان کو غیر معتبر قرار دیتا ہے لہذا یہ مسلم ہو جاتا ہے کہ صحیح روایات میں فرضی روایتیں شامل کر دی گئی ہیں۔ اس کے لئے بھی ایک فریق دوسرے کو متہم کرتا ہے۔ اہل سنت کا کہنا ہے کہ شیعوں نے روایتیں گڑھ کے مشہور کرادیں اور جامعین روایات نے انہیں بھی اپنے مجموعوں میں شامل کر لیا لہذا بات یہاں پر ٹھہرتی ہے کہ اصل مجرم وہ ہیں جنہوں نے مقصدی طور پر وضع روایات کی مہم شروع کی اور رسول کی زندگی اور اسلام میں اتنے پہلو پیدا کر دیئے کہ آج ہر صداقت مشکوک معلوم ہوتی ہے۔

اس کا سراغ اگر کچھ لگ سکتا ہے تو تاریخ کے تدریجی ارتقاء سے اور اس حقیقت تک پہنچ کر کہ روایت سازی سے کس کی اغراض وابستہ تھیں؟ نتیجے پر پہنچنے سے قبل کسی روایت کو جھوٹا قرار نہیں دیا جا سکتا۔

تحقیق کا یہ سلسلہ اس وقت سے شروع کرنا پڑے گا جب آنحضرتؐ نے ایک بوڑھے سامی کی پشت پناہی میں اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا۔ آپ کے ایک پہلو میں سن رسیدہ سہی مگر وقت کی حسین ترین ملیکتہ العرب تھی، دوسری جانب ایک بچہ

آپکی انگلی پکڑے ہوئے ھا۔

اس سامی نے سفر و حضر، سوتے جاگتے، اندر باہر ہر جگہ اور ہر طرح پیغمبر اسلام کی حفاظت کی، بالفاظ دیگر اسلام کے لئے اپنی جان و مال، نسلی روابط اور پورا خاندان داؤں پر لگا دیا مگر خود علی الاعلان اسلام قبول نہیں کیا تاکہ قریش منہ کی مروت میں اس پر ہاتھ اٹھا نہ سکیں اور وہ اپنے بھتیجے کا سینہ سپر بنا رہے۔ اس دور اندیشی اور تدبر کو تقیہ کا نام دیا جا سکتا ہے اور اس کو اس انداز پر بھی سوچا جا سکتا ہے کہ اگر ابو طالب اول دن کھلے بندوں اسلام قبول کر لیتے تو کیا وہ خدمات انجام دے سکتے جو انہوں نے دیں؟ اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اکثر بزرگوں کے آباء کافر تھے لہذا انہیں یہ ضد پیدا ہوئی کہ ابو طالب کو بھی کافر ثابت کیا جائے۔ یہ پہلا جھوٹ ہے جو مقصدی طور پر بولا گیا۔ اس کے خلاف عبداللہ ابن عباس نے شہادت دی کہ مرتے وقت انہوں نے اپنے کانوں سے ابو طالب کو کلمہ طیبہ پڑھتے سنا تھا تو کہہ دیا گیا کہ عبداللہ ابن عباس کا سن بارہ تیرہ سال تھا اس لئے شہادت معتبر نہیں .... حالانکہ یہی ابن عباس دور خلافت میں فقہی گتھیوں کو سلجھاتے ہیں تو ان کے فیصلے کو حرف آخر سمجھ لیا جاتا ہے .... بات یہ ہے کہ ابو طالب کا اسلام اگر تسلیم کر لیا جاتا تو کوئی دوسرا بزرگ مسلم اول ہونے کا دعویٰ کر ہی نہ سکتا۔ اگر مسلمانوں سے یہ سوال کیا جائے کہ کیا ابو طالب کی تجہیز و تکفین اسلام کے طریقے پر نہیں ہوئی؟ تو اس کا جواب ملتا ہے کہ رحمتہ للعالمین کا کرم تھا۔ اس ہٹ دھرمی کے پس پردہ صرف اس جذبے کی کارفرمائی نظر آتی ہے کہ علیؑ کے باپ کو بھی اپنے باپ کی طرح غیر مسلم قرار دے دیا جائے لہذا یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ دشوار نہیں کہ ابو طالب کے سلسلے کی ہر روایت وضعی اور جھوٹی ہے اس کا راوی کون ہے؟ مورخین جانتے ہیں۔

اس کے بعد حضور کی عملی زندگی میں بیٹے نے باپ کی جگہ لی۔ لوگ کہتے ہیں کہ حضور نے ابو طالب کے احسان کا بدلہ چکایا اور علی کو ہر منزل پر آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اس گستاخی کو برداشت کر لیا جائے تو اسکا جواب کیا ہے کہ خیبر میں حضرت ابو بکر بھی جا کر لڑے اور حضرت عمر بھی مگر ہزیمت یاب ہوئے۔

خندق میں عمرو ابن عبدود کی للکار پر مسلمانوں نے سانسیں روک لی تھیں کہ عمرو تیز سانس کی آواز سن کر اندر نہ آجائے، مقابلے پر گئے تو علی ہی۔ دوسری جنگوں کی تفاصیل بھی ایسی ہی کچھ ہیں جس سے یہ مسلم ہو جاتا ہے کہ شجاعت میں علیؑ کا کوئی ہم سر نہ تھا۔

اب بات آتی ہے علم و فضل کی تو ادوار خلافت اسکی شہادت دیتے ہیں کہ سب کی نظر میں علی کی افضلیت یکساں تھی۔ حضور نے دوسرے صحابہ کی قدر افزائی بھی فرمائی تھی لیکن اس میں کسی کو شک نہ تھا کہ آنحضرت کے بعد علی ہی ان کے جانشین ہوں گے جس کو بدیہی اسباب کی بنا پر ایک حلقہ ماننے کو تیار نہ تھا لہذا پہلے سے اس کی تیاری کر رہا تھا کئی روایتیں ذہنی طور پر تصنیف کر لی گئی تھیں اور ان کے راوی بھی متعین ہو چکے تھے حالانکہ علی کی فضیلت میں جو آیات نازل ہوئیں ان میں سے اکثر پر مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

آیہ تطہیر، آیہ صالح المومنین، آیہ ولایت، آیہ مباہلہ، آیہ نجوی، آیہ اذن واعیہ آیہ اطعام، آیہ بلّغ۔

حضورؐ نے جو کچھ فرمایا، وہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے کوئی مورخ انکاری نہیں۔

حدیث مدینہ، حدیث سفینہ۔ حدیث نور، حدیث منزلت، حدیث خیبر، حدیث خندق، حدیث طیر، حدیث ثقلین، حدیث غدیر۔

دوسرے بزرگوں کے شرف میں بھی اسی طرح کے اقوال ملتے ہیں جن کی حقیقت کو تاریخ نے واضح کیا ہے لیکن رسول اکرم کی زندگی میں مورخین کے بیان متواترہ سے واضح ہوتا ہے کہ رسول کے فوراً بعد کوئی علیؑ کا مثیل نہ تھا لہذا فی الوقت دو مفروضہ حدیثوں کو مستقبل کی بنیاد بنایا گیا جن کو اگلی احادیث کا پیش خیمہ کہا جا سکتا ہے۔

ایک میں قائد کا انتخاب شوریٰ کے ذریعہ طے کرنے کی بات ہے۔ دوسری میں "حدیث توریث" کے ذریعہ اولاد رسول کو وراثت سے محروم کیا گیا ہے۔

اس حدیث کی خصوصیت یہ ہے کہ حدیث اس تحریری ہبہ نامے کی تردید

کرتی ہے جو باغ فدک کے سلسلے میں حضورؐ نے اپنی بیٹی فاطمہ زہرا کو لکھ کر دیا تھا اور جس پر بعض صحابہ کی قلمی شہادتیں بھی تھیں۔ گویا آنحضرت نے پہلے تو بیٹی کو ہبہ نامہ لکھ دیا پھر عائشہ کی موجودگی میں حضرت ابو بکر سے کہہ دیا کہ انبیاء کی میراث اس کی اولاد کو نہیں ملتی......... ہم جس پیغمبرؐ کو مانتے ہیں، وہ کبھی دروغ مصلحت آمیز کا مرتکب بھی نہیں ہو سکتا۔ نعوذ باللہ!

پہلی حدیث عرب کے رسم و رواج کے مطابق ہے کہ قبیلے کی قیادت کے لئے بزرگ افراد اپنے لائق اور بزرگ ترین فرد کو منتخب کرتے تھے۔ اس وضعی حدیث پر عمل کرنے کے لئے پہلی بیوفائی اور گستاخی یہ کی گئی کہ رسولؐ کی میت چھوڑ کر انتخاب کے لئے چلے گئے۔ کل تک جو لوگ مقرب ترین تھے، ان سے مشورہ تو در کنار منہ تک نہ چھوا، دوسری چالاکی یہ کی گئی کہ رسول کے قبیلے کو انتخاب میں شرکت کا موقع نہیں دیا گیا کہ ان لوگوں کے جانے سے منصوبہ کہیں الٹ نہ جائے بنی ہاشم اپنے سردار اور پیغمبرؐ کو بے گور و کفن چھوڑ نہ سکتے، یہ سب کو معلوم تھا لہذا حضورؐ کی حالت خراب ہوتے ہی سارے انتظامات کر لئے گئے تاکہ آپ کی رحلت ہوتے ہی اپنا کام کر لیا جائے۔

حدیث توریث کا علم صرف ابو بکرؓ کو تھا، حضرت عمرؓ کو بھی نہ تھا، ان سے روایت ہے۔

"جب ابو بکر نے اس حدیث کا ذکر کیا تو علیؑ اور عباس نے ان کو جھوٹا، گنہگار اور خائن ٹھہرایا۔" (۹)

صحیح مسلم کی یہ روایت کسی شیعہ کی گڑھی ہوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جب آل فاطمہ کا دور ابتلاء شروع ہو چکا تھا اور اسی مقصد کے لئے حدیث کی تصنیف بھی کی گئی تھی۔ اس کے بعد یا تو علیؑ اور عباس کو دروغ گو ٹھہرایا جائے یا حدیث کو وضعی قرار دیا جائے۔ حدیث کے وضعی ہونے کے ثبوت میں حضرت عثمان، حضرت عمر بن عبد العزیز اور بعض خلفائے بنی عباس کو پیش کیا جا سکتا ہے جن کا عمل باغ فدک کے سلسلے میں حضرت ابو بکر کے عمل کی نقیض ہے۔ ان حالات میں یہ فیصلہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ وضعی احادیث کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوا؟

شوریٰ کا شاخسانہ صرف علی کو محروم خلافت کرنے کے لئے کھڑا کیا گیا تھا کیونکہ ایکبار کے بعد یہ اصول ہمیشہ کے لئے پس پشت پڑ گیا۔ حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کو نامزد کر دیا اور حضرت عمر نے چند افراد کو اختیار دیدیا کہ وہ کسی کو منتخب کر دیں۔ انہوں نے حضرت عثمان کو چن لیا اور ان کے بعد عوام نے خود حضرت علی کو یہ منصب قبول کرنے کے لئے مجبور کر دیا جنکو حضرت معاویہ نے حکمت عملی سے عالم نماز میں قتل کرا دیا اور خلافت پر قبضہ کر لیا۔

اس طرح مسلمانوں کی بادشاہت ابو سفیان کے خاندان میں منتقل ہو گئی انہوں نے روایت سازی کے سلسلے میں جو کار نمایاں انجام دیئے ہیں وہ ثبوت کے محتاج نہیں۔ متعصب مورخ کو بھی اعتراف ہے کہ آیات کی غلط تفسیر، احادیث کی تنسیخ و تصنیف پر ایک دینار فی حدیث مقرر تھا اور اہل بیت کے خلاف روایت بیان کرنے پر انعام و اکرام سے بھی نوازا جاتا تھا۔ یہ حدیثیں اصل حدیثوں سے ٹکر لیتی ہیں۔ اس طرح برسوں کی مسلسل جدوجہد میں ہزاروں احادیث کا ذخیرہ ہو گیا مسلمانوں کی تاریخ بھی مرتب ہوئی اور وہ مسالک فقہ تشکیل پائے جو ہمیشہ ایک دوسرے سے متصادم ہوتے رہیں گے۔

جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے، ان کا شیرازہ ادوار خلافت سے بکھرنا شروع ہوا تو کوئی ربذہ میں، کوئی مدائن میں، کوئی دمشق میں داعی اجل کو لبیک کہہ گیا اور حضرت معاویہ کے عہد سے تو ان پر عرصہ حیات ہی تنگ ہو گیا۔ ان کے لئے حقیقی احادیث کا محفوظ رکھنا ہی مشکل تھا تو وہ جھوٹی روایتیں کس طرح گڑھتے اور انہیں ضرورت بھی کیا تھی البتہ مدح علی میں غلو کر سکتے تھے تو زبان کس جگہ کھولتے؟ منظر عام پر آتے تو جان سے ہاتھ دھوتے۔ ایک کام شیعوں نے ضرور کیا کہ سردار اور قید خانوں میں ثنائے اہل بیت کرتے رہے مگر اس میں بھی حق ثناء ادا نہ کر سکے کیونکہ زبان کھلتے ہی انہیں ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جاتا تھا۔

اس سلسلے میں ایک نکتہ اور قابل غور ہے کہ جامعین میں بیشتر بزرگوں نے تو شیعہ راویوں سے احادیث کو لیا ہی نہیں اور جنہوں نے ان کی روایتوں کو نقل کر دیا ہے، انہیں غیر معتبر کہہ دیا جاتا ہے لہذا روایت سازی میں شیعوں کو

حصہ دار بنانا انتہائی بڑا ظلم ہے جو چودہ سو برس تک ان پر روا رکھا گیا ہے۔ عدل و
انصاف شاید دنیا سے اٹھ ہی گیا ہے کہ ماضی کی تاریخ بھی شیعوں کے خون سے
رنگین کی جاتی رہی اور اب اپنے ہی خون کا الزام بھی انہیں کے سر رکھا جاتا ہے۔
روایتیں جس کے خلاف گڑھی گئیں، واضع روایات بھی انہیں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔
پہلے اقتدار کی ہوس نے دین اور حامیان دین کا خون کیا، اب اکثریت کا
زعم عزت کی موت سے ڈراتا ہے۔ تخت سلطنت پر متمکن جابر بادشاہوں نے اگر
ستم کے پہاڑ توڑے تو انہیں حکومت ملی لیکن حکومتوں کی پروردہ نسلیں کیوں اپنے
کو ظالموں کی اولاد ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہیں؟

اسلام کی تاریخ سے کسی کو ذرا بھی مس ہوگا تو وہ تسلیم کرے گا کہ رسول
اکرم کے بعد ان کی اولاد جور و ظلم کا شکار ہوتی رہی۔ ہم انہیں مظلوموں کے نام
لیوا ہیں، اکثریت ہمیں ستاتی رہی تو ماضی کے ظالموں میں اس کا شمار ہوگا۔ رہ گئی
بات ہمارے عقائد کی تو خلافت کا قصہ ایک گئی گزری بات ہے۔ اس کو کیوں
چھیڑا جائے جو ہم سچی بات کہہ دیں بہتر یہ ہوگا کہ مذہبی مسائل میں پہلے حنفیت،
مالکیت، شافعیت، حنبلیت، اشعریت اور وہابیت آپس میں فیصلے کر لے، توحید،
رسالت اور قرآن کی بابت اپنے نظریات کو ہم آہنگ بنالے، تب ہم پر معترض ہو۔

شیعوں کا مسلک شروع ہی سے واضح ہے۔ اس میں کوئی ترمیم و اضافہ نہ
کبھی ہوا ہے اور نہ ہونا ممکن ہے وہ لوگ جو شیعہ دشمنی میں تو متحد ہیں لیکن ان کے
درمیان نہ توحید مشترک ہے، نہ شخصیت رسول کی نوعیت، نہ قرآن کی حیثیت و
مفہوم، وہ شیعوں پر کس منہ سے اعتراض کرتے ہیں۔ کیا خلافت اسلام کی ان
بنیادی چیزوں سے زیادہ اہم ہے کہ خدا، محمد مصطفیٰؐ اور کلام الہیٰ کو مجروح کرنے
والا تو قابل معافی ہے اور خلافت کا منکر گردن زدنی۔ دعوت عام ہے احناف ذوی
الاحترام کے لئے کہ ہر مسلک کے خدا اور رسول کی معرفت حاصل کریں۔ انہیں
خود پتہ چل جائے گا کہ کس کا عقیدہ کیا ہے؟ اور یہی عقیدہ فرقہ ناجی کا فیصلہ بھی کر
دے گا۔

امامت شیعوں کے اصول دین میں ہے، سنیوں میں خلافت کو کوئی خاص

اہمیت حاصل نہیں لہذا صرف خلافت کے ماننے نہ ماننے پر نجات اخروی کا انحصار
نہیں ہو سکتا اور اگر یہ بات اتنی ہی اہم ہے تو بنی امیہ کے ستر ہزار منبروں سے علیؑ
پر تبرا کرانے والے کے خلاف کوئی فتویٰ دینا پڑے گا کہ وہ جہنمی ہے یا جنتی؟

تاریخ کی شہادت میں تبرا کا رواج

"حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ ہم لوگ یعنی انصار منافقوں
کو حضرت علی کے بغض سے پہچانتے تھے۔"

"حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے جناب رسولؐ خدا کو یہ
فرماتے ہوئے خود سنا کہ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ وہ مجھ پر اور جو کچھ میں لایا ہوں
اس پر ایمان رکھتا ہے درانحالیکہ وہ علیؑ سے بغض رکھتا ہے، تو ایسا شخص جھوٹا ہے،
ہرگز مومن نہیں ہے۔"

حضرت علیؑ سے منافق محبت نہیں کرے گا اور مومن بغض نہیں رکھے گا
(امام احمد بن حنبل)

تبرا بنی امیہ کے بیشتر خلفاء نے جاری رکھا پھر دور بنی عباس میں بھی اکثر
اس کا اعادہ کیا جاتا رہا۔ کیا بگاڑا تھا علیؑ نے ان سیاہ قلب فرمانرواؤں کا، یہی نا کہ
انہیں اس تجلی کی چھاؤں میں چلانا چاہتے تھے جس نے پہلی بار غار حرا کو منور کیا تھا
.... اظہار بیزاری بنی عباس کے بعد سلجوقیوں، ایوبیوں اور غزنیوں میں کیا جاتا
رہا۔ تاریخ نے شہاب الدین غوری کے فخریہ الفاظ لوح زمانہ پر ثبت کر دیئے ہیں کہ
غور میں کبھی علیؑ اور اولاد علیؑ پر تبرا نہیں کیا گیا۔

سلاطین مابعد نے اس میں اتنی تبدیلی کر دی کہ علیؑ کے بجائے علی کے
پیرووں کے نام لینے لگے۔ تبرا کی محفلوں میں ایک شخص منبر پر جاتا اور آواز لگاتا:
"فلاں ابن فلاں رافضی بود!" حاضرین جواب دیتے: "بر پدرش لعنت"!
صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی گئیں اور علیؑ کے غلام یہ سب دیکھتے سنتے رہے۔ آخر وہ
وقت بھی آیا کہ انتزاع سلطنت عباسیہ پر جہاں مختلف حصوں میں جداگانہ سلطنتیں
قائم ہوئیں، وہاں ایشیا و افریقہ میں بعض چھوٹی بڑی شیعہ حکومتیں بھی وجود میں آگئیں

شیعوں کے ضبط کا پیمانہ ہر عہد میں چھلکتا رہا تھا مگر انہیں مجبوری تبرا کی آوازیں سننا پڑی تھیں۔اب جو اظہار خیال کی آزادی ملی تو انہوں نے بھی نام بدل بدل کر تبرا خوانوں کی آوازوں میں آوازیں ملادیں اور ان کی آواز بازگشت اطراف وجوانب میں سنائی دینے لگی۔

تقریباً چار سو سال تک صرف ایک مصرعہ پڑھا گیا تھا، اس پر دوسرا مصرعہ لگا تو شعریت پیدا ہو گئی اور سامعین پھڑک اٹھے۔اب شیعوں پر ہتک صحابہ کا الزام بھی لگا دیا گیا۔گویا ان صحابہ کی قیمت تھی اور علیؑ کی کوئی قیمت نہ تھی۔

شام کی حدود مملکت میں حضرت علیؑ پر تبرا ہونے کا تذکرہ بیشتر مورخین نے کیا ہے۔اسی لئے امام حسن نے معاویہ سے صلح کی شرائط میں یہ شرط رکھی تھی کہ آئندہ حضرت علیؑ پر سب وشتم نہ کیا جائے گا لیکن حضرت معاویہ نے عمل اس کے بالکل برعکس کیا اور علی سے برءت کو اپنی بیعت کا جزو بنا لیا۔اس پر بنی تمیم کے ایک شخص نے کہا۔

"امیرالمومنین!ہم زندوں کی اطاعت کریں گے مگر مردوں سے برائت نہیں کریں گے۔"

"اس پر معاویہ زیاد کی طرف متوجہ ہوا اور بولا، "اس شخص کو اچھائی کی وصیت کر۔" (۱۰)

چنانچہ اس کو زیاد نے اسی وقت قتل کر دیا۔تاریخ کی روشنی میں وقت کی تدریجی ترقی کے سا تھ جب صحیح معنی میں پہلی شیعہ حکومت قائم ہوئی تو معزالدولہ نے خلفاء کی قوت ختم کرنے کے ساتھ ہی بغداد میں شیعیت کی تبلیغ شروع کر دی اور ۳۵۱ھ میں بغداد کی جامع مسجد کے پھاٹک پر لکھوا دیا۔

"معاویہ بن ابی سفیان، غاصبین فدک، امام حسن رضی اللہ عنہ کو روضہ نبوی میں دفن کرنے سے روکنے والوں، حضرت ابوذر کو جلاوطن کرنے والوں، عباس کو شوریٰ سے خارج کرنے والوں پر لعنت ہو۔"

"خلیفہ میں اس بدعت کو روکنے کی طاقت نہ تھی، کسی سنی نے رات کو یہ عبارت مٹادی۔معزالدولہ نے پھر لکھوانے کا ارادہ کیا لیکن اس کے وزیر مہلبی نے

مشورہ دیا کہ صرف معاویہ کے نام کی تصریح کی جائے اور ان کے نام کے بعد "والظالمین لآل محمد" یعنی آل محمد پر ظلم کرنے والوں کا فقرہ بڑھا دیا جائے۔معزالدولہ نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ غالباً تبرا کی اس منافقانہ شکل کی ابتداء اسی سے ہوتی ہے۔" (۱۱)

شاہ معین الدین ندوی نے اس کو "منافقانہ شکل کی ابتداء" لکھا ہے لیکن وہ بھول گئے کہ یہ منافقانہ شکل صدیوں پہلے سے پائی جاتی تھی اور اس کو منافقین اول کی ممتاز فرد ابوسفیان کے بیٹے نے تشکیل دیا تھا جس کی جوابی ابتداء معزالدولہ نے کی، دوسرے اس کی تقلید کرتے رہے، خود شاہ ندوی اپنی تاریخ میں لکھ کر بھول گئے "امیر معاویہ نے اپنے زمانے میں برسر منبر حضرت علی پر سب وشتم کی مذموم رسم جاری کی تھی اور ان کے تمام عمال اس رسم کو ادا کرتے تھے۔" (۱۲)

فاضل مورخ کا بنی بویہ پر یہ الزام کھلے ہوئے تعصب پر مبنی ہے۔معزالدولہ سے شیعوں کو صرف یہ فائدہ پہنچا تھا کہ ان پر ظلم وستم بند ہو گیا تھا اور انہیں مذہبی آزادی مل گئی تھی لیکن اتنی ہی آزادی سنیوں کو بھی حاصل رہی اور جب دونوں میں لڑائی ہوئی تو حکومت نے کسی کا ساتھ نہیں دیا۔

دو طرفہ تبرا سو ڈیڑھ سو برس تک ہوتا رہا پہلا مصرعہ کچھ دنوں بعد اپنے محبوب صحابہ کو بچانے کے لئے حذف ہو گیا اور تھوڑے عرصے تک صرف دوسرا مصرعہ ہی پڑھا جاتا رہا اور جب مسلمان اقتدار سے بالکل محروم ہو گئے تو دوسرا مصرعہ بھی بند ہو گیا۔

پچھلی صدی سے یہ تبرا اس طرح شروع کیا گیا ہے کہ رسول کے پارہ ہائے جگر پر کیچڑ اچھالی جا رہی ہے۔مشرکوں اور بے دینوں کے اعمال کو عین اسلام قرار دیا جا رہا ہے لہذا ضرورت ہے تاریخ کی وہ تصویر دکھانے کی جس سے خیر و شر کے خال وخد واضح ہو سکیں تاکہ ہماری جوان نسل اپنے ماضی سے ناآشنا نہ رہے۔

تاریخ کے تدریجی ارتقاء پر ایک اچٹتی نظر ڈالی جائے تو ہر منزل پر الٹا چور کوتوال کو ڈانٹتا نظر آتا ہے۔سقیفہ میں جو کچھ ہوا، اگر اتنے ہی پر اکتفاء کی جاتی تو عرب کے بوریہ نشین پیغمبرؐ کی اولاد صبر و شکر کے ساتھ رشد و ہدایت کی فیض

رسائی کر کے اپنی نسلیں گزارتی رہتی اور شاید دنیا کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ فرمانروائی کی وراثت کس نے چھینی اور سجادہ نبوت کی نمائندگی کا اعزاز کس کو ملا؟ لیکن ستم یہ ڈھایا گیا کہ بزدلوں کو بہادر، جھوٹوں کو سچا اور منافقوں کو کھرا مسلمان ثابت کرنے کے لئے ظلم کا دروازہ کھول دیا گیا اور جب خلافت مدینے سے دمشق اور بغداد منتقل ہو گئی تو صادقین کا قتل عام معمول بن گیا۔

عوام آج کی طرح شروع ہی سے ان پڑھ اور کانوں کے کچے رہے ہیں اور ان کا حافظہ ہمیشہ کمزور پایا گیا ہے۔ یہ راز گنبد اسلام کے نام نہاد پروہتوں کو معلوم تھا لہذا اول دن سے ایک پالیسی اختیار کی گئی کہ صرف سامنے کی باتیں عام لوگوں کو بتائی جائیں رنگ بھری ہوئی تصویر منظر عام پر لائی جائے، اصلی خال و خد کسی کے سامنے آنے نہ پائیں۔ اس پالیسی پر آجتک عمل ہو رہا ہے اور اپنے محبوب کرداروں کو بدلی ہوئی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ظلم کا ذمہ دار مظلوم کو، قتل کا سزاوار مقتول کو ٹھہرایا جاتا تھا اور آج بھی ٹھہرایا جاتا ہے۔ ہر مورخ پہلے تو حالات کو مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر بن نہیں پڑتا تو لکھ دیتا ہے کہ یزید جب ننگی تلوار لئے گھوم رہا تھا تو امام حسینؑ اس کے سامنے گئے کیوں؟ واقعہ حرہ کے سلسلے میں شاہ معین الدین ندوی لکھتے ہیں۔

"مدینتہ الرسول کی تباہی یزید کا سب سے سیاہ کارنامہ ہے لیکن اس کی ذمہ داری سے اہل مدینہ بھی بری نہ تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ انکی مخالفت کا انجام یہی ہوگا اگر ابتداء سے وہ بیعت کر لیتے تو اس کی نوبت نہ آتی۔" (۱۳)

اس سے ایک تو خلافت کی قیمت، دوسرے بیعت کی وقعت کا اندازہ ہوتا ہے اور سب سے اہم نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ خلیفہ یزید ہو یا اس سے بھی برا ابو لہب کا سا کوئی بھی، اگر اس کی طرف سے جان و مال کے خطرات ہوں تو صداقت کا راستہ چھوڑ دینا چاہیئے یا پھر تقیہ کر لینا چاہیئے۔

بات تھی مسلمانوں کے قائدانہ انداز کی کہ وہ عوام کو تاریکی میں رکھ کر بقائے حکومت کی تدابیر کر رہے تھے۔ مقصد صرف اتنا تھا کہ لوگ روشنی کے

اصل منبعوں کو دیکھنے نہ پائیں لہذا پہلے تو ان سب کو راستے سے ہٹا دیا پھر ان پر تبرا شروع کرا دیا تاکہ شام و عراق کے انجان مسلمان غلط فہمی میں پڑے رہیں کہ یہ لوگ اتنے برے تھے تب ہی تو ان پر لعنت کی جاتی ہے۔

ان حقائق کو اکثر قدیم مورخوں نے قلم بند کیا ہے لیکن اس صدی کے تاریخ نگار جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو چھ سو برس تک ہونے والے اس شرعی ظلم کو چھپا جاتے ہیں تاکہ ان دشمنان اسلام کو مسلم ثابت کر سکیں۔

شاہ معین الدین ندوی نے تو یہ بھی غضب ڈھایا کہ صلح حسن کی آٹھ نو شرطوں میں سے صرف تین کو لکھا کیونکہ ساری شرائط لکھتے تو تبرا نہ کرنے کی شرط بھی لکھنا پڑتی .... یہ عوام کو انجان رکھنے کی وہی پالیسی ہے جس کی حیثیت پہلے سیاسی پتھر کی ہے۔

کیا حضرت علیؑ اور ان کی اولاد اطہار کے ساتھ ایسا سلوک کرنے والے درگزر کے لائق ہیں اور اگر کوئی اس کے بعد بھی علیؑ کے ان دشمنوں کی قصیدہ خوانی کرتا ہے تو کیا اس کو علیؑ کا نام لینے کا حق رہ جاتا ہے۔ یقیناً وہ بھی علی کا دشمن قرار پائے گا اور علی کے دشمن کے لئے حضور کی جو حدیث ہے، وہ اس پر صادق آئے گی

یہ تبرا سننے والے سنتے رہے اور اس کی آواز تاریخ میں گونجتی رہی مگر جب شیعوں نے اسی لب و لہجہ میں طبع آزمائی کی تو بدعت کے فتاوے صادر ہونے لگے۔ کیا چار سو سال تک یہ بدعت داخل ثواب تھی جو مفتیوں کے منہ کھل نہ سکے۔ اب شیعہ بولے تو سب چیخ پڑے۔

مکاتیب فقہ کی تاریخ کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ شیعہ فقہ اور شیعان علیؑ پہلے روز سے موجود تھے اور دو سو برس تک تعداد سے قطع نظر مسلمانوں میں صرف دو گروہ پائے جاتے تھے، ایک علی کا دوست، دوسرا علی کا دشمن۔ محور ہر دو صورت میں علی ہی تھے۔ ظلم و ستم کے دھارے میں شیعوں کی تعداد تو نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی لیکن شیرازہ بندی اور اصول و فروعات فقہ پر کوئی حرف نہیں آیا کیونکہ ہر زمانے میں شیعوں کا امام موجود تھا جس کو ارباب سیاست نے محسوس کیا تو مقابلے کی فقہ اور امام دونوں بنا دئے اور اہل السنت والجماعت کو تشکیل کر کے

مقابل لا کھڑا کیا۔

اس کے بعد کوئی ہم کو جھوٹا کہے تو اس کو سوچنا چاہیئے کہ آنحضرتؐ سے مامون کے دور تک ہم جو کہتے آئے تھے، کیا اب اس کے علاوہ کچھ کہتے ہیں؟ اس کے برعکس دور بنی امیہ میں جہم بن صفوان نے کیا کہا، عہد عباسیہ میں واصل بن عطا کے نظریات کیا تھے اور پھر حکومت ساز امام اعظم کے ارشادات قابل غور ہیں لیکن موخرالذکر دو سے ہمارے اختلافات اتنے شدید نہ تھے، جتنے آگے چل کر الاشعری اور امام احمد بن حنبل کی تنسیخات و ترمیمات سے ہوئے۔ گویا ان بزرگوں سے قبل نظریات احناف صحیح نہیں تھے اور وہ بھی ہماری ہی تعریف میں آتے تھے۔

اور وہابی مسلک کے بعد تو شیعہ بھی جھوٹے اور سنی بھی جھوٹے۔

لوگ سنیوں کو بڑا بھائی کہتے ہیں جو غلط ہے، وہ شیعوں سے ڈیڑھ سو برس چھوٹے ہیں اور وہابی ایک ہزار سال چھوٹے۔ یہ اور بات ہے کہ وہابیوں نے ہم دونوں کے نظریات توحید، اعتقاد رسالت اور دوسرے ہر موقف کو باطل قرار دیدیا ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ اسلام سے یا ان کا رشتہ ہے یا ہمارا کیونکہ اتنے تضادات کی موجودگی میں دونوں کو صراط مستقیم پر تو کہا نہیں جاسکتا۔

مذاہب امامیہ، حنفیہ، مالکیہ، اور شافعیہ بالترتیب افکار قدیمہ کے حامل ہیں۔ ان میں فقہ امامیہ پونے دو سو سال زیادہ پرانی ہے۔ ان سب نے توحید، رسالت اور قرآن کے بارے میں جو نظریات پیش کئے ہیں، وہابیت ان سب کی تردید کرتی ہے جو محققین سلف کے لئے ایک للکار ہے۔ بالفاظ دیگر ہزار گیارہ سو برس تک مسلمان جس خدا کو اور جس رسول کو مانتے رہے، وہ غلط تھا۔ اتنی طویل مدت کے بعد ایک شخص ان حقائق کو سمجھ سکا۔ جس کی تہہ تک صدیوں کی بساط پر پھیلے ہوئے جید عالم پہنچ نہ سکے۔ ان میں حاملان علم لدنی ہمارے آئمہ بھی تھے، فاضلان روزگار علماء بھی اور یگانہ عصر فقہا بھی۔

ابن رشد اور ابن عربی وغیرہ ان کے علاوہ ہیں اور عظیم المرتبت صوفیاء ان پر مستزا ہیں فکری اور تاریخی تحقیق کا یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا رہا تو خدا مادیت کے سانچے میں ڈھل جائے گا اور یزید پیغمبری کی سطح کو چھونے لگے گا۔

پیغمبری یا فرمانروائی

مورخین نے حضور سرور کائنات کی شخصیت کے مختلف پہلو متعین کئے ہیں: ایک بحیثیت پیغمبر، دوسرے فرمانروا، تیسرے بحیثیت سپہ سالار وغیرہ۔

تدبر، اصلاح معاشرہ اور تبلیغ انسانیت پیغمبرانہ شخصیت کے ذیلی محاسن ہیں، فرماں روائی بھی اس کا ایک رخ قرار پاتی ہے لیکن اس میں دنیاوی سیاست کا اضافہ کر دیا جائے تو اس کی نوعیت بالکل الگ ہو جاتی ہے اور وہ ہوس اقتدار اور ملک گیری کی تابع ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں شروع ہی سے مسلمانوں کے دو نظریے رہے ہیں۔ ایک اسلام کو خالص روحانی مذہب قرار دیتا ہے اور تشکیل مملکت کو اشاعت مذہب کی ناگزیر ضرورت سمجھتا ہے، دوسرا اس کو خالص سیاسی مذہب۔ یہ دونوں نظریے رسولؐ کی حیات طیبہ سے ذہنوں میں پرورش پا رہے تھے اور حضورؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی کھل کر سامنے آگئے۔

سپہ سالار اور اس طرح کی دوسری حیثیتیں ہوس فرمانروائی کا شاخسانہ ہیں مگر اس سے حضورؐ کی صلاحیت ذات پر روشنی پڑتی ہے اور آپؐ کی پیغمبرانہ بصیرت کا حسن کہی جاسکتی ہے۔

اس طرح ضمنی تفصیلات کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو پیغمبر اسلام کی صرف ایک اضافی حیثیت رہ جاتی ہے اور وہ ہے فرمانروائی کی۔ جس کو صحیح معنیٰ میں تبلیغ دین کا مقصدی لوازمہ قرار دینا بے محل نہ ہوگا۔

غزوات نبوی دو غیر متوازن یا کسی حد تک متوازن طاقتوں کے معرکے تھے جو بغض اسلام کے سبب وقوع میں آئے تھے۔ اس میں کی ہر جنگ بانی اسلام پر مسلط کی گئی تھی اور آپ نے ہر جنگ میں اسلام کو بچانے کے لئے تلوار اٹھائی، از خود کسی بے خطر اور متمدن گروہ پر حملہ نہیں کیا تھا۔ لہذا پیروان اسلام کے

لئے لڑائی کی شرط اولین یہ قرار پائی کہ مقابلہ صرف اس وقت کرنا چاہئے جب مذہب
پر آنچ آرہی ہو ۔ اسی اصول پر جانشین پیغمبر علیؑ ابن ابی طالب اور ان کی برگزیدہ
اولاد نے شمشیر کا استعمال صرف اس وقت کیا جب اسلام نے انہیں اپنے تحفظ کی
دعوت دی ۔

یہی سنت آج تک پیروان علیؑ کا لائحہ عمل رہی ہے ۔

ایک پیغمبر ! ایک فرماں روا ۔

یہ دو حیثیتیں اگرچہ ایک دوسرے کا جزو لا ینفک رہی ہیں لیکن مادی آنکھ
سے جب فرمانروائی تو دیکھا گیا تو ابوسفیان حضرت عباس سے کہے بغیر نہ رہا ۔
"تمہارے بھتیجے کی بادشاہت تو بہت عظیم ہو گئی ہے !"
"یہ بادشاہت نہیں پیغمبری ہے ۔" حضرت عباس نے ایک تہدید آمیز
جواب دیا جس میں حضرت ابو طالب کے لب و لہجہ کی کھنک تھی ۔ ابوسفیان نے
ابو طالب کی للکار بار بار سنی تھی مگر کبھی سر نہیں جھکایا تھا، آج اطاعت قبول کر لی
کیونکہ اب پیغمبری کے ساتھ فرمانروائی بھی شامل تھی ۔ ابو طالب کی سرپرستی میں جو
دعوت اسلام دی جاتی رہی تھی، اس میں صرف دین کی چمک تھی، کوئی دنیاوی جاہ
وجلال نہ تھا، آج وقت کے ماتھے پر محکومیت کے بجائے حاکمیت کی لکیریں دکھائی
دے رہی تھیں جو العرب الجاہلیہ کے مدبر کی نگاہ سے چھپی نہ رہیں اور اس نے سر
اطاعت خم کر دیا ۔

ابوسفیان کا قبول اسلام خلوص سے خالی تھا ۔ اس میں بے چارگی اور
مصلحت اندیشی کے سوا کچھ نہ تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نے پیغمبری کے بجائے
فرمانروائی کا طوق اپنے گلے میں ڈالا تھا جو مستقبل میں دمشق کے تاج و تخت کی
زینت بنا ۔

اس طرح روایتی عرب کے دو نمائندہ کرداروں نے دو جداگانہ حیثیتوں
سے ہادی اسلام کے سامنے گردنوں کو جھکا دیا ۔ ایک نے پیغمبری کی خاموش تائید کر
کے دوسرے نے برائے نام کلمہ پڑھ کر بلکہ ایک نے پیغمبر مان کر اور دوسرے نے

ریگزار کا فرمانروا سمجھ کر ۔ یہی دو کردار جو ابو طالب اور ابوسفیان کے ناموں سے
موسوم تھے، اسلام کے تاریخ ساز کہے جا سکتے ہیں ۔

پیغمبرؐ کی حیات طیبہ ہی میں ذہنی طور پر دونوں قسم کے کردار دانستہ یا
نادانستہ طور پر پرورش پاتے رہے اور دور رسالت ختم ہوتے ہی کھل کر سامنے
آ گئے ۔ ایک نے ابو طالب کی تاسی کی، دوسرے نے فرمانروائی پر قبضہ کر لیا اور پیغمبرؐ
کی سیرت و کردار سے، چونکہ، اس کا کوئی تعلق نہ تھا لہذا اس نے خود اپنی سیرت کو
سیرت پیغمبرؐ کا نام دیدیا اور اس کا نام اسلام رکھا ۔

اس اسلام کو اساس بنانا آسان نہ تھا کیونکہ دور نبوی کے برگزیدہ اصحاب
زندہ تھے لہذا ایک اقدام تو یہ کیا گیا کہ ایسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا
جو جھوٹ کو جھوٹ کہنے کی جرأت کر سکتے، باقی لوگوں کو خرید لیا گیا ۔ دوسرا اہم قدم
یہ اٹھایا گیا کہ ارشادات پیغمبر کو مسخ کرنے کی مہم شروع کر دی گئی اور وضعی
اسلام کی تائید میں اتنی حدیثیں گڑھی گئیں کہ اصل اقوال مشتبہ نظر آنے لگے جن
کی تصاویر آج کے مجموعہ احادیث میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں ۔

ان ریشہ دوانیوں کا ایک اجمالی خاکہ "ہمارے عقائد : ہماری تاریخ"
میں پیش کیا جا چکا ہے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وفات ختمی مرتبت کے بعد مسلمانوں کے دو
نمایاں گروہ سامنے آ گئے : ایک گروہ سیرت پیغمبر کے ورثہ داروں کا ہمنوا، دوسرا وہ
جس کے دنیاوی مفادات حکومت کے ساتھ تھے ۔

"سقیفہ بنی ساعدہ" میں ساٹھ ستر یا زائد سے زائد سو آدمیوں کا یک طرفہ
فیصلہ ریگزار کی پوری قوم کے مستقبل پر مہر لگا نہ سکتا جبکہ یہ لوگ مختار مجاز یا
نمائندے بھی نہ تھے لیکن مشکل یہ آ پڑی تھی کہ حضرت رسالت مآب کا جانشین
اقتدار کے لئے تلوار بھی اٹھا نہ سکتا جس کے بہت سے اسباب تھے ۔ ان اسباب کو
امیر المومنینؑ نے مختلف مواقع پر واضح کیا ہے ۔ ایک بدیہی بات یقینی طور پر یہ
سامنے آتی ہے کہ شکست خوردہ عنصر اسلام سے رو گرداں ہو جاتا ۔ وہ گروہ، جو خود
پیغمبر کی میت کو پیٹھ دکھا کر چلا آیا تھا، وہ اقتدار سے محرومی کے بعد تعلیمات پیغمبر
کی پرواہ کیا کرتا ۔ پھر خانہ جنگی کا ایک حاصل یہ بھی ہو سکتا کہ کہنے والے حکمرانی کو

مقصود پیغمبری قرار دے دیتے اس لئے حضور اکرمؐ کی ذات گرامی کو جس نے جیسا سمجھا تھا، اس نے اسی پر اکتفاء کی ۔ ایک تبلیغ و اشاعت اسلام میں لگ گیا، دوسرے نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی لیکن دوسرا گروہ مسائل دینی میں پہلے کا محتاج رہا۔

یہ صورت حال تاریخ اسلام کا سب سے بڑا المیہ ہے جس کی واضح تصویر جنگ صفین میں نظر آتی ہے: ایک طرف صنادید عرب کے نمائندے کا بیٹا معاویہ بن ابی سفیان حرص و آز کے حواریوں کو لئے ہوئے، جبر و تشدد کے پرچم اڑاتا ہوا آگے بڑھتا نظر آتا ہے، دوسری طرف کلید بردار کعبہ اور پشت پناہ محمدؐ کا جانشین علی ابن ابی طالب، جس کے جلو میں نبیؐ کے مقدس صحابی عمار یاسر، ابوایوب انصاری عدی بن حاتم، حجر بن عدی اور ان سب کے ساتھ کہن سال اویس قرنی نشان اسلام کے سائے میں علامت ایمان کے طور پر فروکش ہیں ۔

میزان جنگ کے دونوں پلڑے اسلام کا توازن و تقابل کر رہے تھے لیکن حقیقی اسلام صرف ایک طرف تھا جس کا فیصلہ وقت نے کر دیا اور دلوں کے کھوٹ نے بھی اس کے خلاف زبان ہلانے کا یارا نہ دیا تو یہ کہہ دیا گیا کہ معاویہ سے خطائے اجتہادی ہو گئی ۔ ایک غیر مجتہد کا اجتہاد بھی تاریخ کا عجوبہ ہے!

حضرت عمرؓ نے بھی کئی اجتہادات کئے تھے: حی علیٰ خیر العمل اذاں سے نکلوا کر صبح کی نماز میں الصلوۃ خیر من النوم کا اضافہ کرایا، متعہ کو حرام قرار دیا، رمضان میں تراویح کو رائج کیا، دور رسولؐ کے معمولات میں ترمیم و تنسیخ نہ صرف گستاخی تھی بلکہ بدعت بھی یا شرع اسلامی اسے جو کچھ بھی کہے لیکن ان تمام باتوں کا کوئی نہ کوئی جواز تو پیش کیا جاتا ہے جو اگرچہ صرف تاویل ہے مگر اس کو غور طلب تو کیا جا سکتا ہے، خلیفۂ وقت سے معاویہ کی بغاوت کی تاویل ممکن نہیں ہے جس کا کم سے کم نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ وہ نام نہاد اسلام کھل کر سامنے آگیا جس پر اب تک شرافت ظاہری کے پردے پڑے ہوئے تھے ۔

پھر مسجد کوفہ میں امیرالمومنین کی شہادت کے بعد امام حسنؑ کو خلافت ظاہری سے دست برداری پر مجبور کر دینا حضرت معاویہ کی شاطرانہ سیاست کا

کارنامہ ہے ۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مسلمانوں کی تاریخ کا خونچکاں باب ہے ۔

اب دمشق کی خلافت مدینے کی دینی اجارہ داری سے آزاد ہو چکی تھی ۔ اسلام پر امویت غالب آچکی تھی ۔ دارالفتاویٰ شام کے اسلحہ خانے کا ایک جزو تھا ۔ مدینے میں اولاد رسول پر عرصہ حیات تنگ تھا ۔ علیؑ کا نام لینا گردن زدنی تھا ۔ نام لیا جاتا تو حکومت کے منبروں پر سب و شتم کے لئے ۔ کوفہ، بصرہ اور دمشق میں محبان علی کا خون ارزاں تھا جس کسی پر اہل بیت کی دوستی کا شبہ بھی ہوتا اس کو دار پر چڑھا دیا جاتا ۔ کوئی علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے ناموں پر بچوں کے نام نہ رکھ سکتا ۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ نام نہاد مملکت اسلامیہ اولاد رسول اور اس کے ماننے والوں سے خالی ہو چکی تھی ۔ اہل ایمان یا تو تقیہ چلے گئے تھے یا دور دراز قبائل میں جا بسے تھے ۔

پھر کربلا کے بعد اہل بیت کی اسیری نے خوابیدہ حمیت اسلامی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ۔ انتقام کی ایک لہر اٹھی اور عین الوردہ میں محبان اہلبیت کے خون کی ندیاں بہہ گئیں لیکن انتقام کی دوسری کروٹ نے مختار ابن ابی عبیدہ ثقفی کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور قاتلان کربلا چن چن کر قتل کر دیئے گئے ۔

حضرت علی ابن ابی طالب کے نقش قدم پر چلنے والے آئمہ حصول اقتدار کی خاطر تلوار اٹھانے کے قائل نہ تھے لیکن امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں ایک نظیر پیش کر کے اس نکتہ کی صراحت کی کہ اسلام پر آنچ آتی ہو تو جہاد باللسان فرض عین بن جاتا ہے اور رسن بستہ ہو کر تہہ تیغ ہو جانا ہی جہاد نہیں بلکہ انجام سے بے نیاز ہو کر اسلام دشمن طاقتوں سے ٹکرا جانا بھی ایمان کا راستہ ہے ۔

اس نظیر نے محبان علی کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی روانی کو تیز کر دیا تھا اور مظلوموں کے انداز فکر میں یہ تبدیلی آگئی تھی کہ باطل کی للکار کا جواب میدان جنگ میں سرفروشی سے دینا بھی آئمہ کی تاسی ہے ۔ امام وقت کی طرف سے اس کی اجازت ملنا ممکن نہ تھا کیونکہ اس کے پس پردہ استقرار حکومت کا مقصد ڈھکا چھپا نہ رہتا اس لئے سب سے پہلے حضرت محمد حنفیہ کا سہارا لیا گیا اور مختار نے میدان میں آکر اولاد رسول کے قاتلوں سے انتقام لے کر امام زین العابدینؑ کی

خوشنودی حاصل کی پھر برسوں کے فصل سے حضرت زید شہید نے تلوار کو بے نیام کیا

حضرت زید شہید کی سرفروشی فقہی اور سیاسی اعتبار سے جو حیثیت بھی رکھتی ہو مگر مظلوم بنی ہاشم نے دشمنان دین کو یہ بتادیا کہ علیؑ کے وارثوں کی تلوار ابھی زنگ آلود نہیں ہوئی ہے، وہ تہذیب کے علم بردار بھی ہیں اور رزم گاہ کے شیر بھی

پھر یحییٰ بن زید نے شمشیر آبدار کی ایک آزمائش کی اور آپ کے جسد بے سر نے شہر پناہ کے کنگرے پر لٹک کر اپنی سربلندی کا اعلان کیا۔

زندہ رہنے کی اس جدوجہد میں چھوٹے بڑے گروہ سروں سے کفن باندھ کر مختلف مقامات پر مختلف اوقات میں نکلتے رہے اور عرب و عراق، شام و ایران میں اپنے نقوش دوام ثبت کرتے رہے۔

کہنے کو حد نظر بلکہ حد علم تک شیعہ علی نام کا کوئی متنفس کہیں پایا نہ جاتا جو جس مقام پر بھی تھا، دھیمی دھیمی سانسیں لیتا ہوا جی رہا تھا، انفرادی اور اجتماعی قتل کا معمول جاری تھا پھر بھی آئے دن کہیں نہ کہیں چند سید زادے بے چارگی سے قتل ہونے پر ظالموں کو موت کا مزہ چکھا کر مرجانے کو ترجیح دیتے تھے۔

یہ جذبہ کربلا سے سیدانیوں کے کارواں کے ساتھ چلا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے دور دور تک پھیلتا گیا تھا کہ نہ اس کو مسلم بن عقبہ کی خون آشامی روک سکی اور نہ حجاج بن یوسف کی درندگی۔ واقعات کربلا کا بیان اس کو مسلسل ہوا دیتا رہا اور وہ غیر محسوس طریقے پر کسی دبی ہوئی چنگاری کی طرح اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ معلوم اس وقت ہوتا جب کوئی گروہ کسی چھوٹے بڑے آتش فشاں کی طرح اچانک پھٹ پڑتا، ظلم کی پرچھائیوں کو جلاکر خاکستر کر دیتا اور چند شہیدوں کی قبریں بناکر سرد پڑجاتا۔

اموی دور میں اس کی رفتار نے شدت اختیار نہیں کی لیکن مختلف مقامات پر بغاوتیں ہوتی رہیں - مروان بن حکم کے ہاتھوں بنی امیہ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد، بادی النظر میں میدان شیعان علی سے خالی ہو چکا تھا، مگر ایک انقلابی روح

دلوں میں پرورش پا رہی تھی اور دور دراز چھوٹے چھوٹے حلقوں پر شیعوں کا اثر بڑھ رہا تھا جس سے فاطمی تحریک کو فائدہ پہنچا۔ یہی تحریک آگے چل کر عباسی تحریک بن گئی۔

بنی عباس بنی ہاشم کی ایک شاخ تھے اور انہوں نے قصر معاویہ کے خاکستر پر اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی مگر اصل حقدار کے لئے وہ اپنے پیش رووں سے زیادہ سفاک ثابت ہوئے اور انہوں نے امویوں کا استیصال کلی کرنے کے بعد علویوں کے ساتھ پہلا جیسا یا اس سے بدتر سلوک روا رکھا لیکن ۱۰ محرم ۶۱ھ کو فضائے کربلا میں امام حسینؑ کا جو استغاثہ بلند ہوا تھا، اس کی آواز بازگشت ہر شیعہ کے کان میں گونج رہی تھی، وہ تعداد کا احساس کئے بغیر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرا جاتے اور اپنے خون سے تاریخ کا ایک روشن عنوان تحریر کر جاتے۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں جو انصاف کا خون کیا گیا، روح اسلام کے گلے پر چھری پھیری گئی اس سے اقتدار طلب اور جاہ پسند حلقے کو ایک راستہ مل گیا اور آنے والی نسلوں تک ایک پیغام پہنچا کہ جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے۔ اس پر عبداللہ ابن زبیر اور مختار ابن ابی عبیدہ کے بعد سب سے پہلے زید شہید نے عمل کیا پھر یہ مزاج حریت نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا رہا۔

عہد عباسیہ میں نفس ذکیہ نے اس پر عمل کیا۔ ان کا انجام بھی زید شہید سے مختلف نہ ہوا۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ بہادروں کی موت مارے گئے مگر انہوں نے لوح زمانہ پر ایک مہر دوام لگادی اور دوسروں کے لئے اتنے گہرے نقوش قدم چھوڑ گئے کہ کتنے ہی سربکف قافلے ان پر پاؤں رکھتے ہوئے چلے تو منزل سے ہمکنار ہوگئے

۱۶۹ھ میں حسن مثنیٰ کی اولاد میں حسین بن علی نے آل ابی طالب کو اپنے پرچم تلے جمع کیا اور عباسی لشکر کو شکست فاش دی۔ بنی ہاشم کے حوصلے بلند ہو چکے تھے۔ مدینے پر کسی حد تک ان کا قبضہ تھا لیکن بغداد سے تازہ دم فوج آگئی اور حج کے لئے آئے ہوئے عباسی بھی ان کے شریک ہوگئے، مکے سے کوئی دس میل ہٹ کر

زنج میں دو غیر متوازن فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ امام حسنؑ کی اولاد بے جگری سے لڑی مگر سو لاشیں گر گئیں تو حوصلے پست ہو گئے اور باقیوں نے جانیں بچانے کے لئے میدان چھوڑ دیا۔

ان میں ایک شہزادہ ادریس بن عبداللہ عباسی افسر مواصلات صالح بن منصور کی مدد سے مراقش پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جس کے ہاتھوں مغرب اقصیٰ میں پہلی شیعہ حکومت وجود میں آئی۔

حسین بن علی بن حسن مثلث کی شہادت کے تیس سال بعد ۱۹۹ھ میں حسن مثنیٰ کے پوتے محمد ابن طباطبا نے رقہ میں ظہور کیا۔ انہیں بنی عباس کے ایک باغی کی حمایت حاصل ہو گئی جس نے تھوڑی سی جمعیت فراہم کر لی تھی۔ یہ دونوں ایک منصوبہ بنا کر کوفہ پہنچے، جہاں آل محمد کے نام پر ایک کثیر تعداد ان کے گرد جمع ہو گئی اور انہوں نے کوفہ کے گورنر کو شکست دے کر بھگا دیا۔

انہیں دنوں ابن طباطبا اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور زید شہید کی نسل کے ایک، شاہزادے کو ان کا جانشین بنا دیا گیا۔ پھر ابو سرایا کا مقابلہ زبیر بن مسیب سے ہوا جو دس ہزار کے تازہ دم لشکر کے ساتھ آیا تھا وہ بھی ہزیمت یاب ہوا اس طرح کئی معرکوں میں ابو سرایا کامیاب ہوا اور بصرہ و واسط پر بھی قابض ہو گیا پھر ایک سخت لڑائی کے بعد مدائن بھی فتح کر لیا گیا لیکن عباسی اس کا پیچھا چھوڑنے والے نہ تھے۔ وہ فوجوں پر فوجیں بھیجتے رہے۔ آخر ابو سرایا کو کوفے میں پناہ لینا پڑی مگر ہرثمہ کے لشکر نے کوفے کا محاصرہ کر لیا اور ابو سرایا قادسیہ کی طرف بھاگ نکلا

ابو سرایا کا کردار مورخین نے مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ پھر بھی سیاسی اسباب و عوامل سے قطع نظر ابو سرایا آل محمدؐ کا طرفدار ضرور تھا۔ اس نے بصرہ میں عباس بن محمد کو، یمن میں ابراہیم بن موسیٰ کو، فارس میں اسمٰعیل بن موسیٰ کو، اہواز میں زید بن موسیٰ کو عامل مقرر کیا تھا اور ملک کا نظم و نسق حسین افطس بن حسن بن امام زین العابدین کے سپرد کیا تھا۔ اس طرح عراق کے بڑے حصے کی امارت امام زادوں یا ان کے بیٹوں میں تقسیم کر دی تھی۔

بلاشبہ یہ تحریک ایک رواتی جذبے سے شروع کی گئی تھی لیکن آگے چل کر

اس میں خود غرضی شامل ہو گئی اور ہو سکتا ہے کہ خود ابو سرایا کی نیت میں بھی کھوٹ ہو۔ بہر حال اس کا انجام شکست، گرفتاری اور قتل ہوا۔

حسین افطس اب تک مکہ اور مفاضات پر قابض تھے۔ ابو سرایا کے قتل ہو جانے کی خبر سن کر حسین افطس کو گھبراہٹ پیدا ہوئی اور محمد بن جعفر الصادق کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی۔

" یہ موقع مناسب ہے، لوگوں کے قلوب آپ کی طرف مائل ہیں۔ آیئے میں آپ کی بیعت کیے لیتا ہوں کوئی شخص آپکی مخالفت نہ کرے گا۔"

محمد بن جعفر الصادق نے اس درخواست کو منظور کرنے سے انکار کر دیا مگر یہ اور ان کا لڑکا علی برابر اسی پر اصرار کرتا رہا۔

" بالآخر محمد بن جعفر الصادق ان لوگوں کے کہنے سننے میں آگئے اور طوعاً و کرہاً بیعت خلافت لینے پر آمادہ ہو گئے۔ لوگوں نے انکی خلافت کی بیعت کی اور امیر المومنین کے لقب سے پکارنے لگے" (۱۴)

ابن خلدون نے اس سلسلے میں حسین افطس، ان کی اولاد اور خود محمد بن جعفر الصادق کے بیٹوں پر کیچڑ اچھالی ہے جو قابل یقین نہیں ہے۔ مگر اتنا تو ماننا پڑے گا کہ خانوادہ رسالت کے بعض افراد پر ہوس دنیا غالب آگئی تھی اور وہ اپنی نسلی منزلت کا احساس کئے بغیر ایسی حرکتیں کر جاتے تھے جو انہیں کسی طرح زیب نہ دیتیں۔

جہاں تک محمد دیباج کا تعلق ہے، خود ابن خلدون نے انہیں عالم و زاہد اور نیک سیرت لکھا ہے۔ وہ مسلسل مظالم سے تنگ آچکے تھے۔ اسی لئے انہوں نے ہارون کی خلافت ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ انجام کار عیسیٰ الجلودی کے ہاتھوں مدینہ اس طرح تاراج کرایا گیا کہ کربلا کی غارت گری کی یاد تازہ ہو گئی۔

اس طرح کے واقعات ملک کے طول و عرض میں آئے دن پیش آتے رہے اور حوصلہ مند چھپے ہوئے حب اہل بیت کے جذبے کو ہوا دے کر قسمت آزمائی کرتے رہے مگر بہت کم لوگوں کو قیام حکومت میں کامیابی ہو سکی۔ ان میں سے چند خاندان قابل ذکر ہیں: طاہری، علوی، زیدی، بنی بویہ، بنی مزید، آل حمدان وغیرہ

عالم اسلام

مسلمانوں نے جب اپنی تسخیری مہمات کا آغاز کیا تو عراق و ایران، شام و لبنان، مراقش و مصر، افریقہ و اندلس تک اپنے پھر ہرے لہراتے چلے گئے اور اطالیہ و یورپ کے بعض علاقوں پر بھی قابض ہوگئے۔ پھر ہند و سندھ اور مشرق بعید تک سلطنت کی حدود کو وسعت دی۔

دو ڈھائی سو سال بعد جب شیعہ ظلم و ستم کے تنگ دائروں کو توڑ کر باہر نکلے تو یہی انکی کشور کشائی کا میدان تھا، اسی میں انہوں نے اپنی ہوئی تلواروں کے جوہر دکھائے اور دجلہ و فرات اور نیل کے ساحلوں پر اپنی ہمت و شجاعت کی داستانیں قلم بند کیں۔

شیعوں کا دائرہ اقتدار

عراق و ایران

باقیات الصالحات

شیعہ مراقش و مصر میں

خلفائے فاطمئین

مغل سلطنت

سلطنت صفویہ

شیعان کشمیر

سندھ

ہندوستان

شیعوں کا دائرہ اقتدار

عراق و ایران

حکومت طاہریہ

شیعوں کی شمشیر زنی کا مقصد استقرار حکومت ہو یا نہ ہو لیکن انہیں اپنی بقا کے لئے کوئی پناہ گاہ درکار تھی۔ برسوں سے وہ دلوں میں محبت اہل بیت چھپائے جی رہے تھے، کبھی نام بدل کر کبھی اپنا عقیدہ اپنی ذات تک محدود رکھ کر چنانچہ اموی اور عباسی حکومتوں کے ہر دور میں ایسے افراد پائے جاتے جو بظاہر خلفائے وقت کے آلہ کار تھے مگر حقیقتاً سینوں میں ولائے علی کی شمع روشن کئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نام طاہر بن حسین کا بھی ہے۔

ابو مسلم خراسانی کا نام اس سلسلے میں حرف اول کا درجہ رکھتا ہے جس کی تلوار نے حقوق اہل بیت کی خاطر بنی امیہ کا استیصال کلی کیا لیکن بنی عباس نے اپنی فتانت سے فائدہ اٹھالیا اور پیغمبر اسلام کی اولاد دائرہ محرومی سے باہر نہ نکل سکی۔ دوسرا نام طاہر بن حسین کا لیا جاسکتا ہے اس پیمانے پر نہ ہی مگر طاہر کی حکمت عملی اور سیاست سے ایک علاقے میں محبان علیؑ کو عافیت ضرور میسر آگئی اور وہ بنی عباس کا نشانہ ستم بننے سے قدرے محفوظ رہے۔

ہارون رشید کے بعد جب امین و مامون کے درمیان حصول سلطنت کی کشمکش ہوئی تو طاہر بن حسین مامون کا طرفدار تھا اور کہا جاسکتا ہے کہ مامون کی کامیابی میں خود اسکی سیاست و فراست کے ساتھ طاہر کی مدبرانہ شجاعت کو بھی دخل تھا۔ مامون کو اس کا احساس تھا لیکن اس کو اپنے لئے بھی بے خطر نہ سمجھتا۔ خود طاہر بھی مامون کی طرف سے چوکنا رہتا چنانچہ اس نے حکمت عملی سے خراسان کی گورنری حاصل کر لی اور خلیفہ کے سامنے سے ہٹ گیا۔

طاہر یقیناً مامون کا وفادار تھا لیکن بنی عباس نے اولاد رسول سے جو سلوک روا رکھا تھا، اس کو کوئی محب اہل بیت برداشت نہ کرتا، چنانچہ بقول ابن خلدون

" طاہر خراسان گیا اور ۲۰۹ھ تک ٹھہرا رہا۔ بعد ازاں خلافت سنیہ کی مخالفت کی ہوا دماغ میں سمائی، ایک روز خطبہ دینے کو کھڑا ہوا تو خلیفہ کے لئے دعا نہ کی۔ منبر سے نیچے اتر آیا۔" (۱۵)

اسی دوران طاہر کا انتقال ہو گیا اور عبداللہ بن طاہر اس کا جانشین ہوا، اور سلیمان بن طاہر اور محمد بن عبداللہ مختلف عہدوں پر فائز ہوئے۔ پھر یہ سلسلہ طاہر کی نسل میں چلتا رہا۔ ایک عرصے تک طاہری حکمراں خلفائے بنی عباس کے تابع رہے اور ان کے احکام کی بجاآوری کرتے رہے کیونکہ ان میں خلافت سے ٹکر لینے کی سکت نہ تھی۔ اگر ان میں سے کوئی یہ غلطی کر جاتا تو حکومت طاہریہ کے قیام کا امکان ختم ہو جاتا لہذا کسی نے عباسی پرچم کے مقابل اپنا پھریرا نہیں لہرایا لیکن جب سلطنت عباسیہ کمزور تر ہو گئی تو انہوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور وہ بادشاہ کہے جانے لگے۔

مامون کے ارادوں میں اول دن سے طاہر کے لئے کھوٹ تھا بلکہ طاہر کے ہاتھ سے نکل جانے پر افسوس تھا۔

"ایک دن اس نے احمد بن ابی خالد کو طلب کر کے فرمایا: چونکہ تم ہی اس کے ضامن ہوئے تھے، اب جاؤ اور اس کو میرے پاس لاؤ۔ ہنوز احمد بن ابی خالد کی روانگی کی نوبت نہ آئی تھی کہ اس کے اگلے دن طاہر کی موت کی خبر آ گئی۔ خلیفہ مامون نے یہ خبر سن کر ارشاد فرمایا: "الحمد اللہ الذی قدمہ و اخرنا" (۱۶)

عبداللہ بن طاہر کو باپ کا قائمقام بنانے میں خلیفہ کو تکلف تھا لیکن مصلحتاً ۲۰۹ھ میں بعض مناصب پر فائز کیا پھر آہستہ آہستہ عبداللہ نے اپنا خاندانی وقار واپس لے لیا۔

حکومت صفاریہ

سلطنت عباسیہ کے انحطاط کے ساتھ ساتھ مختلف صوبوں میں خود مختاری کا

ذہن پرورش پا رہا تھا۔ خراساں میں عبداللہ بن طاہر عہد معتصم میں انتقال کر چکا تھا اور اپنے بیٹے طاہر بن عبداللہ کو نیشاپور کا والی بنا گیا تھا جو آخر بادشاہ بن بیٹھا پھر طاہر کی جگہ محمد بن طاہر نے لے لی لیکن ان میں سے کسی ایک کو زیادہ دن چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا کیونکہ بغداد کی مرکزی سلطنت اپنے دائرے کے اندر سمٹتی جا رہی تھی اور طاہریوں کی دیکھا دیکھی نت نئی حکومتیں وجود میں آ رہی تھیں جن میں ایک حکومت صفاریہ بھی تھی۔

طوائف الملوکی کے اس دور میں محبان اہل بیت میں سے ایک بزرگ صالح بن نصر کنعانی المعروف بہ صالح مطوعی نے خارجیوں کے مقابلے کے لئے رضاکاروں کا ایک لشکر تیار کیا جس کی قیادت درہم بن حسن کے سپرد کی۔ اس فوج نے کئی ابتدائی کامیابیاں حاصل کیں حتیٰ کہ آگے چل کر خراسان کا ایک حصہ طاہریوں سے خالی کرا لیا مگر صالح کی وفات کے بعد درہم دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور رضاکاروں نے ۲۵۱ھ میں یعقوب بن لیث کو اپنا امیر بنا لیا۔

یعقوب بن لیث اور عمرو بن لیث سجستان میں تانبے پیتل کا کاروبار کرتے تھے۔ انہوں نے تنظیم رضاکاران میں دامے درمے قدمے ہر طرح سے حصہ لیا تھا۔ یہ لوگ صرف کاروباری ہی نہ تھے۔ شجاع اور باتدبیر بھی تھے۔ ایک مختصر سی مدت میں انہوں نے کافی بڑے علاقے کو زیر کر لیا اور ہوشمندی یہ کی کہ خلیفہ کی خدمت میں تابع فرماں رہنے کے لئے عرضداشت روانہ کر دی۔

سجستان میں اپنی حکومت کی داغ بیل ڈال کر یعقوب کرمان کا عازم ہو گیا۔ علی بن حسین بن شبل فارس کا نیم خود مختار گورنر تھا اس نے خلیفہ معتز کو اطلاع دی۔ کمزور مگر چالاک خلیفہ نے دونوں کو علیحدہ علیحدہ اپنی طرف سے گورنری کی اسناد بھجوا دیں وہ دونوں کی حقیقت سے واقف تھا اور چاہتا تھا کہ یعقوب اور علی بن حسین آپس میں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں۔

اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس زمانے میں ایک مخصوص علاقے کے اندر اقتدار کی لڑائیاں شیعیان علی کے مابین واقع ہوئیں جن میں سادات کی ایک حکومت بھی شامل تھی لیکن کسی کی فتح کو دیرپائی میسر نہیں ہوئی پھر بھی سجستان

طبرستان اور خراسان پر تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں شیعوں کی حکمرانی رہی۔

بہرحال یعقوب بن لیث کو کرمان میں طوق بن غلس کا مقابلہ کرنا پڑا اور طوق اس کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ شیراز کا دوسرا مقابلہ بہت سخت تھا۔ علی بن حسین کے ساتھ پندرہ ہزار کا جنگ آزمودہ لشکر تھا لیکن وہ یعقوب کے جیالے سپاہیوں کے سامنے ٹھہر نہ سکا اور علی بن حسین بھی پابہ زنجیر کر لیا گیا تاہم یعقوب بجستان کی طرف واپس ہو گیا اور فارس کا نیا گورنر دربار خلافت سے بھیج دیا گیا۔

چونکہ عباسی خلافت کا بھرم ابھی باقی تھا لہذا خاندان طاہریہ کی طرح یعقوب لیث نے بھی بغداد سے کھلی بغاوت خلافت مصلحت سمجھی اور فارس فتح کر لینے کے باوجود اس پر قبضہ نہیں کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ محمد بن عبداللہ بن طاہر عراق و سواد کا گورنر تھا۔ ۲۵۳ھ میں اس کی وفات پر اس کا بھائی عبیداللہ گورنر ہوا مگر تھوڑے ہی عرصے بعد خلیفہ معتز نے اسکو معزول کر کے سلیمان بن طاہر کو گورنر بنا دیا۔ ان تغیرات کے باوجود طاہری خاندان بڑی حد تک مختلف جہتوں سے امور سلطنت میں دخیل تھا اور اس وقت کا منتظر تھا جب وہ خود اپنی بادشاہی کا اعلان کر سکے

یعقوب لیث اس حقیقت سے واقف تھا اس لئے اس نے جلدی نہیں کی لیکن ۲۵۶ھ میں جب محمد بن واصل نامی ایک شخص نے کردوں کی مدد سے فارس پر قبضہ کر لیا تو ۲۵۷ھ میں محمد بن یعقوب نے فارس پر ہلہ بول دیا مگر خلیفہ موفق نے مصلحت وقت سمجھ کر یعقوب کو بلخ و طخارستان کی سند امارت عطا کر کے بہلا لیا اور یعقوب لیث نے اسی سلسلے میں کابل پر بھی تصرف حاصل کر لیا۔

اسی زمانے میں حسن بن زید نے محمد بن طاہر کے متعدد مقبوضات حاصل کر لئے اور آل طاہر کی ہزیمت یابی سے ان کے خاندانی وقار کو بڑا دھچکا لگا۔ یہ وہ دور ہے، جب مصر پر ابن طولون فتح کے پرچم لہرا رہا تھا اور وادی نیل محبان علیؑ کے لئے تنگ ہو رہی تھی۔

۲۶۰ھ میں یعقوب صفار اور حسن بن زید کا راست مقابلہ ہوا جس میں حسن بن زید کو شکست ہوئی۔

سلطنت عباسیہ کے انحطاط کے ساتھ ساتھ شیعوں کا دائرِ اقتدار بڑھ رہا تھا۔ صوبوں کے عامل تقریباً خود مختار ہو رہے تھے لیکن وہ اپنے کو مصلحتاً دربار بغداد سے وابستہ رکھنے کی کوشش کرتے جن میں شیعہ حکمراں بھی تھے۔ ان سب کے سامنے حصول اقتدار اور ہوس حکمرانی کے سوا کچھ نہ تھا لہذا وہ ایک دوسرے سے بھی متصادم ہو جاتے۔ انجام کار بجستان، دیلم، طبرستان وغیرہ کے سرحدی علاقے کبھی ایک کے قبضے میں چلے جاتے کبھی دوسرے کے، لیکن وقت کی تدریجی ترقی کے ساتھ حکومت صفاریہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا چنانچہ ۲۶۲ھ میں موفق و صفار کا ٹکراؤ بھی ہو گیا جس میں یعقوب کو نقصان اٹھانا پڑا مگر جلد ہی دونوں میں صلح ہو گئی۔ اسی سن میں احمد بن عبداللہ نجستانی نے بنو طاہر کی حکومت کا بڑا حصہ فتح کر لیا لیکن ایک سال بعد ۲۶۳ھ میں یعقوب صفار نے اہواز کو اس کے قبضے سے نکال کر اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

یعقوب کا سلسلہ فتوحات نہایت تیزی سی جاری تھا کہ ۲۶۵ھ میں عمر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور عمرو بن لیث اس کا جانشین ہوا۔ خلیفہ نے بھی خراسان، اصفہان، بجستان، سندھ، کرمان اور پولیس بغداد پر اس کی حکومت تسلیم کر لی۔

یعقوب بن لیث سلطنت صفاریہ کا بانی ہی نہیں تھا معمار بھی تھا، غیر مسلم قوتوں کے مقابلے میں وہ لوہے کی دیوار بن جاتا۔ خارجیوں کے استیصال میں اس نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے، ان کی بدولت اسے قبول عام حاصل تھا پھر صفاری حکومت کے استقرار میں اس کی پامردی عدیم النظیر ثابت ہوئی۔

بجستان کے نزدیک و دور اسلام دشمن قوتوں کا اس نے جس طرح قلع قمع کیا، وہ اس کے جذبہ اسلامی اور ذاتی شجاعت پر دلالت کرتا ہے کابل کی ناقابل تسخیر پہاڑیوں میں اس کی جوانمردی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ رتبیل کے فولادی آدمیوں کو اس نے جس طرح پارہ پارہ کر دیا، وہ اس کا عظیم کارنامہ ہے۔ اس محاذ سے اس نے خلیفہ کی خدمت میں چند بت بھی ہدیے کے طور پر بھیجے تھے۔

"کابل کا علاقہ گو بنی امیہ کے ابتدائی زمانے میں بلکہ خلافت راشدہ ہی کے دور سے اسلامی حکومت کا باجگزار بن گیا تھا لیکن وہ عراق و ایران کی طرح اسلامی

ملک نہ تھا۔ صفاریوں نے اس کو اسلامی قلمرو میں شامل کر کے اسلامی ملک بنا دیا (۱۷)

شاہ معین الدین ندوی نے ابن خلکان کے حوالے سے لکھا ہے کہ :۔

" صفار اپنی شجاعت و شہامت، تدبر و سیاست اور انتظامی قابلیت کے لحاظ سے بے نظیر تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ: جس شخص کو میں چالیس دن ساتھ رہنے کے بعد نہ پہچان سکوں، اس کو دوسرا شخص چالیس سال تک نہیں پہچان سکتا۔ حسن بن زید علوی اس کی شجاعت و استقلال کی وجہ سے اس کو " سندان " کہتے تھے۔ اس کی تدبیر و سیاست کے بہت سے واقعات مورخین نے نقل کئے ہیں۔ "

ان محاسن کے ساتھ ساتھ وہ حد درجہ ذہین و طباع بھی تھا اور صاحب ذوق بھی۔ کہا جاتا ہے۔

" ایک دن یعقوب کا چھوٹا بچہ اخروٹوں سے کھیل رہا تھا، ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڑھے میں چلا گیا۔ بچے کی زبان سے بے ساختہ نکلا " غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گور۔ " یعقوب موجود تھا۔ بچے کی زبان سے اس کو یہ کلام بہت پسند آیا لیکن، چونکہ اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے اس لئے شعراء کو بلا کر اس نے پوچھا کہ یہ کون سی بحر ہے انہوں نے کہا: ہزج ہے، پھر تین مصرعے لگا کر پوری رباعی کردی اور دوبیتی نام رکھا، پھر دوبیتی کے بجائے رباعی کہنے لگے (۱۸) "

یعقوب نے اپنی عسکری زندگی کا آغاز ایک رضاکار کی حیثیت سے کیا لیکن جب وہ سفر آخرت کا عازم ہوا تو ایران و عراق کا بیشتر حصہ اور کابل اس کے تابع فرمان تھا۔ کہنے کو وہ خلافت بغداد کے ماتحت تھا مگر حقیقتاً اس کی حیثیت کسی بادشاہ کی سی تھی جس کی رعایا خوشحال اور جس کا ملک شاداب تھا۔

بلاشبہ اس کی عمر کا بڑا حصہ گھوڑے کی پیٹھ پر گزر گیا پھر بھی اس نے بہت سے رفاہی کام کئے اور تھوڑی سی مدت میں اتنی شاندار حکومت بنا لی کہ جب عمرو بن لیث نے اس کی جگہ سنبھالی تو وہ وقت کا سب سے طاقتور حکمراں تھا۔

عمرو بن لیث یعقوب لیث کا لائق جانشین تھا بلکہ محبت اہل بیت میں کسی

حد تک غلو رکھتا۔ سیرت و کردار کے لحاظ سے وہ ایک شیعہ جرنیل نظر آتا۔ روزانہ نماز فجر کے بعد فوج کی پریڈ لیتا اور لشکر کی ہدایت اور ہمت افزائی کے لئے چند کلمات ضرور کہتا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ایک صبح فوجی پریڈ کے بعد اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور منہ سے نکل گیا

"کاش یہ لشکر عاشور کو کربلا میں موجود ہوتا........!"

شجاعت کے ساتھ اس میں تدبر کی بھی کمی نہیں تھی۔ رموز مملکت کو کماحقہ سمجھتا تھا۔

اس کو وراثت میں ایک مضبوط حکومت ملی تھی جس پر اس نے اول دن سے توجہ کی اور اسی کے ساتھ ساتھ بغداد پر اپنا اثر و رسوخ بڑھانے میں کوشاں رہا۔ ۲۶۶ھ میں اس نے عبید اللہ بن عبد اللہ بن طاہر کو پولیس بغداد پر، احمد بن عبد العزیز بن ابی دلف کو اصفہان میں اور حرمین اور طریق مکہ میں محمد بن ابی اساج کو متعین کیا۔ یہ سب اس کے معتمد علیہ تھے لیکن ۲۶۷ھ میں خلیفہ معتمد نے سلطان محمد بن عبد اللہ بن طاہر کو مع اہل و عیال قید کر دیا۔ الزام یہ لگایا گیا کہ وہ خجستانی و عمرو لیث کی جنگ میں خجستانی اور حسین بن طاہر سے خفیہ خط و کتابت کرتا تھا۔ اسی سنہ میں خجستانی نے محمد بن طاہر کا نام خطبہ سے نکلوا دیا، خلیفہ معتمد کے بعد اپنے نام کو داخل کیا اور اپنے ہی نام کا سکہ بھی چلایا۔

خجستانی ۲۶۸ھ میں انتقال کر گیا اور اس کی سپاہ بنو طاہر کے نامور سپہ سالار رافع بن ہرثمہ سے جا ملی جس نے بلاد خراسان اور خوارزم پر قبضہ کر لیا۔

بعض مورخین حالات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عباسی خلیفہ ایک لمحے کے لئے عمرو بن لیث سے مطمئن نہ تھا۔ ۲۷۱ھ میں معتمد نے خراسان کی حکومت اس سے لے کر محمد بن طاہر کو دیدی۔ اس نے رافع بن ہرثمہ کو اپنا نائب مقرر کر دیا اس لئے خلافت بغداد اور عمرو کی مخالفت شروع ہو گئی۔ خلیفہ نے احمد بن عبد العزیز کو اس کے مقابلے پر روانہ کیا اور عمرو کو شکست ہوئی

۲۷۴ھ موفق نے خود فارس کا رخ کیا۔ عمرو بن لیث بھی مقابلے پر آ نکھرا

مگر کچھ سوچ کر کرمان اور بجستان کی طرف چلا گیا، پھر کچھ عرصہ بعد اس نے خلیفہ کی خوشنودی حاصل کر لی۔

عمرو بن لیث کی کوشش اول دن سے یہی رہی تھی کہ خلیفہ سے اس کا براہ راست ٹکراؤ نہ ہونے پائے لیکن سلطنت کے مختلف حصوں میں مختلف طاقتیں توسیع مملکت میں کوشاں تھیں جو ایک دوسرے سے بھی متصادم ہوتیں اور جس طاقت کا پلڑا بھاری پڑتا، خلیفہ کا جھکاؤ اس کی طرف ہو جاتا۔ یہ صورت حال یعقوب بن لیث کے اٹھان اور استقرار حکومت سے پائی جاتی لیکن ۲۷۶ھ کے بعد عمرو کو بھی یہ خدشہ لگا رہتا کہ مبادا خلیفہ نے تمام مخالف قوتوں کو اس کے خلاف یکجا کر لیا تو وہ مقابلے کا متحمل نہ ہو سکے گا لہذا دونوں قیام حکومت کے لئے دلوں میں گنجائش نہ ہونے کے باوجود آپس میں متحد تھے۔

محمد بن طاہر نے ۲۷۱ھ میں رافع بن ہرثمہ کو خراساں میں اپنا نائب بنا دیا تھا لیکن اس کا خود سرانہ رویہ دیکھ کر خلیفہ اس سے ناراض ہو گیا اور اس نے عمرو بن لیث کو خراساں کی سند دیدی۔ عمرو سے اس کی متعدد لڑائیاں ہوئیں اور اس نے ہر مرتبہ شکست کھائی، آخر رافع خوارزم کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

ابو سعید والی خوارزم نے فریب دے کر رافع کو پکڑ لیا اور اس کا سر عمرو بن لیث کی خوشنودی کے لئے ۲۸۳ھ میں اس کو بھیج دیا...... عمرو نے وہ سر خلیفہ معتمد کی خدمت میں پیش کر دیا۔

حکومت علویہ

شیعوں کی تاریخ وقت کے کسی موڑ پر اپنے آغاز سے بے تعلق نہیں رہی بلکہ بنگاہ غائر دیکھا جائے تو آنحضرتؐ کی مقدس زندگی میں اور اس کے بعد محبت آل رسول کا جو بیج جہاں کہیں بویا گیا تھا وہ پہلے پودا بنا پھر تناور درخت۔ جبر و تشدد کے طوفانوں نے اکثر ان درختوں کو اکھاڑ پھینکا مگر ان کی جڑیں اندر ہی اندر پھیلتی رہیں۔ ساز گار آب و ہوا میں کونپلیں پھوٹتی رہیں پھر ہوا کے تند و تیز جھونکوں سے مرجھاتی رہیں مگر قوت نمو انہیں تازہ کرتی رہی۔

درخت تنوں سے کاٹے گئے، شاخیں قطع کی گئیں مگر پرانی شاخوں کی جگہ

نئی شاخیں پیدا ہوتی رہیں اور یہ سلسلہ ہر دور میں جاری رہا۔

اس کے اسباب و عوامل میں صداقت اور صرف صداقت کی کارفرمائی تھی۔ تاریخ کا ایک سطحی جائزہ لیا جائے تب بھی اس کے پس منظر میں رسولؐ کے پاک باطن صحابیوں اور خود امیر المومنین کے چہرے نظر آئیں گے جن میں عمار یاسر، سلمان فارسی اور ابوذر غفاری سر فہرست ہیں۔ ان مقدس بزرگوں نے کیا کچھ نہیں کیا، محتاج بیان نہیں۔ مدائن اور اس کے گرد و نواح میں حضرت سلمان فارسی کا ایمان آج بھی ضو ریز ہے۔ شام میں جبل عامل پر حضرت ابوذر غفاری کی صداقت کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں اور حاتم طائی کی سرزمین یمن میں خود امیر المومنین نے قبیلہ طے کو جو روشنی دکھائی تھی اس کو سیکڑوں سال بعد بھی عدی بن حاتم کی اولاد نشان منزل بنائے ہوئے ہے۔

حقوق آل محمد کے نعرے اکثر ایسے ہی علاقوں سے بلند ہوتے رہے اور انہیں کی گھاٹیوں سے نکل کر بعد کربلا ایمان کے متوالے داد شجاعت دیتے رہے جن سے بنی عباس نے فائدہ اٹھایا...... ابو مسلم کی تلوار اٹھی تھی آل محمد کی حمایت اور بنی امیہ کی دشمنی میں لیکن شاطران سیاست نے بساط کے مہروں کو اس چابکدستی سے استعمال کیا کہ جیت ان کے حق میں ہوئی اور پھر انہوں نے اپنے کو امویوں کا لائق وارث ثابت کر دیا۔

اس طرح اولاد رسول کی محرومی بدستور اپنی جگہ پر رہی اور ایک وقتی ٹھہراؤ کے بعد محبان علیؑ کے محسوسات کا تلاطم آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ امیر المومنین نے رحلت نبیؐ کے بعد صبر و سکون کی جو تلقین کی تھی ان کے وارثوں کا لائحہ عمل اب بھی وہی تھا لیکن خاندان کے اکثر افراد شدت غم سے بے قابو ہو کر میدان میں نکل آتے اور رزم گاہ کی موت کو گھٹ گھٹ کر مرنے پر ترجیح دیتے۔ ان میں ابوالحسین یحییٰ بن عمر بن یحییٰ بن حسین بن زید شہید بھی تھے، جنہوں نے عرب بادیہ نشینوں کو جمع کر کے کوفے پر قبضہ کر لیا لیکن خلافت بغداد کے حکم پر محمد بن عبداللہ بن طاہر کے ایک جنرل نے ابوالحسین کو شکست دی اور وہ لڑتے ہوئے مارے گئے۔

حصول اقتدار کی یہ جدوجہد ان آبادیوں میں عام تھی جن میں علیؑ کی اولاد اور ان کے ماننے والے بستے تھے۔ بلاشبہ اس کی ذمہ داری حد سے زائد تشدد پر عائد ہوتی ہے لیکن جنگ کی نوعیت کو استقرار حکومت کی مساعی کے سوا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا چنانچہ دیلم و طبرستان میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال پیش آئی .... دربار خلافت سے محمد بن عبداللہ بن طاہر کو طبرستان میں جاگیر عطا ہوئی اس کا نائب جاگیر پر قبضہ کرنے کے لئے پہنچا تو دیلم کے شیعان علی نے مزاحمت کی کیونکہ وہ زمینوں کو چراگاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ بات زیادہ آگے بڑھی تو محمد و جعفر پسران رستم نے "رے" پہنچ کر حسن بن زید بن محمد بن اسمٰعیل بن حسن بن زید بن حسن سبط سے ملے اور ان کے ہاتھوں پر بیعت کر کے ۲۵۰ھ میں ایک علیحدہ ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔

"آمد" میں حسن زید کا مقابلہ محمد بن اویس سے ہوا جس نے شکست کھائی اب حسن نے ساریہ کا رخ کیا۔ سلیمان عامل ساریہ نے ایک میدان میں روکا مگر حسن کے چند دستے ایک چکر کاٹ کر شہر میں داخل ہو گئے اور گھبرا کر سلیمان بن طاہر نے میدان چھوڑ دیا۔ دوسرے دن حسن نے سلیمان کے اہل و عیال کو اس کے پاس جرجان روانہ کر دیا۔

"بیان کیا گیا ہے کہ سلیمان نے ارادتاً شکست کھائی تھی اس وجہ سے کہ کل بنی طاہر کا میلان تشیع کی جانب تھا۔"

اب حسن نے اپنے لشکر کو باقاعدہ مرتب کیا اور محمد بن جعفر بن عبداللہ عقیقی بن حسین بن علی بن زین العابدینؑ کو سپہ سالاری کا منصب عطا کیا جنہوں نے کچھ دنوں بعد رے کو فتح کر لیا مگر محمد بن میکال بنی طاہر کی طرف سے مقابلے پر آیا تو وہ ہزیمت یاب ہو کر گرفتار ہو گئے پھر حسن بن زید کے دوسرے افسر فوج واجن نے ابن میکال پر فتح پائی اور رے پر دوبارہ قبضہ کر لیا .... جنگوں کی تفصیلات سے قطع نظر، ایک وقت وہ بھی آیا جب خراسان اور دوسرے علاقوں پر علویوں نے اپنے پرچم لہرا دیئے۔

لڑائیوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ بغداد سے یکے بعد دیگرے کئی لشکر آئے،

حسن بن زید بڑی بہادری سے لڑے، علوی تیغ زنی کے جوہر دکھائے مگر انجام کار انہیں طبرستان چھوڑ کر دیلم میں پناہ لینا پڑی پھر وقت کے تھوڑے فصل سے حسن نے اپنے مقبوضات کا بڑا حصہ واپس لے لیا۔

حکومت سامانیہ۔

سلطنت عباسیہ کے زوال پر مذکورہ بالا حکومتوں کے دوش بدوش بنی سامان کی ایک حکومت بھی وجود میں آئی جو بخارا، سمرقند اور خوارزم پر مشتمل تھی ..... اسد بن سامان کے خاندان نے مامون رشید کے دور میں عروج حاصل کیا، اس کے چار بیٹے نوح، احمد، یحیی اور الیاس کلیدی عہدوں پر فائز تھے۔ طاہر بن حسین نے اپنے عہد حکومت میں ان سب کو نوازا پھر عبداللہ بن طاہر نے نصر بن احمد کو سمرقند کی گورنری پر بحال رکھا۔

خراسان کی حکومت جب یعقوب بن لیث کے ہاتھ آئی تو نصر سے اس کا مقابلہ ہوا اور نصر شکست کھا کر بخارا آگیا جہاں اس کا بھائی اسمٰعیل سامانی حکمران تھا

اسد بن سامان کے بیٹے یقیناً مدبر اور شجاع تھے لیکن تاریخی شواہد کی رو سے اس کی توسیع میں ترکوں کی تلوار کو بڑا دخل ہے اور الپتگین کا نام جس کا تاریخی عنوان قرار دیا جا سکتا ہے، پھر اس کے غلام سبکتگین نے اپنے آقا کے منصب کو سنبھالا۔ اس کے بعد محمود بن سبکتگین نے باپ کی جگہ لی .... بنی سامان کی فتوحات بہر طور اس خاندان کی مرہون منت ہیں۔

عراق و ایران کے افق تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو دو سو سال کی مسلسل سرفروشی کے بعد شیعوں کی پہلی مستقل پناہ گاہ طاہر بن حسین کی حکومت تھی جس میں طاہر کی گورنری سے آل طاہر کی بادشاہت تک کوئی پچھتر سال اس مظلوم فرقے نے اطمینان کا سانس لیا پھر علویہ اور صفاری حکومتیں قائم ہوئیں اور علاقائی طور پر یہ محسوس کیا گیا کہ علی کے نام لیواؤں کو بھی جینے کا حق ہے۔

استقرار حکومت کی ایسی ہر جدوجہد بلاشک و شبہ واقعہ کربلا کا نتیجہ تھی مگر ایسی کوئی تحریک اس انداز پر چلائی نہیں گئی جس کا درس امام حسینؑ نے دیا تھا

البتہ ایک ذہنی انقلاب جو آیا تھا، وہ یہ کہ جب جرم صداقت میں گردن کٹوانا ہی ہے تو زید شہید اور نفس ذکیہ کی موت کو لبیک کیوں نہ کہا جائے!

اس سلسلے میں اگر آغاز تاریخ کے باب اول کا جائزہ لیا تو نیابت پیغمبری اور فرمانروائی کی تقسیم کے بعد شیعوں کا فرمانروائی میں کوئی حصہ نہ رہا تھا اور وہ قطعاً کوئی حصہ بھی نہ لیتے، بشرطیکہ انہیں طرح طرح سے ستایا نہ جاتا اور ان پر عرصہ حیات اتنا تنگ نہ کر دیا جاتا کہ ان کی چیخیں نکلتیں تو وہ خود اپنی ہی آوازیں سن کر رہ جاتے۔

غصب حقوق کی پہلی منزل سے محبان علی تین مرحلوں سے گزرتے رہے تھے: تلوار، زہر اور وضعی روایات........ روایات تو روح اسلام پر راست حملہ تھیں جن سے خود اختیاری عمل کو دین کا نام دیا جا سکتا تھا اور یہ مقصد پورا ہو چکا تھا، توسیع مملکت کے لئے کسی بھی بے خطر اور متمدن ملک پر حملہ جہاد کی تعریف میں آ چکا تھا اور ایسی جنگوں کا ہر شمشیر زن غازی اور مقتول شہید قرار پا چکا تھا، حالانکہ غزوات نبوی کے علاوہ کسی لڑائی میں شرکت کرنے والے کو غازی کہنا غلط ہی نہیں بلکہ بدعت ہے۔

ابتدائے خلافت کے محاربات کو زیر بحث نہ لایا جائے تو بھی اس کے بعد کی بیشتر جنگیں غیر اسلامی قرار پائیں گی۔ صرف ان جنگوں کا کوئی جواز پیدا ہو سکتا ہے جن میں کسی دوسری قوم کی طرف سے مسلمانوں پر حملے کا خطرہ ہو۔

مسلمانوں کے مستقبل کی تاریخ اس کی بے شمار نظیریں پیش کرتی ہے۔ خود سبکتگین نے جب غزنی میں اپنی علیحدہ حکومت قائم کی تو ہندوستان پر اس کا حملہ اور اس کے بعد محمود کی سترہ جارحانہ یلغاریں جہاد تو نہیں قرار دی جا سکتیں۔ پہلے حملے کا جواز پیدا کرنے کے لئے اگر یہ مان لیا جائے کہ جے پال کی نیت میں فتور تھا تو بعد کے تمام حملوں کے لئے کیا کہا جائے گا، بالخصوص سومنات کے مندر کی تاریخ محمود کو بت فروش کے بجائے بت شکن نہیں بنا سکتی۔

اسی طرح سلجوقیوں اور ایوبیوں کے وہ معرکے جو صرف مسلمانوں ہی سے ہوئے اور جن کو ملک گیری کی ہوس کے سوا کچھ کہا نہیں جا سکتا، اسی تعریف میں

ہیں، انہیں میں طاہریوں، علویوں اور صفاریوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان سب نے جو کچھ کیا، اس میں جہانبانی اور حکمرانی کے جذبے کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ محب اہل بیت تھے اور ان کی بدولت شیعہ ایک عرصے تک مظالم و ستم کا شکار ہونے سے بچے رہے۔

تلوار اور زہر کے مراحل کا منبع دمشق کا اسلحہ خانہ رہا تھا جس نے بنی امیہ کے بعد بنی عباس کے عہد میں ہارون رشید تک اپنا راستہ نہیں بدلا، مامون نے سادات کشی کے لئے کھلے بندوں تلوار کا استعمال نہیں کیا کیونکہ اس سے ملک کے مختلف گوشوں میں ہونے والی شیعوں کی بغاوتیں بڑھ جانے کا خطرہ تھا لہٰذا زہر اور زہر آلود پالیسی کو بروئے کار لانا اس کے نزدیک عین مصلحت قرار پایا تھا۔

اس کا یہ منصوبہ کامیاب رہا۔ اس نے چند ماہ کے لئے امام رضا کو بلا کر راستے سے ہٹا دیا اور مسلک امامیہ، جو اس کی راہ کا سب سے بڑا کانٹا تھا، اس کے مقابلے پر اس نے اتنے مسالک فقہ لا کھڑے کئے کہ اسلام اس کی ضرب سے آج تک کراہ رہا ہے۔

مسلک اعتزال اس کی سرپرستی میں پروان چڑھا۔ فقہ حنفیہ اس کی شکر گزار ہے۔ اسی کے حکم پر امام ابو یوسف نے اس کو مرتب کیا، اہل السنت و الجماعت کی تشکیل و ترویج اس کا کارنامہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فکر و خیال کی جو آزادی اس نے عام کی تھی، اس کے نتیجے میں قرامطہ اور زنج جیسے کتنے ہی فرقوں نے جنم لیا۔ یہ وہی پالیسی ہے جو حضرت معاویہ یا ان کے حاشیہ نشینوں نے خارجیوں کو پیدا کرنے میں استعمال کی تھی۔

طاہر بن حسین، مامون کی سلطنت کا معمار تھا۔ اس کا انجام بھی ہرثمہ بن اعین سے مختلف نہ ہوتا لیکن طاہر مامون کے ارادوں کو بھانپ کر خراساں کی گورنری پر چلا گیا اور مامون کو امور سلطنت نے اتنی مہلت نہ دی کہ طاہر جیسے مضبوط دشمن پر توجہ کر سکتا۔

عباسی خلیفہ کی اسی دانشمندانہ روش نے اس کو مامون اعظم تو بنا دیا لیکن اسکے بعد سلطنت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی۔ اخر عراق و ایران کی طرح ماوراء النہر میں سلطنت سامانیہ کی داغ بیل پڑ گئی۔ اس سلطنت نے طاہری، علوی اور

صفاری حکومتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور آگے چل کر طاہریوں اور صفاریوں کی طرح خلافت بغداد پر چھا گئی۔

سامانی حکومت کا دورانیہ ایک سو تیس سال سے زائد نہیں ہے جس میں گیارہ فرمانروا برسر حکومت رہے لیکن دوسری حکومتوں کی طرح یہ حکومت بھی ابتدائی چند دہائیوں کے بعد زوال پذیر ہو گئی اور دھیرے دھیرے غزنویوں کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔

طاہری اور صفاری حکومتوں کا اختتام

حکومت طاہریہ شیعی اقتدار کا سنگ میل تھی اور طاہر بن حسین کے وقت سے شیعوں کا مستقر بنتی جا رہی تھی۔ عبداللہ بن طاہر نے اس حکومت کو چار چاند لگا دیئے لیکن ۲۵۰ھ میں جب سے بجستان کے ملحق حسن بن زید کی حکومت اور ۲۵۳ھ میں دیلمی حکومت وجود میں آگئی، اس وقت سے طاہری حکمراں برابر جنگ و جدل میں الجھے رہے۔

عبداللہ کے بعد محمد بن طاہر کے وقت سے طاہری بادشاہت زوال پذیر ہونے لگی ۔ محمد بن طاہر سے علویوں کے معرکے بھی ہوئے اور صفار کے بھی، جن میں طاہری کبھی کامیاب رہے اور کبھی شکست یاب ہوئے لیکن ان کی طاقت کمزور ہوتی رہی ۔

یعقوب بن لیث صفار ایک معاصر حکمران تھا مگر اس کو طاہریوں سے کوئی خاص پرخاش نہ تھی لیکن ۲۵۷ھ میں جب یعقوب نواح بجستان کے غیر مسلم فرماں رواؤں سے مصروف پیکار تھا تو اس کے ایک حریف عبداللہ سنجری نے نیشاپور کا محاصرہ کر لیا۔ محمد بن طاہر نے اپنے کو کمزور پا کر اور بعض علماء کے دباؤ میں آکر اس کو طبین اور قہستان کا حاکم بنا دیا۔

یعقوب کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے محمد سے مطالبہ کیا کہ عبداللہ سنجری کو گرفتار کر کے اس کے پاس بھیج دیا جائے۔ محمد بن طاہر نے انکار کیا تو یعقوب خود نیشا پور پر چڑھ دوڑا۔ صفار اپنے دور کا سب سے طاقتور حکمران تھا، محمد بن طاہر مقابلے کی تاب نہ لاسکا اور یعقوب نے محمد اور اس کے خاندان کو گرفتار کر لیا۔

اس طرح پچاس پچپن سال تک شاہانہ طمطراق کے ساتھ حکومت کرنے کے بعد خاندان طاہریہ کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ جا بجا چھوٹی چھوٹی جاگیریں باقی تھیں، وہ بھی آگے چل کر امتداد زمانہ کے ہاتھوں ملیامیٹ ہو گئیں۔

حکومت صفاریہ کا انجام

یعقوب بن لیث نے طاہریوں کے علاقے اپنی مملکت میں شامل کر لئے تھے لیکن بچے کھچے چھوٹے مقبوضات سے اس نے کوئی تعرض نہ کیا اور نہ ان کی بدحالی کے درپے ہوا اس نے عبداللہ السنجری کا پیچھا نہ چھوڑا جو نیشاپور سے بھاگ کر حسن بن زید کی پناہ میں چلا گیا تھا۔ یعقوب ۲۶۰ھ میں طبرستان جا پہنچا۔ حسن بن زید سے اس کا سخت معرکہ ہوا جس میں حسن کو شکست ہوئی اور یعقوب فتح و ظفر کے پرچم اڑاتا ہوا عبداللہ کے تعاقب میں رے کی طرف چل پڑا حاکم رے نے عبداللہ کو گرفتار کر کے اس کے حوالے کر دیا اور یعقوب اس کو قتل کر کے بجستان آگیا۔

لیکن یعقوب کو اس کے بعد بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ جلد ہی اس کو خجستانی کی سرکوبی کے لئے نکلنا پڑا جس نے نیشاپور پر قبضہ کر لیا تھا۔ طاہریوں کا ایک بڑا گروہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ ۲۶۲ھ میں یعقوب صفار اور عمرو بن لیث کو کئی لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ خجستانی ۲۶۸ھ میں اپنے غلاموں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

یعقوب کی نظر میں حسن بن زید کا احترام تھا مگر امور مملکت نے ایک کو دوسرے کا دشمن بنا دیا تھا چنانچہ حسن بن زید نے محاصرہ نیشاپور میں صفار دشمن عناصر کی مدد کی تھی لہٰذا یعقوب و حسن کا پھر مقابلہ ہوا اور حسن کو ہزیمت یاب ہو کر تاوان ادا کرنا پڑا۔ ۲۶۴ھ میں یعقوب نے بلا مزاحمت اہواز پر قبضہ کر لیا اور ۹ شوال ۲۶۵ھ کو جند سابور میں قیام کے دوران انتقال کیا۔

"خلافت بغداد سے عمرو کو یعقوب صفار کا جانشین تسلیم کر لیا گیا، خراسان اصفہان، بجستان، سندھ، کرمان کی حکومت، پولیس بغداد اور سرمن رائے کی افسری کی اسناد عطا کی گئیں۔" (۱۹)

"۲۷۱ھ میں خلیفہ نے عمرو بن لیث کو معزول کر دیا۔ حجاج خراسان سفر مکہ

سے واپس آئے تو انہیں اس کی معزولی اور محمد بن طاہر کی تقرری سے آگاہ کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ بر سر منبر عمرو بن لیث پر لعنت کی جائے"۔(۲۰)

اس حکم کے نتیجے میں متعدد لڑائیاں ہوئیں۔آخر عمرو نے ایک وفد بھیج کر خلیفہ کی خوشنودی حاصل کر لی۔

پھر رافع بن ہرثمہ کا سر جب اس نے خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا تو ماوراء النہر کی حکومت کا خواستگار ہو گیا۔

"یہ علاقہ مدتوں سے سامانی خاندان کی موروثی حکومت میں چلا آتا تھا اور اس کے فرمانروا دوسرے خود سر موروثی والیوں کے مقابلے میں زیادہ مطیع و منقاد تھے۔اس کے برعکس عمرو پر اس کو پورا اعتماد نہ تھا اس لئے اس نے عمرو کو اسمٰعیل سے لڑوا کر عمرو کی قوت توڑنے کے لئے اس کی درخواست قبول کر لی اور اسکو ماوراء النہر پر قبضہ کی سند لکھ کر دیدی۔"(۲۱)

شاہ معین الدین ندوی کا یہ خیال بالکل درست ہے خلیفہ نے جان بوجھ کر عمرو بن لیث کو طاقتور دشمن کے منہ میں ڈھکیلا تھا جس کو عمرو سمجھ نہ سکا اور اپنی طاقت پر غیر معمولی اعتماد کرتے ہوئے بلا کسی مزید تیاری کے بڑھتا چلا گیا۔

اسمٰعیل سامانی کو خلیفہ کے حکم کی اطلاع مل چکی تھی یا کر دی گئی تھی، وہ عمرو کی آمد کا منتظر تھا اور دریائے جیحوں کو پار کر کے مورچے بنا چکا تھا۔عمرو نے اپنی روایتی شجاعت کے ساتھ حملہ کیا مگر پسپا ہوا اور میدان چھوڑ کر بخارا آگیا پھر نیشاپور پہنچ کر دم لیا۔

اس مقام پر اس نے اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو واپس لانے کی کوشش کی سامان جنگ بھی فراہم کیا اور بلخ کا عازم ہوا۔

اسمٰعیل پہلے سے جال بچھا چکا تھا، نہر عبور کرنے کی کشتیاں پہلے ہی غائب کرا دی تھیں اور عمرو کشتیاں ساتھ لیکر آیا نہیں تھا، لہٰذا مجبوراً نہر کے اس طرف پڑاؤ ڈال دیا......... اسمٰعیل اسی کا منتظر تھا۔اس نے سارا انتظام پہلے سے مکمل کر رکھا تھا اور ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا جس کے مطابق اس نے راتوں رات ایک اور مقام سے نہر کو عبور کیا اور تین طرف سے صفاری لشکر کو گھیرے میں لے لیا۔

عمرو نے روز روشن میں محاصرے کو توڑ کر نکل جانے کی کوشش کی۔اس کی فوج بڑی جانبازی سے لڑی، محصور ہونے کے باوجود دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے۔اسمٰعیل جانتا تھا کہ اس کا مقابلہ کسی معمولی آدمی سے نہیں ہے، اس نے جان بوجھ کر ایک طرف نکلنے کا راستہ دیدیا۔عمرو اس فریب میں آگیا اور اس طرف بڑھنے لگا جہاں سپاہیوں کی ایک تعداد جال لئے ہوئے موجود تھی۔اس نے جال پھینک کر عمرو بن لیث کو گرفتار کر لیا۔سپاہ اپنے فرمانروا کا یہ انجام دیکھ کر فرار ہونے لگی اور اسمٰعیل سامانی کے لشکریوں نے قتل عام شروع کر دیا پھر بھی ایک تعداد بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

اسمٰعیل نے عمرو بن لیث کو پابہ زنجیر کر کے پہلے قید کیا پھر خلیفہ معتضد کے پاس بھیج دیا جس نے زندان میں ڈلوا دیا۔گویا یہی اس کا منشاء تھا اور اسی لئے اس نے عمرو بن لیث کو ماوراء النہر بھیجا تھا۔

اسمٰعیل کے اس کارنامے پر دربار خلافت سے اس کو عمرو کے تمام مقبوضات کی سند حکومت عطا فرمائی گئی۔

عمرو بن لیث معتضد کے حین حیات قید میں رہا۔مکتفی نے ۲۸۹ھ میں تخت خلافت پر بیٹھتے ہی اس کو قتل کرا دیا شاید قید ہونے کے باوجود اس کی طرف سے کچھ اندیشہ تھا۔

اب سامانی حکومت کا تقریباً پورے عراق و ایران پر قبضہ تھا اور وہ طاہریوں اور صفاریوں کی جگہ لے چکی تھی پھر بھی صفار کی اولاد نے شیروں کی گود میں پرورش پائی تھی، وہ بے دست و پا ہو کر نہ بیٹھ سکی۔عمرو کی گرفتاری کے بعد اس کے پوتے طاہر بن محمد بن عمرو بن لیث نے فارس سے طاہری حاکم کو نکال کر اس پر قبضہ کر لیا۔خلیفہ معتضد نے اپنے غلام بدر کو اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا، طاہر بن محمد میں لڑنے کی طاقت نہ تھی، وہ محاذ سے ٹل گیا۔

اس دوران بنی صفار ہوس اقتدار میں باہم لڑتے رہے۔آخر طاہر بن محمد نے دربار خلافت میں حاضر ہو کر فارس کی حکومت ٹھیکے پر لے لی۔اس طرح صفار کی اولاد مزید دس سال تک کسی نہ کسی انداز پر بر سر حکومت رہی اور عمرو بن لیث

کے بعد یعقوب، عمرو، طاہر بن محمد، لیث بن علی اور معدل بن علی علاقائی طور پر حاکم رہے۔ ۲۹۸ھ میں سامانیوں کے ہاتھوں ان کا خاتمہ ہو گیا۔

صفاری دور حکومت پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی جائے تو اس کے اقتدار کا دورانیہ پینتالیس سال سے زائد نہیں ہے اور اس مدت میں صرف دو شجاع و مدبر نظر آتے ہیں جنہوں نے لوح زمانہ پر اپنے نقوش ثبت کئے ہیں: ایک یعقوب بن لیث دوسرا عمرو بن لیث۔ یعقوب کے حصے میں کامیابیاں تھیں، عمرو کو قسمت کا ہیٹا قرار دیا جا سکتا ہے مگر وہ اتنا بہادر تھا کہ فاتحین عالم کی صف میں اس کو کھڑا کیا جائے تو اس کی تلوار میں دوسروں سے زائد آب و تاب دکھائی دے گی۔ ابن خلدون نے اس کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"عمرو بن لیث نہایت مدبر و منتظم شخص تھا۔ بڑے بڑے صوبے اس کے زیر حکومت تھے۔ لشکریوں کی بہت زیادہ خاطر داری کرتا اور سپہ سالاروں کی کامل نگرانی رکھتا۔ تمام ممالک مقبوضہ میں اس کے پرچہ نویس پھیلے ہوئے تھے۔ کوئی حال اور واقعہ ایسا نہ ہوتا جس کی اطلاع اس کو نہ ہوتی۔ بہت رعب و داب کا آدمی تھا۔ کسی شخص کی یہ مجال نہ تھی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کرتا جو شکایت جس کو جس سے پیدا ہوتی اس کی حاجب سے شکایت کرتا اور حاجب اس قضیے کو اس کے روبرو پیش کرتا۔" (۲۲)

حکومت علویہ کا خاتمہ

سادات کی حکومت صفاری حکومت سے تین چار سال قبل عمل میں آئی تھی اور اول دن سے اس کو مخالفین کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پہلے طاہریوں سے ٹکر ہوئی جو استقرار حکومت کے مرحلہ اول کی بات تھی لیکن حسن بن زید کی تنظیمی صلاحیت اور شجاعت ہر مخالفت کو جھیل گئی اور حکومت ایک مرکزی جگہ سے پھیلی تو پھیلتی ہی رہی۔

اس میں عوام کے حب اہلبیت اور حسن بن زید کی قیادت دونوں کو دخل تھا...... حکومت صفاریہ بن جانے کے بعد حسن کا سب سے بڑا حریف یعقوب بن لیث تھا جس سے قدم قدم پر حسن زید کو نپٹنا پڑا۔

حسن کی رگوں میں نسل فاطمہؑ کا خون تھا اور اسوہ علی اس کا مسلک حیات لیکن ان سب سے زائد اس کے پیش نظر ایک حکومت کا قیام تھا...... ویسی ہی حکومت جیسی طاہر بن حسین، یعقوب بن لیث نے قائم کی تھی اس لئے اس کی حکومت اور اس کی ذات سے تقدس کو وابستہ کر دینا ہمارے انداز فکر کے خلاف ہوگا

حسن بن زید ہوں یا یعقوب بن لیث، وہ صرف فرماں روا تھے۔ ہم تو انہیں پسند اس لئے کرتے ہیں کہ انہوں نے علیؑ کے نام لیواؤں کو اپنے طور پر جینے دیا، مسلک آل محمدؐ پر چلنے کے مواقع فراہم کئے اور عقیدت کی جو شمعیں انہوں نے جلائیں ان کی روشنی پھیلنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔

ہمارا موقف یہ کبھی نہیں رہا کہ کوئی اولاد فاطمہ کی لاشوں پر سے گزر کر تخت سلطنت پر آ کر بیٹھے اور اس سے دو چار اچھے کام بھی سرزد ہو جائیں تو ولی اللہ، کوئی نبی کے نواسے کی قبر کھدوا کر کسی فقہ کا نفاذ کرے تو محی الدین والملت، کوئی کسی متمدن قوم پر طمع زر میں غارت گری کرے تو مجاہد و غازی، کوئی باپ اور بھائیوں کا خون بہا کر جبر و ظلم کی داستان دہرا دے اور کسی خاص عقیدے کیلئے سینہ سپر ہو جائے تو رحمتہ اللہ علیہ، ہم تو صرف اقتدار کی خاطر بنی نوع انسان کے ہر خونی کو قاتل قرار دیتے ہیں۔ ہاں اگر یہ خونریزی استقرار دین کے لئے عمل میں آئے تو جہاد ہے۔

اسی معیار پر طاہر بن حسین، یعقوب صفار اور حسن بن زید کو بھی پرکھتے ہیں تو انہیں خیر و شر کا مجموعہ پاتے ہیں تاہم جاہ طلبی کے نظریئے سے حسن کی سوجھ بوجھ اور دلاوری خراج تحسین لئے بغیر نہیں رہتی۔

ہمارا مقصود کسی پر اعتراض ہر گز نہیں بلکہ ہمیں تو بتانا صرف یہ ہے کہ جہاد وہ ہے جو دفاعاً یا خالص تبلیغ اسلام کے زاویہ نگاہ سے غیر مسلمین کے خلاف کیا جائے مگر بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کو پسندیدہ کرداروں کی پردہ پوشی اتنی مرغوب ہے کہ جنگ صفین کے دونوں فریق حق پر، امام حسینؑ کے قاتل حق پر...... دلیل یہ ہے کہ امام زد پر آئے ہی کیوں جو قتل ہو گئے۔

حد یہ ہے کہ مسلم بن عقبہ کی تاراجی مدینہ بھی جائز: بقول شاہ معین الدین ندوی، اگر مدینے والے پہلے ہی بیعت کرلیتے تو یہ نوبت کاہے کو آتی!

خدا مبارک کرے دوسروں کو ایسا ذہن، ہم تو دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کہنے کے قائل ہیں اور شیعہ حکمرانوں سے جو تحفظ حقوق اہلبیت کے کام ہوئے ہیں، ان کو نظر امتنان سے دیکھتے ہیں اور ان کی ہوس ملک گیری ہمارے نزدیک دیسی ہی ہے جیسے سلطان محمود کے ہند و سندھ پر حملے۔

اس لحاظ سے حسن بن زید بھی ایک حکمران تھا جو اپنے ہم مشربوں سے متصادم ہوتا رہا البتہ بغداد کی خلافت سے اس کا کوئی اتحاد نہ ہو سکا۔ اس کا کھلا ہوا سبب یہ تھا کہ حسن کا عقیدہ روز روشن کی طرح عیاں تھا اور عباسی خلیفہ ایک لمحے کے لئے بھی اس پر اعتماد نہ کر سکتا اور خود حسن کو بھی اس کی طرف سے اطمینان نہ ہو سکتا پھر بھی خلافت میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ وہ حسن کی طاقت کو پاش پاش کر سکتی لہذا علوی حکومت مسلسل گھٹتی بڑھتی رہی۔

۲۶۵ھ میں حسن کو یعقوب صفار کے ساختہ پرداختہ احمد بن عبداللہ نجستانی سے جنگ کرنا پڑی۔ نجستانی پوری تیاری سے مقابلے پر آیا تھا لہذا حسن کو شکست فاش ہوئی اور حسن نے بتقاضائے مصلحت تاوان دے کر جان چھڑائی۔

حسن زید کا دم خم اب بھی ویسا ہی تھا مگر اب اس پر بڑھاپے کے آثار طاری ہوتے جا رہے تھے، ادھر یعقوب صفار کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور عمرو بن لیث اس کی جگہ لے چکا تھا جو بڑے بھائی کا لائق جانشین تھا۔

صفاریوں سے حسن کی معاصرانہ چشمک تھی لیکن اس زمانے میں معمولی جھڑپوں کے علاوہ کوئی بڑا معرکہ پیش نہیں آیا حتیٰ کہ رجب ۲۷۰ھ میں بیس سال حکومت کر کے حسن اپنے خالق حقیقی سے جاملا اور محمد بن زید نے بھائی کا منصب سنبھال لیا۔

محمد، حسن سے کم بہادر نہ تھا مگر حسن کا سیاسی ذہن وہ کہاں سے لاتا! خاندانی شرافت کی اس میں کوئی کمی نہ تھی مگر افسران لشکر پر حسن کا سا رعب و داب نہ رکھ سکا...... ایک بڑا تغیر یہ بھی ہوا تھا کہ خلافت عباسیہ میں کچھ جان پڑ

گئی تھی اور ماوراء النہر کی سامانی حکومت بھی خلافت کے لئے موجب تقویت بن گئی تھی

عباسی خلافت کے لئے یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس نے جان بوجھ کر شیعوں کو برداشت کیا تھا خلیفہ کے ارادے جو عمرو بن لیث کے لئے تھے، وہی محمد بن زید کے لئے لہذا حسن بن زید کی وفات کے بعد ہی سے اندر اندر سازشیں ہو رہی تھیں۔ چنانچہ ۲۷۲ھ میں قزوین کے حاکم اذکوتکین نے اچانک رے پر حملہ کر دیا۔ محمد بن زید بھی مقابلے کے لئے نکلا۔ گھمسان کا رن پڑا مگر محمد بن زید کو شکست ہوئی۔ اس نے بھاگ کر جرجان میں پناہ لی...... قبضے کے بعد رے میں اذکوتکین کے مظالم ایک ظالم فاتح کا ثبوت ہیں۔

اس کے بعد ہی عمرو بن لیث کو بغداد سے معزول کیا گیا اور محمد بن طاہر کو گورنر خراسان بنایا گیا۔ ۲۷۵ھ میں اس کے نائب رافع بن ہرثمہ نے جرجان پر چڑھائی کر دی۔ محمد بن زید میں لڑنے کی طاقت نہ تھی۔ اس نے راتوں رات بھاگ کر استراباد میں پناہ لی۔ رافع نے اس شہر کا محاصرہ بھی کر لیا۔ محمد بن زید دو برس تک حصار سے نکل نکل کر مقابلہ کرتا رہا لیکن دو سال کے محاصرے سے اکتا کر ایک شب بھیس بدل کر نکل بھاگا۔

رافع نے پیچھا نہ چھوڑا۔ محمد کی طاقت پارہ پارہ ہو چکی تھی مگر وہ بزدل نہ تھا اس نے بار بار رافع کو منہ توڑ جواب دیا آخر ۲۷۷ھ میں زچ ہو کر طبرستان کو چھوڑ دیا

اس دوران محمد بن زید کا ایک افسر رستم بن قارن رافع سے جاملا اور علی بن کافی والی "سالوس" نے بھی رافع کی اطاعت کر لی۔ محمد بن زید عسکری لحاظ سے کمزور پڑ چکا تھا پھر بھی اس نے سالوس کا محاصرہ کر لیا اور کافی مدت بعد جب رافع اس کو بچانے کے لئے پہنچا تو محمد دیلم کی طرف کوچ کر گیا۔

عراق و ایران کی جنگی بساط پر اب بھی علوی اور صفاری مہرے موجود تھے لیکن عباسی عمال اور بنی سامان کا پلڑا بھاری پڑ رہا تھا۔ ۲۸۸ھ میں جب عمرو بن لیث کا خاتمہ ہو گیا تو مخالفین کی ہمتیں بڑھ گئیں اور ان کی نگاہیں دیلم و طبرستان پر گڑ گئیں۔

محمد بن زید کی فوجی طاقت مقابلتاً خاصی کمزور ہو چکی تھی ۔ اس کے بہت سے افسر دشمنوں سے جا ملے تھے پھر بھی شیر شیر ہی ہوتا ہے ، عمرو کے بعد اس نے اپنے دیرینہ علاقے جرجان کا رخ کیا ۔ اسمٰعیل سامانی کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ مزاحم ہوا کیونکہ اب وہ نہ صرف خراسان ، بجستان بلکہ طبرستان تک پر اپنا حق سمجھتا تھا ۔ محمد اسمٰعیل کی دھمکی کو خاطر میں نہیں لایا ۔

اسمٰعیل پہلے سے اس کے لئے تیار تھا اس نے ایک لشکر جرار مرتب کر رکھا تھا جو محمد بن ہارون کی سرکردگی میں فوراً روانہ ہو گیا ۔ باب جرجان پر دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا ، محمد بن زید نے زندگی اور موت کی لڑائی لڑی ، خود خون میں نہا گیا مگر میدان کو دشمنوں کی لاشوں سے پاٹ دیا ۔ آخر اسمٰعیلی لشکر شکست کھا کر پسپا ہو گیا ۔

تاریخ نے جنگ احد کا ایک منظر دیکھا تھا ۔ مسلمان فتحیاب ہوتے ہی لوٹ میں لگ گئے تھے اور کمین گاہ میں چھپے ہوئے خالد بن ولید مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے تھے .... ایسا ہی ایک منظر اس جنگ میں بھی نظر آیا :

" محمد بن زید کی سپاہ مال غنیمت کی لوٹ میں لگ گئی ۔ محمد بن ہارون نے یہ دیکھا تو اپنے بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو روکا اور ایک تعداد کے ساتھ پلٹ کر بھرپور حملہ کر دیا ۔ اس غیر متوقع یلغار سے فتح شکست میں بدل گئی ۔ محمد بن زید کے آدمی بیدریغ قتل ہونے لگے اور ایک انتشار و ابتری میں بھاگنے لگے ، محمد بن زید نے فرار کو عار سمجھا ، تھوڑے سے وفاداروں کے ساتھ حملے کو روکنے کی کوشش کی ، زخمی پہلے ہی سے تھا ایک کا مقابلہ دس بیس سے ہوا تو زخموں کی تاب نہ لا کر گر گیا اور قید ہو کر کچھ ہی دنوں بعد مر گیا ۔ " (۲۳)

" محمد بن زید شجاع ہونے کے ساتھ ساتھ زاہد و پاکباز اور عالم و فاضل تھے " جس کی تصدیق شاہ معین الدین ندوی نے اپنی تاریخ میں کی ہے ۔

قیدیوں میں محمد بن زید کا بیٹا زید بن محمد بھی تھا جس کو ابن خلدون کے بیان کے مطابق اسمٰعیل نے آرام سے رکھا پھر رہا کر دیا ۔

۲۸۹ھ میں اسمٰعیل نے طبرستان پر قبضے کے بعد دیلم پر فوج کشی کی اور

کامیاب ہوا اس طرح سامانی حکومت خراسان و طبرستان تک پھیل گئی ۔

طبرستان کا ایک حصہ آل زید کے قبضے میں رہا ۔ زید بن محمد بن زید اس پر حکومت کرتا رہا پھر اس کا بیٹا حسن اس علاقہ کا فرمانروا رہا آہستہ آہستہ اس نے جاگیر کی شکل اختیار کی اور حکومت کے بجائے حکومت کے آثار باقی رہ گئے ۔

حکومت زیدیہ : آغاز و انجام

چوتھی صدی ہجری کا اٹھان حکومت سامانیہ کے شباب کا تھا اور ماوراء النہر سے خراسان تک اس کے پرچم لہرا رہے تھے ۔ طبرستان و دیلم بھی اس کے طابع تھا لیکن شیعوں میں بیداری کی جو لہر دوڑی تھی ، وہ حکومت کے روکے رک نہ سکی اور انفرادی کوششیں جاری رہیں ان کوشش کرنے والوں میں اطروش نامی ایک بزرگ بھی تھے ۔

" اطروش کا نام حسن تھا جو علی بن حسین بن علی بن عمرو بن زین العابدین کا بیٹا تھا ۔ محمد بن زید کی شہادت کے بعد وہ دیلم چلا گیا ۔ تیرہ برس تک وہیں ٹھہرا رہا اور اسلام کی دعوت و تعلیم دیتا رہا اور وہاں لوگوں سے عشر لینے پر اکتفا و قناعت کرتا رہا ۔ دیلم کا بادشاہ ابن حسان اسکی مدافعت اور روک تھام کرتا پھر بھی دیلم کا ایک بڑا گروہ اس کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا اور اس کی اطاعت قبول کر لی ۔ اطروش نے دیلم کے بلاد میں مسجدیں بھی بنوائیں اور لوگوں کو مذہب شیعہ زیدیہ کی تعلیم بھی دی ۔ " (۲۴)

اس دوران سامانی حکومت کی طرف سے کئی عامل متعین ہوئے جنہوں نے اہل دیلم پر خوب ستم ڈھائے ۔ آخر ابو العباس محمد بن ابراہیم تعینات کیا گیا وہ بھی عوام کے لئے بہت ظالم ثابت ہوا تنگ آ کر دیلم والوں نے اطروش کو حملے کی دعوت دی ۔

ابو العباس سے اطروش کا سخت معرکہ ہوا جس میں ابو العباس کو شکست ہوئی ، اس عرصے میں اطروش کا داماد حسن بن قاسم بھی مدینے سے آگیا اس نے اکثر محصورین کو قتل کر دیا ، ۳۰۱ھ میں " الناصر " کے لقب سے طبرستان پر قبضہ کر لیا ۔

٣٠٢ھ میں بمقام سالوس ابوالعباس اور الناصر کا مقابلہ ہوا۔اس میں بھی ابوالعباس ہزیمت یاب ہوا، ٣٠٢ھ میں سعید بن نصر خود خراسان کا لشکر عظیم لیکر نکلا، اطروش اس کی تاب نہ سکا اور میدان جنگ میں کام آیا۔

اطروش کے تین بیٹے تھے، ابوالقاسم، حسن اور حسین، چوتھا داماد حسن بن قاسم تھا جو صحیح معنوں میں اطروش کا پیرو تھا اور داعی صغیر کہا جاتا تھا۔

٣٠٨ھ میں اس نے دیلم کے سالاران لشکر میں سے لیلی ابن نعمان کو جرجان میں مامور کیا جو "المویدلدین المنتصرلال رسول اللہ" کے لقب سے یاد کیا جاتا۔اس کی نیشاپور کے سامانی عامل قراتکین سے کئی لڑائیاں ہوئیں جن میں لیلیٰ کو کامیابی نصیب ہوئی، حسن بن قاسم کا نیشاپور پر قبضہ ہو گیا۔اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ بھی جاری کر دیا۔

سعید بن نصر کو بخارا میں اس کی خبر ملی تو وہ غصے میں کھول گیا۔اس نے ایک لشکر جرار مرتب کیا، نامی گرامی بہادروں کو اس لشکر میں شامل کیا۔حمویہ بن علی کو سپہ سالار بنایا اور لشکر کو مفتوحہ علاقے واپس لینے کے لئے روانہ کر دیا

لیلی بن نعمان ان تیاریوں سے بے خبر تھا وہ طوس میں مقابلے پر آ گیا۔عسکری طاقتوں میں کوئی تناسب نہ تھا پھر بھی لیلیٰ بڑی بہادری سے لڑا مگر شکست یاب ہوا، بھاگ کر آمد پہنچا لیکن دشمن نے پیچھا نہ چھوڑا اور آمد میں گرفتار ہو کر قتل کیا گیا۔

حسن بن اطروش استراباد میں مقیم تھا اس نے دیلمی سردار ماکان بن کانی کو نظم و نسق کا منتظم اعلی بنا رکھا تھا۔سعید بن نصر نے خراسان سے چار ہزار سوار روانہ کئے، حسن نے دو گنی طاقت سے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور بھاگ کر استراباد آیا۔وہاں ماکان کو اپنا قائمقام بنا کر ساریہ کا عازم ہو گیا۔

سعید بن نصر نے ایک دوسرا لشکر استراباد کی طرف بھیج دیا اور ماکان نے ساریہ پہنچ کر پناہ لی مگر ٣١٠ھ میں دوبارہ استراباد کو حاصل کر لیا۔

دیلمی سرداروں میں اسفار بن شیرویہ، سیکری، مرداویج اور سولویہ، ماکان بن کانی کے ساتھیوں میں تھے مگر اسفار کسی بات پر ناراض ہو کر نیشاپور کے

سامانی عامل کی پناہ میں چلا گیا تھا جو فی الوقت جرجان پر قابض تھا اس کی مدد سے ابو علی حسین بن اطروش نے طبرستان پر قبضہ کیا.......... آگے چل کر اسفار خود جرجان کا سامانی حکمران بن گیا۔

اس سے اور اولاد اطروش سے متعدد معرکے ہوئے، جن میں فریقین کامیاب اور ہزیمت یاب ہوتے رہے پھر اطروش کے بیٹے اور پوتے باہم دست و گریبان ہوتے رہے، ماکان بن کانی کبھی ایک کا ساتھ دیتا، کبھی دوسرے کا، نتیجے میں کبھی ایک کسی علاقے پر قابض ہو جاتا کبھی دوسرا۔٣٢١ھ میں ابو علی بن اسمٰعیل بن جعفر اطروش طبرستان کا حکمراں تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔مرداویج رے پر قابض تھا اس نے ابو جعفر بن محمد بن ابوالحسن احمد بن اطروش کی حمایت کی ماکان کو طبرستان سے نکال دیا، اور ابو جعفر کو تخت نشین کیا۔

اس کے انتقال پر اس کا بھائی "الثائر" کے لقب سے فرمانروا بنایا گیا جس نے دشمنوں سے شکست کھائی اور پہاڑوں میں جا کر پناہ گزیں ہوا اور اپنی حکومت کے تیس سال بعد ٣٥٥ھ میں وفات پا گیا۔حسن بن جعفر (الناصر کے لقب سے) بھائی کا جانشین ہوا۔حاکم جبل نے اس کو گرفتار کر کے خلیفہ بغداد کے پاس بھیج دیا۔اس طرح اطروش کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

خاندان حمدانیہ

انتزاع خلافت میں طاہری، علوی، صفاری اور سامانی جو بھی آزاد حکومتیں قائم ہوئیں ان سب کا بنیادی تعلق کسی نہ کسی طرح خلفائے عباسیہ سے قائم رہا اور ہر حکمراں اس کے لئے مجبور تھا کیونکہ گئے گزرے حالات میں بھی عوام کے ذہنوں پر خلافت کے تقدس کا غلبہ تھا اور عسکری طاقت کے لحاظ سے بھی مرکز خلافت اتنا کمزور نہ ہوا تھا کہ اس کو آسانی سے شکست دی جا سکتی اس لئے طاہری بادشاہ اور صفاری تاجدار، ہر ایک نے کوشش کی کہ بظاہر خلیفہ وقت کا ہوا خواہ بنا رہے

اس انداز کو موصل اور حلب کے حمدانی بادشاہوں نے بھی اپنائے رکھا اور مرکز خلافت کا سہارا لے کر حکومت کی بنیادیں مضبوط کیں۔

عرب کے قبیلہ تغلب کی یہ شاخ کسی مدت سے نواح موصل میں آباد تھی اور عقیدے کے لحاظ سے آل رسولؐ کو حق بجانب تصور کرتی تھی ۔ اس کا رابطہ عباسی خلفاء سے بھی تھا ۔ ۲۸۱ھ میں اس کے ایک سردار قبیلہ محمد بن حمدان بن حمدون نے ماردین پر قبضہ کر لیا مگر ایک ہی سال کے بعد معتمد عباسی کی سپاہ نے اسے مار بھگایا پھر ابو الہیجا عبداللہ بن حمدان کو موصل کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔

مرکز خلافت سے اس قبیلے کے تعلقات خوشگوار تھے اس نے ۳۰۷ھ میں ابراہیم بن حمدان کو دیار ربیعہ کا عامل بنا دیا، سعید بن حمدان کو ۳۱۲ھ میں نہاوند کی حکومت عطا ہوئی ۔ ابو الہیجا اور بعض دوسرے بزرگ عموماً بغداد میں رہتے ۔ ان کے بیٹے اور بھتیجے بزرگوں کی نیابت میں نظم حکومت کی دیکھ بھال کیا کرتے ۔ چنانچہ حسن بن ابو الہیجا ایک لائق حکمران ثابت ہوا ۔ اس نے اچھے انتظام سلطنت کے ساتھ ساتھ خلیفہ کی نظر میں بھی وقار حاصل کیا اور ۳۳۰ھ میں ناصر الدولہ کے خطاب سے نوازا گیا۔

حسن کا بھائی علی واسط کا گورنر تھا اور ایک شجاع اور مدبر حکمران تھا اس نے حلب اخشیدیوں سے چھین لیا اور کئی معرکوں میں یونانیوں کو پسپا کیا ۔ دربار خلافت سے اس کو سیف الدولہ کا خطاب دیا گیا۔

حمدانیوں کا شمار چوتھی صدی ہجری کے چند مقتدر خاندانوں میں ہوتا تھا اس کے افراد مرکزی حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز تھے اور بجا طور پر عباسی سلطنت کے انحطاط میں خود مختار بادشاہ بن جانے کے اہل تھے ۔

یوں تو وہ تقریباً ڈیڑھ صدی تک اقتدار سے وابستہ رہے لیکن صحیح معنی میں ان کا زمانہ حکومت ۳۱۷ھ تا ۳۹۴ھ قرار دیا جا سکتا ہے ۔

موصل میں اس خاندان کے تین نامور حکمران گزرے : ناصر الدولہ عضد الدولہ ابو تغلب اور ابو عبداللہ حسین ۔

حلب میں سیف الدولہ ، ابو المعالی، سعید الدولہ ، ابو الفضائل ، ابو الحسن علی، ابو المعالی شریف ۔

ان میں سے بیشتر بڑے بہادر ، ادیب و شاعر، علم پرور تھے لیکن ان میں سے کسی نے شیعیت کی کوئی خدمت نہیں کی ، البتہ ان کے دور میں مقبوضہ علاقوں کے شیعہ ظلم و تشدد سے محفوظ رہے ۔

اسی دور میں بنی عقیل کی حکومت وجود میں آئی اور سلطنت بنی بویہ کی داغ بیل پڑی ، ماوراالنہر کی سامانی حکومت اپنے انجام کو پہنچی اور اس کے بجائے غزنی میں سبکتگین بن الپتگین نے ایک نئی حکومت قائم کر لی ۔

بنی حمدان اس اعزاز کے باوجود ہر طرح خلافت عباسیہ کے تابع تھے لیکن دولت و اقتدار میں رشک و حسد لازم ہوتا ہے ، آل حمدان بھی اس سے خالی نہ رہے اور رشتے ناتوں کا لحاظ کئے بغیر ایک دوسرے سے حکومت چھین لینے کی کوشش کرنے لگا۔

ناصر الدولہ ابو محمد حسن موصل و دیار ربیعہ کا والی تھا لیکن اس کے چچا ابو العلاء نے اس کے خلاف سازش کی اور خلیفہ راضی سے بھتیجے کی پوری مملکت کو ٹھیکے پر لے لیا ۔ ناصر الدولہ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ موصل سے ٹل گیا پھر دوسرے راستے سے موصل پہنچ کر ابو العلاء کو گرفتار کر کے قتل کر دیا ۔ یہ بات راضی کو ناگوار گزری ۔ اس نے ابن مقلہ کو ناصر الدولہ کی تادیب کے لئے روانہ کیا ۔ ناصر الدولہ اس کی زد سے ہٹ گیا اور جب ابن مقلہ موصل میں اپنے نائب چھوڑ کر واپس چلا گیا تو اس نے دونوں کو موصل سے نکال دیا اور خلیفہ کو ہموار کر کے پھر امارت کا پروانہ حاصل کر لیا ۔

زوال پذیر حکومتیں ہمیشہ محلاتی سازشوں کا شکار ہوتی رہی ہیں ۔ عباسی دربار بھی اس سے خالی نہ تھا ۔ امیر یاقوت ابو عبداللہ بریدی کے ہاتھوں قتل ہو گیا واسط و بصرہ کا امیر ابن رائق موقع سے فائدہ اٹھا کر امیر الامراء بن گیا، کچھ عرصے کے لئے اس کی جگہ بجکم نے لی پھر ابن رائق اپنی جگہ پر آ گیا ۔ اسی دوران خلیفہ متقی فوج کا مطالبہ پورا نہ کر سکا اور فوج ابن بریدی سے جا ملی، خلیفہ نے بغداد سے بھاگ کر موصل میں پناہ لی ۔ ناصر الدولہ نے ابن رائق کو قتل کرا دیا اور خلیفہ نے ناصر الدولہ کو امیر الامرائی کے عہدے پر فائز کر دیا اور اس کے بھائی ابو الحسین علی کو

سیف الدولہ کا خطاب دیا۔

ابن بریدی نے ابن رائق کی زندگی ہی میں بغداد پر قبضہ کر لیا تھا لیکن ناصر الدولہ جب خلیفہ کو لیکر بغداد کی طرف بڑھا تو ابن بریدی بھاگ کھڑا ہوا لیکن واسط میں قیام کر کے پوری تیاری سے واپس ہوا، سیف الدولہ نے اسے شکست دی اور ۳۳۱ھ میں اس پر چڑھ دوڑا۔ اس درمیان دو ترکی افسروں تخج اور توزون نے بغاوت کر دی اور سیف الدولہ کے پڑاؤ پر حملہ کر دیا اور سیف الدولہ کو بغداد چھوڑنا پڑا تو ترکوں نے اس کی بغدادی قیام گاہ کو لوٹ لیا۔ اس طرح ناصر الدولہ کی امیر الامرائی کا خاتمہ ہو گیا۔

تخج اور توزون میں فوج کی سپہ سالاری اور حکومت کی تقسیم ہو گئی تھی مگر کچھ عرصہ بعد دونوں میں جھگڑا ہو گیا اور توزون نے تخج کو گرفتار کر کے اس کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروادیں۔

خلیفہ متقی ناصر الدولہ کی پناہ میں تھے لیکن کچھ دنوں بعد انہوں نے حمدانیوں کی روش میں تبدیلی محسوس کی اور توزون پر اعتماد کر کے بغداد آگئے، توزون نے ان کو اندھا کرا دیا اور ان کی جگہ مستکفی کو خلیفہ بنا لیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بنی بویہ کی حکومت پوری توانائیوں کے ساتھ برسر عمل تھی لہذا بنی حمدان سے ان کا ٹکراؤ ناگزیر تھا جو پچھلے کئی برسوں سے ہو رہا تھا۔ وقت کی تدریجی ترقی کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہا کیونکہ فی الوقت دو ہی طاقتیں میدان میں تھیں: ایک حمدانی دوسری بویہی۔ دونوں مسلک کے لحاظ سے شیعہ تھیں لیکن اقتدار کی کشمکش میں مذہب و مسلک کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا اس لئے ایک دوسرے سے برسوں تک برسرپیکار رہا۔

آل بویہ تعارف

اس خاندان کے عروج کا پہلا پتھر طبرستان کی حکومت زیدیہ کی بساط پر رکھا گیا.......... حکومت زیدیہ تیسری صدی ہجری کے اواخر میں اپنے آغاز کے بعد جرجان رے، کاشان تک پھیل گئی تھی پھر آپس کے جھگڑوں کے سبب اس کا انحطاط شروع

ہوا۔ ان کا ایک سردار لشکر ماکان بن کانی طبرستان پر قابض ہو گیا تھا مگر دوسرے سردار اسفار نے اس کو مار بھگایا پھر ۳۱۶ھ میں وہ خود اپنے ہی امیر مرداویح کے ہاتھوں شکست یاب ہو کر قتل ہوا، اسی زمانے میں خاندان بویہ کے جد اعلیٰ فوجی ملازمت میں داخل ہوئے۔

"ابو شجاع فناخسرو بویہ یزدجرد بادشاہ فارس کی نسل سے تھا۔ اس کے بزرگوں نے ابتدائے ظہور اسلام میں عرب سے بھاگ کر گیلان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ چونکہ مدتوں دیلمیوں میں رہے، خود بھی دیلمی کہلانے لگے تھے۔

بویہ ایک مرد متوسط الحال بحیرہ کیسپین سے مچھلیاں پکڑ کر گزارا کیا کرتا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے، علی، حسن اور احمد۔ یہ ماکان کانی کے ملازم ہو گئے۔ ماکان کا حال بگڑ گیا تو انہوں نے ۳۱۸ھ میں مرداویح کی ملازمت اختیار کر لی۔ مرداویح نے علی کو ہمدان اور اصفہان کے درمیان علاقہ کرخ کا حاکم بنا دیا (۲۵)"

یہ ہے خاندانی پس منظر اور ارتقاء کی پہلی منزل بنی بویہ کی لیکن بعض متعصب مورخین نے انہیں مجہول النسب قرار دیا ہے اور نسب نامے پر قلم کی اتنی روشنائی گرا دی ہے کہ وہ پڑھا نہ جاسکے پھر بھی ان کا عروج خاندانی مردانگی اور تدبر کا بدیہی ثبوت ہے جسے چھپایا نہیں جاسکتا۔

علی نے کرخ میں اپنے بھائیوں اور اہل خاندان کے تعاون سے راعی اور رعایا کو شیر و شکر کر دیا اور عوام کو اتنا گرویدہ بنا لیا کہ اس کا دائرہ حکومت چھوٹی سی فوجی چھاونی بن گیا اور ۳۲۰ھ میں اس نے عباسی گورنر مظفر بن یاقوت سے اصفہان چھین لیا پھر ارجان فتح کیا، ۳۲۱ھ میں نوبند جان اور ۳۲۲ھ میں شیراز مسخر کیا اور شیراز کو اپنا مرکز حکومت قرار دیا۔

اس طرح علی بن بویہ نے سادات زیدیہ کی مردہ حکومت کو ایک نئے نام سے نشاۃ ثانیہ عطا کی اور اس شیعہ حکومت کے لئے زمین بنائی جو عراق و عجم، کرمان و فارس، آذربائیجان اور خوزستان تک پھیل گئی پھر اس میں عرب، عمان، احساء، بحرین اور جزیرہ وغیرہ بھی شامل ہو گئے۔

اس حکومت کے جبروت اور سطوت کا یہ عالم تھا کہ خلفائے بغداد عملاً اس

کے دست نگر اور محکوم تھے کہنے کو وہ عباسی خلفاء کے امیر الامراء تھے مگر دراصل تھے خلیفہ گر۔ خلفاء کا روزینہ ان کی طرف سے مقرر تھا، تمام ملکی، فوجی اور مالی معاملات تاجداران بویہہ سے متعلق تھے۔ خطبہ اور سکہ میں ان کے ساتھ خلیفہ کا نام شامل تھا اور وہ دکھانے کو خلیفہ کے سامنے باادب بیٹھتے تھے جو ویسی ہی مصلحت تھی جس کا سلسلہ خاندان طاہریہ سے شروع ہوا تھا۔

"شیراز پر قبضے کے بعد فوج نے علی سے روپے کا مطالبہ کیا، اس کے ہاتھ بالکل خالی تھے، وہ بہت متردد ہوا۔ ایک دن وہ دارالامارہ میں بیٹھا اسی فکر میں ڈوبا تھا کہ ایک سانپ چھت سے نکل کر ایک سوراخ میں گھس گیا، علی نے فراشوں کو سوراخ کھودنے کا حکم دیا، اسے کھودا گیا تو ایک کھڑکی نظر پڑی، اس میں سے پانچ لاکھ اشرفی کا سامان نکلا، اس غیبی مدد سے علی کا بگڑا ہوا کام بن گیا۔" (۲۶)

بنی بویہہ کے پہلے حکمراں کی شخصیت و حکومت دونوں مسلم ہو چکی تھیں پھر بھی اس نے عباسی خلیفہ سے توثیق کرانے کے لئے ایک زر سالانہ کی پیش کش کی اور اس کو "راضی" سے سند اور عمادالدولہ کا خطاب عطا ہوا اور خلعت و لوائے حکومت بھی دیا گیا۔

مرداویج پر علی کا یہ اعزاز بہت گراں گزرا، وہ اس پر پوری طاقت سے حملہ آور ہو گیا، عمادالدولہ علی نے مصلحت وقت سمجھ کر صلح کر لی...... کچھ عرصے بعد مرداویج کو خود اس کے ترک سپاہیوں نے قتل کر دیا۔

عراق و خوزستان کے بعض علاقے عباسی خلیفہ کی ذاتی جاگیر تھے۔ اس پر امیر یاقوت اور ابوعبداللہ بریدی دونوں کی نظریں لگی ہوئی تھیں چنانچہ اسی سلسلے میں امیر یاقوت اور عمادالدولہ کا تصادم ہوا اور عمادالدولہ نے یاقوت کو شکست دے کر صلح پر مجبور کر دیا اور راضی نے اس کو فارس، عراق، خوزستان کا باقاعدہ حکمراں بنا دیا اور عمادالدولہ کی اس حکومت کا آغاز ہو گیا جو اپنے وقت کی سب سے بڑی طاقت کہی جاتی تھی۔

عمادالدولہ علی نے سلطنت کی تقسیم اس طرح کی کہ شیراز کو مرکز حکومت بنا کر فارس کو براہ راست اپنی ماتحتی میں رکھا، رکن الدولہ حسن کو ہمدان اور

قزوین سمیت اصفہان کا حکمران بنایا، تیسرے بھائی معزالدولہ احمد کو کرمان، عراق کی حکمرانی عطا کی۔

تینوں بھائیوں کو خلافت پر غلبہ حاصل تھا، خطبے میں بھی ان کے نام لئے جاتے تھے۔ ان کی سلطنت عراق و عجم، آذربائجان و خوزستان، کرمان و فارس، عرب، عمان، احسا، بحرین اور جزیرہ تک پھیلی ہوئی تھی۔

خلیفہ ان کے وظیفہ خوار تھے، تمام ملکی، سیاسی اور مالی معاملات ان کے حیطہ اختیار میں تھے۔ ذاتی طور پر سب کے سب بڑے عالم و فاضل اور باکمال تھے، عقیدتاً وہ شیعہ تھے مگر اپنے درباروں میں انہوں نے شیعہ سنی ہر مکتب فقہ کے علماء کو جگہ دی تھی۔ ادیب، شاعر، فلسفی، سائنسداں، فقیہہ، محدث اور مورخ اور دیگر کاملین فن کی سرپرستی کرتے، نظم و نسق اتنا اچھا تھا کہ زبردست کسی کمزور کو دبا نہ سکتا، بادشاہ خود ہر فریادی کی دادرسی کرتا تھا۔

فوج کی تنظیم میں انہیں یہ طولیٰ حاصل تھا اور اسی میں ان کی طاقت کا راز چھپا ہوا تھا۔

بعض مورخین نے بویہی عملداروں کے رعایا پر تشدد کے واقعات لکھے ہیں مگر وہ بھول گئے کہ شخصی حکومت کے ہر عہد میں اس کی نظیریں پائی جاتی ہیں۔ سلجوقی، غزنوی اور ایوبی کوئی دور اس سے خالی نہیں تو صرف بویہیوں کو ہی مورد الزام کیوں قرار دیا جائے، بالخصوص معزالدولہ کو۔ وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ایک غالی شیعہ تھا لہٰذا اس کی شیعیت نے سارے محاسن کو ملیامیٹ کر دیا اور ظالم و جابر کے القاب سے نوازا گیا۔ سلطان محمود کی خونخواری اور غارت گری کے باوجود اس کو محی الدین والملۃ لکھا گیا لیکن معزالدولہ کو کسی مورخ نے سلطان بھی نہیں لکھا حد ہے عصبیت کی جبکہ ابن خلدون نے خود لکھا ہے کہ اس خاندان کے بیشتر فرماں رواؤں کو دربار خلافت سے سلطان کا لقب دیا گیا تھا۔

۳۸۸ھ میں ستاون سال کی عمر میں عمادالدولہ کا انتقال ہو گیا تو رکن الدولہ قبیلے کا رئیس اعظم ہوا اور اس کا بیٹا عضدالدولہ بسبب وصیت شیراز کا حکمراں بنا

"مورخین نے لکھا ہے کہ وہ نیک نہاد، عادل، حلیم، شجاع، مکارم اخلاق

سے آراستہ اور محاسن آداب سے پیراستہ تھا۔عامۂ خلائق سے مرحمت و ملاطفت سے پیش آتا اور ضعفاء و رعایا کی دلجوئی کرتا۔اس کے زمانہ حکومت میں رعایا مرفہ حال اور آسودہ رہی۔"(۲۷)

حمدان اور بویہہ کے معرکے

شاہ معین الدین ندوی نے لکھاہے: "حمدانی نسلاً عرب اور مذہباً سنی تھے"
یہ ایک پرانی ریت ہے، حسب ضرورت سنی کو شیعہ اور شیعہ کو سنی بنا دینا قلمکاری کا کرشمہ رہاہے جیسا کہ پچھلے دنوں پاکستان میں قائداعظم محمد علی جناح کے لئے ہوا اور ایک مسلم شیعہ کے سنی ہونے کا دعویٰ کر دیا گیا۔

جہاں تک بنی حمدان کا تعلق ہے تو بلاشبہ وہ حلقہ امامیہ سے تعلق رکھتے تھے مگر خلافت بغداد سے وابستگی اور امور مملکت کے تحت انہوں نے شیعوں کی کھلی ہوئی سرپرستی نہیں کی اور نہ سنیوں سے کوئی تعصب برتا لہذا انہیں سنی کہہ دیا گیا حالانکہ اس سے کبھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور افراد کے مفروضہ اضافے سے کسی حلقے کی وقعت نہیں بڑھتی۔علی اپنی جگہ پر علی ہی رہتے ہیں شیخین کی سیاسی حیثیت شرعی نہیں بن جاتی جسکو علیؑ نے اقتدار کی خاطر بھی تسلیم نہیں کیا۔

بنی حمدان شیعہ تھے اور شیعہ ہی رہے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہوس اقتدار میں انہوں نے بلالحاظ مسلک کبھی جاہ طلبی کا راستہ نہیں چھوڑا اسی لئے ماضی کی طرح شیعہ طاقتیں اس دور میں بھی ٹکراتی رہیں اور بنی حمدان اور بنی بویہہ وقتاً فوقتاً نبردآزما نظر آتے رہے۔

بغداد کی خلافت پچھلی دو دہائیوں سے موصل کی دست نگر رہی تھی مگر اب اس پر توزوں کا قبضہ تھا جو عبداللہ بن بریدی کے بھائی ابوالحسین بن بریدی کو خلیفہ مستکفی کے حکم سے قتل کرانے کے بعد مطلق العنان ہو گیا۔ابن شیرزاد اس کا داہنا ہاتھ تھا۔ناصرالدولہ ان حالات سے بے تعلق نہ تھا۔وہ بغداد پر چڑھائی کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ توزوں خلیفہ مستکفی کو لے کر موصل کا عازم ہو گیا لیکن ۳۳۲ھ میں دونوں کے مابین صلح ہو گئی۔

توزون اس مہم سے واپس ہی ہوا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا اور ابن شیرزاد اس کا جانشین ہوا۔

عراق کا بویہی حکمران ان تغیرات سے بے خبر نہ تھا۔واسط کو فتح کرنے کے بعد وہ بغداد کی طرف متوجہ ہوا۔مستکفی میں معز الدولہ احمد سے لڑنے کی طاقت نہ تھی لہذا معزالدولہ بآسانی بغداد پر قابض ہو گیا اور خلیفہ کی طرف سے اس کو سلطان کا لقب دیا گیا۔

"بنی بویہہ اور سلجوقیہ کا ہر وہ شخص جو سلطنت کے سیاہ و سفید کا اختیار رکھتا، سلطان کے لقب سے مخاطب کیا جاتا تھا۔"(۲۸)

ناصرالدولہ حمدانی کو اس کی خبر ہوئی تو وہ آگ بگولا ہو گیا کیونکہ وہ بغداد کو اپنا حق سمجھتا تھا لہذا وہ پوری فوجی تیاری کے ساتھ موصل سے چل پڑا۔

معزالدولہ مستکفی کو معزول کر کے مطیع کو تخت خلافت پر بٹھا چکا تھا۔اس نے پہلے اپنے سپہ سالاروں کو ناصرالدولہ کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا پھر خلیفہ مطیع کو لے کر خود بھی روانہ ہو گیا۔

عکبرا کے مقام پر معزالدولہ کے مقدمہ لشکر سے ناصرالدولہ کی فوجوں کا خونریز معرکہ ہوا۔اس عرصہ میں خود معزالدولہ بھی پہنچ گیا اور اکا دکا لڑائیوں میں ناصرالدولہ کا سخت نقصان ہوا مگر ابن شیرزاد کی غداری سے معزالدولہ کے لشکر کے لئے رسد آنا بند ہو گئی جس سے وہ سخت مصیبت میں پھنس گیا مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔اس پامردی کے نتیجے میں ناصرالدولہ کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر موصل کا عازم ہو گیا۔

معزالدولہ نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔آخر ناصرالدولہ نے مصلحت سمجھ کر معزالدولہ سے صلح کر لی لیکن لڑائیوں کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا معزالدولہ نے کئی بار موصل پر قبضہ کیا مگر ناصرالدولہ نے واگزار کرالیا۔۳۴۵ھ میں ناصرالدولہ نے بغداد پر حملہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔۳۵۴ھ میں دونوں میں پھر صلح ہو گئی۔

شاہینی حکومت

عمران بن شاہین جامدہ کا ماہی گیر مگر بڑا دلیر اور باحوصلہ شخص تھا۔ ایک بار جامدہ کے علاقے میں اس نے بعض سرکاری محاصل وصول کر لئے اور گرفتاری کے خوف سے بطیحہ آ گیا۔ یہاں جنگلی چشموں کے کنارے مچھلیوں اور پرندوں کے شکار پر گزر اوقات کرنے لگا جس میں بعض دوسرے لوگ بھی اس کے شریک ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھی موقع پا کر راہ گیروں کو بھی لوٹ لیتے تھے۔ اس طرح جیالوں اور بہادروں کی ایک جماعت اس کے ساتھ ہو گئی پھر وہ معزالدولہ کے مخالف ابوالقاسم بریدی سے جا کر مل گیا لیکن ۳۳۵ھ میں جب معزالدولہ نے ابوالقاسم کی طاقت ختم کر کے بصرہ پر قبضہ کر لیا تو عمران بن شاہین اس سے الگ ہو کر اپنی طاقت بڑھانے لگا اور آخر بطیحہ کے بعض علاقوں پر قبضہ کر کے ایک چھوٹی سی حکومت بنا لی۔

معزالدولہ نے اس کی سرکوبی کے لئے کئی بار فوجیں بھیجیں جنہوں نے اس کو شکستیں دیں مگر بعض مرتبہ اس نے بویہی لشکر کو پسپا کر دیا۔ آخر معزالدولہ نے اس کی صلح کی پیش کش مان لی اور اس کو بطائح کا حاکم بنا دیا۔

اس کے بعد بھی وہ نچلا نہ بیٹھ سکا، ایک بار اس نے اہواز کا خراج چھین لیا، معزالدولہ اس کی قوت کو توڑ دینا چاہتا تھا لیکن اس کا ارادہ پورا نہ ہو سکا اور ابن شاہین کی باقاعدہ ریاست قائم ہو گئی جس کے بعد یکے بعد دیگرے آٹھ حکمران گزرے۔

سلطان معزالدولہ: ایک عظیم حکمران

بویہی حکومت کا بانی بلاشبہ عمادالدولہ علی تھا لیکن اس کو سربلند کرنے میں معزالدولہ احمد کو بڑا دخل رہا۔ اس نے حدود سلطنت کو اتنا وسیع کر دیا کہ وہ مغربی ایشیا میں عباسی سلطنت کی سابقہ وسعت کو چھونے لگی۔

ناصرالدولہ حمدانی اس کا سب سے بڑا حریف تھا جو خود معزالدولہ سے کم نہ

تھا لیکن بویہی حکمرانوں نے ہر میدان میں اس کے دانت کھٹے کر دیئے مگر ناصرالدولہ بھی آسانی سے مات ماننے والا نہ تھا، وہ صلح کرتا اور موقع پاتے ہی اس کو توڑ دیتا اور ایک بار پھر قسمت آزمائی کے لئے تلوار کو بے نیام کر لیتا۔

۳۳۶ھ میں جب ترک سردار تکین نے ناصرالدولہ کے خلاف بغاوت کی تو ناصرالدولہ نے معزالدولہ سے مدد مانگی۔ معزالدولہ نے ایک فوج اپنے وزیر ابوجعفر ضمیری کی سرکردگی میں بھیج دی اور ناصرالدولہ نے تکین کو گرفتار کر کے آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروا دیں اور حسب قرار داد ابن شیرزاد کو گرفتار کر کے ضمیری کے حوالے کر دیا۔

پھر ناصرالدولہ کو دوسرے ترک سردار جمان کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ ناصرالدولہ نے بمشکل اس پر قابو پایا مگر اس کو یہ بدگمانی پیدا ہو گئی کہ اس بغاوت میں دیلمیوں کا ہاتھ ہے۔ اس کی خبر معزالدولہ کو بھی ہوئی اور دونوں طرف سے بدظنی نے شدت اختیار کر لی جس کے نتیجے میں طرفین جنگی تیاریاں کرنے لگے۔

۳۳۷ھ میں معزالدولہ بغداد سے روانہ ہوا، ناصرالدولہ موصل سے نصیبین کا عازم ہوا، معزالدولہ سیدھا موصل پہنچا اور اس پر قبضہ کر لیا اسی دوران یہ خبر گوش گزار ہوئی کہ خراسان کی فوج نے بغاوت کر دی ہے۔ معزالدولہ نے اپنے بھائی رکن الدولہ کو خراسان روانہ کر دیا۔ اس وقفے میں ناصرالدولہ نے صلح کی پیش کش کی جس کو معزالدولہ نے قبول کیا اور چونسٹھ ہزار درہم سالانہ پر موصل جزیرہ اور شام کی سند حکومت اس کو عطا کی۔ شرائط صلح میں طے پایا کہ خطبات میں اس کا اور رکن الدولہ و عمادالدولہ کے نام بھی لئے جائیں گے۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر وہ ذی الحجہ ۳۳۷ھ میں بغداد واپس ہو گیا۔

ناصرالدولہ نے ماضی کی طرح کچھ ہی دنوں میں علم بغاوت بلند کر دیا اور معزالدولہ نے ۳۳۸ھ کے درمیان پھر موصل پر قبضہ کر لیا ناصرالدولہ نصیبین چلا گیا اور چلتے وقت تمام مال و اسباب لیتا گیا جس سے بویہی فوج میں کھانے پینے کی بھی تنگی ہو گئی مگر معزالدولہ نے ناصرالدولہ کے آدمیوں کو توڑ کر یہ مشکل آسان

ایک بار پھر ناصرالدولہ کی طرف سے معافی کی استدعا کی گئی مگر معزالدولہ نے انکار کر دیا آخر بہت کہنے سننے اور سیف الدولہ کی ضمانت پر دو کروڑ نو لاکھ درہم پر مصالحت کر لی اور عراق واپس ہو گیا۔

۳۵۳ھ میں ایک مرتبہ پھر معزالدولہ اور ناصرالدولہ میں ان بن ہو گئی، وعدے کے مطابق ناصرالدولہ کو دس لاکھ درہم سالانہ ادا کرنا تھے۔ باقیات کی ادائیگی کے لئے ناصرالدولہ نے اپنے بیٹے ابو تغلب مظفر کو یمن بھیجنے کی درخواست کی تو معزالدولہ شبہ میں پڑ گیا۔ اس نے موصل پر فوج کشی کر دی اور موصل پر قبضہ کر کے نصیبین کی طرف چل پڑا اور اس پر بھی اپنا پرچم لہرا دیا۔ اس عرصے میں ابو تغلب مظفر نے موصل پر ہلہ بول دیا مگر پسپا ہوا۔

ناصرالدولہ بھی گھات لگائے ہوا تھا وہ ایک چکر کاٹ کر موصل جا پہنچا اور اس پر دوبارہ قابض ہو گیا اس کے ساتھ ہی اس نے بعض سرداروں کو قتل کر دیا اور ایک تعداد کو گرفتار کر لیا۔

اس مرتبہ ناصرالدولہ کا پلڑا بھاری پڑ رہا تھا لہذا معزالدولہ نے مصلحتاً صلح کی درخواست منظور کر لی۔ ناصرالدولہ نے مقررہ خراج دینا قبول کر لیا۔ قیدی رہا کر دیئے گئے اور معزالدولہ اس کو موصل، دیار ربیعہ اور صوبہ جات کی سند حکومت دے کر واپس ہو گیا۔

بلاشبہ بویہی حکمراں کا سطوت و جبروت تمام ممالک محروسہ میں مسلم تھا پھر بھی جا بجا باغی سر اٹھاتے رہے اور معزالدولہ بڑی خوش اسلوبی سے انہیں فرد کرتا رہا۔ ۳۵۵ھ میں اس نے عمران بن شاہین والی بطائح کی سرکوبی کے لئے واسط کی طرف کوچ کیا لیکن عمان پر قرامطہ نے قبضہ کر لیا تھا لہذا ایک لشکر عمان کی سمت روانہ کیا جس نے عمان فتح کر لیا۔

اس کی فوجیں عمران بن شاہین کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں کہ وہ علیل ہو گیا اور محاصرہ ختم کر کے اور عمران سے اپنی شرائط پر صلح کر کے بغداد آ گیا یہ اس کی آخری فتوحات تھیں۔

تبرا

یوں تو معزالدولہ کے عہد کی بہت سی خصوصیات ہیں مگر تبرا کو ان میں اہمیت حاصل ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک صبح جامع مسجد بغداد کے پھاٹک پر لکھا پایا گیا۔

"معاویہ بن ابی سفیان پر لعنت اور ان لوگوں پر لعنت جنہوں نے حقوق فاطمہؑ غصب کئے، جنہوں نے حسنؑ کو نانا کے پہلو میں دفن ہونے نہیں دیا، جنہوں نے ابوذر کو خارج البلد کیا جنہوں نے عباسؑ کو شوریٰ سے نکلوایا۔"

اگلی رات کسی نے پوری عبارت مٹا دی۔ معزالدولہ دوبارہ لکھوانا چاہتا تھا مگر بعض مشیروں کے کہنے پر صرف معاویہ اور قاتلان آل رسول پر لعنت لکھ دی گئی

بڑی چیخ پکار کی جاتی ہے معزالدولہ کے اس عمل پر۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ معزالدولہ علیؑ کے پیرو تھے، انہیں معاویہ کے فعل کی تقلید نہیں کرنا چاہیئے تھی۔ ابن ابی سفیان نے اگر علیؑ پر ستر ہزار منبروں سے تبرا کرایا تھا تو معزالدولہ کو معاویہ کے بجائے اپنے مولیٰ کی تاسی کرنا چاہیئے تھی۔ جس طرح امیرالمومنین نے اختیار رکھتے ہوئے بھی تلوار نہیں اٹھائی تھی اور صبر سے کام لیا تھا اسی طرح معزالدولہ کو بھی ایسا جواب نہیں دینا چاہیئے تھا مگر معزالدولہ ایک دنیاوی حکمران تھا، وہ علیؑ کا ظرف کہاں سے لاتا پھر صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا تھا، وہ ڈھائی سو برس تک سنتے رہے تھے، کہاں تک سنتے۔ آخر اسی لب و لہجہ میں جواب دینا پڑا جو بشریت کا تقاضا تھا۔

پھر معزالدولہ اور تمام شیعہ حکمراں کوئی دینی رہنما تو تھے نہیں۔ انہوں نے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد سے بدسوں تک دیکھ لیا تھا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیئے بغیر چارہ نہیں اور جو شرافت کی زبان نہیں سمجھتا، اس کو اسی کی زبان میں سمجھانا چاہیئے۔

اس اصول پر اگر معاویہ پر لعنت کی گئی تو برا ماننے کی کیا بات ہے۔ معاویہ کیلئے تو وہی کہا گیا ہے جو اس نے علیؑ کے لئے کہا تھا۔

رہ گئی حقوق فاطمہ غصب کرنے کی حقیقت تو اگر کسی نے حقوق غصب کیے تو وہ یقیناً قابل لعن اور اگر حقوق غصب نہیں کئے تو برافروختہ ہونے کی ضرورت نہیں اور اس کے بعد بھی ناراضگی ہے تو گویا حقیقت غصب کو تسلیم کر لیا

امام حسنؑ کو قبر کی جگہ نہ دینے کا حق شرعی طور پر کسی کو پہنچتا تھا تو لعنت غلط اور اگر نہیں پہنچتا تھا تو بالکل درست۔ اس کا فیصلہ اسلام کے قانون وراثت سے کیا جائے۔ اگر نبی میراث نہیں چھوڑتا تو سب بیویاں اور نواسے برابر، کسی بیوی کو کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

ابو ذرؓ کا جلا وطن کیا جانا ہر مکتبہ فقہ کی رو سے ناجائز ہے۔ حضرت علیؑ اور بعض صحابہؓ کی مشایعت جس کی تصدیق کرتی ہے۔

حضرت عباس کا مجلس شوریٰ سے خارج کیا جانا شہادت دیتا ہے کہ شوریٰ سے خاندان رسولؐ کا ذرا سا تعلق بھی براداشت نہ تھا اس لئے ایسے عمل کو برا نہیں تو کیا اچھا کہا جائے گا؟

اور اگر یہ لعنت اتنی ہی بری تھی تو بعد کے سنی حکمرانوں کو مؤرخین روک لیتے جو باقاعدہ تبرا کی مجلسیں منعقد کراتے تھے جن میں محبان علیؑ تو درکنار ان کے آباء پر بھی لعنت کی جاتی تھی۔ کاش تاریخ کے قلمکار آنکھوں کے اندھے اور کانوں کے بہرے نہ ہوتے تو غزنی کے در و دیوار میں انہیں "بر پدرش لعنت" کی گونج ضرور سنائی دیتی۔

معزالدولہ کا دوسرا کارنامہ ہے عید غدیر کا جشن۔ اٹھارویں ذی الحجہ کو شہر میں چراغاں کیا جاتا، مکان سجائے جاتے، لوگ زرق برق لباس پہنتے اور خوشیاں مناتے کیونکہ اس دن پیغمبر اسلام نے علیؑ کی مولائیت کا اعلان کیا تھا اور حضرت عمر نے مبارک باد دیتے ہوئے تسلیم کیا تھا کہ اس دن کے بعد سے علیؑ ہر مسلمان کے مولیٰ ہو گئے جس کے ذیل میں حضرت ابو بکر بھی تھے اور حضرت عمر بھی اور تاقیامت ان کے تمام ماننے والے بھی۔

علی کے شیدائی اگر اس دن اظہار مسرت کرتے ہیں تو اس میں ہر طبقہ کے مسلمانوں کو شامل ہونا چاہیئے۔ انہیں اپنے مولیٰ کے جشن مولائیت پر تکلیف کیوں؟

جلوس عزا

"روز عاشور شہادت امام حسینؑ پر سوگ منانا یزیدیوں کو ناگوار ہوتا تو قدرے تعجب خیز نہ تھا لیکن معزالدولہ نے جب اس کا حکم دیا تو شیعوں نے اس حکم کی بخوشی و خاطر تعمیل کی، اہل سنت دم تک نہ مار سکے کیونکہ زمام حکومت شیعہ کے قبضے میں تھی اور خلیفہ اس کا محکوم تھا۔ ماہ محرم ۳۵۳ھ میں پھر اس رسم کا اعادہ کیا گیا۔ اہل سنت برداشت نہ کر سکے۔ مابین ان کے اور شیعہ کے فتنہ و فساد برپا ہو گیا بہت بڑی خونریزی ہوئی، مال و اسباب لوٹ لیا گیا"۔

اس کے معنیٰ کھلے لفظوں میں یہ ہیں کہ سنیوں کو نہ علیؑ کے لئے حضورؐ کا کوئی فرمان پسند اور نہ حضور کے نواسے کا غم شہادت برداشت۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا تجزیہ کیا جائے تو تان گروہ بندی پر جا کر ٹوٹے گی اور اس کا آخری کردار یزید بن معاویہ قرار پائے گا مگر صاف گوئی سے اسلام کی مشترک رسی کمزور پڑنے کا خدشہ ہے لہذا صرف اتنی ہی گزارش کافی ہو گی کہ ہم کسی بات میں خوش ہیں تو آپ شریک نہ ہوں مگر ناخوش تو نہ ہوں۔ ہمیں آل رسول کو بیدردی سے قتل کرنے کا صدمہ ہے تو آپ اتنے مشتعل نہ ہوں کہ ہم پر حملہ کر دیں اور اگر اس پر تلے ہوئے ہیں تو اعلان کر دیں کہ آپ قاتلان کربلا کے ساتھ ہیں اور ان کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔

ہمارے نقطہ نگاہ سے معزالدولہ کا طرہ امتیاز ہے کہ اس نے عاشور کو کربلا کی یاد میں پہلا جلوس عزا نکالا۔

"شہر اور دیہات کے لوگ سیاہ ماتمی لباس میں شارع عام پر برآمد ہوئے، عورتیں شہیدوں کے نام لے لے کر بین کرتی، ماتم کناں، چہروں پر خاک ملے، بال کھولے، رخساروں پر طمانچے مارتی ہوئی آہستہ آہستہ بڑھتی نظر آئیں، شہر کے بازار سونے، دوکانیں بند، چہل پہل کی کوئی علامت نہیں۔ سوگوار فضا میں حسین حسین کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔" (۲۹)

دیکھنے والوں پر تاثر کا یہ عالم کہ دو پچھاڑیں کھانے لگے۔ نتیجے میں اولاد

رسولؑ کے قاتلوں سے ان کی نفرت کا بڑھ جانا یقینی تھا شاید یہی بات ایک گروہ کو گوارا نہ ہو سکی اور وہ جلوس پر حملہ آور ہو گیا۔

معزالدولہ کا یہ تاریخی اقدام وقت کے دھارے پر آگے بڑھتا رہا ہے اور آج تمام دنیا میں اس کی تاسی کی جاتی ہے۔کوئی اسلام سے آشنا ہو یا نہ ہو لیکن یوم عاشور ہر خطۂ ارض کو معلوم ہو جاتا ہے کہ چودہ سو سال قبل پیغمبر اسلام کا نواسا اپنی صداقت کے جرم میں بڑی بے رحمی سے شہید کر دیا گیا۔

ہم حشر تک معزالدولہ کے احسان مند رہیں گے کہ اس نے ہمیں وہ راستہ دکھایا جس پر عمل پیرا ہو کر ہم شہید اعظم کا پیغام دنیا تک پہنچاتے رہتے ہیں اور ہر مظلوم کو بتاتے ہیں کہ ظالم کتنا ہی توانا ہو، اسکے آگے سر جھکا دینا بنی نوع انسان اور انسانیت دونوں کی توہین ہے۔

مخالف مورخین اس بطل حریت کیلئے کچھ لکھیں لیکن زید شہید اور نفس ذکیہ کا یہ غلام مختار ثقفی کی وہ نظیریں پیش کر گیا جسکے نقش قدم پر شیعوں کے قافلے ہمیشہ رواں دواں رہیں گے۔

آخر اس کا انجام بھی ہر ذی روح کی طرح ہوا اور ربیع الاول ۳۵۶ھ میں طویل علالت کے بعد وہ بغداد میں اپنے خالق حقیقی سے جاملا اور اس کا بیٹا عزالدولہ باپ کا جانشین ہوا۔

"خاندان بنی بویہہ کا اصل بانی علی بن بویہہ الملقب بہ عمادالدولہ والی فارس تھا۔ معزالدولہ اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس کے حصے میں کرمان کا علاقہ آیا تھا لیکن خلافت بغداد کی تولیت کا جلیل القدر منصب اس کی قسمت میں تھا۔ ۳۲۴ھ میں اس کو یہ منصب ملا، ۳۵۶ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس حساب سے اس نے گویا ۲۶ سال تک خلافت بغداد کی فرمانروائی کی۔"

ابن خلدون، معین الدین اور بعض دوسرے مورخین نے بویہین کے کرداروں اور نظم و نسق میں کیڑے ڈالنے کی کوشش کی ہے جن میں معزالدولہ سرفہرست ہے مگر حقیقت صرف اتنی ہے جس کو شاہ معین الدین لکھ گئے ہیں۔

"بنی بویہہ نہایت متعصب شیعہ تھے۔ چند دنوں تک تو وہ خاموش رہے

پھر ان کا تعصب ظاہر ہونے لگا، دولت عباسیہ کے بہت سے وزراء اور متوسل عجمی اور شیعہ تھے لیکن ان میں سے کسی نے علانیہ شیعیت کی ترویج و اشاعت کی جرأت نہ کی تھی۔ معزالدولہ نے خلفاء کی قوت ختم کرنے کے ساتھ ہی بغداد میں شیعیت کی تبلیغ شروع کر دی۔" (۳۰)

یہ انداز بیان عصبیت سے خالی نہیں تاہم اس کو خلاف واقعہ کہا نہیں جا سکتا۔ امیرالمومنین کی شہادت کے بعد سے شیعہ جو تقیہ میں گئے تو عموماً اس سے باہر نہیں نکلے اور وقت کی رفتار کو دیکھتے ہوئے دائرہ شریعت میں رہ کر مصلحت سے کام لیتے رہے۔ اموی عہد حکومت میں بھی جابجا ایسے لوگ موجود تھے جو دلوں میں حب علیؑ کی شمعیں جلائے ہوئے تھے مگر آنکھوں سے بھی اس کی روشنی کو ظاہر نہ ہونے دیتے اور عباسیوں کے سفاکانہ دور میں بھی کسی نے علی الاعلان آل محمدؐ کی دوستی کا دم نہیں بھرا۔ وقت کے تدریجی ارتقاء کے ساتھ دور دراز علاقوں میں ایک طرف ان کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں وجود میں آتی رہیں، دوسری طرف عقیدے کا اظہار کئے بغیر وہ حکومت میں دخیل ہوتے رہے۔

موٹے موٹے نام گنوائے جائیں تو تعداد سیکڑوں تک پہنچ جائے گی: اسحق کاتب، ابو سلمہ خلال، ابو عبداللہ یعقوب ابن داؤد، فضل ابن سہل، حسن ابن سہل، حسن ابن علی، ابوالفضل جعفر، ابوالفتح فضل ابن جعفر، محمد ابن حسین ذوالکفایتین، ابوالفتح علی ابن محمد، مہلبی ابو دلف عجلی، ابوالقاسم وزیر مغربی، ابو عبداللہ حسین ابن زکریا، ابراہیم صولی، طلائع ابن زریک، افضل، ابن افضل، ابوالحسن جعفر ابن محمد، ابن فطیر، ابوالمعالی، حسن ابن سلیمان وغیرہ وغیرہ کتنے ہی اسمائے گرامی ہیں جو شیعہ جلی یا خفی تھے اور نہایت خاموشی سے تاحیات خدمات اہل بیت کرتے رہے۔

چھوٹی بڑی حکومتوں کا ذکر زیر قلم ہے جو بڑی احتیاط سے مسلک آل محمد کی اشاعت کرتے رہے۔ ان میں آل حمدان کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے مگر انہوں نے بنی طاہر کی طرح کھلے بندوں شیعیت کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ اپنی حکومت کی بقاء کے لئے کوشاں رہے اور آل بویہہ سے مسلسل ٹکر لیتے رہے......... کیونکہ حکومت چھ

ہی ایسی ہوتی ہے کہ اس میں رشتہ ناتہ اور عقیدہ کچھ دیکھا نہیں جاتا۔
بقول شاہ ندوی یہ صرف بوبہین تھے جنہوں نے کھلم کھلا نعرہ اہل بیت لگایا اور معزالدولہ نے تو دھڑلے کے ساتھ فاطمہؑ اور آل فاطمہؑ کے حقوق کا اعلان کر دیا اور ان کے جانشین بھی اسی جادہ مستقیم پر قائم رہے۔

بنی حمدان کا نامور شمشیر زن

تاریخ میں حمدانی حکومت کا عروج دو ناموں کا رہین منت ہے: ناصر الدولہ اور سیف الدولہ ۔ یہ دونوں بھائی صحیح معنیٰ میں تاریخ ساز تھے اور ان کے بعد ہی اس حکومت کا زوال شروع ہو گیا۔

ناصرالدولہ کی عمر معزالدولہ سے جنگ و جدال میں گزر گئی جس میں سیف الدولہ بھی برابر کا شریک رہا لیکن وہ حلب اور سرحدی علاقوں کا حکمران تھا لہٰذا اسے بار بار عیسائیوں سے متصادم ہونا پڑا۔ وہ تنہا شخص ہے جس نے اس زمانے میں عیسائیوں کی بھرپور یلغاروں کو روکا اور انہیں پے در پے شکستیں دیں ۔ اس لحاظ سے اس کو صلاح الدین ایوبی کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔

سیف الدولہ بھی بڑے بھائی ناصر الدولہ کی طرح اثنا عشری تھا لیکن فاطمین مصر کی اس کی نظر میں بڑی وقعت تھی وہ ان کا احترام کرتا تھا۔

جنگ آزمائی میں وہ ناصرالدولہ سے کسی طرح پیچھے نہ تھا بلکہ بڑھا چڑھا تھا ۳۳۵ھ میں اس سے قیدیوں کے تبادلے کے بعد رومیوں کی صلح ہو گئی تھی لیکن ۳۳۶ھ میں انہوں نے شہر مرعش پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا سیف الدولہ نے آگے بڑھ کر مقابلہ کیا مگر انہیں پسپا نہ کر سکا، لڑائیاں ہوتی رہیں

۳۳۷ھ میں سیف الدولہ رومی مقبوضات میں گھس گیا، ہزاروں قیدی اور مال غنیمت لے کر پلٹا مگر راستے میں عیسائی فوجوں نے گھیر لیا اور فتح شکست میں بدل گئی۔ سیف الدولہ تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ بچ نکلا۔

۳۴۱ھ میں عیسائیوں نے پھر یورش کی اور اسلامی علاقوں پر تاخت کی ، ۳۴۲ھ میں سیف الدولہ نے جواباً رومی سرحدوں پر حملہ کیا اور اتنی غارت گری کی

کہ عیسائی بوکھلا گئے، عیسائیوں نے مشتعل ہو کر ایک بڑا لشکر فراہم کیا، حرث کے قریب فریقین کا سخت مقابلہ ہوا اور عیسائی ہزیمت یاب ہوئے ۔ ہزاروں قیدی سیف الدولہ کے ہاتھ آئے طرطوس کے عیسائی گورنر نے اطاعت کر لی۔

عیسائی بھی خاموش بیٹھنے والے نہ تھے انہوں نے سیف الدولہ کے ہٹتے ہی طرطوس کو پامال کر ڈالا اور شکست کا بدلہ لے لیا۔

اس کے بعد سیف الدولہ نے عیسائی مملکت میں گھس کر بدلہ لے لیا مگر اس مرتبہ بھی واپسی پر عیسائیوں نے اپنے قیدی اور مال غنیمت چھین لیا۔ ۳۵۰ھ میں سیف الدولہ کا ایک سپہ سالار میافارقین کی طرف سے بلاد روم میں گھس گیا اور عیسائیوں کو ایک سبق دے کر بعافیت واپس آگیا۔

ماہ محرم ۳۵۱ھ میں رومیوں نے پھر سر اٹھایا اور عین زربہ کے قریب ایک پہاڑی پر قبضہ کر لیا پھر شہر کو گھیر لیا ۔ اہل شہر نے پناہ کے وعدے پر دروازے کھول دیئے مگر عیسائیوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کیا کہ شہر کی سڑکیں خون سے رنگین ہو گئیں ۔ ساز و سامان جو کچھ مل سکا، اس کو لے کر عیسائی واپس ہو گئے مگر قوساریہ میں اپنی فوجیں چھوڑ گئے۔

اس کے بعد ہی عیسائیوں نے حلب کا محاصرہ کر لیا۔ سیف الدولہ اس کے لئے تیار نہ تھا پھر بھی وہ بڑی بہادری سے لڑا۔ اہل شہر نے ساتھ دیا مگر شکست ہوئی عیسائیوں نے قتل عام شروع کر دیا، شہر کو جلا کر خاک کر دیا۔ شہریوں نے عیسائی بادشاہ کے بھانجے کو قتل کر دیا اس لئے بادشاہ نے غصے میں بارہ سو قیدیوں کو جیل سے نکلوا کر قتل کرا دیا۔

سیف الدولہ نے ایسی شکست کے باوجود ہمت نہ ہاری، تھوڑے ہی دنوں میں لشکر کو درست کر کے نکلا۔ پہلے عین زربہ کو عیسائیوں سے چھینا پھر طرطوس پہنچ کر مزید تیاری کی اور روم کے کئی سرحدی شہروں پر حملے کر کے انہیں تباہ کر ڈالا رومیوں نے جواب میں قلعہ سنتہ پر چڑھائی کر دی، اس کو فتح کر کے کئی نواحی قلعوں پر قابض ہو گئے۔

اس اثناء میں سیف الدولہ کے غلام تجا نے ایک رومی لشکر کو شکست فاش

دی اور پانچ سو سپاہی گرفتار کر لئے۔اس کے بعد فوری طور پر رومیوں کی یلغار رک گئی کیونکہ انہوں نے اپنے بادشاہ کو قتل کر ڈالا تھا۔

سیف الدولہ اور عیسائیوں کے معرکوں میں غالب و مغلوب کا فیصلہ کبھی نہیں ہو سکا۔اتنا کہا جا سکتا ہے کہ حمدانی بہادر کو قدرے اطمینان میسر آجاتا تو وہ عیسائیوں کی طاقت کو اتنا توڑ دیتا کہ کل کے صلاح الدین ایوبی کو ان کی سرکوبی کے لئے اتنی محنت کرنا نہ پڑتی .... لیکن سیف الدولہ کو مسلسل اندرونی اور بیرونی تنازعات کا سامنا کرنا پڑا۔

عیسائیوں سے نپٹ کر وہ سکون کی سانس بھی لینے نہ پایا تھا کہ ناصر الدولہ کے بیٹے ہبتہ اللہ نے بغاوت کر دی۔پھر اس کا غلام تجا خم ٹھونک کر میدان میں آگیا سیف الدولہ نے دونوں مرحلوں کو سر کر لیا تاہم اس کو وقت اور قوت دونوں صرف کرنا پڑیں۔

۳۵۳ھ میں عیسائیوں نے مصیصہ پر قبضہ کر کے تاراج کر ڈالا پھر ۳۵۴ھ میں یہی حال طرطوس کا بھی کیا۔ان کی شہ پر اہل انطاکیہ نے بھی بغاوت کر دی۔ سیف الدولہ عیسائیوں کے مقابلے میں نکلنے ہی والا تھا کہ انطاکیہ کی خبر پہنچی لہذا وہ پہلے اسی طرف متوجہ ہو گیا۔اہوازی اور وزیر اہل انطاکیہ کے سربراہ تھے۔انہوں نے عرصے تک مقابلہ کیا۔آخر گرفتار ہو کر مارے گئے......... اس کے بعد ہی سیف الدولہ کو مروان قرمطی کی بغاوت فرد کرنا پڑی۔

۳۵۵ھ میں عیسائیوں نے اپنی حدود سے نکل کر "آمد" کا محاصرہ کر لیا مگر اہل شہر نے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا، مجبوراً وہ میافارقین کے قریب دارا کی طرف بڑھ گئے۔سیف الدولہ نصیبین میں مقیم تھا اور بڑی تیزی سے فوجیں منظم کر رہا تھا۔عیسائیوں پر سیف الدولہ کی شجاعت کا رعب بیٹھا ہوا تھا۔وہ اس کی تیاریوں کی خبروں سے خائف ہو گئے اور میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

پھر عیسائیوں نے انطاکیہ کے گرد گھیرا ڈالا مگر اہل شہر کی مسلسل مدافعت سے مایوس ہو کر طرطوس کی جانب پلٹ گئے۔

اس کے بعد ہی ماہ صفر ۳۵۵ھ میں بمقام حلب سیف الدولہ کا انتقال ہو گیا

"اس وقت یہی ایک فرمانروا مسلمان حکمرانوں میں بہادر اور باہمت تھا اس لئے تنہا وہی رومیوں کے مقابلے میں سینہ سپر ہوا اور برسوں ان کا مقابلہ کرتا رہا۔عباسی حکومت میں کوئی دم نہ تھا، وہ کوئی مدد نہ کر سکی۔"

"قیصر ارمانوس کا سپہ سالار تقفور (ینکوفورس) مسلمانوں کا سخت دشمن تھا اس نے بلقان کی تمام ریاستوں کو متحد کر کے شام و جزیرہ کی سرحد پر عام یورش کر دی اور ۳۳۶ھ سے لے کر ۳۶۲ھ تک مسلسل پچیس سال کی خونریز لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ان میں لاکھوں مسلمان قتل اور گرفتار ہوئے۔رومیوں نے سروج، عین زربہ، آذنہ، مصیصہ، طرطوس، بہت سے سرحدی شہروں، فوجی چھاونیوں اور قلعوں پر قبضہ کر کے ان کو بالکل ویران کر ڈالا، ان کی پوری مسلمان آبادی تہہ تیغ کر دی۔ہزاروں مسلمانوں کو قید کر کے لونڈی غلام بنا ڈالا۔مسجدوں کو مسمار کر دیا اور بہت سے مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنا لیا۔"

"ان نازک اور پر آشوب حالات میں تنہا سیف الدولہ ان کے مقابلہ پر سینہ سپر ہوا اور گو وہ رومیوں کی یورش کو پوری طرح نہ روک سکا لیکن جب تک زندہ رہا، بڑی شجاعت اور دلیری سے مقابلہ کرتا رہا اور جہاں تک ہو سکا رومیوں سے ان کے ظلم و سفاکی کا انتقام بھی لیا۔" (۳۱)

سیف الدولہ کی ناوقت موت کے بعد عیسائی شیر ہو گئے.......... ادھر اس کے بیٹے ابو لمعالی شریف اور اس کے اہل خاندان سے حلب کے لئے جنگ شروع ہو گئی اور مسلمانوں کا رہا سہا بھرم بھی جاتا رہا۔

طرفہ ستم یہ ہوا کہ جمادی الاول ۳۵۵ھ میں ناصر الدولہ کو اس کے بیٹے ابو تغلب نے گرفتار کر کے موصل میں نظر بند کر دیا اور موصل و حلب دونوں حکومتوں میں خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی جو بنی حمدان کے زوال کا پیش خیمہ

بویہین کا شیرازہ حکومت

عماد الدولہ علی اس خاندان کا سربراہ بھی تھا اور بانی حکومت بھی۔وہ ۳۳۸ میں ساڑھے سولہ سال حکومت کر کے دنیا سے اپنا رشتہ منقطع کر گیا تو رکن

الدولہ حسن کا بیٹا عضد الدولہ فارس کا حکمراں ہوا کیونکہ عماد الدولہ کے کوئی اولاد نہ تھی اس نے اپنی زندگی میں منجھلے بھائی کے بیٹے کو اپنا جانشین بنا دیا تھا۔

۳۵۶ھ میں جب معزالدولہ احمد کا انتقال ہوا تو عزالدولہ بختیار نے باپ کا منصب سنبھالا۔

رکن الدولہ حسن بقید حیات تھا جو عماد الدولہ کے بعد سے قبیلہ کا رئیس اعظم تھا۔ معزالدولہ نے جیتے جی اس کی اطاعت کی اور عزالدولہ بھی اس کے حکم کا پابند تھا۔ اس شریفانہ تہذیب میں رکن الدولہ نے ہر موقع پر اپنی بزرگانہ حیثیت کی لاج رکھی اور چچیرے بھائیوں میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہونے دیا۔

اب عزالدولہ عظیم معزالدولہ کے بجائے کرمان و عراق کا حکمران اور خلافت بغداد کا متولی تھا۔ بڑے باپ کے بیٹے اکثر نااہل ہوتے ہیں۔ عزالدولہ بختیار ایسا تو نہ تھا مگر اس میں معزالدولہ کا سا تدبر اور سوجھ بوجھ نہ تھی لہذا اس کے غلط فیصلوں سے بغداد کی منظم بساط میں رخنے پڑنے لگے اور ترک و دیالمہ دونوں اس کے خلاف ہو گئے۔

عباس بن حسین اس کا وزیر تھا، خزانہ خالی ہونے کے سبب اس نے امراء کی جائیدادیں ضبط کیں اور عوام سے زبردستی رقوم وصول کیں، نتیجے میں بدامنی پھیل گئی۔ عزالدولہ کے اس عمل میں عباس کے مشوروں کو دخل تھا۔ وہ ذاتی طور پر ایسا کوئی اقدام شاید نہ کرتا جسکو بعد میں محسوس کیا اور ۳۶۲ھ میں اس نے عباس کو ہٹا کر ابن بقیہ کو وزیر بنایا، وہ بھی عام مخالفت کم نہ کر سکا۔

انہیں دنوں دیلمی اور ترکی فوجیوں میں جھگڑا ہو گیا عزالدولہ نے دیالمہ کا ساتھ دیا جس کے سبب معزالدولہ کا وفادار حاجب سبکتگین بھی عزالدولہ کا مخالف ہو گیا اور اس نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ معزالدولہ اپنے بھائیوں سمیت واسط چلا گیا

اس موقع پر سنیوں نے شیعوں سے بدلہ لیا کیونکہ ترک سنیوں کے حمایتی تھے۔ کافی کشت و خون ہوا اور شیعوں کے گھربار لوٹ لئے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم سرحدوں پر عیسائی حملے ہو رہے تھے۔ ۳۵۶ھ میں جب سیف الدولہ کا انتقال ہوا تو گویا عیسائیوں کو روکنے والا حصار ٹوٹ گیا اور

سرحدی شہروں کے مسلمان اپنے گھروں میں بھی محفوظ نہ رہے۔ بغداد کے باحمیت مسلمانوں نے عیسائیوں کے سد باب کے لئے ہنگامہ کیا لیکن فالج زدہ خلیفہ مجبور تھا لہذا ترکوں نے اس کے بجائے عبدالکریم طائع کو تخت خلافت پر بٹھا دیا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

اس دوران ناصرالدولہ کے دوسرے بیٹے ہبتہ اللہ نے دیار بکر میں رومیوں کو شکست دے کر ان کے سپہ سالار کو گرفتار کر لیا تھا جس سے عیسائیوں کا زور گھٹ گیا تھا اور ان کی یلغار رک گئی تھی پھر بھی بغداد میں حالات ویسے ہی تھے۔ سبکتگین بدستور بغداد پر قابض تھا۔

عزالدولہ بختیار نے ان حالات کی خبر رکن الدولہ اور عضد الدولہ کو کر دی تھی۔ رکن الدولہ نے اپنے وزیر ابوالفتح کو روانہ کیا اور عضد الدولہ اپنے بھائی ابو عبداللہ حسین کو لے کر چلا مگر ابوالفتح کو اس نے اہواز میں روکے رکھا اور ابو عبداللہ تکریت پہنچ کر ٹھہر گیا۔

سبکتگین نے خلیفہ طائع کے ساتھ بغداد سے نکل کر واسط کا محاصرہ کر لیا لیکن انہیں دنوں اس کا وقت آخر آپہنچا اور ترکوں نے اس کے بجائے فتگین کو اپنا امیر بنا لیا

ابو عبداللہ منصوبے کے مطابق بغداد جا پہنچا اور اس پر باسانی قابض ہو گیا

عضد الدولہ نے واسط کا رخ کیا تو ترکوں نے محاصرہ اٹھا کر دیالی میں مورچہ قائم کر لیا، عضد الدولہ واسط سے عزالدولہ کو لیکر بغداد کا عازم ہوا۔ ترکوں نے مداین کے قریب اس کو روکنے کی کوشش کی مگر شکست کھائی اور وہ تکریت چلے گئے۔

ابو تغلب حمدانی بھی بغداد فتح کرنے کی فکر میں نکلا تھا مگر عضد الدولہ کی راہ میں بعض رکاوٹیں ڈالنے کے سوا کچھ نہ کر سکا اور بے نیل مرام موصل واپس ہو گیا

عضد الدولہ کی نیت چچیرے بھائی عزالدولہ کے لئے نیک نہ تھی مگر رکن الدولہ کے ڈر کی وجہ سے وہ خاموش رہا البتہ فوج کو انعام کے مطالبہ کے لئے بھڑکا دیا اور عزالدولہ کو مشورہ دیا کہ رقم دینے کے بجائے حکومت سے بے تعلقی کا اعلان کر دے۔ سادہ لوح عزالدولہ اس فریب میں آگیا۔ خلیفہ طائع بھی عزالدولہ سے

حالاں تھا وہ اس کے استعفیٰ پر عضدالدولہ کی پناہ میں آگیا پھر عضدالدولہ نے عزالدولہ بختیار کو بہانے سے گرفتار کرلیا۔

رکن الدولہ بیٹے کے اس فعل سے بہت برہم ہوا اور عضدالدولہ کے ہزار بہانوں کے باوجود نہ مانا۔ اس کو اپنے بھتیجے بیٹے سے کم عزیز نہ تھے آخر عضدالدولہ کو عزالدولہ بختیار کو بحال کرنا پڑا مگر اس میں کوئی اہلیت نہ تھی اس نے انصرام حکومت پھر ابن بقیہ پر چھوڑ دیئے جو بہت چالاک آدمی تھا، آخر اس سے عزالدولہ کے تعلقات خراب ہو گئے۔

۳۶۵ھ میں رکن الدولہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے عضدالدولہ کو معاف کر دیا اور اس کو اپنا ولی عہد نامزد کیا۔ دوسرے بیٹوں ابوالحسن، فخر الدولہ اور موئدالدولہ کو ہمدان اور اصفہان کی حکومتیں عطا کیں اور سب کو متحد و متفق رہنے کی وصیتیں کر کے محرم ۳۶۶ھ میں ملک عدم سدھار گیا۔

"رکن الدولہ بڑا جامع اوصاف فرمانروا تھا اس میں تدبر و سیاست اور محاسن اخلاق تمام خوبیاں جمع تھیں۔ عدل و انصاف میں بڑا اہتمام کرتا، اس کے دور میں کسی پر ظلم نہ ہونے پاتا، رعایا میں بہت مقبول و محبوب تھا، حتی الامکان خونریزی سے بچتا تھا، صرف مجبوری کی حالت میں تلوار اٹھاتا، بڑا مخیر و فیاض اور فقرا و مساکین کا ملجا و ماویٰ تھا، مزاج میں نرمی اور حلم غالب تھا، دشمنوں کے ساتھ بھی نرمی کا برتاؤ کرتا تھا۔" (۳۲)

بحیثیت مجموعی رکن الدولہ اہل خاندان اور رعایا کے لئے پدرانہ شفقت کا ایک مثالیہ تھا جس کو ہماری تہذیبی روایات آج بھی وقت کے ہر موڑ پر تلاش کرتی ہیں۔

بنی حمدان کی باہمی نبرد آزمائی

ناصرالدولہ نے تین بیٹے چھوڑے تھے: ابو تغلب، ابو عبداللہ اور ابو طاہر ابراہیم۔ سیف الدولہ کے بیٹے پوتوں کے نمایاں نام ابوالمعالی شریف، اس کا بیٹا ابوالفضائل سعداللہ، ابوالفضائل کا بیٹا ابوالمعالی اور ابوالحسن علی وغیرہ تھے۔

ابو تغلب بن ناصرالدولہ کو حکومت ہاتھ میں لیتے ہی ایک عزیز ابو فراس کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا جس کو شکست دے کر ابو تغلب نے صلح پر مجبور کر دیا اس کے بعد ہی ناصرالدولہ ۳۵۸ھ میں انتقال کر گیا اور موصل میں مدفون ہوا۔

حمدان سے ابو تغلب کی صلح ہو گئی تھی مگر دونوں کے درمیان بدگمانی باقی تھی۔ اس اثنا میں ابراہیم اور حسین حمدان سے مل گئے اور اس کے خلاف سازش کرنے لگے اور ان کے مابین معمولی جھڑپیں ہونے لگیں۔

عیسائیوں نے اس خلفشار سے فائدہ اٹھا کر انطاکیہ اور حلب کا محاصرہ کر لیا مگر مسلمان جب مقابلے کے لئے بڑھے تو وہ بھاگ گئے۔

موقع سے فائدہ اٹھا کر سیف الدولہ کے غلام قرعویہ نے علم بغاوت بلند کر دیا اور ابوالمعالی کو حلب سے نکال کر خود سر حکمراں بن گیا۔ ابوالمعالی نے پہلے حران کا رخ کیا اور وہاں داخل نہ ہو سکا تو میافارقین کا عازم ہوا۔ وہاں اس کی والدہ نے ٹھہرنے نہ دیا تو حماۃ کی طرف روانہ ہوا۔

جب کوئی حکومت رو بہ زوال ہوتی ہے تو اس کے افراد چھوٹی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ حال حمدانیوں کا بھی تھا۔ اس افراتفری میں ابو تغلب میافارقین پر چڑھ دوڑا اور اپنی والدہ سے تاوان جنگ لے کر واپس ہوا۔

عیسائی پہلے ہی سے گھات میں لگے ہوئے تھے، انہوں نے انطاکیہ پر قبضہ کر لیا پھر حلب کو گھیرے میں لے لیا، آخر قرعویہ نے خراج دینے کا وعدہ کر کے صلح کر لی

نصف ۳۵۹ھ میں ابو تغلب حران پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا اور وہاں اپنا نائب چھوڑ کر موصل کی طرف واپس ہوا جس پر اس کی عدم موجودگی میں عزالدولہ بختیار نے قبضہ کر لیا تھا جو آپس کی مناقشت کا نتیجہ تھا۔ حمدان اور ابراہیم ابو تغلب کی عدوات میں بغداد جا کر عزالدولہ کو لائے تھے اور اب موصل کو اس کے قبضے سے نکالنا ابو تغلب کے بس کی بات نہ تھی۔

ابو تغلب نے حالات کو سمجھتے ہوئے عزالدولہ کے سامنے دامن مصالحت پھیلا دیا جس کو عزالدولہ نے منظور کر لیا اور اپنی شرائط منوا کر بغداد واپس ہو گیا۔

اس طرح حمدانی حکمران کبھی غیروں سے مگر بیشتر اپنوں سے لڑتے بھڑتے

رہے اور اپنی طاقت کو کمزور کرتے رہے۔

دمشق ایک عرصے سے مصر کے مقبوضات میں شامل ہو چکا تھا ابو المعالی کے کئی مقابلے دمشق کے گورنر سے بھی ہوئے اور ایک موقع پر اس نے والی انطاکیہ سے مدد بھی حاصل کی۔ آخر وہ رقہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا پھر دیار بکر کے بعض علاقوں پر قابض ہو گیا مگر اس کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ ۳۹۱ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ سعید الدولہ ابو الفضائل اس کا جانشین ہوا۔ اس کے ایام حکومت بھی لڑتے بھڑتے گزر گئے۔ آخر سیف الدولہ کے غلام ابو نصر نے اپنے آقا کو معزول کر کے حلب پر قبضہ کر لیا اور وہاں مصر کے علوی حاکم کا خطبہ پڑھا دیا۔

اس کے بعد ابو الحسن بن ابو الفضل اور ابو المعالی بن ابو الفضل نے بعض حصوں پر حکومت کی اور ۳۹۴ھ میں حمدانی حکومت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

بنی بویہ کا دوسرا معمار: سلطان عضد الدولہ

عضد الدولہ کی آنکھیں شروع ہی سے بغداد کی جانب لگی ہوئی تھیں مگر اسے باپ کی وصیت اور فہمائش کا احترام تھا وہ از خود عزالدولہ بختیار کے خلاف کوئی اقدام نہ کرتا لیکن عزالدولہ نے خود اس کا موقع دیدیا۔ وہ عضد الدولہ سے مطمئن نہ تھا لہذا چچا کی وفات کے بعد سے فوجی تیاری میں لگ گیا اور اس کے ساتھ ہی امرائے رکن الدولہ فخر الدولہ اور حسنویہ کردی وغیرہ سے ساز باز شروع کر دیا اور ابو تغلب اور عمران شاہین سے بھی مدد کا طالب ہو گیا۔

عضد الدولہ کو اس کی خبر لگی تو وہ اپنی فوجوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ عزالدولہ بختیار حسنویہ اور ابن حمدان کے فریب وعدہ پر اہواز جا پہنچا۔ دونوں میں ایک خونریز جنگ ہوئی اور عزالدولہ نے شکست کھا کر واسط کی راہ لی۔ اس موقع پر عمران بن شاہین نے آلات حرب اور سامان سے مدد کی اور عزالدولہ اس کی پناہ میں چلا گیا پھر واسط آگیا۔

عضد الدولہ نے فتح پا کر ایک سپہ سالار بھیج کر بصرہ پر قبضہ کر لیا اور مضر و ربیعہ قبائل کی پرانی دشمنی کو ختم کرا کے دونوں میں میل کرا دیا....... عزالدولہ

اس شکست سے مایوس نہ تھا اس نے نئے سرے سے فوج کو مرتب کیا اس دوران حسنویہ کے دو بیٹے ایک ہزار سواروں کے ساتھ اس کی کمک کو آگئے پھر بھی وہ عضد الدولہ کی طاقت سے خائف تھا۔

اس جنگ میں جن لوگوں نے عزالدولہ بختیار سے سازش کی تھی، ان میں رکن الدولہ کا وزیر ابو الفتح بن عمید بھی تھا، عضد الدولہ نے اس کو گرفتار کر کے آنکھیں پھڑوا دیں اور عزالدولہ بختیار سے کہلا بھیجا کہ اطاعت کی شرط پر وہ اس کو کہیں بھی چلے جانے کی اجازت دے سکتا ہے۔ عزالدولہ چار و ناچار اس پر آمادہ ہو گیا اور عضد الدولہ کی ہدایت کے مطابق ابن بقیہ کو پکڑوا کر اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں۔

اس کے بعد عضد الدولہ بغداد میں داخل ہوا۔ جامع مسجد میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور پھاٹک پر تین بار نوبت بجائی گئی جو کسی بادشاہ کی آمد کا اعلان تھا

عزالدولہ باحال پریشان شام کا راہی ہوا۔ اس کے ساتھ حمدان بن ناصر بھی تھا جو اس کو موصل کی طرف لے چلا، حالانکہ عضد الدولہ نے ابو تغلب کے علاوہ کسی کے پاس چلے جانے کی اجازت دی تھی۔ وہی ہوا جس کا خطرہ عضد الدولہ کو تھا۔ ابو تغلب نے حمدان کو گرفتار کرا دینے کی شرط پر عزالدولہ سے مدد کا وعدہ کر لیا۔ نادان امیر اس بہلاوے میں آگیا۔ اس نے حمدان کو پکڑوا دیا اور ابو تغلب بیس ہزار کی جمعیت لے کر اس کے ساتھ بغداد کی سمت چل پڑا۔

عضد الدولہ بھی مقابلے کے لئے بغداد سے نکل کھڑا ہوا، لشکروں میں گھمسان کی جنگ ہوئی اور حمدانی لشکر ہزیمت یاب ہوا۔ عزالدولہ گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا۔ ابو تغلب بھاگ نکلا۔

عضد الدولہ نے اس پر اکتفا نہ کی۔ اسی سلسلے میں موصل کی سمت پیش قدمی کی اور شہر پر قبضہ کر لیا........... اس مقام پر اطمینان سے ٹھہر کر اس نے ابو تغلب کی تلاش میں فوجی دستے روانہ کئے اور اس کے ایک سردار ابو الوفا نے ابو تغلب کو نصیبین میں جا لیا۔ ابو تغلب بھاگ کر میافارقین پہنچ اور ایک دروازے سے داخل ہو کر دوسرے سے نکل گیا۔ اس طرح حسنیہ جا کر اس نے دم

لیا۔ بویہی فوج تعاقب میں وہاں پہنچی تو ابو تغلب روم بھاگ گیا......... طویل قیام
کے بعد وہ مملکت اسلامیہ میں واپس ہوا تو آمد میں قیام کیا۔

ابو تغلب کے سلسلہ تعاقب میں جو مقامات پڑتے رہے، عضد الدولہ نے
ان سب پر اپنے پہرے بٹھا دیئے، میافارقین، رحبہ، دیار مضر اور دوسرے تمام
مقامات فتح کر لئے جو کبھی حمدانی حکومت کے شہر تھے۔

۳۶۸ھ میں ابو الوفا کو اس علاقے کا حاکم بنا کر عضد الدولہ بغداد واپس ہو گیا

شام میں رملہ کے قریب بنی عقیل کی آبادی تھی۔ ابو تغلب آمد سے چل کر
وہاں آگیا اور قبیلہ بنی عقیل میں آکر قیام پذیر ہوا۔ اس زمانے میں رقہ پر ایک
عرب سردار وغفل قابض تھا اس کو شبہ ہوا کہ ابو تغلب بنی عقیل سے مل کر اس کو
ہٹا دینا چاہتا ہے لہذا اس نے حملہ کر کے ابو تغلب کو ختم کر ڈالا۔ بنی عقیل نے اس
کے بیوی بچوں کو ابو المعالی کے پاس بھجوا دیا۔

اب عضد الدولہ بغداد میں معزالدولہ کی یاد تازہ کر رہا تھا وہ کچھ روز آرام
کرنا چاہتا تھا کہ کردستان میں خلفشار کی خبریں ملیں اور اس کو اس طرف متوجہ
ہونا پڑا۔

یہ حکومت ۳۵۰ھ میں قائم ہوئی تھی اس میں اور بنی بویہ میں پہلے سے
کشمکش تھی اس کے فرمانروا بدر بن حسنویہ کے کئی بھائی تھے جو مختلف قلعوں پر
قابض تھے اور آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہو رہے تھے۔ عضد الدولہ نے
۳۶۹ھ میں ایک ایک کر کے سارے قلعوں کو مسخر کر لیا اور اپنی طرف سے بدر کو
ان سب کا حاکم بنا دیا۔

اب عضد الدولہ کے خاندانی مخالفین میں فخر الدولہ اس کی آنکھ میں کھٹکتا
تھا اس نے عزالدولہ بختیار کا ساتھ دیا تھا، وہ ان دنوں ہمدان کا والی تھا۔
عضد الدولہ کو خطرہ تھا کہ کبھی اس کے خلاف نہ اٹھ کھڑا ہو اس لئے اس نے اس کو
ایک تادیبی خط لکھا جس کا جواب فخر الدولہ نے خاندانی لب و لہجہ میں دیا جو
عضد الدولہ کو ناگوار گزرا اور اس نے ہمدان پر فوج کشی کر دی۔ فخر الدولہ والی
جرجان شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کے پاس بھاگ گیا۔ عضد والدولہ نے اس

سے فخر الدولہ کا مطالبہ کیا۔ شمس المعالی نے منظور نہ کیا لہذا ۳۷۱ھ میں عضد الدولہ
نے اپنے بھائی موید الدولہ کو روانہ کیا جس نے شمس المعالی کو شکست دی اور وہ
مع فخر الدولہ نیشاپور میں پناہ گزین ہو گیا۔

سامانی حاکم نیشاپور کی درخواست پر امیر نوح بن منصور ان دونوں کی مدد
کرنا چاہتا تھا اور لشکر جانے کو تیار بھی تھا مگر سامانی وزیر کے اچانک قتل ہو جانے
کے سبب شمس المعالی اور فخر الدولہ مدد سے محروم رہ گئے۔

عالم اسلام کا پہلا شہنشاہ

عضد الدولہ عرصے سے صرع کے مرض میں مبتلا تھا، شوال ۳۷۲ھ میں اس
کا انتقال ہو گیا اور نجف اشرف میں دفن کیا گیا۔

بغداد میں اس نے کل ساڑھے پانچ سال گزارے لیکن اس مختصر سی مدت
میں اتنے گہرے نقوش چھوڑے کہ تاریخ اس کو یاد کرتی رہے گی، بقول شاہ معین
الدین ندوی:

"عضد الدولہ دیلمی خاندان کا گل سرسبد اور بڑا جامع اوصاف فرمانروا تھا،
عقل و دانش، تدبر و سیاست، شجاعت و شہامت، فضل و کمال، علم نوازی اور
علماء پروری جملہ اوصاف جہانبانی میں یگانہ تھا اس نے اپنے دور میں دیلمی حکومت
اور خلافت بغداد دونوں کو علمی اور تمدنی حیثیت سے بڑی ترقی دی۔ ابن اثیر کا
بیان ہے کہ وہ عاقل، فاضل، مدبر، باہیبت، عالی ہمت، صائب الرائے، فضائل
دوست، فضلاء نواز، بخشش کے موقع پر فیاض اور احتیاط کے موقع پر محتاط اور
عاقبت اندیش فرمانروا تھا۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ ملک کی وسعت، سلاطین اور
حکومتوں پر غلبہ اور جاہ و جلال اور عظمت و شان میں پورے دیلمی خاندان میں
ممتاز تھا اس نے بہت سے ملک زیر نگیں اور بہت سے فرمانروا مغلوب کئے۔"

"تاریخ اسلام میں وہ پہلا فرمانروا ہے جو شہنشاہ کے لقب سے ملقب ہوا اور
بغداد کے منبروں پر اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ وہ فاضل اور علماء نواز تھا، بہت
سے علوم میں اس کو دستگاہ حاصل تھی۔ علماء نے اس کے لئے کتابیں اور شعرا نے

اس کی شان میں مدحیہ قصیدے لکھے ۔ وہ ایک ماہر ادیب اور خوش گو شاعر تھا (۳۳)

اپنے باپ، چچا اور دوسرے حکمرانوں کی متعدد چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو ملا کر اس نے ایک متحدہ حکومت قائم کر دی ۔ خلافت پر زوال کے ساتھ بغداد اجڑ گیا تھا اس کی علمی مجلس برہم ہو گئی تھی، عضد الدولہ نے اس کو دوبارہ زندہ کیا ۔ اس کی علم نوازی کی وجہ سے مختلف ملکوں کے علماء کھنچ کر بغداد میں جمع ہو گئے اور اس کے نام پر کتابیں لکھیں ۔ چنانچہ نحو میں کتاب الایضاح والتکملہ، قرأت سبعہ میں حجۃ طب میں ملکی اور تاریخ میں تاجی لکھی گئیں ۔

رفاہ عام کے بہت سے کام انجام دیئے، بغداد مسلسل شورشوں اور سیاسی انقلاب سے اجڑ گیا تھا، اس کو دوبارہ آباد کیا، مدینہ طیبہ کے گرد شہر پناہ تعمیر کرائی حضرت علی کی قبر کا پتہ چلا کر اس پر عمارت بنوائی ۔ سارے ممالک محروسہ میں شفا خانے، پل اور دوسری رفاہ عام کی عمارتیں بنوائیں ۔

بغداد کا شفا خانہ، جو بیمارستان عضدی کے نام سے موسوم تھا، بڑا عظیم الشان تھا اس کے اخراجات کے لئے ایک خطیر رقم وقف کی ۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ "اس سرو سامان اور حسن انتظام کا کوئی دوسرا شفاخانہ دنیا میں نہ تھا ۔"

تفصیل مزید میں بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ ہر سال کے آغاز پر ایک بڑی رقم صدقے کے طور پر نکالتا تھا اور اس کو علماء و فقہاء کے ذریعہ غریب عوام میں تقسیم کراتا تھا ۔ جن لوگوں نے خوبیوں کے ساتھ عیوب بھی گنوائے ہیں، وہ خونریزی اور حصول دولت کے ذرائع پیدا کرنے کا الزام اس پر لگا سکے ہیں جس سے کوئی فاتح اور کوئی حکمراں مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اگر کوئی بادشاہ اس سے بچنا چاہتا تو بادشاہت باقی ہی نہ رہتی ۔

اپنے پیش رووں کے مقابلے میں عضد الدولہ کی ایک خصوصیت اور لکھی گئی ہے وہ یہ کہ خلیفہ طائع خود اس قدر کمزور اور نااہل تھا کہ اس نے تمام اختیارات اپنی طرف سے عضد الدولہ کو سونپ دیئے تھے اور اس کی قیمت خلیفہ کی نظر میں اتنی تھی کہ جب وہ آتا تو بڑے اعزاز کے ساتھ اس کو بٹھاتے تھے حتیٰ کہ ۳۶۹ھ میں ملک العزیز والی مصر کی سفارت آنے پر خود طائع نے اپنے سامنے اس کو بٹھایا تھا ۔

خلیفہ نے اس کو از خود اتنے امتیازی اعزازات بخشے تھے جو اب تک کسی کو نصیب نہ ہوئے تھے ۔ وہ سلطان کے ساتھ شہنشاہ بھی کہا جاتا تھا ۔

بالا ختصار شہنشاہ عضد الدولہ تمدن و ثقافت کا علامیہ اور کشور کشائی کا نشان تھا ۔ اس کے عہد کو تاریخ بویہین کا درخشاں باب کہا جا سکتا ہے ۔

بویہین کا زوال

بنی بویہ کے زریں عہد کا دورانیہ حقیقتاً پچاس سال کا تھا جو عماد الدولہ سے شروع ہو کر عضد الدولہ پر ختم ہو گیا ۔ اس عرصے میں ان کی حدود سلطنت کسی بڑی سلطنت سے زائد تھیں ۔ اس کے بعد حصول اقتدار کی خاندانی کشمکش شروع ہو گئی .... اس مدت میں انہوں نے دنیا کو بڑا سبق یہ بھی دیا کہ اگر کوئی خاندان کسی ایک منصف مزاج اور شفیق بزرگ کا تابع ہو تو اس میں انتشار پیدا نہیں ہو سکتا ۔

کہنے کو ۳۷۲ھ میں عضد الدولہ کی وفات پر صمصام الدولہ کی تخت نشینی سے ۴۸۷ھ میں ابو علی کیخسرو کے انتقال تک یعنی مزید ۱۱۵ سال حکومت خاندان میں باقی رہی لیکن صحیح معنیٰ میں معز الدولہ اور عضد الدولہ کا سطوت و جبروت پانچویں سن ہجری کی پانچ سات دہائیوں تک باقی رہا اور آخر میں تو بویہی حکمراں اتنے ناطاقت ہو گئے کہ چھوٹے چھوٹے لشکروں سے شکست کھانے لگے اور نئی طاقتیں ان کے علاقوں کو ہڑپ کرتی رہیں جو نتیجہ تھا بھائی سے بھائی کے ٹکرانے کا ۔

صمصام الدولہ کی جانشینی ۳۷۲ھ میں بظاہر باتفاق رائے ہوئی لیکن پانچ میں سے تین بھائی خوش نہیں ہوئے اور پہلے ہی دن سے اندر اندر مخالفانہ ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں ۔

سلسلہ خاندان کا جائزہ لیا جائے تو مزید پندرہ افراد ارتقائے وقت کے ساتھ برسر اقتدار آئے: موید الدولہ بن رکن الدولہ، فخر الدولہ بن رکن الدولہ، صمصام الدولہ بن عضد الدولہ، شرف الدولہ بن عضد الدولہ، بہاؤ الدولہ بن عضد الدولہ مجد الدولہ بن فخر الدولہ، شمس الدولہ بن فخر الدولہ، سماء الدولہ بن شمس الدولہ، سلطان الدولہ بن بہاء الدولہ، مشرف الدولہ بن بہاؤ الدولہ، جلال الدولہ

بن بہاؤ الدولہ، ابو کالنجار بن سلطان الدولہ، ملک الرحیم بن ابو کالنجار، ابو منصور بن ابو کالنجار، ابو علی کیخسرو بن ابو کالنجار۔

ان میں سے آٹھ نے تولیت بغداد کا شرف پایا: صمصام الدولہ، شرف الدولہ، بہاؤ الدولہ، سلطان الدولہ، مشرف الدولہ، جلال الدولہ، حسام الدولہ، ابو کالنجار، ملک الرحیم۔

بویہی حکمرانوں پر ایک نظر ڈالی جائے تو بیشتر اہل علم، دور اندیش، باتدبیر اور تلوار کے دھنی تھے مگر قبیلے کی سربراہی کا نظام ختم ہو چکا تھا۔ عضد الدولہ کے بعد سے کوئی مرکزی شخصیت باقی نہ رہی تھی اس لئے ہر فرد مطلق العنان ہو گئی تھی۔ ہر شخص ہوس حکومت میں دیوانہ ہو رہا تھا اس کے لئے خود اپنوں کا خون بہانے میں دریغ نہ کرتا، اور اپنی چھوٹی حکومت کو بڑی کرنے میں کوشاں رہتا۔

ایسے میں سرحدوں پر نئی طاقتیں ابھر کر سامنے آئیں اور اندرونی حصوں میں علاقائی حکومتوں نے جنم لیا جن میں غزنوی، سلجوقی، عقیلی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں[1]۔

بنی بویہ میں کچھ بھی اتحاد ہوتا تو نہ باہر سے کوئی ان کی طرف نظر اٹھا سکتا اور نہ اندر سرتابی کی جرأت کر سکتا لیکن وہاں تو صورت حال یہ تھی کہ جب صمصام الدولہ نے پسران ناصر الدولہ، ابو الحسین احمد اور ابو طاہر کو فارس کا گورنر بنایا تو شرف الدولہ ان سے پہلے پہنچ گیا اور ملک پر قبضہ کر کے اپنے نام کا خطبہ جاری کرا دیا۔ صمصام الدولہ نے ابو الحسن حاجب کو اس کے مقابلے کے روانہ کیا تو اس نے امیر وبیس کو بھیجا جس نے ابو الحسن کو مار بھگایا۔

۳۷۳ھ میں ایک بہادر کرد ابو عبداللہ حسین المعروف بہ "باز" نے دیار بکر پر قبضہ کر لیا۔ صمصام الدولہ نے اس کی سرکوبی کے لئے کئی لشکر بھیجے مگر سب نے "باز" سے شکست کھائی۔ آخر صمصام الدولہ کو اس کا قبضہ تسلیم کرنا پڑا۔

۳۷۵ھ میں ایک دیلمی سردار اسفار بن کردویہ نے شرف الدولہ کے اشارے سے بہاؤ الدولہ کو بغداد میں نائب بنانے کی کوشش کی، صمصام الدولہ کی طرف سے فولاد رفاندار نے اسفار کو شکست دی۔ بہاء الدولہ گرفتار ہوا مگر

صمصام الدولہ نے عزت کے ساتھ اس کو رہا کر دیا۔

اس اثناء میں ابو الحسین نے اہواز پر اور ابو طاہر نے بصرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ شرف الدولہ نے ان دونوں مقامات کو بھائیوں سے چھین لیا اور ۳۷۶ھ میں واسط فتح کر کے عراق کی سرحد تک پہنچ گیا۔ اسی دوران صمصام الدولہ کی فوج میں بغاوت ہو گئی اور وہ شرف الدولہ کی اطاعت پر مجبور ہو گیا۔

اب بغداد کی تولیت شرف الدولہ کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے صمصام الدولہ کو قید کر دیا پھر فارس بھیج دیا اور وہاں لے جا کر رہا کر دیا۔

صمصام الدولہ کی مدت تولیت چار سال تھی مگر شرف الدولہ اس سے بھی کم وقت گزار سکا۔

ترک و دیالمہ کی جو لڑائی صمصام الدولہ کے وقت سے جاری ہوئی تھی، شرف الدولہ نے اس کو دور کیا۔ دونوں میں صلح کرائی پھر نظم و نسق کی طرف متوجہ ہوا اور بغداد کی ابتری کو دور کیا۔ بعض اصلاحی کام کئے، ایک عظیم الشان رصد گاہ تعمیر کرائی، مظالم کا سد باب کیا، لوگوں کی ضبط کی ہوئی جائیدادیں واپس کیں اور علمی مجلسوں کو سرگرم کیا مگر اس کی عمر نے وفا نہ کی، صرف دو سال چند ماہ حکومت کر کے جمادی الاول ۳۷۹ھ میں چل بسا۔

ابو نصر بہاء الدولہ اس کی زندگی ہی میں بغداد کا نائب تھا، وہی شرف الدولہ کا جانشین ہوا اور خلیفہ نے اس کی امارت کو تسلیم کر کے خلعت، سیاہ عمامہ، طوق اور کنگن سے نواز دیا لیکن بہاء الدولہ کو فی الفور مشکلات سے دوچار ہو جانا پڑا اور اس نے طائع کے بجائے قادر باللہ کو خلیفہ بنا دیا۔

ابو الحسین اور ابو طاہر پسران ناصر الدولہ شرف الدولہ کے وقت سے بغداد میں مقیم تھے۔ بہاؤ الدولہ کے آغاز حکومت میں انہوں نے جانے کی اجازت طلب کی اور بہاء الدولہ نے منظوری دیدی اور وہ دونوں سیدھے موصل کے عازم ہو گئے۔ خواشاذہ والی موصل نے انہیں داخل ہونے سے روکا مگر اہالیان موصل پرانے رشتوں سے ان کے ساتھ ہو گئے۔ انہوں نے والی موصل کو شکست دے کر نکال دیا، موصل پر دوبارہ آل حمدان کا پرچم نصب کر دیا اور ایک بار پھر موصل و

حلب میں حمدانی حکومت قائم ہو گئی۔

بہت ممکن تھا کہ حکومت کچھ دن باقی رہتی لیکن بدقسمتی سے باز بن مرواں کی نئی حکومت دیار بکر میں قائم ہو چکی تھی جو اس کے لئے وبال جان بن گئی۔

علاقائی حکومتیں

عمران بن شاہین کی حکومت معزالدولہ کے وقت سے قائم تھی جو بطیحہ میں تقریباً موروثی ہو چکی تھی۔

حکومت مروان

دوسری حکومت باز بن مروان کی دیار بکر میں صمصام الدولہ کے دور میں وجود میں آئی۔ صمصام الدولہ کی فوجوں سے اس کے کئی معرکے ہوئے، آخر صمصام الدولہ نے دیار بکر پر حکومت کی سند اس کو دیدی تھی۔

حالات کی ابتری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے موصل پر حملہ بول دیا، حمدانیوں نے مقابلہ کیا۔ باز گھوڑے سے گر کر مر گیا اور اس کے بھانجے ابو علی مرواس نے پسپائی اختیار کی۔ ابو طاہر اور ابو عبداللہ حمدانی نے دیار بکر پر فوج کشی کر دی مگر شکست کھائی اور ابو علی کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ ابو علی نے والی مصر کی سفارش پر دونوں کو چھوڑ دیا والی مصر نے ابو عبداللہ کو حلب کا حاکم بنا دیا جس پر وہ اپنی موت تک باقی رہا۔ ابو طاہر نے نصیبین جا کر پناہ لی جہاں عقیلیوں نے اس کو قتل کر دیا۔

باز بن مروان بنی حمدان کا ننہالی رشتہ دار تھا، یہ قرابت ابو علی کو بھی پہنچتی تھی لہذا کردوں اور بعض حمدانیوں کا تعاون اس کو حاصل تھا، اس نے آمد، ارزن، میافارقین اور کیفہ کو ملا کر ایک مضبوط حکومت بنا لی تھی پھر توسیع مملکت کی ہوس میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ اس کے بعد ابو منصور بن مروان اس کا قائم مقام ہوا۔

ابو منصور کا پورا خاندان بنی بویہ کی سرپرستی کو تسلیم کرتا تھا مگر ہوا کے رخ کو دیکھ کر یا عقیدت میں ابو منصور نے خلیفہ مصر کی اطاعت کر لی اور ایک

عرصے تک اس علاقے کا حاکم رہا۔

ابو منصور کے بعد مزید تین حکمران اس خاندان کے گزرے: ابو نصر احمد بن مروان، ابو نصر کا پوتا نظام الدولہ اور منصور بن ابو نصر۔ ۴۷۸ھ میں سلجوقیوں نے پورے علاقے پر قبضہ کر لیا۔

بنی عقیل

بنی کعب عرب کا معروف قبیلہ تھا اس کی شاخیں آہستہ آہستہ شام، عراق، شمالی افریقہ اور اندلس میں پھیل گئیں۔ اسی قبیلے کی ایک شاخ بنی منتفق خاندان معروفیہ کی سرپرستی میں بصرہ کے نواح میں بطیحہ کے قریب آباد تھی۔

ایک شاخ بنی خفاجہ صحرائے عراق میں رہزنی کرتی تھی۔ ۳۲۷ھ کے بعد جب بنی عبیدہ اور بنی منتفق نے کوفہ، بصرہ اور واسط کے درمیانی علاقے میں سکونت اختیار کی تو بنی خفاجہ بھی ان سے آملے اور انہیں متحدہ شاخوں سے بنی عقیل کی بنیاد پڑی۔

چوتھی صدی ہجری میں شام و عراق کے عقیلی اس دور کے ممتاز حکمران حمدانیوں کو خراج ادا کرتے تھے۔ ان کے زوال کے وقت ۳۷۹ھ میں بنی عقیل میں سے ابو داؤد محمد نصیبین اور دیار بکر کا حکمراں تھا۔ ۳۸۰ھ میں اس نے موصل کا اضافہ کیا۔ ۳۸۱ میں بویہیوں نے موصل خالی کرا لیا مگر ابو داؤد کی وفات پر اس کے بھائی مقلد نے ۳۸۶ میں موصل فتح کر لیا۔ بویہی تاجدار نے معینہ خراج پر ملک کے مزید اضافے سے اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔

ابو المکارم مسلم بن قریش کے عہد میں اس کی مملکت کی حدود موصل و حلب سے بغداد کے مضافات تک پہنچتی تھیں۔ اس کے انتقال پر زوال شروع ہوا۔ ۴۸۹ھ میں ایک ترکی سردار قدام الدولہ کربوقا نے ان کا دارالحکومت بھی سلجوقی سلطنت میں شامل کر دیا۔

عقیلیوں کی مدت حکومت سو برس سے زائد رہی۔ اس مدت میں سات حکمران برسراقتدار آئے: حسام الدولہ مقلد بن مسیب، معتمد الدولہ قرواش بن

حسام الدولہ ، زعیم الدولہ بن حسام الدولہ ، حسام الدولہ کا پوتا علم الدولہ قریش ، شرف الدولہ مسلم بن قریش ، ابراہیم بن قریش ، علی بن مسلم ۔

بنی مزید

بنی عدنان کے قبیلہ بنی اسد نے عرب سے ترک وطن کیا تو قادسیہ و بغداد تک آباد ہو گئے ۔ نعمانیہ ان کا مرکز تھا اور خوزستان کے جزائر میں بنی دبیس بھی انہیں کے کنبے سے تھے ، یہ جزیرہ اسی نسبت سے جزیرہ دبیسیہ کہلاتا تھا ۔

ابوالحسن علی بن مزید اور اس کا بھائی ابوالغنائم رئیس قبیلہ تھے ۔ ابوالغنائم بنی دبیس میں رہتا تھا ۔ وہاں اس نے کسی بات پر ایک سردار کو مار ڈالا اور بنی دبیس سے بچنے کے لئے اپنے بھائی ابوالحسن علی کے پاس آگیا ۔ ابوالحسن نے ۴۰۱ھ میں دو ہزار سواروں سے بنی دبیس پر حملہ کیا مگر شکست کھائی ابوالغنائم قتل ہو گیا اور ابوالحسن بچ نکلا ۔

۴۰۵ھ میں ایک لڑائی اور ہوئی اس میں ابوالحسن کامیاب ہوا اور جزیرے پر قبضہ کر لیا ۔ پھر مضر بن دبیس نے ابوالحسن پر شب خون مارا ، ابوالحسن نے بھاگ کر بلد النیل میں پناہ لی اور مضر نے اپنے جزیرہ پر قبضہ کر لیا ۔

اس کے بعد ہی سلطان الدولہ بویہی کی طرف سے ابوالحسن کو جمیعہ کی حکومت مل گئی ، ۴۰۸ھ میں وہ وفات پا گیا اور نورالدولہ اس کا جانشین ہوا ۔

نورالدولہ دبیس کی تخت نشینی پر اس کے بھائی مقلد نے بغاوت کی اور ناکام ہو کر بنی عقیل کے پاس چلا گیا ، دوسرا بھائی ثابت بھی مخالف تھا اس سے کئی لڑائیاں ہوئیں ۔ آخر اس کو ایک جاگیر دے کر منہ بند کر دیا گیا ۔ ۴۴۱ھ میں اس نے واسط کی فوج کو شکست دی ۔ کچھ دنوں بعد سلجوقیوں کی اطاعت کر لی ، ۴۷۷ھ میں رحلت کر گیا ۔

بویہی حکومت کا ڈھلتا سورج تھا اور سلجوقیوں کا بھرپور اٹھان ، دبیسی فرمانرواؤں کو ابتداً بنی بویہ سے سابقہ پڑا پھر سلجوقیوں سے ۔ وہ سب کے سب مرد میدان تھے مگر بڑی طاقتوں کے مقابلے میں سربر نہ ہو سکے پھر بھی تقریباً ڈیڑھ سو سال ان کی حکومتوں کا سلسلہ جاری رہا ۔ اس مدت میں آٹھ حکمران تخت اقتدار پر بیٹھے

بہاؤالدولہ منصور ، سیف الدولہ صدقہ ، نورالدولہ دبیس بن صدقہ ، محمد بن دبیس اور علی بن دبیس ۔ ان میں سے بہاؤالدولہ منصور کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس نے ۴۹۵ھ میں جمیعہ کے مقام پر حلہ آباد کیا .... ۵۴۳ھ میں اس قبیلہ کو سلجوقیوں نے جلاوطن کر دیا اور اس سرزمین پر ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا ۔

امارت بنی حسنویہ

سریاح اور بزرنکال کے قلعوں کی ایک چھوٹی سی حکومت تھی جو حسنویہ بن حسین کرد نے اپنے نانہال سے وراثت میں پائی تھی ، انہیں کردوں میں ایک گروہ عباسی بھی تھا ۔ انہوں نے آہستہ آہستہ اطراف دینور ، ہمدان ، نہاوند وغیرہ پر قبضہ کر لیا اور چوتھی صدی کے اوائل میں ایک حکومت قائم کر لی جو تقریباً نصف صدی تک باقی رہی ۔

حسنویہ بہادر ، منتظم اور فیاض تھا ۔ بویہی حکومت کے قیام کے بعد وہ رکن الدولہ کے ہواخواہوں میں داخل ہو گیا اور اس کی طرف سے کئی جنگی خدمات انجام دیں ۔

۲۶۹ھ میں حسنویہ کا انتقال ہو گیا تو بدر اس کا جانشین ہوا ۔ اس نے اپنے باپ کا نام اونچا کیا ۔ عراق کی جنگی بساط پر اس نے بارہا اپنی جوانمردی کے جھنڈے گاڑے اور ناصرالدولہ کے لقب سے سرفراز ہوا ۔ اس زندگی ہی میں ہلال نے نظم حکومت سنبھالنے کی کوشش کی اور باہی جنگیں واقع ہوئیں ۔ ۴۰۵ھ میں بدر کا قتل ہو گیا اور ہلال امیر مملکت ہوا ، ہلال سے بویہیوں کے کئی معرکے ہوئے ۔

پھر طاہر نے ہلال کی جگہ لی ۔ ابوالشوک کردوں کی دوسری شاخ کا امیر تھا ، اس سے طاہر کی جنگ ہوئی ، ابوالشوک کے جنگی کارنامے بھی تاریخ کا حصہ ہیں ، اس کی نسل میں بھی کئی حکمران گزرے ہیں : سعدی بن ابوالشوک ، مہلہل ، بدر بن مہلہل ۔ آخر سلجوقیوں کے ہاتھوں ان سب کا خاتمہ ہو گیا ۔

دولت بنی مرداس

صالح بن مرداس ، عمرو بن کلاب کی اولاد میں تھا ، اس کا خاندان اطراف حلب میں آباد تھا۔ بنی حمدان کے زوال پذیر ہونے پر " رحبہ " ابن محلکان کے قبضے میں تھا۔ صالح بن مرداس سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے' اس نے اپنی بیٹی کا عقد اس سے کر دیا پھر دونوں میں ناچاقی ہو گئی اور ابن محلکان صالح سے برسرپیکار ہو گیا لیکن صالح نے خود اس کو قتل کرا دیا اور رحبہ پر قبضہ کر لیا۔ اسد الدولہ صالح ایک مرد جنگ آزما تھا ، اس طوائف الملوکی کے زمانے میں وہ اپنی حدود مملکت کو بڑھاتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک سخت جنگ کے بعد اس نے حلب ابی شعبان کے قبضے سے نکال لیا ، پھر اس کی حکومت بعلبک اور عانہ تک پھیل گئی اور حسان بن مفرج رملہ سے سرحد مصر تک قابض ہو گیا۔

مصر کے فاطمی خلیفہ نے ان دونوں کی سرکوبی کے لئے انوشتگین دریدی کو تعینات کیا۔ اردن کے قریب اس سے ان دونوں کی ہولناک جنگ ہوئی جس میں صالح بن مرداس اور اس کا چھوٹا بیٹا لڑتا ہوا مارا ، دوسرا بیٹا ابو کامل نصر بن صالح بچ کر نکل گیا اور حلب میں شبل الدولہ کے لقب سے تخت نشین ہو گیا۔

۴۲۱ ھ میں ارمانوس ، یورپ کے تمام عیسائی بادشاہوں کی تین لاکھ فوج لے کر حلب پر حملہ آور ہوا۔ شبل الدولہ میں اس ٹڈی دل کو روکنے کی طاقت نہ تھی مگر وہ بنی کلاب کی شجاعت کا ورثہ دار تھا اپنی پوری طاقت سمیٹ کر مقابلے پر آ گیا۔

اب اس کو قسمت کی بات ہی کہنا چاہیئے کہ عیسائی لشکر میں غلط فہمی کی بناء پر پھوٹ پڑ گئی ، رومی بادشاہ نے ایک سردار ابن دوقس کو گرفتار کر لیا ، نتیجے میں عیسائی لشکر واپس ہونے لگا۔ شبل الدولہ نے اس سے فائدہ اٹھا کر عیسائی کیمپ پر حملہ کر دیا۔ عیسائیوں کا بہت نقصان ہوا ، وہ تمام مال و اسباب چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

۴۲۹ ھ میں مصری لشکر حلب پر آور ہوا۔ شبل الدولہ نے مقابلہ کیا وہ میدان جنگ میں کام آیا اور اس کے لشکر کو شکست ہو گئی۔ اس کا بھائی شمال بن صالح " رحبہ " میں معزالدولہ کے لقب سے تخت نشین ہوا اور حلب پر مصری سردار

وزیری قابض رہا۔ ۴۳۳ ھ میں وزیری کا انتقال ہوا تو معزالدولہ شمال نے حلب کو حصار میں لے لیا اور چند ماہ بعد اس پر قبضہ کر لیا لیکن مصری فوج کے جتھے آئے دن پریشان کرتے رہتے تھے اس لئے معزالدولہ نے خود حلب کو مصر کے حوالے کر دیا۔

۴۵۴ ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد عطیہ بن صالح حلب کا حکمراں ہوا لیکن بعض مفسدوں کے بھڑکانے سے محمود بن نصر سے اس کی ان بن ہو گئی اور محمود نے فوج کشی کر کے چچا کو حلب سے نکال دیا۔

سلجوقی عراق و شام پر قابض ہوتے چلے جا رہے تھے اور بنی مرداس ایک ایک شہر کے لئے آپس میں دست و گریبان تھے۔ آخر محمود نے سلجوقیوں کی اطاعت کر لی پھر بھی حکومت زیادہ دن اس کے خاندان میں باقی نہیں رہی۔ ۴۷۲ ھ میں اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔

شجاعت اس قبیلے کی خصوصیات میں تھی۔ صلیبی محاربات کی ابتدائی جنگوں میں ۴۹۱ ھ تک وثاب بن محمد بن نصر بن صالح بن مرداس نام کے شہسوار کا نام پایا جاتا ہے جو ایک گھوڑ سوار دستے کا افسر تھا۔

اس قبیلے کی حکومت اپنے سو سال بھی پورے نہیں کر سکی مگر اپنے بعد شجاعت اور ادب پروری کی داستان چھوڑ گئی۔ یہ سب عقیدے کے اعتبار سے شیعہ تھے۔ (۳۴)

بنی عمار

خلافت بنی عباس میں لبنان شام کا ایک حصہ تھا جس کی امارت بزرگان بنی عمار کے سپرد ہوئی تھی۔ بویہیں کے عہد میں یہ قبیلہ ممتاز قبائل میں شمار ہوتا تھا اس نے لبنان بالخصوص طرابلس کو اتنی ترقی دی تھی کہ دور دور تک اس کی شہرت تھی ، اس کو علم و ادب اور جہاد کا روشن مینار کہا جاتا تھا یہ **حقیقت الحسن بن عمار** کے دور حکومت کا طرہ امتیاز تھی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ الحسن نے اس شہر کو دانشوران شام کا مرکز بنا دیا تھا اس نے ایک بڑی درس گاہ تعمیر کرائی تھی جس کے متصل کتب خانہ بھی تھا۔ یہ

درس گاہ آہستہ آہستہ دارالعلوم بن گئی۔کتب خانے میں ۱۸۰ کاتب ملازم تھے جو کتابوں کی نقلیں کیا کرتے تھے۔

یہ خاندان صرف اہل قلم نہ تھا، صاحب سیف بھی تھا جس نے بارہا صلیبیوں سے اپنا لوہا منوایا تھا۔کئی بہادروں کے نام تو نصرانی حلقے میں زبان زد عام تھے اور عمار بن محمد بن عمار کے ذکر پر تو انہیں پسینہ آجاتا تھا۔وہ اس سورما کو ملک الساحل کہہ کر پکارتے تھے۔

اہل صلیب کی نگاہیں یوں تو پورے عالم اسلام پر لگی ہوئی تھیں لیکن طرابلس تو ان کی آماجگاہ بن گیا تھا جس پر متعدد حملے کرنے کے باوجود وہ قبضہ نہ کر سکے تھے کیونکہ عمار بن محمدان کے راستے کے دیوار بن کر کھڑا تھا جس سے سر ٹکرا کر وہ واپس جاتے تھے۔آخر سنجل دی فرینک نے طرابلس کے راستے پر ایک ٹیلہ بنوایا۔ اس کے اوپر ایک قلعہ تعمیر کرایا جس کے مینار سے بہت دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔

اس کی خبر جب طرابلس پہنچی تو سپہ سالار فخرالملک تین سو سواروں کو لے کر طرابلس سے نکلا۔محافظین قلعہ سے سخت جنگ ہوئی مگر وہ اس طوفان کو روک نہ سکے اور ان تین سو بہادروں نے قلعہ اور طلائی مینار کو جلا کر خاکستر بنا دیا۔سنجل نے جلے ہوئے مینار کی چھت پر کھڑے ہو کر دیکھا تو اس کا دل بیٹھنے لگا۔اس صدمے سے وہ ایسا بیمار پڑا کہ جانبر نہ ہو سکا۔

فخرالملک نے پانچ سال تک اہل صلیب کو روکے رکھا۔اس عرصے میں ان کی تعداد اور طاقت میں اضافہ ہوتا رہا لہذا فخرالملک نے محسوس کیا کہ اب ان کی یلغار کو روکنا اس کی طاقت سے باہر ہو گیا ہے۔اس نے خلیفہ بغداد سے مدد مانگی۔ سلجوقی عراق وایران کے فرمانروا بن چکے تھے، خلیفہ نے ان کو توجہ دلائی اور صورت حال سے آگاہ کیا لیکن ان کے کان پر جوں نہ رینگی۔مجبوراً بنی عمار نے اپنے قوت بازو پر اعتماد کیا اور سروں سے بے نیاز ہو کر لڑتے رہے۔

غیر متناسب طاقتوں کی جنگوں کا جو انجام ہونا چاہئے تھا وہی ہوا۔فخرالملک لڑائی میں رستم و سہراب کی شجاعت کو مات کرتا رہا مگر تابہ کے! بہادروں کی تعداد کم سے کم ہوتی رہی۔آخر ۵۰۳ھ ہجری میں طرابلس پر اہل صلیب کا پرچم لہرانے لگا اور

کبھی کے مسلمان حکمراں عیسائیوں کی رعایا بن گئے۔بنی عمار شیعہ عقیدے کے مسلمان تھے۔ (۳۵)

غزنوی اور سلجوقی

شیعہ دور اقتدار میں صرف بخارا کی سامانی حکومت تھی جو صفاریوں یا بویہیوں کا مقابلہ کر سکتی لیکن سامانی طاقتور ہونے کے باوجود ان سورماؤں کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔امتداد زمانہ سے جب شیعوں کی چھوٹی بڑی حکومتیں آپس میں ٹکرا کر کمزور پڑ گئیں اور بویہیں کا زوال بھی شروع ہو گیا تو سبکتگین غزنی میں اپنی حکومت مضبوط کر چکا تھا اور سرحد کے بویہی علاقوں پر تاخت کر رہا تھا۔

یہ بات چوتھی صدی ہجری کی ساتویں دہائی کی ہے۔سبکتگین کے انتقال پر اس کا نامور بیٹا محمود تخت نشین ہوا پھر مسعود بن محمود۔غزنی کی سلطنت سامانی سلطنت کے خاکستر پر بنی تھی لیکن محمود کے عہد میں اس کی حدود پھیلیں تو بویہی علاقوں کو تاراج کرتی ہوئی بغداد تک پہنچ گئیں اور ایک وقت وہ آیا جب شہنشاہ عضدالدولہ کی کرسی پر غزنی کا سلطان محمود بیٹھا نظر آیا۔

محمود نسلاً ترک تھا اور اسی قوم سے اس کا تعلق تھا جو سرحد چین پر خوارزم تک اور شاش، فرغانہ، ماوراءالنہر، بخارا، سمرقند اور ترمذ میں آباد تھی اور سلجوق اس کا سردار تھا۔محمود کی افواج سے ان کے کئی معرکے ہوئے، ایک گروہ نے محمود کی اطاعت کر لی، اس کو فوج میں داخل کر لیا گیا، ارسلان بن سلجوق کو گرفتار کر کے ہندوستان کے کسی قلعہ میں بھیج دیا اور یغمر نامی ایک شخص کو ان کا سردار بنا دیا۔اس کے بیٹے کو رے میں سکونت کی اجازت دے دی۔

محمود کے انتقال کے بعد ترکوں نے بغاوت کی اور کئی جنگوں کے بعد رے فتح کر لیا۔اس گروہ کا نام عراقیہ تھا۔دوسرا گروہ بوقاء کوکیاش کی سرکردگی میں آذربائیجان ہوتا ہوا ۴۲۹ھ میں مراقہ پہنچ گیا۔اس موقع پر کچھ لوگ ٹوٹ کر بوقاء کے ساتھ رہ گئے، کچھ منصور اور کوکیاش کے ہمراہ ہمدان کی طرف بڑھنے لگے اور کرخ اور ہمدان پر قابض ہو گئے۔اس طرح رے، دیار بکر اور موصل میں قتل و

غارت کا بازار گرم کیا۔

ترکوں کا ایک سردار ارسلان بن سلجوق ان کے ساتھ آیا تھا جو گرفتار کر لیا گیا تھا؛ دوسرے سردار میکائیل بن سلجوق کا بیٹا طغرل بک وطن ہی میں تھا۔اس موقع پر قاصد بھیج کر ان ترکوں کے ظالمانہ افعال پر احتجاج کیا گیا مگر اس نے مجبوری ظاہر کی پھر سلطان مسعود بن محمود سے طغرل بک کی ہولناک جنگ ہوئی۔ مسعود شکست یاب ہوا اور طغرل نے ۴۳۱ھ میں نیشاپور پر قبضہ کر لیا۔

یہ تھی ابتداء حکومت سلجوقیہ کی۔اس کے بعد دائرہ حکومت پھیلتا رہا......

سلجوقی حکومت میں آٹھ فرمانروا گزرے۔۴۳۹ھ سے ۵۵۱ھ، ۱۲۲ سال اس خاندان کے عروج کا زمانہ ہے اس کے بعد حصے بخرے ہو گئے اور آہستہ آہستہ ملک چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ گیا۔آخری حکومت خوارزم کی تھی جو ۴۷۰ھ میں قائم ہو کر ۶۲۸ھ میں تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔

سلطنت سلجوقیہ کے فرمانروا طغرل بیگ، الپ ارسلان، ملک شاہ، ناصرالدین محمود، برکیارق، ملک شاہ ثانی، محمد بن ملک شاہ اور سنجر بن ملک شاہ کے نام تاریخ میں روشن ہیں۔

اقتدار کی جنگ یا خودکشی

موصل پر حمدانی قبضہ اور بنی حمدان کی حکومت کا خاتمہ بہاؤالدولہ کے دور کی بات ہے۔اس کی سلطنت میں اب پہلی سی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ باقی نہ تھا لیکن معزالدولہ اور عضدالدولہ کے نام اس سے وابستہ تھے اور پھر بہاؤالدولہ بھی کوئی ناکارہ فرماں روا نہ تھا۔اس میں اسلاف کا سا تدبر اور شجاعت نہ سہی پھر بھی شیروں کے خاندان کا فرد تھا۔وقت ساتھ دیتا تو وہ ماضی کی روایات کو برقرار رکھتا لیکن اس کو مسلسل اپنوں اور غیروں کی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا جن کا مقابلہ وہ اپنی اکیلی طاقت پر نہ کر سکا اس لئے سلطنت کے حصے بخرے ہونا شروع ہو گئے

۳۷۶ھ کے آخر میں شرف الدولہ نے صمصام الدولہ کو بغداد سے بے دخل کر کے فارس بھیج دیا تھا اس نے فارس پر قبضہ کر لیا......بہاؤالدولہ جب ترکوں اور

دیلمیوں کا تنازعہ ختم کرا کے فارغ ہوا تو اس نے فارس پر توجہ کی اور بغداد سے روانہ ہوا۔صمصام الدولہ کی فوج نوبندجان کے قریب خیمہ زن تھی۔بہاؤالدولہ کے مقدمہ لشکر نے اس کو شکست دی مگر صمصام الدولہ کے ایک سپہ سالار نے جلد ہی اس کا بدلہ لے لیا اور بہاؤالدولہ کے ہراول کو پسپا کر دیا۔

اسی دوران بہی خواہان سلطنت نے درمیان میں پڑ کر صلح کرادی اور بہاء الدولہ نے ۳۸۰ھ میں بلاد فارس وارجان پر صمصام الدولہ کا قبضہ تسلیم کر لیا اور فوراً بغداد واپس ہو گیا جہاں شیعہ اور سنیوں میں لڑائی ہو رہی تھی۔بہاء الدولہ نے واپس ہوتے ہی مصالحت کرادی اور صمصام الدولہ نے بڑھ کر سوس پر قبضہ کر لیا جس کو ۳۸۴ھ میں بہاء الدولہ نے واگزار کرا لیا پھر اہواز پر یلغار کرائی اور اس کو بھی فتح کر لیا۔

اس عرصے میں صمصام الدولہ بصرہ پر بھی قبضہ کر چکا تھا اور بہاء الدولہ کا لشکر بھی ایک طرف موجود تھا کہ عمران بن شاہین کا جانشین مہذب الدولہ بھی تسخیر کا امیدوار بن کر میدان میں آگیا۔مختلف محاذوں پر کئی مقابلے ہوئے۔آخر بہاء الدولہ کا ایک سردار شکرستان کو اہل شہر کا تعاون حاصل ہو گیا اور تینوں طاقتوں نے خونریزی سے بچنے کے لئے اس کا تسلط تسلیم کر لیا۔

اقتدار کی یہ لڑائیاں چھوٹے بڑے پیمانے پر جاری تھیں کہ بہاء الدولہ نے بدر بن حسنویہ کرد کو اپنی طرف ملا لیا صمصام الدولہ کی طاقت کم ہو چکی تھی کہ عزالدولہ کے بیٹے ابوالقاسم اور ابونصر کسی طرح قید سے آزاد ہو گئے اور ایک جمعیت فراہم کر کے اس کے مقابل آگئے۔صمصام الدولہ اپنے ایک قلعہ میں پناہ لینے کے ارادے سے چلا کہ راستے میں کردوں نے اس کو لوٹ لیا۔اب صمصام الدولہ نے قلعہ رودماں کا رخ کیا۔والی رودماں نے گرفتار کر کے ابونصر کے حوالے کر دیا جس نے ۳۸۸ھ میں اس کو قتل کرا دیا۔

یہ خبر بہاء الدولہ کے لئے موجب طمانیت تھی لیکن ابھی عزالدولہ کے بیٹے سدراہ تھے پھر بھی بہاء الدولہ نے کئی قلعوں کو فتح کیا ابونصر اور ابوالقاسم نے کئی

لڑائیاں لڑیں مگر کامیاب نہ ہوسکے بلکہ خود ان کا لشکر منتشر ہوگیا۔ابوالقاسم بدر بن حسنویہ کے پاس چلاگیا پھر بطیحہ جاکر وہیں کا ہورہا۔ابونصر دیلم کا عازم ہوگیا۔ وہاں سے ایک فوج مرتب کرکے اس نے کرمان کے اکثر مقامات مسخر کیے۔

بہاء الدولہ نے موفق بن علی کو اس کے مقابلے پر بھیجا اور ابونصر میدان جنگ میں کام آیا۔موفق کی یہ کارکرگزاری بہاء الدولہ کی خوشنودی کا باعث تھی لیکن موفق کی طرف سے اس کو بعض غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں۔موفق نے سرکشانہ انداز اختیار کیا تو بہاء الدولہ نے اس کو قتل کرادیا۔

۳۸۰ھ میں حکومت بنی مروان قائم ہوئی۔۳۸۴ھ میں خراسان سے سامانی اقتدار ختم ہوا۔۳۸۹ھ میں ماوراء النہر سے بھی خاتمہ ہوگیا۔۳۸۸ھ میں حکومت بنی حسنویہ خراسان پر قابض ہوئی اور ۳۸۷ھ میں بنی مزید نے بہاء الدولہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا مگر شکست کھاکر اطاعت اختیار کرلی، ۳۹۲ھ میں پھر قرواش بن مقلد سے مل کر مدائن پر حملہ آور ہوا۔بہاء الدولہ نے ابوجعفر کو متعین کیا اور یکے بعد دیگرے کئی جنگوں کے بعد ان کے مقبوضات پر قبضہ کرلیا۔

بغداد کے فتنہ و فساد کے سلسلے میں بہاء الدولہ نے ابوجعفر کو معزول کیا اور وہ باغی ہوا تو بہاء الدولہ نے ابوعلی عمید الجیوش کو تعینات کیا جس نے سخت لڑائی کے بعد ابوجعفر کو شکست دی .... ۳۹۷ھ میں ابوجعفر نے بدر بن حسنویہ اور ابوالحسن علی بن مزید اسدی اور کئی دوسرے قبائل کو ملاکر بغداد کا محاصرہ کیا مگر شکست کے آثار دیکھ کر ہٹ گیا۔کچھ دنوں بعد ابوجعفر نے بہاء الدولہ کی اطاعت کرلی۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ملک کے اطراف کئی چھوٹی چھوٹی محولہ حکومتیں قائم ہوگئی تھیں جو توسیع ملک کے لئے باہم ٹکراتی رہتیں اور مل کر بہاء الدولہ کے سامنے بھی آجاتیں۔بویہی حکمران ان سب کا مقابلہ کرتا رہا۔بنی عقیل کے ساتھ تو بہاؤالدولہ کے بہت سے معرکے ہوئے۔۳۸۶ھ میں محمد بن مسیب عقیلی والی موصل کے انتقال پر مقلد اور عقیل دو بھائیوں میں ٹھن گئی۔بہاء الدولہ کو بھی دخل دینا پڑا۔آخر مقلد سے ادائے خراج کی شرط پر صلح ہوگئی۔۳۹۱ھ میں مقلد کے

قتل کے بعد اس کا بیٹا قرواش جانشین ہوا۔اس نے ۳۹۲ھ میں مدائن پر دھاوا بول دیا۔عمید الجیوش اور ابوجعفر نے انہیں پسپا کیا مگر دوبارہ وہ بنی مزید اور بنی اسد کو لیکر آگئے۔بویہی لشکر کو شکست دے دی اور بہت قتل و غارت کیا۔ابوجعفر نے بڑی مشکل سے انہیں شکست دی اور قرواش کو سر جھکانے پر مجبور کردیا۔

۳۹۳ھ میں مہذب الدولہ والی بطیحہ کے درباریوں میں سے ایک شخص ابوالعباس نے خروج کیا اور مہذب الدولہ کو بطیحہ اور بصرہ سے نکال دیا۔ بہاؤالدولہ نے ابوعلی عمید الجیوش کو بھیج کر اس کی سرکوبی کی۔وہ شکست کھاکر خوزستان کی طرف چلاگیا اور اہواز پر قابض ہوگیا اور بہاء الدولہ کی فوج نے لڑکر اس کو نکال دیا۔ابوالعباس کردستان کی طرف نکل جانا چاہتا تھا لیکن ایک دیلمی سردار نے پکڑلیا اور عمید الجیوش نے اس کو قتل کرادیا۔

۴۰۲ھ میں بمقام ارجان بہاء الدولہ کا انتقال ہوگیا اور ابوشجاع سلطان الدولہ اس کی جگہ تخت نشین ہوا۔

بہاء الدولہ کی مدت سلطنت چوبیس سال تھی لیکن وہ آباء و اجداد کا نام روشن نہ کرسکا۔اس کو صلاحیت کی کمی بھی کہا جاسکتا ہے اور نصیبے کا کھوٹ بھی۔ اس کے وقت تک بویہین کی سطوت و شوکت کچھ نہ کچھ باقی تھی۔اس کے بعد زوال پذیر سلطنت اتنے ٹکڑوں میں بٹ گئی کہ باہمی شیرازہ بندی ماضی کی کہانی بن کر رہ گئی

ملک گیری یا جہاد

بدقسمتی سے آپس میں لڑنے والے سب شیعہ تھے اور غزنی کا سنی اقتدار للچائی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی حیثیت صرف اسی قدر تھی کہ ایک عقیدے والوں کی حکومت پر دوسرے عقیدے والے کی نگاہ تھی ورنہ ہمارے نظریے سے تو نہ کسی کی کوئی جنگ شرعی اور نہ کوئی محاربہ اسلامی۔اسلام نے تو صرف ان جنگوں کو جہاد قرار دیا تھا جو تحفظ اسلام یا بقائے اسلام کے لئے لڑی جائیں۔ملک گیری کی ہوس اور جہانبانی کی طمع میں اگر کوئی طاقتور کسی کمزور مسلم یا غیر مسلم پر چڑھ دوڑے تو وہ جنگ اسلام کی جنگ تو قرار نہیں دی جاسکتی

خود آنحضرتؐ کے تمام غزوات و سریات دفاعی تھے۔ان میں سے کسی میں کوئی جارحانہ پہلو برآمد نہیں ہوتا اور ان کے بعد جو جنگی مہمات سر ہوئیں ، وہ موضوع بحث ہیں ، ان میں تحفظ یا تبلیغ دین کے عناصر منطقی فکر ہی سے نکالے جا سکتے ہیں۔اس میں کامیابی نہ ہو تو ملک گیری کی ابتداء وہیں سے ہو جائے گی مگر خطائے بزرگان گرفتن خطا است اس لئے جنگ صفین ہوس اقتدار کا سنگ بنیاد قرار پائے گی اور اس کے بعد مسلمانوں کی اکثر لڑائیاں اسی ذیل میں آئیں گی ، خواہ وہ سنیوں کی ہوں یا شیعوں کی۔

امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی جنگوں کا شمار دفاعی جنگوں میں ہے جن میں تحفظ و تبلیغ اسلام کے علاوہ کوئی اساسی مقصد ڈھونڈ کر بھی نکالا نہیں جا سکتا .... عام مسلمانوں کی بعض جنگیں بھی مستثنیات میں آتی ہیں جو غیر مسلمین کے جارحانہ حملوں کے خلاف واقع ہوئیں ۔ان میں محاربات قسطنطنیہ اور صلیبی جنگیں شامل ہیں اور سیف الدولہ و صلاح الدین ایوبی کے نام جن کا سرنامہ ہیں۔

یہ ہے ہمارا زاویہ نگاہ اور ہماری تحقیق میں شرع اسلام کا فیصلہ ، ورنہ کہنے کو تو ہندوستان پر محمود غزنوی کی غارت گری میں بھی جہاد کے پہلو نکال لئے جاتے ہیں اور شیعہ و سنی لڑائیوں کے مقتول بھی شہید کہہ دیئے جاتے ہیں مگر کوئی یہ نہیں سوچتا کہ حنفیوں ، اشعریوں اور حنبلیوں کی لڑائیوں میں بغداد و قاہرہ کی سڑکوں پر جو خون کے دریاء بہے ، ان میں کس گروہ کے لوگ شہید اور کس گروہ کے لوگ ہلاک ٹھہرائے جائیں گے ؟

فرقہ بندی کے اس کھیل میں دور حاضر تو صرف دو گروہوں کے نام لیتا ہے. شیعہ اور سنی ۔ماضی بعید میں بھی صرف دو نام ہی تھے :علی کا دوست اور علی کا دشمن ، بالفاظ دیگر شیعہ اور غیر شیعہ ۔ منصور و ہارون رشید نے اہل سنت کے نام کو زندہ کیا اور مامون نے فقہ حنفی مدون کرا کے اس پر مہر دوام ثبت کر دی مگر رائج الوقت مسلک معتزلی ہی رہا ۔ حنفی مذہب تو تیسری صدی ہجری کی چوتھی دہائی میں منظر عام پر آیا جب ظالم متوکل نے اس کو سرکاری مذہب قرار دیا۔

اس سے پہلے شافعی ، مالکی اور حنبلی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں موجود تھے

مگر کسی کو کسی سے پرخاش نہ تھی ، گردن زدنی تو صرف رسول کی اولاد ، وہ بھی حکومت کی اصل حقدار ہونے کے سبب ۔ غصب خلافت کی بات نہ ہوتی تو صرف بعض مسائل میں نظریاتی اختلاف ہوتا مگر فرقہ بندی کی کوئی صورت سامنے نہ آتی ۔ وقت کے فصل نے اگر ایک طرف مسالک کی تفریق پیدا کر کے استقرار حکومت کے دھارے کا رخ موڑا تو دوسری طرف جہاد کی تعریف ہی بدل ڈالی۔

اب اگر ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف تلوار اٹھاتا تو جہاد ، کوئی مسلمان بادشاہ توسیع مملکت کے لئے حملہ کرتا تو جہاد ، حتیٰ کہ کوئی سنی کسی شیعہ پر حملہ کر دیتا تو جہاد لیکن ہم نے کبھی ایسی کوئی منطق تسلیم نہیں کی اور کسی شیعہ نے کوئی حکومت بھی بنائی تو اس کے فعل کو اسلامی قرار نہیں دیا البتہ اس کا افادی نتیجہ اگر دائرہ شرع کے اندر رہا تو اس کو مستحسن قرار دیا اس لئے ملک گیری اور حکومت سازی کسی دور میں بھی کی گئی تو خون انسانی کی ارزانی کو ہم نے اسلامی قید و بند کی زنجیروں میں اسیر نہیں کیا اور کسی ظالم و جارح کی خونریزی کو جہاد کے معنی نہیں پہنائے ۔

طاہری ، علوی ، صفاری سلاطین ہمارے نزدیک اموی اور عباسی بادشاہوں اور غزنوی ، غوری اور سلجوقی سلطانوں سے مختلف نہیں ۔ہاں ان میں جس کسی کی طرف سے دین کی کوئی خدمت ہوئی ہے اس کو بنگاہ استحسان دیکھا ہے اور شیعہ حکمرانوں کی طرف سے جہاں کہیں ہمارے تحفظ اور آل رسول کی حرمت کا التزام کیا گیا ہے وہاں ہم ان کو کلمات خیر سے یاد کرتے رہے ہیں .... یہی سبب ہے جو ہم نے ان کے کارناموں کو یکجا کر دیا ہے اور بڑے اختصار سے ان کی سیرتوں کے خاکے پیش کر دیئے ہیں تاکہ دنیا کو معلوم ہو سکے کہ ہم صرف ملت گریہ کن نہیں ہیں تلوار کے دھنی بھی رہے ہیں اور اپنی ہوئی تلواروں سے ہم نے صرف اپنا خون ہی نہیں بہایا بلکہ سواد قلم سے جریدہ عالم پر مہر دوام بھی لگائی ہے ۔

ہمارے مولیٰ علی نے ہمیں ایک لب و لہجہ دیا تھا ۔جب تک ہمارا سلسلہ امامت باقی رہا ، ہم نے اسی لب و لہجہ میں بات کی لیکن دنیا نے اس کو ہماری کمزوری سمجھا اور ہماری گردنوں کو اپنی تلواروں کے لئے وقف کر لیا مگر جب ہمارا آخری امام

پردہ غیب میں چلا گیا تو پابندیاں بدستور تھیں تاہم ہم نے حدود میں رہتے ہوئے اس لب و لہجہ میں بات کرنا شروع کی جس کو دنیا نے ہمیشہ سمجھا ہے اور یہ لب و لہجہ تھا تلوار کا۔

یقیناً ہم نے دشمنوں کی صفوں میں گھس کر اور ان میں اپنی جگہ بنا کر ان کا قلع قمع کیا ہے لیکن ہمارے ساتھ تو یہ شروع ہی سے کیا گیا تھا ہمارے گھر میں پناہ لے کر ہم ہی کو گھر سے نکال باہر کیا گیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے آئمہ کا تو یہ وطیرہ نہیں تھا مگر ہم امام کے پیرو ہیں، خود امام نہیں ہیں۔ دنیا کو حاصل کرنے کے لئے ہم کو دنیا والوں کی طرح بننا پڑا اور اس صراط عمل میں جو دین کی خدمت ہو سکی، ہمارے اکثر افراد نے وہ خدمت بھی کی۔

بلاشبہ یہ مظلوموں کا راستہ نہ تھا مگر ظلم سہنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے لہذا مظلوم بھی گھات میں لگے رہے اور جیسے ہی موقع ملا، انہوں نے ظالموں کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔

تلواروں کی جھنکار

یہ داستان تھی ماضی کے جیالوں کی۔ حال اس سے بالکل مختلف تھا، بلندیوں کی طرف پرواز کرنے والوں کی اولاد اب بڑے غرور کے ساتھ روایتی آن بان کا مذاق اڑاتی ہوئی نیچے کی طرف جا رہی تھی اور اس پر نادم بھی نہ تھی۔

رکن الدولہ بویہی ایوان کا دوسرا ستون تھا، فخرالدولہ اس کا بیٹا تھا جس کو خود عضدالدولہ کی طرح استحقاق حکومت تھا لیکن اس نے عزالدولہ کے مقابلے میں عضدالدولہ کا ساتھ نہ دیا لہذا عضدالدولہ نے برسراقتدار آ کر اس کو نیشاپور میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ ۳۷۳ھ میں جب بڑے بھائی موید الدولہ کا انتقال ہوا تو اراکین سلطنت نے فخرالدولہ کو بلا کر صفہان و رے کا فرمانروا بنایا اور اس نے قدیم وفاداروں کی مدد سے انتظام سلطنت کا حق ادا کیا لیکن تولیت بغداد کا خیال وہ دل سے نکال نہ سکا۔

بدر بن حسنویہ اور ویلس بن عفیف اسدی اس کے ساتھ تھے چنانچہ ایک

لشکر تیار کر کے وہ آگے بڑھا اور اہواز پر قابض ہو گیا لیکن جلد ہی فخرالدولہ کی بدسلوکی کے سبب فوج میں پھوٹ پڑ گئی۔ وہ رے کی طرف پلٹ پڑا اور اہواز پر پھر بہاءالدولہ کی حکومت کا پرچم اڑنے لگا۔

ماہ شعبان ۳۸۵ھ میں فخرالدولہ کا انتقال ہو گیا اور تخت حکومت پر اس کا چھوٹا بیٹا مجدالدولہ ابو طالب رستم متمکن ہوا۔ اس کے بھائی شمس الدولہ کو ہمدان اور قرمیس کا حاکم بنایا گیا۔

مجدالدولہ کی کم سنی کے باعث ماں اس کی اتالیق تھی مگر عملاً انتظام حکومت وزراء اور امراء کے ہاتھ میں تھا۔ شمس الدولہ نے بدر بن حسنویہ کو لے کر چڑھائی کر دی اور اس نے مجدالدولہ کی جگہ لے لی۔ اس کے بعد ہی مادر مجدالدولہ بدر کی طرف سے مشتبہ ہو گئی اور شمس الدولہ نے ماں کو حصار میں لے لیا مگر وہ کسی نہ کسی طرح نکل گئی۔

اسی زمانے میں بدر حسنویہ سے اس کے بیٹے کی ناچاقی ہو گئی۔ بدر نے بہاءالدولہ سے مدد مانگی۔ اس نے مدد تو کی لیکن فتح کے بعد تمام مال و اسباب پر قبضہ کر لیا......... وقت کے فصل سے بنی عقیل اور دوسری طاقتوں میں محاربے ہوئے جن میں سلطان الدولہ بھی ملوث ہوا اور بنی مزید نے بعض مقامات کو تاراج کر ڈالا

مجدالدولہ اپنی ماں کے ساتھ نہاوند میں مقیم تھا۔ اس درمیان تنخواہیں نہ ملنے کے سبب شمس الدولہ کی فوج نے بغاوت کر دی۔ وہ ہمدان واپس آ گیا اور رے پر پھر مجدالدولہ کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد شمس الدولہ نے رے پر یلغار کرنے کی کوشش نہیں کی اور مجدالدولہ ماں کی سرپرستی میں حکومت کرتا رہا۔

ملک کے مختلف حصوں میں جنگ و جدل کا بازار گرم تھا مجدالدولہ جوانی کے دائرے میں داخل ہو کر علاقے کی خوشحالی اور اصلاحات میں لگا ہوا تھا۔ ماں ملک کی دیکھ بھال کرتی مگر ۴۱۹ھ میں جب وہ انتقال کر گئی تو نظم حکومت بگڑ گیا۔

بخارا کی سامانی حکومت شیعی اقتدار کے پہلے دن سے ان علاقوں کی گھات میں تھی مگر عمرو بن لیث کی شکست اور صفاری حکومت کے خاتمے کے بعد بھی وہ زیادہ دور تک اس طرف بڑھنے کی جرات نہ کر سکی اور مضبوط بویہی سلطنت قائم

ہونے کے بعد بو اس طرف دیکھنے کا سوال ہی نہ تھا لیکن جب بویہی فرمانروا خود آپس میں ٹکرانے لگے تو امیر نوح بن منصور نے حالات سے فائدہ اٹھایا اور بویہی سرداروں کی باہم چشمک میں ایک کا ساتھ دے کر سبکتگین اور محمود دونوں کو نیشا پور کی طرف روانہ کر دیا جنہوں نے لڑ بھڑ کر خراسان پر قبضہ کر لیا۔

۳۸۵ھ میں ابو علی اور فائق دونوں سرداروں نے مل کر نیشاپور پر حملہ کیا اور محمود کو شکست دے کر نکال دیا۔ سبکتگین ہرات میں تھا، وہ اس خبر پر چل پڑا اور باپ بیٹے مل کر حملہ آور ہوئے۔ اب کی جنگ کا پانسہ ان کے حق میں پڑا اور ابو علی اور فائق گرفتار ہو گئے........ کچھ دنوں تک وہ بخارا اور کاشغر میں قید رہے پھر رہا ہو کر فخر الدولہ کے پاس جرجان پہنچ گئے۔

۳۸۷ھ میں امیر نوح کا انتقال ہو گیا۔ سبکتگین طوس میں ٹھہر گیا اور اس نے مصلحتاً فخر الدولہ سے دوستی کر لی۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد سبکتگین وفات پا گیا اور اسمٰعیل اس کا جانشین ہوا، محمود نے اس کو پکڑ کر قید کر دیا اور بلخ کو دارالحکومت بنا کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا جس کی سند اس نے خلیفہ قادر باللہ سے حاصل کر لی۔

بخارا میں نوح کے بعد ابو الحرث اور پھر عبد الملک کی حکمرانی تھی اور محمود ان کی طرف سے ایک بڑے علاقے کا حاکم تھا جس میں خراسان بھی شامل ہو چکا تھا جس کی وہ حدود بڑھاتا جا رہا تھا۔ اس دوران سیاوش تکین سے اس کے کئی معرکے ہوئے، وہ ہندوستان پر بھی حملے کرتا رہا مگر اس کی مملکت پر زوال نہیں آیا حتیٰ کہ ۳۹۵ھ میں اس نے سلطنت سامانیہ کو ختم کر دیا۔

اب وہ غزنی کا مطلق العنان بادشاہ تھا اور اس کی نظریں ہندوستان پر گڑ گئی تھیں۔ کالنجر، سومنات، اجمیر وغیرہ کی فتوحات اسی دور کی ہیں، پھر وہ بویہی سلطنت کے ملحق علاقوں کی طرف مائل ہوا.......... سب سے پہلے اسے "رے" کی زبوں حالی کی خبر ملی اور اس نے ایک لشکر اپنے حاجب کی ماتحتی میں اس طرف روانہ کر دیا۔

مجد الدولہ کے بڑے بھائی شمس الدولہ نے ماں کی زندگی میں ہمدان کی

حکومت علیحدہ کر لی تھی اور وہ اس پر قابض تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ سماء الدولہ اس کا بیٹا تھا اس نے کچھ دنوں بعد فرہاد بن مرداویج پر حملہ کیا۔ اس نے علاء الدولہ کاکویہ سے مدد مانگی جو شمس الدولہ کا ماموں تھا۔ ماموں بھانجے کے خلاف اس کے دشمن کی مدد پر تیار ہو گیا۔ سماء الدولہ جنگ کا ارادہ ترک کر کے واپس ہو گیا مگر علاء الدولہ نے پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر ایک سخت جنگ ہوئی اور سماء الدولہ کے سپہ سالار تاج الملک نے فرہاد اور علاء الدولہ کی متحدہ فوجوں کو شکست دے دی۔

اس درمیان علاء الدولہ نے تاج الملک کے ترک سپاہیوں کو توڑ لیا اور فتح شکست میں بدل گئی۔ علاء الدولہ نے دونوں کو گرفتار کر کے ہمدان پر قبضہ کر لیا۔

ماموں نے ایک بھائی کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا تو مجد الدولہ اس سے کیا امید کر سکتا، دوسرے اعزاء و اقرباء میں ابو کالنجار اور جلال الدولہ کی فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں، غزنی کی یلغار پر مجد الدولہ کس سے مدد طلب کرتا اور وہ خود اتنے بڑے لشکر سے لڑنے کے قابل نہ تھا لہذا عالم یاس میں جب غزنوی حاجب نے صلح کی بات چیت کرنے کے لئے بلایا تو وہ اپنے بیٹے ابو دلف کو لے کر چلا گیا۔ غزنی کے شکاری نے شکار کے خود جال میں آ جانے کے بعد نہ چھوڑا۔ دونوں گرفتار کر کے پابہ زنجیر کر لئے گئے اور خراسان لے جا کر قید کر دیئے گئے۔

فاتحین عالم تسخیر ملک کی خاطر انسانی زاویہ نگاہ سے حملے کا کوئی نہ کوئی جواز پیش کرتے رہے ہیں اور مسلمان بادشاہوں کے ہوا خواہ شرعی تاویلات میں ذہنوں کو الجھاتے رہے ہیں۔ شاذ و نادر ہی ایسے مواقع آئے ہیں، جب حکومت کی تبدیلی عوام کی خدمت کی خاطر عمل میں آئی ہو اور کوئی تبدیلی اگر عام انسانوں کے لئے مفید بھی ہو تو بھی ایک غور طلب مسئلہ ہے کہ اس سے پہلے کتنا خون بہتا ہے اور کس قدر غارت گری ہوتی ہے۔

بات حقیقتاً صرف شہہ زور اور ناطاقت کی ہے اور توسیع مملکت کی ہوس ہمیشہ سے محض اس لئے سطح زمین کو رنگین کرتی رہی ہے کہ چار وانگ عالم میں اس کی فرمانروائی کا ڈنکا بجتا رہے.......... مطمع نگاہ اگر صرف انسان کی فلاح ہو تو کسی چھوٹے سے علاقے میں بھی اتنی اصلاحات کی جا سکتی ہیں کہ دوسرے اس سے سبق

لیں لیکن ہوتا یہ رہا ہے کہ سکندر دارا کی سلطنت کو غارت کر دیتا ہے اور پنجاب میں داخل ہو کر پورس کے ہاتھیوں سے خود اس کی فوج روندوا دیتا ہے تو تاریخ اس کے کارناموں کو حاشیئے چڑھا کر محفوظ کر لیتی ہے، کوئی یہ نہیں کہتا کہ وہ بنی نوع انسان کے لئے قہر الٰہی تھا۔

یہی صورت مسلمانوں میں بھی پیش آئی۔ ابتدائی فتوحات کی رو "ہادیانہ قیادت" کے نقوش کو ملیا میٹ کر گئی تو بعد کے حکمرانوں کو موقع مل گیا اور وہ مسلمان اور غیر مسلمین پر حملوں کو مقصد اسلام قرار دینے لگے اور آج تک یہ طے نہ ہو سکا کہ کسی متمدن ملک پر بلاوجہ حملہ جائز ہے یا ناجائز۔

حاکم شام معاویہ کے جانشینوں کو جب بنی عباس نے بزور شمشیر بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا تو انہیں بھی مقدس قرار دیدیا گیا حالانکہ ان میں سے اکثر بڑے ظالم و خونخوار تھے۔

پھر وہ کمزور پڑے تو ایک طویل جدوجہد کے بعد بویہین نے انہیں دبا لیا اور اب بویہین کی طاقت ختم ہو رہی تھی، تو محمود غزنوی کا دست زبردست ان پر اتنا زور ڈال رہا تھا کہ وہ زمین کا پیوند ہوئے جا رہے تھے اور تاریخ محمود کو بنگاہ استحسان دیکھ رہی تھی، وہ اتنا ہی ستم گر اور جابر تھا جتنے بویہین۔ ہمارے خیال میں تو دونوں مخلوق الہیٰ کے دشمن اور دونوں انسان کے خون کے پیاسے تھے جنہوں نے اپنی سلطنت کو وسعت دینے کی خاطر انسان اور انسانیت کا خون ارزاں کر دیا اور پھر اسی انداز پر سلجوقیوں اور غوریوں نے ان کی جگہ لے لی۔

بویہی اقتدار کے آخری معرکے

بعض مورخین نے بڑی واویلا کی ہے کہ بویہین نے عباسی خلفاء کے تقدس کو پامال کیا۔ کیسا تقدس، کیا وہ بڑے پاکباز تھے یا خدا نے ان مکاروں کو تخت خلافت ہی کے لئے پیدا کیا تھا؟ کہاں سے حکم آیا تھا کہ رسولؐ کی مسند پر بیٹی کی اولاد کے بجائے ابو سفیان کے نسلی نمائندے بیٹھیں۔۔۔ اور پھر ان سے چالاکی اور تلوار کے بل پر حضرت عباس کے پوتے یہ جگہ چھین لیں۔

کوئی مسلمان تخت سلطنت پر بیٹھ جانے سے مقدس ہو سکتا ہے تو امیر تیمور اس کا سب سے زیادہ اہل تھا۔ رہ گئی بات خلافت کے نام کی تو خلیفہ آج کن کن کو کہا جاتا ہے، سب جانتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ سب مقدس ہوں گے۔

ہمارے نزدیک تو بویہی سلاطین نے صرف عام مسلمانوں کے جذبات کا احترام کیا جو خلافت کے ناسور کو باقی رکھا ورنہ اس دور میں بھی آپریشن سے اس کا علاج ہو سکتا تھا........ بہرحال یہ خلافت گر اب زوال پذیر تھا اور غزنی کا سلطان منصب خلافت گری حاصل کرنے کے لئے بازؤں کو تول رہا تھا۔

بہاء الدولہ کے بعد جب ۴۰۲ھ میں سلطان الدولہ تخت نشین ہوا تو خود اپنے گھر کے دشمنوں کی زد پر تھا۔ پہلا دشمن خود اس کا بھائی ابوالفوارس تھا۔ وہ دیلمیوں کا ایک لشکر لے کر مقابل ہوا جس میں اس کو شکست ہوئی۔ مدد کے لئے اس نے غزنی کا رخ کیا اور محمود کی فوج لیکر پلٹا تو کرمان و شیراز پر قبضہ کر لیا۔

سلطان الدولہ کو اس کی خبر ملی تو تادیب کے لئے روانہ ہوا اور اب کی ابوالفوارس کو شکست دی۔ ابوالفوارس نے بھاگ کر پہلے شمس الدولہ بن معزالدولہ والی ہمدان کے پاس پناہ لی پھر والی بطیحہ مہذب الدولہ سے طالب امداد ہوا۔ اس عرصے میں اس کے بھائی جلال الدولہ نے بیچ میں پڑ کر سلطان الدولہ سے صفائی کرا دی۔

۵۴۱ھ تک بویہی سلطنت کا وقار برقرار رہا لیکن سلطان الدولہ کو زیادہ دن چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے بعد ہی مشرف الدولہ بن بہاء الدولہ سے اس کی ان بن ہو گئی۔ مشرف الدولہ و بیس بن علی بن مزید کی کمک لے کر بڑھا۔ سلطان الدولہ نے ایک سپہ سالار ابن سہلان کو اس کے مقابلے پر بھیجا جو شکست یاب ہوا اور مجبوراً واسط مشرف الدولہ کے حوالے کر کے نکل کھڑا ہوا۔ ۴۱۲ھ میں دونوں بھائیوں کے مابین صلح ہو گئی اور طے پایا کہ عراق پر مشرف الدولہ کا قبضہ رہے گا اور کرمان و فارس پر سلطان الدولہ کا۔

ربیع الاول ۴۱۶ھ میں مشرف الدولہ بن بہاء الدولہ عراقی حکومت کے پانچویں سال وفات پا گیا اور اس کا بھائی ابو طاہر جلال الدولہ تولیت بغداد پر فائز

ہوا جو کچھ عرصہ بعد بصرہ کا عازم ہوا اس کی عدم موجودگی میں ابو کالنجار بن سلطان الدولہ کے نام کا خطبہ پڑھ دیا گیا جو اس زمانے میں اپنے چچا ابو الفوارس سے مصروف پیکار تھا۔

جلال الدولہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بغداد واپس ہوا مگر اہل بغداد نے اس کو اندر داخل نہ ہونے دیا۔

اس اثناء میں ابو کالنجار ابو الفوارس کو شکست دے چکا تھا اور چچا بھتیجے میں صلح ہو چکی تھی مگر اس کے بغداد پہنچنے سے قبل جلال الدولہ کو بغداد والوں نے قبول کر لیا تھا۔ تاہم ترکوں نے اس کی مخالفت کی لیکن جلال الدولہ نے انہیں ہموار کر لیا۔

ابو کالنجار بھی حالات سے غافل نہ تھا، اس نے بغداد جانے کے بجائے بصرہ دکرمان فتح کیا پھر واسط پر قابض ہو گیا اور ان تمام قلعوں پر تسلط حاصل کر کے اہواز کی سمت روانہ ہو گیا اور اثیر عنبر و قرواش والی موصل کو بغداد کی جانب بڑھنے کی ہدایت کی۔ ان میں اثیر عنبر راستے ہی میں فوت ہو گیا۔

ان واقعات کی اطلاع جلال الدولہ کو بغداد میں ہوئی تو وہ لشکر لے کر ابو کالنجار کے مقابلے کے لئے چل پڑا۔ ابو کالنجار نے بھی بغداد کا رخ کیا اور وبیس اور ابو الشوک کو طلب کیا۔ وبیس کو اپنے ملک پر خفاجہ کے حملے کا خطرہ تھا لہذا اس نے ساتھ نہ دیا۔ ابو الشوک نے جواباً مطلع کیا کہ محمود بن سبکتگین کی فوجیں عراق کی طرف بڑھ رہی ہیں لہذا آپس کا جدال مناسب نہیں۔ ابو کالنجار رک گیا اور وہ خط جلال الدولہ کو بھیجدیا مگر وہ باز نہ آیا۔ اس نے اہواز پہنچ کر اسکو لوٹ لیا، ابو کالنجار کی والدہ اور اہل و عیال کو لے کر بغداد کا عازم ہو گیا۔

ابو کالنجار بھی تعاقب میں روانہ ہوا، ربیع الاول ۴۲۱ ھ میں دونوں کے مابین ہولناک جنگ ہوئی، تین روز تک معرکہ قتال گرم رہا، ابو کالنجار کے دو ہزار آدمی کام آئے اور ہزیمت یاب ہو کر اس نے اہواز کی راہ لی۔

اس عرصے میں نور الدولہ وبیس کے بعض سرداروں میں بغاوت کے آثار رونما ہوئے، نور الدولہ نے ان کو گرفتار کر کے سزائیں دیں، پھر کسی بات پر اس

کا معرکہ مقلد بن ابو الاعز اور جلال الدولہ کے لشکر سے ہوا جس میں اس کو شکست ہوئی اور اس نے ابو ستان غریب پہنچ کر پناہ لی۔ اس وقفے میں جلال الدولہ سے اس کی صلح ہو گئی۔

مقلد نور الدولہ کا چچیرا بھائی تھا مگر دونوں میں چلی ہوئی تھی لہذا مقلد نے ابو خفاجہ کو ملا کر، اس پر حملہ کر دیا، مطیر اباد، نیل اور سور کو تباہ کر ڈالا۔ نور الدولہ بھاگ کر دجلہ پار ابو الشوک کے پاس چلا گیا اس نے آپس میں صلح کرا دی۔

۴۲۱ ھ میں جلال الدولہ نے "مدار" پر یلغار کی۔ ابو کالنجار نے اس کے دفاع کے لئے اپنے نامی سرداروں کو روانہ کیا، بڑی سخت لڑائی ہوئی، شہر والوں نے ابو کالنجار کا ساتھ دیا اور جلال الدولہ کی فوج دو طرفہ حربوں سے پس کر رہ گئی، اس کا اکثر حصہ کام آگیا، باقی ماندہ نے واسط پہنچ کر جانیں بچائیں۔

جلال الدولہ نے واسط کو اپنے بیٹے پر چھوڑا اور اپنے وزیر ابو علی کو بطائح کی طرف بھیجا جس نے بطائح سر کرنے کے بعد بصرہ کا رخ کیا۔ بصرے میں ابو کالنجار کی طرف سے ابو منصور بن بختیار حاکم تھا اس کو ابتداً شکست ہوئی۔ ابو علی نے تعاقب کیا مگر جب دریا میں ابو علی کی جنگی کشتیاں اس کی طرف بڑھیں تو ابو منصور نے پلٹ کر حملہ کر دیا اور جنگ کی بازی الٹ گئی فوج میں بھگدڑ پڑ گئی، ابو علی پکڑا گیا اور ابو کالنجار کی قید ہی میں اپنے ایک غلام کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

جلال الدولہ اس کے بعد خود بصرہ کی طرف بڑھا اور ابو کالنجار کے لشکر کو پسپا کر دیا جس نے ابو منصور کے پاس ابلہ جا کر دم لیا اب کی ابو منصور نے خود آ کر مقابلہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکا، اور لڑائی میں کام آگیا۔

ابو کالنجار سخت مزاج آدمی تھا، ان ناکامیوں کے ساتھ ہی والی بصرہ ابو القاسم سے بھی اس کی مخالفت ہو گئی اور اس نے جلال الدولہ سے ساز کر لیا جلال الدولہ نے اپنے بیٹے ملک العزیز کو روانہ کیا، اس نے ابو کالنجار کی فوج کو بصرہ سے نکال دیا اور ابو القاسم کی حکومت کو برقرار رکھا لیکن ۴۲۵ ھ میں ملک العزیز سے اس کی مخالفت ہو گئی اور ابو القاسم کو بصرہ سے نکال دیا گیا لیکن وہ اپنے آدمیوں کو جمع کر کے ملک العزیز سے لڑتا رہا اور ابو کالنجار کی مدد سے پھر بصرے پر قابض ہو گیا۔

ایک طرف شمشیر و سنان کے یہ کھیل ہو رہے تھے، دوسری طرف محمود غزنوی رے کو فتح کر کے قزوین کی طرف بڑھ رہا تھا اس نے قزوین کے بعد شہر سادہ آدہ اور یافت کو بھی مسخر کر لیا اور اس کے حاکم الکین کو گرفتار کر کے خراساں بھیج دیا، پھر فرقہ باطنیہ کے ایک بڑے گروہ کو قتل کیا، معتزلہ کو شہر بدر کیا، فلسفہ اور اعتزال کی کتب نذر آتش کیں اور حدود آرمینیہ تک قبضہ کرتا چلا گیا۔

اصفہان میں علاء الدولہ کاکویہ نے اس کی اطاعت کر لی رے پر اپنے بیٹے مسعود کو حاکم بنا کر وہ زنجان اور ابر کی طرف بڑھا اور ان دونوں مقامات کو فتح کر لیا پھر اصفہان کی طرف متوجہ ہوا اور علاء الدولہ کو بیدخل کر دیا۔ اس پر اہل اصفہان نے بغاوت کی۔ محمود نے نہایت بیدردی سے شہر کو پامال کر ڈالا۔ بقول ابن خلدون پانچ ہزار آدمی تہہ تیغ کر دیئے۔

ارسلان بن سلجوق کو پہلے ہی ماوراء النہر سے گرفتار کر کے ہندوستان کے کسی قید خانے میں بھیج چکا تھا۔ اس زمانے میں اس کے قبیلے نے پھر سر اٹھایا، اصفہان، رے اور آذربائیجان میں لوٹ مار کی۔ غزنی کی فوجیں ان سے لڑتی رہیں مگر ان کا سیلاب رک نہ سکا۔

۴۲۰ھ میں بمقام غزنی سلطان محمود کا انتقال ہو گیا۔ مسعود اس کا بڑا بیٹا تھا جو اس وقت اصفہان میں تھا لہذا موقع سے فائدہ اٹھا کر اسمٰعیل تخت نشین ہو گیا لیکن مسعود نے غزنی پہنچ کر بزور شمشیر اس کو ہٹا دیا اور خود غزنی کا فرمانروا بن گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ایک طرف تاتاری ملک کے مختلف مقامات پر قتل و غارت کر رہے تھے، دوسری طرف بویہی شہزادے مختلف شہروں اور علاقوں کے اقتدار کے لئے باہم ٹکرا رہے تھے، خود غزنوی بھی کبھی ایک سے لڑتے کبھی دوسرے سے۔ سلطان محمود کے انتقال سے اس میں اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ علاء الدولہ نے اصفہان کے لئے ایک جنگ کی اور ہزیمت یاب ہو کر جلال الدولہ کے پاس پہنچ گیا۔

سلطان مسعود نے تمام علاقوں کو واپس لے لیا پھر کرمان پر حملہ کیا جو ابو کالنجار کے قبضہ میں تھا۔ ابو کالنجار کی طاقت جلال الدولہ سے لڑتے لڑتے ٹوٹ

چکی تھی وہ مسعود کا مقابلہ نہ کر سکا اور جیرفت کی جانب فرار ہو گیا اس کے ساتھی مسعودی لشکر کے تعاقب سے گھبرا کر ایک درہ کوہ میں گھس گئے۔

کچھ عرصے بعد علاء الدولہ اور فرہاد بن مرداویج نے متحد ہو کر غزنوی مقبوضات پر حملے کئے مگر شکست کھائی پھر دونوں نے اصفہان کا رخ کیا سخت لڑائی ہوئی، فرہاد میدان میں کام آیا، علاء الدولہ پہاڑیوں میں چھپ گیا۔ دوسری بار پھر قسمت آزمائی کی مگر پھر بھاگنا پڑا۔

ان سنین میں طغرل بیگ ترکمان اور اس کے ساتھیوں کی غارت گری جاری رہی۔ آخر مسعود نے ان کا منہ بھرنے کے لئے طغرل کو نسا کا اور اس کے بھائی جغری داؤد کو دہستان کا حاکم بنا دیا۔ کچھ دنوں یہ لوگ خاموش رہے پھر پرانا طریقہ اختیار کر لیا۔ مجبوراً مسعود نے ان پر فوج کشی کی۔ ۴۲۹ھ میں ترکمان بھی مقابلے پر ڈٹ گئے اور باقاعدہ جنگ کرنے کے بجائے شبخوں مار کر سامان اور گھوڑے لوٹ لے گئے۔

اس طرح تین سال تک انہوں نے غزنوی لشکر کو الجھائے رکھا اور اس کو پریشان کیا، آخر ایک بار شکست دیدی اور سلطان مسعود کو بعض امراء کے ساتھ فرار ہو کر جان بچانا پڑی۔

۴۳۱ھ میں طغرل نے نیشاپور پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد بیغو نے ہرات فتح کر لیا ۴۳۲ھ میں جغری بیگ داؤد نے بلخ کو حصار میں لے لیا۔ سلطان مسعود نے ایک بڑا لشکر روانہ کیا جو بمشکل ہرات و بلخ کو واگزار کرا سکا۔

سلجوقیوں کی یلغار سے اراکین سلطنت مسعود سے بددل ہو گئے۔ انہوں نے اس کو معزول کر کے سلطان محمد کو تخت نشین کر دیا پھر قید میں مسعود کا قتل ہو گیا تو اس کے بیٹے مودود نے چڑھائی کر دی۔ شعبان ۴۳۲ھ میں سلطان محمد مارا گیا اور مودود بادشاہ ہو گیا۔

ان تغیرات کے نتیجے میں کچھ شہر بویہیوں نے واپس لے لئے اور باقی تمام پر آہستہ آہستہ سلجوقیوں نے قبضہ کر لیا۔

جلال الدولہ ہنوز بغداد کا متولی تھا۔ ۴۲۲ھ سے قادر باللہ کے بعد قائم

بامراللہ تخت خلافت پر متمکن تھا لیکن بغداد کے حالات ٹھیک نہ تھے امراء کی باہمی چپقلش نے امن و امان خطرے میں ڈال دیا تھا آخر ایک امیر بار سطفان کھل کر سامنے آگیا۔ جلال الدولہ سے اس کا معرکہ ہوا اور وہ گرفتار ہو کر قتل کیا گیا اسپر خلیفہ نے جلال الدولہ کو ملک الملوک کا خطاب دیا۔

۴۲۸ھ میں بعض بزرگوں کی تحریک پر جلال الدولہ سے ابو کالنجار کی صفائی ہو گئی اور اس کے بیٹے ابو منصور سے جلال الدولہ کی بیٹی کا عقد ہو گیا۔

ابو کالنجار مسلسل شکستوں کے بعد بصرہ اور کئی دوسرے مقامات پر قبضہ کر چکا تھا۔ خاندان کے دوسرے افراد بھی کئی مقامات پر اپنے پرچم لہرا چکے تھے کہ شعبان ۴۳۵ھ میں جلال الدولہ کی وفات ہو گئی۔ اسکا بڑا بیٹا ملک العزیز ان دنوں واسط میں تھا، بروقت بغداد نہ پہنچ سکا۔ ابو کالنجار اہواز میں تھا، وہ فوراً بغداد کی طرف چل پڑا، اس کے ساتھ ہی اس نے مخبر بھیج کر ملک العزیز کی فوج میں پھوٹ ڈلوادی۔

بغداد کے نئے بادشاہ کی طرف سے فوج اور خلیفہ کے نذرانے کا سوال بھی تھا اور ملک العزیز کے پاس روپیہ نہ تھا۔ ابو کالنجار کی یہ حیثیت تھی، اس نے مطالبات پورے کر دیئے اور خلیفہ نے اس کو محی الدین کے لقب کے ساتھ خلافت کا متولی بنا دیا اور رمضان ۴۳۶ھ سے ابو کالنجار نے اس منصب کو سنبھال لیا۔

ملک العزیز نے دو بار اس کے مقابلے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ ناکام رہا۔ آخر وہ میافارقین میں نصر الدولہ کے پاس پناہ گزیں ہوا اور وہیں وفات پا گیا۔

بویہی حکومتوں کا زوال انتہاء پر پہنچ چکا تھا تاہم ماضی کے اکابر کا اتنا دبدبہ تھا کہ نہ محمود و مسعود عراق پر قبضہ کرنے کی ہمت کر سکے اور نہ ان کے جانشین سلجوقی ان کی طرف آنکھ اٹھا سکے حالانکہ وہ خراسان پر پوری طرح قابض ہو چکے تھے۔

علاء الدولہ ۴۳۳ھ میں انتقال کر چکا تھا، اس کی عملداری ہمدان سے اصفہان تک تھی۔ ابو منصور فرامرز اس کا بیٹا تھا، چھوٹا بھائی ابو الحرب بعض علاقوں کا دعویدار ہوا اور دونوں میں ٹھن گئی۔ ابو الحرب نے رے کے سلجوقیوں سے مدد لی اور جرجان فتح کر لیا مگر ابو منصور سے میدان داری میں شکست کھائی۔

اس نے ابو کالنجار سے درخواست کی وہ ابو الحرب کے ساتھ اپنا لشکر لے کر بڑھا اور اصفہان کو گھیر لیا۔ ابو منصور نے خراج دینے کے وعدے پر اطاعت کر لی۔

سلجوقیوں نے خراسان اور رے کے بعد ہاتھ پاؤں نکالنا شروع کر دیئے تھے ابو کالنجار نے کئی محاذوں پر انہیں روکا لیکن ایک بوڑھی حکومت کے لئے نوخیز سیلاب کو روکنا آسان ثابت نہ ہوا۔ آخر ابو کالنجار نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ طغرل بیگ سے صلح کر لی جائے۔ طرفین نے اس پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اسی کے ساتھ دونوں میں رشتہ داری بھی عمل میں آگئی۔ ابو کالنجار کی بیٹی طغرل کو بیاہ دی گئی اور طغرل کے بھائی جغری بیگ داؤد کی بیٹی ابو منصور فلاستون کے عقد میں آگئی

ایک سال بعد ۴۴۰ھ میں ابو کالنجار اپنے بھائی ابراہیم نیال کی بغاوت فرد کرنے کے لئے نکلا تو خیاب پہنچ کر سفر آخرت کر گیا۔ بغداد میں اس کی حکومت کی مدت سوا چار سال تھی۔

بغداد کا آخری متولی

ابو کالنجار کے چھ بیٹے تھے: ابو نصر، خرد فیروز، ابو منصور فلاستون، ابو طالب کامرو، ابو المظفر بہرام، ابو علی کیخسرو اور ابو سعد خسرو۔ تین بیٹے ان کے علاوہ اور تھے۔ ابو کالنجار کی وفات کے وقت ابو منصور اس کے ساتھ تھا۔ ابو نصر بغداد میں تھا اس نے قائم سے بغداد کی تولیت اور عراق کی حکومت حاصل کر کے الملک الرحیم کا لقب اختیار کر لیا۔ بصرہ میں اس کا بھائی ابو علی کیخسرو حکمران تھا جس کو اس نے بحال رکھا۔

ابو منصور فلاستون نے فارس جا کر شیراز پر قبضہ کر لیا تھا جس کو ملک الرحیم نے اپنے بھائی ابو سعد کو بھیج کر گرفتار کرا لیا۔ کچھ دنوں بعد ابو منصور قید سے چھوٹ گیا تو اس نے شیراز کی فوج کی مدد سے پھر شہر پر قبضہ کر لیا اور اہواز بھی لے لیا۔ کئی سال تک دونوں بھائیوں میں جنگ ہوتی رہی۔ کبھی میدان ایک کے ہاتھ رہتا کبھی دوسرے کے۔ آخر منصور کو شیراز کا حکمران مان لیا گیا اور اہواز کو اس کے قبضے سے نکال لیا گیا۔

ادھر سلجوقی حکومت ایران و عراق کے وسیع تر علاقوں پر محیط ہوتی جا رہی تھی۔ فرامرز بن علاء الدولہ نے طغرل بیگ کی اطاعت کر لی تھی لیکن سلجوقی حکمران کو اس کا اعتبار نہ تھا۔ ۴۳۳ھ میں اس نے اصفہان اور رے پر مستقل قبضہ کر لیا تھا اور فرامرز کے لئے ایک جاگیر چھوڑ دی تھی۔ اس طرح ایک بویہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

اس کے بعد طغرل نے خلیفہ بغداد سے سند حکومت حاصل کرنے کے لئے ایک وفد روانہ کیا۔ خلیفہ نے اسے بغداد آنے کی دعوت دی مگر اس نے بعض گرانقدر تحائف بھیج دینے پر اکتفاء کی اور دربار خلافت سے اس کو خلعت اور رکن الدولہ کے خطاب سے نوازا گیا۔

پچھلے دنوں ملک الرحیم نے ہزار سب والی رامہرمز سے اس کا علاقہ چھین لیا تھا۔ ابو منصور نے اس کو ملا کر اہواز پر حملہ کر دیا۔ ملک الرحیم اس کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کو شکست ہو گئی اور اس نے واسط پہنچ کر دم لیا مگر اس کے بھائی ابو سعد نے انہیں دنوں اصطخر پر قبضہ کر لیا تھا ابو منصور نے ایک کامیابی کے بعد شیراز کی طرف رخ کیا لیکن ابو سعد کے مقابلے میں شکست کھائی اور ایک قلعہ میں جا کر چھپ گیا۔

پھر ابو منصور اور ہزار سب طغرل بیگ سے ایک ہزار فوج لیکر نئے سرے سے مقابلے پر آئے۔ اتفاق سے ملک الرحیم کا دیلمی سپہ سالار عراق کی طرف گیا ہوا تھا۔ دبیس بن مزید بھی موجود نہ تھا۔ ملک الرحیم کے ساتھ تھوڑی سپاہ عسکر مکرم میں تھی۔ وہ اہواز کی طرف آ گیا اور دشمنوں کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کے لئے اس نے ابو سعد کو فارس کی طرف روانہ کر دیا مگر یہ تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی۔ ابو منصور نے براہ راست اس کے سامنے پہنچ کر میدان میں نیزہ گاڑ دیا۔ ملک الرحیم کو پیٹھ دکھاتے شرم آئی، اس نے مقابلہ کیا مگر اس کو بھاگ کر پھر واسط میں پناہ لینا پڑی۔

۴۴۱ھ میں بساسیری اور بنی عقیل کی ایک جنگ ہو چکی تھی اور زعیم الدولہ بن مقلد سے سخت معرکہ پڑا تھا مگر وہ فیصلہ کن نہ تھا۔ اس کے بعد ہی انبار

پر حملہ کر کے قرواش والی انبار کو نکال دیا اور اس پر قابض ہو گیا تھا۔ ۴۴۶ھ میں قریش بن بدران والی موصل نے انبار پر حملہ کیا اور اس کو فتح کر کے طغرل بیگ کے نام کا خطبہ پڑھوا دیا۔

جنگ و جدل کے اس دور دورے میں خارجیوں نے عمان پر قبضہ کر لیا پھر بغداد میں بلوہ ہوا اور شیعہ آئمہ کی قبور تک کھدوا ڈالنے کا منصوبہ بن گیا مگر اس پر عمل نہ ہو سکا۔ نور الدولہ دبیس کو اس کی خبر ملی تو اس نے اپنی مملکت میں عباسی خلیفہ کا خطبہ بند کرا دیا۔ مخالفین نے جواباً مشہد کو جلا دیا۔ صلح پسند لوگوں نے مداخلت کی۔ یہ تصادم ختم ہو گیا لیکن ۴۴۵ھ میں منافرت کی آگ پھر بھڑک اٹھی جس کو بڑی مشکل سے دبایا جا سکا۔

بصرہ ابو کالنجار کے مرنے کے بعد سے ابو علی کے قبضے میں تھا۔ انہیں دنوں اس کی طرف سے بغاوت کا شبہ پیدا ہوا۔ ملک الرحیم کی طرف سے بساسیری کو بھیجا گیا جس نے ابو علی کو شکست دے کر بصرہ پر قبضہ کر لیا۔ ابو علی نے شط عمان جا کر قرار لیا۔ بساسیری نے تعاقب کیا اور شط عمان اور تشتر پر قابض ہو گیا۔ غرض کہ نت نئی جنگیں بویہی افراد کے درمیان ہوتی رہیں۔ ملک الرحیم کا دائرہ اقتدار یقیناً بڑھتا رہا لیکن ابو علی کے سے لوگ طغرل بیگ کی پناہ میں بھی پہنچتے رہے۔

انہیں دنوں ابو منصور فلاستون نے شیراز لے لیا اور طغرل اور عبدالرحیم دونوں کے نام خطبے میں شامل کروا دیئے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب کردوں اور عربوں کے گروہ بھی لوٹ مار میں لگ گئے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی خفاجہ نے حلہ کے شہروں پر تاخت کی۔ دبیس مقابلے کی تاب نہ لا سکتا۔ اس نے بساسیری سے مدد مانگی بساسیری ان کو مارتا ہوا فرات عبور کر گیا، خطان کا محاصرہ کیا پھر اس کو فتح کر کے قلعہ مسمار کرا دیا مگر اس مینار کو نہیں تڑوایا جو بیعہ بن حطاعم نے زر کثیر خرچ کر کے کشتیوں کی رہنمائی کے لئے بنوایا تھا

ملک کی اس صورت حال اور سلجوقیوں کی کامیابیوں نے بغداد کے ترکوں کو بھی اکسایا۔ انہوں نے وزیر السلطنت سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کر دیا اور رقم نہ ملنے پر بغداد اور مضافات کو لوٹنے لگے۔ وزیر السلطنت روپوش ہو گیا ترک اس کو

ڈھونڈتے ہوئے خلیفہ تک پہنچ گئے......... آخر وزیر سلطنت نے پناہ گاہ سے باہر آکر ان کا مطالبہ پورا کیا۔

عرب اور کرد پہلے ہی ہنگامے برپا کئے ہوئے تھے جن میں قریش بن بدران والی موصل بھی شامل ہو گیا۔ انہوں نے کامل بن محمد بن مسیب کو بھی جا گھیرا۔ خود بساسیری کے مویشی تک ہنکائے گئے۔ اسی سلسلے میں تاتاریوں کا ایک گروہ بھی نکل آیا اس نے مضافات اہواز کو تباہ کر ڈالا۔

بغداد میں بساسیری نے دو آدمیوں پر شبہ کر کے گرفتار کر لیا اور ایک کو سولی پر لٹکا دیا۔ یہ دونوں آدمی وزیر سلطنت رئیس الروسا کے تھے۔

بات یہ تھی کہ "بساسیری" مذہباً باطنی شیعہ تھا اور بغداد کا رئیس الروسا سنی تھا، اس لئے دونوں میں مخالفت تھی۔ بساسیری کو سلجوقیوں کا عروج، جو سنی تھے سخت گراں تھا اور رئیس الروسا ان کا ہمدرد اور بہی خواہ تھا۔ بساسیری اور موصل کی عرب حکومت میں بھی مخالفت تھی خصوصاً جب سے قریش بن بدران نے طغرل بیگ کی اطاعت قبول کر لی تھی اس وقت سے بساسیری اس کے خلاف ہو گیا تھا۔ (۳۶)

نتیجے میں ایک نے دوسرے پر الزام تراشی کی اور رئیس الروسا نے بساسیری کے خلاف عمائدین کو ملا کر خلیفہ کے کان بھر دیئے اور خلیفہ نے ملک الرحیم کو خط لکھا کہ بساسیری خلافت مصر سے سازش کر رہا ہے۔ انجام کار اہواز سے بغداد کے راستے میں ملک الرحیم نے بساسیری کو الگ کر دیا اور وہ رحبہ چلا گیا اور وہاں سے خلیفہ مصر سے خط و کتابت کرنے لگا۔

طغرل بیگ ۴۴۷ھ میں حج کے بہانے بغداد کی سمت روانہ ہو چکا تھا۔ ملک الرحیم کے بغداد پہنچنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ بھی آپہنچا۔ ملک الرحیم میں بساسیری کی علیحدگی کے بعد طغرل سے لڑنے کی طاقت نہ تھی لہٰذا خلیفہ کی وساطت سے اس نے دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا اور طغرل سے باہمی مصالحت ہو گئی کہ وہ بدستور اپنے منصب پر قائم رہے گا اور طغرل بیگ واپس چلا جائے گا۔

لیکن طغرل کے قیام بغداد میں اہل بغداد نے اس کی فوج پر حملہ کر دیا جس

میں ترک پیش پیش تھے۔ اس میں ملک الرحیم کو ملوث کر لیا گیا۔ طغرل بیگ کے بہت سے آدمی کام آگئے۔ اس نے خلیفہ سے کہلوایا کہ اگر ملک الرحیم اس میں شامل نہیں ہے تو اس کو میرے پاس بھیجا جائے۔

ملک الرحیم خلیفہ کے کہنے میں آگیا مگر جیسے ہی وہ طغرل کی قیام گاہ میں داخل ہوا، فوراً پکڑ لیا گیا۔ خلیفہ نے ہزار کہا مگر طغرل نے ملک الرحیم کو نہ چھوڑا البتہ اس کے کچھ آدمیوں کو رہا کر دیا جو بساسیری کے پاس چلے گئے۔ اس طرح بویہی ایوان کا آخری مینار بھی گر گیا۔ طغرل بیگ تیرہ ماہ بغداد میں رہا، ملک الرحیم اور اس کے فوجیوں کا مال و متاع اور جائیدادیں سب اس نے ضبط کر لیں .... خلیفہ ان کے فعل سے کچھ دنوں اس سے ناراض رہا پھر اس نے اس کی خوشنودی کی خاطر اپنی بھتیجی خدیجہ بنت داؤد کا عقد خلیفہ سے کر دیا۔

ابو منصور فلا ستون سلجوقیوں کی طرف سے ۴۴۰ھ تک فارس کا حکمراں رہا جس کو اس کے سپہ سالار نے قید کر دیا اور خود حکمران بن گیا تو سلجوقیوں نے اس کو گرفتار کر کے فارس پر قبضہ کر لیا۔

ابو علی کیخسرو الپ ارسلان کے پاس چلا گیا تھا اس نے نوبند جان اور کرمان کی جاگیریں اسے دیدی تھی۔ وہ ۴۸۷ھ میں مر گیا۔ پھر کوئی بویہی حکمران باقی نہ رہا اور اس عظیم سلطنت کا خاتمہ ہو گیا جو تاریخ ساز بھی تھی اور خلیفہ گر بھی۔ ملک الرحیم ۴۵۰ھ میں وفات پا گیا۔

بساسیری رحبہ سے نور الدولہ دبیس بن مزید کے پاس چلا گیا جو عقیدۃ شیعہ تھا۔ حلہ میں ٹھہر کر اس نے اپنی فوج کی ترتیب دی اور نور الدولہ کے تعاون سے ایک منصوبہ بنانے لگا۔

ملک الرحیم اہل بغداد کی اکثریت کا ہم عقیدہ نہ ہی لیکن اس وقت انہوں نے اس کو بہت یاد کیا۔ جب سلجوقی فوجیوں نے ان پر وہ مظالم ڈھائے جس کی توقع وہ اپنے محافظوں سے نہ کر سکتے۔ قتل و غارت اور لوٹ مار کے عادی سلجوق ان مواقع کو ضائع نہ کر سکتے جب نہتے شہریوں کے گھر ان کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ انہوں نے اہل شہر کے مال و متاع کو مال غنیمت کی طرح لوٹا اور خلیفہ نے جب

طغرل سے شکایت کی تو طغرل نے مجبوری کا اظہار کر دیا۔

آخر طغرل بیگ کو بغداد سے کوچ کرنا پڑا۔ وہ خلافت بغداد کا نیا متولی تھا اور ایک فاتحانہ شان کے ساتھ مرکز خلافت سے جا رہا تھا۔

تاریخ کی ہر سلطنت کا خاتمہ جس طرح ہوتا آیا ہے، عماد الدولہ کے خاندان کی حکومت بھی اسی طرح ختم ہوئی۔ جب تک خاندان کی کوئی مرکزی شخصیت باقی رہی، اس وقت تک ایک آواز پر ہر طرف سے لبیک کی آوازیں آتی رہیں اور جب سے شیرازہ منتشر ہوا اس وقت سے ایک شیرازے کی لڑیاں خود آپس میں گتھم گتھا ہونے لگیں۔ ایسے میں کوئی کسی کی آواز کہاں سنتا ہے بلکہ لبیک کہنے کے بجائے زبان شمشیر سے جواب دیا جاتا ہے۔

بویہی آپس میں دست و گریبان رہے اور غزنویوں نے ان کی باہمی لڑائی سے فائدہ اٹھایا اور جب وہ کمزور پڑے تو سلجوقیوں کی نئی طاقت ابھری اور اس نے آہستہ آہستہ بساط کے ایک ایک مہرے کو ہٹانا شروع کیا پھر ملک الرحیم نام کے شاہ شطرنج کو بھی مات دیدی اور بغداد ایک نئے سورج کو طلوع ہوتے دیکھنے لگا۔

وقت کا یہ انقلاب شیعوں کے لئے نیا نہ تھا وہ شروع ہی سے عصبیت کی چکی میں پستے آئے تھے۔ تاج و تخت سے کبھی ان کو کوئی تعلق نہ رہا تھا البتہ وہ صبر و سکون کے ساتھ اسلام کے اصول پر انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے تھے جس کا موقع انہیں بویہی سلطنت میں ملا تھا تو انہوں نے پرچم اہل بیت بلند کیا تھا جس کو ایک لمحے کے لئے برداشت نہیں کیا گیا۔

بویہی انصاف پسند حکمراں تھے۔ انہوں نے کبھی جانبداری سے کام نہیں لیا شیعوں کو اعلائے کلمۃ الحق کا استحقاق ضرور دیا تو اس پر شیعہ سنی فساد ہو گیا اور پھر فساد ہوتا ہی رہا۔ قتل عام، آتش زنی، غارت گری لگ بھگ سالانہ معمول بن گیا ہمارے مشاہد جلائے گئے، کتب خانے نذر آتش کئے گئے لیکن اب ہم بکھرے اور منتشر نہیں تھے۔ شیعہ حکومتوں کی برکت سے ہماری آبادیاں کرخ جیسے محلوں میں سمٹ آئی تھیں لہذا ہماری طرف سے بھی کچھ نہ کچھ کیا گیا پھر بھی اکثریت اور اقلیت کا فرق باقی رہا۔

یہ لڑائیاں پہلے پہل وقوع میں آئی تھیں کیونکہ اس سے قبل ہم کوئی جواب دینے کے قابل ہی نہیں تھے۔ مقابلتاً اب بھی بہت کمزور تھے لیکن اب ہمارا مقابلہ عوام سے تھا۔ حکومت کی ننگی تلواریں ہمارے سروں پر نہیں تھیں، تاہم مجموعی طور پر نقصان ہمارا ہی ہوتا رہا۔

ہمارے وجود کو ابتداء ہی سے برداشت نہیں کیا گیا تھا تو ہماری حکومت کو کیونکر برداشت کیا جاتا لیکن دنیا طاقت کو پوجتی ہے۔ بویہیوں میں جب تک کس بل رہا، ان کے سامنے لوگوں کے سروں پر طائر بیٹھے رہے، کوئی سرتابی کی جرأت نہ کر سکا لیکن بغداد میں سلجوقی پرچم لہراتے ہی نگاہیں بدل گئیں۔ اب شیعوں کے لئے بنی امیہ کا اور منصور و متوکل کا دور نئے سرے سے شروع ہونے والا تھا جس کے لئے وہ تیار تھے۔

باقیات الصالحات

سلجوقی بویہی سلطنت کے بیشتر علاقوں پر قابض ہو چکے تھے ۔ جا بجا چھوٹی چھوٹی حکومتیں باقی تھیں جن کا تعلق اگرچہ بویہین سے نہ تھا لیکن وہ شیعہ تھیں اور سلجوقیوں سے اتحاد نہ کر سکتیں جیسے بنی وبیس اور بنی عقیل ۔ بویہی سپہ سالار بساسیری امدنوں حلہ میں نور الدولہ وبیس کے پاس مقیم تھا۔

۴۴۸ھ میں دونوں نے مل کر موصل پر حملہ کیا ۔ قریش بن بدران نے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور گرفتار کر کے نور الدولہ کی خدمت میں پیش کیا گیا اس نے خلیفہ مستنصر علوی کا مصر سے منگوایا ہوا خلعت پیش کیا جس کو قریش نے قبول کیا اور موصل میں اس کے نام کا خطبہ جاری کرا دیا۔

طغرل نے واپس آتے ہی اپنے ایک امیر ہزار سب کو اعراب موصل کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا جس نے ایک سخت لڑائی کے بعد انہیں پسپا کیا ۔ ایک بڑی تعداد ان میں سے کام آئی، قیدیوں میں سے اکثر کو طغرل بیگ نے قتل کرا دیا

قریش و نور الدولہ کو موصل میں اس کی خبر ملی تو انہوں نے طغرل سے صلح کر لینا ہی وقت کا تقاضا قرار دیا ۔ طغرل نے اس پیش کش کو منظور کیا اور دونوں کے بیشتر علاقے ان کے قبضے میں رہنے دیئے ۔

بساسیری موصل سے رحبہ چلا گیا.......... اس دوران طغرل دیار بکر اور جزیرہ کی طرف متوجہ ہوا ۔ ابن مروان نے اطاعت قبول کر لی اس کے بعد ہی طغرل بیگ نے سنجار پر دھاوا بولا اور اس کو فتح کر کے وہاں کے حاکم کو قتل کر دیا ۔ پھر بغداد کا عازم ہوا ۔ خلیفہ کی خدمت میں بیش قیمت تحائف پیش کئے اور وہ خود اعزازات سے نوازا گیا۔

پہلی مرتبہ طغرل سے خلیفہ کی ملاقات نہیں ہوئی تھی ۔ اب کی حضوری کی عزت بھی ملی اور الملک المشرق والمغرب کا لقب بھی پایا۔

موصل میں وہ اپنے بھائی نیال کو نگراں کے طور پر چھوڑ آیا تھا ۔ وہ طغرل سے باغی ہو کر ہمدان چلا گیا ۔ بساسیری اور قریش بن بدران یہ خبر ملتے ہی آگئے اور موصل پر قابض ہو گئے ۔

طغرل بغداد سے سیدھا موصل پہنچا مگر بساسیری اور قریش اس سے قبل ہی بغداد کی طرف روانہ ہو گئے تھے ۔ آخر طغرل نے ہمدان کا رخ کیا مگر نیال کی قوت دیکھ کر اس کو اپنی شکست کا خدشہ پیدا ہو گیا اس لئے رے کی طرف چل پڑا........

پھر اپنے بھتیجوں الپ ارسلان اور قاروت کو اپنے ساتھ شامل کر کے نیال کی طرف بڑھا اور اس کو شکست دے کر گرفتار کر لیا پھر قتل کرا دیا۔

بغداد خالی تھا ۔ وہاں کوئی بساسیری اور قریش کو روکنے والا نہ تھا ۔ انہوں نے بسہولت شہر پر قبضہ کر لیا اور خلیفہ مستنصر علوی کا خطبہ جاری کر دیا اور خلیفہ کو اس کے چچیرے بھائی کے ساتھ حدیثہ بھیج دیا۔

مورخین متفق ہیں کہ بساسیری نے اہل بغداد کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا، خلیفہ قائم کی ضعیف ماں کو ایک اچھے مکان میں منتقل کر کے کنیزوں کا انتظام بھی کر دیا اور وظیفے کے ساتھ ضروریات کی تمام اشیاء فراہم کرا دیں۔

رئیس الروسا سے اس کی پرانی دشمنی تھی، اس کو معاف نہیں کیا اور تشہیر کرا کے سولی پر لٹکا دیا ۔ عمید عراق کو قتل کرا دیا۔

طغرل نیال سے مصروف پیکار تھا ۔ اس سے فراغت پا کر اس نے بغداد پر توجہ دی اور بساسیری کو بعض آسان شرائط پیش کیں مگر بساسیری اس کے فریب نہیں آیا ۔ سلجوقی لشکر کے قریب پہنچنے سے قبل ہی وہ ذی قعدہ ۴۵۰ھ میں بغداد چھوڑ گیا۔

خلیفہ قائم اس کے بعد ہی بغداد آگیا ۔ طغرل نے بغداد میں داخل ہو کر اس کی بڑی عزت و تکریم کی اور خلیفہ نے بھی اپنے ہاتھ سے اسکی کمر میں تلوار باندھی جو

ایک بڑا اعزاز تھا۔

بساسیری اور نور الدولہ وبیس عراق میں مقیم تھے۔طغرل نے ان کے مقابلے کے لئے ایک بڑا لشکر روانہ کیا۔نور الدولہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی بطیحہ کیطرف روانہ ہو گیا۔بساسیری ٹھہرا رہا۔وہ گھوڑے پر سوار اپنی فوج کے ساتھ مد مقابل تھا۔اچانک اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ دینا چاہی شاید فرار ہونے کا ارادہ تھا مگر قسمت ساتھ چھوڑ چکی تھی، کچھ ایسا ہوا کہ وہ گھوڑے سے گر پڑا، سلجوقیوں نے اس کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔اس کا سر طغرل کو پیش کیا گیا اور جسم بغداد لا کر تشہیر کرایا گیا۔

طغرل بیگ واسط سے پھر بغداد آ گیا............. بنی وبیس کا حکمراں سیاسی صورت حال کو سمجھ چکا تھا اور اس نے اپنی قوت کا اندازہ بھی کر لیا تھا۔اسی لئے بساسیری کا ساتھ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔اس نے ہزار سب کے ذریعہ صلح کو مناسب قرار دیا۔وہ ۴۵۲ھ میں نور الدولہ اور ابو علی بن کالنجار کو لیکر بغداد پہنچا اور طغرل بیگ سے ان کی صفائی ہو گئی۔خلیفہ قائم نے ان کے اعزاز میں دعوت دی اور طغرل کی موجودگی میں خلعتیں عنایت کیں.......... اس زمانے کے چھوٹے چھوٹے شیعہ حکمرانوں کے لئے سلجوقیوں کی اطاعت کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔انہوں نے ایسا ہی کیا مگر کچھ دنوں بعد ان کے علاقوں کو کسی نہ کسی بہانے سلجوقیوں نے ہڑپ کر لیا۔

۴۵۳ھ میں بعض عمائدین کی تحریک پر طغرل کے ساتھ خلیفہ قائم کی بیٹی کا عقد ہوا مگر رخصتی نہ ہونے کی شرط پر۔کچھ دنوں بعد طغرل بغداد سے واپس ہو گیا لیکن ۴۵۵ھ میں پھر بغداد گیا اور کنیزوں کی موجودگی میں دولہن کا دیدار کر کے پلٹ آیا........ واپسی کے چھ ماہ بعد رمضان ۴۵۵ھ میں بمقام رے انتقال کر گیا۔

طغرل کے کوئی اولاد نہیں تھی، اس لئے اس کا بھتیجا سلیمان جانشین ہوا لیکن امراء نے اس کو تسلیم نہیں کیا، لہذا دوسرا بھتیجا الپ ارسلان تخت پر بٹھایا گیا بنی وبیس سے سلجوقیوں کا پھر کوئی اختلاف نہیں ہوا۔نور الدولہ بن

وبیس ستاون سال حکومت کر کے ۴۷۴ھ میں دنیا سے کوچ کر گیا اور اس کا بیٹا بہاؤ الدولہ ابو کامل منصور باپ کا جانشین ہوا۔اس نے بھی سلجوقی حکومت کی بالادستی قبول کی، خود جا کر الپ ارسلان سے سند حکومت لے آیا اور نہایت عدل و انصاف سے حکومت کرتا رہا۔

سیف الدولہ صدقہ

ربیع الاول ۴۷۶ھ میں بہاؤ الدولہ نے سفر آخرت کیا۔اس عرصے میں ملک شاہ، الپ ارسلان کی جگہ لے چکا تھا۔سیف الدولہ صدقہ نے بہاؤ الدولہ کا منصب سنبھالا۔خلیفہ نے نقیب العلوین کو بھیج کر صدقہ سے تعزیت کی اور سند حکومت عطا فرمائی جس کی توثیق ملک شاہ نے بھی کر دی۔

ملک شاہ کا انتقال ہونے پر جب برکیارق اور اس کے بھائی محمد بن ملک شاہ میں رزم آزمائی ہوئی تو سیف الدولہ نے برکیارق کا ساتھ دیا اور بعض جنگوں میں بذات خود شریک ہوا اور مالی اور فوجی مدد تو کرتا ہی رہا۔

برکیارق کی کامیابی میں اس کا ایک حصہ تھا لہذا ۴۹۴ھ تک اس کی عزت و توقیر کی جاتی رہی۔اس کے بعد برکیارق کے وزیر ابو المحاسن نے قاصد بھیج کر مطالبہ کیا کہ دس لاکھ دینار کا جو سامان اس کے پاس محفوظ کرایا گیا تھا، اس کو واپس کر دے ورنہ بزور شمشیر وصول کیا جائے گا۔

سیف الدولہ بہادروں کی اولاد میں تھا۔اس لب و لہجہ کو انگیز نہ سکا اس نے جواب سخت دیا اور برکیارق کا نام خطبے سے نکلوا دیا۔

سلطان برکیارق اپنے بھائیوں محمد اور سنجر سے ہزیمت یاب ہو کر بغداد پہنچا تھا کہ اس کو ان حالات کی خبر ملی۔اس نے اپنے ایک امیر ایاز کو صدقہ کے پاس روانہ کیا۔

شبہات ایک بار دل میں گھر کرنے کے بعد نہیں نکلتے۔صدقہ سلجوقیوں کا ماتحت ہی نہیں، وفادار دوست بھی تھا۔اس نے حق رفاقت ادا کیا تھا۔ایک دفعہ کی متکبرانہ بدسلوکی کو وہ بھول نہ سکا پھر امیر ایاز کا انداز بھی حاکمانہ تھا اس لئے بات بننے کے بجائے اور بگڑ گئی اور صدقہ نے کوفہ سے سلطان کے گورنر کو نکال کر اس پر

قبضہ کر لیا۔

۳۹۶ھ میں سلطان برکیارق نے اصفہان کا محاصرہ کیا تھا جہاں کا حاکم اس کا بھائی سلطان محمد تھا۔ وہ قلعہ بند ہو گیا تھا اور برکیارق ہمدان کی طرف واپس ہو گیا تھا۔ صدقہ ان دنوں اپنی فوجوں کے ساتھ صرصر میں مقیم تھا۔ ابو النوازی اور سقمان دو سلجوقی سردار بھی سلطان محمد کے حامی تھے اور بغداد میں پہلے ہی طرح اسکے نام کا خطبہ پڑھوانا چاہتے تھے۔ وہ بغداد کے عازم ہو گئے۔ صدقہ کا تعاون بھی انہیں حاصل تھا۔ آخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور بغداد میں سلطان محمد کے نام کا خطبہ جاری ہو گیا۔

سیف الدولہ صدقہ سلطان محمد کا کھلا حامی تھا۔ واسط میں سلطان برکیارق کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔۔۔ صدقہ نے اس پر حملہ کیا اور فتح کر کے وہاں بھی سلطان محمد کا خطبہ پڑھوا دیا۔

۴۶۷ھ میں قائم بامر اللہ کی وفات کے بعد ۴۸۷ھ تک خلیفہ مقتدی بامر اللہ کا دور خلافت رہا۔ اب مستظہر خلیفہ تھا۔ سلجوقی سلاطین اس کے مطیع تھے مگر عملی طور پر بغداد سیف الدولہ کے تابع تھا جو ماضی کے شیعہ اقتدار کی آخری علامت تھا مگر وقت کی رفتار دیکھ کر سلاجقہ کا دست و بازو بنا ہوا تھا۔

بنی عقیل کی حکمرانی بھی صحیح معنیٰ میں ختم ہو چکی تھی لیکن برکیارق نے بہاء الدولہ بن وہب کو "ہئیت" کی جاگیر دیدی تھی۔ بنی عقیل کا ایک گروہ صدقہ کے ساتھ تھا۔ بہاء الدولہ اور صدقہ میں کسی بات پر ان بن ہوئی تو بنی عقیل نے صدقہ کا ساتھ دیا۔ بہاء الدولہ تلخ صورت حال میں حج بیت اللہ کو چلا گیا اور مقلد کی اولاد میں محمد بن رافع ہئیت کا والی بن گیا۔ بہاء الدولہ کی واپسی پر صدقہ نے شہر خالی کر دینے کا مطالبہ کیا۔ منصور بن کثیر بہاء الدولہ کی طرف سے فوج لے کر نکلا۔ میدان کارزار گرم ہوا۔ اس دوران شہریوں نے شہر کا پھاٹک کھول دیا اور صدقہ کا لشکر اندر داخل ہو گیا۔

منصور نے اطاعت کر لی اور صدقہ نے اپنے چچیرے بھائی ثابت بن کامل کو ہئیت کا حاکم بنا دیا۔

پھر واسط میں منصب الدولہ بن ابو الخیر کو والی مقرر کیا اور حلہ کا عازم ہو گیا اب برکیارق اور سلطان محمد میں صلح ہو گئی تھی۔ سلطان محمد نے صدقہ کے مقبوضات پر اس کی حکومت کی توثیق کر دی اور بصرہ پر قبضے کے لئے اپنے ایک نائب کو متعین کیا پھر ایک باغی کی سرکوبی کی طرف متوجہ ہو گیا اور صدقہ کو بصرہ کے لئے مامور کر دیا۔ سلجوقی حکمران بصرہ اسمٰعیل بن ارسلان سیف الدولہ صدقہ کو خاطر میں نہ لایا اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔

صدقہ نے اس کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تو میدان حرب و ضرب گرم ہوا۔ قلعہ کے دوسری طرف سے صدقہ کی دوسری فوج حملہ آور ہو گئی اور دو طرفہ جنگ میں اسمٰعیل شکست کھا کر جزیرہ کی طرف بھاگ گیا پھر اس نے صدقہ سے امن کی درخواست کی، صدقہ نے اس کو مان لیا اور بصرہ پر اپنے دادا کے ایک مملوک سردار التونتاش کو حاکم بنا کر ۴۹۴ھ میں حلہ آ گیا۔

التونتاش کے خلاف قبائل ربیعہ اور منتفق نے بغاوت کی تو سلطان محمد نے اپنی طرف سے ایک حاکم وہاں بھیج دیا۔

مہذب الدولہ صدقہ کی طرف سے واسط کا عملدار تھا لیکن نظم کو سنبھال نہ سکا۔ مجبوراً صدقہ نے اسے معزول کر کے حماد بن ابو السید کے حوالے کر دیا اور وہ اپنے وطن بطیحہ چلا گیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ بویہین کے زمانہ اقتدار میں جو شیعہ طاقتیں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی رہیں، زبوں حالی کے اس دور میں انہوں نے آپس میں رشتے قائم کر لئے تھے۔ مہذب الدولہ کی بیٹی بدران بن صدقہ کو بیاہی تھی اور بنی عقیل بھی کسی نہ کسی نوعیت سے سیف الدولہ صدقہ کی شخصیت سے وابستہ ہو گئے تھے کیونکہ اب تو ان سب کا ملجا و ماویٰ وہی رہ گیا تھا۔

مہذب الدولہ اور حماد بھی ایک ہی دادا کی اولاد تھے اور رشتے میں چچا بھتیجے ہوتے تھے لیکن واسط کی حکمرانی کے سلسلے میں ان کے درمیان چل گئی صدقہ حماد کے ساتھ تھا اس نے بطیحہ پر لشکر کشی کر دی۔ آپس میں کئی معرکے ہوئے۔ آخر مہذب الدولہ کے بیٹے کی درخواست پر صدقہ نے دونوں میں مصالحت کرا دی۔

سیف الدولہ صدقہ برسوں تک برکیارق کا جانباز رہا تھا پھر وزیر السطنت ابو المحاسن کے تکبر کے باعث وہ سلطان محمد کی طرف چلا گیا اور اس کی حکومت کی جڑیں مضبوط کرتا رہا۔ برکیارق کے انتقال پر جب سلطان محمد پوری سلطنت کا بادشاہ بن گیا تو اس نے صدقہ کی خدمات کے عوض اسے بہت نوازا۔ اس کا یہ عروج اکثر عمائدین و امراء کو پسند نہ تھا۔ وہ اس کی طرف سے سلطان محمد کے کان بھرنے لگے۔ شروع میں سلطان محمد نے توجہ نہیں کی مگر تابہ کے! آخر سلطان محمد کو اپنے وفادار شمشیر زن کی طرف سے سوء ظن پیدا ہونے لگا۔

صدقہ کی جمعیت اور شجاعت

اتفاق سے والی سادہ سرخاب بن کیخسرو سے سلطان ناراض ہو گیا۔ سرخاب نے صدقہ کے دامن عاطفت میں پناہ لی۔ صدقہ کو امید تھی کہ وہ سلطان سے اس کی صفائی کرا دے گا لیکن صدقہ کے دشمن حمید ابو جعفر محمد بلخی نے سلطان کو اتنا بھرا کہ وہ طیش میں آکر صدقہ پر چڑھ دوڑا اور اس سے سرخاب کی واپسی کا مطالبہ کیا۔

صدقہ حدود سلجوقیہ کا مانا ہوا سردار تھا۔ اس کو اپنی طاقت پر بھی اعتماد تھا مگر اس کا بیٹا وبیس سلجوقی حکومت سے ٹکر لینے کے حق میں نہ تھا۔ سپہ سالار لشکر سعید بن حمید کو سلطان کی طرف سے سیف الدولہ کی اتنی توہین گوارا نہ ہو سکی۔ اس نے جنگ کا مشورہ دیدیا اور صدقہ نے پہلے کی طرح انکاری جواب دیدیا۔

طرفین میں سخت کشمکش ہوئی اور سلطان محمد نے ربیع الاخر ۵۰۱ھ میں جنگ کی تیاری شروع کر دی اور بغداد کے نواح میں سلجوقی فوجیں جمع ہونا شروع ہو گئیں۔

سیف الدولہ کی شجاعت اور تدبر مسلم لیکن اس موقع پر اس نے دور اندیشی سے کام نہیں لیا پھر بد نصیبی سے اس نے مقدمۃ الجیش فضل بن ربیعہ کو مقرر کیا جو درپردہ سلطان محمد سے ملا ہوا تھا وہ مقابلے پر پہنچتے ہی سلطان سے جاملا۔

میدان جنگ کی ذرا سی غلطی جنگ کا پانسہ الٹ دیتی ہے ایسا ہی کچھ صدقہ کے ساتھ پیش آیا۔ اس کی ساکھ خراب ہو گئی۔ سلطان محمد نے اسکو اور خراب کرنے کے لئے امیر محمد بن بوقا کو صدقہ کے مقبوضات کی تاراجی پر متعین کیا جس

نے پہلے واسط پر حملہ کیا پھر توسان پر یلغار کی۔ صدقہ کے سرداروں نے بڑی جیداری سے مقابلے کئے اور ثابت بن کامل نے سلجوقیوں کے چھکے چھڑا دیئے مگر آخر انہیں شکست ہوئی اور امیر محمد نے صدقہ کی عملداری کو تباہ و برباد کر ڈالا۔

بغداد کے قریب خود صدقہ اور سلطان محمد کی مڈبھیڑ ہوئی۔ سلطان اس جنگ کے لئے پہلے سے سازش کا جال بچھا چکا تھا۔ جنگ شروع ہوتے ہی عبادہ اور خفاجہ صدقہ کی صفوں کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے۔ صدقہ نے آوازیں لگائیں۔

"آل خزیمہ، آل ناشرہ، آل عوف! یہ جنگ کا وقت ہے تم عرب نژاد ہو اپنی تلواروں کی آزمائش کرو"

سیف الدولہ کی یہ آواز گونج کر رہ گئی انہوں نے گھوم گھوم کر بھی دیکھا مگر پلٹے نہیں۔

بنی مروان کے گرد صدقہ کے پرچم تلے جمع ہو گئے تھے۔ صدقہ نے انہیں للکارا وہ سردھڑ کی بازی لگا کر ٹوٹ پڑے۔ بنی وبیس کا آخری وارث اپنی آخری جنگ میں اس طرح لڑا جیسے اسلاف کی ہر روایت اس کے ساتھ ہو لیکن فوج کے بازو ٹوٹ چکے تھے پھر بھی اس نے میدان نہ چھوڑا۔

سلطان محمد صدقہ کی بہادری سے واقف تھا جانتا تھا کہ اس کا مقابلہ آسان نہیں، دوگنے سلجوقی بھی مقابل ہوئے تو سر بر نہیں ہو سکتے اس لئے اس نے تلوار کے بجائے سیاست کے تیر اپنے ترکش سے نکالے تھے، پہلے اس نے صدقہ کے ہراول کو توڑا پھر اس کی پوری فوج میں اپنے مخبر پھیلا دیئے۔ انہوں نے عصبیت، تحریص و ترغیب، ہر حربے کا استعمال کیا اور اتنی خاموشی سے غداری کا زہر پھیلایا کہ صدقہ کو بھنک تک نہ مل سکی........ پھر بھی شیر کا مقابلہ تھا۔ صدقہ جیالے کردوں کے دوش بدوش لڑ رہا تھا اس کا رجز دور دور تک سنائی دے رہا تھا۔

"میں صدقہ ہوں، عرب کا بادشاہ!"

اس کی تلوار بجلی کی طرح کوند رہی تھی کہ منصوبے کے مطابق سلجوقی لشکر نے تیروں کی بارش شروع کر دی جس نے سیف الدولہ کے بہت سے سپاہیوں کو زخمی کر دیا۔ اس دوران پہلے سے متعین کئے ہوئے تازہ دم دستے صدقہ کی طرف

بڑھے اور صفوں کو چیرتے ہوئے صدقہ تک جا پہنچے۔ عین اسی وقت ایک تیر آکر لگا اور صدقہ لڑکھڑا گیا تاہم اس کی تلوار چلتی رہی۔ ایک ترکی غلام گھات میں لگا ہوا تھا اس نے ایک پہلو سے کمر پر زور دے کر ڈھکیل دیا اور صدقہ گھوڑے سے زمین پر آرہا غلام نے تلوار کا وار کر دیا اور سر اتار لیا۔

اس طرح وسط ایشیا میں شیعوں کی شجاعت کا پرچم سرنگوں ہو گیا جس کے اسباب و عوامل میں مکر و فریب کا زیادہ دخل تھا۔

سیف الدولہ سلطان محمد کا حکومت ساز تھا، سلجوقی فرماں روا نے اس کے لئے اپنے عمل پر شرمندگی کا احساس کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن دل ہی دل میں وہ سوچتا ضرور ہو گا کہ ایسے باوفا کے لئے اس نے جو کچھ کیا، وہ اس کی خدمات کا بدل نہ تھا .... مگر سیاسی مصلحتوں میں ایسے انسانی افکار کی کبھی کوئی قیمت نہیں رہی۔

یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ سلطان محمد صدقہ کو آزاد چھوڑ دیتا تو اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سلجوقیوں کے لئے بڑے سے بڑا خطرہ بن سکتی تھی پھر سلجوقی اکثریت ذہنی طور پر اتنی روشن خیال نہ تھی کہ شیعوں کے شکست خوردہ عناصر کو ایک مرکز پر جمع ہوتے دیکھ کر خاموش رہتی لہذا برکیارق اور سلطان محمد کی جنگ آزمائی ختم ہوتے ہی انہوں نے ضرور سوچا ہو گا کہ "حلہ" کو اسی مقام پر پاش پاش کر دینا چاہئے ورنہ پانی کا چھوٹا سا چشمہ کہیں دریائے قہار نہ بن جائے اور اپنے سیلاب میں سلجوقیت کو بہا نہ لے جائے۔

عصبیت کے اس ماحول میں کسی شیعہ کردار کا زندہ رہنا آسان نہ تھا اس کو تو مزیدی اور عقیلی وارثان وقت کی غیر معمولی صلاحیت کہنا چاہئے کہ انہوں نے اپنی سوجھ بوجھ سے خود کو نشانہ ستم بننے سے بچائے رکھا۔

سلطان محمد نے سیف الدولہ صدقہ کو قتل کرا دیا تھا اور خلیفہ کو اس کا سر نذرانے کے طور پر بھیج دیا تھا پھر بھی اس کو احساس ضرور تھا کہ صدقہ کی شمشیر براں اس کی محافظ رہی تھی اسی لئے جب صدقہ کی بیوہ حلہ سے آئی تو اس نے احترام کے ساتھ اس کا استقبال کرایا اور اس کے بیٹے دبیس کو حلہ کی جاگیر پر بحال کر دیا۔

دبیس اس کی اطاعت سے انحراف نہ کرنے کا عہد و پیمان نہ کرتا تب بھی

وہ ایک کمزور حکمراں کو خاطر میں کیا لاتا جس کی طاقت کو سلجوقیوں کا چھوٹا دستہ بھی پامال کر سکتا تھا تاہم اس نے بتقاضائے احتیاط اس کو حلہ جانے نہیں دیا کیونکہ وہ بہر طور شیر کا بچہ تھا۔

سلطان محمد کی وفات پر ۵۱۱ھ میں جب سلطان محمود تخت نشین ہوا تو اس نے اس کو اپنی نگاہوں کے سامنے رہنے کی پابندی سے آزاد کر دیا اور دبیس حلہ آگیا ....یہاں وہی ہوا جس کا خطرہ سلجوقی تاجدار کو تھا، دبیس کے گرد کرد، عقیلی اور مزیدی سب جمع ہونے لگے۔

دبیس بن صدقہ

۵۱۲ھ میں خلیفہ مستظہر باللہ کا انتقال ہو گیا اور ان کے بیٹے مسترشد باللہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو ان کا بھائی کسی خوف سے چھپ چھپا کر مدائن چلا گیا اور وہاں سے حلہ جا کر پناہ گزین ہوا۔ خلیفہ نے دبیس سے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا

وہی صورت حال پیش آگئی جس کا شکار سیف الدولہ صدقہ ہوا تھا عرب کی حمیت کسی طرح اس کی اجازت نہ دے سکتی کہ مہمان کو اس کے دشمن کے حوالے کر دے، دبیس نے خلیفہ کو جواب دیا کہ امیر ابوالحسن نے میری پناہ لی ہے، میں اس کو زبردستی نہیں بھیج سکتا، تاوقتیکہ وہ خود جانا نہ چاہے۔

خلیفہ کے سفیر نے سمجھا بجھا کر امیر ابوالحسن کو راضی کر لیا اور دبیس نے اس کو ضروریات کی تمام چیزیں فراہم کر دیں مگر وہ حلہ سے روانہ نہ ہوا تھا کہ بغداد سے ایک فوج برسقی کی ماتحتی میں روانہ ہو گئی........ امیر ابوالحسن جس خطرے کے تحت بغداد سے بھاگا تھا وہ سر پر آگیا تو اس نے ماہ صفر ۵۱۳ھ میں خود بڑھ کر واسط پر قبضہ کر لیا۔

دبیس ایسے کسی جھگڑے میں پڑنا نہ چاہتا تھا لیکن خلیفہ نے حکم بھیجا کہ اب وہ تمہارا مہمان نہیں ہے اس کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو۔ بادل نخواستہ دبیس نے اس پر عمل کیا اور امیر ابوالحسن کو اس کے ایک دستہ فوج نے گرفتار کر کے بغداد پہنچا دیا۔

اس عرصے میں کئی سلجوقی امراء کے مابین میدان داری کی نوبت آ گئی جس میں دبیس کو بھی شامل ہونا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ان کو لڑوانا چاہتا تھا تاکہ کسی ایک طرف شامل ہو کر باپ کا سا وقار حاصل کرسکے .... مگر حقیقت یہ ہے کہ امیر ابوالحسن کے سلسلے میں خلیفہ مسترشد، دبیس سے سخت ناراض تھا اس نے سلطان کو لکھا تھا کہ دبیس اپنے باپ کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔

اتفاق یہ ہے کہ سلجوقی امراء میں کسی حد تک مطلق العنانی پیدا ہو گئی تھی چنانچہ آذر بائیجان کے حاکم مسعود نے علم بغاوت بلند کر دیا اور ربیع الاول ۵۱۴ھ میں بمقام استرآباد سلطان محمود کے لشکر سے اس کا مقابلہ ہوا جس میں مسعود کو شکست ہوئی۔

پھر مسعود کے ایک بھائی نے سلطان محمود سے اس کا قصور معاف کرا دیا اور الزام دبیس پر آگیا کہ وہ سلجوقی سرداروں کو ورغلایا کرتا تھا۔ سلطان محمود خلاف توقع اس کی طاقت بڑھ جانے سے متوحش تھا۔ ان ریشہ دوانیوں کی خبر سے طیش میں آگیا اور اس نے حلہ پر ہلہ بولنے کا حکم دیدیا۔

دبیس ان دنوں عراق میں تھا اس کو ان سازشوں اور سلطان کے ارادے کی خبر ملی تو اس نے اہل و عیال کو بطیحہ بھیج دیا اور خود حلہ آگیا اور تمام مال و اسباب سمیٹ کر ایلغازی بن ارتق کے پاس ماردین جا کر پناہ لی۔

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ دبیس نے خود حلہ کو تباہ کر دیا تھا لیکن یہ خلاف عقل ہے۔ اجداد کی آباد کی ہوئی بستی کو کوئی خود اپنے ہاتھوں سے کیونکر تباہ کر سکتا ہے، دبیس نے اتنا ضرور کیا ہو گا کہ وہاں کچھ ایسا نہ چھوڑا ہو گا جو سلطان محمود کے کام آسکے۔ رہ گئی حلہ کی تاراجی تو وہ ہر لحاظ سے سلطان محمود کا کارنامہ ہے جو بارہ گھنٹے کے اندر عمل میں آگیا۔ ۔ ۔ ۔ سیف الدولہ صدقہ بھی محلاتی سازش سے مارا گیا تھا اب اس کا بیٹا بھی اس زد پر تھا وہ بھی آسانی سے سر خم کرنے والا نہ تھا۔ اس نے صورتحال کو سمجھ کر اپنے بھائی منصور کو صغد سے ایک فوج کے ساتھ عراق کی طرف روانہ کیا جو حلہ اور کوفہ ہوتا ہوا بصرہ پہنچا اور دبیس کی ہدایت کے مطابق مصالحت کے لئے ایک وفد سلطان محمود کی خدمت میں روانہ کر دیا تاکہ حقیقت

حال گوش گزار کی جاسکے لیکن مصالحت تو اس وقت ہوتی جب کوئی بات سبب کے ساتھ واقع ہوتی، وہاں تو قصور ڈھونڈھ کر پیدا کئے گئے تھے جو درباریوں کا کام ہو یا خود سلطان کا، نتیجے میں صلح کو بات چیت کے بجائے منصور، اس کے بیٹے اور تمام ساتھیوں کو گرفتار کرا لیا گیا اور کرخ کے قریب ایک قلعہ میں قید کر دیا گیا۔

" اس کے بعد دبیس کے ہمراہیوں کا ایک گروہ واسط کی طرف آیا جس کو سلجوقیوں نے روک لیا۔ اب دبیس نے ایک فوج مہلہل بن ابی العسکر کی ماتحتی میں روانہ کی اور مظفر بن ابی الخیر کو اس کی کمک کے لئے روانہ کیا مگر مہلہل مظفر کے پہنچنے سے قبل سلجوقیوں سے ٹکرا گیا اور ہزیمت یاب ہو کر گرفتار کر لیا گیا۔

سلجوقیوں کا جنگی فریب

اس دوران دبیس کے ایک جعلی خط کے ذریعے مظفر کو دبیس سے برہم کر دیا گیا اور وہ واسط کی فوج سے جا ملا۔

مختلف مورخین کے بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ دبیس از خود افواج سلطانی سے ٹکرانا نہ چاہتا تھا اس نے سیف الدولہ صدقہ کے سے طاقتور کو روکا تھا تو خود چھوٹی سی فوج کے ساتھ لڑنے پر آمادہ کیا ہوتا مگر امیر ابوالحسن کو مہمان بنا لینے کے جرم میں خلیفہ مسترشد جب اس کا دشمن ہو گیا اور اس نے سلطان کو اس کا مخالف بنا دیا تو ممکن ہے اس نے بعض امراء کو بغاوت پر اکسایا ہو پھر بھی اس نے اپنے بھائی منصور کو پہلے مسترشد کے پاس بھیجا اور جب وہ درگزر سے کام لینے پر آمادہ نہ ہوا تو براہ راست سلطان محمود کی خدمت میں روانہ کیا جس نے منصور کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروا دیں۔

دبیس کا باپ رزم گاہ میں عزت کی موت مارا گیا تھا، بھائی صلح کی درخواست لے کر گیا تھا تو سلجوقی طاقت کے زعم میں سلطان نے اس کا یہ حشر کیا!

اس کے بعد دبیس کا جو عالم ہونا چاہئے تھا وہ ہوا، وہ ایک بپھرا ہوا شیر بن گیا اور مقبوضات سلطانی کو نیم دیوانگی میں تاراج کرنے لگا .... سلطان نے بھی تو حلہ کو برباد کر دیا تھا۔

دبیس جانتا تھا کہ اس کے مٹھی بھر سرفروش افواج قاہرہ سے کب تک لڑ سکتے ہیں پھر بھی اس کے سامنے دو ہی راستے تھے عزت کی موت یا ذلت کی زندگی پھر خلیفہ اور سلطان کی روش سے یہ اندازہ بلکہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کو ذلت کی زندگی کے بجائے ذلت کی موت ہی میسر آئے گی۔ اپنے بھائی منصور کا انجام اس کے سامنے تھا لہٰذا اس نے عزت کی موت کو ترجیح دی اور اس کا راستہ اس نے اپنا لیا۔

سلطان کا بھائی مسعود اس سے لڑا تھا جو قابل معافی قرار پایا مگر بقول مورخین اس کو جنگ کے لئے ورغلانے والا دبیس تھا۔ اس کا قصور شاید مسعود سے زائد تھا تب ہی وہ عفو نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بات بالکل واضح ہے کہ دبیس کے خلاف مفروضہ جرائم تراش لینا تھے جو کر لئے گئے اور دبیس بھی نوشتہ تقدیر پر شاکر ہو کر میدان میں آ گیا۔ نہر ملک میں مسترشد کا جو مال و متاع تھا وہ سب اس نے لوٹ لیا اور نواحی شہروں کو یوں پامال کیا کہ شہری بھاگ بھاگ کر بغداد جا کر پناہ گزیں ہوئے۔

پچھلی جنگ میں دبیس نے خلیفہ کے ایک خادم کو گرفتار کر لیا تھا اس کو رہا کر کے دبیس نے ایک خط خلیفہ کو اس کے ذریعے روانہ کیا جس میں منصور کے ساتھ سلطان کی ظالمانہ حرکت کا ذکر کیا اور اپنی طرف سے اطاعت کا وعدہ کیا مگر اس کی یہ کوشش بے سود ہوئی۔ مسترشد نے اس کو معاف کرنے کے بجائے پوری تیاریوں کے ساتھ ایک بڑا لشکر ترتیب دیا اور دبیس کو سبق دینے کے لئے چل پڑا۔

دبیس نے بھی منہ نہ موڑا۔ محرم ۵۱۷ھ میں سخت جنگ ہوئی مگر دبیس خلیفہ کے ٹڈی دل پر بازی نہ لے جا سکا اس کو شکست ہو گئی پھر بھی وہ ہمت نہ ہارا اور منتفق سے مدد لے کر بصرے کا عازم ہو گیا۔ شہر کو فتح کر کے اس کے سردار کو قتل کر دیا اس درمیان خلیفہ کی ہدایت پر برسقی اس کی طرف روانہ ہوا مگر اس کے پہنچنے سے قبل دبیس نے بصرہ چھوڑ دیا۔

۵۱۸ھ میں اس نے صبیائیوں کی مدد سے بصرہ کا محاصرہ کر لیا اور اس میں

کامیابی نہ ہونے پر طغرل بن سلطان محمد کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور اس کو تسخیر عراق کا خواب دکھایا۔

دبیس کی یہ مساعی یقیناً غدرانہ تھیں مگر وہ کرتا بھی کیا خود اس میں اتنی بڑی سلطنت سے لڑنے کی طاقت نہ تھی اور خلیفہ کسی قیمت پر اس کی جان بخشی پر تیار نہ تھے۔ ان حالات میں اس کے لئے بجز اس کے کوئی راستہ ہی نہ تھا کہ خلیفہ اور سلطان کے خلاف خود انہیں میں سے دشمن پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

کاش کوئی عصبیت زدہ مورخ یہ بھی لکھ دیتا کہ دبیس اور کرتا کیا؟ پھانسی کا پھندا خود اپنے گلے میں تو ڈال نہ سکتا۔ اس کی رگوں کا گرم خون ایسی اجازت نہ دے سکتا پھر وہ ایک بہادر کا بیٹا تھا اس کو تو لڑ کر ہی مرنا تھا۔

شجاع ابن شجاع

آذربائیجان میں دبیس کا شاندار خیر مقدم کیا گیا اور طغرل ایک بڑی فوج کے ہمراہ فتح عراق کے لئے چل پڑا۔ مسترشد بھی ایک لشکر جرار لے کر نکلا۔ دونوں فوجیں ایک لمبا چکر کاٹ کر قریب پہنچیں۔ دبیس نے تامرا میں قیام کر کے کوچ کیا اور خلیفہ کی فوج کا سامان رسد لوٹ لیا...... پھر اتفاقاً خلیفہ مسترشد سے اس کی ملاقات ہو گئی وہ معافی کا طلبگار ہو گیا اور خلیفہ نے وزیر السلطنت جلال الدین بن صدقہ کی سفارش پر اس کو معاف کر دیا۔

دبیس جب طغرل کے پاس واپس آیا تو خلیفہ کی طرف سے وسوسہ میں تھا اور سلطان کی طرف سے تو اسے قطعی اطمینان نہ تھا کیونکہ امور مملکت میں مخالف کو مطمئن کر کے پھنسا لینا آئے دن کا کھیل رہا تھا۔ اس کا الو تو اس وقت سیدھا ہو سکتا تھا جب سلجوقیوں میں باہم تلوار چلتی تو وہ کسی فریق کا ساتھ دے کر اپنی جگہ بناتا لہٰذا طغرل جب سلطان سنجر کے پاس خراساں پہنچا تو اس نے سنجر کے کان بھرنا شروع کر دیئے۔

۵۲۲ھ میں سلطان محمود سے سلطان سنجر کی ملاقات ہوئی تو آپس کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ سنجر نے دبیس کو سلطان محمود کے حوالے کر کے کہا کہ اس کو عزت کے ساتھ اس کے شہر واپس کر دیا جائے، سلطان محمود اسے بغداد لے گیا اور

خلیفہ سے اس کی معافی کی سفارش کی............ دبیس کا خدشہ غلط نہ نکلا، مسترشد اس کی غلطیوں سے درگزر کرنے پر تو تیار ہو گیا لیکن اس کا علاقہ واپس کرنے پر راضی نہ ہوا۔

سلطان محمود بغداد سے واپس ہو کر ہمدان میں مقیم ہوا۔ وہاں سے کوچ کرنے پر اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا پھر سلطان بھی بیمار پڑ گیا............ حلہ خلیفہ کے قبضے میں تھا۔ دبیس نے موقع پایا تو سلطان کے چھوٹے بیٹے کو لے کر فرار ہو گیا حلہ سے مسترشد کے متعینہ والی کو نکال دیا اور خود ۵۲۳ھ میں حلہ پر قبضہ کر لیا۔

سلطان نے اس کی اطلاع پا کر دبیس کے دونوں ضامنوں کو بلایا۔ ان میں سے احمد بیلی دبیس کو لانے کے لئے روانہ ہو گیا پھر خود سلطان بھی عراق کی طرف چل پڑا۔

دبیس نے بہت سے بیش قیمت تحائف سلطان کی خدمت میں روانہ کئے سلطان نے انہیں قبول تو کیا مگر دبیس کی معذرت کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خود بغداد پہنچ گیا......... دبیس کو اپنے بارے میں خلیفہ کے ارادوں کا اندازہ تھا اس لئے بصرہ پر حملہ آور ہو گیا اور اس کو لوٹ کر قبضہ کر لیا۔

سلطان نے اس کے تعاقب میں فوجیں روانہ کیں تو بصرہ چھوڑ کر بریہ جا پہنچا، وہاں سے شام کی طرف کوچ کیا۔ تاج الملک والی دمشق کو اطلاع ہوئی تو اس نے چالاکی سے دبیس کو گرفتار کر لیا۔

عماد الدین زنگی شام کے بعض علاقوں کا والی تھا، تاج الملوک کا بیٹا اور بعض امراء اس کے پاس نظر بند تھے۔ زنگی دبیس کا سخت ترین دشمن تھا۔ اس کو خبر ہوئی تو اس نے تاج الملوک کے بیٹے اور امراء کے بدلے دبیس کو طلب کیا۔ تاج الملوک نے یہ سودا کر لیا مگر بہادر بہادر کی قدر جانتا ہے۔ عماد الدین زنگی نے خلاف توقع دبیس کو رہا کر کے نوازش و اکرام سے نوازا اور اپنے ساتھ رہنے کی استدعا کی۔

۵۲۵ھ میں سلطان محمود نے انتقال کیا اور اس کا بیٹا ملک داد اس کی جگہ تخت نشین ہوا مگر اس کے چچا مسعود نے بزور شمشیر تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت مسعود کا بھائی طغرل خراساں میں اپنے چچا سنجر کے پاس تھا۔

سلطان مسعود کے تخت پر بیٹھتے ہی طغرل اور عماد الدین زنگی دونوں اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ سنجر کو ان دونوں کا سلطان مسعود سے لڑنا پسند نہ آیا اس نے عماد الدین کو بغداد کا شحنہ بنا دیا اور دبیس کو اس کا معاون مقرر کر دیا۔ اس پر سلطان مسعود سنجر اور طغرل دونوں سے جنگ پر آمادہ ہو گیا۔

خلیفہ مسترشد سلطان مسعود کی مدد کے لئے بغداد سے نکلا مگر عماد الدین زنگی اور دبیس کی فوجیں سد راہ ہوئیں۔ بغداد واپس ہو کر اس نے نئے سرے سے لشکر کو مرتب کیا اور عماد الدین و دبیس کا مقابلہ کیا اور دونوں کو پسپا کر دیا۔ دبیس نے حلہ جا کر دم لیا جس کے مضافات پر اقبال خادم کا تصرف تھا۔ خلیفہ مسترشد نے ایک فوج اقبال کی کمک کے لئے بھیجی۔ دبیس سے اس کا مقابلہ ہوا اور دبیس کو ہزیمت ہوئی وہ بھاگ کر واسط پہنچا تو اس کا بقیۃ السیف لشکر بھی کام آ گیا تاہم ابن الخیر والی بطیحہ کی مدد سے اس نے واسط پر قبضہ کر لیا۔

بغداد سے پھر ایک لشکر بھیجا گیا۔ دبیس کی قوت ختم ہو چکی تھی پھر بھی اس نے مقابلہ کیا ایک خونریز جنگ ہوئی اور میدان اقبال خادم کے ہاتھ رہا۔ اس بار دبیس سلطان مسعود کی پناہ میں چلا گیا۔

اس اثناء میں طغرل وفات پا گیا اور خلیفہ مسترشد سے سلطان مسعود کا تنازعہ بہت بڑھ گیا دبیس نے بعض امراء کے ساتھ بغداد جا کر ایک بار پھر خلیفہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر دبیس پھر سلطان مسعود کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

خلیفہ مسترشد اس کی بے ادبی کی سزا دینے پر تل گئے تھے۔ وہ ایک بڑا لشکر لے کر نکلے اور بمقام اعرج طرفین کے لشکر ایک دوسرے کے مقابل خیمہ زن ہو گئے۔ آخر ایک سخت معرکہ پیش آیا جس میں مترشد کو شکست ہوئی۔ وہ اور اس کے عمائدین گرفتار کر لئے گئے۔ سلطان مسعود نے خلیفہ سے فوج نہ رکھنے کی شرط کے ساتھ بعض شرائط منظور کرائے اور دونوں کے مابین صلح ہو گئی۔

سلطان مسعود کے قیام بغداد میں ذی قعد ۵۲۹ھ میں باطنیوں کے ہاتھوں خلیفہ مسترشد کا قتل ہو گیا اور خلیفہ راشد باللہ اس کے جانشین ہوئے اس قتل کا

الزام دبیس کے سر رکھ دیا گیا اور سلطان مسعود نے بے خبری میں اس کا سر اتروا لیا جو سلجوقیوں کی دیرینہ آرزو تھی اور جس کی خاطر کئی بار بڑے بڑے جال بچھائے گئے تھے۔

حلہ میں صدقہ بن دبیس کو اس کی خبر پہنچی تو باپ کے خون ناحق پر اس کا خون کھولنے لگا مگر اس نے بڑے تحمل سے کام لیا اور اتنی بڑی سلطنت سے متصادم ہو کر خود کشی نہیں کی بلکہ بعض وفاداروں کے ساتھ سلطان کی طرف چل پڑا۔ سلطان نے اس کو وہیں روک لیا کیونکہ ظالم اپنی پرچھائیں سے بھی ڈرتا رہتا ہے پھر صدقہ بن دبیس تو سیف الدولہ صدقہ کا پوتا تھا۔

صدقہ جری ہونے کے ساتھ دانش مند بھی تھا۔ اس نے سلطان کے دل میں جگہ بنالی اور کچھ دنوں بعد حلہ اس کو واپس مل گیا۔

خلیفہ راشد بغداد میں صرف خلیفہ تھے۔ کچھ دنوں بعد عماد الدین زنگی والی موصل کی گزارش پر موصل جا کر مقیم ہوئے۔ عماد الدین بڑی فرماں برداری سے پیش آیا اور بار بار سلطان مسعود کی زیادتیاں بیان کر کے خلیفہ کو سلطان سے برگشتہ کرتا رہا۔ سلطان مسعود کو اپنی طرف سے خلیفہ راشد کے خیالات کا علم ہوا تو اس نے اسے معزول کر دیا اور ۵۳۰ھ میں خلیفہ مقتفی لامر اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی

سلطان مسعود ہمدان پہنچا تو صدقہ بن دبیس نے حلہ آنے کی دعوت دی سلطان فوجوں کو اطراف میں بھیج کر حلہ پہنچ گیا۔ صدقہ نے بڑے انکسار کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور بعض امراء کی تحریک پر اپنی بیٹی کا عقد اس کے ساتھ کر دیا جس کی داغ بیل شاید پہلے ہی پڑ چکی تھی۔

اسی زمانے میں خلیفہ راشد کے ارادوں کا علم ہوا۔ وہ اچانک اس کے سر پر جا پہنچا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی اور سلطان نے ان سب کو شکست دیدی اور امیر منکبرس والی فارس کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔

جنگ ختم ہی ہوئی تھی کہ والی خوزستان اور والی خلخال اپنی فوجوں کے ساتھ اکدم پلٹ پڑے۔ مسعود بڑے اطمینان کے ساتھ ایک مقام پر فرد کش تھا۔

تھوڑی سی فوج اس کے ارد گرد تھی جس کے پاؤں اس بھرپور یلغار میں اکھڑ گئے اور سلطان کو شکست کھانا پڑی۔

امراء و عمائدین کی ایک تعداد فاتحین کے ہاتھوں گرفتار ہو گئی جن میں صدقہ بن دبیس اور عنبر بن ابی العسکر بھی تھا۔ امراء کے ساتھ یہ دونوں قتل کر دیئے گئے۔

سلطان مسعود نے سنبھلنے کے بعد محمد بن دبیس کو حلہ کا والی بنا دیا اور مہلہل بن ابی العسکر کو مددگار کے طور پر متعین کیا۔ اس طرح حلہ کی حکومت اس خاندان میں باقی رہی۔

والی فارس اور خوزستان وغیرہ مختلف شہروں پر دھاوے مار رہے تھے۔ آخر سلطان مسعود کو ان کی سرکوبی کے لئے نکلنا پڑا۔ ۵۴۱ھ میں بغداد سے نکلتے وقت اس نے امیر مہلہل بن ابی العسکر اور نظیر خادم کو بغداد کا نگراں مقرر کیا۔ انہوں نے کسی شبہ پر یا کسی مصلحت سے علی بن دبیس کو قلعہ تکریت میں قید کر دینے کی رائے دی۔ علی کو کسی طرح اس کی خبر ہو گئی وہ چند آدمیوں کے ساتھ نکل بھاگا اور حلہ پہنچ گیا۔

یہ گویا ایک تحریک تھی دبے ہوئے زخموں کو ابھارنے کی یا اس منصوبے کو زندہ کرنے کی جو کبھی بروئے کار لایا گیا تھا۔ محمد بن دبیس مہلہل کی اس حرکت کے باوجود علی کی بغاوت کا حامی نہ تھا۔ دونوں بھائیوں میں جنگ ہوئی اور علی نے حلہ پر قبضہ کر لیا۔

مہلہل ایک لشکر کے ساتھ حلہ کی سمت روانہ ہوا۔ سخت جنگ کے بعد مہاہل کو شکست ہوئی۔ اس نے میدان سے فرار ہو کر بغداد میں آکر قرار لیا۔ خلیفہ مقتفی نے مہلہل کی زیادتی پر علی کے حق میں فیصلہ دیا لیکن جب رعایا کے ساتھ علی کے برے سلوک کی اطلاع ملی تو سلطان نے اس کو معزول کر دیا اور حلہ کو سالار کرد کی جاگیر میں دیدیا۔

سالار کرد حلہ پر جا کر قابض ہو گیا اور علی طف میں تفشکنجر کے پاس پہنچا۔ اس کی مدد سے علی نے سالار کو مار بھگایا اور وہ بغداد واپس ہو گیا۔

۵۴۴ھ میں بغداد کے بعض امراء نے سلطان مسعود کے خلاف بغاوت کی۔ تفشکنجر بھی ان میں شامل تھا۔ علی بن دبیس کو احسان کا بدلہ چکانا تھا وہ بھی ساتھ ہولیا۔ انہوں نے ملک شاہ بن سلطان محمود کی حکومت کا اعلان کر دیا مگر کسی جنگ کی نوبت نہیں آئی وہ لوگ منتشر ہوگئے اور علی بن دبیس نے سلطان مسعود سے جا کر صفائی کر لی۔

کچھ دنوں بعد علی بن دبیس ایسا بیمار ہوا کہ صحت یاب نہ ہو سکا اور چند ماہ صاحب فراش رہ کر انتقال کر گیا۔ مہینوں کے فصل سے سلطان مسعود بھی چل بسا اور سلجوقی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

سلطان ملک شاہ کہنے کو تخت نشین ضرور ہوا مگر اس کی حکومت چند روزہ اور برائے نام تھی۔

حلہ پر پہلے سالار کرد نے قبضہ کیا۔ بغداد کا شحنہ مسعود بلاک اس کے ساتھ تھا۔ وہ سالار کرد کو ختم کرا کے خود حلہ کا حکمران بن گیا۔ خلیفہ مقتفی نے عون الدین بن ہبیرہ کو بھیجا۔ اس نے مسعود بلاک کو تکریت کی طرف مار بھگایا .... اس دوران ملک شاہ اور خلیفہ مقتفی کے مابین لشکر آزمائی ہوتی رہی۔ آخر ذی قعد ۵۴۷ھ میں خلیفہ مقتفی بغداد واپس آگیا۔

۵۴۸ھ میں سلجوقی امراء نے ملک شاہ کو گرفتار کر کے معزول کر دیا اور محمد بن محمود کو تخت پر بٹھا دیا مگر خلیفہ نے اس کو منظور نہ کیا۔ محمد بن محمود نے ۵۵۲ھ میں بغداد کا محاصرہ کر لیا مگر ناکام واپس ہونا پڑا۔

۵۵۵ھ میں خلیفہ مقتفی نے رحلت کی اور مستنجد لامراللہ اس کا جانشین ہوا اس نے بغداد میں سلجوقیوں کا خطبہ بند کرا دیا۔

اب عباسی خلافت کسی حکمراں کی تابع نہیں تھی۔ بغداد اور اس کے تمام نواحی علاقے اس کے قبضہ و تصرف میں تھے بلکہ عراق کا بیشتر رقبہ حدود خلافت میں آتا تھا۔ خلیفہ مستنجد بامراللہ ماضی کے عباسی بادشاہوں کی طرح صاحب، طبل و علم بھی تھا اور ایک بڑے لشکر کا مالک بھی لہذا خلیفہ مستنجد نے سلجوقی تاجداروں کے بجائے احکام جاری کرنا شروع کر دیئے۔

خلیفہ مستنجد نے نظم حکومت سے فارغ ہوتے ہی پہلے خفاجہ کی سرزنش پر توجہ کی اور امیر ارغش اور امیر قیصر کو تعینات کیا جنہوں نے رحبہ تک ان کا تعاقب کیا۔ خفاجہ نے صلح کی پیش کش کی مگر امیر ارغش نے منظور نہ کیا۔ آخر قبیلہ خفاجہ نے دیگر قبائل سے مدد لی اور امیر ارغش کو رحبہ تک بھگا لے گئے۔ امیر قیصر مارا گیا اور ارغش سخت زخمی ہوا۔ بغدادی لشکر کا ایک بڑا حصہ کام آگیا۔

اس سے خلیفہ کو ان کی طاقت کا اندازہ ہو گیا اور اس نے اطاعت کی شرط پر مصالحت کر لی۔

ساحل فرات کے ساکن

دوسرا قبیلہ بنی اسد تھا جو سلجوقیوں کا تختہ مشق بھی بنا رہا پھر بھی اپنی شجاعت کا لوہا منواتا رہا۔ اس قبیلے میں حقیقتاً اسد ہی پیدا ہوتے تھے مگر اب وہ بے سردار کا رہ گیا تھا۔ حلہ کا پرچم سرنگوں ہو چکا تھا۔ وہ کسی ایک پرچم کے نیچے جمع نہ ہو سکتے۔ بقول ابن اثیر ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے سلجوقی فرمانروا سلطان محمد کے محاصرہ بغداد کے وقت سلطانی لشکر کی مدد کی تھی اور یوں بھی خلیفہ کی نظر میں وہ ہمیشہ سے فتنہ و فساد پھیلاتے رہے تھے۔

خلیفہ مستنجد نے تیرون بن قماج کو ان کی سرکوبی پر متعین کیا لیکن اب وہ دریا کے کنارے آباد نہ تھے بلکہ پہاڑی دروں میں جا بسے تھے اور پہاڑی سلسلے میں ان کی آبادیاں منتشر تھیں۔ اس لئے فوج بغداد انہیں نقصان پہنچانے کے بجائے خود کم ہوتی رہی۔ مستنجد نے ضد میں آکر ابن معروف سردار منفق کو بھیجا۔ اس نے ان کا محاصرہ کر لیا اور کافی دنوں تک کامیاب نہ ہونے پر تیرون بن قماج کو مزید فوج لیکر روانہ کیا اور ابن معروف کو لکھا کہ شیعیت کے باعث وہ بنی اسد کے ساتھ رعایت کرتا ہے۔

نوعیت واقعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ ابن معروف نے ایسا کیا ہوگا لیکن وہ تیرون بن قماج کے ساتھ ضرور تھا۔ بہرحال مورخین بتاتے ہیں کہ بغدادی لشکر نے "ان کے پانی لانے کے راستے بند کر دیئے اور نہایت بے رحمی سے انہیں پامال کرنے کو بڑھے۔ چار ہزار اسد مارے گئے باقی ماندہ کے لئے حلہ سے جلا

وطن ہو کر نکل جانے کی منادی کرا دی گئ چنانچہ وہ لوگ حلہ سے جلا وطن ہو کر اطراف میں پھیل گئے اور ان میں سے ایک متنفس بھی عراق میں نہ رہا۔ ان کے پہاڑی دروں اور ان کے مقبوضات پر تیرون اور ابن معروف قابض ہو گئے (۳۷)

بنی اسد کا یہ ظالمانہ استیصال تاریخ کا بڑا المیہ ہے۔ خطا ان کی یہ تھی کہ وہ اہل سیف اور بہادر تھے۔ بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی یہ کارروائی اگر دو دہائی قبل کی جاتی جب ان کا کوئی سردار بقید حیات تھا تو حکمراں طاقت کو معلوم ہو جاتا کہ سابقہ کسی شجاع قبیلے سے پڑا ہے مگر منتخب اس برے وقت کو کیا گیا جب وبیس کا ہر وارث مر چکا تھا اور کوئی اس قبیلے کو منظم کرنے والا باقی نہ تھا، پھر بھی وہ ٹولیوں میں بٹ کر اس طرح لڑے کہ لشکر خلافت کو کاٹ کر رکھ دیا۔

مستنجد نے تیرون بن قماج کو ہدایت کی تھی کہ پانی بند کر کے پورے قبیلے کو مجبور کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے دروں سے باہر نکل آئیں۔ بنی اسد کے لئے یہ عمل انجانا نہ تھا۔ ان کے اسلاف نے دیکھا تھا کہ مستنجد کے پیش رووں نے محرم ۶۱ ھ میں پیغمبر اسلام کے نواسے پر پانی بند کر دیا تھا اور بھوک اور پیاس سے کمزور کر کے ان کا مقابلہ کیا تھا۔ حکومت کا ٹڈی دل کھلے میدان میں چند نفوس سے لڑنے کی ہمت نہ کر سکا۔

ایسا ہی کچھ یہاں بھی کیا گیا۔ چونکہ قبیلے کی تنظیم ختم ہو چکی تھی۔ مختلف گروہ مختلف اوقات میں سروں سے کفن باندھ کر نکلے اور بے تکان حملوں میں لاشوں کے انبار لگا کر جام شہادت پی گئے۔ عزم وہمت، صدق ولماں، صبر و ایثار و وفا سب کو جوڑ لیں تو اپنی داستان بن جائے گی۔

کم سے کم چار ہزار بنی اسد قتل ہوئے۔ بغدادی لشکر کے مقتولین کی تعداد دس گنی سے کم نہ ہوگی جس کو مورخین نے تحریر نہیں کیا۔ بہر حال متعصب خلافت نے شیعوں سے یہ علاقہ صاف کرا لیا۔ وہ کہاں کہاں جا کر آباد ہوئے؟ اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا تاہم یہ بات مسلم ہے کہ ان کی اجتماعی طاقت ختم ہو گئی۔

سلجوقیوں کا مقصد بھی ایسا ہی تھا مگر وہ ان کو ناطاقت بنا کر رکھنا چاہتے تھے

جو بڑی سلطنت کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی گروہ اتنا مضبوط نہ ہونے پائے جو فرمانروا کے مدمقابل ہو سکے۔

خلیفہ مستنجد ان سے زائد سفاک نکلا۔ اس نے جڑ ہی سے اکھاڑ پھینکنے کا منصوبہ بنا لیا اور اس میں کامیابی حاصل کر لی۔

بچے کھچے عقیلیوں کی ایک تعداد بھی ان میں شامل تھی۔ خود اپنے قبیلے کی حیثیت سے تو ان کی طاقت پہلے ہی ختم ہو چکی تھی اور وہ جابجا منتشر ہو گئے تھے، کچھ لوگوں نے اس پناہ گاہ کو غنیمت سمجھا تھا۔ اب وہ بھی ترک وطن پر مجبور ہو گئے تھے

کہا جاتا ہے کہ کبھی بحرین میں عقیلیوں کی حکومت بھی تھی، پھر وہ عراق آگئے تھے۔ اس واقعے کے بعد ایک گروہ بحرین پہنچا اور ایک عرصے تک بحرین کے ایک علاقے پر حکمراں رہا۔

کہنے کو بنی اسد کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے محاصرہ بغداد میں سلطان محمد کی مدد کی تھی مگر اتنے سے قصور کی اتنی بڑی سزا خلاف عقل ہے۔ بات در حقیقت وہی تھی جو مستنجد نے ابن معروف کو لکھی تھی کہ وہ شیعیت کی وجہ سے بنی اسد کی موافقت کر رہا ہے اور اسی بنا پر مستنجد نے تیرون بن قماج کو بھیجا تھا۔ اگر ابن معروف اس کے بعد بھی کسی نرمی کا مظاہرہ کرتا تو اس کا حشر بنی اسد سے مختلف نہ ہوتا

ہماری نظر میں یہ دباؤ اس سفاکانہ اور ظالمانہ عمل میں شرکت کا جواز نہیں بن سکتا۔ ابن معروف کو معلوم تھا کہ اس مظلوم قبیلے کے خلاف لشکر کشی کیوں کی گئی ہے؟ اس کے بعد بھی وہ بیرحم خلیفہ کا آلہ کار بنتا رہا اور بے گناہوں کے خون میں تیرون کے ساتھ اپنے ہاتھ بھی رنگے .... حکومت کا لالچ انسان کو کتنا اندھا کر دیتا ہے اس عمل کے بعد ابن معروف کو شیعہ تو نہیں کہا جا سکتا!

بنی اسد کی جلا وطنی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ مختلف العقیدہ ہونے کے جرم میں انہیں اپنے وطن سے نکال دیا گیا اور ان کا اس قدر خون بہایا گیا کہ ایک مدت تک پہاڑی وادیوں کی زمین ان کے خون سے رنگین رہی .... قسی القلبی کی اس نظیر کو بڑے پیمانے پر دیکھا جائے تو اندلس میں عیسائیوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر جو کچھ بیتا، اس میں خود اپنے عمل کی داستان

پڑھی جا سکتی ہے اور اس کو پڑھ کر دوسروں کے ساتھ خود ہماری آنکھیں بھی نم ہو جاتی ہیں!

ظالم کسی عقیدے کا بھی ہو، ہماری نظر میں ظالم ہی ہے اور ہم اس کو قابل نفرت ہی قرار دیتے ہیں۔

مستنجد اور سلاجقہ کا موازنہ کیا جائے تو سلاجقہ کی پالیسی کلیتاً شیعہ کش نہیں تھی۔ طغرل بیگ ایک متعصب سنی ضرور تھا۔ اس کے طور طریقے میں شیعوں سے نفرت کا انداز جھلکتا ہے پھر بھی وہ مستنجد لا مرللہ کا سا ذہن تو نہ رکھتا۔ اس کے عہد میں معتبر شیعہ بعض عہدوں پر موجود تھے البتہ اس نے اپنی حدود مملکت میں اہل سنت کی بالادستی کو مسلم کر دیا تھا حتیٰ کہ صبح کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم شامل کر دیا تھا۔

الپ ارسلان اور ملک شاہ بھی اسی قسم کے حکمراں گزرے۔ ان کے رفاہی کام عالم آشکار ہیں پھر تقریباً شیعوں کے لئے یہی پالیسی عام رہی مگر جہاں کہیں کسی نے طاقت پکڑی، اس کو اسی جگہ کسی نہ کسی بہانے کچل دیا گیا جیسا کہ بنی وبیس کے ساتھ پیش آیا۔

اب سلجوقی سلطنت کے خاکستر پر موصل کے اتابکوں کا ایوان کھڑا ہو رہا تھا تو زمانہ شیعوں کے لئے مقابلتاً برا آ رہا تھا لیکن اب ان میں رہ ہی کیا گیا تھا جس پر وہ سر اٹھاتے یا ان سے کسی کو کوئی خطرہ پیش آ سکتا۔ باصلاحیت افراد جا بجا ضرور پائے جاتے جو اپنے دماغی اور فنی امتیاز کے سبب نظر انداز نہ ہو سکتے مگر شیعوں کی کوئی جماعتی حیثیت نہ رہ گئی تھی۔ وہ بن امیہ اور بنی عباس کے ابتدائی ادوار کی طرح منظر عام سے بالکل ناپید تو نہ تھے، کہیں کہیں کونوں کھدروں میں موجود تھے اور اپنے کو محفوظ رکھنے کے لئے کھل کر سامنے نہ آتے۔

مسلم علاقوں پر عیسائی یلغار تو بنی امیہ کے عہد سے شروع ہو گئی تھی۔ بنی عباس کے زمانے میں بھی جاری رہی مگر جب کبھی اس نے شدت اختیار کی تو کبھی سیف الدولہ حمدانی نے جواب دیا، کبھی لبنان کے بنی عمار نے اور کبھی بے بسی میں مسلمان پس کر رہ گئے۔ سلجوقیوں سے بھی عیسائیوں کے معرکے ہوتے رہے مگر

اس حکومت کے کمزور پڑتے ہی پھر عیسائیوں نے سر اٹھایا تو موصل سے عماد الدین زنگی انگڑائی لے کر اٹھا تھا۔ اس میں شیعوں کا کوئی نمایاں حصہ نظر نہیں آتا مگر وہ نمایاں تھے بھی نہیں تو قابل ذکر کیونکر ٹھہرتے۔

سلجوقی دور میں عماد الدین زنگی کے کارنامے تاریخ میں محفوظ ہیں۔ وہ ملک شاہ کا بچپن کا ساتھی اور ایک شجاع ترین مسلمان تھا۔ شام کے بعض علاقوں کا حاکم رہا پھر موصل کا عامل بنا دیا گیا۔ ۵۲۱ھ میں سلطان سنجر نے اس کو بغداد کی شحنگی پر مامور کیا تھا اور وبیس مزیدی کو اس کا معاون بنایا تھا۔

اب سلجوقی سلطنت حصوں بخروں میں بٹ چکی تھی۔ عماد الدین زنگی نے اس میں سے بھی اپنا حصہ لیا اور مملکت کو بڑھاتا رہا۔ مسترشد کے عہد خلافت تک وہ تقریباً پورے کردستان کو صاف کر چکا تھا............ اور صرف عماد الدین زنگی ہی نہیں اتسز بن محمد بھی خوارزم میں اپنی حکومت قائم کر چکا تھا جس کا لقب خوارزم شاہ تھا۔

آٹھ دس سال میں عماد الدین کی حکومت شام تک پھیل گئی۔ مسلم علاقوں کو ہتھیانے کے ساتھ ساتھ وہ عیسائیوں کی سرکوبی بھی کرتا رہا۔

بویہی دور کے چھوٹے حکمرانوں میں ایک خاندان بنی مروان کا تھا۔ ان کا ایک قلعہ زنگی حکومت کے وسط میں پڑتا تھا۔ ۵۴۱ھ میں عماد الدین نے اس کا محاصرہ کیا مگر دوران محاصرہ اسکے کسی غلام نے اسکو قتل کر دیا۔

زنگی امیر کے کئی بیٹے تھے جن میں سے سیف الدین غازی موصل میں تخت نشین ہوا اور نور الدین نے حلب میں اپنی علیحدہ حکومت قائم کر لی مگر دونوں میں اتحاد رہا۔ ۵۴۴ھ میں سیف الدین زنگی کی حکومت کافی مضبوط ہو چکی تھی، وہ اہل صلیب سے بہت سی لڑائیاں لڑ چکا تھا اور اس کی حکومت کافی وسیع ہو گئی تھی۔

فاطمین مصر خلافت عباسیہ کے آخر دور میں روبہ زوال تھے اور مصر میں نور الدین زنگی کی مداخلت شروع ہو چکی تھی۔ آخر اس کے سپہ سالار شیر کوہ نے مصر پر حملہ کر دیا اور نظم حکومت میں دخیل ہو گیا........ صلاح الدین نجم الدین ایوب نے شیر کوہ کی جگہ لی اور نور الدین کے انتقال پر شام و مصر کا فرماں روا ہو گیا

شیعہ مراقش و مصر میں

تارکانِ وطن

محبانِ علیؑ کے مدینے سے ترکِ وطن کا سلسلہ کب شروع ہوا؟ اس کے لئے مخصوص وقت کا تعین نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے اسباب و عوامل میں شروع ہی سے امامؑ اول کے اس اعلان کا دخل پایا جاتا ہے کہ وہ اقتدار کے لئے مسلمانوں پر تلوار نہیں اٹھائیں گے۔ اس کے بعد اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ اس کے بعد آپ کے جانشینوں نے جب تحفظ اسلام کی خاطر رزمگاہ میں قدم جمایا تو ان کے حریف مسلمان نہ تھے۔ اس کی صراحت مزید کے لئے اتنا کہا جا سکتا ہے کہ علیؑ اور حسینؑ سے لڑنے والوں کا صحیح اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔

حضرت سلمانؓ فارسی، حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت عمار یاسرؓ کا ابتدائی ترکِ وطن اگرچہ مقصدی تھا مگر اس میں حضرت علیؑ کی روشِ امامت کی کارفرمائی ضرور تھی چنانچہ عمار یاسر نے عراق و شام میں، حضرت ابوذر غفاری نے مضافات دمشق میں اور جناب سلمان فارسی نے مدائن میں حقوق آلِ محمد کے لئے نعرے بلند کئے اور حضرت سلمان مدائن ہی میں خالق حقیقی سے جا ملے۔

حضرت ابوذر کو بھی شام کی سرزمین کا پیوند بنا دیا جاتا مگر شاید حاکم شام کو ڈر تھا کہ ابوذر کی قبر سے مرنے کے بعد بھی صداقت کی کرنیں پھوٹتی رہیں گی اس لئے اس نے پابہ زنجیر کر کے مدینے واپس بھیج دیا تاکہ خلیفہ سوم ان کو کسی ویرانے میں دفن کرا دیں جہاں کوئی جیتے جی یا پس شہادت ان کی آواز سننے والا نہ ہو۔

ترکِ وطن کا سلسلہ ظلم و تشدد کے ارتقاء کے ساتھ بڑھتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ وقت آ گیا کہ علی کا نام لینا حکومت وقت سے بغاوت قرار دیا جاتا رہا۔

کس زمانے میں کتنے لوگوں نے اباء و اجداد کی سرزمین کو خیرباد کہا اور کس کس دور میں کون کون جلا وطن کیا گیا، صدیوں تک پھیلی ہوئی بساط وقت پر اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا لیکن موٹے موٹے نام تاریخ نے اپنے دامن میں محفوظ کر لئے ہیں جن میں ایک جلی نام "ادریس بن عبداللہ بن حسن مثنیٰ" ہے جنہوں نے مراقش میں پہلی شیعہ حکومت قائم کی۔

مراقش

طلوع اسلام کے وقت مصر میں عیسائیت کا غلبہ تھا اور جا بجا یہودیت بھی پائی جاتی تھی۔ مراقش میں اور بالخصوص بربروں میں آتش پرستی کو عروج تھا۔ حضرت عمر کے عہد میں جب مصر فتح ہوا اور عمرو عاص نے مراقش کے بعض حصے زیرنگیں کر لئے تو وہاں کے لوگ اسلام سے آشنا ہوئے............ اس اسلام شناسی کے تصور میں شمشیر آبدار کی چمک بھی شامل تھی۔

پھر درس و تدریس کے تسلسل سے حضرت علیؑ کا نام ملحق ہوا اور مصر کے ساتھ مراقش نے بھی آلِ رسول کا نام سنا۔ چار سال کا مختصر دور ہوتا ہی کتنا ہے تاہم بعض حلقے اس حقیقت سے ناآشنا نہ رہے کہ اسلام تسخیر ممالک کا نام نہیں بلکہ اسلام نام ہے خدا شناسی کا اور خود شناسی کا جو آداب و تہذیب انسانیت کا ایک ابدی دستور ہے۔

لیکن اس تاثر کو دیرپائی میسر نہ آ سکی۔ عبداللہ بن ابی سرح، معاویہ بن خدیج، عقبہ بن نافع اور ان کے نائبین نے سابقہ نظریات کو بحال کر دیا۔ جو سر تلواروں کی دھاروں سے قلم نہ ہو سکے، وہ خم تو ہو گئے مگر دل مسخر نہ ہو سکے، عقبہ کی فوجیں بربر قبائل کو کاٹتی چھانٹتی ہوئی مراقش کے سنگلاخ علاقوں میں بھی گھستی چلی گئیں اور لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرتی رہیں مگر انہیں مسلمان کے بجائے خارجی بناتی رہیں اور پھر یہ سلسلہ جاری ہی رہا۔

یہ کہنا یقیناً صحیح نہ ہوگا کہ قبولیت اسلام میں سب بہکے ہوئے لوگ تھے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بربر قبائل کی اکثریت میں خارجی نظریات ہی پھیلے اور

پھیلائے گئے تھے ۔ سخت اور بیہڑ علاقوں کے درشت خو اور تند مزاج لوگوں کو اسلام کے جو معنی بتائے گئے، اسی کو انہوں نے سمجھا اور وہی ان کا مسلک لسانی قرار پایا جس میں اہل بیت کی دشمنی بھی شامل تھی .... عہد عباسیہ میں یہ نظریات بدلتے رہے اور ان میں کہیں کہیں آل رسول کے لئے جگہ بنتی رہی ۔

۱۶۹ھ میں جب بمقام فخ عباسیوں کے ہاتھوں اولاد حسنؑ کا قتل عام شروع ہوا تو ادریس بن عبداللہ کو ان کا غلام راشد بچا کر نکال لے گیا.......... بنی امیہ کے سفاکانہ عہد اور بنی عباس کے خون آشام دور میں تقیہ شیعوں کے بچنے کا واحد راستہ تھا اور اسی کا سہارا لے کر محبان علیؑ حکومت میں پائے جاتے تھے چنانچہ شہزادہ ادریس بھی ایک افسر محصولات کی مدد سے طنجہ کے قریب شہر ولیلیٰ پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جس کو مشیت الہیٰ کے سوا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

افسر محصولات کو اس خفیہ مدد کا خمیازہ جان دے کر بھگتنا پڑا جو علی کے دوستوں کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔

اس طویل سفر میں دو سال سے زائد صرف ہوئے اور اس کو بھی حسن اتفاق ہی کہنا چاہیئے کہ جس علاقے میں ادریس الاکبر نے پناہ لی وہاں نصرانیوں، یہودیوں اور مجوسیوں کی اکثریت تھی اور وہاں کا حکمراں اسحٰق بن محمد بھی آل رسول سے ناواقف نہ تھا۔ کچھ دنوں بعد جب اس کو ادریس کے آنے کا حال معلوم ہوا تو وہ عزت واحترام سے پیش آیا اور پھر ادریس نے روح اسلام کو ان پر منکشف کیا تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔

دیکھتے ہی دیکھتے ادریس الاکبر کے قبول عام کا یہ عالم ہو گیا کہ لوگ پروانہ وار فدا ہونے پر تیار ہو گئے ۔

خوش عقیدہ اسحٰق بن محمد نے ہارون رشید کے بجائے ادریس الاکبر کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا اور ادریس نے دین کی حقانیت اور بنی ہاشم کی فصاحت کے سہارے غیر مسلموں کو مسلمان بنانا شروع کر دیا پھر کچھ وقفے سے ۱۷۴ھ میں تلمسان فتح کر لیا اور اس حکومت کا سنگ بنیاد رکھ دیا جو ایک صدی سے زائد تک مغرب اقصیٰ میں علوم اہل بیت کی روشنی پھیلاتی رہی ۔

بغداد مراقش کی اس نئی حکومت سے بے خبر نہ تھا مگر لشکر کشی میں کامیابی کے امکانات نظر نہیں آرہے تھے کیونکہ ادریس الاکبر کا دائرٔ فتوحات بڑھتا چلا جا رہا تھا اس لئے ہارون رشید نے اپنے معتبر غلام سلیمان شماخ کو متعین کیا کہ افریقہ پہنچ کر ادریس کے معتقدین میں شامل ہو جائے اور انہیں راستے سے ہٹا دے ۔

سلیمان نے موقع پا کر ادریس کو زہر آلود منجن استعمال کروایا جس سے ان کی موت واقع ہو گئی ۔

ادریس نے اپنے بعد کوئی اولاد نہ چھوڑی تھی ۔ صرف ایک کنیز حاملہ تھی لیکن باوفا غلام راشد حکومت کا نگراں رہا اور کنیز کے بطن سے جو بچہ پیدا ہوا اس کو تاج و تخت کا وارث قرار دیا گیا۔

اس کو ادریس الاکبر کی تعلیمات کا اثر ہی کہنا چاہیئے کہ نوزائیدہ بچے کی بادشاہت پر اکثر ارباب حکومت متفق رہے۔ ۱۸۸ھ ہجری میں اس کی تخت نشینی عمل میں لائی گئی جبکہ اس کی عمر گیارہ سال تھی ۔

راشد دو سال قبل ، افریقہ کے عباسی حاکم ابراہیم بن اغلب کی سازش سے قتل ہو چکا تھا ۔ ابو خالد یزید بن الیاس العبدی اس کی جگہ سربراہ مملکت تھا، نئے بادشاہ کی فتوحات میں اس کے تدبر کو بڑا دخل ہے ۔

مراقش کی بلکہ دنیا کی پہلی شیعہ حکومت ادریس الاکبر کی زندگی میں اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ ان کے بعد ادریس اصغر کے بالغ ہونے تک کوئی اس پر ضرب نہ لگا سکا۔

ادریس الاصغر نے شروع ہی سے اندرونی استحکام اور بیرونی توسیع پر توجہ دی ۔ دوسرے مقامات پر بسنے والے عربوں کو مراقش میں آباد کیا اور تمام ملحقہ علاقوں کو مسخر کر کے پورے مغرب اقصیٰ پر اپنا پرچم لہرا دیا ۔ افریقہ کے بنی اغلب اور بغداد کی عباسی خلافت نے ہر حربہ استعمال کر ڈالا مگر ادریسیوں نے حکومت کا اتنا مضبوط ڈھانچہ بنایا تھا کہ اس پر کوئی اثر نہ پڑا بلکہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوتی رہی ۔

۱۹۲ھ میں ادریس نے شہر فاس کی بنیاد ڈالی اور تلمسان سے اپنا

دار لحکومت فاس میں منتقل کر دیا۔ اسی زمانے میں اس نے خارجیت کا استیصال کیا اور بربروں کی ایک بڑی تعداد کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ اس کی حکومت شروع ہی سے خود مختار رہی تھی۔ اب اس نے اپنی سلطنت کا علیحدہ سکہ بھی ضرب کرایا اور بے شمار دنیاوی اور دینی کام کر کے ۳۷ سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔

محمد بن ادریس ۲۱۳ھ میں باپ کے مرنے پر تخت نشین ہوا اس نے اپنی سلطنت کو نو حصوں میں تقسیم کر دیا چند بھائیوں اور بھتیجوں کو حکمراں بنایا، خود فاس کے مرکز کو اپنے ہاتھ میں رکھا۔

کہنے کو مغرب اقصیٰ کی یہ سلطنت نو حصوں میں بٹی ہوئی تھی لیکن اتنی مضبوط شیرازہ بندی تھی کہ سب اپنے کو فاس کا ماتحت سمجھتے اسی لئے پورے ملک میں ہر طرف عدل وانصاف کا دور دورہ تھا، رعایا خوش حال اور راستے بے خطر تھے محمد نے رفاہ عام کے بہت سے کام کئے اور بڑے رعب و دبدبہ سے حکومت کر کے ۲۲۱ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

علی بن محمد نو سال کی عمر میں باپ کا جانشین ہوا چند ہی سال میں اس نے وفادار امراء کی مدد سے اپنے کو ایک لائق حکمراں ثابت کر دیا اور ہر طرح محمد کی روایات کو برقرار رکھا۔ ۱۴ سال کی فرمانروائی میں اس نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ۲۳۴ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

یحییٰ بن محمد نے تخت نشین ہوتے ہی اصلاحات پر توجہ کی۔ فاس کی آبادی اور رونق اسکے عہد میں روز افزوں رہی، خوش حالی اور امن وامان کے سبب لوگ دوسرے مقامات سے آکر فاس میں آباد ہوئے۔ مسجد قرویین کی تعمیر اس کا کارنامہ ہے۔ ۲۵۰ھ میں اسکی وفات ہو گئی۔

یحییٰ بن یحییٰ کے ظلم و تعدی اور عیاشی سے بنی ادریس کی عظیم سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ اکابر حکومت نے تنگ آکر اس کو دالامارہ سے نکال دیا۔ اس نے بھاگ کر عدۃ الاندلس میں پناہ لی اور اس صدمے سے اسی رات مر گیا۔ عامل ریف علی بن عبداللہ اس کی بیوی کا باپ اور خاندان ادریس کے موقر افراد میں تھا۔ یحییٰ کے بجائے اس کو بادشاہ بنایا گیا مگر تھوڑے ہی دنوں بعد اس نے عبدالرزاق

خارجی سے شکست کھائی اور امرائے اس کے بجائے یحییٰ بن قاسم کو بادشاہ بنالیا۔

یحییٰ بن قاسم ایک بہادر حکمراں تھا اس نے عبدالرزاق کو شکست دے کر اپنا علاقہ واپس لے لیا اور دور دور تک ان کا نام و نشان مٹا دیا لیکن وہ جلد ہی محلاتی سازش کا شکار ہو گیا۔ ۲۹۲ھ میں ربیع بن سلیمان نے اس کو قتل کر دیا۔

"یحییٰ بن ادریس بن عمر، یحییٰ بن قاسم کے بعد فاس کا بادشاہ بنایا گیا۔ اس نے عدل، علم، فضل اور حکومت میں وہ مرتبہ پایا کہ اس سے قبل اور بعد اس کے گھرانے میں کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ عالم، فقیہہ، حافظ حدیث، خوش بیان، دین دار اور پرہیزگار شخص تھا۔ اقصائے مغرب پر کمال شان و شوکت سے حکومت کرتا رہا۔" (۳۸)

یہ وہ دور تھا جب فاطمئین مصر کی سلطنت مراقش تک پھیل رہی تھی۔ ان کے سپہ سالار مصالہ نے فاس پر چڑھائی کر دی۔ یحییٰ ہزیمت یاب ہوا۔ اس نے فاطمیوں کی اطاعت کر لی اور فاس کا محدود علاقہ اس کے قبضہ میں رہ گیا مگر جلد ہی وہ بیدخل کر کے امیلا کی طرف جلا وطن کر دیا گیا جہاں وہ کسمپرسی کی موت مر گیا اور اس کے ساتھ ہی بنی ادریس کا خاتمہ ہو گیا۔

بنی ادریس بلاد ریف و غمارہ جا کر پناہ گزیں ہوئے جہاں انہوں نے اپنی چھوٹی سی حکومت قائم کر لی۔ انہیں میں سے بنی حمود بھی تھے جنہوں نے ۴۰۳ھ میں بنی امیہ کے بعد اپنی حکومت قائم کی تھی مگر ان کے شیعہ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ شاید انہوں نے اندلس کے ماحول میں مسلکِ شیعیت کا اعلان نہ کیا ہو۔

سلطنت ادریسیہ کے تیسرے حکمراں نے اپنی سلطنت کے نو حصوں میں تمام عزیز و اقارب کو حکمراں بنایا تھا جو نسلاً بعد نسل فاس کے مرکز سے متوسل رہ کر حکومت کرتے آئے تھے۔ اس طرح ایک خاندان بہت سے حصوں میں بٹ کر سارے ملک میں پھیل گیا تھا۔ انتزاع سلطنت ہونے پر مختلف لوگوں کی چھوٹی چھوٹی طاقتیں ابھرتی رہیں۔ ۳۱۳ھ میں حسن بن محمد بن قاسم بن ادریس (حجام) نے فاس پر قبضہ کر لیا مگر ۳۱۵ھ میں فاطمیوں کے ہاتھوں شکست کھا کر قتل ہو گیا۔

بنی ادریس کچھ تو ریف کی طرف چلے گئے اور کچھ پہاڑوں میں جا چھپے تھے۔

۳۱۳ھ میں ابراہیم بن محمد کی سرکردگی میں قلعہ حجر النسر تعمیر کیا اور فاس اور اس کے ملحق مقامات کو فتح کیا۔

۳۳۷ھ میں اس کا انتقال ہونے پر قاسم بن محمد (کانون) اس کا جانشین ہوا جو ۳۶۳ھ میں فوت ہوا۔ اس کا بیٹا حسن ۳۷۵ھ تک اس برائے نام حکومت کا والی ہوا پھر امویوں کے ہاتھوں مارا گیا اور یہ علاقہ سلطنت اندلس میں شامل ہو گیا۔ یہ چھوٹی سی حکومت سلطنت ادریسیہ کی عظیم سلطنت کے باقیات الصالحات میں تھی جو حقیقتاً چوتھی صدی ہجری کی دوسری دہائی میں ختم ہو چکی تھی۔" ۳۱۹ھ میں عبدالرحمن الناصر نے افریقہ پر چڑھائی کر کے مراقش کا بڑا حصہ فتح کر لیا تھا اور ادریسی شہزادوں کو قرطبہ لے آیا تھا اور عملی طور پر مغربی مراقش ہسپانوی خلیفہ کے قبضے میں اور مشرقی مراقش مصر کے فاطمی خلیفہ کے زیر تسلط آ گیا۔" (۳۹)

سلطنت ادریسیہ کے عروج و زوال کے مابین ڈیڑھ سو برس کا دورانیہ ہے اس مدت میں انہوں نے کتنی ہی معاشی، تمدنی اور رفاہی اصلاحات کیں۔ ادریسیوں کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ نیم وحشی انسانوں کو انسان بنایا۔ وہاں کے رہنے والوں نے اسلام کا نام تو سنا تھا مگر وہ اسلام ماضی کے فاتحین کا مسخ شدہ تھا، بنی ادریس نے مراقش سے دور دراز علاقوں تک صحیح اسلام کی تصویریں پیش کیں اور خانوادہ رسالت کا ایسا تعارف کرایا کہ آج تک سجلماسہ اور دوسری صحرائی بستیوں میں آل رسول موجب برکت تصور کی جاتی ہے۔

یہ سلطنت کب کی ختم ہو چکی ہے مگر اس کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں .... اس کو بنی ادریس کا کارنامہ ہی کہنا چاہئے کہ ظہور مہدی کا تصور بربروں کے ذہن میں اتنا پختہ ہو گیا تھا کہ اس کے بعد مہدیت کے بیشتر دعویدار اسی سرزمین میں پیدا ہوئے۔

افریقہ پر ایک نظر

عرب و عراق کی طرح مصر و مراقش بھی شروع ہی سے مسلمانوں کی باہم نبرد آزمائی سے دوچار رہے۔ سلطنت عباسیہ کے عروج میں افریقہ کا گورنر ابراہیم بن اغلب تھا جس کو ہارون رشید کی طرف سے ایک باجگزار بادشاہ کے سے

اختیارات حاصل تھے کیونکہ اس خاندان نے بنی امیہ کے خلاف ابو مسلم خراسانی کا ساتھ دیا تھا۔ اغلب بن سالم یقیناً ابو مسلم کی طرح محب اہل بیت تھا لیکن اس کی اولاد دوسروں کی طرح وقت کے دھارے پر چل پڑی تاہم وہ مذہبی معتقدات میں اتنے کٹر نہ تھے کہ مصر کے ابن طولون کی طرح اولاد فاطمہ کے خون سے محلوں کے در و دیوار کو رنگین بنا دیتے اور زندانوں کو شیعیان علی کی لاشوں سے پاٹ دیتے پھر بھی اول و آخر وہ عباسی ہی تھے۔

شمالی افریقہ کو جغرافیائی حیثیت سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:
مصر و مراقش، مراقش کے تین حصے تھے۔ مصر سے ملحق طرابلس اور تیونس کا علاقہ جس کا پایہ تخت قیروان تھا، درمیان میں الجزائر جس کا مرکزی مقام تلمسان تھا، بالکل مغربی حصے کا دارالحکومت سجلماسہ تھا۔

انہیں تین حصوں میں اوقات مختلفہ میں حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ حتیٰ کہ تیسری صدی کے آخری عشرے میں سلطنت فاطمیین کی داغ بیل پڑ گئی۔

فاطمی تحریک

محمد بن اسمٰعیل کی تحریک امامت کا آغاز امام جعفر صادقؑ کی وفات کے بعد سے ہوتا ہے اور وہ جماعت اس کی داعی ہے جس نے امام موسیٰ کاظمؑ کی امامت کو تسلیم نہیں کیا اور اسمٰعیل کے بیٹے محمد کو اپنا امام بنایا ۔ یہ تحریک کیونکر شروع ہوئی ؟ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا لیکن تاریخ اس کی شاہد ضرور ہے کہ خلافت عباسیہ سے محمد کا کچھ تعلق ضرور تھا اور جب دربار بغداد سے محمد کی طلبی ہوئی اور وہ مدینے سے جانے لگے تو امام موسیٰ کاظمؑ نے ان کو نصیحت کی تھی کہ وہ اپنی زبان کو خاندان کے خلاف استعمال نہ کریں ۔ ہارون رشید سے محمد کی کیا گفتگو ہوئی اور طلبی کی غرض کیا تھی ؟ اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن اس کے بعد عملاً امامت کی یہ تحریک جڑ پکڑنے لگی لیکن خفیہ خفیہ اور بہت احتیاط کے ساتھ لہذا انہیں امام مکتوم یا امام مستور کہا جاتا تھا ۔ حتیٰ کہ یہ امامت محمد بن احمد تک پہنچی جنہیں اپنی ہر دل عزیزی کے سبب حبیب کہہ کر پکارا جاتا تھا .... تحریک کے راز میں رکھنے کا سبب اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کہ اسے عوام یا حکومت کی طرف سے خطرہ تھا ۔ حبیب حمص کے قریب سلمیہ میں رہتے تھے ۔ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہیں اتنے وسائل میسر آگئے کہ وہ چہار جانب اپنے داعی بھیجنے لگے ۔ یمن ، یمامہ ، بحرین ، سندھ ، مصر اور مراقش کوئی خطہ ایسا نہ تھا جہاں اسمٰعیلی داعی نہ پہنچے ہوں ۔ انہیں میں ایک ابو عبداللہ الحسین بن محمد بن زکریا المعروف بہ ابو عبداللہ الشیعی بھی تھا ۔ دو داعی حلوانی اور سفیانی مراقش بھیجے تھے جنہوں نے الجزائر میں قبائل کتامہ کو اسمٰعیلی بنایا ۔

یمن میں ابو القاسم حسین بن فرخ بن حوشب نے ایک جمعیت فراہم کر کے ۲۷۰ھ میں بعض علاقے مسخر کر لئے تھے اور صنعا پر قابض ہو گیا تھا اس تحریک میں بھی نعرہ حقوق آل محمد کا لگایا جاتا مگر تان محمد الحبیب پر جا کر ٹوٹتی تھی ۔

اس اثناء میں حلوانی اور سفیانی مراقش میں انتقال کر گئے اور ان کی جگہ

ابو عبداللہ الشیعی کو بھیجا گیا جو ۱۵ ربیع الاول ۲۸۸ھ کو کتامہ کے شہر انکجان پہنچے ، امامت اہل بیت کا اعلان کر دیا اور کئی علاقے فتح کر لئے ۔ ابراہیم بن احمد اغلبی کی طرف سے سدباب کے لئے ایک فوج بھیجی گئی جس نے ۲۸۹ھ میں بمقام مالوت انہیں شکست دی لیکن جلد ہی اس نے مسیلہ کے معرکے میں اغلبیوں کو مار بھگایا ۔ ابراہیم نے تیسری بار ایک تازہ دم لشکر مقابلے پر بھیجا مگر اس نے بھی شکست کھائی الشیعی نے اس کے بعد اردگرد کے تمام شہروں پر قبضہ کر لیا اور اعلان کرا دیا کہ ظہور مہدی کا وقت آگیا ہے ۔

اس دوران محمد الحبیب کا انتقال ہو چکا تھا اور عبیداللہ ان کے جانشین ہو چکے تھے ۔ الشیعی کی طرف سے انہیں ان حالات کی اطلاع ملی تو وہ اپنے بیٹے ابو القاسم محمد نزار اور دوسرے لوگوں کے ساتھ روانہ ہو گئے .... الشیعی کا بھائی ابو العباس سوداگروں کے بھیس میں آگے آگے تھا وہ ابراہیم کے قائمقام زیادۃ اللہ کے ہاتھوں قیروان میں گرفتار ہو گیا ، عبیداللہ دوسرے راستے سے سجلماسہ پہنچے تو وہاں کے حاکم الیسع نے ان کو پکڑ لیا ۔

الشیعی سطیف پر قبضہ کر چکے تھے پھر انہوں نے زیادۃ اللہ کی چالیس ہزار فوج کو شکست دی اور علاقوں پر علاقے فتح کرتے چلے گئے پھر زیادۃ اللہ کو مکمل شکست دے کر رقادہ پر قبضہ کر لیا ، ابو العباس کو قید سے چھڑایا اور سجلماسہ پر حملہ آور ہو گئے ۔ الیسع شکست یاب ہو کر مارا گیا اور عبیداللہ مع محمد نزار کے آزاد کرا لئے گئے ..... الشیعی ربیع الآخر ۲۹۷ھ میں رقادہ واپس ہوئے تو انہوں نے رقادہ اور قیروان میں عبیداللہ کی بیعت لی ۔ اس طرح بنی اغلب بنی رستم اور بنی مدرار کی حکومتیں ختم ہو کر ان کی جگہ عبیداللہ المہدی کی سلطنت قائم ہو گئی جو بحر ظلمات سے صحرائے شام تک اور بحیرہ روم سے افریقہ کے صحرائے اعظم تک پھیل گئی ۔

شروع شروع میں قیروان کے قریب مہدیہ اس سلطنت کا دار الحکومت قرار پایا ۔ ۳۵۸ھ میں جب مصر فتح ہوا تو قاہرہ آباد کیا گیا اور مرکز سلطنت وہاں منتقل ہو گیا ۔

خلفائے فاطمئین

عبیداللہ المہدی باللہ

عبیداللہ المہدی باللہ نے تخت پر بیٹھتے ہی بنی کتامہ کو بڑے بڑے عہدے دئے اور جاگیریں عطا کیں پھر جابجا داعی روانہ کئے۔ طرابلس اور صقلیہ میں اپنے گورنر مقرر کئے۔ وقت کے فصل سے مسلمانان صقلیہ نے ۳۱۳ھ تک کلیبریہ یعنی جنوبی اطالیہ میں کئی شہر ٹورنٹو، اوٹرنٹو وغیرہ فتح کر لئے اور لومبرڈی پر حملہ کر کے خیران اور ایرجہ کو فتح کر لیا پھر برابران علاقوں کے قبضہ کے لئے لڑتے رہے۔

الشیعی کا بھائی ابوالعباس مہدی کو شاہ شطرنج کی طرح رکھنا چاہتا تھا اس نے اپنے اختیارات میں کمی پا کر بعض سرداران کتامہ سے سازش کی اور بدقت تمام اپنے بھائی ابوعبداللہ کو ملا کر مہدی کے قتل کے درپے ہو گیا مگر راز کھل گیا اور مہدی نے دونوں بھائیوں کو قتل کرا دیا اس کے بعد مشرق میں برقہ اور مغرب میں تاہرت بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لئے۔ ۳۰۱ھ اور ۳۰۷ھ میں قایم بن مہدی نے مصر پر حملہ کر کے سکندریہ اور مصر کے بعض علاقہ فتح کئے مگر مقتدر عباسی نے مونس خادم کی فوج بھیج کر اپنے علاقوں کو آزاد کرا لیا۔ ۳۰۳ھ سے ۳۰۶ھ تک مہدی باللہ نے خارجیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے قیروان کے قریب ایک مضبوط شہر اور مستحکم قلعہ تعمیر کرایا اس کا نام مہدیہ رکھ کر دارالحکومت قرار دیا۔

۳۰۵ھ میں فاس کے ادریسی بادشاہ کو مطیع کیا اور ۳۰۹ھ میں اسکے ملک کا الحاق کر لیا پھر حاکم سجلماسہ کی بغاوت کو فرو کیا۔ ۳۱۵ھ میں مغرب کے علاقہ میں بنی فاطمہ کی حکومت کمزور پڑی تو ابوالقاسم محمد نے چڑھائی کر کے مختلف سرکش قبیلوں کو مغلوب کیا اور ریف پر حملہ کر کے لکور فتح کر لیا پھر جرادہ کے حاکم حسن بن ابی العیش ادریسی کو مطیع کیا۔

عبیداللہ کے عہد کا آخری واقعہ یہ ہے کہ فاس و مغرب کا صوبہ دار اندلس کے بنی امیہ سے مل گیا تھا۔ اس نے فاطمیوں کا نام خطبہ سے نکال کر بنی امیہ کا نام داخل کر دیا تھا۔ مہدی نے اپنے سپہ سالار احمد بن بصلین کو اس کی سرکوبی کو روانہ کیا جس نے باغی گورنر کو شکست دے کر صحرا کی طرف بھگا دیا اور تمام مغرب الاقصےٰ کو مسخر کر کے فاطمی سلطنت میں شامل کر دیا۔ اس کے بعد مہدی اندلس فتح کرنے کی تدبیر میں تھے کہ ملک الموت نے تمام آرزوں کا خاتمہ کر دیا۔

مہدی نے اپنی سلطنت اپنی حیات ہی میں سرحد مصر سے بحر ظلمات اور جزائر خالدات (کریز) تک اور بحیرہ روم سے صحرائے اعظم افریقہ تک پھیلا لی تھی یہ حکومت زبردست اور فعال تھی۔ سیوطی جیسا کٹر سنی معترف ہے کہ عبیداللہ نے دادگستری اور فیاضی کے ساتھ سلطنت کی۔ لوگ ان کی طرف جھکے ہوئے تھے۔

محمد القائم بامر اللہ

محمد القائم بامر اللہ بڑے جنگ آزمودہ اور ماہر سپاہی تھے۔ اکثر جنگوں میں خود فوج لے کر جایا کرتے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ سید امیر علی لکھتے ہیں کہ یہ پہلا فاطمی خلیفہ ہے جس نے بحیرہ روم پر حکومت و اقتدار حاصل کرنے کی غرض سے جہازوں کا ایک زبردست بیڑہ تیار کیا۔ ۳۲۲ھ میں ایک شخص ابن طالوت نامی نے مہدی کا بیٹا ہونے کا دعویٰ کر کے طرابلس کا محاصرہ کر لیا مگر اس کا جھوٹ کھل جانے پر اسی کے آدمیوں نے اس کا سر کاٹ کر قائم کے پاس بھیج دیا۔

۳۲۳ھ میں پھر مغرب الاقصے میں بغاوت ہو گئی، ۳۲۴ھ میں قائم نے اس بغاوت کو فرد کیا اور ریف کے بنی ادریس کو مطیع کیا۔ ایک عرصے سے اطالوی ڈاکو فاطمی خلیفہ کی بندرگاہوں پر لوٹ مار کر جاتے تھے لہٰذا قایم کے سپہ سالار نے جنوبی اطالیہ کو مقام گیٹا تک تاخت و تاراج کر ڈالا اور مار تا دھاڑ تا شہر جنوہ تک جا پہنچا، شہر کو فتح اور بہت سے اطالیوں کو گرفتار کر لیا۔ شہر جنوہ ایک عرصے تک بنی فاطمہ کے قبضے میں رہا پھر لومبرڈی کا ایک حصہ بھی مطیع کیا گیا۔ اگر قایم کی اپنی سلطنت میں ابو یزید خارجی کی زبردست بغاوت شروع نہ ہو جاتی جس میں ان کی

تمام دولت اور فوج صرف ہو گئی تو یقیناً وہ تمام ملک اطالیہ کو مسخر کر لیتے پھر بھی اس بیڑے نے واپسی کے وقت سارڈینا پر حملہ کر کے فرنگیوں کو کئی بار شکست دی پھر قرقیسیا کا رخ کیا جو شام کے ساحل پر ہے یہاں اس نے عباسیوں کے جہازوں کو جلا دیا اور بہت سا مال غنیمت لے کر مہدیہ کی طرف مراجعت کی۔

۳۲۳ھ میں قایم کے خادم زیدان نے اسکندریہ فتح کر لیا مگر بعد میں اخشید والی مصر کی فوج نے آکر وہاں سے نکال دیا۔ ۳۲۵ھ سے ۳۲۹ھ تک اہل صقلیہ نے سخت بغاوت کی اور متواتر شکستیں کھانے کے بعد ۳۲۷ھ میں انہوں نے قسطنطنیہ کے بیڑے کو مدد کے لئے بلایا مگر صقلیہ کے فاطمی گورنر نے ۳۲۸ھ میں قلعہ ابو ثور فتح کر کے جرجنت کا محاصرہ کر لیا پھر قایم کا بیڑا تونس سے جا کر رومی بیڑے کے مقابلے میں ڈٹ گیا اور ۳۲۹ھ میں اس کو تباہ کر ڈالا۔ یہ حالات دیکھ کر اہل جرجنت نے اور ان کے بعد تمام اہل صقلیہ نے ہتھیار ڈال دیئے اور تمام جزیرہ میں امن قائم ہو گیا۔

سب سے بڑی بغاوت جو خلیفہ قایم کے زمانہ میں ہوئی وہ ابو یزید خارجی کی بغاوت تھی۔ ابو یزید توذر میں پیدا ہوا اور وہیں اس نے نشو و نما پائی تھی اور خوارج نکاریہ کی صحبت میں، جنکو صفریہ بھی کہتے ہیں، انھیں کا مذہب اختیار کر لیا پھر تاہرت میں آکر لڑکوں کو پڑھانے لگا۔ وہ دوسرے مذہبوں کی تکفیر کرتا اور سلطان پر خروج کرنا مباح بتاتا تھا۔ ۳۱۶ھ میں وعظ کہنا شروع کیا اور بہت سے لوگوں کو اپنا پیرو بنالیا پھر اس نے مہدی کی وفات کے بعد جبل اوراس میں خروج کیا اور شیخ المومنین لقب اختیار کیا، ناصر اموی بادشاہ اندلس کا خطبہ پڑھ دیا بربر کے بہت سے قبیلے اس کے ساتھ ہو گئے۔ چونکہ وہ سبزہ گدھے پر سوار ہوا کرتا تھا اس لئے صاحب الحمار کے نام سے بھی مشہور ہوا۔ ۳۳۲ھ میں اس نے تبسیہ مرماجنہ اور اربس اور بیبہ فتح کر لئے۔

قایم کو یہ خبر پہنچی تو انہوں نے رقادہ اور قیروان کی طرف فوجیں روانہ کر دیں اور میسور خواجہ سرا کو ابو یزید کی سرکوبی کے لئے متعین کیا پھر ایک دوسری فوج اپنے خادم بشریٰ کے ساتھ باجہ کی طرف بھیجی۔ ابو یزید نے بشریٰ کو شکست

دے کر تونس کی طرف بھگا دیا اور باجہ میں داخل ہو کر مردوں بچوں کو قتل اور عورتوں کو اسیر کر لیا پھر تونس پر قبضہ کر لیا اور قیروان کی طرف بڑھا مگر بشریٰ کے طلایہ نے ابو یزید کے طلایہ کو شکست دے کر ۴ ہزار قتل اور ۵ سو گرفتار کر لئے۔ اس کے بعد ابو یزید نے ۳ لاکھ فوج کے ساتھ رقادہ اور پھر صفر ۳۳۳ھ میں قیروان فتح کر لیا۔ میسور نے شکست کھائی اور مارا گیا اسکے بعد ابو یزید کی فوج نے سوسہ بھی فتح کر لیا اور اس کے فوجی دستوں نے تمام افریقہ میں قتل و غارت و آتشزنی کا بازار گرم کر دیا۔ اس کے بعد اس نے مہدیہ کا محاصرہ کر لیا، شہر کی ناکہ بندی کر دی، چھ مختلف حملوں میں سخت شکستیں کھاتا رہا۔

یہاں تک کہ ۳۳۴ھ کے شروع میں اس کے آدمیوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور وہ منتشر ہو گئے، صرف تیس آدمی اس کے ساتھ رہ گئے۔ صفر ۳۳۴ھ میں وہ قیروان کی طرف مراجعت کر گیا۔ شہروں اور قریوں کے لوگوں نے ابو یزید کے آدمیوں کے متفرق ہونے کا حال سن کر اس کے عاملوں کو قتل کر ڈالا، بعض کو پکڑ کر مہدیہ بھیج دیا اس کے بعد قایم نے اپنے گورنر روانہ کر دیئے۔ اہل سوسہ نے بھی ایسا ہی کیا تھا مگر ابو یزید نے قیروان میں پہنچ کر پھر جمعیت کثیر بہم پہنچائی اور ان کو یہ حکم دے کر شہروں کی طرف روانہ کیا کہ "قتل کرو، قید کرو، لوٹو جلاؤ، برباد کرو" چنانچہ اس کے لشکر نے ۲۰ صفر ۳۳۴ھ کو تونس میں داخل ہو کر شہر کو لوٹ لیا اور مردوں کو قتل کیا اور عورتوں بچوں کو اسیر کر لیا پھر مسجدوں کو بھی منہدم کر ڈالا

ربیع الاول ۳۳۴ھ میں قایم کی فوج جا پہنچی اور علی بن حمدون نے ابو یزید کی فوج کو پسپا کر کے تونس فتح کر لیا لیکن اسی اثناء میں ابو یزید کے بیٹے ایوب نے باجہ فتح کر لیا اور تونس پر حملہ کیا مگر قایم کی فوج نے مار مار کر قیروان کی طرف بھگا دیا۔ اس کے بعد علی بن حمدون نے کئی لڑائیوں میں اسے شکستیں دے کر تیجست اور باغایہ بھی چھین لیا۔ جمادی الاخر ۳۳۴ھ میں ابو یزید نے لشکر جمع کر کے سوسہ کا سخت محاصرہ کر لیا، یہاں قایم کا لشکر کثیر موجود تھا، روز لڑائی ہوتی رہی جس میں کبھی ایک کی فتح ہوتی، کبھی دوسرے کی۔ غرض سوسہ کا محاصرہ جاری تھا کہ ماہ شوال ۳۳۴ھ میں قایم کا انتقال ہو گیا۔

اسماعیل المنصور باللہ

اسماعیل المنصور باللہ نے جب تک ابویزید کے خرخشہ سے چھٹکارا حاصل نہیں کر لیا قایم کی وفات کو چھپائے رکھا۔ خلیفہ کا لقب بھی اختیار نہیں کیا، سکہ و خطبہ میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس اثناء میں فرمانوں اور احکامات پر اپنے دستخطوں میں امیر اسمٰعیل ولیعہد لکھتے رہے۔

اسمٰعیل بڑے شجاع، بہادر، عقیل، مستعد، مستقل مزاج، خوش خلق، ادیب لبیب، شاعر مقرر بلیغ اور نہایت منتظم تھے، فی البدیہہ خطبہ دیتے اور دریا کی روانی کی طرح بولتے تھے۔

ابویزید کی بغاوت سے سارے ملک میں تہلکہ تھا، ساحل بحر کے چند قلعہ بند شہروں اور مہدیہ کے علاوہ کچھ بھی قبضہ میں نہ رہا تھا۔ اندلس کے اموی خلیفہ ناصر نے مغرب الاقصےٰ پر قبضہ کر لیا تھا، ایسے میں پھر سلطنت کو سنبھالنا اور اپنے آبائی ملک پر قابض رہ جانا اسماعیل کی لیاقت و قابلیت کا بڑا امتحان تھا لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔

قایم کی وفات کے وقت ابویزید سوسہ کا محاصرہ کئے پڑا تھا اور اہل سوسہ اس کو توڑنے میں زور مار رہے تھے، مگر انہیں کوئی کامیابی نہ ہو رہی تھی۔ اسماعیل نے بادشاہ ہوتے ہی ان کی مدد پر فوج روانہ کی۔ اس فوج نے سوسہ کی فوج کے ساتھ مل کر ابویزید کی فوج سے ایسی جنگ کی کہ وہ بدحواس ہو کر بھاگ نکلا۔ اس کے بہت سے آدمی مارے گئے پھر اس کی چھاونی لوٹ کر آگ لگا دی گئی۔ ابویزید فرار ہو کر قیرواں پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے اسے گھسنے نہ دیا اور اس کے عامل کو نکال دیا۔ ناچار آخر شوال ۳۳۴ھ میں وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ قیروان سے دو دن کی راہ پر سبیبہ آیا۔ ۲۴ شوال کو اسمٰعیل قیروان میں پہنچے تو ابویزید نے پھر ایک جمعیت اکٹھی کر لی تھی، قیروان پر چڑھائی کر دی، لڑائی ہوئی، پہلے دن شاہی فوج فتحیاب رہی مگر دوسرے دن شکست کھا کر مہدیہ اور سوسہ کی طرف بھاگ نکلی۔ پھر بادشاہ نے بذات خاص نہایت شجاعت سے جنگ کی اور اتنے آدمی قتل کئے کہ

ابویزید کا جی چھوٹ گیا اس نے ذیقعد ۳۳۴ھ میں کوچ کا نقارہ بجا دیا مگر جلد ہی واپس آیا ۱۵ محرم کو نہایت شدید جنگ کے بعد ابویزید شکست یاب ہوا مقام فتح پر خلیفہ نے منصوریہ آباد کیا اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔

ربیع الاول ۳۳۵ھ میں منصور ابویزید کے تعاقب میں روانہ ہوا اور اسے دباتا چلا گیا، جنگل، بیاباں، پہاڑ، وادی اور دلدلوں کی کچھ پروانہ کی یہاں تک کہ اس کے پیچھے بلاد سودان کے سے ویرانے میں پہنچ گیا، جہاں پانی کی ایک مشک ایک دینار میں ملتی تھی۔ سخت محنت کے باعث اس کو بیماری نے آگھیرا اور ناچار پلٹ کر کچھ عرصہ تک عمرت میں مقیم رہا، ابویزید نے موقع پا کر سیلہ کا محاصرہ کر لیا منصور صحت یاب ہونے کے بعد رجب ۳۳۵ھ کو پھر ابویزید کی طرف روانہ ہوا اور وہ محاصرہ چھوڑ کر قلعہ کتامہ میں متحصن ہو گیا، منصور نے پیچھا نہ چھوڑا، ۲۵ محرم کو سخت لڑائی کے بعد ابویزید مارا گیا اور مصر کا خلیفہ سجدہ شکر بجا لایا۔

ابویزید کی مہم سے فارغ ہو کر ۳۳۶ھ میں منصور نے مغرب الاقصےٰ پر چڑھائی کی جہاں کے گورنر نے ابویزید کی شورش کے زمانہ میں بغاوت کر کے اندلس کے اموی خلیفہ کا خطبہ پڑھ دیا تھا۔ خلیفہ نے باغی گورنر کو بھگا دیا اور تاہرت فتح کر لیا اور جمادی الاول ۳۳۶ھ میں قیروان کی طرف مراجعت کی۔ ابویزید کی سرکشی کے زمانے میں ۳۳۵ھ میں اہل صقلیہ نے بھی بغاوت کی تھی اور رومیوں نے بھی۔ وہ روپیہ دینا بند کر دیا تھا جس پر صلح قرار پائی تھی۔ منصور نے ۳۳۶ھ میں ابولغنائم الحسن بن علی کلبی کو صقلیہ کا گورنر بنا کر روانہ کیا۔ اس نے باغیوں کی قرار واقعی سرکوبی کی۔ رومیوں کے راہب نے بھی ڈر کے مارے تین سال کا نہ دیا ہوا جزیہ داخل کر دیا مگر قسطنطنیہ کے بادشاہ نے سمندر کی راہ سے بہت سی فوج صقلیہ کی طرف روانہ کر دی جو شہر اور نت میں اتر گئی یہ خبر سن کر منصور نے بھی ایک بیڑا جہازوں کا حسن کلبی کی مدد کے لئے روانہ کر دیا۔ اپنی فوج کو شاہی فوج کے ساتھ ملا کر حسن قلوریہ پر چڑھ گیا اور رومیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ رومی بغیر لڑے بارہ کی طرف بھاگ گئے۔ حسن نے فوجی دستے تموریہ میں قتل و غارت کرنے کے لئے پھیلا دئے اب جاڑا آ گیا تو حسن نے مسینی کی طرف مراجعت

کی۔ گرمی شروع ہوتے ہی حسن نے پھر قلوریہ پر دھاوا کیا اور یوم عرفہ ۳۴۰ھ کو بمقام جراحہ رومیوں کو سخت شکست دی۔ قسطنطین بادشاہ روم نے مجبور ہو کر صلح کر لی اور حسن ریو کی طرف واپس ہوا تو شہر کے وسط میں اس نے نہایت عالیشان مسجد تعمیر کرادی۔

شوال ۳۴۱ھ کو خلیفہ منصور کا انتقال ہو گیا اور ان کے صاحبزادے المعزلدین اللہ خلیفہ ہوئے تو حسن اپنے بیٹے احمد کو صقلیہ کا گورنر بنا کر خود خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

ابو تمیم المعز لدین اللہ

اس خلیفہ کو مورخین نے دانا، مستعد، شجاع، سخی، عادل، کریم الاخلاق، سائنس و فلسفہ کا ماہر، مربی علوم و فنون، صائب الرائے، واقف قوانین ملک و ملت، ماہر نجوم و ہیئت اور سرپرست اہل علم تحریر کیا ہے اور مختصر لفظوں میں مغرب کا مامون قرار دیا ہے۔

اس کے عہد میں شمالی افریقہ کا تمدن عروج پر پہنچ گیا۔ عوام خوشحال اور فارغ البال تھے۔ مجموعی طور پر امن و امان تھا اندرون ملک فساد اور ہنگامے سختی سے دبادئے جاتے، نظم حکومت مستحکم تھا۔

پورے ملک کا نظام اصول پر قائم تھا، کام کے قواعد و ضوابط مقرر تھے۔ صوبے ضلعوں میں منقسم تھے اور ہر ضلع میں لائق و متدین افسر متعین تھے۔ استقرار امن کے لئے ایسے سپاہی بھرتی کئے گئے تھے جو ضرورت پڑنے پر فوج میں شامل کئے جا سکیں۔ منظم فوج اس کے علاوہ تھی جو پوری طرح تربیت یافتہ تھی۔

" المعزلدین اللہ بہت نرم دل اور نرم مزاج تھے۔ خدا نے ایک خاص شعور اور لیاقت انہیں عطا کی تھی۔ بعض سردار، جوان کے بزرگوں کے خون کے پیاسے رہے تھے، وہ خواہ ان سے محبت نہ کرتے ہوں مگر دوست ضرور تھے۔ المعز بھی ان سے بڑی مہربانی سے پیش آتے۔ اس طرح انہوں نے دشمنوں کو بھی اپنا حامی اور مددگار بنا لیا تھا۔" (ابن خلدون)

بالا ختصار المعزوہ عظیم فرمانروا تھا جس کی صلاحیت و تدبر نے اس کی سلطنت کو عظیم بنا دیا۔

آغاز حکومت میں انہوں نے جبل اوراس اور باغایہ کی بغاوتوں کو فرو کیا۔

اندلس کے اموی خلیفہ ناصرلدین اللہ نے ایک ایسا تجارتی جہاز بنوایا تھا جس کی اس وقت تک کوئی مثال نہ تھی۔ ۳۴۴ھ میں اس جہاز کو بحر روم کے ساحلی شہروں سے تجارت کے لئے روانہ کیا گیا۔ اتفاق سے اسے صقلیہ کا ایک جہاز مل گیا جس پر گورنر صقلیہ کا قاصد کچھ خطوط لے کر المعز کی خدمت میں جا رہا تھا، اندلسی جہاز نے صقلیہ کے جہاز کو لوٹ لیا اور المعز کے نام کے خط اور تمام مال و اسباب لے کر فرار ہو گیا۔ المعز کو اس کی خبر پہنچی تو اس نے بھی ایک بیڑا تیار کرایا اور اس کو حسن بن علی گورنر صقلیہ کی سرکردگی میں اندلس پر حملے کے لئے روانہ کر دیا۔

اس بیڑے نے مریہ کی بندرگاہ میں داخل ہو کر جتنے جہاز وہاں موجود تھے، سب کو پھونک دیا اور اس بڑے جہاز کو بھی گرفتار کر لیا پھر خشکی پر زبردست غارت گری کی اور مال غنیمت لے کر واپس ہو گیا۔

اس کے جواب میں ۳۴۵ھ میں خلیفہ ناصر نے اپنے امیر البحر غالب کی ماتحتی میں ستر جہازوں کا بیڑا بھیجا جو افریقہ کی بعض بندرگاہوں پر لوٹ مار کر کے چلا گیا، پھر بحری لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اسی دوران مغرب الاوسط کے گورنر یعلی بن محمد یفرنی نے مصر سے بغاوت کر کے اموی خلیفہ کی اطاعت کر لی اور مغرب الاقصیٰ کے بعض حاکموں نے بھی اندلسی خلیفہ کا خطبہ جاری کر دیا۔ اس پر فاطمی خلیفہ نے اپنے وزیر اور سپہ سالار اعظم ابوالحسن جوہر بن عبداللہ کو ان سب کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ جوہر نے مغرب الاوسط پہنچ کر باغیوں کو قتل کیا اور ۳۴۸ھ میں بحر اوقیانوس کے ساحل تک کا پورا علاقہ مسخر کر لیا۔ اس طرح ۳۴۸ھ ختم ہوتے ہوتے حدود مصر سے ساحل بحر تک کے تمام ممالک پر فاطمیین کا قبضہ ہو گیا۔

۳۵۱ھ میں جزیرہ قریطش کے مسلمانوں نے رومیوں کے خلاف المعز سے مدد مانگی۔اس جزیرے میں ابو حفص عمر بن عشیب بلوطی کا خاندان حکمران تھا جس کو کسی زمانے میں حکم بن ہشام نے اندلس سے جلاوطن کیا تھا اور وہ اس جزیرے کو رومیوں سے چھین کر اس کا حکمراں بن گیا تھا۔۳۵۱ھ میں جب رومیوں نے اس پر حملہ کیا تو ان لوگوں میں قوت مدافعت نہ تھی۔انہوں نے المعز سے رجوع کیا اور المعز نے ایک لشکر روانہ کر دیا جس سے رومیوں کی جنگ ہوئی، وہ ہزیمت یاب ہوئے اور ان کی ایک تعداد گرفتار ہو گئی لیکن مصری فوج کے واپس ہوتے ہی رومیوں نے اس جزیرے پر پھر قبضہ کر لیا۔

اس کی کسر المعز نے یوں پوری کی کہ صقلیہ میں رومیوں کے جو قلعے تھے ان سب پر قبضہ کر لیا اور رومیوں کو وہاں سے نکال دیا۔

صقلیہ میں حسن بن علی کلبی کا خاندان تقریباً سو برس سے آباد تھا اور جزیرے پر انہیں کی حکمرانی تھی جسے خلفائے فاطمیین کی سرپرستی حاصل تھی۔کلبی دور میں صقلیہ کو اتنا عروج حاصل ہوا کہ وہ مستقبل کے قاہرہ کا پیش خیمہ بن گیا ہر طرف خوشحالی کا دور دورہ تھا۔مسجدیں، مدرسے، دارالعلوم، علوم و فنون کے مراکز کیا کچھ نہیں تھا اس جزیرے میں؟ ہر طرف چہل پہل، دن عید رات شب برات، پلرمو کا طبی دارالعلوم بغداد اور قرطبہ کی نظیر پیش کیا کرتا تھا۔جنوبی اطالیہ میں سلرمو کا مدرسہ شہرہ آفاق تھا۔

اس کے بعد ایک عظیم واقعہ پیش آیا۔مصر قدیم کے بادشاہ کافور اخشیدی کے مرنے پر امراء نے گیارہ سال کے ایک بچے کو تخت نشین کیا اور اس کے نام سے عوام پر ستم رانی کرنے لگے۔قحط و وبا کے بھگتے ہوئے لوگ ان تازہ مظالم کو برداشت نہ کر سکے اور بعض اکابر نے المعز سے رجوع کیا۔المعز نے ان کی خواہش پر ابوالحسن جوہر کو ایک لاکھ سوار اور بارہ سو مال کے صندوق دے کر روانہ کیا جس کو مقام جتیرہ پر نوعمر اخشیدی بادشاہ بلوشاہ کی فوج نے روکا اور مقابلہ بھی کیا مگر ۱۱ شعبان ۳۵۸ھ کو انہیں عبرتناک شکست ہوئی۔

اخشیدی بادشاہ گرفتار ہوا اور جوہر دارالسلطنت میں داخل ہو گیا پھر مصر

قدیم سے لگا ہوا ایک شہر آباد کیا جو قاہرہ معزیہ کہہ کر پکارا گیا اور جس کو فاطمیین کا مرکز حکومت بنایا گیا۔جوہر نے عباسی خلیفہ کا سکہ و خطبہ بند کر کے المعز لدین اللہ کا خطبہ جاری کیا اور ایک سکہ ضرب کرایا، اذان میں "حی علی خیر العمل" داخل کرایا، نماز میں بسم اللہ باواز بلند کہنے کی ہدایت کی، نماز جمعہ میں سورہ جمعہ اور سورہ منافقین کی تلاوت کا حکم دیا، خطبے میں آئمہ طاہرین کے اسمائے گرامی شامل کرائے اور فضائل اہل بیت بیان کرنے کی تاکید کی۔

ان کاموں سے فارغ ہو کر اس نے جامع ازہر کی تعمیر شروع کرائی جو آج عالم اسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔

۳۵۹ھ میں پوپ یوحنا دہم نے جنوبی اطالیہ سے مسلمانوں کو نکالنے کا منصوبہ بنایا۔اس مقصد کے لئے اس نے قسطنطنیہ سے فوج طلب کی جو اطالیہ کے لشکر سے مل کر جنوب کی طرف پیش قدمی کرنے لگی مگر اس کی یہ کوشش کارگر نہ ہوئی۔متحدہ فوج کو منہ کی کھانی پڑی اور وہ اپنی راہ واپس ہو گئی۔

۳۶۲ھ میں المعز یوسف تگین بن زیری کو اپنا قائم مقام بنا کر مصر قدیم کی طرف روانہ ہوئے اور ۵ رمضان کو قاہرہ میں داخل ہوئے۔۳۶۴ھ میں پہلی مرتبہ عید غدیر بڑی شان و شوکت سے منائی گئی۔

جوہر ۳۵۹ھ میں دمشق فتح کر چکا تھا اور وہاں فاطمی خلیفہ کا خطبہ جاری کرا چکا تھا۔اب اس نے شام کے دوسرے علاقے مسخر کئے۔

پچھلے دو سال سے احساء کے قرمطی شام کے علاقے میں لوٹ مار کر رہے تھے اور ان کی طرف توجہ نہ دی جا سکی تھی۔آخر ان کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ مصر پر بھی حملہ آور ہوئے۔المعز نے ایک لشکر بھیج کر ان کی گوشمالی کی۔ایک تعداد قتل ہو گئی، باقی احساء کی طرف فرار ہو گئے۔

شعبان ۳۶۴ھ میں ایک ترکی سردار الپتگین دمشق پر قابض ہو گیا۔اس نے پھر عباسی خلیفہ کا خطبہ جاری کرا دیا، المعز خود اس کی تادیب کے لئے روانہ ہوئے مگر بلبیس پہنچ کر انتقال کر گئے۔

مکے اور مدینے میں پہلے ہی فاطمی خلیفہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔اس دوران

دوسرے مقامات پر بھی اس کا اجراء ہوا حتیٰ کہ خلیفہ کے وفات پانے کے وقت اسلامی دنیا کے بڑے حصے میں ان کی خلافت تسلیم کی جاچکی تھی۔

المعز لدین اللہ کے لئے مورخین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس نے ایسی عدالت و سخاوت سے حکومت کی جو کسی عظیم شہنشاہ کے شایان شان ہے۔ایک بار پندرہ ہزار اونٹوں اور دس ہزار خچروں پر لدے ہوئے صندوق افریقہ سے آئے جن میں زر و جواہر بھرے ہوئے تھے۔المعز نے خزانچی کو حکم دیا کہ سارے صندوق محفوظ کر لئے جائیں اور چند صندوق روز نکالے جائیں، ضرورت مندوں کو اجازت دی جائے کہ ہر ایک مٹھی بھر بھر کے نکال لے۔اب یہ اس کی قسمت ہے کہ اس کی مٹھی میں جو کچھ آجائے، وہ اس کا ہے۔

ابن خلدون لکھتا ہے کہ بنی فاطمہ کی حکومت کے دوران وزارت ارباب قلم ہی کو ملتی رہی۔

ابو الفرج یعقوب بن یوسف بن کلس المعز کا وزیر تھا، ابو حنیفہ نعمان بن محمد بن منصور قیروانی قاضی القضاۃ۔ مقریزی رقم طراز ہے کہ المعز کا خطبہ ممالک مغرب، مصر و شام، عراق و حجاز وغیرہ میں پڑھا جاتا تھا۔

ابو المنصور نزار العزیز باللہ

وہ جواد، کریم، شجاع، دانشمند، حلیم و صابر، خوش خلق اور کثیر العفو فرمانروا تھے۔ معافی کو انتقام پر ترجیح دینے والے؛ مغلوب پر رحم کرنے والے، دشمن کو نوازنے والے، حسن سیرت اور انصاف میں اپنے والد کے نقش قدم پر، عالم و فاضل، ادیب و شاعر، عید کے دن ان کے ایک بیٹے کا انتقال ہوگیا تو چند شعر کہے

ہم اولاد مصطفیٰ حاملان رنج و غم ہیں، صبر و ضبط کے گھونٹ پیتے رہتے ہیں،
ہمارے مصائب و آلام بھی عجیب ہیں۔اول و آخر آزمائش کی کسوٹی پر پرکھے جاتے ہیں،
دنیا اپنی عیدوں کی خوشیاں مناتی ہے ہماری عیدیں ماتم میں گزرتی ہیں۔"

العزیز کو عمارتیں بنانے کا بہت شوق تھا۔مصر میں کتنی ہی عمارتیں ان کی یادگار ہیں۔ رعایا پرور تھے، ہر ایک کے لئے ملنے کی اجازت عام تھی، خونریزی کو

بالکل پسند نہ کرتے، شکار کے شوقین تھے، گھوڑے، کپڑے اور جواہر کے اعلیٰ درجے کے مبصر۔ان کی سلطنت کی وسعت پہلے سے زائد تھی۔ حمص، حماۃ، شیراز اور حلب بھی اس میں شامل ہوگیا تھا۔محرم ۳۸۲ھ میں مخلد بن مسیب عقیلی والی موصل نے اپنی سلطنت موصل، مدائن، کوفہ اور انبار وغیرہ میں ان کا سکہ و خطبہ جاری کیا۔یمن میں بھی انہیں کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔

یہ عظمت و شان مرتے دم تک باقی رہی۔سلطنت کی حدیں ان کے زمانے میں دریائے فرات کے کنارے سے بحر ظلمات تک پھیلی ہوئی تھیں۔عرب کا تمام مغربی حصہ منتہائے یمن تک اس میں آتا تھا۔

العزیز بھی اپنے پیش رووں کی طرح بنو کتامہ پر بڑا اعتماد کرتے تھے۔ یہ قبیلہ فاطمیین کے استقرار حکومت میں اساسی حیثیت رکھتا تھا پھر بھی فاطمی خلیفہ نے محسوس کیا کہ ان کے علاوہ بھی بعض فوجی دستے ہونا چاہیئے تاکہ صرف بنی کتامہ کی محتاجی نہ رہے لہذا انہوں نے ترک اور دیلمیوں کو بھی بھرتی کیا تاہم بنی کتامہ کی قدر افزائی میں کمی نہیں کی۔

ان کا عہد مقابلتاً پرسکون تھا تاہم عرب قبائل میں زناتہ نے بغاوت کی جس کو بلکین نے رفع کیا۔عبس بن ام الانصار نے نبوت کا دعویٰ کیا، اس کو شکست دے کر قتل کیا گیا۔

فاس و سجلماسہ میں کچھ خلفشار تھا، ان دونوں مقامات پر دوبارہ قبضہ کیا گیا، اندلس کے بنی امیہ نے مغرب اقصیٰ کے بعض علاقے دبالئے تھے ان کو آزاد کرایا گیا اور ۳۷۱ھ تک اس سرزمین سے ان کے اقتدار کو بالکل ختم کر دیا گیا۔

۳۷۳ھ میں بلکین کا انتقال ہوگیا تو بنی امیہ نے بعض ساحلی علاقوں پر تسلط حاصل کرلیا۔ بلکین کا بیٹا منصور افریقہ کا نیا گورنر ہوا تھا، وہ فی الفور اس طرف توجہ نہ کرسکا..... ۳۶۸ھ میں حاکم صقلیہ نے کستنہ اور قلوریہ میں طارنتا و عروانیہ فتح کئے۔۳۷۱ھ میں بردویل شاہ فلانڈرز جہاد کے لئے نکلا تھا۔اس نے قلعہ مالطہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ گورنر صقلیہ اس کو چھڑانے کے لئے آیا تو میدان جنگ میں مارا گیا اور اہل صقلیہ نے اس کے بیٹے جابر کو گورنر بنالیا اس نے باپ کی موت کا

بدلہ لینے کے لئے پوری تیاری سے حملہ کیا تو عیسائیوں کو جانیں بچانا مشکل ہو گیا اور بردویل فرار ہو گیا۔

جابر بہادر تھا مگر اس میں انتظامی صلاحیت نہ تھی اس لئے العزیز نے جعفر بن محمد بن حسن کلبی کو اس کے بجائے گورنر مقرر کیا۔ ۳۷۵ھ میں جعفر کی وفات پر اس کا بھائی عبداللہ اور ۳۷۹ھ میں عبداللہ کے مرجانے پر ابوالفتوح یوسف بن عبداللہ گورنر ہوا۔

دمشق کے حالات کافی دنوں سے ابتر ہو رہے تھے۔ المعز کے انتقال کے بعد سے الپتگین نے پھر لوٹ مار شروع کر دی تھی، آخر ۳۶۵ھ میں العزیز نے جوہر کو روانہ کیا۔ اس نے پہنچتے ہی دمشق کا محاصرہ کر لیا لیکن الپتگین نے اپنی مدد کے لئے قرمطیوں کے سردار حسن بن احمد کو بلالیا۔

جوہر مصلحتاً رملہ کی طرف ہٹ گیا۔ الپتگین نے قرامطہ کو لے کر رملہ پر چڑھائی کر دی۔ آخر جوہر عسقلان آگیا یہاں بھی الپتگین نے آکر گھیر لیا۔ جوہر اپنے کو کمزور پا رہا تھا لہذا اس نے حکمت عملی سے کام لیا اور تنہائی میں الپتگین سے ملاقات کر کے کہا کہ وہ اس کو بعافیت نکل جانے دے تو آئندہ دمشق سے کوئی سروکار نہ رکھے گا۔ الپتگین راضی ہو گیا اور جوہر اپنی فوج کے ساتھ واپس ہو گیا۔

مصر پہنچ کر جوہر نے از سر نو لشکر مرتب کیا اور العزیز کو لے کر رملہ کا عازم ہو گیا...... قرمطی اور الپتگین اب تک دمشق میں مقیم تھے۔ محرم ۳۶۷ھ میں زبردست معرکہ ہوا، دشمن کے بیس ہزار آدمی مارے گئے۔ ایک بڑی تعداد گرفتار ہوئی جن میں الپتگین بھی تھا۔ خلیفہ اس کے ساتھ لطف و کرم سے پیش آیا اور اس کو اپنے ساتھ مصر لے آیا اور اس کو اپنا حاجب بنا لیا۔ پھر لوٹ مار نہ کرنے کے وعدے پر قرمطیوں کا بیس ہزار دینار سالانہ مقرر کر دیا۔

دمشق میں الپتگین کے بعد اس کا وزیر قسام قائم مقام تھا۔ اس کو العزیز نے گورنر بنا دیا۔ ۳۷۲ھ میں اس کو مصر بلا لیا اور خطخ کو اس کی جگہ مقرر کیا، تدریجاً وقفے سے بکجور کو اور ۳۷۸ھ میں نیر کو متعین کیا اس نے ۳۸۲ھ میں سرتابی کی تو منجوتکین کو بھیجا جس نے نظم حکومت پر قابو پالیا۔

وقت کے فصل سے بنی طے اور فلسطینی عربوں کے امیر مفرج بن دغفل نے نواح رملہ میں غارت گری شروع کر دی تو ۳۶۹ھ میں بلتگین کو مصر سے روانہ کیا گیا جس نے ان سب کو سرکوبی کر کے بھگا دیا۔

العزیز کے آخر عہد میں رومیوں نے شام کے سرحدی علاقوں پر تاخت کی۔ العزیز ان کو سزا دینے کے لئے خود روانہ ہوئے مگر رجب ۳۸۶ھ میں بلبیس پہنچ کر بیمار پڑ گئے اور ۲۸ رمضان کو سفر آخرت کر گئے۔

مرنے سے قبل انہوں نے ساڑھے گیارہ سال کے الحاکم کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا

العزیز کا عہد ان کے معاصرین میں مثالی تھا۔ شہنشاہ عضد الدولہ بویہی سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، ان کے بعد فاطمیین میں ان جیسا خلیفہ نہ ہو سکا۔

ابو علی منصور الحاکم بامر اللہ

الحاکم تخت سلطنت کے لئے بہت کم سن تھے لہذا العزیز نے اپنے معتمد و معتبر خواجہ سرا کو اتالیق مقرر کیا تھا وہ داروغہ قصر بھی تھا اور بحالت موجودہ مدبر سلطنت بھی۔ اس نے الحاکم کی بیعت کرائی اور سب سے پہلے نئے خلیفہ کو مبارکباد دی

امراء بظاہر مطیع و وفادار تھے لیکن جلد ہی ان کے مابین پھوٹ پڑ گئی اور برجوان اور ابن عمار کی باہمی رقابت کے باعث امیروں کے دو گروہ بن گئے، برجوان کے مشارقہ اور ابن عمار کے مغاربہ۔ ان دونوں میں جنگ ہوئی اور مشارقہ غالب رہے۔ برجوان نے ابن عمار کو اس شرط پر معاف کر دیا کہ آئندہ کیلئے مستقلاً خانہ نشین ہو جائے۔ مشارقہ و مغاربہ کی چپقلش نظم حکومت پر اثر انداز ہوئی اور چہار جانب ایک باغیانہ رجحان پیدا ہو گیا۔ صور میں بغاوت ہوئی، مفرج بن دغفل نے شام میں لوٹ مار شروع کر دی۔ بادشاہ روم ذوقش نے حالات سے فائدہ اٹھا کر افامیہ کا محاصرہ کر لیا۔

برجوان نے جیش بن صمصامہ کو روانہ کیا۔ اس نے اہل صور اور مفرج کو شکست دی پھر افامیہ میں رومیوں کے مقابلے پر آیا اور ان کو انطاکیہ تک بھگاتا چلا گیا۔ شاہ روم جنگ میں مارا گیا اور رومیوں نے دس سال کے لئے برجوان سے صلح کر لی۔

اب برجوان ہر سیاہ و سپید کا مالک تھا اور اس کی مطلق العنانی حد سے بڑھ گئی تھی ۔ کوئی چارہ نہ دیکھ کر الحاکم نے ۳۸۹ھ میں اسے قتل کرادیا اور اس کی جگہ فہد بن ابراہیم کو وزیر بنادیا اور حسین بن جوہر کو قائد القواعد ۔

انہیں دنوں مفرج اور حسان بن مفرج نے رملہ میں علم بغاوت بلند کیا اور عسقلان پر قبضہ کرلیا ۔ علی بن جعفر بن فلاح الحاکم کی طرف سے مامور ہوا، اس نے ۳۹۰ھ میں انہیں شکست دی ۔ اس کے بعد ہی مفرج مر گیا اور حسان نے اطاعت کرلی ۔

۳۸۶ھ میں منصور بن بلکین کا انتقال ہونے پر اس کا بیٹا ابو مناد افریقہ کا گورنر ہوا مگر اس نے مالکی مذہب اختیار کرلیا اور اس مذہب کی عام اشاعت کرنے لگا انجام کار افریقہ کے شہروں میں ۴۰۷ھ میں بے شمار شیعہ قتل کر دیئے گئے اور بعض کو تو زندہ جلادیا گیا ۔

اسی زمانے میں ایک شخص ابورکوہ ولید بن ہشام اموی نے بغاوت کی .... یہ شخص منصور بن عامر کے عہد میں اندلس سے خارج البلد ہو کر قیروان میں آبسا تھا اور برقہ میں بچوں کو تعلیم دیتا تھا ۔ اس نے ایک جماعت فراہم کر کے برقہ کے فاطمی عامل کو نکال دیا اور جو فوج مقابلے پر آئی وہ شکست یاب ہوئی ۔ اس سے ابورکوہ کا حوصلہ بڑھ گیا اور اس نے صعید اور مصر پر چڑھائی کر دی ۔ شاہی فوج سے اس کی جنگ ہوئی اور طرفین کے بہت سے آدمی مارے گئے پھر ۳۹۷ھ میں راس البرکہ میں جنگ ہوئی ابورکوہ نے شکست کھائی اور گرفتار ہو کر قتل کیا گیا ۔

۴۰۰ھ میں الحاکم نے حمید الدین کرمانی کو مدینہ منورہ روانہ کیا اور اس کو ہدایت کی ۔

"میرے دادا امام جعفر صادقؑ کے مکان میں فلاں جگہ کھودنا ۔ اس میں سے ایک صندوق برآمد ہوگا جس میں کتاب علوم آئمہ اور بعض نوادرات محفوظ ہیں ، ان کو نکال لانا ۔"

حمید الدین گیا اور حسب ہدایت عمل کیا تو تبرکات برآمد ہوئے اور انہیں

لے کر وہ قاہرہ آگیا ۔

۴۰۱ھ میں قرواش بن مقلد نے موصل میں خلیفہ الحاکم کے نام کا خطبہ پڑھوا دیا تو قادر باللہ عباسی نے بہاء الدولہ بن عضدالدولہ بویہی سے رجوع کیا اور بہاء الدولہ کی فہمائش پر قرواش پھر عباسی خلیفہ کا خطبہ پڑھوانے لگا ۔

۴۰۲ھ میں قادر باللہ نے خلفائے فاطمیین کی قدح میں ان کا ایک نسب نامہ شائع کرایا جس میں انہیں مجوسی کی اولاد ، زندیق اور ملحد ثابت کرنے کی کوشش کی ۔ اس پر شیعہ و سنی علماء کے دستخط بھی کرائے ۔ مقصود یہ تھا کہ فاطمی خلفاء کی طرف عوام کا میلان ختم ہو جائے لیکن اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا ۔ عباسی خلفاء کی بے وقعتی اسی طرح باقی رہی ۔

الحاکم کا معمول تھا کہ رات میں ایک مخصوص گدھے پر سوار ہو کر شہر کا گشت کیا کرتے تھے پھر کوہ مقطم پر بنے ہوئے مکان میں جا کر اعتکاف میں مصروف ہو جاتے ۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کبھی کبھی مسلسل آسمان کی طرف دیکھتے رہتے اور ستاروں سے اکتساب نور کیا کرتے ۔

ستائیس شوال ۴۱۱ھ کو وہ گدھے پر بیٹھ کر نکلے تو واپس نہ آئے ، دو سوار ساتھ تھے ، ان کو بھی انہوں نے راستے ہی سے واپس کر دیا تھا ۔ معمول کے مطابق جب وہ پلٹ کر نہ آئے تو تلاش میں امراء و عمائدین دوڑ پڑے اور سیدھے کوہ مقطم کی طرف گئے ، پہاڑ کی چڑھائی پر گدھا نظر آیا جس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے تھے ایک مقام پر الحاکم کے کپڑے پڑے ہوئے ملے جو پارہ پارہ تھے اور خون میں لت پت تھے ۔

کپڑوں سے یہ اندازہ بھی لگایا گیا کہ جسم چھریوں سے زخمی کیا گیا تھا ، جس کی علامات کپڑوں پر پائی جاتی تھیں اس طرح الحاکم کی موت کا یقین کرلیا گیا مگر لاش دستیاب نہیں ہوئی ۔

الحاکم کا نابالغ بیٹا ان کا جانشین ہوا جس کی رسوم تخت نشینی ممالک محروسہ میں ادا کی گئیں ۔

بادی النظر میں الحاکم کسی سازش کے تحت قتل کر دیئے گئے جس کی

صراحت مورخین نے کی ہے لیکن عقیدت مندوں کا کہنا ہے کہ وہ غیبت میں چلے گئے ہیں اور کسی وقت معینہ پر ظہور کریں گے ۔

الحاکم سخی ، شجاع ، منصف ، عالم ، عابد اور صاحب کرامات تھے ۔ حبیب السیر کا بیان ہے کہ وہ عادل اور خدا ترس خلیفہ تھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کمال مبالغہ کرتے ، مدرسے بنائے ، ان کے لئے جاگیریں وقف کیں اور مدارس کے لئے عالم اور فقیہہ مقرر کئے ۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ " مخالفین بنی فاطمہ یہ جو کہتے ہیں کہ وہ کافر تھے اور انہوں نے نماز ساقط کرنے کا فرمان جاری کیا تھا (بلکہ بعض دشمنوں نے یہاں تک بدنام کیا ہے کہ خدائی کا دعویٰ کیا تھا) یہ ہر گز صحیح نہیں ہے کیونکہ ان سے اگر اس قسم کی کوئی بات بھی صادر ہوتی تو اسی وقت قتل کر دیا جاتا، ہاں انکا رافضی ہونا تو سب ہی جانتے ہیں ۔"

مختصر یہ کہ الحاکم نہایت متشرع فرمانروا تھے ، اپنی سلطنت میں انہوں نے شراب اور بے چھلکے کی مچھلی کی خرید و فروخت کی ممانعت کی ، شکاری کتوں کے علاوہ تمام کتوں کے مروا ڈالنے کا حکم دیا، تراویح کو بدعت سمجھ کر اس کے پڑھنے پر پابندی لگا دی ، نصارا و یہود کو حکم دیا کہ سیاہ عمامے باندھا کریں ، یہودی گلے میں پانچ رطل وزنی بچھڑے کی شکل اور نصرانی اتنی ہی وزنی صلیب اپنے گلے میں ڈالا کریں ، جانوروں میں اونٹ گھوڑے وغیرہ کے بجائے گدھے پر سوار ہوں ۔

۴۰۲ھ میں انہوں نے حکم دیا کہ خلیفہ کے واسطے زمین بوسی نہ کی جائے ، نہ سلام کے وقت ہاتھ چومے جائیں کیونکہ مخلوق کے لئے زمین کی طرف جھکنا رومیوں کا فعل ہے ، اس کے عوض صرف السلام علےٰ المومنین ورحمتہ اللہ وبرکاتہ کہا جائے ۔ ۴۰۳ھ میں لوگوں کو شطرنج کھیلنے کے جرم میں پٹوایا ، اپنی سلطنت کے تمام گرجوں کے توڑنے کا حکم نافذ کیا، قصر کے گرد طبل و بوق بجانے کی ممانعت کی ۴۰۴ھ میں حکم دیا کہ عورتیں دن رات کسی وقت باہر نہ نکلا کریں ۔ ان کو روشندانوں اور کوٹھوں سے جھانکنے کی بھی ممانعت کی گئی ۔ سودے والوں کو حکم دیا کہ لانبا کرچھا اپنے ساتھ رکھیں تاکہ اس سے دروازہ کے اندر عورتوں کو سودا دے سکیں اور عورتیں اسی میں قیمت ڈال دیا کریں ۔

اسی سال نجومیوں اور گانے بجانے والوں کی جلا وطنی کا حکم دیا لیکن جب انہوں نے اپنے اپنے پیشے سے توبہ کر لی تو ان کو معاف کر دیا ۔ ۳۹۸ھ میں حکم جاری کیا کہ رات کو گھر کے دروازے بند نہ کیا کریں اور دوکانیں کھلی رکھا کریں گھروں اور گلی کوچوں کے دروازوں پر مشعلیں اور شمعیں روشن رہا کریں تاکہ لوگ دن کی طرح کوچوں اور بازاروں میں چل سکیں، خود الحاکم بھی اپنے غلام مسعود کے ساتھ ایک دراز گوش پر سوار بازاروں کا گشت کرتے جس کسی کو بدمعاشی کرتے یا کم تولتے دیکھتے تو اپنے غلام سے پٹواتے اور اس کی بے عزتی کراتے تھے ۔ اس گشت سے خوف خدا نمایاں ہوتا اور ہر ایک کو اجازت تھی کہ جس کا جی چاہے اپنا حال خود بادشاہ سے مل کر عرض کرے ۔ اوائل عہد سے اشھد ان علیاً ولی اللہ اذان میں باآواز بلند کہا گیا جو اب تک شیعوں میں مروج ہے ۔

الحاکم ایک باکمال ہیئت داں تھے ۔ ابوالحسن علی بن عبدالرحمن بن احمد بن یونس المتوفی ۳۹۹ھ المعروف بہ ابن یونس منجم نے ان کے نام پر ایک اعلیٰ درجہ کی زیچ ۴ جلدوں میں تیار کی جو زیچ حاکمی کے نام سے مشہور ہے ۔

قاہرہ کے قریب ہی جبل مقطم کی چوٹی پر الحاکم نے اپنے لئے ایک خانقاہ بنا رکھی تھی ۔ رات کو اکثر وہاں چلے جایا کرتے اور عبادت کیا کرتے تھے ۔ ۲۷ شوال ۴۱۱ھ کو جب جبل مقطم پر چڑھ رہے تھے تو تنہا پا کر کسی دشمن نے ہلاک کر دیا ۔ جسٹس امیر علی لکھتے ہیں کہ الحاکم بڑی فیاضی اور تندہی کے ساتھ علم و سائنس کی ترقی میں کوشش کرتے تھے ، شام و مصر میں انہوں نے بہت سی مسجدیں کالج اور رصدگاہیں تعمیر کرائی تھیں ۔

ابوالحسن علی الظاہر لاعزاز دین اللہ

ان کی عمر صرف سولہ سال تھی لہٰذا رئیس الرؤسا ابوالحسن عمار بن محمد اتالیق اور حاکم کی بہن ست الملک نائب السلطنت قرار پائی ۔

کہا جاتا ہے کہ امیر الجیوش ابن دواس نے بعض مذہب دشمن عناصر سے سازش کر کے الحاکم کو قتل کرا دیا تھا جس کا علم ست الملک کو تھا لہٰذا بیعت کے دوسرے دن ، جب وہ دربار میں حاضر ہوا تو ست الملک نے اسے گرفتار کر کے

گردن مار دی اور کہا کہ "یہ الحاکم کے قتل کا بدلہ ہے......!"

بعض متعصب مورخین نے ست الملک کو الحاکم کے قتل میں ملوث کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کے امیر الجیوش سے ناجائز تعلقات تھے جس کا علم الحاکم کو ہو گیا تھا لہذا ست الملک نے ابن دواس کے ذریعے الحاکم کو قتل کرا دیا لیکن مقریزی اس کی تردید کرتا ہے اور اس کو بہی خواہان بنی عباس کا اتہام قرار دیتا ہے بہرحال ست الملک چار سال تک حسن و خوبی سے نظم سلطنت کی دیکھ بھال کرتی رہی، ۴۱۵ھ میں انتقال کر گئی۔

اس کے بعد حبشی غلام معضاد مدبر سلطنت ہوا، شریف کبیر عجمی، شیخ نجیب الدولہ جرجرائی اور شیخ عمید الحسن بن بدوس امرائے سلطنت نے معضاد سے مل کر طے کیا کہ ان لوگوں کے علاوہ کوئی اور خلیفہ سے ملنے نہ پائے۔ یہ پابندی اس حد تک تھی کہ چتربردار، صاحب الشاء، داعی الدعاۃ، قاضی القضاۃ اور نقیب نقبائے طالبین تک کو بیس روز میں صرف ایک دفعہ باریابی کی اجازت تھی۔

۴۱۸ھ میں ابوالقاسم علی بن احمد جرجرائی کو وزیر بنایا گیا جو آخر وقت تک اس عہدے پر فائز رہا کیونکہ وہ بڑا منتظم اور دیانت دار تھا۔ ۴۱۴ھ میں منتخب الدولہ وزیری متولی قیساریہ کو فلسطین کی امارت سپرد کی گئی۔ صالح بن مرداس اور حسان بن مفرج سے اس کی متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ آخر صالح نے حلب اور اس کے مضافات پر اور حسان نے رملہ اور اس کے نواح پر قبضہ کر لیا اور شام کا ایک بڑا حصہ فاطمین کے ہاتھ نکل گیا۔

۴۱۵ھ میں عراق و خراساں کے حاجی شام و مصر کی راہ سے مکے سے واپس ہو کر قاہرہ آئے تو الظاہر نے ان کو خلعت دئے۔ عراقیوں کے خلعت قادر باللہ عباسی نے اور خراسانیوں کے خلعت محمود بن سبکتگین نے یہ کہہ کر جلوا ڈالے کہ "رافضیوں کے دیئے ہوئے خلعت ناپاک ہوتے ہیں۔"

۴۱۶ھ میں تمام فقہائے مالکی مصر سے نکال دیئے گئے اور داعیوں کو حکم ہوا کہ لوگوں کو کتاب دعائم الاسلام اور مختصر الوزیر حفظ کرائیں اور اسماعیلی مذہب کی تبلیغ کریں۔

اسی سال رومیوں نے صقلیہ کے کئی مقامات مسلمانوں سے چھین لئے اور قلوریہ ان سے خالی کرا لیا۔

۴۱۸ھ قیصر روم سے صلح ہو گئی، اس نے اپنے ملک میں الظاہر کا خطبہ پڑھنے کی اجازت دیدی۔ اس کے بعد ہی قسطنطنیہ میں ایک مسجد بنائی گئی اور اس میں موذن مقرر کیا گیا، جواباً الظاہر نے قمامہ کا گرجا تعمیر کرا دیا۔

۴۲۱ھ میں اہل روم سے ترکوں کی جنگ ہوئی جس میں طرفین کے بکثرت آدمی کام آئے۔ بقول روضتہ الصفا قیصر روم نے چھ لاکھ فوج سے شام پر حملہ کیا تھا پھر حلب کی طرف پیش قدمی کی لیکن اہل حلب نے چھاپے مار مار کر اس کے لشکر کو تباہ کر دیا۔ ۴۲۵ھ میں جب بغداد میں ہنگامہ ہوا تو الظاہر نے اپنے داعی روانہ کئے اور کافی آدمیوں نے ان کی دعوت قبول کی۔

نصف شعبان ۴۲۷ھ میں الظاہر نے وفات پائی اور ابو تمیم معد ان کے جانشین ہوئے۔

الظاہر اپنے جد امجد العزیز کی طرح منصف مزاج اور نیک سیرت تھے۔ ان کی سیاست اور کمال فراست سے اکثر فتنے دب جاتے۔ چونکہ امراء نے ان کو تقریباً نظربندی کے عالم میں رکھا تھا اس لئے قدرے عیش پسند ہو گئے تھے، پھر بھی حدود سلطنت میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑا تھا تاہم کہا جا سکتا ہے کہ خلافت فاطمین کے زوال کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

ابو تمیم معد مستنصر باللہ

جرجرائی وزارت پر اور وزیری شام کی گورنری پر اب تک برقرار تھا۔ وزیری نے اپنی فراست سے شام میں بڑی اصلاحات کی تھیں، ہم عصر فرمانرواؤں میں اس کی عزت تھی اور رومی تو اس سے خائف رہتے۔ مستنصر کے دل میں بھی اس کی قیمت تھی جس سے وزیر جرجرائی جلتا تھا۔ آخر ۴۳۳ھ میں اس نے اس پر بغاوت کا الزام لگا کر چڑھائی کر دی۔

وزیری ایک بہادر جرنیل تھا....۴۲۹ھ میں اس نے شبل الدولہ پر حملہ کیا تھا اور اس کو قتل کر کے حلب پر قابض ہو گیا تھا۔ ۴۳۲ھ میں حماۃ اور افامیہ کے درمیان رومیوں کو شکست دی تھی اور ان کا زور اتنا توڑا تھا کہ رومی مدتوں مسلمانوں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کرسکے۔ اس میں قاہرہ کی فوج سے ٹکر لینے کی طاقت تھی مگر اس نے ٹل جانا مناسب سمجھا اور حماۃ کی طرف ہٹ گیا پھر اپنی فوج کو مضبوط کر کے حلب میں داخل ہو گیا مگر اسی سال جمادی الاول میں اس کا انتقال ہو گیا

اس کے انتقال پر معزالدولہ ثمال بن صالح بن مرداس نے صفر ۴۳۴ھ میں حلب کے تمام علاقوں پر، حسان بن مفرج نے فلسطین پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔

۴۴۹ھ میں مصریوں کے حملے پر ثمال نے حلب کو مصری سردار ابن ملہم کے حوالے کر دیا اور خود مصر چلا گیا مگر شعبان ۴۵۴ھ میں محمود بن شبل الدولہ نے حلب لے لیا جسکو ثمال نے مصر سے آکر ۴۵۳ھ میں واگزار کرایا۔ ذی قعد ۴۵۴ھ میں ثمال مرگیا اور عطیہ حلب کا گورنر ہوا۔ محمود بن شبل الدولہ خراساں میں اقامت گزین تھا۔ اس نے ۴۵۵ھ میں پھر حلب فتح کر لیا۔ ۴۶۸ھ میں محمود نے وفات پائی تو اس کا بیٹا نصر جانشین ہوا مگر ۴۶۹ھ میں اس کا بھائی حلب کا بادشاہ ہو گیا

۴۷۲ھ میں شرف الدولہ مسلم بن قریش والی موصل نے حلب چھین لیا اور اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، جس کو ۴۷۹ھ میں سلجوقیوں نے فتح کیا اور قسیم الدولہ اقسنقر کو وہاں کا گورنر بنا دیا پھر آہستہ آہستہ پورا شام مسخر کر لیا۔

اس سے قبل ۴۶۳ھ میں سلجوقی سردار تسز رملہ، بیت المقدس اور اس کے جوار کا علاقہ فتح کر چکا تھا۔ ۴۶۸ھ میں اس نے دمشق کو مسخر کر کے وہاں عباسی خلیفہ مقتفی کا خطبہ جاری کر دیا اور حی علیٰ خیر العمل اذان سے نکلوا دیا۔

۴۶۹ھ میں اس نے قاہرہ کو بھی فوجی حصار میں لیا مگر بدر الجمالی نے ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ وہ بہت برے حال میں دمشق واپس ہو سکا۔ ۴۸۲ھ میں فاطمی لشکر نے شام کے ساحلی مقامات صور، صیدا، عکہ وغیرہ تسخیر کر لئے لیکن مسلسل حملوں کے باوجود دمشق فتح نہ کر سکے۔

افریقہ کے حالات ان سے زیادہ مختلف نہ تھے۔ وہاں کا گورنر معزبن بادیس سخت شیعہ دشمن تھا۔ اس نے ۴۴۲ھ میں مستنصر کا خطبہ موقوف کر کے عباسی خلیفہ کا خطبہ جاری کر دیا تھا۔ مستنصر نے دو عرب قبائل رعبہ اور ریاح اس کے پیچھے لگا دئے۔ انہوں نے ہرقہ کی سکونت اختیار کی اور چہار جانب لوٹ مار شروع کر دی پھر اپنی تعداد بڑھا کر ۴۴۶ھ میں طرابلس فتح کر لیا اور قیروان سے تین منزل پر بمقام جندران تین ہزار فوج سے معز کی ساٹھ ہزار فوج کو شکست دی اور باجہ فتح کر لیا پھر ۴۴۹ھ میں قیروان میں داخل ہو گئے۔ معز مہدیہ کی طرف بھاگ نکلا اور وہیں ۴۵۳ میں مرگیا۔

اس کا بیٹا تمیم اس کی جگہ تخت نشین ہوا تو اس نے ۴۷۶ھ میں عربوں کو شکست دے کر قیروان اور بعض دوسرے علاقوں سے نکال دیا اور ۴۸۰ھ میں اپنی سرزمین کو تمام مخالف عناصر سے پاک کر کے آزاد حکومت قائم کر لی لیکن ۵۰۱ھ میں وہ مرگیا اور اس کا بیٹا یحییٰ بادشاہ ہوا تو اس نے مصلحت وقت دیکھ کر مصری خلفاء کا خطبہ جاری کر دیا اور اس کے بعد زیری بادشاہ فاطمئین کا خطبہ پڑھتے رہے، یہاں تک کہ ۵۴۲ھ میں صقلیہ کے نصرانی حکمراں روجر نے مہدیہ فتح کر لیا۔

۴۴۲ھ میں علی بن صلیحی نے یمن میں مستنصر کے نام کا خطبہ جاری کیا تھا ۴۵۰ھ میں بساسیری نے عباسی خلیفہ قائم کو قید کر کے اس کے کپڑے اور عمامہ مصر بھیجا تھا اور ایک سال تک بغداد میں فاطمی خلیفہ کا خطبہ پڑھوایا تھا۔ ۴۵۱ھ میں مستنصر کی خلافت بصرہ، واسط اور مضافات میں تسلیم کر لی گئی تھی لیکن جب طغرل بیگ نے بساسیری کو قتل کرا دیا اور قائم کو آزاد کرا لیا تو پھر ۴۶۲ھ سے مکہ و مدینہ میں بھی عباسی خلیفہ کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔

حقیقتاً خلافت فاطمئین کے قیام سے نہ صرف خلافت عباسیہ پر ضرب لگی تھی بلکہ پوری سنی دنیا تلملا اٹھی تھی کہ خلافت پر تو ان کی اجارہ داری تھی، اس کو شیعوں کے ایک فرقہ نے کیونکر اپنا لیا اور یہ انداز فکر ایک حد تک غلط نہ تھا کیونکہ شیعوں کی طرف سے خلافت کو کبھی تسلیم نہیں کیا گیا لیکن خلافت کے لئے ایک معیار یہ بنا لیا گیا تھا کہ جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں پینا اسی کا ہے اور اس کی

تصدیق حاکم شام نے بزور شمشیر خلافت حاصل کر کے کی تھی۔

خلافت و امامت کے مسئلے کو طول دیئے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ حضور سرور کائنات کی وفات کے بعد پیغمبری اور فرمانروائی کی جو تقسیم از خود ہو گئی تھی، اس سے دو گروہ وجود میں آ گئے تھے: ایک گھر والوں کا، دوسرا باہر والوں کا۔ گھر والے سجادہ رسالت کی نیابت کے لئے امامت کے قائل تھے، باہر والوں نے سقیفہ بنی ساعدہ سے خلافت کا آغاز کر دیا تھا جس میں حضرت علیؑ کے چار سال زبردستی درمیان میں آ گئے تھے۔ زبردستی اس لئے کہ باہر والے گروپ کی بڑی تعداد نے اس کو تسلیم نہیں کیا تھا، اس میں سرفہرست ام المومنین حضرت عائشہ تھیں۔

پھر یہ خلافت کھلی ہوئی بادشاہت کی صورت ابن زبیر، بنی امیہ اور بنی عباس میں آگے بڑھتی رہی اور اس کے حصول کا واحد ذریعہ اپنی ہوئی تلواریں رہیں۔ جن کی تلواریں زیادہ تیز ثابت ہوئیں، انہوں نے تاج و تخت خلافت حاصل کر لیا۔

دوسروں کی دیکھا دیکھی فاطمئین نے بھی قسمت آزمائی کی اور جیالوں کا ساتھ دینے والی خلافت ان کے ہاتھوں میں آ گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب خلافت کے اصطلاحی معنی تھے ایک مضبوط حکومت!

علامہ عبدالحق محدث دہلوی آل رسول کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ کتنے سیر چشم ہیں کہ آپ نے مسلمانوں کی فرمانروائی بڑی کشادہ دلی سے دوسروں کے سپرد کر دی۔

ہماری طرف سے اس میں اتنا اضافہ ہو سکتا ہے کہ دوسروں نے قبضہ کر لیا تو ہم نے اس کو واپس لینے کے لئے مسلمانوں میں خون خرابہ پسند نہیں کیا کیونکہ حضورؐ اس کی تاکید فرما گئے تھے۔ حضرت علیؑ کے بعد دوسرے آئمہ کرام نے بھی اپنے کسی پیرو کو اقتدار کے لئے مسلمانوں پر تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ اب اگر حضرت مختار ثقفی، زید شہید یا نفس ذکیہ میدان میں آئے تو یہ ان کا ذاتی اجتہاد تھا، اس کا آئمہ گرامی قدر کی مرضی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

پھر جب امام مہدیؑ غیبت میں چلے گئے تو کوئی محبان اہل بیت کو روکنے والا نہ تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ دنیا انسان کی زبان کے بجائے تلوار کی زبان سنتی بھی

ہے اور سمجھتی بھی ہے تو سنیوں کے ساتھ شیعہ بھی نبرد آزما ہو گئے اور یہ سلسلہ خاندان طاہریہ سے شروع ہوا تو مراقش سے مصر پہنچا اور فاطمئین نے اپنی عظیم بادشاہت کا نام خلافت رکھ دیا۔

امامت قرآن و حدیث کی رو سے صرف خدا کی دین پر منحصر تھی جو ازل سے حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کے لئے مقدر تھی۔ کوئی ڈیڑھ سو سال تک تو امامت مختص رہی اہل بیت رسول سے۔ خلافت کی فقہی ضروریات کے لئے کچھ باہر کے آدمی بھی کھڑے ہوئے لیکن ان میں سے کوئی اپنے کو امام کہنے کی جرات نہ کر سکا۔ بنی عباس کے دوسرے خلیفہ نے یہ امتیاز بھی خانوادہ رسالت سے چھین لیا اور خود امام جعفر صادقؑ کے حلقہ تلامذہ سے ایک ممتاز عالم کو منتخب کر کے امام بنا ڈالا: امام بھی کیسا امام اعظم! اور اس کے بعد یہ سلسلہ دور استقبال کے متوازی آگے بڑھتا رہا، حتیٰ کہ ہمارے بارھویں امام دنیا کی نظروں سے دور چلے گئے تب بھی حکومت ساز امامت کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔

لائق استعجاب تو یہ امر تھا کہ خدا ساز امامت کے مقابلے پر انسان اپنی امامت لے آیا پھر خلافت تو انسان کی ساختہ و پرداختہ تھی، اس میں اگر شیعوں کا کوئی حلقہ حصہ دار بن گیا تو اعتراض کی کیا بات ہے۔ اس نے خدا کا دیا ہوا کوئی منصب تو نہیں چھینا تھا۔ انسانوں کی خلافت تھی، وہ بھی انسان تھے، انہوں نے لے لی اور ایسے رعب اور دبدبے سے اس کو رکھا کہ مکے اور مدینے نے بھی اسکو مان لیا۔

اب اگر مراکز خلافت کو دیکھا جائے تو بغداد و دمشق کے ساتھ قاہرہ کا نام ناگزیر ہے بلکہ قاہرہ کی نظیر دونوں میں سے کوئی پیش نہیں کر سکا۔ جامع ازہر آج بھی عالم اسلام کی عدیم المثال یونیورسٹی ہے۔ عجیب بات ہے کہ دارالعلوم تو تسلیم ہے مگر اس کے بانیوں کی خلافت سے انکار ہے کیونکہ اس پر شیعیت کی چھاپ لگی ہوئی ہے شیعیت کی چھاپ تو امامت پر بھی تھی، اس نام کو کیوں استعمال کیا۔ شاید صرف اس لئے کہ فقہ اور امام لازم و ملزوم ہیں اور نماز کے لئے خلافت نہیں بلکہ امامت ہی درکار ہوتی ہے۔

بہرحال کوئی مانے یا نہ مانے مگر فاطمیین مصر دو ڈھائی سو سال تک چار دانگ عالم میں اپنی خلافت کے ڈنکے پٹواتے رہے اور ان کے سامنے بغداد کی خلافت بچوں کا کھیل نظر آتی جو طالع آزما شمشیر زنوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی تھی۔ عباسی خلیفہ جانتے تھے کہ وہ دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ ہیں پھر بھی وہ حسد میں فاطمیین پر کیچڑ اچھالتے رہتے۔

ان کے خلاف ایک بار انہوں نے ایک محضر شائع کرایا تھا جو بے اثر ثابت ہوا تھا، دوسری بار پھر ایک محضر تیار کرایا اور اس کی بے شمار نقلیں شہروں شہروں تقسیم کرائیں کہ خلفائے مصر مجہول النسب ہیں۔ وہ شاید بھول گئے کہ دنیا حسب و نسب ہی کو مانتی تو اولاد فاطمہ زہرا سے زائد کون تھا مگر ان پر ستم کے پہاڑ ڈھائے جاتے رہے اور ان ستمگروں میں خود وہ اور انکے اسلاف بھی آتے ہیں اور اب وہ نہیں ہیں تو دشمنی ان کے ماننے والوں سے نکالی جاتی ہے۔

لیکن سچی بات سنتا کون ہے۔ خلیفہ بغداد اور ان کے لواحقین چاند کی طرف خاک اڑاتے رہے، چاند کا دامن تو میلا نہیں ہوا، خاک پھینکنے والوں کے منہ پر آگری جو طغرل بیگ نے اپنے رومال سے پونچھ ڈالی کہ وہ خلفائے فاطمیین سے انتقام لے گا۔

اتفاق کی بات ہے کہ ۴۶۰ ھ سے ۴۶۶ ھ تک مصر میں سخت قحط پڑا۔ ہزاروں آدمی فاقوں سے مرگئے اور کتنے ہی ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ ارباب حکومت سے جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ سب کیا مگر دوسری جگہوں سے کتنا غلہ منگوایا جا سکتا۔ نتیجے میں حکومت خود ڈانوا ڈول ہونے لگی جس کو بدر الجمالی وزیر نے سنبھالا اور اس موقع پر ہر ممکن ذریعہ استعمال کر کے تھوڑا بہت اناج فراہم کرتا رہا۔

بدر الجمالی پکا اثنا عشری تھا۔ اس نے مصر کو بڑے بحران سے نکالا، طرابلس الشام، صور اور مکہ کو دوبارہ فاطمی سلطنت میں شامل کیا پھر وہ مکہ کی گورنری پر بھیج دیا گیا۔

انہیں دنوں ترکی غلاموں کا زور بڑھ گیا اور اس کو توڑنے کے لئے نئے غلام بھرتی کئے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں میں رشک و حسد پیدا ہوا اور باہم جنگ کی

نوبت آگئی۔ ناصر الدولہ ابو علی حسین بن حمدان ترکی غلاموں کا سردار تھا۔ اس نے ترکوں کا ساتھ دیا اور کئی لڑائیوں کے بعد ترک فتحیاب ہوئے اور مصر میں ان کا طوطی بولنے لگا۔

یہ لوگ خلیفہ پر دباؤ ڈال کر بڑی بڑی رقوم وصول کرتے اور اس طرح انہوں نے خزانہ خالی کر دیا مگر ناصر الدولہ وصول ہونے والی رقموں میں سے ترکوں کو بہت کم دیتا لہذا اس سے ترکوں کی ان بن ہو گئی اور انہوں نے اس کو مصر سے نکلوا دیا۔

ناصر الدولہ نے ایک جمعیت فراہم کر کے قاہرہ پر چڑھائی کر دی۔ شاہی فوج نے شکست کھائی پھر ترکوں اور ناصر الدولہ میں اس شرط پر صلح ہو گئی کہ تاج الملوک شادی اس کا نائب ہوگا مگر یہ صلح عارضی ثابت ہوئی، بات بگڑتی ہی رہی۔ ناصر الدولہ نے خلیفہ کا وظیفہ بند کر دیا اور سکندریہ اور دمیاط فتح کر کے وہاں عباسی خلیفہ کا خطبہ جاری کر دیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ ناصر الدولہ نے بیرون ملک کے سنیوں سے ساز باز کر لیا تھا اور خود بھی سنی ہو گیا تھا لہذا وہ خلیفہ کو معزول کرنا چاہتا تھا۔ یہ حقیقت ترکوں کو معلوم ہوئی تو انہوں نے اس کے محل میں گھس کر اس کو قتل کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے بھائیوں فخر العرب اور تاج المعالی کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔

ان حالات سے مجبور ہو کر خلیفہ نے پھر بدر بن عبداللہ الجمالی کو مکہ سے طلب کیا۔ اس دوران صقلیہ میں بھی بدنظمی ہو گئی اور فرنگیوں نے ۴۶۴ ھ میں قصریانہ اور جرجنت کے سوا پورے جزیرے پر قبضہ کر لیا اور ۴۸۱ ھ میں یہ دونوں مقامات بھی لے لئے۔

بدر جمالی مصر کو سنبھالنے میں لگا ہوا تھا کہ ذی قعد ۴۸۷ ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا بیٹا محمد ملک ابو القاسم وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اسی دوران ۱۸ ذی الحجہ ۴۸۷ ھ کو خلیفہ مستنصر نے عالم فانی سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔

مستنصر بڑے صابر و شاکر فرمانروا تھے۔ قحط کے زمانے میں انہوں نے بھی رعایا کے ساتھ فاقے کئے۔ ناصر خسروان کے زمانے میں ایک سال تک مصر میں رہا

۴۷۹ھ میں شیخ الجبال حسن بن صباح تاجروں کے لباس میں قاہرہ پہنچے اور سات سال تک مستنصر کے مہمان رہے پھر مستنصر نے انہیں خراساں اور بلاد عجم کا داعی مقرر کیا۔ حسن نے پہلے باطنی طور پر اور علانیہ اسمٰعیلیت کی دعوت دی پھر قلعوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ چلتے وقت انہوں نے مستنصر سے پوچھا تھا کہ آپ کے بعد ہمارا امام کون ہوگا؟ مستنصر نے اپنے بیٹے نزار کا نام لیا تھا۔

مستنصر کے تین بیٹے تھے: نزار، ابوالقاسم احمد مستعلی اور محمد۔ مستعلی اپنے والد کے بعد خلیفہ ہوئے اور محمد کے بیٹے عبدالمجید میمون حافظ کو بعد میں یہ منصب ملا۔

ابو القاسم احمد مستعلی باللہ

وصیت کے مطابق نزار کو خلیفہ ہونا چاہئے تھا مگر وزیر سلطنت سے ان کی مخالفت تھی اس لئے اس نے احمد کو مستعلی کے لقب سے خلیفہ بنا دیا۔ نزار اسکندریہ چلے گئے جہاں الپتگین گورنر تھا۔ اسکندریہ والوں نے نزار کی بیعت کر لی اور انہوں نے مصطفیٰ لدین اللہ کے لقب سے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔

اس پر وزیر سلطنت افضل نے اسکندریہ میں انہیں گھیر لیا مگر شکست کھائی اس نے پھر حملہ کیا اور نزار کو الپتگین اور قاضی ابن عمار سمیت گرفتار کر لیا۔ مستعلی نے نزار کو دیوار میں چنوا دیا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ گرفتاری کے بعد نزار کا کیا حشر ہوا؟ کسی کو معلوم نہیں لیکن نزاری اسمٰعیلیوں کو یقین ہے کہ نزار کا بیٹا ہادی قید سے نکل گیا تھا اور اسی ہادی کے سلسلے سے الموت کے اسمٰعیلی امام پیدا ہوئے۔

اس طرح اسمٰعیلی دو فرقوں میں بٹ گئے: ایک مستعلویہ جو ہندوستان کے شیعہ بوہرے ہیں اور جن کا کہنا یہ ہے کہ مستنصر نے بعد میں مستعلی کے لئے وصیت کی تھی، دوسرا فرقہ نزاری کہلاتا ہے جو حسن بن صباح کا پیرو ہے اور آغا خانی خوجوں کے نام سے معروف ہے۔

۲۵ صفر ۴۹۵ھ کو مستعلی ۲۸ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ملک الافضل نے ان کے بیٹے ابو علی کو تخت خلافت پر بٹھا دیا اور اس کے کم سن ہونے

کے سبب پورا نظم سلطنت اپنے ہاتھ میں رکھا۔

مستعلی کے عہد ہی میں ملک شام سلجوقیوں اور رومیوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ رومیوں نے ۴۹۲ھ میں معرۃ النعمان اور بیت المقدس، ۴۹۳ھ میں جیفا اور ۴۹۴ھ میں قیساریہ اور ساحل شام کے دیگر مقامات بھی فتح کر لئے تھے۔ حلب و دمشق میں فاطمیوں کا خطبہ ۴۹۰ھ سے بند ہو گیا تھا۔ بحالت موجودہ شام سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔

ابو علی منصور آمر باحکام اللہ

مستنصر کے زمانے میں بھی وزیر سلطنت تمام مالی اور ملکی امور پر حاوی تھا، منصور کے عہد میں وہ تقریباً مطلق العنان ہو گیا اور خلیفہ عضو معطل بن کر رہ گئے پھر بھی اس دور میں ہر طرف امن، خوشحالی اور چہل پہل کے آثار نمایاں رہے۔ چند فتوحات بھی کی گئیں اور صلیبی مجاہدوں کو پسپا بھی کیا گیا لیکن بعض علاقے بھی ہاتھ سے نکل گئے اور ساحل فنیقیہ کے شہر جو بدر الجمالی نے فتح کئے تھے، ان کو مجاہدین نے لے لیا۔

۴۹۷ھ میں عکہ، ذی الحجہ ۵۰۲ھ میں طرابلس الشام چھن گئے اور مصری فوج اس وقت پہنچی جب ان شہروں کا جنازہ نکل چکا تھا۔ اسی سال عرقہ، بانیاس اور جبل الامان، ۵۰۳ھ میں بیروت، ۵۰۴ھ میں صیدا، ۵۱۱ھ میں قلعہ تبنین پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا۔ ۵۱۱ھ میں شاہ بردویل مصر پر حملہ آور ہو گیا مگر بیمار ہو جانے کے سبب واپس ہو گیا اور العریش پہنچ کر مر گیا۔

افضل سلطنت کا منتظم بھی تھا اور آمر کا نگراں بھی لیکن جوان ہو کر خلیفہ اس کے پند و نصائح برداشت نہ کر سکے، لاابالی طبیعت اور عیش پسندی سے وہ مناسب اور نامناسب کی تمیز کھو بیٹھے تھے۔ رمضان ۵۱۵ھ میں انہوں نے چند آدمی بھیج کر افضل کو قتل کرا دیا۔ مورخین نے اس کو باتدبیر اور صائب الرائے لکھا ہے۔

افضل کے بعد مامون ابو عبداللہ کو وزیر بنایا گیا مگر اس کو بھی اپنی حد سے تجاوز کرنے پر ۵۱۹ھ میں گرفتار کر لیا گیا اور ۵۲۱ھ میں مع اس کے بھائیوں کے قتل کر دیا گیا۔

ان واقعات کے ساتھ ساتھ خود فاطمیین میں بھی اتنا اختلاف ہو گیا تھا کہ نزاریہ فرقہ مستعلویوں اور ان کے اماموں کا سخت دشمن تھا۔ ۵۲۴ھ میں ایک دن آمر سیر سے واپس آرہے تھے کہ دس نزاری فدائیوں نے انہیں قتل کر دیا۔

مرتے وقت آمر نے کہا تھا کہ میری فلاں بیوی حاملہ ہے۔اس کے بیٹا ہو گا جو میرا جانشین ہو گا، میرا عم زاد عبدالمجید میمون اس کا کفیل ہو گا۔اس وصیت کے مطابق عبدالمجید کو حافظ لدین اللہ کے لقب سے نائب السلطنت بنادیا گیا لیکن حاملہ بیوی سے لڑکی پیدا ہوئی اس لئے بعد میں حافظ ہی خلیفہ کے منصب پر فائز ہو گئے۔

مقریزی لکھتا ہے کہ آمر کریم وجواد تھے۔ان کے متعلقین کثرت عطا سے بعیش وآرام بسر کرتے، رعایا بھی خوشحال تھی، وہ حافظ قرآن بھی تھے اور واقف فقہ بھی

بعض مورخین نے آمر کو لاولد لکھا ہے اور بعض نے تحریر کیا ہے کہ انہوں نے ایک لڑکا طیب نامی چھوڑا تھا، حافظ جس کے سرپرست قرار پائے تھے مگر طیب کے بالغ ہونے پر ان کی نیت میں فرق آگیا اور انہوں نے خلافت پر قبضہ کر لیا۔

ایسے مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ آمر نے اس کی بھی پیشین گوئی کی تھی اور اپنے اکابر دعاۃ کو ہدایت کی تھی کہ ایسے میں طیب کو روپوش کر دیں۔بوہریوں کے نزدیک اس امام طیب کی نسل کا امام ہر زمانے میں ہونا واجب ہے اور اسی کو وہ سیدنا کہتے ہیں۔

عبدالمجید میمون حافظ لدین اللہ

ابو علی احمد بن افضل ان کا وزیر تھا جو اثنا عشری تھا۔کہا جاتا ہے کہ حافظ نے بھی وہی مذہب اختیار کر لیا تھا اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے شیعوں کے بارہویں امام مہدی آخر الزماں کا نام سکے پر کندہ کرایا تھا، خطبے میں بھی اس کو شامل کیا تھا اور اسمٰعیل بن جعفر صادق اور حافظ کے نام نکلوا دیئے تھے۔

پھر ابو علی کی مطلق العنانی اور سخت گیری کے سبب وہ اس سے اکتا گئے اور عاجز ہو کر ۱۵ محرم ۵۲۶ھ کو ایک فرنگی کے ہاتھوں اس کو قتل کرادیا۔

ابن خلکان نے ابو علی احمد کے تدبر اور انتظامی صلاحیت کی تعریف کی ہے۔

ابو الفتح ابو علی احمد کی جگہ وزیر بنا تو اس نے بھی شاہ شطرنج بنادیا۔اس پر حافظ نے ۲۲ ذی الحجہ ۵۲۶ھ کو اسے بھی زہر دلوا دیا پھر دو سال تک کسی کو وزیر نہیں بنایا اور خود سارا انتظام دیکھتے رہے۔ ۵۲۸ھ میں انہوں نے بڑے بیٹے سلیمان کو ولی عہد اور وزیر مقرر کیا اور چند ماہ بعد اس کے انتقال پر منجھلے بیٹے حیدرہ کو نامزد کیا۔اس پر چھوٹے بیٹے حسن نے ہنگامہ کر دیا، لڑائی ہوئی۔مجبوراً حافظ نے اس کو دونوں منصب عطا کر دیئے اور اس نے تمام امور سلطنت پر قبضہ کر لیا مگر وہ بڑا سفاک اور ظالم ثابت ہوا۔اس نے بہت سے امیروں کو ہلاک کرا دیا چالیس امیر تو ایک ہی شب میں مارے گئے آخر حافظ نے اسکو زہر سے ہلاک کر ڈالا۔

اب حافظ نے ایک نصرانی امیر تاج الدولہ بہرام کو وزیر بنایا جو نصرانیوں کو مسلمانوں پر ترجیح دینے لگا۔امیر رضوان ایک سنی وزیر تھا۔اس کو اس نے دور دراز علاقے کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔رضوان نے وہاں پہنچ کر ایک فوج مرتب کی اور قاہرہ پر چڑھائی کر دی۔بہرام اسوان کی طرف بھاگ نکلا۔رضوان کے بھائی ابراہیم اوحد نے پیچھا کیا اور پکڑ کر لے آیا۔حافظ نے اسے نظر بند کر دیا اور بہرام نے رہبانیت اختیار کر لی۔

اس کے بعد رضوان نے حافظ کو تخت سے اتار دینے کی سازش کی حافظ کو خبر ہو گئی، انہوں نے اس کا گھر لٹوادیا ۔ وہ بھاگ کر سلجوقیوں کی پناہ میں چلا گیا اور ایک ترکی امیر کشتگین سے مدد لے کر مصر پر حملہ آور ہوا۔ ۵۳۴ھ میں اس نے باب النصر کے قریب اہل مصر کو شکست دی۔اس عرصے میں اس کے کئی ساتھی اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔حافظ نے حکمت عملی سے اس کو پکڑوالیا اور قید کر دیا لیکن وہ قید سے نکل بھاگا اور ایک بار پھر مصریوں کی ایک جماعت فراہم کر کے قاہرہ پر چڑھ دوڑا اور شہر میں داخل ہو گیا لیکن حافظ نے سوڈانیوں کی ایک جماعت بھیج کر اس کو قتل کرادیا۔

۵۴۴ھ میں حافظ کا انتقال ہو گیا، مقریزی نے انہیں کثیر المدارات، عارف اور علم نجوم کا ماہر لکھا ہے۔

ابو منصور اسمعیل ظافر بامر اللہ

ان کے زمانے وزیر وہ رہا جس کے بازو میں زور ہوتا۔ انہوں نے تخت نشین ہو کر ابو الفتح بن امصال کو وزیر بنایا چالیس روز بعد سکندریہ کے گورنر ابن السلار نے اسکو قتل کر کے وزارت حاصل کر لی اور ملک العادل کا لقب اختیار کر لیا ابن السلار کو اس کے سوتیلے بیٹے عباس نے تلوار کے گھاٹ اتار دیا اور خود وزیر بن گیا

خلیفہ کو محل کی چہار دیواری کے باہر کوئی اختیار نہ تھا۔ رقابتیں، سازشیں، فرقہ بندیاں اور بد عملی نے قاہرہ کو میدان کارزار بنا دیا تھا جس کے نتیجے میں صلیبیوں نے عسقلان پر قبضہ کر لیا۔

امراء ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ انہوں نے خلیفہ ظافر کو عباس کے قتل پر آمادہ کیا۔ عباس کو خبر ہوئی تو اس نے خلیفہ کو محل کے اندر قتل کرا دیا اور ظافر کے بھائیوں جبریل و یوسف اور حسن بن حافظ کے بیٹے پر الزام لگا دیا اور سب کو تہہ تیغ کرا دیا۔ پھر ظافر کے کم سن بیٹے کو تخت پر بٹھا کر تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

ابو القاسم عیسیٰ فائز بنصر اللہ

وہ برائے نام خلیفہ تھے، اصل بادشاہ خود عباس تھا۔ اس پر امراء، لشکری اور سوڈانی سب اس کے خلاف ہو گئے۔ ادھر ظافر کی نوعیت قتل کی بو پھوٹ گئی تھی۔ محل سے اس کی خبر طلائع بن رزیک گورنر اشمونین کو ملی۔ اس نے سپاہیوں اور خانہ بدوش عربوں کو ظافر کے غم میں سیاہ لباس پہنا کر قاہرہ کی طرف پیش قدمی کی۔ قاہرہ کے لشکری بھی اس سے جا ملے۔ عباس ۱۴ ربیع الاول ۵۴۹ھ کو اپنے بیٹے نصر اور دوست اسامہ کو لے کر شام کی طرف بھاگ نکلا۔

ظافر کی بہن نے زر کثیر دے کر فرنگیوں کی خدمات حاصل کیں۔ انہوں نے عباس کو راستے ہی میں جا لیا۔ لڑائی میں عباس مارا گیا۔ اسامہ فرار ہو گیا اور نصر کو ایک پنجرے میں بند کر کے قاہرہ لایا گیا۔ قصر کے اندر قینچیوں سے اس کی بوٹیاں کاٹی گئیں اور باب زویلہ پر پھانسی دیدی گئی۔

طلائع نے ربیع الاول ۵۴۹ھ میں قاہرہ پہنچ کر ظافر کی لاش آبائی قبرستان میں دفن کرائی اور خود ملک الصالح کے لقب سے وزارت عظمیٰ پر فائز ہوا۔

کم سن خلیفہ فائز نے جب سے اپنے چچاؤں کی لاشیں دیکھی تھیں، اس وقت سے مرض صرع میں مبتلا ہو گیا تھا، وہ نظم حکومت سنبھالنے کے قابل ہی نہ تھا اس لئے طلائع آزادی کے ساتھ امور ملکی و مالی کو انجام دیتا رہا۔ حتیٰ کہ ۱۷ رجب ۵۵۵ھ کو گیارہ سال کی عمر میں فائز کا انتقال ہو گیا۔ طلائع نے ابو محمد عبداللہ علی بن یوسف بن حافظ کو عاضد لدین اللہ کے لقب سے تخت نشین کر دیا۔

طلائع ایک وفادار وزیر تھا لیکن اس کی خود مختاری محل کی خواتین کو سخت ناگوار تھی۔ اس سلسلے میں بعض بدنما واقعات رونما ہوئے پھر بھی مورخین نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔

وہ قوم کا ارمنی اور عقیدے کا اثنا عشری تھا، شاعر، سخی، اہل علم و فضل کا قدر داں، خوش نویس، ادیب اور شاعر تھا، سادات کی بڑی عزت کرتا، انہیں انعام واکرام سے نوازتا رہتا اور بعض بزرگ سیدوں کے تو اس نے وظائف مقرر کر دیئے تھے۔ اس کی شخصیت رعب دار تھی مگر ہر شخص کو اس نے ملنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ نماز گزار تھا اور فرض و نوافل کا حد درجہ پابند، "کتاب الاعتماد فی الرد علیٰ اہل العناد" بحث امامت علی ابن ابی طالب میں اسکی تصنیف ہے۔ اس کے اشعار بھی دو جلدوں میں موجود ہیں، الجوهر فی الرد علی القدریہ اس نے ایک قصیدہ قدریہ کی تردید میں لکھا تھا۔

وہ ایک کھلا ہوا شیعہ تھا، مکہ و مدینہ اور مشاہد مقدسہ کے لئے نقد و جنس بھیجتا رہتا اور تمام روضوں کے مجاوروں کی خدمت بھی کرتا تھا۔

وزارت کی باگ ڈور ایسے وقت میں اس کے ہاتھ آئی تھی جب فاطمیین میں کسی قسم کا دم خم باقی نہ تھا، پھر بھی جتنا ملک رہ گیا تھا اس کا انتظام اس نے بڑی خوبی سے کیا، آخر عمر تک فرنگیوں سے لڑتا رہا اور اکثر موقعوں پر اس نے انہیں شکست فاش دی۔

ابو محمد عبداللہ علی عاضد لدین اللہ

دس برس کی عمر میں وہ خلیفہ ہوئے، طلائع نے اپنی بیٹی انہیں بیاہ دی۔

محل میں ایک عرصے سے اس کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں، آخر فائز کی چھوٹی پھوپھی نے ابن الداعی کو اس کے قتل پر مامور کر دیا اور ۱۹ رمضان ۵۵۶ھ کو جب طلائع دہلیز قصر سے گزر رہا تھا، تو ابن الداعی نے اس پر حملہ کر کے چھریوں کے پے در پے واروں سے اتنا زخمی کر دیا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا مگر مرنے سے قبل اس نے فائز کی پھوپھی کو بھی ٹھکانے لگوا دیا۔

عاضد نے اس کی وصیت کے مطابق اس کے بیٹے رزیک کو وزیر بنا لیا مگر اس کی وزارت کو صرف بارہ ماہ گزرے تھے کہ صعید کے گورنر شاور نے چڑھائی کر کے اس کو قتل کر دیا اور صفر ۵۵۸ھ میں خود وزیر بن گیا لیکن اس کے نو ماہ بعد طلائع کے صاحب الباب امیر ضرغام نے قاہرہ سے نکال دیا۔

شاور سنی المسلک تھا، وہ نور الدین محمود کے پاس دمشق جا پہنچا اور اس سے اس شرط پر مدد کا طلب گار ہوا کہ مجموعی محاصل میں سے فوج کی تنخواہیں نکال کر جو کچھ بچے گا، اس کا ایک تہائی دمشق بھیجتا رہے گا اور دمشق کے سپہ سالار شیرہ کوہ کو ہمیشہ قاہرہ میں رکھے گا۔

نور الدین محمود نے اسد الدین شیرہ کوہ اور اس کے بھتیجے صلاح الدین کو شاور کے ساتھ کر دیا۔ شیر کوہ لڑتا بھڑتا ۲ جمادی الآخر ۵۵۹ھ کو قاہرہ میں داخل ہو گیا، ضرغام گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا اور شاور بجبر وزیر بنا دیا گیا۔

شیر کوہ شہر کے باہر مقیم تھا، شاور نے عہد شکنی کی اور شیر کوہ کو حکم بھیجا کہ مصر سے نکل جائے۔ ناچار شیرہ کوہ نے بلبیس پر قبضہ کر کے مصر کے مشرق میں اپنی حکومت بنا لی۔

شاور نے اس اثناء میں فرنگیوں سے مدد حاصل کر لی اور ان کو لے کر بلبیس کا محاصرہ کر لیا۔ شیر کوہ صورت حال کو نازک دیکھ کر ذی الحجہ ۵۵۹ھ میں شام کی طرف واپس ہو گیا مگر ربیع الاول ۵۶۲ھ میں پوری تیاری کے ساتھ پلٹ کر

آیا اور مصر کے مغربی حصے پر قابض ہو گیا۔ شاور نے پھر فرنگیوں کو بلایا مگر شیر کوہ نے مشترک لشکر کو بمقام بابین شکست دی پھر سکندریہ کو مسخر کر لیا۔

شاور میں فرنگیوں کے بل پر اتنا دم خم تھا کہ اس نے سکندریہ کو حصار میں لے لیا۔ آخر شیر کوہ نے پچاس ہزار دینار تاوان دینے کی شرط پر صلح کر لی اور یہ بھی قید لگائی کہ جب فرنگی چلے جائیں گے تو وہ بھی مصر خالی کر دے گا اور اس معاہدہ کی رو سے شیر کوہ شوال ۵۶۲ھ میں شام واپس ہو گیا۔

فرنگیوں نے شاور سے ایک خفیہ معاہدہ کیا تھا کہ فرنگی سفیر قاہرہ میں رہے گا، بعض شہروں پر ان کا فوجی قبضہ ہو گا اور انہیں ایک لاکھ دینار سالانہ مصر سے بطور خراج ملتا رہے گا۔

شاور ایک طرح پر ان کی گرفت میں آ گیا تھا چنانچہ اس نے قاہرہ کی شحنگی ان کے حوالے کر دی اور شہر کے دروازے بھی ان کی سپردگی میں دے دیئے۔ انجام کار وہ مسلمانوں کو ستانے لگے۔

صفر ۵۶۴ھ میں بیت المقدس کے بادشاہ اموری نے اچانک مصر پر حملہ کر دیا اور بلبیس فتح کر کے اس کو پوری طرح لوٹا اور قاہرہ کو حصار میں لے لیا۔ اہل مصر نے قاہرہ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ان کا دباؤ بڑھتا گیا۔ آخر خلیفہ عاضد نے براہ راست نور الدین زنگی سے مدد کی درخواست کی۔ اس دوران شاور نے دس لاکھ دینار اور ایک روایت کے مطابق بیس لاکھ دینار دے کر عیسائیوں کو صلح پر راضی کر لیا۔

نور الدین زنگی نے مصر کی مدد کے لئے شیر کوہ کو صلاح الدین اور دوسرے امراء کے ساتھ آٹھ ہزار فوج دے کر روانہ کر دیا جس نے فرنگیوں کو شکست دے کر انہیں واپسی پر مجبور کر دیا پھر شاور کا سر کاٹ کر عاضد کے پاس بھیج دیا

عاضد نور الدین کے ممنون احسان تھے۔ انہوں نے شیر کوہ کو ملک المنصور اور امیر الجیوش کے خطابات دے کر وزارت کے عہدے پر فائز کر دیا۔ شیر کوہ نے گورنروں کے عہدوں پر اپنے معتمدوں کو مقرر کیا، فوجیوں کو جاگیریں عطا کیں لیکن وہ دو ماہ پانچ روز وزارت کر کے ۲۲ جمادی الآخر ۵۶۴ھ میں وفات پا گیا اور اس کے بھتیجے صلاح الدین نے ملک الناصر کا خطاب پا کر قلمدان وزارت سنبھال لیا

صلاح الدین نے ایک طرف داد دہش سے لوگوں کو اپنا ہمنوا بنایا، دوسری طرف عاضد سے بدظنی پیدا کرنے کے لئے عوام سے جا و بے جا رقوم وصول کرنا شروع کر دیں، پھر خلیفہ کو بھی نہیں بخشا، ان کو اس طرح لوٹا کہ ان کے پاس صرف ایک گھوڑا رہ گیا اور ایک دن وہ بھی منگالیا۔

یہ ہوا انجام المعز کے آخری جانشین کا، قاہرہ کا عظیم شہر جس کی یادگار ہے اور جامع ازہر نے جس کو غیر فانی بنا دیا ہے۔

صلاح الدین نے امور سلطنت پر حاوی ہو کر خلیفہ کو عضو معطل بنا دیا پھر ان یادگاروں کو مٹانا شروع کیا جن سے فاطمیین کی یاد تازہ ہوتی تھی۔

جمادی الاخر ۵۶۶ ھ میں دارالمعونہ کو مدرسہ شافعیہ میں اور دارالعدل مدرسہ مالکیہ میں بدل دیا، قضاۃ شیعہ کو معطل کر کے پورے ملک میں شافعی قاضی مقرر کئے، عاضد کے قاضی القضاۃ کامل کو معزول کر کے عبدالملک بن درباس کو مصر کا قاضی القضاۃ بنا دیا۔

اس وقت سے مصر میں مذہب شیعہ ناپید ہونے لگا اور اس کی جگہ مالکی اور شافعی مذہب نے لے لی۔ آخر صلاح الدین کے مظالم سے تنگ آ کر قصر خلافت کے داروغہ خواجہ سرا موتمن الخلافہ نے خفیہ خفیہ مصریوں کی ایک جماعت اکٹھا کر کے فرنگیوں کی مدد طلب کی لیکن یہ راز کھل گیا اور صلاح الدین نے دھوکے سے موتمن الخلافہ کو قتل کرا دیا۔ پھر قصر خلافت کے تمام ملازمین کو برطرف کر کے اپنے کارندے مقرر کر دیئے اور اپنے معتمد خواجہ سرا بہاء الدین قراقوش کو محل کا داروغہ بنا دیا۔

ظلم جب اپنی انتہا پر پہنچ گیا تو پچاس ہزار حبشیوں نے جمع ہو کر صلاح الدین کی فوج سے جنگ کی مگر حبشیوں کی نہ کوئی تربیت تھی اور نہ تنظیم، انہیں شکست ہوئی۔ ایک بڑی تعداد قتل ہو گئی، جو بچے وہ بھاگ نکلے۔

صفر ۵۶۵ ھ میں فرنگیوں نے دمیاط کا محاصرہ کیا۔ نور الدین نے اطلاع پا کر کمک روانہ کی اور خود شام میں رومی علاقے پر حملہ آور ہو گیا۔ نتیجے میں عیسائی دمیاط چھوڑ کر واپس ہو گئے۔ ۵۶۶ ھ میں صلاح الدین نے ایلہ فتح کر لیا۔

محرم ۵۶۷ ھ کے دوسرے جمعہ کو صلاح الدین نے مصر میں عاضد کا خطبہ موقوف کر کے مستضی عباسی کا خطبہ جاری کر دیا۔ عاضد اس کے بعد ہی عاشور ۵۶۷ھ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور اس کے ساتھ ہی سلطنت فاطمیہ کا ستارہ ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔

قرمانی لکھتا ہے کہ عاضد شدید التشیع تھے اور سب صحابہ میں مبالغہ کرتے تھے، خود صلاح الدین کو اعتراف تھا کہ اس نے عاضد سے زائد سخی اور کریم نہیں دیکھا۔ وہ بڑے نرم مزاج تھے اور رعایا سے بہت محبت کرتے تھے۔

عاضد کی وفات پر صلاح الدین نے ان کے تمام مال و اسباب پر قبضہ کر لیا اور اہل و عیال کو محل کے ایک گوشے میں قید کر دیا۔ وہ سب آہستہ آہستہ اسی عالم میں مر گئے۔ جو ۶۱ھ کے زندان شام کی پیروی تھی۔

یہ تھا پہلا جہاد صلاح الدین ایوبی کا جو اس نے شیعوں کے خلاف کیا اور عالم اسلام جس کے لئے بڑے فخر سے اس کا نام لیتا ہے۔

مسلمانوں میں ایک تفرقہ حضورؐ کی حیات دنیاوی کے اختتام پر پڑا تھا۔ کسی نے آپ کو صرف پیغمبر مانا اور کسی نے ایک سراپا ہدایت فرمانروا گردانا۔ یہ نظریاتی اختلاف آج تک پایا جاتا ہے۔

دوسرا فکری اختلاف شیعوں میں امام جعفر صادقؑ کی رحلت کے بعد پیدا ہوا اور ایک گروہ نے امام موسیٰ کاظمؑ کو امام تسلیم نہیں کیا بلکہ امام صادقؑ کے بیٹے اسمٰعیل کو امام قرار دیا جو آپ کے حین حیات انتقال کر چکے تھے۔ محمد بن اسمٰعیل کے یہ پیرو اپنی باطنی تحریک کو لے کر اٹھے اور انہوں نے مصر میں پی خلافت قائم کر لی اسمٰعیلیوں کے سلسلہ امامت میں چودہ تاجدار گزرے جن کے محولہ بالا حالات مسلم تاریخ کا حصہ ہیں۔ ان کے علاوہ امامت کا ایک موروثی تسلسل نزار سے بھی چلتا ہے، جس سے اسمٰعیلیوں میں کئی شاخیں ہو گئی ہیں۔

ایک شاخ حسن بن صباح کی ہے جنہیں شیخ الجبال بھی کہا جاتا ہے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ نزار کو دار پر چڑھا دیا گیا تھا مگر حسن بن صباح کے فدائی اس کو تسلیم نہیں کرتے، وہ نزار کی غیبت کے قائل ہیں۔

اسی طرح خلافت فاطمیین کے بعض فرمانرواؤں کا تشیع انہیں اثنا عشری ثابت کرتا ہے لیکن اس سے موضوع بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسمٰعیلی بو اہیہ اساسی طور پر شیعوں میں شامل تھے اور شامل ہیں اور بیشتر اصول شیعیت ان کی طرف سے مجروح نہیں ہوتے اس لئے ان کی سرگزشت تاریخ شیعان علی کا حصہ ہے۔

فاطمیین مصر کی دو سو پچھتر سالہ تاریخ خلافت یقیناً ماضی کے عروج و زوال کی وہ داستان ہے جس کے سامنے صرف خلافت بغداد قرطبہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ بغداد و قرطبہ کے فرمانرواؤں نے انسان اور انسانیت کے لئے جو کچھ کیا، اس کو تاریخ نے محفوظ کرلیا ہے لیکن قاہرہ کی خدمات انسانی اور تجلیات عمرانی زیر قلم صفحات کی ضرورت ہیں۔

مشرقی تہذیب میں رعایا کو بادشاہ کی اولاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فاطمیین مصر نے اس کی عملی تصاویر پیش کیں۔ وہ خود کتنے بڑے انسان اور کس قدر ہادیانہ صفات کے حامل تھے؟ اس کی صراحت ابن اثیر، ابن خلکان، ابن خلدون، مقریزی اور دیگر مورخین نے کی ہے اور علیحدہ علیحدہ خلفائے مصر کی سیرت و کردار کے جو خاکے پیش کئے ہیں، انہیں دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ شریف بھی تھے، زاہد و پاکباز بھی، مفکر و سیاستداں بھی، عالم و فقیہہ بھی اور ان کی اکثریت اپنے پہلو میں ایک دل دردمند رکھتی تھی۔

فاتحین عالم میں ان کا شمار نہ کیا جائے، تب بھی اہل سیف اور شجاع تو مانا ہی جائے گا۔ ان کی شوکت و سطوت، رعب و داب انہیں سلاطین اعظم کی صف میں لاکھڑا کرتا ہے لیکن اس بلندی پر ہونے کے باوجود وہ جابر و ظالم کہے نہیں جا سکتے

ان کی سلطنت بھی دوسری سلطنتوں کی طرح دور دور تک پھیلی پھر اپنے مرکز کی طرف سمٹ کر ایک نئے فاتح صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں فنا ہو گئی لیکن انہوں نے جو اپنے نقوش قدم چھوڑے ہیں، وہ آج بھی باقی ہیں اور انکی قائم کی ہوئی علمی درسگاہ آج بھی عالم اسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔

جسٹس امیر علی نے ہسٹری آف سیراسنز میں ان کی عمرانی اصلاحات کا ایک مختصر سا قلمی خاکہ پیش کیا ہے جو ان کی عظمت کے ایک پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔

فاطمئین کے نقوش قدم

۲۴ جمادی الثانی ۳۵۹ھ مطابق ۱۴ مئی ۹۶۹ء کو جوہر نے قاہرہ کی داغ بیل ڈالی تھی اور المعز کے پہنچنے سے قبل فصیلیں بن چکی تھیں۔ عالیشان عمارتیں آناً فاناً تیار ہو گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت خوبصورت شہر وجود میں آگیا جس کی پختہ سڑکیں باہر مضافات تک چلی جاتی تھیں اور حارات کہلاتی تھیں۔ بازاروں کو اخطاط کہتے تھے جو فصیل تک جا کر ختم ہوتے تھے۔ خلیفہ کا خاص محل جس میں بارہ گنبد دار ایوان تھے، شہر کے مشرقی حصہ میں واقع تھا اور جس کا نام قصر الکبیر الشرقی یا قصر المعزیٰ تھا۔ محل کے دس پھاٹک تھے، ہر پھاٹک پر فوج کا ایک دستہ متعین رہتا، ہر دستہ میں پانچ سو سپاہی پیدل اور پانچ سو سوار ہوتے۔ محل کے بارہ ہزار خدمتگار تھے اور اس سے ایک زمین دوز راستہ دوسرے عالی شان محل کی طرف جاتا تھا جو دریائے نیل کے کنارے شہر کے مغربی حصہ میں واقع تھا اور جس کو قصر المغربی یا قصر البحر کہتے تھے۔ شہر کے اندر اور باہر خلیفہ کے اور بھی کئی محل اور مکان تھے جن کی پچی کاری اور گلکاری چین کے نقش و نگار کو مات کرتی تھی اور کندن کی جھلک ستاروں سے چشمک زنی کرتی تھی۔ امیروں کے محلات کاری گری کا اعلیٰ نمونہ تھے، مگر رقبے میں شاہی محلوں سے کم تھے۔ خوبصورت باغات کے مناظر، ان کے گرد مکانات کی قطار، ہوشمند اور طرار سیاحوں کو بھی ورطہ حیرت میں ڈال دیتی تھی۔

پندرھویں اور سولھویں صدی کے یورپین سیاح اس پر روضہ رضواں یا باغ جناں کا گماں کرتے تھے۔ مسجدیں، کالج، شفاخانے، بڑے بڑے ہوٹل اور سرائیں شہر میں بیشمار تھیں۔ چار جامع مسجدیں تھیں جن کی شان و شوکت دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی تھیں، بی فاطمہ کا بنایا ہوا ایک امام باڑہ بھی تھا جس کو حسینیہ کہا جاتا اور جس کی عمارت ایسی خوبصورت تھی کہ چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی ہو گی۔ اس امام باڑے میں ایام عاشورہ میں مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔

مردوں اور عورتوں کے واسطے عالیشان حمام بنے ہوئے تھے۔ عورتوں کے حمام فوراً شناخت ہو جاتے تھے کیونکہ ان کی ظاہری نمائش مختلف تھی۔ منڈیوں میں بیس ہزار دوکانیں تھیں جو دنیا کی پیداواروں سے بھری رہتیں اور جن کی آراستگی دیکھ کر گمان ہوتا کہ رئیسوں کی کوٹھیاں ہیں۔ شہر کے گرد ایک بڑی مضبوط فصیل تھی۔ چند بڑے بڑے دروازوں کے نام حسب ذیل تھے۔ الباب النصر، الباب الفتوح، الباب القنطرہ، الباب الذویلہ اور الباب الخلیج۔ متمول لوگوں کی دلچسپی بازوں اور شکروں سے پرندوں کے شکار اور کتوں سے ہرنوں کا تعاقب کرانے پر مرکوز تھی۔ دریا کے کنارے رہنے والے ملاح دریائی گھوڑے شکار کرتے تھے۔

سلطنت کے انتظامی محکمے اور صیغے عباسیوں کی طرح تھے مگر چند کے نام مختلف تھے اور ان محکموں میں نمایاں فرق بھی تھا۔ مصر میں امیرالجیوش کا بڑا اقتدار ہوتا تھا۔ وہ کمانڈر انچیف اور وزیر دونوں کا کام کرتا تھا اور کہا جاسکتا ہے کہ امیر الجیوش ہی بادشاہ ہوتا تھا۔ ابتدائی خلفاء کے عہد میں امیرالجیوش صرف اپنا منصبی کام ہی کرتا تھا مگر مستنصر کے عہد سے بنی فاطمہ کا آفتاب ڈھلنا شروع ہوا اور سازش اور گروہ بندی نے تدبر کی جگہ چھین لی تو سب نفسانفسی میں مبتلا ہوگئے۔ صرف سیاسی حیثیت ہی عزت و حرمت کا ذریعہ رہ گئی۔ علماء کی جگہ جاسوسوں نے لے لی اور ایماندار و باوفا اور آزاد طبع لوگوں کے بجائے خوشامدیوں اور منافقوں کی قدر ہونے لگی۔ حکام نے لوگوں میں پھوٹ ڈلوانے اور سازشیں کرانے کو ہی ملک داری سمجھ لیا مگر ان سفیہانہ کوششوں کا خمیازہ آخر خود انہیں کو بھگتنا پڑا۔

خلفائے فاطمی علم و ہنر کے بڑے مربی تھے۔ انہوں نے دارالعلم، کتب خانے اور دارالحکمتہ قائم کئے تھے۔ بڑی بڑی کتابیں، علم ہندسہ اور سائنس کے متعلق آلات فراہم کئے تھے، لکھنے کا سامان مفت دیا جاتا۔ خلفاء علمی مجلسیں منعقد کرتے جن میں مدارس اعلیٰ کے پروفیسر منطقی، مہندس، فقیہ، حکیم اپنا اپنا خاص لباس یعنی خلع پہن کر شریک ہوتے تھے۔ انگریزی یونیورسٹیوں میں جو گاؤن

گریجویٹوں کو دیئے جاتے ہیں وہ بالکل اسی طرز کے ہیں جس طرز کے خلع ہوتے تھے دو لاکھ ستاون ہزار دینا سالانہ کالجوں، پروفیسروں اور تعلیمی افسروں کی تنخواہوں، تعلیمی سامان اور علمی آلات پر خرچ کئے جاتے اور بطریق شائستہ رعایا سے وصول کئے جاتے تھے۔ ہر علمی شاخ کی تعلیم عام تھی۔ علم ہیئت کو شائع کرنے کے لئے رصد گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ ایشیا اور ہسپانیہ سے بڑے بڑے عالم اور سائنسداں ان ایوان ہائے علوم و فنون کو زینت دینے کے لئے بلائے گئے تھے۔

بنی فاطمہ کی تاریخ کو مکمل کرنے کے لئے اس عجیب تحریک کا ذکر ضروری ہے جو انہوں نے اپنی رعایا میں علم پھیلانے کی غرض سے پیدا کی تھی، وہ یہ تھی کہ بنی فاطمہ اپنے فرقے میں غیر مذاہب کے لوگوں کو شامل کرنے سے جو سیاسی فائدہ مترتب ہو سکتا ہے اس کو نظر انداز نہ کرتے۔ بڑے دارالحکمتہ کے متعلق ایک گرانڈ لاج تھی جس میں اسمٰعیلی مذہب کے سراپا راز اصول سے واقف ہونے کے خواہش مندوں کو اس مذہب کے عقائد کی تعلیم دی جاتی تھی، ہفتہ میں دو بار یعنی شنبہ اور دوشنبہ کو داعی الدعاۃ جو وزیر یا قاضی القضاۃ ہوتا، جلسہ کا انعقاد کرتا جس میں مرد اور عورتیں سفید لباس زیب تن کئے شامل ہوتی تھیں۔ ان جلسوں کو مجالس الحکمتہ کہتے تھے۔ کارروائی شروع کرنے سے قبل داعی الدعاۃ، گرانڈ ماسٹر کا یعنی خلیفہ کا انتظار کرتا اور جب وہ آجاتا تو داعی الدعاۃ اس کو وہ لیکچر پڑھ کر سناتا جو نئے ممبروں کو سنانا ہوتا تھا، اس پر خلیفہ اپنے دستخط ثبت کر دیتا تھا۔ لیکچر سن چکنے کے بعد نووارد، داعی الدعاۃ کے ہاتھ پر بوسہ لیتے اور گرانڈ ماسٹر کے دستخط کو پیشانی سے لگاتے۔ مقریزی نے اس لاج کے مختلف درجوں کا ذکر کرتے ہوئے فریمنسری کی تاریخ کا نقشہ پیش کیا ہے جو حقیقتاً قاہرہ کی لاج سے نقل کی گئی ہے۔

دارالحکمتہ کی سیاسی شان تو اس کے بانیوں کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی مگر اس کی علمی شعاعوں نے مملوکوں کی افراتفری کے زمانے تک مصر کے شہروں کو منور رکھا اور اس کے جو راز تھے وہ زمانہ دراز گزر جانے کے باوجود آج تک ویسے ہی ہیں اور مختلف مذہب و ملت کے اقوام و ممالک میں اسی طرح اپنی شان دکھا رہے ہیں۔

قاہرہ میں بے شمار کالج تھے۔شاہی کتب خانے میں نہایت خوشخط اور کمال خوبصورتی سے مجلد کی ہوئی ایک لاکھ قلمی کتابیں تھیں جو طلباء کو بلا تامل مستعار دی جاتیں۔فاس قیروان اور دیگر افریقی شہروں میں علم کے دریا بہہ رہے تھے۔ فاس کے کتب خانہ اعظم میں یونانی مورخ لیوی کی تصنیفات کا مکمل عربی ترجمہ موجود تھا۔

شیخ الجبال

تذکرہ فاطمئین کے ذیل میں وہ فرقہ نظرانداز نہیں ہو سکتا جس نے محمد بن اسمٰعیل المعروف بہ امام مکتوم سے اپنا رشتہ تو برقرار رکھا لیکن عقائد کی حد تک اپنا راستہ الگ بنالیا، یہ فرقہ حسن بن صباح کا ہے جو نزار کی امامت کا قائل ہے۔

حسن بن صباح، چونکہ نزار کی خدمت میں رہتے تھے اور ان کی عظمت کے قائل تھے لہذا ان کے متبعین اپنے کو نزاری کہتے ہیں۔ ابن خلدون نے ان کے نظریات کو قرامطہ کے مشابہ قرار دیا ہے جبکہ جسٹس امیر علی کا خیال ہے کہ حسن بن صباح مزدک و مانی کے فلسفے سے متاثر تھے۔حقیقت جو کچھ بھی ہو لیکن حسن بن صباح کے عقائد اصل اسمٰعیلیوں سے مختلف تھے جو فی زمانہ بواہیر کہلاتے ہیں۔

کسی مورخ کے تبصرے سے قطع نظر کرکے "حسن" کی شخصیت اور مبلغ علم کو دیکھا جائے تو وہ رے کے باشندے تھے۔مختلف درسگاہوں میں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی، نجوم، ہندسہ اور ریاضیات کے ماہر تھے اور اگلی زندگی کو سامنے رکھا جائے تو ایک عالی دماغ، مہم جو اور مستقل مزاج انسان تھے، تب ہی فاطمی خلیفہ مستنصر نے دعوت باطنیہ دینے کے لئے منتخب کیا تھا۔

یہ خدمات انہوں نے بڑی خوبی سے انجام دیں پھر اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہو گئے جو نجانے کب سے ان کے ذہن میں پل رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ فاطمی داعی احمد بن غطاش کے اثر سے باطنی تحریک کے داعی بنے تھے اور اس کے بعد مستنصر کا تقرب حاصل کیا تھا۔بہر طور انہوں نے شام، جزیرہ، دیار بکر، خراسان، کاشغر اور ماوراء النہر کا دورہ کیا اور قلعہ "الموت" کو اپنے مقصد کے لئے تجویز کیا جو ایک علوی کی ملکیت تھا۔حسن نے اس سے تعلقات استوار کرکے قلعہ پر قبضہ کرلیا، پھر ان کے

مریدوں کا حلقہ وسیع تر ہوتا رہا اور دشمنوں کو راستے سے ہٹوا دینا ان کا شغل ہو گیا۔

اسی قلعہ سے حسن نے نظام الملک طوسی پر حملہ کرایا تھا اور سلجوقیوں کا عظیم وزیر ان کے فدائیوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترا تھا، پھر انہوں نے قلعہ خالنجان، اسویا، الرمل، ملاذخان اور کتنے ہی دوسرے قلعوں پر اپنے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔

حسن بن صباح کی تعلیمات کتنی اثرانگیز تھیں، اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی جنت ارضی اتنی دلکش ضرور تھی کہ آدمی ایک بار اس میں داخل ہوتا تو باہر آنے کا جی نہ چاہتا پھر حشیش کا استعمال اس سے قبل شاید دوسرے لوگوں نے نہ کیا ہو یا پھر عام نہ ہوا اور حسن بن صباح اولین اشخاص میں سے ہیں جو اس کو حربے کے طور پر بروئے کار لائے۔اس سلسلے میں یقیناً حاشیہ آرائی کی گئی ہے مگر اس کو بالکل بے بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔

وجوہ پر یقینی رائے زنی ممکن نہیں مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شیخ الجبال کا ایک اشارہ ان کے مرید کے لئے کافی ہوتا۔اس کے بعد کسی کی جان لینا تو درکنار، وہ خود اپنے گلے پر چھری پھیر سکتا تھا۔

یہی سبب تھا جو کوئی چھوٹا بڑا اپنے کو فدائیوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ سمجھتا۔

باطنیت کے پرستاروں کا طریق جنگ عام سپاہیوں کی طرح نہ تھا۔ وہ پہلے جاسوسوں کے انداز سے کسی مقام پر اپنی جگہ بناتے پھر متعلق شخص یا اشخاص پر حملہ کر دیتے۔ وہ بڑے دلیر اور جیالے ہوتے مگر حربوں کا استعمال ہمیشہ کمین گاہوں سے کرتے اور حیلہ سازی کرکے بڑے بڑے کام سرانجام دیتے۔ نظام الملک کو بھی انہوں نے اسی طرح مارا تھا۔

ان کے قلعے ہر طرح مضبوط ہوتے۔ان میں مہینوں کے دفاع کا سامان موجود رہتا۔آلات حرب و ضرب کے ساتھ ساتھ ان قلعوں میں زر و جواہر کے انبار لگے رہتے جو لوٹ کے ہوتے۔فاطمئین مفتوحہ ممالک سے خراج وصول کرتے ہیں، باطنئین اپنی پناہ میں لئے ہوئے افراد سے زر ماہانہ یا زر سالانہ وصول کرتے تھے۔

یقیناً انہوں نے امن عامہ کو تباہ کر دیا تھا لیکن عوام ان کی زد سے محفوظ

تھے، ان کا نشانہ صرف دشمن یا خواص ہوتے، انہیں پر وہ خنجر آزمائی کرتے اور وہی
ان کا نشانہ ستم بنتے تھے۔

شیخ الجبال کی حیثیت ایک فرقے کے رہنما کی ہے۔ متبعین کا کہنا ہے کہ وہ
اپنے مسلک کی اشاعت خفیہ خفیہ تو کر چکے تھے، اب انہیں کھلے بندوں اپنا پیغام
پہنچانا تھا، اگر وہ مٹھی بھر سرفروشوں کو لے کر میدان میں نکلتے تو ان کا بھی وہی حال
ہوتا جو بویہی، عقیلی اور مزیدی حکمرانوں کا ہوا لہذا انہوں نے اپنے لئے ایک نیا
راستہ تجویز کیا اور چند قلعے مسخر کر کے انہیں حصن حصین بنا لیا تا کہ قوت حاصل ہو
جانے کے بعد سلجوقیوں کے مدمقابل آسکیں لیکن یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔

قتل و غارت کے لئے استدلال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے عام فاتحین کی
طرح زمین کو انسانی خون سے لالہ زار نہیں کیا بلکہ چیدہ چیدہ افراد کو قتل کیا جس
سے ایک خوف اور دہشت پھیلی مگر عام آدمی اس سے متاثر نہیں ہوا اسی لئے
داعئین جب عوام میں گھس کر اپنے نظریات پیش کرتے تو دو چار آدمی اسکو قبول
ضرور کر لیتے تھے۔

باطنی مقلد شیخ کو فاتحین عالم کے مقابلے میں لا کھڑا کرتا ہے تو کہتا ہے کہ
لوٹ مار اور مال غنیمت میں دونوں برابر ہیں مگر فاتحین کے دامنوں پر بے گناہ
شہریوں کے خون کے دھبے نظر آتے ہیں، شیخ الجبال کو کسی عوامی خونریزی میں ملوث
نہیں کیا جا سکتا، وہ اپنے مضبوط قلعوں کے ساتھ دولت اس لئے اکٹھا کر رہے تھے
کہ جس طرح طغرل بیگ نے آہستہ آہستہ سلجوقی حکومت کو پھیلایا تھا اسی طرح
باطنی حکومت کی داغ بیل ڈالیں۔

حقیقت جو کچھ بھی ہو لیکن حسن بن صباح کا اپنے قلعوں کو مستحکم کرنا کسی
مقصد سے خالی نہ تھا مگر وقت نے مساعدت نہ کی اور سلجوقیوں نے ان خلاف لشکر
کشی شروع کر دی۔

فدائیوں کے طریقہ کار میں یرغمال بنا کر استحصال کرنا بھی شامل تھا جس
سے انہیں بے پناہ دولت ملتی تھی۔ سلجوقی فوجوں نے کئی مرتبہ ان کے خلاف اقدام
کیا مگر خود نقصان اٹھا کر پسپا ہوئے۔

ایک مرتبہ انہوں نے اصفہان میں سلطان برکیارق کے بیٹے محمد کو گھیر لیا
تھا اور سلطان کو اس کی جان بچانے کے لئے ان کا مطالبہ پورا کرنا پڑا تھا، اس کے
بعد برکیارق نے ان کے خلاف اعلان جنگ کرا دیا۔ فوجی دستے اطراف میں پھیل
گئے اور فدائی چن چن کر قتل کئے جانے لگے لیکن مرنا ان کے لئے شیخ کی تعلیمات کے
مطابق حاصل حیات تھا، اسی لئے وہ کسی امیر پر آزمائش ستم کرتے اور خود گھر جاتے
تو اس مقام پر اپنے کو بھی ہلاک کر ڈالتے ...... چنانچہ برکیارق کے حین حیات
فدائین کا استیصال نہ ہو سکا۔ سلطان محمد جب سلجوقیوں کا فرمانروا ہوا تو اس نے
قلعہ شاہ در کا محاصرہ کیا جس کا سربراہ احمد بن غطاش تھا جس کو حسن بن صباح کا
استاد یا دست راست کہا جاتا۔

محصورین کے سلجوقیوں سے مقابلے ہوتے رہے۔ آخر احمد بن غطاش نے
درخواست کی کہ ان کو قریب کے قلعہ میں نصف نصف کر کے جانے کی اجازت دی
جائے تو وہ قلعہ خالی کر دیں گے۔ سلطان محمد نے منظور کر لیا مگر جب آدھے فدائی
جا چکے تو سلجوقیوں نے قلعہ منہدم کرا دیا، اسی (۸۰) فدائی مع احمد بن غطاش کے
مارے گئے۔

اسی زمانے میں ابراہیم استرا بادی کو بغداد میں قتل کیا گیا۔ اس کے بیٹے
بہرام نے شام پہنچ کر قلعہ بانیاس پر قبضہ کر لیا اور وہاں سے اپنے مسلک کی تبلیغ
کرنے لگا، پھر اس نے اس پر اکتفا نہیں کی اور ایک فوج مرتب کر کے بعلبک کے
حکمراں ضحاک پر حملہ کر دیا۔ سخت لڑائی کے بعد بہرام کو شکست ہوئی اور وہ رزم گاہ
میں کام آیا۔

علی بن تفتگین باطنی تعلیمات سے متاثر تھا۔ اس عرصے میں اس نے اطراف
میں تبلیغی مہمات روانہ کیں۔ ابو علی وزیر نے بھی اس سے تعاون کیا، پھر اس نے
عوام کے خوف سے قلعہ بانیاس عیسائیوں کے حوالے کر دیا۔

اس نواح میں پہلے ہی سے باطنیوں کے کئی قلعے تھے جو ایک دوسرے کے
متصل تھے، قلعہ مصیات ان میں سب سے بڑا تھا۔ ۵۷۲ھ میں جب صلاح الدین
نے شام فتح کیا تو اس قلعہ کو گھیرے میں لیا پھر اپنے ماموں کے کہنے سے محاصرہ اٹھا لیا

پھر سلجوقی حکمرانوں نے کئی قلعوں پر یلغار کی اور ان میں سے بعض کو فتح بھی کر لیا مگر قلعہ الموت اپنی جگہ پر رہا۔

اس کے بعد جلال الدین بن علاء الدین خوارزم شاہ جب ہندوستان سے واپس ہوا تو اس نے آذر بائیجان اور آرمینیا کی تسخیر کے بعد اس قلعہ کا بھی محاصرہ کیا تھا مگر اس کو فتح نہ کر سکا اور باطنیوں کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں۔

تاتاریوں کے خروج کے زمانے میں باطنیوں کے حملے بھی بڑھ گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہلاکو نے اپنے دور اقتدار میں باطنیوں کی گوشمالی کی تھی اور شیخ الجبال کے ایک ساتھی خور شاہ کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا تھا لیکن خود شیخ الجبال کے سلسلے میں مورخین میں اختلاف ہے، کسی نے یقین کے ساتھ کچھ نہیں لکھا۔

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ سلطان بیبرس ملک الظاہر نے مابقی قلعوں کو منہدم کرایا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ دشوار نہیں کہ حسن بن صباح کے انجام تک پہنچنے کے بعد بھی باطنی تحریک ختم نہیں ہوئی، ان کے قلعے بھی جابجا باقی رہے جو امتداد زمانہ میں دھیرے دھیرے ختم ہو گئے اور باطنی بھی اپنا لائحہ عمل بدل کر عام شہریوں میں شامل ہو گئے۔

اس مسلک کے لوگ آج بھی ساری دنیا میں موجود ہیں جو اسمٰعیلی خوجہ کہلاتے ہیں۔ شیخ الجبال حسن بن صباح سے ان کا سلسلہ امامت چلتا ہے جو آغا خان کی نسل میں ایک کے بجائے دوسرے کو منتقل ہو جاتا ہے۔

ان کے عقائد شیعوں سے بہت مختلف ہیں اور امام مکتوم محمد بن اسمٰعیل کے مسلک سے بھی علیحدہ ہیں پھر بھی وہ حضرت علیؑ کو نہ صرف امام اول مانتے ہیں بلکہ ان کے عقیدے میں نصیریت کی جھلک بھی پائی جاتی ہے اس لئے تاریخ شیعان علیؑ سے انہیں نکالا نہیں جا سکتا۔

اندلس سے شیعوں کا براہ راست کوئی تعلق کبھی نہیں رہا۔ ایک خیال یہ ہو سکتا ہے کہ موسیٰ بن نصیر، چونکہ دشمن اہل بیت نہ تھا، اس لئے ممکن ہے کہ طارق بن زیاد کی فوج میں کچھ شیعہ شامل ہوں جنہوں نے قیام اندلس میں اپنی نسل چھوڑی ہو۔ اس کے بعد اموی عہد میں تو اس فرقے کے وجود کا امکان ہی نہ تھا چ

حکومتیں بدلتی رہیں، طوائف الملوکی میں جب چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہوئیں تو بعض پر شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید وہ محب اہل بیت ہوں جیسے بنی حمود جو نفس ذکیہ کی اولاد میں سے تھے البتہ مغرب اقصیٰ کی صورت حال مختلف تھی وہاں کوئی قبیلہ شیعہ ہو یا نہ ہو لیکن آل رسول کی محبت کا دم ضرور بھرتا تھا۔

مراقش کی ادریسی سلطنت ختم ہو چکی تھی لیکن بنی ادریس کی تبلیغ نے اتنا کام کیا تھا کہ صحرا میں جہاں کہیں کوئی آبادی تھی وہاں اہل بیت کی عظمت کے چراغ روشن تھے۔ ایسی ہی ایک حکومت "اشراف سعدئین" کی بھی تھی جسکے سر خانوادہ رسالت کے سامنے ہمیشہ عقیدت سے جھکتے رہے۔

اشراف سعدئین

مشہور تھا کہ اہل سجلماسہ نے جب سے ایک سید کو لا کر بسایا، ان کی برکت سے فصلوں کو فیض پہنچا ہے لہذا اہل درعہ بھی حجاز کے شہر ینبع النخل سے نفس ذکیہ کی اولاد سے ایک بزرگ کو جا کر لے آئے ان کی آمد بھی درعہ کی فصلوں کے لئے سعد ثابت ہوئی اس لئے وہ سعدئین کہلائے۔

ابو محمد عبداللہ اول

اس نے مسلمانوں کی ایک جماعت لے کر پرتگیزیوں کا مقابلہ کیا تھا اور ۹۱۷ھ میں انہیں سوس سے نکال دیا تھا لہذا سوس کا ہر دلعزیز بادشاہ بن گیا، نیک نفس، متقی، مستجاب الدعوات تھا، ۹۳۳ھ میں اس نے انتقال کیا۔

ابو العباس احمد اول

اس نے پرتگیزیوں کے کئی حملوں کو رد کیا تو ۹۳۰ھ میں اہل مراقش نے خود شہر اس کے حوالے کر دیا، فاس کے وطاسی بادشاہ نے چڑھائی کی تو اس کو شکست دی، ۹۴۰ھ میں اس کے بھائی محمد الشیخ نے اسے گرفتار کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔

ابو عبداللہ محمد، ...، المعروف بہ الشیخ

اس نے ۹۴۸ھ میں اپنے ملک سے پرتگالیوں کو نکال دیا، ۹۵۵ھ میں ایک خونریز جنگ کے بعد مکناسہ اور ۹۵۶ھ میں وطاسیوں کا دارالسلطنت فاس فتح کر لیا۔ ۹۵۷ھ میں اس نے ترکوں سے تلمسان چھین لیا اور کل مغرب اقصیٰ کا بادشاہ بن گیا۔ وہ سلیمان پاشا والی قسطنطنیہ کو برا کہتا تھا اور ان سے صلح منظور نہ کرتا اس لئے ترکوں نے سازش کر کے ۹۶۴ھ میں اسے قتل کرا دیا پھر مراقش کے گورنر نے ابوالعباس اور اس کے بیٹوں کو بھی دھوکے سے مروا دیا۔ محمد بڑا مدبر، عالی دماغ اور باہمت بادشاہ تھا۔

ابو محمد عبداللہ الغالب باللہ

دور حکومت کے پہلے ہی سال حسن پاشا والی الجزائر نے تلمسان پر حملہ کیا مگر شکست کھائی۔ ترکوں سے اس کو سخت نفرت تھی، ان کی ضد پر اس نے حجر بادیس اس شرط پر اسپین کے حوالے کر دیا کہ وہ ترکوں پر بحری حملہ کرتا رہے گا۔ ۹۸۰ھ میں مغربی ساحل پر پرتگیزیوں نے حملہ کیا تو ان کے جہازوں کو غالب نے لوٹ لیا جن پر پندرہ سو توپیں تھیں۔ ۹۸۱ھ میں وہ وفات پا گیا۔

ابو عبداللہ متوکل

اس کے چچا عبدالملک اور احمد قسطنطنیہ سے پانچ ہزار کا لشکر لے کر حملہ آور ہوئے، عرصے تک لڑائی ہوتی رہی، ۹۸۳ھ میں متوکل فرار ہو گیا۔

عبدالملک معتصم

متوکل اسکے خلاف سباسچین شاہ پرتگال کو چڑھا لایا، زبردست جنگ ہوئی جس میں متوکل اور سباسچین دونوں مارے گئے۔ اسی دوران معتصم کا انتقال ہو گیا اور احمد اسکی جگہ بادشاہ ہوا۔ معتصم ترکوں کے رنگ میں رنگ گیا تھا مگر متوکل اپنی روش پر قائم تھا۔ وہ زبردست عالم اور مناظر تھا۔

احمد منصور باللہ

اس سے ترکوں کے تعلقات اچھے تھے اور یورپ کے بعض حکمرانوں سے

بھی۔ اس نے اپنی سلطنت کو بہت وسعت دی، قصر بدیع اس کی یادگار ہے۔ بیدار مغز اور دور اندیش حکمراں تھا، ۱۰۱۲ھ میں مر گیا۔ اس نے ایک خاص خط ایجاد کیا تھا جس میں حروف کے بجائے اعداد استعمال کئے جاتے اور ان اعداد کا مطلب صرف اس فن کو جاننے والا ہی سمجھ سکتا۔ یورپ کا خط شغرہ اسی کی نقل ہے۔

زیدان

وہ فاس کا بادشاہ ہوا تو مراقش میں اس کا چھوٹا بھائی ابو فارس تخت پر بیٹھا زیدان نے دوسرے بھائی محمد الشیخ کو ابو فارس کے مقابلے پر روانہ کیا جس سے عوام زیدان کے خلاف ہو گئے اور وہ تلمسان کی طرف بھاگ گیا۔ ۱۰۱۲ھ میں محمد الشیخ فاس پر قابض ہو گیا اور اس کے بیٹے عبداللہ نے مراقش ابو فارس سے چھین لیا مگر وہ ظالم تھا لہٰذا زیدان نے عوام کی مدد سے اس کو نکال دیا۔ ۱۰۱۵ھ میں عبداللہ نے زیدان کو مار بھگایا، اس طرح ان کے درمیان برابر لڑائیاں ہوتی رہیں۔ زیدان اور اس کی اولاد عرصے تک مراقش میں حکمراں رہی اور عبداللہ فاس پر قابض رہا۔ زیدان نے ۱۰۳۷ھ میں وفات پائی، وہ زبردست عالم اور دینیات اسلام کا ماہر تھا۔

عبدالملک، ولید، محمد الشیخ اور ابو العباس احمد

یکے بعد دیگرے مختلف مقامات کے بادشاہ ہوئے اور مسلسل ایک دوسرے سے لڑتے رہے اور ان کے علاقوں پر دوسرے لوگ قبضہ کرتے رہے۔ ۱۰۷۹ھ میں مولا رشید فلالی نے ابوالعباس کے بیٹوں اور دیگر اہل خاندان کو قتل کر کے اس خاندان کی حکومت کو ختم کر دیا جس کی مدت ڈیڑھ سو سال رہی اور جس کا مسلک شروع شروع میں شیعہ تھا پھر بدلتا رہا لیکن وہ ہمیشہ اہل بیت کی عظمت کے قائل رہے۔

اشراف فلالی (سجلماسہ)

نفس ذکیہ کی نسل سے ایک بزرگ مولیٰ حسن بن قاسم ۶۶۴ھ میں سجلماسہ پہنچے۔ بنی مرین نے ان کی بڑی عزت و توقیر کی۔ وہ نہایت صالح، زاہد و متقی، عالم و فاضل اور باکمال تھے، اپنے پند و نصائح سے انہوں نے اہل سجلماسہ کو بڑا فیض

پہنچایا اور ان کی برکت سے سجلماسہ میں ایک خوشحالی کا دور آگیا۔

ان کا بیٹا مولیٰ محمد بھی باپ کے نقش قدم پر تھا۔ وہ بھی سجلماسہ کی دینی قیادت کرتا رہا۔ اس طرح یہ سلسلہ محمد بن محمد بن علی تک پہنچا۔

اشراف سعدئین کے آخری دور میں کسی عصبیت کی بناء پر سوس کے حکمرانوں نے گورنر سجلماسہ کے ذریعہ محمد بن محمد بن علی کے والد شریف محمد کو گرفتار کرالیا۔ محمد نے زرفدیہ دے کر انہیں چھڑایا مگر اپنی ناطاقتی کا احساس پیدا ہو گیا۔ اس وقت سے محمد بن محمد نے جمعیت فراہم کرنا شروع کر دی۔

زہد و تقویٰ کے حامل اور سجادہ عبادت کے وارث کو جنگ و جدل سے کیا کام تھا لیکن دنیا نے ظلم و تشدد سے مدافعت کی صلاحیت کو ناگزیر قرار دیا تو محمد بن محمد نے ایک دن سجلماسہ کے گورنر کو شکست دے کر نکال دیا اور عوام نے برضا و رغبت اس کی بیعت کر لی۔ ۱۰۵۰ھ سے ۱۰۶۵ھ تک سجلماسہ پر اس نے حکومت کی

شریف محمد بن محمد

اس نے سجلماسہ پر قبضے کے بعد خود سوس پر حملہ کیا پھر درعہ فتح کیا۔ ۱۰۶۰ھ میں اس نے برتاسن کا ایک حصہ ترکوں سے لے لیا۔ وہ الجزائر پر حملہ کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ بھائی مولیٰ رشید نے بغاوت کی، جنگ ہوئی اور وہ مولیٰ رشید کی گولی سے مارا گیا۔

مولیٰ رشید بن محمد

اس نے ۱۰۷۶ھ میں تازا اور فاس بھی فتح کر لیا۔ ۱۰۷۹ھ میں مراقش پر بھی قبضہ کر کے اپنا سکہ اور خطبہ بھی جاری کر دیا۔ ۱۰۸۱ھ میں ابو حسون کی اولاد سے سوس کا علاقہ بھی چھین لیا۔ ۱۰۸۲ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ رعایا اس کے عہد میں خوشحال تھی اور علم و فضل کا بڑا چرچا تھا۔

مولیٰ اسمٰعیل بن محمد

امراء نے اس کے بھتیجے ابو العباس کو مراقش کا حکمران بنایا تھا مگر وہ فاس میں تخت نشین ہوتے ہی مراقش پر چڑھ دوڑا۔ ابو العباس مراقش سے فاس آگیا۔ واپس ہو کر مولیٰ اسمٰعیل نے ۱۰۸۴ھ میں اس کو قتل کرا دیا اور مکناسہ کو

دار الحکومت بنالیا۔

۱۰۸۹ھ میں وہ ایک بڑا لشکر لے کر الجزائر پر حملہ آور ہوا مگر ترکوں سے طے پا گیا کہ دریائے تافنا اس کے اور ترک علاقے کے درمیان حد فاصل رہے گی۔ ۱۰۹۲ھ میں اس نے اسپین سے مہدیہ پھر ۱۰۹۵ھ میں طنجہ انگریزوں سے چھین لیا۔ ۱۱۰۰ھ میں العرائش اور ۱۱۰۲ھ میں اصیلا اسپین کے قبضے سے نکال لیا۔

ان فتوحات کے بعد مولیٰ اسمٰعیل نے ملک اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا اور ۱۱۳۹ھ میں سفر آخرت کر گیا۔

اسمٰعیل ایک اقبال مند اور شجاع حکمران تھا۔ اس کی قلمرو کی حدود جنوب میں سوڈان اور مشرق میں بسکرہ پر ختم ہوتی تھیں۔ اس کی تعمیرات عالم کی عظیم عمارتوں کے سامنے قابل ذکر ہیں۔ اپنی اولاد کو اس نے علوم و فنون میں ماہر کیا تھا۔

اسکے بعد ابو العباس ذہبی، عبداللہ اور محمد بن عبداللہ بادشاہ ہوئے جو آپس میں دست و گریباں رہے اور ان کے علاقے آہستہ آہستہ مغربیوں کے ہاتھوں میں چلے گئے، بعض پر ترکوں نے قبضہ کر لیا۔

محمد بن عبداللہ کے بعد سات فرمانروا اور گزرے: یزید بن محمد، سلیمان بن محمد، عبدالرحمان بن ہشام، محمد بن عبدالرحمٰن، حسن بن محمد، عبدالعزیز بن حسن اور یوسف بن حسن۔

۱۳۳۱ھ میں اس کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور فرانس اور اسپین نے اس کو آپس میں تقسیم کر لیا۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن عبداللہ یا اس کے پیش رو نے اپنا عقیدہ بدل لیا تھا۔ اس کے بعد تمام حکمران غیر شیعہ گزرے۔ شروع کے چھ فرمانروا نہ صرف ناموں سے بلکہ عمل سے بھی اہل بیت کے طرفدار تھے۔ (۴۰)

مغل سلطنت

شیعیت اصولی طور پر کبھی جارحانہ فوج کشی کی حامی نہیں رہی بلکہ اس نے تسخیر ملک کے لئے خونریزی کی ہمیشہ ممانعت کی اور شیعوں کے آئمہ نے اپنے پیرووں کو اس کی اجازت بھی نہیں دی لہذا علیؑ کے کسی فدائی نے اگر فوجی طاقت کے بل پر کوئی علاقہ فتح کیا تو اسے اس کا ذاتی فعل قرار دیا جائے گا۔

اس پابندی کے باوجود کوئی تین سو برس تک شیعہ چھوٹے اور بڑے پیمانے پر اقتدار کے لئے لڑتے رہے اور اس مدت میں ان کی شمشیر آبدار نے وہ جوہر دکھائے جس کی نظیریں آگے چل کر صلاح الدین ایوبی نے پہلے شیعہ کشی میں پھر عیسائیت کا غلبہ روکنے کے لئے پیش کیں۔

عیسائیت سے مسلمانوں کا ٹکراؤ بنی امیہ کے عہد سے شروع ہوا تو اس وقت تک جاری رہا جب تک اہل اسلام میں کچھ دم خم باقی رہا۔

عباسی عہد میں بھی عیسائیوں سے مسلمانوں کے معرکے ہوئے جس میں شیعوں نے بھی حصہ لیا اور حمدانیوں میں سیف الدولہ کی عمر ہی صلیبی سورماؤں سے لڑتے گزر گئی۔ پھر سلجوقی عہد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور اسی دور میں لبنان کے بنی عمار نے ایک عرصے تک صلیبی سیلاب کو روکے رکھا۔

اس سلسلے میں عماد الدین زنگی اور نور الدین زنگی کے کارنامے مسلمانوں کی تاریخ میں محفوظ ہیں اور ان کے بعد صلاح الدین کسی مرد آہن کی طرح پورے یورپ کے سامنے تن تنہا ایستادہ نظر آیا۔

صلاح الدین ایوبی نے مصر کی فاطمی سلطنت کا جنازہ اپنی نوک شمشیر پر اٹھا کر قبرستان پہنچایا تھا پھر زنگی سلطنت کے وارث کی حیثیت سے کوس لمن الملک بجایا تھا لیکن اس کے بعد مسلم سلطنت کئی حصوں میں بٹ گئی: شام، مصر، خوارزم اور دوسری چھوٹی چھوٹی حکومتیں۔ ایسے میں تاتاریوں کا سیلاب امڈ کر خوارزم کی طرف بڑھنے لگا۔

شیعہ حکومتیں بیخ و بن سے اکھڑ چکی تھیں۔ افراد اب بھی موجود تھے جو پہلے کی طرح بکھرے ہوئے تھے اور عام مسلمانوں کی طرح علی الاعلان یا تقیہ میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ تاتاریوں کی یلغار میں وہ بھی ہر مقام پر اس دیوار میں شامل ہے جو تاتاریوں کو روکنے کے لئے کہیں کہیں بنائی گئی اور دیوار گرنے سے وہ بھی مسلمان کی حیثیت سے پستے رہے۔

تاتاریوں کی یورش کا ذمہ دار یقیناً علاء الدین خوارزم تھا جس کی بزدلی مسلم تاریخ کا المیہ ہے۔ تاہم باپ کی کمی اس کے بیٹے جلال الدین نے پوری کی۔ وہ عالم اسلام کو تباہی سے تو نہ بچا سکا مگر جوانمردی کا ایک سکہ تاتاریوں پر بھی بٹھا گیا

عراق، ایران و شام خون میں نہا گیا اور مسلمانوں پر من حیث القوم ایسی قیامت ٹوٹی جو شاید پاداش تھی صدیوں کے ظلم و ستم کی اور جس کے اسباب میں ان کی تفریق و انتشار کو بڑی اہمیت دی جا سکتی ہے۔

تاتاریوں کا معمول تھا کہ جس مقام کو فتح کر کے پامال کرتے اس کے باقیات الصالحات کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ ان میں علماء، فقہاء اور فنکار سب شامل ہوتے۔ اس طرح چنگیز خان کے نائب ہلاکو خان کے پاس ایران میں بڑے بڑے ماہرین علوم و فنون جمع ہو گئے تھے جن میں شیعوں کے شہرہ آفاق عالم نصیر الدین طوسی بھی تھے جو ماہر ریاضیات بھی تھے اور استاد فلسفہ بھی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہلاکو کو بغداد پر حملے کے لئے آمادہ کیا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو شیعوں کے خون ناحق کا انتقام تھا ورنہ محسوس یہی ہوتا ہے کہ مسلمان مورخین نے قرائن و قیاسات سے ان کے دامن کو ہلاکو کی خونریزی میں ملوث کیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بغداد کی بدامنی اور خلافت کے حالات کسی بھی حملہ آور کے لئے ایک واضح دعوت تسخیر تھے جس کی قلمی تصویر کشی جسٹس امیر علی نے ہسٹری آف سیراسنز میں کی ہے جو ان اسباب و عوامل پر روشنی ڈالتی ہے جن میں ہلاکو شمشیر برہنہ ہو کر بغداد پر ٹوٹ پڑا!

بغداد کی تباہی

خلیفہ مستنصر ۱۲۴۲ء میں عین اس وقت ، جب اس کے خاندان اور عرب تہذیب پر وقت آنے والا تھا، اس دنیائے فانی سے رحلت کر گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا احمد عبداللہ المستعصم باللہ کے خطاب سے تخت خلافت پر رونق افروز ہوا۔ یہ کمزور اور عیش پرست تھا۔ اس کے عہد میں ملک کے اندر باہر شورش اور فتنہ برپا ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا خاندان ہمیشہ کے لئے خلافت و حکومت سے محروم ہو گیا

بغداد میں حنفیوں اور حنبلیوں کے جھگڑوں ، بغداد کے مغربی مضافات میں کرخ کے شیعہ اور سنیوں کے تنازعوں اور فسادوں نے اور سب سے زائد امراء پر بدمعاشوں اور لفنگوں کے غلبہ نے ایوان حکومت کے سنگ بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا۔ مستعصم کا خواب و خور حرام ہو گیا اور اس نے اپنے باپ کی فوج کو موقوف کر کے جلتے پر تیل ڈالنے کا کام کیا۔ شیعہ اور سنیوں کی لڑائیوں سے تنگ آکر اس نے اپنے بیٹے ابو بکر اور سیکریٹری کو کرخ کے مضافات منہدم کر دینے اور شیعوں کو غلام بنا لینے کا حکم دے دیا۔ اس حکم سے موید الدین محمد بن العلقمی شیعہ وزیر کو سخت رنج پہنچا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شیعوں کا انتقام لینے کے لئے اس نے مغلوں کو بغداد آنے کی دعوت دے دی۔ عرب مورخ ابن خلدون ، ابوالفدا ، مقریزی اور سیوطی وزیر کو نمک حرام لکھتے ہیں اور میرا خوند اور وصاف ان کی تائید کرتے ہیں ، صرف ایک مصنف جامع التواریخ اس کو نمک حلال اور شاہی خاندان کو آنے والی مصیبت سے بچانے کا خواہاں بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "بادشاہ خود نالائق تھا، وزیر کیا کر سکتا تھا" بہر حال اصل معاملہ خواہ کسی طرح بھی ہو، واقعہ یہ ہے کہ ہلاکو جو ایران میں اپنے بھائی منگو خان کا نائب تھا ، حشاشین کو فنا کر کے اور ان کے قلعوں کو تباہ کرنے کے بعد تبریز کی طرف بڑھا۔ وہاں سے اس نے مستعصم باللہ کی طرف اپنے قاصد کے ہاتھ ایک پیغام بھیجا کہ "جب ہم رود بار پر حملہ کرنے گئے تھے تو ہم نے تجھ کو پیغام بھیجا تھا کہ ہماری مدد کر، تو نے مدد دینے کا وعدہ کیا تھا مگر کوئی آدمی نہیں بھیجا۔ اب ہم تجھ کو ہدایت کرتے ہیں کہ اپنا رویہ تبدیل کر اور شرارتوں سے باز آ، اگر تو باز

نہ آئے گا تو تیری سلطنت اور تیرے خزانے ہمیشہ کے لئے تجھ سے جدا ہو جائیں گے"

کم عقل خلیفہ کے پاس نہ فوج تھی اور نہ خزانہ ، صرف چند شکستہ دل مشیر اور تباہ و خستہ شہر کے کھنڈر موجود تھے پھر بھی اس نے اس طوفان کے آگے جھک جانے کے بجائے مغرورانہ جواب دیا جس سے وحشی ہلاکو غیظ و غضب میں آگیا اور اتنی بڑی فوج کے ساتھ ، جو سارے بغداد کو گھیرے میں لے سکتی تھی ، خلفاء کے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ خلیفہ کے لشکر نے شہر سے کچھ فاصلہ پر وحشیوں کا مقابلہ کیا مگر ایک موقع پر اختلاف رائے ہونے کے سبب سخت تباہی بخش شکست کھائی اور دوسرے موقع پر جانوں کا بے سود نقصان عظیم ہوا۔ مغلوں نے اب بغداد کا محاصرہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ شہر کے باہر تمام بلندیوں میناروں اور مکانوں پر توپوں کی قسم کی کلیں نصب کی گئیں جن کے ذریعہ بڑے بڑے پتھر اور دہکتے ہوئے گولے اندر کی طرف پھینکے جانے لگے۔ فصیلیں شق ہو گئیں اور کئی مکانات میں آگ لگ گئی۔

چالیس دن کے محاصرہ کے بعد خلیفہ نے ہلاکو سے صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ یہ اظہار اطاعت بے اثر ثابت ہوا۔ ہلاکو نے مستعصم باللہ کے بڑے بڑے سرداروں کو اپنے کیمپ میں بلایا اور خفیف سے عذر پر ان کو اور ان کے ہمراہیوں کو قتل کر دیا۔ مستعصم کی حالت سخت مایوسی کی تھی ایسے موقع پر اس سے کہا گیا کہ شہر حوالے کر کے خلیفہ اپنی اور رعایا کی جانیں بچا سکتا ہے وہ فوراً تیار ہو گیا اور اپنے بیٹوں ، بھائی اور تین سو دیگر سربرآوردہ اشخاص قاضی شیخ امام اور عمائد سلطنت کو لے کر مغل لشکر میں پہنچ گیا۔ وحشی مغل نے اپنے فاسد خیالات اور ارادوں کو اپنی چرب زبانی اور خندہ پیشانی کے نیچے دبائے رکھا۔ اس نے خلیفہ سے کہا کہ اہل شہر سے کہلا بھیجو ، لوگ ہتھیار پھینک کر پھاٹکوں کے آگے جمع ہو جائیں تاکہ مردم شماری کر لی جائے۔ ناسمجھ خلیفہ نے اس ہدایت کے ساتھ اپنے محافظ بھیج دیئے ، جن کو مغلوں نے قابو میں کر لیا اور دوسرے دن طلوع آفتاب کے بعد قتل و غارت شروع ہو گیا۔

بغداد کی تباہی و بربادی کا خاکہ کھینچنے کے لئے گبن جیسے جید عالم کا قلم درکار ہے : عورتیں اور بچے جو پناہ مانگنے کے لئے ہاتھوں میں قرآن لئے [illegible] موت [illegible]

طرف ڈھکیل دیئے گئے، ناز پرور وہ خواتین، جنہوں نے کبھی غیر مردوں کی صورتیں بھی نہ دیکھی تھیں، مکانوں سے کشاں کشاں باہر لائی گئیں اور انکی سخت بے حرمتی اور عصمت دری کی گئی، وہ علم و ہنر کے خزانے جو بادشاہوں نے سخت جانفشانی سے جمع کئے تھے اور جن میں قدیم ایران کی ترقی کے بچے کھچے گوہر چن چن کر رکھے گئے تھے چند گھنٹوں میں ضائع و برباد ہو گئے۔ تین دن تک گلیوں میں خون کی ندیاں بہتی رہیں اور دریائے دجلہ کا پانی میلوں تک ارغوانی ہو گیا۔ لوٹ مار، قتل و غارت اور کشت و خون کا بازار چھ ہفتوں تک گرم رہا۔ وحشیوں نے محلات، مساجد اور مزارات آگ کی نذر کر دیئے یا ان کے سنہرے کلس اتار کر انہیں کھنڈر بنا دیا۔ ہسپتالوں میں بیمار اور مریض، کالجوں میں طلباء اور پروفیسر تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ مزاروں میں شیخوں اور مقدس اماموں کی غیر فانی یادگاریں کتب خانوں میں عالموں اور فاضلوں کے نہ مٹنے والے کارنامے خاک کا ڈھیر ہو گئے، جہاں کہیں دریا نزدیک تھا پانی کی آغوش میں غرق کر دیئے گئے۔ پانچ صدیوں کی محنت شاقہ سے جمع کئے ہوئے خزانے جہالت پر قربان ہو گئے۔ قوم کا چمنستان علم و ہنر ہمیشہ کے لئے اجڑ گیا اور ایوان ترقی منہدم ہو گیا۔ چار دن کے کشت و خون کے بعد ۲۰ محرم ۶۵۶ھ یا ۲۷ جنوری ۱۲۵۸ء کو مستعصم مع اپنے بیٹوں اور خاندان کے سربر آوردہ افراد کے ذبح کر دیا گیا اور خاندان عباسیہ کے صرف چند نونہال جان سلامت لے کر نکل سکے۔ بغداد میں قتل و غارت سے قبل بیس لاکھ نفوس کی آبادی تھی۔ ابن خلدون کے قول کے مطابق سولہ لاکھ جانیں تلف ہوئیں اور اس کی تباہی کے ساتھ مغربی ایشیا پر جہالت کا گھٹاٹوپ اندھیرا چھا گیا۔

تیرھویں صدی مسیحی میں وحشی مشرکوں کی بدولت جو بربادی اسلامی دنیا پر وارد ہوئی، عرب اور ایرانی مورخ اس کا بیان بڑے دردانگیز لہجہ میں کرتے ہیں۔ کوئی شخص سوائے جاہل اور سیہ باطن کے بنی نوع انسان کے اس قدر جانی اتلاف اور تمدنی نقصان پر چار آنسو بہائے بغیر نہ رہے گا۔ ابن الاثیر لکھتا ہے۔ "مغلوں کا حملہ سخت مصیبت اور خوفناک تباہکاری تھی جو دنیا پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً وارد ہوئی اور جس کی مثال شاید مستقبل میں بھی ڈھونڈے سے نہ ملے گی

اگر کوئی کہے کہ ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک ایسا قہر الہیٰ نازل نہیں ہوا تو وہ بالکل سچ کہتا ہے کیونکہ تاریخ میں اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔

عبداللطیف مغلوں کے حملہ کی نسبت تحریر کرتا ہے "یہ ایسی مصیبت تھی جس کے سامنے ساری مصیبتیں ہیچ ہیں"۔ جوینی مصنف جہاں کشا جو چنگیز خان کا ملازم تھا لکھتا ہے کہ "وہ انقلاب جس نے دنیا کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا علم کو تباہ اور عالموں کو ختم کر دیا، خراسان کو جو روشنی کا مرکز اور علماء کا مامن تھا، کالعدم کر دیا، علم و ہنر کے وارث تلوار کی نذر ہو گئے اور زمانہ میں سائنس اور علوم کا قحط پڑ گیا

بغداد کو تباہ و برباد کر کے مغلوں نے دریائے فرات کو عبور کیا اور الجزیرہ پہنچ گئے۔ خونریزی اور جہالت ان کے ہمرکاب تھی، رودحہ، حران اور نصیبین کے باشندے تلواروں کے گھاٹ اتر گئے، حلب میں پچاس ہزار آدمی قتل ہوئے اور دس ہزار بچے غلام بنا کر فروخت کئے گئے۔ حران اس وعدے پر کہ شہر محفوظ رکھا جائے گا مطیع ہو گیا، مگر مغلوں نے سارے باشندوں کو موت کی نیند سلا دیا حتیٰ کہ شیر خوار تک کو نہ چھوڑا۔ یہ ۹ صفر ۶۵۸ھ یا ۲۸ جنوری ۱۲۶۰ء کا واقعہ ہے۔ اس طرح تباہی و بربادی کو جلو میں لئے ہوئے یہ درندے مغرب کی طرف بڑھتے رہے اور مسلمانوں کا نفاق موئے پر سو درے کا کام کرتا رہا۔

مغل تہذیب کے دھارے پر

اب صورت حال یہ تھی کہ تقریباً پورا عالم اسلام تاتاریوں کے قبضے میں تھا کچلے اور دہشت زدہ مسلمان لٹے لٹائے شہروں میں جا بجا بکھا ہو رہے تھے کہ فلسطین میں سلطان بیبرس ملک الظاہر نے اپنی طاقت کو سمیٹا، مایوس اور بددل مسلمانوں میں ایک جوش پیدا کیا اور موت یا زندگی کی لڑائی لڑنے کے لئے چل پڑا۔

تاتاریوں نے عین جالوت میں ان کا مقابلہ کیا۔ سروں سے کفن باندھ کر نکلنے والے یہ سمجھ کر آئے تھے کہ ان کو تو قتل ہی ہونا ہے پھر میدان جنگ میں مار کر کیوں نہ مریں، تاتاری مسلسل فتوحات کے نشے میں سرشار تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا جلال الدین ابن خوارزم شاہ کے بعد دوسرا سرفروش ان کے مدمقابل ہے اور مسلمان سرفروش موت سے لڑنے کے لئے آئے ہیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ تاتاری صفیں ٹوٹنے لگیں اور مسلمانوں کے پیہم حملوں سے یہ دراڑیں بڑے بڑے شگافوں میں بدل گئیں۔تاتاریوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور پہلی بار انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پھران کے لئے گھوم کر اس طرف دیکھنا ممکن نہ تھا۔

اس فتح کے بعد ادھر مسلمانوں کی مایوسی میں ہمت و حوصلے کی شعاعیں پھوٹیں، ادھر تاتاری تمدنی زندگی سے آشنا ہونے لگے اور ہلاکو کا دربار چونکہ علماء و فضلاء سے بھرا ہوا تھا لہذا اس میں بھی ایک انسانیت پیدا ہونے لگی۔یہی وہ وقت ہے جب سے منگولیا کے وحشیوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا۔

شیعہ کشی پچھلی دو صدیوں کا طرہ امتیاز رہی تھی کسی مدت کے لئے اس کا سوال ہی ختم ہو گیا تھا۔تاریخ میں یہ ہوتا آیا ہے کہ دور اقتدار میں اکثریت اقلیت کو کچلتی ہے اور جب خود اس پر مصیبت آتی ہے تو اتحاد و اتفاق کا نعرہ بلند کرتی ہے ایسا ہی کچھ اس زمانے میں بھی ہوا مگر تا بہ کے؟

چنگیز خان نے ملک کی تقسیم اپنے بیٹوں کے مابین کر دی تھی۔ اس کی رو سے منکو قاآن تین نسلوں کے بعد مرکز میں تخت نشین ہوا تھا۔اس کی طرف سے ہلاکو خان ایشیا کا فرمانروا تھا اور چنگیز خان کے پوتے پڑپوتے اور دوسرے رشتہ دار مختلف علاقوں کے امیر تھے۔

حضورؐ کی ذات گرامی کے بارے میں مسلمانوں کی نظریاتی تفریق یقیناً افسوس ناک تھی تاہم اس میں کوئی نہ کوئی آہنگ پایا جاتا تھا لیکن جب سے دمشق میں اسلام کو سیاسی مصالح اور دین کا آمیزہ بنا دیا گیا، اس وقت سے اسلام کی ہیئت بدلتی ہی رہی۔

بنی عباس بھی بنی ہاشم کی طرح بنی امیہ کا تختہ ستم رہے تھے مگر جب انہوں نے حکومت پر قبضہ کیا تو غاصب کی حیثیت سے اصل حقدار کی پامالی ان کا بھی مسلک منصبی بن گیا اور انہوں نے جادہ اقتدار کی خاطر ماضی کی تقلیدیں پیش روؤں سے زیادہ چابکدستی دکھائی اور اصول و فروعات دین میں اولاد فاطمہؑ کی برتری اور

شرف ختم کرنے کے لئے ایک امامت لا کھڑی کی اور منصور نے حضرت ابو حنیفہ کو امام اعظم کا لقب دیدیا۔

شیعوں کے امام خدا نے بنائے تھے، بنی عباس نے سنی بھی بنا دئے، سنیوں کی فقہ بھی اور سنیوں کا امام اعظم بھی۔ اس کے بعد امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام غزالی، امام فخرالدین رازی، امام ابن تیمیہ وغیرہ ظہور میں آتے رہے کس کو کس نے امام بنایا، کون خود امام بن گیا؟ اس کی تفصیل ان کے ماموین جانتے ہوں گے۔

جہاں تک فقہوں کا تعلق ہے، ایک فقہ فقہ حنفیہ کے نام سے تو عباسی لائے، باقی فقہیں خود داعیان امامت نے پیش کیں جس کے نتیجے میں مسائل پر مسائل پیدا ہوتے چلے گئے: رویت باری، خلق قرآن اور دیگر اجتہادی نظریئے لہذا شیعہ و سنی تو ایک طرف رہے، ان نظریات کے پیرو آپس میں گتھم گتھا ہونے لگے۔

یہ سلسلہ جو چلا تو چلتا ہی رہا، لیکن جب کبھی شیعہ اور غیر شیعہ کا سوال پیدا ہوا تو شیعوں کے لئے باقی سب سنی بن گئے اور اہل بیت اور غیر اہل بیت کے طرفداروں کے صرف دو گروہ رہ گئے۔

یہ صورت حال کئی صدیوں سے اپنی جگہ پر تھی، خلافت کے درباروں میں تو شیعوں کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی، عموماً وہ منظر عام سے ہٹ جاتے.... تمام حکومتوں کے ادوار میں یہی صورت رہی اور اب تاتاریوں کا دور دورہ تھا تو چونکہ وہ غیر جانبدار تھے اس لئے اختلاف شدت کے ساتھ سامنے آ رہا تھا۔

تاتاری جب قتل عام کر رہے تھے تو سب مسلمان تھے، نہ کوئی شیعہ تھا اور نہ سنی مگر ہلاکو کے دربار میں جب شیعہ، سنی علماء جمع ہوئے تو سب فرد واحد کی کاٹ کرنے لگے اور یہ فرد واحد تھے علامہ نصیرالدین طوسی!

اداب و تہذیب سے نابلد مغل نے درباری علماء سے مختلف اوقات میں بہت کچھ پوچھا تھا اور بعض باتوں پر یقین بھی رکھتا تھا اس لئے اکثر سوالات کیا کرتا تھا۔ اس موقع پر مختلف مسالک کے عالم علامہ نصیرالدین کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے مگر آل رسول کا پرچم جس کے سر پر لہرا رہا ہو، اس کو لاجواب کون کر

سکتا ہے۔ نتیجے میں ہر موقع پر عالموں کے متحدہ محاذ کو منہ کی کھانا پڑی۔

ایک بار تو ان سب نے قیامت ہی کر دی اور علامہ نصیر الدین کا قصہ ہی ختم کر ڈالنے کا انتظام کر دیا۔

مغلوں میں مردے کو مٹی کے نیچے دبانے کا رواج بھی تھا۔ ہلاکو کی ماں کا انتقال ہوا تو اس کی تدفین کا انتظام کیا جانے لگا۔ علامہ نصیر الدین طوسی کی بڑی عزت تھی، وہ سب سے پہلے تعزیت کے لئے گئے اور کافی دیر تک انسان کے انجام اور آخرت پر گفتگو کر کے چلے گئے۔ علماء نے اجتماعی طور پر ایک منصوبہ بنا لیا تھا نصیر الدین کے جانے کے بعد وہ سب ایک ساتھ پہنچے اور بڑے دکھ کا اظہار کیا پھر ایک جید عالم نے بڑے تشویش کے لہجے میں کہا:۔

"قبر میں فرشتے آتے ہیں جو عربی میں سوال کرتے ہیں، آپ کی ماں عربی تو جانتی نہیں، جواب کیسے دیں گی؟"

جاہل تاتاری صرف پیکان و تیغ کی حرکت کے گر جانتا تھا، قلم کی گردش سے اس کی پچھلی نسلیں تک آشنا نہ رہی تھیں، مسلم علماء سے بعض باتیں اس نے سن رکھی تھیں، وہ بھی ایک فکر میں پڑ گیا کہ اس کی ماں قبر میں کیا کرے گی لہذا اس نے اس عالم سے سوال کر دیا۔

"پھر کیا کیا جائے؟"

"کسی عربی داں کو اس کے ساتھ دفن کر دیجئے تاکہ وہ فرشتوں کی بات سمجھ کر خود جواب دیدے۔" عالم نے مشورہ دیا اور بات ہلاکو کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے خود ان ہی سے پوچھا۔

"کس عالم کو......؟"

"اس کا فیصلہ آپ خود کریں، ویسے فی الوقت نصیر الدین سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے۔" عالم نے جو کہنا تھا، وہ کہہ دیا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر دل ہی دل میں مسکراتا ہوا چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہلاکو نے اس کے جانے کے بعد علامہ نصیر الدین کو طلب کیا اور ان سے کہا۔

"تمہیں میری ماں کے ساتھ دفن ہونا ہے......"

پھر اس نے دریافت کرنے پر تفصیل بتائی۔ علامہ نصیر الدین کے ہوش اڑ گئے مگر وہ بڑی متانت سے بولے۔

"مجھے اس خدمت میں کوئی عذر نہیں مگر آپ کی فکر ہے۔"

"میری فکر......؟" ہلاکو نے استفہامیہ انداز میں کہا اور علامہ نصیر الدین نے صراحت کی۔

"فرشتے اچھی عربی سے متاثر ہوتے ہیں اور بلاشبہ مجھ سے اچھی عربی کوئی نہیں جانتا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ سو برس بعد جب آپ کا وقت آئے گا تو میں آپ کے ساتھ جاؤں گا، ویسے آپ کی مرضی!"

"پھر ماں کے لئے کیا کیا جائے؟" ہلاکو نے علامہ سے حل دریافت کیا اور علامہ نے انہیں عالم کا نام لے لیا جنہوں نے ہلاکو کو یہ راستہ دکھایا تھا اور اسی سلسلہ میں کہا۔

"میرے بعد اگر کسی کو عربی پر عبور حاصل ہے تو وہی بزرگ ہیں۔"

ہلاکو کی سمجھ میں آ گیا اور وہ خوش ہو کر بولا۔

"میں آپ کی اسی علمیت کے سبب آپ کی قدر کرتا ہوں۔"

پھر علامہ نصیر الدین اجازت لے کر باہر آ گئے اور وہ عالم طلب کر لئے گئے .... وہ بہت چیخے چلائے مگر ہلاکو نے ایک نہ سنی، اس کو اپنی ماں کا خیال تھا کہ قبر میں تکلیف نہ ہونے پائے۔

مغلوں کی رسم کے مطابق گڑھا کھدا ہوا تیار تھا۔ پہلے ہلاکو کی ماں قبر میں اتاری گئی پھر اس عالم کو اس میں پھینکا گیا اور گڑھا مٹی سے پاٹ دیا گیا۔

جس نے دوسرے کے لئے گڑھا کھدوایا تھا، وہ خود اس میں دبا دیا گیا۔

اس طرح کے واقعات پیش آتے رہے اور سنی و شیعہ عالموں کی کشمکش ہلاکو کے دربار میں جاری رہی۔ ہلاکو کے دل پر اسلام کا سکہ بیٹھتا جا رہا تھا لہذا طرفین کی کوششیں جاری تھیں کہ اپنے مسلک کو برحق ثابت کرے۔

مغل فرمانروا کو ملتفت پا کر اسلام کی توضیحات میں ہر مکتبہ فقہ کا عالم اپنے اپنے زاویہ فکر و اجتہاد کو پیش کرتا رہا۔ شیعوں کے اصول میں کسی اجتہاد کا سوال ہی

نہ تھا البتہ اس کی افادی تشریحات علامہ نصیر الدین طوسی ضرور بیان کرتے رہے جو تہذیب سے قدرے آشنا ہونے کے بعد چنگیز خان کے وارث کے لئے کچھ قابل فہم ضرور قرار پائیں مگر جب کسی دوسرے کی باری آئی تو اس نے اپنا منطقی راستہ دکھایا۔ اس طرح ناتراشیدہ مغل کا ذہن الجھ کر رہ گیا۔

اسلام کے نقوش اس کے ذہن میں بنتے اور بگڑتے رہے اور وہ منگولیا کے وحشیانہ تمدن اور اسلامی ثقافت کا معجون مرکب بن کر رہ گیا........ اور کوئی فیصلہ کئے بغیر اس دنیا سے گزر گیا۔

اس کے بعد ہی مغلوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا جن میں سے بعض نے سنی مسلک اختیار کیا اور بعض نے شیعہ لیکن ان میں یہ شناخت دشوار تھی کہ کون شیعہ ہے، کون سنی، تاہم مسلکوں کی تفریق کے باوجود وہ ایک دوسرے کے اتنے دشمن نہ رہے کہ عقیدے کے اختلاف کے سبب خون خچر پر اتر آتے۔

صورت حال اب پہلے سے مختلف تھی، جن لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا وہ بھی مسلمانوں کے دشمن نہ تھے اور ہلاکو کی طرح علماء و فقہاء کی قدر دانی کرتے تھے۔

غیر جانبدار مغل ماحول میں شیعوں پر کوئی پابندی نہ تھی لیکن سنی اکثریت تھی ان کے سامنے اکا دکا شیعہ عالم ہمہ وقت موجود تو نہ رہتے لہذا جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو جو بھی سنی عالم ہوتا وہ سادی تختی پر جو چاہتا لکھ دیتا۔ ان حالات میں شیعوں کی غیر معمولی ذہانت ہی انہیں سربر کر سکتی تھی اور اس آزمائش میں اہلبیتؑ کا مسلک انہیں سربلند رکھتا۔

اس سلسلے میں متعدد علماء نے اپنی ذہانت اور ہمہ دانی کے پرچم لہرائے جن میں شیخ طوسی کے بعد علامہ حلی کا نام بار بار لیا جاتا ہے۔

آپ ہلاکو کے آٹھویں جانشین محمد خدا بندہ کے دربار میں بہت معروف تھے آپ کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دن خدا بندہ نے اپنی ایک بیوی کو غصے میں طلاق دیدی۔ اس نے بھی کچھ زبان درازی کی اور خدا بندہ نے تین چار مرتبہ اس کو

طلاق دینے کا اعلان کر دیا پھر وہ نادم ہوا کیونکہ غلطی بیوی کی نہ تھی، خود اسی کی تھی جس کو اس نے محسوس کیا اور درباری علماء کے سامنے اپنی ندامت کا اظہار کیا۔

علماء نے بیک زبان کہہ دیا۔

"طلاق ہو گئی، اب وہ کسی اور سے شادی کرے تو آپ کے عقد میں آسکتی ہے"

خدا بندہ اس بیوی کو چاہتا بہت تھا وہ پریشان ہو گیا اور علماء سے اس نے پوچھا

"کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ کسی کے پاس گئے بغیر وہ میری ہو جائے؟"

علماء نے انکاری جواب دیا۔ اس پر ایک درباری نے رائے دی کہ علامہ حلی سے بھی فتویٰ لے لیا جائے، چنانچہ علامہ بلوائے گئے اور آپ کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ طلبی کی غایت کیا ہے؟

آپ جب پہنچے تو خدا بندہ نے احترام کے ساتھ آپ کو تخت کے اوپر آجانے کو کہا۔ آپ نے دونوں جوتیاں اتار کر اپنے ہاتھ میں لے لیں اور تخت کے اوپر چڑھ گئے۔ اس پر کسی نے کہا۔

"یہ جوتیاں ہاتھ میں کیوں لے لیں"

"ابو حنیفہ چرا لے جائیں گے ......" آپ نے جواب دیا اور ایک جید عالم بڑے استعجاب میں بولے

"ابو حنیفہ......؟"

"جی ہاں، ابو حنیفہ...... وہ رسول اللہ کی بزم سے جوتیاں چرا لے جاتے تھے" علامہ حلی نے بڑی متانت سے بتایا اور وہ عالم تقریباً چیخ پڑے۔

"ابو حنیفہ تو اس وقت تھے ہی نہیں۔"

"اچھا، وہ رسول کے وقت میں نہیں تھے۔" علامہ حلی اس طرح بولے جیسے انہیں کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہو، پھر آپ نے کہا "اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے فتاوے سنی سنائی پر مبنی ہیں"۔

اس کا جواب عالم نے دیا: "لیکن جو کچھ سنا، وہ بہت معتبر ذرائع سے"۔

"آپ معتبر ذرائع کی بات کرتے ہیں ہم ان میں سے اکثریت کو مشکوک جانتے ہیں، ہم جو کچھ کہتے ہیں، وہ اس کے حوالے سے جو ہر وقت، سفر و حضر میں پیغمبر

کے ساتھ رہتا تھا اور جو حقیقتاً حضورؐ کا سایہ تھا۔" علامہ کے لہجے میں ایک وقار تھا اور آواز قدرے بلند، جس کو آپ نے بلند تر کیا اور امام جعفر صادق کی بیان کی ہوئی حدیث دہرائی جو امامؑ نے اپنے پدر بزرگوار اور انہوں نے اپنے والد نامدار اور انہوں نے بسلسلہ آبائی حضرت علیؑ سے سنی تھی اور حضرت علیؑ نے خود سرور کائناتؐ سے۔

علامہ نے فرمایا۔

"غصے میں دی ہوئی طلاق نہیں ہوتی، طلاق تو صرف وہ طلاق ہے جو ثبات عقل و ہوش میں سوچ سمجھ کر دی جائے اور اس کے بعد بھی آدمی کو اپنے غلط فیصلے کا احساس ہو تو طلاق کالعدم ہو جاتی ہے اور وہ بیوی سے رجوع کر سکتا ہے"۔

خدا بندہ اور اہل دربار اچھل پڑے اور سب نے علامہ کے فتوے پر اظہار مسرت کیا۔

اس طرح کے معرکے آئے دن ہوتے رہتے تھے جن میں خادمان آل رسول بازی لے جاتے تھے اور انہیں کی بدولت مغلوں کے دل و دماغ میں لمعان کی کرن پھوٹتی تھی اور وہ بارگاہ فاطمہ زہرا کے دربان بنتے جاتے تھے۔

مغلوں کا مرکز حکومت

ہلاکو کے مذہب کے متعلق یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ عام خیال یہی ہے کہ وہ مغل عقیدے اور اسلام کا معجون مرکب تھا۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ فتح بغداد کے بعد اس نے اسلام قبول کر لیا تھا تاہم یہ سچ ہو یا غلط، یہ مسلم ہے کہ مسلمان علماء کی اس کے دربار میں بڑی توقیر تھی۔

حکیم خواجہ نصیر الدین طوسی مولف اخلاق ناصری وغیرہ نے ہلاکو کے حکم سے مراغہ میں ایک رصد گاہ بنائی تھی، ملا علی اور ملا غیاث الدین بھی اس کے عہد میں تھے، نیز اثیر الدین ادماتی، نجم الدین منجم اور شیخ سعدی اس کے درباریوں میں شامل تھے، اس کا وزیر پہلے سیف الدین بیٹکچی تھا پھر خواجہ شمس الدین محمد جوینی ہوا۔

وہ ایران، ایشیائے کوچک اور ہندوستان سے بحیرہ روم تک کے ملک کا بادشاہ تھا، اسی قلمرو میں اس کا خاندان تقریباً ایک صدی تک حکمران رہا، تخت نشینی کے لئے خاندانی لڑائیوں سے قطع نظر بہمہ وجوہ اس کے ملک میں امن و امان رہا۔ علوم و فنون کی ترقی میں گزشتہ شاہان ایران کی طرح ایلخانی فرمانروا بھی قابل تعریف تھے۔ ابو سعید کے زمانے میں اس خاندان کا زوال شروع ہوا اسباب وہی تھے جو عباسیہ اور سلاجقہ وغیرہ کے زوال کا باعث ہوئے تھے یعنی مذہبی جھگڑے، امرا کا آپس میں رشک و حسد۔

ابو سعید کے انتقال کے بعد سلطنت بھان متی کا تماشا بن گئی۔ امراء ایسے شہزادوں کو تخت پر بٹھاتے جو ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن سکتے، بالخصوص دو گھرانوں کے باہمی نفاق نے سلطنت کو خاک میں ملا دیا، ان میں سے ایک غازاخان کا منظور نظر امیر چوپان تھا، دوسرا امیر حسین جلائر۔ دونوں امیروں کا ایک ایک بیٹا تھا جو ہم نام تھے مگر تمیز کے لئے چوپان کے بیٹے کو حسن کوچک اور امیر حسین کے بیٹے کو حسن بزرگ کہتے تھے۔

ابو سعید کے بعد جب فضا حسن کوچک کے لئے سازگار ہوتی تو وہ کسی کو تخت پر بٹھا دیتا اور جب حسن بزرگ کو موقع ملتا تو کسی دوسرے کو بادشاہ بنا دیتا۔ اس سے ایک وقت میں دو دو بادشاہ ہوتے رہے اور آپس میں جنگ و جدل کی نوبت آتی رہی یہاں تک کہ ایلخانی خاندان کے آخری بادشاہ نوشیرواں کے بعد ایران میں جلائر کا طوطی بولنے لگا اور حکومت ہلاکو کے خاندان سے نکل گئی اور جلائر، مظفریہ، کرت، سربداری وغیرہ کی حکومتیں قائم ہو گئیں جو اس وقت تک قائم رہیں جب تک امیر تیمور نے تمام ایران کو فتح نہیں کر لیا اور اس کو اپنی اولاد میں تقسیم نہیں کر دیا۔

اباقا خان

ہلاکو کے بعد بادشاہ ہو کر اس نے تبریز کو دارالحکومت بنایا، اپنے بھائی یشموت کو دربند و شیروان کی طرف بھیجا، دوسرے بھائی تنشین کو علاقہ مازندران

وخراسان دریائے آمو کے کنارے تک دیا، نویان بہادر اور ایدکان نویان کو حدود روم کی حفاظت کے لئے متعین کیا، بکر و ربیعہ کی امارت دریائی نویان کے حوالے کی، گرجستان و سرحد شام بشر آموں کے سپرد کیا وزارت اور دیوان خاص کا منصب خواجہ شمس الدین محمد جودینی کو دیا فارس کی حکومت اتابک ابو بکر کی اولاد پر بحال رکھی مگر چغتائی کے پوتے برکہ خان نے باتفاق قیدو خان ماوراء النہر و ترکستان پر قبضہ کر لیا پھر اباقاخان کے ملک پر حملہ کیا مگر شکست کھا کر بخارا بھاگ گیا اور بخارا کے علماء کے ہاتھ پر مسلمان ہو کر غیاث الدین اپنا نام رکھا۔ غیاث الدین کے مرنے کے بعد اس کا ملک قیدو خان اور اباقاخان نے آپس میں بانٹ لیا۔ اسی سال مصر کے حاکم نے اباقاخان کے گورنر کی سازش سے روم کے سرحدی ملک پر قبضہ کر لیا، اباقاخان نے اسے نکال دیا اور خود مصر پر چڑھائی کر دی مگر سلطان بند قدار نے مغلوں کو مار بھگایا اور خود بند قدار نے بابلستان پر حملہ کر کے ایک مغل کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ ۶۶۹ھ میں اباقاخان نے اپنے بھائی منگو تیمور کو تسخیر مصر پر مامور کیا مگر اس نے شکست کھائی، ۶۸۰ھ میں اباقاخان کا انتقال ہو گیا۔ خواجہ شمس الدین جلال الدین، مولانا روم اور شمس تبریز اور قطب الدین شیرازی امامی ہردی اس زمانے کے مشہور شعراء گزرے ہیں۔

نکودار بن ہلاکو

وہ اپنے بھائی کی جگہ بادشاہ ہوا اس نے بھی دین اسلام اختیار کیا اور سلطان احمد نام رکھا، مجد الدین یزدی کو قتل کر کے خواجہ شمس الدین کو وزیر بنایا اور اس کے بھائی علاء الدین کو قید سے نکال کر بغداد کا حاکم مقرر کیا، والی مصر سے اس نے صلح کر لی، کیونکہ وہ بھی مسلمان تھا۔ اس پر اس کے بھائی ارغون اور تنقور بگڑ گئے۔ نکودار نے تنقور کو مار ڈالا اور ارغون کو قید کر دیا۔ ارغون نے بوقائی اور تاتاری شہزادوں سے سازش کر کے سلطان کو گرفتار کر لیا، بعد میں قتل کر دیا۔ خواجہ شمس الدین بھاگ گیا۔ اس کی حکومت صرف سوا دو سال رہی، دار السلطنت تبریز تھا۔

منگول عقل و دانش میں حقیقتاً کندہ ناتراش تھے اور مذہب کے سلسلے میں

تو کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ مہذب دنیا کو انہوں نے روند تو ڈالا مگر اس کی چمک دمک دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو گئی۔ مختلف مسالک اور مذاہب کے علماء ان کی گرفت میں تھے لہذا جو جس عالم کے ہتھے چڑھ گیا، اس کو اس نے اپنے زاویہ نگاہ سے تراش لیا۔ نتیجے میں کوئی مسلمان بن گیا، کوئی عیسائی یا یہودی، مسلمانوں میں بھی نظریاتی تفریق کے لحاظ سے جو جس کسی نے سمجھا دیا وہ اس کی سمجھ میں آگیا۔

اسی لئے صحیح معنی میں کوئی کسی مذہب میں پختہ نہ تھا اور ہر معلم کے رنگ میں رنگ جاتا تھا پھر بھی اب ان میں ایک تفریق ہونے لگی تھی اور وہ تسخیر ملک کے عزم و خیال کے ساتھ ساتھ عقیدے کے بندھنوں میں جکڑتے جا رہے تھے اور ان کے اندر ایک گروہ بندی پیدا ہو رہی تھی۔

ارغون خان

ارغون خان نے بادشاہ ہو کر امیر بوقائی کو وزیر بنا لیا اور خواجہ شمس الدین کو دوسرا وزیر، پھر بوقائی کے بہکانے سے اس نے فخر الدین مستوفی اور حسام الدین کے ہاتھوں خواجہ شمس الدین کو مروا دیا۔ اس دوران سعد اللہ یہودی ہر سیاہ سپید پر چھا گیا۔ اس کے رسوخ سے جل کر بوقائی نے ارغون کے بھائی جوشکاب کو بادشاہت کی دعوت دی، اس نے خود ارغون کو اطلاع کر دی اور یہ سازش ناکام ہو گئی پھر سعد اللہ کی ترغیب سے اس نے حکم دیا کہ کل مسلمان اپنا مذہب چھوڑ کر یہودی ہو جائیں ورنہ قتل کئے جائیں گے اس کے ساتھ ہی اس نے حرمین کو مسمار کرنے کا منصوبہ بھی بنا لیا مگر یہ ارادہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ ارغون کو مرض موت لاحق ہو گیا۔ امراء نے جوشنی اور سعد اللہ یہودی کو قتل کرا دیا۔ عبداللہ بیضاوی قاضی القضاۃ اور نجم الدین زرکوب اس عہد کے باکمال تھے۔

کیخاتو خان

کیخاتو خان اس کا جانشین ہوا۔ بایدو خان حاکم بغداد نے طغاچار امیر کی سازش سے اس پر فوج کشی کی اور ۶۹۴ھ میں اس کو قتل کر دیا۔ اپنی چار سال کی حکومت میں اس نے کسی گنہگار یا بیگناہ کو قتل نہیں کرایا، صدر جہاں نظام الدین احمد قزوینی اس کا وزیر تھا۔

بایدوخان

بایدوخان نے تخت نشین ہو کر امیر طغاچار کو امیرالامراء بنا دیا۔ غازاخان خراسان کے حاکم نے نوروز بن ارغون حاکم توران سے مدد لے کر اس پر چڑھائی کی رلستے میں دزیر صدر جہاں بھی اس سے آملا، بایدوخان شکست کھا کر مارا گیا۔ اس کی مدت حکومت چھ ماہ تھی۔

غازاخان

غازاخان نے مسلمان ہو کر اپنا نام محمود رکھا۔ کئی سال بعد کسی شبہ پر اس نے امیر قتلق کو ایک بڑی فوج کے ساتھ نوروز کی گرفتاری پر مقرر کیا۔ نوروز کے بھائی جو عراقین میں حاکم تھے، جا بجا قتل کئے گئے۔ نوروز خود نیشاپور سے اپنے داماد فخرالدین کرت کے پاس ہرات چلا گیا اس نے نوروز کو امیر قتلق کے حوالہ کر دیا اور وہ ۶۹۶ھ میں قتل کر دیا گیا۔

۶۹۹ھ میں مصر اور شام پر اس کا قبضہ ہو گیا مگر امیر قنغچاق ناظم مصر، شاہ مصر سے مل گیا اور دوبارہ روم و شام سلطنت مصر میں شامل ہو گئے۔ ۷۰۲ھ میں دوبارہ مصر پر حملہ کیا گیا مگر شکست ہوئی۔ ۷۰۳ھ میں غازاخان کا انتقال ہو گیا۔

غازان شاہ نے مسلمان ہونے کے بعد دو مرتبہ رسالت پناہ کو خواب میں دیکھا اور ہر مرتبہ امیرالمومنین علی ابن ابی طالب کو آپ کے ساتھ پایا۔ خاتم لاانبیاء نے ہر مرتبہ اس کو تاکید کی کہ میرے اہل بیت کے ساتھ اخلاص رکھ اور سادات کے ساتھ سلوک کر۔

اسی لئے غازان خان آل رسولؐ کو بہت عزیز رکھتا تھا، شیعوں کو کربلائے معلی اور نجف اشرف سے بلا کر اعلیٰ مناصب پر فائز کرتا۔

مرتے وقت اس نے اپنے بیٹے کو بھی اس کی وصیت کی تھی۔

الجائتو خان، محمد خدا بندہ

الجاستو خان، محمد خدا بندہ غازاخان کے لاولد فوت ہونے کے بعد بادشاہ ہوا اسنے اسلام کی اشاعت میں بہت کوشش کی، شیعہ مذہب کا مسلمان تھا، اس نے گیلان کو فتح کیا پھر کئی دوسرے مقامات۔

۷۰۴ھ میں اس نے ایک نیا شہر سلطانیہ آباد کر کے اس کو دارالحکومت قرار دیا، کئی فرمانرواؤں کو باجگزار بنایا پھر مصر پر حملہ کیا مگر صلح کر کے واپس ہو گیا۔ مصر پر حملے کے دوران شہزادہ بیگ، میسور اور داؤد خواجہ ماوراء النہر سے خراسان پر حملہ آور ہوئے۔ اس نے امیر بوجائی اور بہرام شاہ کو ان کے مقابلہ پر بھیجا۔ بوجائی مارا گیا اور بہرام شاہ بھاگ گیا آخر اس نے خود چڑھائی کر کے خراسان سے سب کو نکال دیا اور اپنے بیٹے ابو سعید بہادر خان کو خراساں کا حاکم بنا دیا اور خود سلطانیہ واپس ہو کر انتقال کر گیا۔ خواجہ رشید اور علی شاہ اس کے وزیر تھے۔ شام، کرمان، سیستان قنغچاق، وارس، بلغار، ماوراء النہر، ختا، خوارزم، تاتار و گیلان اس کے زیر حکومت تھے۔ اتنی وسیع سلطنت میں اس نے امن و امان برقرار رکھا۔

ابو سعید بہادر خان

الجاستو محمد خدا بندہ کے مرنے کے بعد امیر چوپان نے ابو سعید کو بلا کر بادشاہ بنایا، تمام ملکی اور جنگی انتظام خود اس کے سپرد رہے اور دیگر امور اس کے منتخب لوگوں سے متعلق قرار پائے۔ خواجہ رشیدالدین پر سازش کے الزامات تھے لہذا اس کو قتل کرا دیا گیا، اس پر ملک میں کئی مقامات پر بغاوت ہوئی، خراسان شہزادہ میسور والی ماوراء النہر نے لیا اور دشت قنغچاق پر شہنشاہ اورنگ نے قبضہ کر لیا، والی مصر نے بکر تک کا علاقہ دبا لیا۔

بات یہ تھی کہ لوگ امیرالامراء کے اختیارات سے جلتے تھے اور اس کے قتل کے درپے تھے اس کے علاوہ شیعہ علماء بالخصوص علامہ حلی نے مغل دربار میں آل محمدؐ کی فضیلت میں جو استدلال کیا تھا اور وقتاً فوقتاً جو تقاریر کی تھیں، اس نے مغل ذہنوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا، خدا بندہ اور تمام متعلقین نے تو علی الاعلان شیعیت کا اظہار کر دیا تھا، پھر بتدریج مغلوں کا ایک گروہ حلقہ اہل بیت میں داخل ہو گیا۔ بالفاظ دیگر:۔

شیخ نصیرالدین طوسی نے ہلاکو کے دربار میں جو بیج بویا تھا وہ بارآور ہو رہا تھا اور پچھلی نسلوں میں کتنے ہی سربرآوردہ افراد شیعہ ہو چکے تھے۔ اس کے بعد جہد

مسلسل جاری رہی اور اب اکدم بادشاہ وقت اور اراکین دولت نے یک زبان ہو کر علیؓ کی حمایت کا نعرہ لگایا تو آواز باز گشت مغل ایوان سے ٹکرا کر دور دور پہنچی اور سنی حلقے میں ایک ہلچل پڑ گئی۔ ہر طرف ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں، سنی علما اپنے اپنے حلقوں میں تحریکیں کرنے لگے، انجام کار بندہ خدا کے بعد ابو سعید کو ہدف بنا لیا گیا اور مقامی طور پر امیر الامراء چوپان سے تو دشمنی ہی ہو گئی اور اس کو راستے سے ہٹا دینے کی تدابیر کی جانے لگیں۔

ابو سعید کو معلوم ہوا تو اس نے ان لوگوں کو قتل کرا دیا۔ میسور شاہ ماوراء النہر نے ہرات میں غیاث الدین کرت کا محاصرہ کر رکھا تھا، ابو سعید نے امیر حسین کو مدد کے لئے بھیجا اور ہراتیوں نے محاصرہ سے رہائی پائی پھر میسور شاہ ۷۲۱ھ میں اپنے ہی امراء کی نمک حرامی سے قتل ہو گیا۔

بادشاہوں کے ذاتی معاملات بھی نظم حکومت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اتفاق سے ایک ایسا واقعہ بھی پیش آگیا۔ ابو سعید امیر چوپان کی لڑکی پر عاشق تھا اور نکاح کا امیدوار تھا مگر وہ امیر شیخ حسن حاکم روم سے منسوب تھی۔ امیر چوپان نے اسے امیر شیخ حسن سے بیاہ دیا، اور خود کسی بہانے خراسان چلا گیا۔ امیر ابو سعید نے ناراض ہو کر چوپان کے بیٹے کو قتل کرا دیا پھر اس کے عزیز و اقارب کو تہہ تیغ کر کے امیر چوپان کی گرفتاری کا حکم دے دیا اس پر امیر چوپان نے خود اس پر حملہ کر دیا مگر شکست کھائی اور غیاث الدین حاکم ہرات سے مدد مانگی۔ غیاث الدین نے مدد کرنے کے بجائے امیر چوپان اور اس کے جوان بیٹے صیداد خان کو قتل کر دیا اور ان کے سر ابو سعید کے پاس بھجوا دیئے۔ ان واقعات سے ڈر کر امیر چوپان کی بیٹی بغداد خاتون کو اس کے شوہر امیر حسن نے طلاق دیدی اور وہ ابو سعید کے حرم میں داخل کر لی گئی۔

امیر شیخ علی خراسان کا حاکم بنایا گیا تھا۔ اس نے وہاں لوٹ مار شروع کر دی نظم حکومت تہہ و بالا ہو گیا مگر قبل اس کے کہ ابو سعید ادھر توجہ کرتا اس کا انتقال ہو گیا۔۔ مغل سلطنت کا ایک زریں باب بند ہو گیا اور خراسان میں سربداریوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

صفی الدین اردبیلی، علاء الدین سمنانی، شیخ احمد اوحدی، قطب الدین رازی اس دور کے مشاہیر میں تھے۔

معز الدین ارپاخان

ابو سعید کے بعد تیرہ سال کے عرصے میں آٹھ بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے۔ پہلے خواجہ غیاث الدین وزیر نے ارپاخان کو بادشاہ بنایا۔ ارپاخان نے بغداد خاتون کو قتل کر دیا جو سلطنت کی دعویدار تھی اور شہزادی ساتی بیگ دختر محمد خدا بندہ سے نکاح کیا۔ ابو سعید کی دوسری زوجہ دلشاد خاتون امیر علی شاہ حاکم بکر کے پاس چلی گئی، اس کی ترغیب سے امیر علی شاہ نے موسیٰ بن علی بن بایدو خان کو تخت پر بٹھا دیا، اس پر امیر شیخ حسن بزرگ نے ناراض ہو کر روم کی حدود میں سلطان محمد کو بادشاہ بنا دیا۔ دونوں میں جنگ ہوئی اور امیر علی شاہ مارا گیا موسیٰ خوزستان کی طرف فرار ہو گیا۔

محمد خان

محمد خان کو تخت پر بٹھا کر حسن بزرگ نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور دلشاد خاتون بیوہ ابو سعید سے عقد کر لیا اس عرصے میں شیخ حسن کوچک بن امیر چوپان نے شہزادی ساتی بیگ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

ساتی بیگ

ساتی بیگ المعروف بہ ساتیک الجاستو کی بیٹی اور ابو سعید کی بہن تھی۔ پہلے اس نے ارپاخان سے نکاح کیا تھا، اب وہ حسن کوچک کے عقد میں تھی۔ حسن کوچک اس کو تخت نشین کر کے حسن بزرگ پر حملہ آور ہوا مگر جلد ہی دونوں میں صلح ہو گئی کیونکہ ایران میں شدید بد نظمی پھیل رہی تھی۔

امیر حاجی طغائی دیار بکر میں، امیر ارتا بعض بلاد روم میں، ملک بن تیمور تاش برجی میں، امیر اکرنج کے بیٹے کردستان میں، اولاد امیر محمود خان آنجو فارس میں، سید جلال الدین میران اور عماد الدین سنائی اصفہان میں، امیر مبارز الدین یزد میں قطب الدین خوری کرمان میں، ملک شجاع الدین بم میں، معز الدین حسین کرت

میں، طغاتیمور مازندران میں، امیر ارغون شاہ طوس میں، سربدار سبزوار میں، امیر
عبداللہ بن امیر ملائی قہستان میں اپنی اپنی حکومتیں قائم کر چکے تھے۔

حسن کوچک تنہا حسن بزرگ کا مقابلہ نہ کر سکتا، لہذا اس نے طغاتیمور کو
ہموار کر کے مازندراں سے بلایا، شیخ امیر علی حاکم خراساں کا لشکر بھی سلطانیہ آپہنچا
اور سب نے مل کر حسن بزرگ پر حملہ کیا مگر شکست یاب ہوئے۔ موسیٰ خان جنگ
میں مارا گیا، طغاتیمور بسطام کی طرف بھاگ گیا اسی درمیان کسی نے امیر علی حاکم
خراسان کو بھی قتل کر دیا۔

اس فتح کے بعد حسن بزرگ نے اباقاخان کے پڑپوتے جہاں تیمور کو تخت پر
بٹھا دیا اور حسن کوچک نے ساتی بیگ کو ہٹا کر سلیمان خان بن بشموت بن ہلاکو
خان کو بادشاہ بنا لیا جو ساتی بیگ کو عقد میں لے آیا۔

دونوں بھائیوں میں تغتو کے مقام پر ایک مرتبہ پھر سخت جنگ ہوئی۔ شیخ
حسن بزرگ شکست کھا کر مازندران بھاگ گیا اور حسن کوچک کو اس کی بیوی نے
مار ڈالا۔ اس عرصے حسن کوچک کے بھائی ملک اشرف نے اصفہان سے آکر سلیمان
پر حملہ کیا اور نوشیرواں نام کے ایک شہزادے کو تخت نشین کیا جو چند روز
حکومت کر سکا، ۷۵۰ھ میں اس کا انتقال ہو گیا اور اسی پر خاندان ہلاکو کی حکومت کا
خاتمہ ہو گیا۔

مغلوں کی سلطنت عراق و ایران میں چھانوے سال چل سکی۔ انحطاط کے
اسباب و عوامل میں بیشتر وہی باتیں تھیں جو دوسری حکومتوں کے زوال کی موجب
رہی تھیں لیکن مغل دوسری حکومتوں کے مقابلے میں کم وقت لے سکے۔ اس کی
وجوہات میں بنیادی بات یہ ہے کہ ان کا کوئی باہمی مرکز اتحاد نہ تھا، مہذب قوموں
سے وابستگی ہوتے ہی وہ اختلاف عقائد کے چکر میں پھنس گئے اور سیاست سے ناآشنا
ہونے کے باعث وقت کے تقاضوں کو سمجھ نہ سکے۔

عیسائی یا یہودی ہونے والے مغل اگرچہ کسی گنتی میں نہ تھے پھر بھی ان
کی کوئی نہ کوئی تعداد تھی، باقی مسلمان ہو گئے۔ منگولیا کے مسلک پر قائم رہ جانے
والے ناقابل ذکر تھے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں اکثریت تو سنی رہی لیکن شیعہ

ہونے والے بھی گنتی میں کم نہ تھے۔ شیعوں کے لئے یہ تناسب اگرچہ باعث
طمانیت نہیں ہو سکتا مگر شیعہ ان سو برسوں میں مغلوں کے شکر گزار ضرور رہے
کیونکہ اس مدت میں کسی نے انہیں اس لئے نہیں ستایا کہ وہ شیعہ ہیں۔

اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ اقتدار سنیوں کے کسی سردار کے بجائے
مغلوں کے ہاتھ میں تھا اور وہ سنی شیعہ سب کو برابر سمجھتے تھے، دوسرا سبب یہ تھا کہ
مغلوں کی تلوار جس طرح سنیوں کے سروں پر تھی، اسی طرح شیعوں کے سروں پر
بھی، دونوں دہشت زدہ اور ہراس کے عالم میں تھے۔ ایسے میں کوئی سنی شیعہ کو
دیکھ کر کیا کہتا کہ گردن زدنی ہے۔

اب مغل منگولیا سے آئے ہوئے وحشی نہ رہے تھے ان میں اسلام کا شعور
بھی پیدا ہو گیا تھا لہذا پرانے سنیوں کے لئے موقع تھا کہ مغل سنیوں سے مل کر
شیعوں کے خلاف محاذ بنائیں۔

واقعات شاہد ہیں کہ ایسا ہوا مگر اس میں شدت نہیں آئی، تسخیری مہمات
کی مصلحتیں ان پر غالب رہیں، لہذا مغل سلطنت جب حصے بخروں میں بٹ گئی تو
ایک نے دوسرے پر اس لئے حملہ نہیں کیا کہ وہ شیعہ ہے بلکہ اس لئے چڑھ دوڑا کہ
اس کا علاقہ چھین کر اپنی حکومت کا رقبہ وسیع کر لے۔

چھوٹے چھوٹے حکمراں طوائف الملوکی میں اسی مقصد کی خاطر آپس میں
متصادم ہوتے رہے، حالانکہ وہ سب مغل تھے اور ان میں سے بیشتر کا سلسلہ نسب
ماضی کے کسی ایک مرکز پر جا کر مل جاتا تھا۔

عقیدے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو خدا بندہ اور اس کے درباریوں کی
نسلیں سب کی سب شیعہ تھیں جن میں جلائر اور بعض دوسرے خاندانوں کی
اکثریت شامل تھی، باقی سب سنی اور یہ امتیاز قدرے مشکل تھا کہ کون شیعہ ہے،
کون سنی کیونکہ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ خاندان عقیدے کے اعتبار سے بٹ بھی جاتے
تھے مگر ان میں آپس کے رشتے برقرار رہتے اور باہم شادی بیاہ بھی ہوتے رہتے تھے۔

طوائف الملوکی

امیر چوپان

امیرچوپان بن ملک بن توران بہادر، سلدوز غازان خان کے زمانے میں بڑے سرداروں میں شمار ہوتا، سخی اور نیک سلطان ابو سعید کے عہد میں اعلیٰ منصب تک پہنچا اور مغلوں کی پوری سلطنت اس کے زیر فرمان آگئی، شہروں کے بیشتر حکام اس کے بیٹے یا متعلقین میں سے تھے، سلطان صرف نام کا بادشاہ تھا۔ پھر بھی بادشاہ بادشاہ ہی ہوتا ہے، امیرچوپان خود سلطان ابو سعید ہی کے اشارے سے قتل ہوا۔

اس کے نو بیٹے تھے: پہلا امیر حسین گورنر خراسان جو خوارزم میں زخمی ہو کر مارا گیا، دوسرا امیر تیمور تاش فرمانروائے روم، جو باپ کے مقتول ہونے پر مصر چلا گیا اور وہاں ملک الناصر کے حکم سے قتل کیا گیا، تیسرا امیر دمشق خواجہ جس کو ابو سعید نے قتل کرایا، چوتھا صلاد خان جو باپ کے ساتھ ہرات میں تلوار کے گھاٹ اترا، پانچواں امیر محمود گورنر گرجستان، یہ بھی ابو سعید کے حکم سے تبریز میں مارا گیا چھٹا امیر سیور خان جو امیر ایلکان بن شیخ حسن بزرگ کے حکم سے دیار بکر میں قتل ہوا، ساتواں امیر یاغی باستی، ملک اشرف کے حکم سے تبریز میں مارا گیا، آٹھواں سیوک اور نواں نوروز۔

چوپانیوں میں امیرچوپان کے بعد دو بادشاہ ہوئے: شیخ حسن کوچک اور امیر حسن برادر حسن کوچک۔

آق بوقائی

آق بوقائی بن ایلکان جو کیخاتو کے زمانے میں سالار بزرگ تھا، بایدو خان کی لڑائی میں مارا گیا۔ اس کا بیٹا امیر حسین سلطان ابو سعید کے دور میں خراسان کے امراء میں سے تھا۔ یہ ارغون کا داماد بھی تھا۔ امیر حسین کے بعد اس کا بیٹا شیخ بزرگ علاقہ روم کا گورنر ہوا۔ ابو سعید کے بعد جب مغل سلطنت زوال پذیر ہوئی تو حسن بزرگ نے شاہی اقتدار حاصل کیا اس کے بعد اس خاندان میں مزید تین بادشاہ گزرے

امیر شیخ حسن نویان ایلکانی

سلطان ابو سعید کے زمانے میں روم کے ایک علاقے کا حاکم تھا۔ اس نے امیر علی شاہ کو قتل کر کے موسیٰ کو بھگا کر، محمد خان کو برائے نام بادشاہ بنایا اور اقتدار مکمل اپنے ہاتھ میں لے کر حاکم بن گیا جس سے فتنہ و فساد کے آثار پیدا ہوئے مگر شیخ حسن نے قابو پالیا۔

اس کے بعد شیخ حسن کوچک نے اس پر خروج کیا۔ امیر حسن بزرگ نے عراق میں پناہ لے کر ایک علیحدہ حکومت قائم کر لی اور اکیس سال حکومت کر کے ۷۵۷ھ میں فوت ہوا۔

امیر حسن کوچک چوپانی

امیر حسن کوچک چوپانی نے سلیمان کو برائے نام تخت پر بٹھا دیا تھا، دراصل بادشاہ وہ خود تھا۔ اس نے روم، آذربائیجان اور عراق و عجم کے بعض علاقے بھی اپنی حکومت میں شامل کر لئے تھے، ۷۴۴ھ میں اس کی بیوی نے سوتے میں اسے قتل کر دیا۔

ملک اشرف چوپانی

ملک اشرف چوپانی نے برائے نام بادشاہ سلیمان کو سلطانیہ میں محدود کر دیا اور خود تبریز میں خود مختارانہ اقامت اختیار کر لی۔ یہ بہت قائم حکمران تھا۔ جانی بیگ حاکم قپچاق نے چڑھائی کر کے ۷۵۸ھ میں اس کو قتل کر دیا اور چوپانی حکومت کا خاتمہ کر دیا

اویس بن حسن بزرگ ایلکانی

اویس بن حسن بزرگ ایلکانی باپ کے مرنے پر ۷۵۷ھ میں بغداد کا بادشاہ ہوا۔ اخی جوق بیگ جانی بیگ کی طرف سے تبریز کا حکمران تھا۔ اس نے تبریز اس سے چھین لیا، پھر برق بیگ، علی پیتن، جلال الدین قزوینی وغیرہ کو شکستیں دے کر ان کے علاقوں پر بھی قابض ہو گیا اور ایک بڑا فرمانروا بن گیا۔ بغداد اس کے زمانے میں بڑا بارونق اور پرامن شہر تھا۔ ۷۷۶ھ میں بیس سال حکومت کر کے اس نے وفات پائی۔

سلطان حسین بن اویس

سلطان حسین بن اویس باپ کا جانشین ہوا۔ سب سے پہلے اس نے خواجہ بیرم ترکمان کی بغاوت فرد کی پھر قلعہ دربند فتح کیا، تبریز و سلطانیہ پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا۔ اس کی عدم موجودگی میں شہزادہ علی نے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ سلطان حسین نے عاقل آقا کو بھیج کر بغداد واپس لیا اور شہزادے کو شونیز کا علاقہ دے کر ہموار کر لیا اور بغداد میں قیام پذیر ہو کر عاقل آقا کو پورے لشکر کے ساتھ تبریز روانہ کیا۔

اس اثناء میں دشمنوں نے پھر بغداد پر حملہ کر دیا۔ سلطان حسین تبریز کی سمت فرار ہوا جہاں اس کے بھائی احمد نے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔

سلطان احمد جلائر بن اویس ایلکانی

سلطان احمد جلائر بن اویس ایلکانی کے قیام تبریز میں عاقل آقا کے اکسانے پر اس کے بھائی بایزید نے سلطانیہ میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ شیخ علی حاکم عراق عاقل آقا کا حامی تھا۔ ان سب نے متحد ہو کر تبریز پر حملہ کیا مگر سلطان احمد سے شکست کھائی پھر طے پایا کہ احمد آذربائیجان اور بغداد میں، بایزید عراق و عجم میں حکومت کرے۔ اس فیصلے کو چار سال گزرے تھے کہ امیر تیمور گورگان نے آذربائیجان فتح کر کے بغداد پر حملہ کیا، سلطان احمد مصر بھاگ گیا اور امیر تیمور کے انتقال کے بعد واپس آکر عراق پر قابض ہوا پھر قرا یوسف والی تبریز پر حملہ بولا مگر جنگ میں مارا گیا۔ یہ تمام سلاطین شیعہ عقیدہ رکھتے تھے۔

اس کی ذات پر ایلکانی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور تبریز میں قرا یوسف ترکمان کی حکومت مستقل ہو گئی۔

ابو اسحاق بن امیر محمود شاہ، عبداللہ انصاری کی نسل سے تھا جو صرف اپنی ذات سے بادشاہ ہوا۔ سلطان ابو سعید کے زمانے میں اس کا رتبہ بلند ہوا تھا۔ آپ کے قتل کے بعد وہ فارس چلا گیا تھا مگر جب شیخ حسن کوچک بادشاہ ہوا تو اس نے

فارس کی حکومت پیر حسن چوپانی کو دے دی، اس نے اصفہان شیخ ابو اسحق کے قبضے میں رہنے دیا۔ کچھ دنوں بعد جب اشرف عراق پہنچا اور اس نے شیراز پر چڑھائی کی تو پیر حسن بغیر لڑے بھاگ گیا۔ ابو اسحاق نے ملک اشرف کے آنے سے قبل شیراز پر قبضہ کر لیا۔ ملک اشرف اپنے بھائی کے مارے جانے کا حال سن کر راستے ہی سے آذربائیجان واپس ہو گیا اور ابو اسحق شیراز کا بادشاہ بن گیا۔

پھر امیر یاغی باستی امیر مسعود برادر ابو اسحق کی مدد سے شیراز کا بادشاہ ہو گیا مگر وہاں کے باشندوں نے اسے نکال دیا اور ابو اسحق اپنی بادشاہت پر واپس آگیا۔ وہ بہت سخی اور عادل بادشاہ تھا۔ قاضی عضد نے اپنی کتاب مواقف اسی کے نام پر لکھی تھی۔ خواجہ حافظ نے بھی اس کی تعریف میں اشعار لکھے ہیں۔ ۷۵۶ھ میں وہ امیر مبارز الدین سے شکست کھا کر قتل ہوا اور شیراز میں خاندان مظفر کی حکومت کا آغاز ہو گیا۔

آل مظفر

عزالدین عمر مرغنی وزیر غیاث الدین غوری کا بھائی تاج الدین عثمان قلعہ خنسار اور بعض علاقہ غور کا حاکم تھا۔ عثمان کے بعد عزالدین کا بیٹا رکن الدین اس کی جگہ حاکم ہوا۔ رکن الدین نے چنگیز خان کی اطاعت کی اور اس کے حکم سے تمام غور اس کو مل گیا۔ اس کا نواسہ شمس الدین امرائے چنگیز خان میں معتبر ہوا اور جب رکن الدین ۶۲۳ھ میں مر گیا تو اس کا نواسہ شمس الدین بن ابو بکر کرت، جو سلطان سنجر سلجوقی کی نسل سے تھا، اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔ یہی خاندان کرت کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس خاندان میں آٹھ بادشاہ گزرے۔

شمس الدین، رکن الدین، فخرالدین، غیاث الدین، شمس الدین، حافظ الدین، معزالدین حسین اور غیاث الدین۔ یہ سب خدابندہ کے باج گزار تھے مگر ان میں سے کئی بہت متعصب سنی تھے۔

غیاث الدین نے مغل سلطنت کے کمزور ہو جانے کے بعد سربدار خواجہ علی موید حاکم نیشاپور و بسطام پر صرف اسی لئے حملہ کیا تھا کہ وہ شیعہ تھا۔ تین سال کی مسلسل جنگ کے بعد فتح تو کر لیا مگر حکومت کسی طویل مدت تک باقی نہ رہی۔

امیر تیمور نے ۷۸۳ھ میں ہرات پر قبضہ کر لیا اور ایک سال بعد ۷۸۴ھ میں پیر محمد، ملک محمد، غیاث الدین اور علی بیگ جونی سب سمرقند لے جا کر قتل کروا دیئے گئے

جد اعلیٰ اس خاندان کا غیاث الدین حاجی خراسانی سجاوندی خوانی عراق عجم کے چند قطعات پر حاکم تھا۔ تاتاریوں نے جب خراسان پر یورش کی تو حاجی اپنے تینوں بیٹوں ابو بکر، محمد اور منصور کو لے کر علاء الدین اتابک کے پاس یزد چلا گیا علاء الدین نے ابو بکر بن حاجی کو تین سو سوار دے کر ہلاکو کی خدمت میں بھیج دیا جو فتح بغداد میں شریک ہوا۔ آخر ہلاکو نے اس کو مصر روانہ کیا جہاں وہ مارا گیا۔

منصور بن حاجی کے تین بیٹے تھے: محمد، علی اور مظفر، جن میں مظفر اتابک یوسف شاہ کے دربار میں امیر تھا، پھر ارغون کی خدمت میں رہا اور اس کا شمار بڑے امیروں میں ہونے لگا۔

۷۱۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ مظفر کے بعد اس کا بیٹا مبارز الدین الجائتو سلطان کی طرف سے باپ کے عہدے پر سرفراز ہوا۔ جب سلطان ابو سعید خان بادشاہ ہوا تو اس نے ۷۱۹ھ میں اس کو یزد کی حکومت عطا کی اور ۷۴۱ھ میں کرمان بھی دے دیا۔ مظفر کی اولاد میں چار بادشاہ ہوئے۔

مبارز الدین محمد

امیر شیخ ابو اسحٰق والی شیراز نے کئی مرتبہ اس پر یورش کی مگر ناکام رہا۔ آخر خود مبارز الدین نے چڑھائی کر کے ۷۵۶ھ میں شیراز فتح کر لیا۔ ابو اسحٰق کے مرنے پر جب مغلوں کی سلطنت ضعیف ہوئی تو وہ اصفہان اور آذر بائیجان پر بھی قابض ہو گیا اور اس نے اپنی سلطنت سندھ سے سرحد عراق تک قائم کر لی۔ آخر عمر میں وہ چھوٹے بیٹے ابو یزید کو ولی عہد کرنا چاہتا تھا مگر اس کے بڑے بیٹوں محمود اور شجاع نے اس کے داماد شاہ سلطان کی سازش سے اسے گرفتار کر کے اندھا کر دیا۔

جلال الدین شاہ شجاع

جلال الدین شاہ شجاع نے کرمان کی حکومت اپنے بھائی ابو یزید کو اور اصفہان کی محمود کو دی اور خود شیراز میں تخت نشین ہوا...... کچھ دنوں کے وقفہ سے چھوٹے بھائی محمود نے سلطان اویس حاکم بغداد و تبریز کی مدد سے شیراز پر قبضہ

کر لیا۔ شجاع نے کرمان میں قدم جما کر مقابلہ کیا اور فتح پائی مگر محمود دوبارہ حملہ آور ہوا اور پھر شیراز پر قبضہ کر لیا۔ محمود کے مرنے کے بعد شیراز پھر اس کے تسلط میں آگیا۔ اس اثناء میں بغداد کا حاکم اویس انتقال کر گیا اور اس کا بیٹا سلطان حسین اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔ شجاع نے خود تبریز جا کر سلطان کی بہن اپنے بیٹے زین العابدین کے عقد میں لی اور اصفہان کی حکومت اس کے سپرد کر دی۔ وہ کمالات باطنی اور فضائل نفسانی کے سبب مشہور تھا۔ حافظ شیرازی اس کے زمانے کے مشاہیر میں سے تھے۔ مرتے وقت اس نے اپنی سلطنت اس طرح تقسیم کی کہ اصفہان یحییٰ کو، کرمان احمد کو اور شوستر منصور کو دیا اور زین العابدین کو اپنی جگہ تخت نشین کیا۔

زین العابدین

زین العابدین سے اس کے چچا ابو یزید، شاہ یحییٰ اور شاہ منصور سے اکثر لڑائیاں ہوتی رہیں، آخر حاکم شوستر منصور نے اس کو گرفتار کر کے آنکھوں میں نیل کی سلائیں پھروا دیں۔ یحییٰ نے شیراز لے لیا اور پھر منصور نے اسے فتح کر لیا اور یحییٰ یزد چلا گیا۔

منصور

منصور اس وقت تک شیراز کا فرمانروا رہا جب تک امیر تیمور نے اس کو فتح نہیں کر لیا۔ تیمور نے پہلے اس کو قتل کیا پھر احمد والی کرمان، یحییٰ والی تبریز، مہدی ابن شجاع، معزالدین جہانگیر بن یحییٰ اور ابو اسحاق، کل سلاطین آل مظفر کو طلب کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا اور فارس کی سلطنت اپنے بیٹے عمر شیخ مرزا کو تفویض کر دی، حکومت کرمان امیر برلاس برادر امیر جاکو کو اور یزد کی حکومت ملوکہ چین کو عطا کی۔

سربداران (خراسان)

سلطان ابو سعید کے زمانے میں خواجہ فضل اللہ باشتینی کا بیٹا عبدالرزاق پہلوان سرداری کے عہدے پر مامور تھا ۷۳۶ھ میں کرمان کا خراج وصول کرنے کے لئے بھیجا گیا تو راستے میں سلطان کی خبر وفات کان میں پڑی لہذا وہ کرمان جانے کے

بجائے اپنے وطن پاشتین آگیا جہاں اس نے کچھ آدمی جمع کئے اور حاکم پاشتین کے بھانجے کو قتل کر کے پاشتین پر قبضہ کر لیا پھر سبزوار فتح کر کے اس کو دارالسلطنت بنا لیا

یہ خاندان اثنا عشری شیعہ تھا۔ بتدریج بسطام وغیرہ کے علاقے بھی اس کے قبضے میں آگئے۔ مدت حکومت صرف تیس بتیس سال ہی رہی مگر اپنی خصوصیات کے اعتبار سے قابل ذکر ہے۔

خواجہ عبدالرزاق

قیام حکومت کے بعد وہ اس پر قبضہ ہی جما رہا تھا کہ اس کے بھائی وجیہ الدین نے اس کو قتل کر دیا اور خود تخت نشین ہو گیا۔ عبدالرزاق کی مدت حکومت ایک سال دو ماہ تھی۔

خواجہ وجیہہ الدین

خواجہ وجیہہ الدین نے امیر ارغون سے نیشاپور چھین لیا۔ طغا تیمور نے اس پر حملہ کیا تو شکست کھائی پھر اس نے خود ہرات پر دھاوا بولا مگر ہزیمت یاب ہوا اور گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا۔

محمو تیمور

محمد تیمور کی مدت حکومت صرف دو سال تھی، ۷۴۴ھ میں علی شمس الدین کے ہاتھ سے مارا گیا اور اس نے اسکے بجائے کلو اسفندیار کو بادشاہ بنا دیا۔

کلو اسفندیار

ایک سال کے اندر ہی تلوار کے گھاٹ اتر گیا۔

شمس الدین بن فضل اللہ

خاندانی جھگڑوں کے سبب سات ماہ بعد ہی برطرف کر دیا گیا۔

شمس الدین علی

شمس الدین علی نے پونے پانچ سال تک بڑے عدل و انصاف سے حکومت کی مگر کوئی اس کا چھپا دشمن تھا، جس نے دھوکے سے قتل کرا دیا۔

خواجہ یحییٰ

خواجہ یحییٰ سخی اور عادل بادشاہ تھا۔اس نے حیدر پہلوان کو سپہ سالار بنایا

اور طغا تیمور کو ہلاک کر کے مازندران پر قبضہ کر لیا۔اس کے زمانے میں سلطنت کی حدود وسیع اور مضبوط تھیں۔اس کے برادر نسبتی نے اس کے بھائی علاء الدولہ سے سازش دھوکے سے قتل کر دیا۔

خواجہ ظہیر الدین

خواجہ ظہیر الدین، حیدر پہلوان کی مدد سے تخت پر بیٹھا مگر عیاش اور شراب خوار تھا، اصلاح کا موقع دیئے جانے کے باوجود نہ سدھرا تو اس کو معزول کر دیا گیا اور حیدر پہلوان کو اس کا جانشین بنایا گیا۔

حیدر پہلوان

حیدر پہلوان بڑا سخی اور منصف مزاج تھا اور فنون حرب کا ماہر بھی مگر اسفرائن کے محاصرے میں حسن دامغانی کے ہاتھ سے مارا گیا۔

لطف اللہ

لطف اللہ حسن پہلوان کی مدد سے بادشاہ ہوا لیکن ایک سال چار ماہ بعد خود حسن اسے مار کر تخت نشین ہو گیا۔

حسن پہلوان

حسن پہلوان نے چار سال سات ماہ رعب و داب سے حکومت کی مگر سازشوں پر قابو نہ پا سکا اور علی موید کے ہاتھ سے قتل ہو گیا۔

خواجہ علی موید

خواجہ علی موید کوئی کامیاب حکمراں ثابت نہیں ہوا۔غیاث الدین کرت نے نیشاپور اس سے چھین لیا۔ امیر تیمور کے خراسان پہنچنے پر اس نے تیمور کی اطاعت قبول کر لی۔تیمور نے اس کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا مگر خود اس کو اپنے امراء میں داخل کر لیا پھر ایک فوج کا سردار بنا دیا، تیموری کی طرف سے وہ کردستان بھیجا گیا تو ایک معرکے میں شدید زخمی ہوا اور جانبر نہ ہو سکا۔سربداران کا وہ آخری بادشاہ تھا۔اس کی مدت حکومت سولہ سال سات ماہ تھی۔

خاندان تیموریہ

تومنائی خان مغل چنگیزخان کا جد چہارم تھا۔ تومنائی کے بیٹے کا پوتا قراچار نویاں چغتائی خان بن چنگیزخان کے دربار میں امیر الامراء تھا۔اس کی اولاد شہر سبزوار کش میں آباد رہی۔ قراچار نویاں کے پوتے کا پوتا تراخائی نویاں تیمور کا باپ تھا

تیمور ۷۳۶ھ میں شہر کش میں پیدا ہوا۔ ۷۶۱ھ میں تراخائی نے ماوراء النہر فتح کرکے شہر سبزاور کش تیمور کو دیدیا۔ وہ لپنے سالے امیر حسین والی افغانستان و ماوراء النہر کو قتل کرکے تخت نشین ہوا اور سمرقند کو دار لحکومت بنالیا۔

پھر اس نے ماوراء النہر اور شرغان فتح کرکے خوارزم پر یورش کی، شیخ یوسف صوفی کو شکست دی، ۷۷۶ھ میں قمرالدین خان کو شکست دے کر کاشغر کا علاقہ چھین لیا اور ارس خان حاکم سفلستان کو مغلوب کیا، ۷۸۱ھ میں خوارزم فتح کرلیا، اترار اور دشت خفچاق جوجے خان کی اولاد سے لے کر توعتمش خان کو دیدیا، ۷۸۳ھ میں فوشنج فتح کرکے ہرات خاندان کرت سے چھڑایا، جونی قربانی حاکم طوس اور علی موید سربداری کو مطیع کیا، شیخ داؤد سبزواری کا استیصال کیا، قطب الدین سیستانی کی سرکوبی کی اور اس کا علاقہ لے لیا اور قندہار اور تمام افغانستان فتح کیا، از بکستان کے مفسدوں کو سزا دی، جرجان، مازندران کو مسخر کیا، امیرولی والی استرآباد کو معزول کرکے وہ علاقہ لقمان شلعر بن تغاتیمور کو دیا، ۷۸۷ھ میں سلطانیہ تک کا کل ملک فتح کرلیا، احمد جلائر کو شکست دی (جو بایزید سلطان روم کے پاس بھاگ گیا)، آذربائیجان کو مسخر کیا، گرجستان فتح کیا پھر فارس میں پہنچ کر اعزاء الدین اردستانی کو سزادی جس نے حجاز کا قافلہ لوٹا تھا۔ جونی قربانی حاکم طوس اور سربداری قتل ہوئے۔ ۷۸۹ھ میں قرا محمد ترکمان پریورش کرکے قلعہ دان وغیرہ فتح کرائے۔ عمر شیخ مرزا ولد تیمور اس لڑائی میں مارا گیا پھر اصفہان میں آکر قتل عام کرایا، ۷۹۵ھ میں شاہ منصور حاکم شیراز کو قتل کیا اور آل مظفر پر کامیاب ہوکر فارس پر قبضہ کیا۔

پھر بغداد فتح کرکے قتل عام کرایا، احمد جلائر اب مصر کی طرف بھاگ گیا۔

۷۹۰ھ میں توعتمش والی خفچاق نے سرکشی کی، اسے مغلوب کیا اور روس میں ماسکو تک گھس گیا اور ماسکو فتح کرکے جلادیا اور دشت خفچاق کی حکومت لپنے ایک ملازم اورلوس جوجے خان کے سپرد کی۔ ادھر چین تک کا تمام ملک فتح ہوا۔ آذربائیجان میں واپس آکر آذربائیجان اور عراق کی حکومت لپنے بڑے بیٹے میران شاہ کو اور خراسان دوسرے بیٹے شاہ رخ کو سپرد کرکے سمرقند آیا، ۸۰۱ھ میں سندھ کو عبور کرکے ہند پر حملہ کیا۔ سکندر بت شکن والی کشمیر نے وکیل بھیج کر اطاعت قبول کی۔ تیمور نے دہلی پر حملہ کیا تو محمود تغلق نے لپنے وزیر ملو خان کے ہمراہ مقابلہ کیا مگر شکست کھاکر گجرات کی طرف بھاگ گیا۔ تیمور نے دہلی فتح کرکے لپنے نام کا خطبہ پڑھا، ۱۵ دن دہلی میں رہ کر بھرتپور فتح کیا اور کوہ شوالک کا علاقہ فتح کرتا ہوا سید خضرخان کو ملتان کا صوبہ دار بناکر سمرقند آیا۔ ۸۰۲ھ میں پھر ایران آیا، شہزادہ سکندر بعد فتح وانتظام مغلستان وخطاوختن کے خدمت میں آکر مستحق تحسین ہوا۔ ۸۰۳ھ میں ایشیاء کوچک پر یورش کرکے سیواس اور ملاطیہ فتح کیا، بہت سے نصارے قتل کیے، مسلمانوں کو امان دی، شاہ رخ مرزا ابلستان (سائبریا) بھیجا گیا اس نے وہاں جاکر ترکمانوں کو شکست دی اور خود تیمور تیمور تاش حاکم حلب، حمص حماۃ اور بعلبک کو فتح کرکے دمشق آیا فرخ شاہ والی مصر منہزم ہوا، تیمور نے دمشق میں قتل عام کراکے شہر کو مسمار کیا پھر گرجستان ہوتا ہوا بغداد آیا اور احمد جلائر کے گماشتہ کو بغداد سے نکال دیا، ۸۰۴ھ میں تبریز آیا اور روم پر یورش کی، انقرہ (انگوریہ) کی لڑائی میں سلطان بایزید یلدرم شکست کھاکر پکڑا گیا اور قید ہی میں مرگیا، پھر قلعہ ازمیر (سمرنا) کو فتح کرکے مسمار کیا۔ روم کی فتح کے بعد ملک فرخ برقوق ناصر شاہ والی مصر بھی مطیع ہوگیا اور مصر میں تیمور کے نام کا سکہ وخطبہ جاری ہوا مگر قرایوسف ترکمان مطیع نہ ہوا، آخر شکست کھاکر مصر چلا گیا۔ ۸۰۵ھ میں ملک کرکین حاکم گرجستان مطیع ہوا۔ یکم محرم ۸۰۷ھ کو امیر تیمور سمرقند واپس آیا اور چین پر آٹھ لاکھ فوج سے چڑھائی کی، راستہ میں ختن فتح کیا مگر شعبان ۸۰۷ھ میں بیمار ہوکر مرگیا حسب وصیت سمرقند میں لاکر دفن کیا گیا۔ عمر ۷۱ برس پائی

فتوحات کے لحاظ سے تیمور لاثانی تھا۔ دنیا میں کسی بادشاہ نے اتنی بڑی سلطنت پر حکومت نہیں کی۔ دیوار چین سے وسط روس یعنی ماسکو اور بحیرہ روم اور دریائے نیل سے دریائے گنگ تک تمام ملک اور خلقت اس کے زیر حکم تھی:
توران، ترکستان، تمام ممالک ایران، گرجستان، چین، ختن، کاشغر، بدخشاں، افغانستان، خراساں، خوارزم، عراق، عرب، کچھ، مکران، شمالی ہندوستان، روم، شام اور حجاز میں سکہ اور خطبہ اسی کے نام کا جاری تھا۔ اسے ایشیاء میں صرف جاپان، ہندچینی اور چین فتح کرنا باقی رہ گیا تھا۔ تیمور کے زمانے میں علامہ تفتازانی، میر سید شریف لیسان الدین محمد نجومی، شمس الدین محمد حافظ شیرازی اور شیرازی صاحب قاموس اور مغربی خواجہ علی شطرنجی مشہور علماء گزرے ہیں۔

تیمور نے اپنے ایام مرض میں اپنے پوتے پیر محمد ولد جہانگیر کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور اپنی سلطنت کو اپنی اولاد میں اس طرح تقسیم کیا:

ہرات، خراساں، مازندران، جرجان اپنے بیٹے مرزا شاہ رخ کو

آذربائیجان، رے اور بغداد دوسرے بیٹے میراں شاہ اور اس کے دو بیٹوں مرزا عمر اور مرزا ابوبکر کو

شیراز، اصفہان، کرمان اور یزد اپنے مرحوم بیٹے عمر شیخ مرزا کے دو بیٹوں پیر محمد اور مرزا رستم کو

ولایت، حبہ تا حدود ختا الغ بیگ بن شاہ رخ کو

کاشغر و ختن ابراہیم سلطان بن شاہ رخ کو۔ اسی طرح دیگر علاقے اپنی دیگر اولاد کو عطا کئے۔ اس کی سلطنت کی مفصل تقسیم اس شجرہ سے صاف اور واضح طور پر ظاہر ہو گی۔ تیمور کی وفات کے بعد صرف ایران، ترکستان اور افغانستان اس کی اولاد کے قبضہ میں رہا دیگر مفتوحہ ممالک نے تیمور کے مرتے ہی اپنی آزادی بحال کر لی، بقیہ مقبوضات بھی آپس کی تقسیم اور جنگ باہمی کی وجہ سے سو برس سے زیادہ خاندان تیموریہ کے قبضے میں نہ رہے۔ آخر میں تیمور کے پوتے بابر کی ہندوستان میں مغلیہ سلطنت ۱۸۵۷ء تک قائم رہی۔

سلطنت تیموریہ کا دورانیہ ایک سو چالیس سال ہے، چودہ فرمانروا اس کی

نسل سے گزرے جو آپس میں اور چنگیز خان کے خاندان کے دوسرے حکمرانوں سے ٹکرا ٹکرا کر ختم ہوتے رہے۔

بادشاہ	سنہ جلوس	سنہ وفات
امیر تیمور	۷۷۱	۸۰۷
مرزا خلیل بن میراں شاہ	۸۰۷	۸۱۱
سلطان سعید شاہ رخ بن تیمور	۸۰۷	۸۵۰
جلال الدین میراں شاہ بن تیمور	۸۰۷	۸۱۲
مرزا پیر محمد بن عمر شیخ بن تیمور	۸۰۷	۸۱۴
الغ بیگ بن شاہ رخ بن تیمور	۸۵۰	۸۵۳
علاء الدولہ ابن بائسنقر بن شاہ رخ	۸۵۰	۸۶۵
سلطان محمد بن بائسنقر بن شاہ رخ	۸۵۰	۸۵۴
ابوالقاسم بابر بن بائسنقر بن شاہ رخ	۸۵۴	۸۶۱
عبداللطیف بن الغ بیگ بن شاہ رخ	۸۵۲	۸۵۴
ابوسعید بن سلطان محمد بن میراں شاہ	۸۵۵	۸۷۳
سلطان حسین بن غیاث الدین بن بائسنقر ابن عمر شیخ	۸۷۳	۹۱۱
بدیع الزماں بن سلطان حسین	۹۱۱	۹۲۰

تیمور کو شیعہ حلقہ ارادت میں شامل نہیں کیا جا سکتا مگر وہ سنی بھی نہ تھا، وہ صرف ایک مسلم حکمران تھا، تسخیر ملک جس کا مسلک اور جہانگیری جس کا نصب العین تھا۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد اس نے جو تیموریہ مغل سلطنت قائم کی اس کی بنیاد شیعہ و سنی حکومتوں کے خاکستر پر رکھی ہوئی تھی۔

در حقیقت اس کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ کسی کا کیا عقیدہ ہے اور کون کس کو مانتا ہے، اس کو تو بہادر اور بے جگر سپاہی درکار تھے جن کی شمشیر خارا شگاف پہاڑوں کو توڑ دیتی۔ ایسے جیالے درکار تھے، خونریزی جن کی فطرت اور بربریت جن کی عادت ہو لہذا ایسے ہی سپاہی لے کر وہ نکلا تھا.......... پھر بھی روایتی طور پر کہا جاتا ہے کہ روضہ امام حسین سے اس کو خاص عقیدت تھی اور عموماً عاشور محرم کو وہ کربلا جایا کرتا تھا۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی فوج میں شیعہ کافی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی خوشنودی کے لئے وہ ایسا کرتا ہو لیکن اس خیال کو تقویت اس

لئے نہیں ہو سکتی کہ کربلا کے بعض سادات کا وہ احترام بھی کرتا تھا اور انہیں عطیات سے نوازتا بھی تھا۔

ایک بزرگ سید کے بارے میں مشہور ہے کہ ہر بار وہ امیر تیمور کو نادرات پیش کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سید نے ضریح مقدس کی ایک نقل پیش کی جو کربلا کی مٹی سے بنائی گئی تھی۔ ایک بار ایک تسبیح دی جس کے بہتر دانے عاشور کو سرخ ہو جاتے تھے۔ تیمور کو عقیدہ ہو نہ ہو مگر یہ چیزیں اس نے احتیاط سے رکھیں

امیر تیمور کا نام نامی فاتحین عالم میں سکندر اعظم اور چنگیز خان کے بعد لیا جاتا ہے۔ اس کی عمر بھی گھوڑے کی پیٹھ پر گزر گئی۔ ۸۰۱ھ میں جب وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا، اس کے بعد جو عاشور اس کو دلی میں پڑا اس کی شب میں اپنی سپاہ کی تالیف قلب کے لیئے اس نے متذکرہ نقل روضہ ایک عماری میں رکھ کر گشت کرائی اور ضریح پر وہ تسبیح بھی لٹکا دی۔ شاید اس کے بعد اس نے ہر شب عاشور اس عمل کو دہرایا ہو۔

پھر بادشاہ کی تقلید میں اس گشت نے رواج کی صورت اختیار کر لی۔ ہندوستان میں اسی کو جلوس تعزیہ کا آغاز قرار دیا جاتا ہے...... اس کی تاریخی حیثیت پر کوئی بحث ایک فاضل کام ہو گا کیونکہ مجلس عزاء اور جلوس کا وجود اس سے قبل بھی پایا جاتا تھا........ تیمور کے اس عمل سے نوعیت جلوس ضرور بدلی اور شیعوں پر اس کا یہ احسان ہے کہ اس نے مظاہرہ غم کا ایک اضافی راستہ دکھا دیا۔

ایک جائزہ

شیعیت کی بساط اشاعت پر ایک نظر ڈالی جائے تو اس کا نقطہ آغاز مدینہ تھا جس کا پھیلاؤ یمن اور مضافات یثرب و بطحیٰ میں صحرائی قبائل تک ہوا تھا پھر کوفہ و بصرہ تک اس کا دامن کشادہ ہوا۔ بنی امیہ کی سختیوں نے وقتی طور سے اس کی اشاعت پر پہرے بٹھا دیئے اور بظاہر وہ ناپید ہو گئی لیکن شیعہ علماء نہایت خاموشی سے جہاد لسان و قلم کرتے رہے۔

زمانہ کچھ سازگار ہوا اور شیعوں کو علاقائی طور پر اپنے عقائد کے اظہار کا موقع ملا تو شیعوں کے گروہ میں پرانے چہروں کے ساتھ نئے چہرے اور خاندانی

شیعوں کے دوش بدوش نئے شیعہ نظر آئے اور ان سب نے مل کر حصول اقتدار کیلئے جہاد بالسیف میں حصہ لیا۔

شیعہ حکومتیں بنیں اور ختم ہو گئیں اور ان کی جگہ غزنویوں، سلجوقیوں اور ایوبیوں نے لے لی۔ ایک بار پھر شیعوں کا دور ابتلاء شروع ہوا لیکن وہ تلواروں کی چھاؤں میں اور سردار زندہ رہنے کے عادی تھے اس لئے مر مر کر جیتے رہے۔ آخر منگولیا کے زرد طوفان نے سب کچھ ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔

عراق و ایران اور شام میں مغل حکومت کے استقرار کے بعد جب تاتاریوں کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی ابتداء ہوئی تو ہر مکتبہ فکر کے علماء نے اپنی صداقت کا مظاہرہ شروع کیا ان میں حنفی بھی تھے مالکی بھی، شافعی بھی تھے اور حنبلی بھی۔ انہیں میں ایک چہرہ امام ابن تیمہ کا بھی تھا...... اور سب کے آخر میں ایک مظلوم طبقے کے اہل علم بھی۔

اس خاموش جہاد میں شیخ نصیر الدین طوسی اہل بیت کے نمائندے تھے اور ان کے دوش بدوش بعض دوسرے علماء بھی۔ اس عہد میں شیعہ علماء نے اپنی حقانیت کے جو بیج بوئے، وہ بار آور ہوئے بغیر نہ رہے اور علامہ حلی تک پہنچتے پہنچتے مغل اور ترک ذہنوں میں اسلام کی وہ تصویر مرتسم ہو چکی تھی جس کے خال و خد تعلیمات آل محمدؐ کی روشنی میں درست کئے گئے تھے۔

کتنے سنی ہوئے؟ کتنے شیعہ؟ اس کا فیصلہ اس لئے بھی نہیں ہو سکتا کہ پہلے سے شیعہ بہت کم تھے اور سنی بہت زائد۔ یہی صورت حال تیمور کے حملے کے وقت باقی تھی جس میں تیمور کے بعد کچھ اضافہ ہوا، کیونکہ اب خود مغلوں اور ترکوں میں بھی عالم پیدا ہو چکے تھے۔ تاریخ نے جو کچھ دیکھا، وہ اتنا ہی کہ اکثر حکمراں قبائل شیعہ تھے اور انفرادی طور پر جو شیعہ، سنی اکثریت کے گھیرے میں تھے، وہ اپنے عقیدے کے بارے میں کسی سے کوئی بات ہی نہ کرتے۔

اس طرح ایران میں شیعہ قبائل کا سلسلہ نسب یا تو ہلاکو خان کی اولاد سے جا کر مل جاتا تھا یا تیمور سے۔ یہی حال سنیوں کا بھی تھا، عراق میں سنی اور شیعہ حلقے بیشتر عراقیوں ہی کے تھے۔ (۴۱)

سلطنت صفویہ

خاندانی پس منظر

شیخ صفی الدین اسحٰق کا نام سب سے پہلے ابو سعید کے دور میں آتا ہے جو ہلاکو خان کی نسل میں محمد خدا بندہ کے بعد تخت نشین ہوا، محمد خدا بندہ کے عہد سے مغل دربار میں شیعہ علماء وفقہاء کو برتری حاصل تھی اور ان میں صفی الدین ایک موقر بزرگ گردانے جاتے تھے۔

انہوں نے شیعیت کی تبلیغ و اشاعت میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور مغلوں کی بڑی تعداد کو حلقہ بگوش اسلام کیا۔

تاریخ کی یاد میں ان کا سلسلہ نسب حضرت موسیٰ کاظمؑ سے جا کر ملتا ہے اور عراق میں ان کے جن آباء و اجداد کا پتہ چلتا ہے وہ دوسرے سادات کی طرح مظالم سے بچنے کی خاطر ٹولیوں میں ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل ہوتے رہے اور آخر اردبیل میں آکر سکونت پذیر ہو گئے۔

خواجہ علی، شیخ صفی الدین کے پوتے تھے جو ایک صاحب کرامت درویش تھے۔ امیر تیمور ان کا بڑا معتقد تھا یہ سلسلہ ان کی کئی پشتوں سے چلا آرہا تھا اور اس کے بعد بھی جاری رہا۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ خواجہ علی کے پوتے شیخ جنید کے ہزاروں مرید تھے اور یہ مقبولیت بڑھتی جارہی تھی جس سے خائف ہو کر جہاں شاہ بن قرا یوسف نے انہیں اپنے علاقے سے نکال دیا اور وہ اردبیل سے حلب آگئے پھر حلب سے دیار بکر چلے گئے۔

اب شیخ جنید ایک مرشد معجز نما تھے لیکن ان کا انداز تصوف دوسرے سجادہ نشینوں کا سا نہ تھا۔ وہ فقیروں کے بھیس میں تماشائے اہل کرم نہ دیکھتے بلکہ

باحیثیت لوگوں کو غریب نوازی کی تلقین بھی کرتے تھے۔ خود وہ مسجد کوفہ کے ولی کامل کا طوق غلامی گلے میں ڈالے تھے لہٰذا اپنے مریدوں کو بھی اہل بیت کے لئے جینے اور اسلام کے لئے مرنے کا درس دیتے تھے۔

اسی لئے کچھ دن بعد انہوں نے دیار بکر سے گرجستان کا رخ کیا اور کفار سے جہاد کا فریضہ انجام دیا جس میں انہیں کامیابی ہوئی اور ایک بڑی تعداد مسلمان ہوئی پھر وہ شیروان کے عازم ہوئے۔

والی شیروان نے ان کے داخلے پر پابندی لگائی لہٰذا جنگ ہوئی اور شیخ جنید نے شہادت پائی۔ باپ کی جگہ بیٹے نے لی اور سلطان حیدر نے ارادتمندوں کو منظم کرکے پھر مقابلہ کیا مگر انہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی اور وہ بھی میدان میں کام آگئے

سلطان حیدر کے تین بیٹے تھے: ابراہیم علی شاہ، اسمٰعیل علی شاہ اور سلطان علی شاہ۔ یہ تینوں اعزا اقربا اور بچے کھچے مریدوں کو لے کر دیار بکر پہنچے تو رستم بیگ ولد حسن سد راہ ہوا۔ وہ اپنے علاقے میں ان کا رہنا خطرے سے خالی نہ سمجھتا اس لئے نوبت مقابلہ کی آگئی۔ جنگ آزمودہ اور ناتجربہ کار لوگوں کا مقابلہ تھا لہٰذا میدان تجربہ کاروں کے ہاتھ رہا اور سلطان علی شاہ نے اپنا مقصد حیات پورا کر دیا۔

باقی بچے دو بھائی، ابراہیم علی شاہ اور اسمٰعیل علی شاہ، وہ بقیۃ السیف کو لے کر گیلان چلے گئے جہاں ان کی پذیرائی ہوئی......... اسی مقام سے ان کی ملک گیری کا آغاز ہوا۔

استقرار حکومت

امیر تیمور نے ۷۸۳ھ سے ۸۹۵ھ تک بیشتر چنگیزی حکمرانوں سے ان کی حکومتیں چھین کر ایک مضبوط تیموری حکومت قائم کر دی تھی لیکن نویں صدی ہجری شروع ہوتے ہوتے خود ان کی حالت بھی چنگیزیوں جیسی ہو گئی تھی۔ ہر طرف اقتدار کی کشمکش تھی، دو تین خاندانوں نے مختلف حلقوں کو بانٹ رکھا تھا اور ایک دوسرے کا ملک چھین لینے کے لئے میدان داری کر رہا تھا۔

ان حالات کا گہرا مشاہدہ اسمٰعیل نے کیا تھا اور ممکن ہے کہ اس کے ذہن

میں قیام حکومت کا کوئی خیال بھی ہو جس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ ۹۰۵ھ میں چار سو مریدوں کو لیکر گیلان سے نکلا آذر بائیجان کے مختلف علاقوں سے جنید کے کچھ مرید اور آکر مل گئے اور اسمٰعیل شیروان کی طرف چل پڑا۔ شاید اسے فرخ شاہ والی شیروان سے باپ اور بھائی کے قتل کا بدلہ لینا تھا۔

سلطان حیدر کی شہادت اسمٰعیل کی دیکھی ہوئی بات تھی۔ اس کے بعد سے وہ رزم گاہوں کا نزدیک سے دور سے جائزہ لیتا رہا تھا۔ وہ ایک خاندانی سجادہ نشین کا وارث تھا لیکن میدان جنگ بھی اس کے لئے کوئی اجنبی جگہ نہ رہی تھی۔ اس کو صرف جہاد کا شرف یا شہادت کی عزت حاصل نہیں کرنا تھی بلکہ اس کا نصب العین دشمن کو ہٹا کر اس کے ملک پر قبضہ کر لینا بھی تھا۔

والی شیروان درویشوں کو کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ ڈالنے کے لئے شیروان سے نکلا تو اس کو محسوس ہوا کہ دلق پوشوں نے اپنے قالب بدل ڈالے اور بھوکے شیروں کی طرح اس کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ فرخ مرزا لڑتا ہوا مارا گیا اور اسمٰعیل نے شیروان میں صفوی حکومت کا پہلا پتھر رکھ دیا۔

الوند مرزا والی تبریز اپنے کو آذر بائیجان کا بادشاہ سمجھتا تھا۔ اس کو جب خبر ملی کہ ایک خانقاہی سرفروش شیروان کا حاکم بن گیا تو وہ اس کی گوشمالی کے لئے ایک بڑا لشکر لے کر روانہ ہوا۔ ۹۰۷ھ میں بمقام شرور اسمٰعیل نے اس کو روکا۔ گھمسان کا رن پڑا، جنیدی مرید سروں سے بے نیاز ہو کر لڑے اور آخر انہوں نے دشمنوں کے منہ پھرا دیئے۔ الوند مرزا آق قونیلو رزم گاہ سے بھاگ نکلا اور اسمٰعیل تبریز پر قابض ہو گیا جہاں سے صحیح معنی میں سلطنت کا آغاز ہوا۔

اس خاندان میں یکے بعد دیگرے گیارہ فرمانروا سریر آرائے سلطنت ہوئے

ابو المظفر شاہ اسمٰعیل صفوی، طہماسپ اول بن اسمٰعیل، اسمٰعیل ثانی بن طہماسپ، محمد خدا بندہ بن طہماسپ، عباس اول بن خدا بندہ، صفی اول بن سام بن عباس، عباس ثانی بن صفی اول، سلیمان اول بن عباس ثانی، حسین بن سلیمان، طہماسپ ثانی بن حسین، عباس ثالث بن طہماسپ ثانی، مدت حکومت دو سو اکتالیس سال رہی۔

شاہ اسمٰعیل صفوی

اسمٰعیل صفوی بادشاہت کا اعلان کرنے سے قبل تقیہ میں تھا، تخت پر بیٹھتے ہی شیعیت کا اعلان کر دیا۔ اس نے تشیع کی اشاعت میں ہر ممکن کوشش کی سکے میں ایک طرف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی ولی اللہ، دوسری طرف اپنا نام کندہ کرایا یہی قزلباشوں کی ٹوپیوں پر بھی کڑھوایا۔

تیموری گورنروں اور چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کو اس نے بہت جلد مطیع کر لیا۔ سلطان مراد، جو عراق، شیراز، کرمان و اصفہان کا بھی حکمراں تھا، اس کی بڑھتی طاقت دیکھ کر حملہ آور ہوا مگر اس نے اس کو ہمدان کے معرکے میں شکست دی اور مراد نے بغداد پہنچ کر دم لیا۔ اسمٰعیل نے اصفہان و شیراز وغیرہ پر بھی قبضہ کر لیا، پھر مازندراں و جرجان فتح کیا اور چند ہی سال میں اس کی قلمرو کی حدود دریائے جیحوں سے خلیج فارس تک اور افغانستان سے دریائے فرات تک پہنچ گئیں اس کے بعد اس نے بغداد بھی لے لیا، ۹۱۷ھ میں محمد خان شیبانی والی ماوراء النہر نے اس کے علاقے پر تاخت کی۔ اسمٰعیل نے مشہد میں اس کو پسپا کیا، وہ مرو میں محصور ہو گیا اور آخر کار قتل ہوا۔

۹۲۰ھ میں سلطان سلیم نے آذر بائیجان پر حملہ کیا اور چالدران کی جنگ میں اس کے لشکر کو شکست دی۔ وہ بغداد کی طرف پسپا ہو گیا۔ اسمٰعیل جوابی حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ سلیم تبریز میں مقیم رہ کر قسطنطنیہ واپس ہو گیا، اسمٰعیل کی اس شکست کا سبب یہ تھا کہ سلطان سلیم بڑی توپیں لے کر آیا تھا اور قزلباشوں کے پاس اس وقت تک توپیں نہ تھیں۔

اب اسمٰعیل صفوی ترکستان، خراسان و طبرستان کی وسیع سلطنت کا تاجدار تھا اور طول و عرض کے حکمراں اس کے زیر نگیں تھے۔ بدخشاں کے حاکم سلطان اویس اور کابل کے بادشاہ بابر نے اپنے ایلچی اس کی خدمت میں بھیجے جو ہرات میں باریاب ہوئے اور قرار پایا کہ دریائے جیحوں کے اس طرف کا علاقہ ایران کا اور اس پار افغانستان کا علاقہ متصور ہو گا

اس کے بعد اسمٰعیل صفوی نے بیرام بیگ قرامانی کو اندخو، شرغان، میمنہ اور فاریاب کا گورنر مقرر کیا اور قم پہنچ کر اقامت پذیر ہوا۔

اس درمیان خبر ملی کہ ازبکوں نے عہد شکنی کر کے دریا پار علاقہ ایران پر قبضہ کر لیا ہے اور نجم ثانی حاکم خراسان کو گرفتار کر کے اپنے بادشاہ کے پاس بھیج دیا ہے اور عبداللہ خان ازبک نے اس کو قتل کرا دیا ہے۔ اسمٰعیل یہ اطلاع پاتے ہی بذات خود اٹھ کھڑا ہوا اور ازبکوں پر ایسی سخت یلغار کی کہ ان کو پامال کر کے رکھ دیا۔

۹۳۰ھ میں اس کا انتقال ہو گیا اور چوبیس سال کی حکمرانی میں وہ ہر اعتبار سے ایک مستحکم سلطنت چھوڑ گیا۔

شاہ طہماسپ اول

طہماسپ صفوی صرف گیارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ شاہ اسمٰعیل نے ازبکوں کو سخت سزا دی تھی مگر نئے بادشاہ کی نابالغی سے فائدہ اٹھا کر عبداللہ خان خراسان پر چڑھ دوڑا اور علاقے کو تاراج کیا۔ طہماسپ کم سن ہونے کے باوجود مقابلے کے لئے نکلا۔ عبداللہ خان اس کے آنے کی خبر پاتے ہی پیٹھ دکھا گیا اور طہماسپ بھی مصلحت وقت سمجھ کر اس کے علاقے میں داخل نہ ہوا۔

کچھ دنوں بعد، جب اس نے عنان سلطنت پوری طرح سنبھال لی تو قندھار پر یلغار کی اور اس کو فتح کر کے خاندان قاچار کے ایک سردار کو وہاں کا گورنر بنا دیا عبداللہ خان ازبک نے اس کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ غلط نکلا تو مجبور ہو کر اس نے صلح کی درخواست کی جو طہماسپ نے منظور کر لی۔ اس کے بعد طہماسپ نے شہر تفلس اور گرجستان فتح کیا۔ اس پر سلطان سلیمان والی ترکی نے اس پر حملہ کیا۔ تبریز، زنجان اور اردبیل میں طہماسپ و سلیمان کے سخت معرکے ہوئے اور سلیمان کو واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ کچھ وقفہ سے سلیمان نے پھر حملہ کیا، آخر دونوں میں صلح ہو گئی۔

۹۵۰ھ میں ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر طہماسپ صفوی کی پناہ

میں آیا۔ بیرم خان ترکمان اس کے ساتھ تھا جو شاہ طہماسپ کا ہم عقیدہ بھی تھا اور بعض حوالوں سے جانا پہچانا بھی اور یوں بھی سلاطین صفویہ بڑے کشادہ دل اور وسیع النظر تھے۔ طہماسپ نے ہمایوں کا خیر مقدم کیا اور کسی بادشاہ کی طرح مہمان بنایا پھر دس ہزار سوار دے کر رخصت کیا۔ یہی وہ مدد تھی جس کی بدولت ہمایوں دوبارہ ہندوستان کی سلطنت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا۔

آخر ۶۶ برس کی عمر میں شاہ طہماسپ پچپن سال تک بڑے دبدبے کی حکومت کر کے انتقال کر گیا۔

شاہ اسمٰعیل ثانی

شیعوں کے بارے میں جہاں بہت سی غلط باتیں مشہور کی جاتی ہیں وہاں ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ بڑے متعصب ہوتے ہیں، سنیوں کو کبھی اپنے اقتدار میں شامل نہیں کرتے، حالانکہ دیکھا جائے تو اس کا اطلاق خود سنیوں پر ہوتا ہے، وہ کسی شیعہ کی پرچھائیں بھی گوارا نہیں کرتے۔ یہ ایک علٰحدہ بات ہے کہ شیعہ تقیہ میں رہ کر اپنی بے مثال صلاحیت کے سبب سنی حلقے میں جگہ بنا لے۔ اس کے برعکس شیعہ جہاں کہیں اقتدار میں رہے، انہوں نے جانتے بوجھتے ہوئے سنیوں کو نوازا جس کی نظیریں بویہیوں کے دور میں بھی کثرت سے ملتی ہیں اور صفوی عہد میں بھی۔ شاہ طہماسپ نے تو بعض کلیدی عہدے سنیوں کو دے رکھے تھے حتیٰ کہ اپنے بیٹے اسمٰعیل کا اتالیق بھی سنی رکھ چھوڑا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شروع ہی سے اسمٰعیل کے ذہن کو بدلتا رہا اور اسمٰعیل جب تخت پر بیٹھا تو اس نے سنی ہونے کا اعلان کر دیا۔

شیعہ ماحول میں یہ ایک بڑی جسارت تھی لیکن بعض سنی اراکین بھی شاہ اسمٰعیل کے ساتھ تھے۔ اس طرح طویل المنصوبہ سازش بروئے کار آئی تھی لہذا شاہ اسمٰعیل نے تخت پر بیٹھتے ہی شاہانہ اختیارات کا استعمال شروع کر دیا اور شیعوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھانے لگا۔ یہاں تک کہ بعض برگزیدہ صوفیوں کو بھی قتل کرا دیا اس کا ارادہ تو یہ تھا کہ خاندان صفویہ کے ایک فرد کو بھی زندہ نہ چھوڑے گا اور وہ اس پر عمل ضرور کرتا لیکن کوئی چارہ نہ دیکھ کر اس کی حقیقی بہن نے اس کو زہر دیدیا اور دو سال حکومت کر کے وہ وفات پا گیا۔

محمد مرزا (محمد خدابندہ)

محمد مرزا نہایت سخی اور عادل حکمراں تھا۔اس کے ابتدائی دور میں عبداللہ خان کے بیٹے جلال خان نے خراسان کو تاراج کیا مگر حاکم خراسان نے شکست دے کر اس کو گرفتار کر لیا پھر قتل کرا دیا۔اسی زمانے میں ملک محمود نے سیستان سے قزلباش فوج کو نکال دیا۔شاہ قسطنطنیہ کی طرف سے مصطفیٰ پاشا نے آذر بائیجان پر حملہ کیا اور قزلباش لشکر کے ایک حصے کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔عادل گرائی تاتاری نے شیروان لے لیا۔وزیر ایران نے شیروان کو چھڑا لیا مگر دوسرے حصے واپس نہ ہوسکے۔سبب یہ تھا کہ بادشاہ کو ضعف بصر تھا۔اس کی بیوی نے شاہی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔انجام کار امراء نے ناراض ہو کر اس کو قتل کرا دیا اور عام بد نظمی پھیل گئی۔

۹۹۳ھ میں عثمان پاشا نے قسطنطنیہ سے آکر تبریز میں قتل عام کرایا، عبداللہ خان بن سکندر خان اوزبک نے ہرات و خراسان پر یورش کی اور پورے علاقے کو تباہ و برباد کر دیا۔ان حالات میں محمد مرزا نے اپنے بھائی عباس کے حق میں تخت سے دست بردار ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ۱۰۱۴ھ میں وفات پا گیا

شاہ عباس اعظم

شاہ عباس خاندان صفویہ کا سب سے عظیم فرمانروا تھا۔اس کے عہد میں عبداللہ اوزبک نے ہرات پر حملہ کر کے ایک تعداد کو قتل کیا ہرات کا ناظم علی قلی خان مقابلے میں مارا گیا پھر عبداللہ خان نے مشہد کا محاصرہ کیا اور چالیس روز میں اس کو فتح کر لیا اور حلقہ امامیہ میں سے ایک متنفس کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔

شاہ عباس جواباً اپنی فوجیں لے کر مقابلے پر آیا تو وہ ملک خالی کر گیا مگر عباس صفوی مشہد کی طرف بڑھتا ہی رہا۔ اس دوران ترکوں نے گنجہ، قراباغ، ہمدان اور نہاوند پر قبضہ کر لیا۔مجبوراً شاہ عباس غم و غصہ میں اس طرف گامزن ہوا صورت حال کو نازک دیکھ کر سلطان سلیم نے صلح کر لی اور ترکوں نے جو علاقے

لے لئے تھے وہ سب واپس کر دیئے۔

ان تجربات سے عباس صفوی نے ۵۹۵ھ میں اصفہان کو دارالسلطنت قرار دیا

۱۰۰۴ھ میں عبدالمومن بن عبداللہ اوزبک نے خراسان میں داخل ہو کر اسفرائن اور سبزوار کو لوٹ لیا۔شاہ صفوی مقابلے پر آیا تو وہ حسب دستور فرار ہو گیا۔شاہ نے اس سلسلے میں مازندراں تک کے علاقے پر تسلط حاصل کر لیا۔

۱۰۰۶ھ میں عبداللہ اوزبک فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا عبدالمومن مارا گیا تو عباس صفوی نے ماوراء النہر پر حملہ کر کے بلخ کا سارا علاقہ فتح کر لیا پھر ترکوں سے تفلس واپس لے لیا۔گرجستان میں بھی اس کو کئی بڑی فتوحات ہوئیں،

اسی زمانے میں جہانگیر کے قلعہ دار قندھار نے پرتگیزیوں سے جزیرہ ہرمز چھین لیا اور ایران سے ترکی کے اہلکار نکال دیئے گئے۔

۱۰۳۲ھ میں شاہ عباس صفوی نے بغداد بھی فتح کر لیا پھر نجف اشرف کا روضہ تعمیر کرایا، کربلائے معلی کے لئے اپنے خزانے کا منہ کھول دیا اور اکثر راستوں پر کارواں سرا تعمیر کرائے۔

وہ ایک راسخ العقیدہ اثنا عشری شیعہ تھا۔شیعیت کی تبلیغ میں اس نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

بعض مورخین نے اس پر الزام تراشی کی ہے کہ سنیوں کے لئے اس کے ملک میں رہنا دشوار ہو گیا تھا جو اس پر تہمت ہے۔وہ اپنے عقائد میں پکا ضرور تھا لیکن کسی سنی کو زبردستی شیعہ بنانے کی کوئی نظیر اس کے عہد میں نہیں ملتی، البتہ شاہ طہماسپ نے جو غلطی کی تھی اور جس کی وجہ سے شاہ اسمٰعیل ثانی سنی ہو گیا تھا اس غلطی کا اعادہ شاہ عباس نے نہیں کیا۔اس نے سنیوں کو عہدے دیئے لیکن سابقہ تجربے کے تحت کسی کلیدی عہدے پر انہیں فائز نہیں کیا۔ وہ آزمودہ را آزمودن کو جہل سمجھتا تھا اس لئے مورخین نے لکھ دیا کہ وہ سنیوں کو اپنی وسیع سلطنت میں رکھنا ہی نہ چاہتا تھا۔تینتالیس برس کی شاندار حکومت میں اس نے ایران کا وقار ہمیشہ بلند رکھا۔۱۶۲۳ء میں بمقام کاشان اس کا انتقال ہوا اور قم میں سپرد خاک کیا گیا۔

شاہ عباس اعظم ایک سخی اور طبعاً رحمدل بادشاہ تھا مگر اپنے سرداروں کو مطیع اور وفادار دیکھنا چاہتا تھا اس لئے ایک ہوشمند فرمانروا کی طرح ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھتا۔ خود اپنی ذات سے بہادر تھا اور بہادروں کی قدر کرتا۔ اوزبکوں کے مسلسل حملوں کو وہ بار بار روکتا رہا، انہیں شکستوں پر شکستیں دیتا رہا، ترکی حملوں کو بھی اس نے کئی مرتبہ رد کیا اور انہیں پسپا کیا حتیٰ کہ تبریز، جارجیا، کردستان اور بغداد پر اپنے پرچم لہرا دیئے۔ اصفہان کو پہلے پہل ایران کا دارالسلطنت اس کی دور بینی کا ثبوت ہے۔

دوسرے مذاہب کے احترام کو وہ اپنا فرض سمجھتا تھا، عیسائیوں کو بھی اس نے گرجا تعمیر کرنے کی اجازت دی تھی۔ ارباب علم و فن کا وہ قدر داں تھا۔ ان کی سرپرستی کرتا۔ اس کے عہد میں بہت سی سڑکیں بنائی گئیں اور عالیشان عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

رعایا کی دیکھ بھال کو وہ اپنا فریضہ منصب قرار دیتا اور ملک کی آبادی بڑھانے میں مسلسل کوشاں رہتا اسی لئے رفاہ عام کے کاموں میں خاص دلچسپی لیتا تھا۔ فنون لطیفہ اور علم و ادب کی بھی اس کے عہد میں بڑی ترقی ہوئی۔

وہ ایک بہت دور اندیش فرمانروا تھا، بالخصوص داخلی اور خارجی حکمت عملی اس کا طرہ امتیاز تھا اسی لئے اس کے دور کو ایران کی تاریخ کا زریں باب کہا جاتا ہے

شاہ صفی

شاہ صفی، شاہ عباس صفوی کا پوتا تھا، بڑا ظالم اور خونخوار۔ اس کے زمانے میں جا بجا بغاوتیں ہوئیں نظم و نسق تہہ و بالا ہو گیا اس نے ان بغاوتوں کو فرد تو کیا مگر شراب کے نشے میں بہت سے بے گناہ بھی قتل کرا دیئے۔

۱۶۳۸ء میں ترکوں نے سلطان مراد کے حکم سے بغداد کا محاصرہ کیا اور سخت مدافعت کے بعد اس کو فتح کر لیا، ہزاروں ایرانی اور قزلباش قتل ہو گئے۔ ایام محاصرہ میں ترک شہر پر ہر روز توپ کے گولے برساتے جس سے محلے کے محلے تباہ ہو گئے۔ اس کے دور میں علی مردان حاکم قندھار نے قندھار شاہجہاں کے حوالے کر دیا۔ ۱۶۴۲ء میں بمقام کاشان وہ مر گیا، قم میں دفن ہوا۔

عباس ثانی

عباس ثانی نو سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ اس نے قندھار شاہجہاں کے عمال سے چھین لیا اور اورنگ زیب اور دارشکوہ کے پے در پے حملوں کے باوجود اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ بڑا پاکباز اور متشرع بادشاہ تھا لہذا شراب پر پابندی لگا دی اور اس کی سزا موت قرار دی، ترکستان کا بادشاہ امام قلی خان اپنے بیٹے نادر محمد کو تخت پر بٹھا کر تخت سے دست بردار ہو گیا تھا، شاہ عباس ثانی نے اس کو بڑی تواضع کے ساتھ اپنے پاس رکھا اور پھر جب ترکستان کے امراء نے نادر محمد کو ہٹا کر اس کے بیٹے عبدالعزیز خان کو بادشاہ بنا لیا تو اس نے نادر محمد خان کو مدد دے کر پھر بادشاہ بنوا دیا۔ چونکہ ترک و افغان خراسان پر برابر حملے کرتے رہتے تھے اس لئے اس نے لشکر کشی کر کے قندھار و کابل پر مستقل قبضہ کر لیا اور ترکمانوں کو سخت سزائیں دیں۔ ۱۶۶۷ء میں اس نے بمقام دامغان وفات پائی اور قم میں سپرد خاک کیا گیا

سلیمان مرزا

۱۰۸۰ھ میں ادینہ خان صابن نے استرآباد لوٹ لیا مگر شاہی فوج سے شکست کھا کر مارا گیا، ترکی و ایران کی سابق جنگوں کے دوران سلیمان خان اردلانی کردستان میں خود مختار ہو گیا تھا، اس نے ایک شہر سلیمانیہ بھی آباد کیا پھر کرکوک اور موصل پر یورش کی۔ ایران کی فوج نے اس کا مقابلہ کیا اور شکست دے کر اس کو قتل کر دیا۔ اسی زمانے میں نادر محمد خان کا بیٹا عبدالعزیز خان سلطنت اپنے بھائی کے سپرد کر کے خانہ کعبہ جانے کے لئے ایران آیا۔ شاہ سلیمان مرزا نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور تزک و احتشام کے ساتھ مکے جانے کے لئے رخصت کیا۔ ۱۶۹۴ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

وہ بڑا رحم دل، متواضع اور غریب پرور بادشاہ تھا۔

حسین مرزا

حسین مرزا عقل سے عاری اور انتظامی صلاحیت سے بے بہرہ تھا اس کے عہد میں ایران کی عظیم سلطنت کو بڑا دھچکا پہنچا۔

۱۱۱۴ھ میں اویس خان غلزئی نے قلعہ دار قندھار شہنواز کو قتل کر کے

قندھار پر قبضہ کر لیا، اس کے مرنے پر اس کے بیٹے محمود خان نے ہرات بھی لے لیا پھر سیستان و کرمان پر بھی متصرف ہو گیا۔ حسین مرزا نے اس کا مقابلہ کیا مگر ۱۷۰۵ء میں خود محمود خان کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ آخر ۱۷۲۲ء میں محمود خان نے اصفہان پر حملہ کر کے اس کو بھی فتح کر لیا اور ایران کا بادشاہ بن گیا۔

حسین مرزا کا بیٹا طہماسپ مازندران میں تھا۔ اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ بڑھ کر محمود خان کا مقابلہ کرتا لہٰذا وہ مازندران کی حکومت پر قابض رہا۔

محمود خان غلزئی

محمود خان غلزئی طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی سوجھ بوجھ بھی رکھتا تھا اس نے ملک محمود شیبانی والی سیستان اور نادر قلی افشار کے تعاون سے خراسان کے بیشتر علاقے بھی مسخر کر لئے پھر نادر قلی کی محمود خان شیبانی سے نااتفاقی ہو گئی اور نادر قلی طہماسپ بن حسین مرزا کو مازندراں سے بلا کر اس کا مددگار بن گیا

دونوں نے مل کر محمود شیبانی پر حملہ کیا اور اس کو گرفتار کر لیا۔ اس طرح طہماسپ کی حکومت خراسان اور سیستان تک وسیع ہو گئی۔ محمود غلزئی مغربی ایران میں تھا اس نے ان حالات میں دماغی توازن کھو دیا اور ۱۷۲۵ء میں دیوانہ ہو کر مر گیا

اشرف خان غلزئی

اشرف خان غلزئی محمود خان کے بعد تخت پر بیٹھا۔ اسی زمانے میں سلطان ترکی نے سلطان حسین کی رہائی کے لئے اس پر چڑھائی کی مگر اشرف خان نے سلطان حسین کو قتل کر دیا پھر ترکوں سے صلح کر لی اور ادھر سے مطمئن ہو کر خراسان پر حملہ کیا مگر طہماسپ اور نادر قلی نے اس کو شکست دی، آخر ۱۷۳۰ء میں وہ خزانہ لے کر اصفہان سے بھاگ نکلا لیکن طہماسپ نے تعاقب کر کے پکڑ لیا پھر قتل کرا دیا۔

شاہ طہماسپ بن حسین مرزا

اصفہان میں طہماسپ کی تخت نشینی عمل میں آ گئی۔ نادر قلی اشرف سے فراغت پا کر عراق کی تسخیر پر متوجہ ہوا اور اس کو غاصبوں سے چھڑا کر تبریز پر حملہ کیا جو ترکوں کے قبضہ میں تھا، اس کو واگزار کرا کے نادر قلی نے افغانوں اور ترکمانوں کی سرزنش کی اور تمام مفسدوں کو چن چن کر قتل کیا آخر میں ہرات پر قبضہ کیا جو

ابدالیوں کے قبضے میں تھا۔

جب پورا ایران اس کے زیرنگیں آ گیا تو اس نے ۱۷۳۲ء میں خود طہماسپ کو گرفتار کر لیا، اس کے شیر خوار بیٹے عباس کو برائے نام بادشاہ بنایا اور عملاً خود ایران کا فرمانروا بن گیا۔

شاہ عباس ثالث

اس کے بعد نادر قلی نے بغداد پر حملہ کیا اور ترکوں کو شکست دے کر اس پر اپنا پرچم لہرا دیا پھر اس نے صوبہ فارس کے حاکم محمود خان بلوچ کو سزا دی اور پورے ایران میں اس کا طوطی بولنے لگا۔

صفویوں کی عظیم سلطنت محمود غلزئی کے اصفہان پر قبضے کے بعد ہی ختم ہو گئی تھی لیکن شاہ طہماسپ ابھی زندہ تھا جس کو نادر کے بیٹے رضا قلی نے قید سے نکال کر قتل کر دیا۔ عباس ثالث ۱۷۳۶ء میں خود اپنی موت مر گیا اور امراء نے علی الاعلان نادر قلی کی بادشاہت کو تسلیم کر لیا۔

خاندان افشاریان

نادر قلی خان عرف نادر شاہ

افشار ذات کے ترکمان تھے، پہلے ترکستان میں رہتے تھے، مغلوں کے عہد میں آذربائیجان آ گئے اور نادر شاہ کے باپ نے مشہد مقدس کے شمال ابیورد میں سکونت اختیار کر لی جہاں ۱۱۰۱ھ میں نادر قلی بیگ المعروف بہ نادر علی شاہ پیدا ہوا۔ ابتداً اس نے رہزنی اور قزاقی سے دولت پیدا کی پھر اس سے ایک فوج بنا لی، اسی فوج کے بل پر وہ اقتدار میں داخل ہوا اور آخر کار ایران کا بادشاہ بن گیا۔

فتوحات نادر شاہ کا مقدر رہیں جس میں اس کی غیر معمولی شجاعت کو دخل تھا اس نے چنگیز خان اور تیمور کی طرح ایک بہت بڑی سلطنت قائم کی اور بیرحمی

میں بھی ان سے کم نہ تھا۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ ان میں سے کوئی فاتح عالم قساوت اور سنگدلی میں دوسرے سے پیچھے نہ تھا۔ تاریخ میں جن کی شجاعت کے ڈنکے بجائے جاتے ہیں اور مورخین نے جن کے قصیدے لکھے ہیں، دیکھا جائے تو ان کے دامن بے گناہوں کے لہو سے آلود اور ان کے ہاتھ متمدن شہریوں کے خون سے رنگین نظر آئیں گے۔ اسی لئے اسلام نے صرف تسخیر ممالک اور حصول اقتدار کے لئے تلوار اٹھانے کی ممانعت کی ہے تاوقتیکہ اسلام پر آنچ نہ آرہی ہو۔

رسولؐ کے نائب برحق علی ابن ابی طالب کی خاموشی کے اسباب میں بنیادی نکتہ یہی تھا کہ لوگوں نے تو صرف اس اقتدار کو چھینا ہے جو علیؑ کو ملنا چاہئے تھا، اسلام کو اتنا تو نہیں بگاڑا ہے کہ وہ پہچانا نہ جاسکے اور پھر جب شام میں اسلام کی شکل ہی بدل دی گئی اور حرام محمدؐ کو فقہی تاویلات سے حلال کر دیا گیا تو ذوالفقار کا استعمال ناگزیر ہو گیا۔ یہی سبب تھا جو ہمارے کسی امام نے نہ زید شہید کی تائید کی اور نہ نفس ذکیہ کے حق میں کوئی فتویٰ دیا اور بعد کے شیعہ سلاطین خواہ وہ صفار ہوں یا بویہی، سب کی جنگیں ویسی ہی تھیں جن کے مجموعوں کو تاریخ اسلام کا نام دیا گیا ہے حالانکہ ان جنگوں کا تعلق اسلام کے بجائے صرف مسلمانوں سے تھا اور وہ صرف استقرار حکومت یا توسیع مملکت کی خاطر لڑی گئی تھیں اور نادر شاہ جیسے لوگوں کی لڑائیاں تو صرف حکومت کے لئے تھیں۔

لیکن اگر محولہ جنگیں اسلامی تھیں جیسی سلطان محمود غزنوی کی لڑائیاں تو نادر شاہ کی فتوحات بدرجہ اتم اس تعریف میں آتی ہیں اور وہ بھی تاریخ اسلام کا حصہ ہیں۔

بہرحال نادر شاہ نے صفویوں کے تخت پر بیٹھ کر جب حکومت کو کچھ مضبوط کر لیا تو قندھار پر دھاوا بولا اور محمود غلزئی کے بھائی حسین شاہ کو شکست دے کر قید کر لیا پھر کابل فتح کیا اور ہندوستان کا عازم ہوا۔

فتوحات کا ایک سیلاب اس کے آگے آگے چلتا تھا اور حکمراں خواہ ہندو ہو یا مسلمان، جو اس کے سامنے آتا، نادر شاہ اس کو روندتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ کرنال

میں ہندوستان کے بادشاہ محمد شاہ کے لشکر نے اس کو روکا مگر وہ اس کو خاطر میں لانے والا نہ تھا۔

اس سلسلے میں ہندوستان کی تاریخ ایک واقعہ کو پیش کرتی ہے کہ محمد شاہ نے دہلی میں اعلان کیا کہ جو شخص نادر شاہ کو نذرانے دے کر واپس کرے گا اس کو اودھ کا صوبہ دیا جائے گا، اس مقصد کے لئے سعادت خان برہان الملک اور نظام الملک روانہ ہوئے۔ سعادت خان خود ایرانی نسل تھا، اس نے سونے کی مہریں اور جواہرات پیش کئے اور نادر شاہ واپسی پر نیم راضی ہو گیا۔ نظام الملک عقب میں روانہ ہوا تھا اس کو راہ میں اس کی خبر ملی چنانچہ وہ اسی مقام سے واپس ہو گیا اور اس کارنامے کو اپنی ذات سے منسوب کر کے اس نے اودھ کی صوبہ داری کا پروانہ حاصل کر لیا۔

اس عرصے میں اس کے مشیروں نے نادر شاہ سے کہا کہ وہ اس حقیر دولت پر اکتفاء نہ کرے اور نادر شاہ نے واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ نظام الملک کی چوٹ پر خود سعادت خان نے یہ بات نادر شاہ سے کہی تھی۔ حقیقت جو کچھ ہو مگر ہوا یہ کہ نادر شاہ واپس ہونے کے بجائے دہلی کی طرف روانہ ہو گیا تاہم سعادت خان برہان الملک کے کہنے سے اس نے کوئی قتل و غارت نہیں کیا

دہلی کے قیام میں بھی نادر پر امن رہا لیکن دہلی والوں نے اس کے بعض سپاہیوں پر پتھر برسائے اور بعض بیانات کے مطابق چند فوجی قتل کر دیئے، اس پر نادر شاہ ننگی تلوار ہو گیا اور اس نے قتل عام کا حکم دے دیا۔

یہ خونریزی دہلی کی عظیم خونریزی تھی جو آخر برہان الملک کی کوششوں سے ختم ہوئی اور نادر شاہ دہلی کی حکومت محمد شاہ کو بخش کر واپس ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ نادر شاہ بڑا ظالم تھا اس نے انسانی خون ارزاں کر دیا تھا، جدھر جاتا، خون کے دریا بہاتا ہوا گزرتا یقیناً نادر شاہ بڑا بے رحم تھا لیکن دوسرے فاتحین کیا خون کے بجائے آب رحمت برساتے ہوئے آگے بڑھتے تھے اور عوام میں لڈو پیڑے تقسیم کرتے تھے، خود مسلمانوں کے تمام تاریخی ہیرو اسی کے مرتکب ہوئے جو نادر نے کیا لیکن نادر شاہ نے جس طرح ہندوستان کی حکومت محمد شاہ کو

واپس کر دی تھی، اس کی نظیر کسی اور نے پیش نہیں کی جبکہ نادر قندھار و کابل فتح
کرتا ہوا آیا تھا، یہ مقامات تو اس نے پرانے حکمرانوں کو نہیں دیئے، ہندوستان
شاید اس لئے دیدیا ہو کہ یہ حکومت طہماسپ صفوی نے ہمایوں کو دلوائی تھی۔
اس کے پیش رو نے جو چیز دی تھی اس کو نادر شاہ واپس کیا لیتا!

پورا ہندوستان اس کے رحم و کرم پر تھا اس کے ساتھ ایسے ایسے جرنیل
موجود تھے جنہیں وہ دہلی میں اپنا قائم مقام بنا سکتا تھا جیسا کہ شہاب الدین غوری
نے کیا تھا اور اپنے کسی جرنیل کو نہ چھوڑتا تو خود ایرانی النسل برہان الملک موجود
تھا، اس کو اپنا باجگزار بادشاہ بنا کر چھوڑ دیتا لیکن برہان الملک نے پوری طلاقت
لسانی سے سفارش کی تھی اور نادر شاہ نے مان لیا۔ اس طرح جو لوگ اس کو درندہ
کہتے ہیں انہیں ماننا پڑے گا کہ اس کے پہلو میں ایک انسانی دل بھی تھا کہ وہ برہان
الملک کو دیئے ہوئے قول سے پھرا نہیں اور جو لوگ برہان الملک پر الزام لگاتے
ہیں کہ وہ نادر شاہ کو واپس لے آیا انہیں یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ اگر ان کا خیال صحیح
ہے تو برہان الملک نے گئی ہوئی حکومت واپس بھی دلا دی۔

یقیناً نادر شاہ بہت مال و دولت لے کر ہندوستان سے پلٹا تھا مگر اس کا عشر
عشیر بھی نہیں جو سلطان محمود نے غزنی میں اکٹھا کی تھی۔ یہ دولت نادر شاہ نے
مشہد میں جمع کی، اس کو اپنا دارلسلطنت قرار دیا اور بیشتر دولت روضہ امام کی
نذر کر دی۔

ایران کے جو علاقے سابقہ عہود میں روسیوں اور ترکوں نے لے لئے تھے،
نادر شاہ نے یکے بعد دیگرے ان سب پر قبضہ کیا، ہندوستان سے واپسی کے وقت
اس نے خوارزم، بخارا اور داغستان کو مسخر کیا تھا، ان سب پر اس کی گرفت
مضبوط تھی لیکن وہ ایک سخت گیر فرمانروا تھا اس لئے اس کے دشمنوں کی تعداد بھی
کم نہ تھی۔ اس کی حدود سلطنت دریائے سندھ سے کوہ قاف تک پھیلی ہوئی تھیں
لہذا ہوشیار رہنے کے باوجود وہ اندرونی سازشوں سے بچ نہ سکا، خود اس کے خون
جگر نے اس سے دھوکا کیا۔ علی قلی خان حاکم ہرات اس کا بھتیجا تھا اس نے امراء سے
مل کر اس کے قتل کا منصوبہ بنایا اور ایک رات سوتے میں وہ قتل کر دیا گیا۔ کہا

جاتا ہے کہ خود اس کے ایک غلام نے تلواروں کے مسلسل وار کر کے اس کو مارا
تھا اور اسے نادر شاہ کے معتمد امراء نے قتل پر آمادہ کیا تھا جس میں احمد شاہ پیش
پیش تھا جس پر وہ سب سے زائد اعتبار کرتا تھا۔

نادر شاہ کے بعد خزانے کے لئے افغانی اور ترکمانی امراء میں نبرد آزمائی ہوئی
احمد شاہ ابدالی غالب آیا وہ سارا خزانہ لے کر قندھار چلا گیا اور خراسان اور
افغانستان کو ملا کر اس نے اپنی علیحدہ سلطنت قائم کر لی۔

پھر ملک کے مختلف حصوں میں جداگانہ حکومتیں قائم ہو گئیں: آزاد نامی
افغان نے آذر بائیجان پر، علی مردان بختیاری نے اصفہان پر اور محمد حسن قاچار نے
بحیرہ کیسپین کے مشرقی ساحل، استراباد پر قبضہ کر لیا۔ نادر شاہ کے بھتیجے علی شاہ
کے پاس ملک کا تھوڑا سا حصہ رہ گیا۔

علی شاہ

اس نے بادشاہ ہوتے ہی اپنے بھائی ابراہیم کو کلات روانہ کیا جہاں نادر
شاہ کی اولاد اور بقیہ خزانہ تھا، ابراہیم نے وہاں پہنچ کر خزانے کو اپنے قبضے میں لے
لیا، نادر شاہ کی اولاد میں پندرہ کو قتل کر دیا کچھ بھاگ گئے اور کچھ بند کر دئے گئے۔
پھر علی شاہ نے انتظام حکومت حسن بیگ اور سہراب کے حوالے کر دیا اور اصفہان
اور فارس کی حکومت ابراہیم کو دیدی۔ کچھ دنوں بعد حسن بیگ نے سہراب کو قتل
کرا دیا اور ابراہیم و علی شاہ میں بھی جنگ چھڑ گئی جس میں علی شاہ کو شکست ہوئی،
وہ گرفتار کر کے اندھا کر دیا گیا اور ابراہیم اس کی جگہ بادشاہ بن گیا۔

ابراہیم شاہ

نادر شاہ کے بیٹے شاہ رخ کو ابراہیم نے قید میں ڈال دیا تھا، اسی زمانے میں
کسی طرح وہ زندان سے نکل آیا اور باپ کے وفاداروں کو یکجا کر کے میدان میں
آ گیا، ابراہیم کی فوج عین جنگ کے دوران اس سے مل گئی اور ابراہیم مارا گیا۔

شاہ رخ شاہ

تخت نشینی کے تین چار ماہ بعد خراسان کے سرداروں نے اس کو پکڑ کر

اندھا کر دیا اور مشہد مقدس کے متولی سید محمد کو جو سلطان حسین صفوی کا داماد اور شاہ سلیمان صفوی کا نواسہ تھا، بادشاہ بنا دیا مگر شاہ رخ کے طرفداروں نے اس کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروا دیں اور شاہ رخ کو قید سے نکال کر تخت پر بٹھا دیا۔ شاید انہیں اندھا بادشاہ ہی درکار تھا۔ شاہ رخ ۱۲۱۰ھ تک خراسان پر حکومت کرتا رہا۔

نادر شاہ کے قتل کے بعد دو سال تک ایک سرے سے دوسرے سرے تک انتشار رہا، استراباد سے آذربائیجان تک تمام شمالی ایران محمد حسن قاچار کے زیر نگیں تھا اور جنوبی ایران پر کریم خان زند حکمراں تھا، صرف خراسان افشاریوں کے پاس تھا۔ ۱۱۷۱ھ میں، جب محمد حسن قاچار مارا گیا تو کریم خان زند نے فارس و ایران کی حکومت پر مکمل قبضہ کر لیا اور خاندان زند نے افشاریوں کی جگہ لے لی۔

خاندان زند

کریم خان

نادر شاہ کے بعد ۱۱۶۳ھ میں علی مراد بختیاری نے قزاقوں کے سردار کریم خان سے ایک معاہدہ کیا اور اصفہان کو گھیرے میں لے لیا پھر حاکم اصفہان ابو الفتح افشار بھی اس اتحاد میں شامل ہو گیا اور تینوں سرداروں نے مل کر سلطان حسین صفوی کے نواسے اسمٰعیل کو برائے نام بادشاہ بنا لیا۔

اس کے بعد کریم خان تسخیر عراق کی مہم پر روانہ ہوا اس کے جانے کے بعد علی مراد خان نے ابو الفتح کو قتل کر دیا اور خود بادشاہ اسمٰعیل کو لے کر فارس کا عازم ہو گیا۔ کریم خان کو علی مراد کی بد عہدی کا علم ہوا تو اس نے بڑھ کر اصفہان پر قبضہ کر لیا پھر فارس کا رخ کیا۔ علی مراد شاہ اسمٰعیل کو لے کر مقابلے پر آیا، لیکن عین موقع پر شاہ اسمٰعیل کریم خان سے آملا اور علی مراد کے لئے فرار کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب محمد حسن خان قاچار بن نواب فتح علی خان نے کشور کشائی کا آغاز کیا تھا اور استرآباد، مازندران، گیلان اور آذربائیجان وغیرہ پر قابض ہو گیا تھا اور استرآباد کو مرکز بنا کر فوجوں کو تسخیری مہمات پر روانہ کر رہا تھا۔

کریم خان نے اس پر چڑھائی کی تو محمد حسن قاچار خود مقابلے کے لئے نکلا۔ شاہ اسمٰعیل نے جو کام علی مراد بختیاری کی مقابلے میں کریم خان کے لئے کیا تھا، وہی کریم خان کے مقابلے میں محمد حسن قاچار کے لئے کیا اور موقع پا کر قاچاری لشکر میں آگیا۔ انجام کار کریم خان کو شکست ہوئی۔ محمد حسن خان نے اصفہان پر تسلط حاصل کر لیا اور محمد حسین قاچار کو صوبہ دار بنا کر شیراز کی سمت بڑھ گیا مگر حسین قاچار اس کے جاتے ہی باغی ہو گیا۔ محمد حسن قاچار نے پلٹ کر مقابلہ کیا تو شکست کھائی ۱۱۷۱ھ میں دھوکے سے بدست شیر علی قتل ہو گیا اسی دوران علی مراد خان بھی محمد خان زند کے ہاتھ سے مارا گیا۔

اب کریم خان کے لئے میدان قدرے صاف تھا۔ اس نے خراسان کے سوا ایران کے بڑے حصے کو مسخر کر لیا اور تہران کو اپنا دار السلطنت قرار دیا، کردستان کی فتح کے بعد وہ ایک بڑی سلطنت کا مالک بن گیا پھر اس کو چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملا

کریم خان ایک غالی شیعہ تھا اس نے کبھی اپنے کو بادشاہ نہیں سمجھا بلکہ وکیل امام عصر کہتا تھا وہ بہادر ہونے کے ساتھ ایک نیک نفس انسان بھی تھا۔ محمد حسین خان کے بیٹے آغا محمد خان سے اس نے بہت اچھا سلوک کیا۔ اس کا نظم حکومت بہت اعلیٰ تھا، رعایا کا خیال رکھتا تھا اور عوام سے بڑی نرمی کے ساتھ پیش آتا، اس نے بہت سے رفاہی کام کئے، سڑکیں بنوائیں، کارواں سرا تعمیر کرائے۔

قاچاریوں کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کیا۔ محمد حسن خان کی ایک بیٹی سے خود عقد کیا، دوسری بیٹی اپنے بیٹے رحیم کے نکاح میں لایا اور اپنے پیچھے داد و دہش کی بہت سی داستانیں چھوڑ گیا۔

ابو الفتح خان و ذکی خان

ابو الفتح کریم خان کا جانشین ہوا تو اس کے چچا صادق خان نے شیراز پر حملہ کیا مگر پسپا ہو کر کرمان کی طرف ہٹنا پڑا۔ اسی زمانے میں تہران کے ایک سردار علی مراد نے اصفہان پر دھاوا بولا، ذکی خان بجبر ابو الفتح کو لے کر مقابلے کے لئے چلا مگر راستے میں ابو الفتح کے آدمیوں نے ذکی خان کو قتل کر دیا اور پھر علی مراد خود ابو الفتح

سے آکر مل گیا اور دونوں شیراز آگئے۔

اس عرصے میں صادق خان نے اطاعت قبول کرنے کا اعلان کر دیا اور اس حیلے سے شیراز آگیا وہ ایک منصوبہ بنا کر آیا تھا چنانچہ اس نے موقع پاتے ہی ابو الفتح اور کریم خان کے باقی دو بیٹوں کو قید کر لیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔

علی مراد اس کی اس حرکت پر بہت مشتعل ہوا۔ وہ اپنی سپاہ کو لے کر شیراز سے نکل گیا پھر پلٹ کر حملہ آور ہوا اور صادق خان کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا پھر کریم خان زند کے تینوں بیٹوں کو قید خانے سے بلوا کر ان کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروا دیں اور خود اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔

علی مراد خان

علی مراد خان طبعاً بہت ظالم تھا اس نے اپنے برادر مادری جعفر خان کے علاوہ حقداران حکومت میں سے بیشتر کو موت کے گھاٹ اتروا دیا، اس پر امراء ناراض ہو گئے اور انہوں نے آقا محمد خان بن محمد حسن قاچار کو استر آباد سے بلوایا اس کی مدد کر کے علی مراد کا مقابلہ کیا اور اس کو شکست دی، اس پر جعفر خان نے اصفہان پر چڑھائی کر دی اسی دوران علی مراد مر گیا اور جعفر خان اصفہان میں تخت نشین ہو گیا۔

جعفر خان

جعفر خان کے بادشاہ ہوتے ہی آقا محمد قاچار نے اس پر چڑھائی کی، جعفر خان شیراز کی طرف فرار ہو گیا جہاں کچھ لوگوں نے اس کو قتل کر دیا۔

لطف علی خان

لطف علی خان بوشہر سے آکر شیراز میں باپ کا جانشین ہوا۔ آقا محمد خان نے اس پر حملہ کیا اور شیراز فتح کر لیا، لطف علی خان نے فرار ہونے کی کوشش کی مگر گرفتار ہو کر قتل کیا گیا۔ اس طرح چالیس سال کے بعد زندیوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ایران کے مطلع حکومت پر قاچار خاندان کا آفتاب طلوع ہوا۔

خاندان قاچار

اس خاندان کا جد اعلیٰ قراچار محمد نویان امیر تیمور کا جد چہارم تھا۔ اس کی نسل میں سب سے پہلے نواب فتح علی خان قلعہ مبارک آباد کا حاکم ہوا۔ وہ صفوی بادشاہ طہماسپ ثانی کے ساتھ کئی مہمات میں شریک ہوا۔ ۱۱۳۹ھ میں نادر شاہ نے طہماسپ کو اس کے خلاف بھرا اور وہ قتل کر دیا گیا، پھر فتح علی خان کا بیٹا محمد حسن خان مبارک آباد کا قلعہ دار ہوا جو ۱۱۷۱ھ میں اپنے نمک حرام ملازم کے ہاتھوں مارا گیا

زندیوں کی حکومت میں محمد حسن خان کا بیٹا حسین قلی خان پھر ایک معزز عہدے پر فائز ہوا۔ اس کے بیٹے آقا محمد خان کو کریم خان زند نے نظر بند کر دیا۔ حسین قلی خان ستائیس سال کی عمر میں ایک ترکمان قوم یموت کے ہاتھوں قتل ہوا

کریم خان کی وفات کے بعد آقا محمد خان نظر بندی سے آزاد ہو گیا اور اس نے ۱۱۹۳ھ سے اپنی فتوحات کا آغاز کر دیا اور ۱۲۱۰ھ تک وہ پورے ایران کا حکمران بن گیا اور اس کی ذات سے سلطنت قاچار کی بنیادی پڑی۔

آقا محمد خان

کریم خان کا انتقال ہوتے ہی وہ تہران کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اس نے کریم خان کا خزانہ لوٹ لیا پھر اپنی قوم کے لوگوں کو جمع کر کے مازندران پر قبضہ کر لیا یہیں سے اس کی فتوحات شروع ہوئیں، آہستہ آہستہ اس نے اصفہان، ہمدان، کردستان اور گیلان مسخر کر لیا اور ۱۲۰۹ھ میں خاندان زند کے آخری بادشاہ لطف علی کو گرفتار کر کے ایران کا بادشاہ بن گیا۔

جارجیا کو روس کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے اس نے ایک ہولناک جنگ کی اور اسی جنگ کے دوران کسی نے سازش کر کے خود اس کے غلام کے ہاتھوں سوتے میں اس کو قتل کرا دیا۔

فتح علی شاہ

خاندان قاچار کا دوسرا بادشاہ حد درجہ شجاع اور ہوش مند تھا اس نے تخت پر بیٹھتے ہی پہلے مفسدوں کا صفایا کیا پھر دوسرے مسائل سلطنت کی طرف توجہ کی مرزا نادر بن شاہ رخ نے خراسان میں علم بغاوت بلند کیا تھا۔ فتح علی نے اس کو گرفتار کرا کے قتل کرایا۔ محمد خان ولد ذکی خان زند نے شیراز میں سر اٹھایا تھا۔ اس کی سرکوبی کی۔ حاجی ابراہیم خان زندیوں کا وزیر اعظم تھا اس نے تسخیر شیراز میں قاچاریوں کا ساتھ دیا تھا۔ وہ حکومت قاچار میں وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کیا گیا تھا مگر وہ اب حد سے زائد مطلق العنانی پر آمادہ تھا، فتح علی شاہ نے اس کو تنبیہ کی تو وہ گستاخی پر اتر آیا۔ شاہ قاچار نے اس کو بھی تلوار کے گھاٹ اتروا دیا۔

۱۲۱۸ھ میں روس نے تفلس کو فتح کر کے گنجہ کا محاصرہ کر لیا، فتح علی شاہ خبر پا کر خود مقابلے پر آیا اور اتنے روسی قتل کئے کہ ان کے سروں کا مینار بن گیا، ۱۲۲۰ھ تک روسیوں سے اس کے سات معرکے ہوئے اور ہر ایک میں روسیوں کا یہی انجام ہوا مگر آٹھویں لڑائی میں روسیوں نے شیروان لے لیا۔

۱۲۲۱ھ میں حاجی فیروز والی ہرات نے مشہد پر حملہ کیا مگر ایرانی اس کو بھگاتے ہوئے بڑھے اور خود جا کر ہرات کا محاصرہ کر لیا آخر حاجی فیروز نے دو سال کا خراج دے کر جان چھڑائی۔

اسی سن میں نپولین بونا پارٹ کا سفیر باریاب ہوا۔ فتح علی شاہ نے اس شرط پر دوستی کو قبول کیا کہ پہلے فرانس و ایران مل کر روسیوں سے نپٹیں گے پھر ایران ہندوستان کی مہم میں فرانس کا ساتھ دے گا۔ ان حالات میں روس نے ۱۲۲۳ھ میں ایران سے صلح کر لی مگر کچھ ہی دنوں بعد بد عہدی کر کے ایروان لے لیا مگر جلد ہی فتح علی شاہ کے ہاتھوں شکست کھائی۔

اسی سال انگریزوں نے اپنی سفارت بھیجی اور الماس کا ایک بڑا نگینہ نذر کیا اور دونوں ملکوں میں دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا۔

۱۲۲۶ھ میں شہزادہ ولی مرزا نے حاجی فیروز والی ہرات پر چڑھائی کر کے پھر دو سال کا خراج وصول کیا۔ روس اور ایران کی کشمکش جاری تھی، گنجہ کے قریب ایک سخت لڑائی ہوئی، روس نے شکست فاش کھائی اور ان گنت روسیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ آخر ۱۲۲۹ھ میں روس نے پھر صلح کا ایک معاہدہ کر لیا۔ اسی سال انگریزوں سے بھی تحریری صلح ہوئی۔

۱۲۳۸ھ میں ترکی سے بھی معاہدہ صلح ہوا۔ اسی سال شیعہ علماء کی تحریک پر روس سے جہاد کیا گیا، پے در پے جنگیں ہوئیں۔ آخر ۱۲۴۳ھ میں پھر صلح ہو گئی۔

۱۲۵۰ھ میں اس عظیم فرمانروا کا انتقال ہو گیا۔

فتح علی شاہ ایک اقبال مند بادشاہ تھا، جدھر جاتا فتوحات اس کے قدم چومتیں مگر ٹرانس کا کیشیا کا علاقہ اسی کے عہد میں روس کے زیر نگیں آیا۔

۱۸۰۲ء میں سعود بن عبدالعزیز نے کربلا کو تباہ کیا، روضہ امام حسین کو شدید نقصان پہنچایا، پانچ ہزار شیعوں کو قتل کر ڈالا اور روضے پر چڑھے ہوئے نوادرات لوٹ لے گئے، فتح علی شاہ نے سلیمان پاشا والی بغداد کو لکھا مگر انہیں ایام میں اس کا انتقال ہو گیا، آخر فتح علی شاہ کو خود ان کی سرکوبی کے لئے نکلنا پڑا۔

۱۸۱۱ء میں وہ ایک لشکر جرار لے کر نکلا، مسقط میں وہابیوں نے اس کا مقابلہ کیا اور شکست کھا کر بے شمار لاشیں اپنے پیچھے چھوڑ گئے پھر نجد میں کئی مقابلے ہوئے جن میں کافی وہابی مارے گئے اور وہ کربلا کے قتل عام کا بدلہ لے کر واپس ہو گیا۔

فتح علی شاہ کثیر الاولاد تھا۔ ۵۷ بیٹے ۴۶ بیٹیاں اس نے یادگار چھوڑیں اور ایک مضبوط حکومت بھی جس میں بعد کے لائق حکمرانوں نے چار چاند لگا دیئے پھر زوال شروع ہو گیا۔

محمد علی شاہ اول

۱۲۵۳ھ میں اس نے غوریاں فتح کر کے حکومت کا افتتاح کیا پھر ہرات کو محاصرہ میں لیا مگر انگریزوں کے کہنے سے محاصرہ اٹھا لیا۔

اس کے عہد میں افغانوں نے شیعوں پر جہاد کی نیت سے حملہ کیا۔ نجیب پاشا

حاکم بغداد سخت شیعہ دشمن تھا ۔اس نے ۱۲۶۰ھ میں کربلا پر چڑھائی کی، تین گھنٹے کے قتل عام میں نو ہزار شیعہ قتل کرائے اور شہر کو بے طرح غارت کیا، محمد علی شاہ نے انتقام لینے کے لئے ترکی پر حملہ کر دیا لیکن کوئی بڑی جنگ ہونے سے قبل روس اور انگلستان کے سفیر درمیان میں آگئے اور عذر معذرت پر بات زیادہ بگڑنے نہیں پائی۔ مرد مسلمان، اہل دانش، بہادر بادشاہ محمد علی شاہ چودہ سال کی باجبروت حکومت کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

ناصر الدین شاہ

۱۲۶۴ھ میں خراسان و مشہد میں ترکمانوں نے بغاوت کی جس کو بآسانی فرد کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں بابی فرقہ وجود میں آیا: علی محمد نامی ایک شخص نے اپنا نام باب رکھا اور مہدی آخر الزماں ہونے کا دعویٰ کیا، ملا حسین بشرویہ اس کا خلیفہ اور قرۃ العین اس کی نائب تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے عقید تمندوں کا ایک حلقہ ہو گیا اور جابجا بغاوت کی صورت پیدا ہو گئی ۔آخر حکومت کو اس پر توجہ کرنا پڑی ۔۱۲۶۶ھ میں باب مارا گیا ۔اس کے ساتھ ہی بہت سے بابی قتل ہوئے اور ان کی جمعیت منتشر ہوئی۔

۱۲۶۷ھ میں محمد امین خاں والی خوارزم نے علاقہ سیرابی پر قبضہ کر لیا جس کو ناصر الدین شاہ نے ایک لشکر بھیج کر واپس لیا..... اسی سلسلے میں حاکم سیستان کو مطیع کیا گیا اور ہرات کو قبضے میں لیا گیا۔

اسی سال شیخ سلیمان بابی اور شیخ علی نے بارہ آدمیوں کے ساتھ شاہ قاچار پر سرراہ حملہ کیا، ناصر الدین کو معمولی ساز خم آیا اور وہ سب قتل کر دیئے گئے ۔ کچھ دنوں کے فصل سے والی قندرھار نے خود حاضر ہو کر اطاعت قبول کی اور والی مسقط باجگزار ہوا۔

۱۲۷۱ھ میں محمد امین خان والی خوارزم نے پھر ہاتھ پاؤں نکالے اور سرخس پر حملہ کر کے فتح کر لیا ۔اس کے مقابلے کے لئے ایک بڑا لشکر بھیجا گیا اور وہ قتل ہوا

اسی زمانے میں دوست محمد والی کابل نے قندھار پر قبضہ کر لیا اور ہرات پر بھی اپنا پرچم لہرا دیا ۔قاچاریوں نے ہرات تو فوراً واپس لے لیا قندھار کے لئے فوج

روانہ ہونے ہی والی تھی کہ دوست محمد نے انگریزوں کی مدد بوشہر بھی فتح کر لیا اور وہاں کے حاکم دریا بیگ کو گرفتار کر کے بمبئی بھیج دیا۔ اس پر ایک بڑی فوج مقابلے کے لئے بھیجی گئی۔ انگریزوں نے افغان فوج کو جدید آلات حرب سے لیس کر دیا تھا پھر بھی کئی معرکوں میں انہیں شکست ہوئی ۔آخر ۱۲۷۳ھ میں انگریزوں کی مداخلت سے صلح ہو گئی اور شاہ قاچار نے ہرات وغیرہ مقبوضات پر کابل کا قبضہ تسلیم کر لیا۔ پھر روس، انگریز اور ترکی سفیر ارزن روم میں یکجا ہوئے اور باہم مختلف ممالک کی حدود متعین ہو گئیں ۔اس کے بعد ممالک فرنگ، ترکی، روس اور امریکہ وغیرہ میں دوستانے کے طور پر سفیروں کا تبادلہ ہوا تا کہ کوئی غلط فہمی ہونے پر ایک دوسرے کے موقف کو سمجھا جا سکے ۔

۱۲۸۲ھ میں ناصر الدین قاچار نے نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کی زیارت کی پھر یکے بعد دیگرے تین مرتبہ انگلستان کا سفر کیا اور ہر مرتبہ ایک سفرنامہ تحریر کیا...... ناصر الدین قاچار ایشیا کا پہلا فرمانروا تھا جس نے ساحل انگلستان پر قدم رکھا اور انگریزوں کے ملک میں جس کا شاندار استقبال کیا گیا۔

۱۳۱۳ھ میں اس عظیم حکمران پر محمد رضا بابی نے گولی چلائی اور وہ اس کے پستول سے شہید ہو گیا۔ بہت نیک، خدا ترس، شجاع اور دور اندیش بادشاہ تھا جس کا شہرہ اقبال ایشیا اور یورپ میں اور جس کا نام امریکہ تک پہنچ گیا تھا۔

اس کے عہد میں ایران نے ہر اعتبار سے ترقی کی ۔ریل ۱۸۶۵ء میں اور تار برقی ۱۸۶۷ء میں شروع ہوئی تھی، ایران میں سب سے پہلے ریل کی پٹری ۱۸۸۸ء میں تہران سے شہزادہ عبدالعظیم تک بچھائی گئی ۔۱۸۸۹ء میں پہلا امپیریل بینک قائم ہوا ۱۸۹۱ء میں انگریزوں نے تمبا کو کا ٹھیکہ لیا مگر ۱۸۹۲ء کے شروع میں مجتہدین کی رائے کے مطابق ٹھیکہ توڑ دیا گیا ۔۱۸۹۵ء میں ایک کمیشن کے ذریعے روس اور ایران کی سرحدوں کا تعین ہوا تا کہ آئندہ کوئی تنازعہ کی صورت پیدا نہ ہو ۔

مظفر الدین قاچار

۱۲۶۸ھ میں وہ بمقام تہران پیدا ہوا، ۱۳۱۳ھ میں تخت نشین ہوا ۔اپنے باپ کی طرح لائق اور منتظم تھا، ۱۳۱۷ھ میں وہ بھی انگلستان کی سیر کو گیا اور لگ بھگ

ایک سال بعد واپس ہوا۔ ۱۳۲۶ھ میں انتقال کر گیا۔ محمد علی مرزا ولی عہد سلطنت اور آذر بائیجان کا گورنر تھا۔ رحلت کی اطلاع پاکر وہ تہران آگیا تاکہ باپ کی جگہ عنان حکومت سنبھال سکے۔

محمد علی شاہ دوئم

محمد علی شاہ دوم جنوری ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء میں تخت نشین ہوا۔ مظفرالدین نے انگلستان کے طرز پر ایک پارلیمنٹ بنادی تھی جو امراء و علماء پر مشتمل تھی۔ اس کو محمد علی نے منظور نہیں کیا۔ آخر راعی اور رعایا میں لڑائی کی نوبت آگئی۔ سخت کشت و خون ہوا۔ مئی ۱۹۰۹ھ میں محمد علی نے ملک کو خطرے میں دیکھ کر پارلیمنٹ کی بالادستی منظور کرلی لیکن اس کے بعد اس نے عہد شکنی کی۔ آخر اس کو تخت سے اتار دیا گیا اور اس کے بیٹے احمد شاہ کو ایران کا فرمانروا بنادیا گیا۔

احمد شاہ

احمد شاہ ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء کو تخت پر بیٹھا، مگر اس کو شروع ہی سے ناساز گار حالات کا سامنا کرنا پڑا جس میں عالمی سیاست کو بھی دخل تھا اور اندرونی خلفشار کو بھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے بھائی کو ایران کا ولی عہد بنا کر خود پیرس آگیا اور نظم سلطنت احمد رضاخان کے ہاتھ میں آگیا جو ایک سپاہی کی حیثیت سے فوج میں شامل ہوا تھا اور اب ایران کی پوری طاقت اور ایک طرح سے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔

رضاخان کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو انسان کے مقدر ساز ہونے کا یقین کرنا پڑتا ہے۔

وہ ماژندران کے سلسلہ کوہ میں ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوا تھا۔ ناخواندگی کی حالت میں وہ ۱۴ برس کی عمر میں قزاق بر گیڈ میں ، جو ناصرالدین شاہ قاچار کی خواہش پر روسیوں نے قائم کیا تھا، بھرتی ہوگیا۔ شوق مطالعہ نے پڑھنا لکھنا سکھایا ایران کے سرحدی علاقوں میں اس نے اشتراکی شورش کو دبانے میں نام پیدا کیا، رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہوا وہ قزاق بر گیڈ کی سرداری پر فائز ہوگیا اس دوران غیر ملکیوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کے لئے حکومت کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو ایک انقلاب پسند رہنما سید ضیاء الدین طباطبائی نے بے اثر پارلیمنٹ کو

ختم کرنے اور انقلاب برپا کرنے پر قزاق بر گیڈ کو مائل کیا۔ رضاخان نے ڈھائی ہزار قزاق فوج کے ساتھ تہران پر چڑھائی کردی، دفاع کرنے والی پولیس بھی فوج سے مل گئی اور ۱۹۲۱ء میں ایک انقلاب آگیا لیکن رضاخان کو شہنشاہ احمد شاہ قاچار کے ساتھ غداری کچھ پسند نہ آئی آخر شہنشاہ نے ضیاء الدین طباطبائی کو ملک کا وزیر اعظم اور رضاخان کو افواج کا سپہ سالار بنادیا۔

لیکن ۱۹۲۱ء میں ضیاء الدین طباطبائی کو اپنی سخت گیری کے سبب مستعفی ہونا پڑا تو رضاخان کو وزارت دفاع کا منصب بھی سونپ دیا گیا اس نے فوج کی تنظیم کے ساتھ طاقت میں خاطر خواہ اضافہ کیا اور ملکی اور خارجہ پالیسیوں پر اپنا اثر مترتب کیا، حتیٰ کہ اکتوبر ۱۹۲۳ء میں وزیر اعظم قوام السلطنت نے احمد شاہ قاچار اور امراء و مجتہدین کی مدد سے رضاخان کو ہٹادینے کا منصوبہ بنالیا لیکن سازش کھل گئی رضاخان نے اقوام السلطنت کو گرفتار کرلیا اور بادشاہ احمد شاہ خرابی صحت کے بہانے اپنے بھائی کو ولی عہد بنا کر پیرس چلا گیا۔

رضاخان نے وزارت عظمیٰ کی ذمہ داری بھی سنبھال لی اس عرصے میں ملک میں جمہوریت کی تحریک شروع ہوگئی، علماء و مجتہدین نے اس کی مخالفت کی اور حالات اتنے بگڑ گئے کہ رضاخان کو مارشل لا لگانا پڑا۔ بے چینی پر ایک حد تک قابو پانے کے بعد رضاخان قم آگیا اس نے مذہبی پیشواؤں سے گفت و شنید کی آخر طے یہ پایا کہ جمہوریت کی تحریک ختم کردی جائے۔

رفتہ رفتہ رضاخان کا اثر حکومت اور پارلیمنٹ پر اتنا بڑھ گیا کہ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں بادشاہ کو معزول کر کے رضاخان کو رضاشاہ پہلوی بنادیا گیا۔ اس طرح قاچاری عہد کا خاتمہ ہوگیا اور اس پہلوی دور کا آغاز ہوا جو انقلاب اسلامی پر مختتم ہوا

پہلوی سلطنت

احمد رضا شاہ پہلوی

سپاہ گری احمد رضا شاہ پہلوی کا پیشہ آبائی تھا۔ اس کے دادا مراد علی خان، ناصرالدین قاچار کے افسر فوج تھے جو ہرات کے محاصرے کے دوران فوت ہوئے۔ والد عباس علی خان ایک متوسط درجے کے زمیندار اور ماژندران کی قاچاری فوج

میں افسر تھے ۔ ان کا انتقال ہوا تو احمد رضا خان صرف چالیس دن کا مولود تھا جس کو لے کر ماں اپنے عزیزوں کے پاس تہران آ گئی اور محمد رضا خان ایک یتیم اور بے سہارا کی طرح پرورش پانے لگا۔

جوان ہونے پر احمد رضا خان نے ایک ان پڑھ سپاہی بن کر زندگی کا آغاز کیا اور جب وہ ایران کا وزیر اعظم ہوا تو اس کا شمار مدبرین عالم میں ہوتا تھا۔

اس نے وقت کے دھارے کا رخ دیکھ لیا تھا لہٰذا پہلے علماء پر اثرات قائم کئے پھر نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کی زیارتوں سے مشرف ہوا اور واپس آکر تندہی کے ساتھ ایران کی تعمیر میں لگ گیا۔

اس نے اپنے دور حکومت میں فوجی تنظیم نو اور اسلحہ سازی کی صنعت کی طرف خصوصی توجہ دی، نظام تعلیم کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا، ذرائع نقل و حمل کو وسعت دی، معدنیات خاص طور سے پٹرول کی دولت کو حکومت کی نگرانی میں غیر ملکی کمپنیوں کی مدد سے تلاش کیا، صحت کے میدان میں بھی کئی اہم اقدامات کئے، حکومت کے نظم و نسق کے شعبہ کی اصلاح کی، نئی تہذیب کو عام کرنے کے لئے معاشرہ کو قدیم تہذیب کی پابندیوں سے نجات دلانے کی کوشش کی علماء و مجتہدین کی مخالفت کے باوجود بے پردگی کو عام کیا، یورپی ممالک سے تجارتی معاہدے کئے اور ملک کو معاشی اور مادی ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔

دوسری جنگ عظیم میں اگرچہ ایران نے اپنی لاتعلقی کا اعلان کر رکھا تھا لیکن روس اور اتحادی فوجوں نے دو طرف سے ایران پر حملہ کر دیا، خاصے جان و مال کا اتلاف ہوا اور حکومت کو سخت سیاسی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ ان حالات میں رضا شاہ کبیر نے اس بات کو مناسب سمجھا کہ وہ اپنے ولی عہد شہزادہ محمد رضا شاہ کے حق میں تخت سے دست بردار ہو جائے چنانچہ اس نے ملک چھوڑ دیا اور خود اختیاری جلاوطنی میں زندگی کے باقی دن گزار دیئے۔

احمد رضا شاہ پہلوی کی زندگی پر ایک نظر ڈالی جائے تو وہ یقیناً ایران کا معمار تھا۔ اس پر زائد سے زائد یہ الزام عائد کیا جا سکتا ہے کہ اس نے ملک کو

نوٹ ۔ آریہ مہر اور پہلوی کی نسبت ایران کے قدیم شاہی خاندان سے ہے ۔

یورپ کے نقش قدم پر ڈال دیا اور علماء کے اثرات کو کم کر کے مذہبیت کو نقصان پہنچایا لیکن اگر اس وقت کے سیاسی افق کو دیکھا جائے تو اس پر پہلا نام مصطفیٰ کمال اتاترک کا نظر آئے گا جس نے خلافت کو ختم کر کے یورپ کے مرد بیمار ترکی میں ایک تازہ روح پھونکی، احمد رضا پہلوی نے بھی اسی کو وقت کا تقاضا قرار دیا۔

ترکی جرمنی کا حلیف رہا تھا اگر مصطفیٰ کمال ایک نیا پرچم لے کر کھڑا نہ ہوتا تو ترکی کا نام دنیا کے نقشے سے اڑ جاتا، رضا شاہ کبیر کا رجحان جرمنی کی طرف تھا لیکن اس نے بڑی مدبرانہ چابکدستی سے اپنی غیر جانبداری برقرار رکھی لیکن اتحادیوں کے نزدیک یہ بھی جرم تھا کہ ایران نے ان کا ساتھ کیوں نہیں دیا۔

ایسے میں صرف رضا شاہ کبیر کی سیاسی سوجھ بوجھ تھی کہ وہ اس تخت سے دست بردار ہو گیا جس پر اتحادیوں کی نگاہ پڑ سکتی اور اس نے ایک نئے تاجدار کو سامنے کر دیا جس پر اتحادیوں کی عدالت کوئی جرم عاید نہ کر سکتی اور اس طرح وہ ایران کو کسی بڑے خرد برد سے بچا لے گیا جو اس کا کارنامہ ہے۔

محمد رضا شاہ پہلوی

۲۲ سالہ محمد رضا شاہ پہلوی نے ستمبر ۱۹۴۱ء میں پارلیمنٹ کے ایک خصوصی اجلاس میں دستور کے مطابق شہنشاہیت کا حلف اٹھایا۔ وہ ایک روشن خیال بادشاہ تھا۔ اس نے اتحادیوں کے بارے میں ایران کی واضح پالیسی مرتب کی اور چند ماہ کی گفت و شنید کے بعد برطانیہ و روس سے بعض معاہدے کر لئے لیکن جلد ہی اپنی سیاسی تدبیر سے ایران کی سرزمین کو روسی اور برطانوی فوجوں سے خالی کرا لیا

وہ فطرتاً ایک شرمیلا نوجوان تھا پھر بھی اپنے دور حکومت میں اس نے ایران کو مادی ترقی کی طرف گامزن کیا مگر ایران کی سیاست کو وہ بیرونی مداخلت سے دور نہ رکھ سکا۔ کبھی وہ برطانیہ کے تسلط میں تو کبھی فرانس کے اور آخر کار امریکہ کے چنگل میں اس حد تک پھنسا کہ ایران امریکہ کا ایک صوبہ اور شاہ ایران علاقہ کا امریکن پولیس مین بن گیا۔ آیۃ اللہ بروجردی کے انتقال کے ساتھ ہی رضا شاہ نے یہ سمجھ لیا کہ ایران میں علماء کا اثر ختم ہو گیا اور ۱۹۶۳ء میں اس نے سفید انقلاب کا اعلان کر دیا۔

اب ایران میں غیر اسلامی شعار کا پرچار عام اور اسے قانونی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، بے پردگی، عریانی، بے حیائی مغربی تہذیب کے پہلو بہ پہلو عروج پر تھے۔ پھر اسرائیل سے تعلقات استوار کئے گئے اور بہائیت کو فروغ حاصل ہوا۔ ایسے میں مشہور عالم دین الحاج آقا روح اللہ خمینی خاموش تماشائی نہ رہ سکے۔ انہوں نے خطبات جمعہ میں عوام کو اس ابتری کی طرف متوجہ کیا اور ایران کے ذریعے عالم اسلام کو آئندہ خطرات سے آگاہ کرنا شروع کیا جس کے نتیجے میں ۵ جون ۱۹۶۳ء کو انہیں گرفتار کر لیا گیا اور قم، تہران، شیراز اور تبریز جیسے شہروں میں شاہ کی مخالفت کی لہر دوڑ گئی، مظاہرے ہوئے اور مجبوراً آیۃ اللہ خمینی کو قید سے رہا کر کے تہران میں نظر بند کر دیا گیا پھر اپریل ۱۹۶۴ء میں انہیں قم بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے انقلاب اسلامی کی تجدید کی اور ظلم کے خلاف عوامی علم بلند کر دیا۔

آیۃ اللہ آقائے خمینی نومبر ۱۹۶۴ء میں ترکی کے لئے ملک بدر کر دیئے گئے مگر وہ عراق منتقل ہو گئے جہاں ان کے مراجع تقلید تھے۔ عراق کے قیام میں وہ مسلسل اسلامی انقلاب کا آوازہ بلند کرتے رہے آخر عراق کی حکومت نے بھی انہیں ملک بدر کر دیا اور وہ کویت ہوتے ہوئے پیرس چلے گئے۔

فرانس کے اس عظیم شہر میں بھی ان کی تحریک جاری رہی، عجیب ستم ظریفی ہے کہ تہران کو مشرق کا پیرس کہا جاتا تھا وہ اسی پیرس کو مشرف بہ اسلام کرنا چاہتے تھے اور یورپ کے پیرس میں بیٹھ کر اس کا نعرہ لگا رہے تھے۔

بہرحال ۱۹۷۸ء میں ایک انقلاب عظیم کے آثار پیدا ہو گئے اور شاہ پہلوی اندرونی اور بیرونی اقتدار کے باوجود اس کو روک نہ سکا۔ اب اس کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا کہ وہ ملک سے فرار ہو کر اپنے کو بچا لے جائے۔ اس کوشش میں وہ کامیاب ہوا اور جنوری ۱۹۷۹ء میں اس پہلوی حکومت کا خاتمہ ہو گیا جس نے مادی زاویہ نگاہ سے ایران کو ایشیا کی سب سے بڑی طاقت بنا دیا تھا لیکن اخلاقی اعتبار سے اتنا کھوکھلا کر دیا تھا کہ وہ کسی طرح مسلمانوں کا ملک کہے جانے کے قابل نہ تھا۔

شیعان کشمیر

کشمیر میں مسلمانوں کے ورود کا کوئی وقت معین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ سلطان محمود نے جب کشمیر پر حملہ کیا تو کہیں نہ کہیں کوئی مسلمان پایا جاتا تھا جو وسط ایشیا سے تجارت یا سیاحت کے لئے آیا ہو گا اور پھر یہیں کا ہو گیا۔

ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح کشمیر پر محمود کا حملہ بھی حصول زر و مال یا تسخیر ملک کے لئے تھا جس کو انجام دے کر وہ ایک ماہ بعد چلا گیا اور کچھ مسلمان اپنی خوشی سے یا حکماً رہ گئے جن سے کشمیریوں کو معلوم ہوا کہ اسلام بھی کوئی مذہب ہے۔ بعض نے اسلام کی حلقہ بگوشی بھی اختیار کی مگر وہ کسی گنتی میں نہیں آتی۔

اس ملک کی اکثریت ہندو اور بدھ مت کی پیرو تھی اور ان کا بادشاہ رینچن ساہ بدھسٹ ہونے کے باوجود اپنے عقیدے سے متفق نہ تھا۔ ایک دن اتفاق سے اس نے دریا کے کنارے ایک شخص کو نماز پڑھتے دیکھا۔ عبادت کا یہ طریقہ اس کو عجیب سا لگا مگر دلکش بھی۔ اس نے عبادت سے فارغ ہونے کے بعد اس شخص سے استفسار کیا اور اس نے اسلام کے بارے میں موٹی موٹی باتیں رینچن ساہ کو بتائیں پھر بادشاہ اس کو اپنی جگہ پر لے گیا اور تفصیلات دریافت کرتا رہا۔ مسلمان اپنے مذہب سے پوری واقفیت رکھتا تھا۔ اس نے بدھ بادشاہ کو متاثر کر لیا......... اس مسلمان کا نام سید شرف الدین المعروف بہ بلبل شاہ تھا۔

بادشاہ کا قبول اسلام وادی کشمیر میں طلوع اسلام کا پہلا دن کہا جا سکتا ہے پھر آہستہ آہستہ علماء، صوفیاء اور سادات پہنچنا شروع ہوئے اور ساکنان کشمیر عمومی سطح پر اسلام سے آشنا ہونے لگے۔

"فرشتہ" کا بیان اس سے مختلف ہے اور وہی صحیح معلوم ہوتا ہے اس نے لکھا ہے کہ:

شاہ مرزا نام کا ایک قلندر راجہ سہدیو کے زمانے میں کشمیر پہنچا اور اپنی چرب زبانی اور دانشمندی سے راجہ کے مزاج میں دخیل ہو گیا اور وزارت کے عہدے تک پہنچ گیا۔ سہدیو کے بعد اس کا بیٹا رینچن راج گدی پر بیٹھا تب بھی شاہ مرزا وزیر رہا۔ رینچن جلد ہی مر گیا تو اس کا ایک قرابت دار اودن قندھار سے آ کر تخت نشین ہوا اس نے بھی مرزا کو بحال رکھا۔

شاہ مرزا ارا کین حکومت پر اپنا اثر قائم کر چکا تھا ان کو ملا کر اس نے ایک فوج تیار کر لی اور راجہ کے مقابلے پر آ گیا۔ اتفاق سے راجہ اودن دیو انہیں دنوں مر گیا۔ رانی ان سے لڑی مگر شاہ مرزا کی چالوں سے مات کھا گئی اور شکست کھا کر گرفتار ہو گئی۔

شاہ مرزا اس کو مسلمان کر کے عقد میں لایا اور ایک شبانہ روز اپنے پاس رکھ کر قید کر دیا اور شمس الدین کا لقب اختیار کر کے کشمیر کا حکمراں بن گیا پھر مذہب حنفی رائج کرنے پر توجہ دی مگر اس نے داد دہش اور انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اس لئے کامیابی سے حکومت بھی کرتا رہا اور حنفیت کو بھی فروغ ملا۔

تین برس حکومت کر کے وہ فوت ہوا تو اس کا بیٹا جمشید تخت پر بیٹھا، پھر علاؤ الدین، شہاب الدین اور قطب الدین تخت نشین ہوئے۔ ان کے بعد سکندر بت شکن کا زمانہ آیا جس نے اشاعت اسلام پر توجہ دی۔ سلطان علی شاہ اس کا جانشین ہوا۔ اس کے بھائی شاہی خاں نے ۸۲۶ھ میں اس کو شکست دے کر حکومت پر قبضہ کر لیا اور سلطان زین العابدین کہہ کر پکارا گیا۔

وہ ایک غیر متعصب حکمراں تھا اس کے عہد میں ہندو مسلمان سب خوش رہے اور حدود سلطنت وسیع سے وسیع تر ہو گئیں۔ بہت سے رفاہی کام بھی ہوئے طور طریقے میں وہ اکبر اعظم کی نظیر تھا۔ پھر شاہ حیدر اور شاہ حسن کے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے اور ۸۶۴ھ میں فتح شاہ کشمیر کا فرمانروا ہوا۔

کشمیر میں شیعیت

اس سلسلے میں متفقہ طور پر ایک نام لیا جاتا ہے سید علی ہمدانی کا جو سات

سو سادات کے ساتھ وارد کشمیر ہوئے۔ سن ورود ۷۷۴ھ بتایا جاتا ہے۔ اس طرح آپ جب سرینگر پہنچے تو مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئے پچیس تیس سال گزر چکے تھے اور سلطان قطب الدین کا زمانہ تھا اس نے بصد تکریم استقبال کیا مگر آپ چالیس روز قیام کر کے واپس ہو گئے۔

سادات یقیناً ٹھہر گئے ہوں گے جنہوں نے وہ خانقاہ مکمل کی جو سید ہمدانی سے منسوب ہے۔

چالیس روزہ قیام میں آپ نے رشد و ہدایت کا فریضہ مرکز حکومت سری نگر میں ادا کیا پھر مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے واپس ہو گئے۔ کشمیر میں قیام کا دورانیہ معلوم نہیں مگر بنیادی اثرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کافی طویل رہا ہو گا اور آپ کے بعد سادات میں سے جو لوگ رہ گئے تھے وہ آپ کے مشن کو پورا کرتے رہے ہوں گے

پھر ۷۹۵ھ میں جب آپ کے صاحبزادے سید محمد ہمدانی کشمیر آئے تو ان کے ہمراہ بھی تین سو آدمی تھے مل جل کر ایک ہزار آدمی لہذا خود سید محمد ہمدانی کو کشمیر میں شیعیت کی اساس قرار دیا جا سکتا ہے۔

سید ہمدانی کا مسلک بعض مورخین نے شافعی لکھا ہے اور بعض نے شیعہ مگر شافعی زیادہ قرین عقل ہے کیونکہ اس وقت سے بہت پہلے ان کی تبلیغی سرگرمیاں تیز ہو چکی تھیں اور ان کے مبلغ مسلسل ملایا، جاوا، سماترا پہنچ رہے تھے، ہو سکتا ہے کہ سید علی ہمدانی کی مسافرت بھی اسی مقصد کے لئے عمل میں آئی ہو۔

بہرحال سید نے فضائل محمد و آل محمد سے اپنی مہم کا آغاز کیا جس کی تلقین امام شافعی بھی کرتے رہے اور اسی پر شیعیت کی اساس بھی رکھی ہوئی ہے ....

سید علی ہمدانی کے بارے میں شیعہ ہونے کا گمان اس لئے بھی ہوتا ہے کہ ان کے ساتھیوں کی اکثریت شیعہ تھی۔

کشمیر کے سابق مسلمانوں میں کچھ شیعہ بھی تھے جو ہندو رسم و رواج سے متاثر ہو گئے تھے۔ سید علی ہمدانی کے ساتھیوں میں شیعہ عالم سعید الدین نے تفہیم اسلام کے ساتھ ان کی اصلاح کے فرائض بھی انجام دیئے۔ سید محمد مدنی اور سید

حسین قمی بھی ۷۹۶ھ میں کشمیر آپہنچے۔ان بزرگوں کے کشف و کرامات کے ان گنت واقعات وادی کشمیر میں زبان زد ہیں۔

اس کے بعد وقتاً فوقتاً سادات میں سے بعض افراد پہنچتے رہے۔ان کے تسلسل میں ایک نام میر شمس الدین عراقی کا ملتا ہے جن کو مرزا حسین والی خراسان نے بھیجا تھا اور ان کے ہاتھ کشمیر کے بادشاہ وقت حسن شاہ کو بعض تحائف روانہ کیئے تھے۔یہ حسن شاہ شاہ مرزا کی اولاد میں تھا، میر شمس الدین بعض اہم تبلیغی مہمات انجام دے کر واپس ہوگئے۔

میر شمس الدین دوسری بار کشمیر گئے تو ایک صاحب اقتدار ملک موسیٰ رینہ کو حلقۂ اہل بیت میں داخل کیا اور اس کے اثر سے پورا چڈ ہیل شیعہ ہو گیا جہاں ۹۰۴ھ میں انہوں نے ایک خانقاہ تعمیر کرائی۔

اب میر کی حیثیت ایک مرشد کی تھی اور اشاعت اسلام میں آپ کی مصروفیت بڑھتی جا رہی تھی۔علاقہ لداخ میں آپ نے بے شمار ہندوؤں کو مسلمان کیا۔کرگلی اور اسکردو میں پرچم آل محمد لہرا دیئے اور نو مسلموں کو از سر نو مسلمان کیا۔

۹۳۲ھ میں میر شمس الدین کا انتقال ہو گیا جو حقیقتاً شیعہ اثناء عشری نہ تھے بلکہ نوربخشی مسلک کے تھے جو شیعہ عقائد سے ملتے جلتے ہیں...... ۹۵۵ھ میں مرزا حیدر کاشغری نے کشمیر پر حملہ کیا تو نوربخشی اور شیعہ اثناعشری سب کا قتل عام کیا اور میر شمس الدین کا مزار کھدوا ڈالا۔اس مرتبہ اسکی حکومت کشمیر میں دس سال رہی۔

نوربخشی عقائد کے بارے میں محمد قاسم فرشتہ نے لکھا ہے کہ بنیادی عقائد میں وہ شیعوں کے مشابہ ہیں لیکن ان کے مذہبی معمولات زندیقوں جیسے ہیں میر شمس الدین کے متعلق فرشتہ کا کہنا ہے کہ وہ نوربخشی نہ تھے بلکہ اثناعشری شیعہ تھے۔کتاب "احوطہ" ایک ملحد کی تصنیف ہے جو ان کے نام سے لکھ دی گئی ہے کشمیر کی آبادی کی بابت فرشتہ کا بیان ہے کہ وہ سنی تھی البتہ فوج میں شیعہ موجود تھے۔

یہ بیان تحقیق مزید میں پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے اور بعد کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔(۴۲)

کشمیر کا جیالا سپاہی

میر شمس الدین کے بعد ملک موسیٰ رینہ نے ان کے مشن کو پورا کیا۔۹۱۶ھ میں فتح شاہ کے مقابلے میں وہ مارا گیا تو فتح شاہ اس کے علاقہ کا حکمران ہوا۔

فتح شاہ سلطان زین العابدین کا بیٹا تھا اس کے دو بھائی اور تھے جن کے مابین لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخر ۹۲۴ھ میں محمد شاہ کامیاب ہوا۔اس نے مشہور و معروف قبائلی سردار لنگر چک کے وارث کاجی چک کو وزارت کے عہدے پر فائز کیا جو امراء کی سازشوں سے اکتا کر نوشہرہ چلا گیا۔

قبائل کی ان لڑائیوں سے شیعیت کو نقصان پہنچا مگر اس سے قبل اتنی اشاعت ہو چکی تھی کہ عقائد متزلزل نہیں ہوئے......... ان ہی میں ایک خاندان کپوارہ تھا جو سنی مسلک پر قائم رہا۔

کاجی چک نوشہرہ میں مقیم تھا کہ کشمیر پر حملے کے لیئے بابر کا بھیجا ہوا لشکر نزدیک پہنچ کر ٹھہر گیا۔کاجی چک نے حب الوطنی میں اس لشکر پر شب خون مارا۔اس کا بیٹا حسین خان، شیخ علی بیگ سردار لشکر کے خیمے میں گھس گیا اور پے در پے تلوار کے تین وار کیئے۔شیخ نے پناہ مانگی تو اس کو چھوڑ دیا مگر رات کے اندھیرے میں باقی لشکر کا صفایا کر دیا۔اس واقعے کی اطلاع جب سلطان محمد شاہ کو ہوئی تو اس نے درخواست کر کے کاجی چک کو عہدہ وزارت پر واپس بلا لیا۔

سلطان محمد اس بار بھی کچھ ہی دنوں بعد کاجی چک کے خلاف ہو گیا تو ۹۳۴ھ میں کاجی نے اس کو تخت سے اتار کر اس کے بیٹے ابراہیم کو بادشاہ بنا دیا اور نظم حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

پچھلی وزارت میں علی رینہ سے کاجی کا معرکہ ہوا تھا اور وہ گرفتاری کے بعد فرار ہو گیا تھا۔اس نے ریگی چک اور ماگرے قبائل سے سازش کی اور ابراہیم ماگرے ۹۳۵ھ میں بابر سے بیس ہزار فوج لے کر کشمیر پر چڑھ دوڑا۔اس لشکر کا سپہ سالار بھی شیخ علی بیگ تھا۔کاجی چک بڑی بہادری سے لڑا مگر شکست کھا کر میدان سے نکل بھاگا۔

فاتحین نے سری نگر میں داخل ہو کر سلطان محمد شاہ کو پھر تخت پر بٹھا دیا اور ملک کو تقسیم کر لیا۔ ملک ابدال، لوہر ماگرے، ریگی چک اور علی رینہ ایک ایک حصے پر قابض ہو گئے۔

۹۳۷ھ میں مرزا کامران نے تیس ہزار فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ شیخ علی بیگ اور محرم سرداران لشکر تھے اس کی اطلاع پا کر چاروں حکمران قلعہ چیراوڑر میں جمع ہوئے اور کاجی چک سے مشترکہ درخواست کی۔ کشمیر کا محب وطن پچھلی باتیں بھول کر مدد کے لئے آگیا پہلی ہی لڑائی میں دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے اور وہ صلح کر کے واپس ہو گئے۔

۹۳۹ھ میں سلطان سعید خان والی کاشغر نے کشمیر پر حملہ کیا اس کے لشکر نے کئی شہر پامال کر ڈالے اور علاقوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ جاڑا گزر جانے پر کشمیری پھر متحد ہو کر آئے۔ پہلے دن کے معرکے میں علی رینہ، حسین رینہ اور علی بٹ نے بڑی شجاعت کے جوہر دکھائے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ دوسرے دن کاجی چک نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اس کے پیہم حملوں سے ترکوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور کاجی چک انہیں بھگاتا چلا گیا۔

اسی سال کشمیر میں سخت قحط پڑا۔ مرزا حیدر دوغلات کاشغری فوج کا ایک سردار تھا جو ہمایوں کا قریبی عزیز بھی تھا۔ اس نے اس موقع پر اہل کشمیر پر بڑے مظالم ڈھائے پھر وہ ہمایوں کے پاس چلا گیا۔ ۹۴۴ھ میں سلطان محمد شاہ کا انتقال ہو گیا لہذا اسکے بیٹے شمس الدین ثانی کو تخت پر بٹھایا گیا اور کاجی چک وزیر بنایا گیا۔ اس کے عہد وزارت میں پہلے شمس الدین کا انتقال ہوا، پھر اس کا بھائی اسمٰعیل شاہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ ۹۴۶ھ میں اسمٰعیل کا بیٹا ابراہیم شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس مدت میں ریگی چک اور ابدال ماگرے نے بغاوت کی اور کاجی چک نے دونوں کو ہندوستان کی طرف مار بھگایا۔ یہ دونوں پھر مرزا حیدر کو چڑھا لائے۔

مرزا حیدر سنی تھا اور یہ دونوں بھی سنی تھے اس لئے انہوں نے شیعیت کے غلبہ کو کم کرنے کے لئے سنی مسلک کے لوگوں کا تعاون حاصل کیا اور کاجی چک مقابلے کی طاقت نہ دیکھ کر نوشہرہ چلا گیا۔

اس عرصے میں شیر شاہ سوری ہندوستان کا بادشاہ ہو چکا تھا۔ کاجی چک نے اس سے مدد حاصل کر کے کشمیر پر حملہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ۹۵۱ھ میں کاجی چک نے دوسرا حملہ کیا مگر اس میں بھی شکست کھائی کیونکہ اس کے پاس فوج کی تعداد بہت کم تھی اور مرزا حیدر کے پاس ایک بڑا لشکر تھا، پھر بھی کاجی چک مایوس نہ تھا لیکن ۲۲ جمادی الاخر ۹۵۲ھ میں اس کا وقت آخر آپہنچا اور پونچھ کے علاقے میں موضع تھنہ میں وہ داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔

وہ ایک عظیم سردار قبیلہ اور باجبروت بادشاہ تھا بہادر، رحمدل اور منصف مزاج، رزم گاہ کا شیر اور بزم کی رونق تھا۔ عقل و دانش ذہانت اور فطانت میں جواب نہ رکھتا۔ اس کی داد و عطا کے قصے کشمیر میں مشہور تھے اس نے چڈبیل کے متصل خانقاہ نور بخشیہ نام کا ایک امام باڑہ بنوایا تھا جو کشمیر کا پہلا امام باڑہ تھا جس میں مجلس عزا منعقد ہوتی تھی۔

شیعوں کی بے چارگی

نازک شاہ ولد فتح شاہ، ابراہیم شاہ کے بجائے کشمیر کا بادشاہ بن چکا تھا مگر حقیقتاً بادشاہت مرزا حیدر دوغلت کی تھی جو ۹۴۷ھ سے اہل کشمیر پر کوہ ستم توڑ رہا تھا۔ وہ ایک بہت متعصب سنی تھا۔ شیعوں کے قصور ڈھونڈ کر اور پیدا کر کے مشق ستم کرتا۔ کاجی چک نے حنفیوں، شافعیوں اور شیعوں کو شیر و شکر بنا رکھا تھا مرزا حیدر نے ان میں عداوت کا بیج بو دیا۔ صورت حال کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ

"۹۵۲ھ میں کاجی کی وفات سے اس کے قبیلے اور جماعت میں تفرقہ اور پریشانی ہوئی، شیعہ امامیہ اور نور بخشی مسلمان بے بس ہوئے کیونکہ اب ان کی رہبری اور رہنمائی کے لئے قائد موجود نہ تھا۔"

اس سے مرزا حیدر اور شیر ہو گیا۔ ۹۵۵ھ میں عوام اور سپاہیوں کو شیعہ اور نور بخشی مسلمانوں کا قتل و غارت کرنے کا حکم دیا۔ یہ حکم پاتے ہی انہوں نے ان دو جماعتوں کا قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ شروع کی۔ ان کے معابد، مساجد اور مکانات جلائے گئے۔ چڈبیل میں میر شمس الدین کی خانقاہ کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا پھر اسکو مزبلے میں تبدیل کر دیا گیا۔ شنکر ریشی شیخ دانیال ولد میر شمس الدین

کے خلیفہ تھے ۔انہیں مرزا حیدر نے ۸ ذی الحجہ ۹۹۵ھ کو شہید کر دیا ۔ان کے جسم کو جلوا دیا ۔ بابا علی بخار کے مرید صوفی داؤد کو تڑپا تڑپا کر مارا ۔خود بابا علی بخار کو قتل تو نہیں کیا مگر ڈاڑھی منڈوا دی ۔قاضی میر علی پر شیعوں کی حمایت کا الزام لگا کر شہر بدر کر دیا ۔ پھر دانیال پر علماء سے کفر کے فتوے لگوا کر قتل کیا حتیٰ کہ شیعہ مشاہیر میں سے کسی کو جیتا نہ چھوڑا ۔

اکتفاء صرف اتنے ہی پر نہیں کی گئی بلکہ حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ جو میر شمس الدین کی پیروی کرے گا نور بخشی یا شیعہ مسلک اختیار کرے گا، وہ مستوجب قتل ہو گا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عراق و شام کی طرح شیعہ تقیہ کر کے منظر عام سے ہٹ گئے مرزا حیدر خود اپنی "تاریخ رشیدی" میں لکھتا ہے ۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس وقت کشمیر میں کوئی شخص علانیہ نور بخشی مسلک کا اظہار نہیں کرتا ۔ تمام لوگ اپنے آپ کو سنی مسلک کا مسلمان ظاہر کرتے ہیں کیونکہ وہ میری سنگدلی سے واقف ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے کوئی دوسرا مسلک اختیار کیا تو انہیں قتل کر دیا جائے گا" ۔(۴۳)

سفاک ترک نے شیعوں کے ساتھ سنیوں اور ہندوؤں کو بھی نہیں بخشا ۔ آخر عیدی رینہ نے اس کے خلاف کھڑے ہونے کا منصوبہ بنایا ۔اس نے سید ابراہیم ، غازی چک اور دولت چک سے مل کر ایک جمعیت اکٹھا کی اور مرزا کی قوت کم کرنے کے لئے مختلف مقامات پر نام کی بغاوتیں کرا دیں ۔ مرزا حیدر نے اپنے فوجی دستے ان جگہوں پر بھیج دیئے اور خود اس کے ساتھ تھوڑے سے سپاہی رہ گئے ۔ یہ لوگ اس موقع کے منتظر تھے ۔انہوں نے اس پر حملہ کر دیا ۔ادھر اس کے سپاہی ٹکڑیوں میں بٹ کر مار ڈالے گئے اور خود مرزا کو ایک قصاب نے ذبح کر ڈالا

قبیلہ چک کا دوسرا جرنیل

۹۵۸ھ میں نازک شاہ کو پھر بادشاہ بنایا گیا، عیدی رینہ وزیر اعظم ہوا اور کاجی چک کے بیٹے اور پوتے مختلف عہدوں پر فائز کئے گئے ۔ ۹۶۱ھ تک کا زمانہ کشمیریوں کے لئے بہت اچھا گزرا ۔اس کے بعد ہیبت خان نیازی سلیم شاہ سوری

کے حکم سے کشمیر پر حملہ آور ہوا ۔ دولت چک کشمیر کا سپہ سالار تھا ۔ بعض اراکین حکومت اس سے جلتے تھے وہ اس کے پیچھے اپنی اپنی فوجیں لے کر چلے تو مگر اس کی شکست کے خواہاں ہو کر ۔

دولت چک نے اپنے لشکر کو دو مختلف راستوں سے بھیج کر دشمن کو گھیرے میں لے لیا اور ایسے تابڑ توڑ حملے کئے کہ صرف دو آدمی بمشکل بچ کر جا سکے ۔

اس فتح سے سارا ملک خوش ہوا مگر عیدی رینہ جل بھن کر کباب ہو گیا ۔ اس نے کئی سرداروں کو ملا کر علم بغاوت بلند کر دیا مگر دولت چک نے اس کے حلیفوں کو توڑ لیا عیدی رینہ ہزیمت یاب ہوا اور بھاگتے میں گھوڑے سے گر کر مر گیا

دولت چک بڑا طاقتور تھا، اپنے وقت کا رستم کہا جاتا، منصف مزاج تھا ۔ اس نے ہر ایک کو مذہبی آزادی دی تھی ۔جو بزرگ مرزا حیدر کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے، ان کے مزارات بنوائے اور پس ماندگان کو جائیدادیں دیں، میر شمس الدین کی خانقاہ دوبارہ تعمیر کرائی اور اس کے لئے کئی گاؤں وقف کئے ۔

دولت چک کے بعد طاقت و سطوت غازی چک کے ہاتھ میں آ گئی ۔اس نے اسمٰعیل شاہ کو معزول کر کے حبیب چک کو فرمانروا بنا دیا اور کشمیر میں چک خاندان کی حکومت کا آغاز کر دیا ۔

حبیب چک کی نالائقی کے سبب کچھ دنوں بعد غازی چک کو تخت پر بٹھا دیا گیا اور ۹۶۱ھ میں اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ۔

چک بادشاہ ، غازی شاہ

چک خاندان اپنی شجاعت ، لیاقت ،تدبر اور دانائی میں ممتاز تھا اور غازی شاہ میں بھی یہ تمام باتیں پائی جاتی تھیں ۔اس نے تھوڑے ہی عرصے میں لداخ ، اسکردو ، گلگت ، پکھل اور گکھر فتح کر کے اپنی سلطنت کی حدود وسیع کر لیں ۔وہ کسی پر زیادتی نہ کرتا پھر بھی اس کے خلاف سازشیں اور بغاوتیں ہوئیں مگر اس نے ان سب پر قابو پا لیا........ باغیوں نے دہلی پہنچ کر مغلوں سے مدد لی اور ابوالمعالی ایک لشکر کے ساتھ کشمیر آپہنچا.......... اور تمام سنی مسلمان اس سے جا کر مل گئے ۔

غازی شاہ کو بالکل وقت پر خبر ہو سکی۔اس کے ساتھ صرف اس کے رشتہ دار اور کچھ قبیلے کے لوگ تھے پھر بھی وہ مقابلے پر آگیا۔

تھوڑے سے سرفروش ایک آزمودہ کار لشکر سے ٹکرائے لیکن مردانگی نے حرص و آز کا منہ پھیر دیا۔ابو المعالی بچ کر نکل گیا اور ڈیڑھ ہزار قیدی غازی شاہ کے لئے چھوڑ گیا۔ باغی پھر ہندوستان پہنچ گئے اور اب کی وہ حیدر کاشغری کے بھائی قرا بہادر کو لے آئے...... اب کی غازی شاہ نے اعلان کیا کہ جو ایک مغل کا سر لائے گا اس کو ایک اشرفی انعام میں ملے گی۔

ڈوم قبیلے کے لوگ یہ سنتے ہی نکل پڑے۔جو مغل جہاں کہیں انکو ملا اس کو انہوں نے پچھاڑ دیا اور ایک اشرفی کے ساتھ کچھ اور انعام بھی حاصل کیا۔اس طمع نے وبا کی صورت اختیار کی تو ایک بڑی تعداد بغیر لڑے بھڑے بے سر ہو گئی اور مغل ہمت ہار کر واپس چلے گئے۔

اس دوران غازی شاہ کی بصارت جاتی رہی اور وہ اپنے بھائی حسین شاہ کے حق میں تخت سے دستبردار ہو گیا۔

غازی شاہ بڑے رعب و دبدبے کا حکمراں تھا، اس کے عہد میں بڑا امن و امان رہا، بہادر اور انصاف پسند تھا، علم دوست اور شاعر تھا، بہادروں اور اہل علم کی عزت کرتا تھا، کسی مظلوم کی حفاظت اپنا فرض، تاہم اس کا عزیز بھی ہو تو سزا دیئے بغیر نہ چھوڑتا۔ان اوصاف کی بدولت اسے ہر دلعزیزی حاصل تھی۔

حسین شاہ

خاندان چک کا تیسرا بادشاہ تھا جو ۹۷۱ھ میں تخت نشین ہوا۔اس کو تخت پر بیٹھتے ہی کئی اندرونی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا، جن کو اس نے بڑی بہادری سے فرد کیا۔

وہ ایک منصف مزاج حکمراں تھا، سنی و شیعہ میں تمیز نہ کرتا لہذا سنی غضب بڑھنے لگا اور اکثر سر عام تلخ کلامی کی نوبت آجاتی، کئی قتل بھی ہوئے۔بادشاہ کی صحت بھی خراب تھی۔آخر وہ اپنے بھائی علی کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گیا مدت حکومت ۹۷۱ھ سے ۹۷۸ھ تک رہی۔

علی شاہ

اس بادشاہ نے ۹۷۸ھ میں عنان حکومت ہاتھ میں لی۔سید مبارک بیہقی اس کا وزیر ہوا جس نے کئی اندرونی بغاوتوں کو فرد کیا پھر سابق شاہی خاندان سے نازک شاہ کے بیٹے حیدر خان اور سلیم خان اٹھے اور کئی قبیلوں کو ملا کر مقابلے پر آ گئے مگر پسپا ہوئے۔علی شاہ نے دونوں کو معاف کر دیا۔

راجہ کشتوار نے دو مرتبہ بغاوت کی مگر شکست کھائی۔پہلی مرتبہ اپنی بیٹی علی شاہ کو پھر دوسری بیٹی یعقوب شاہ کو بیاہ دی۔

اسی زمانہ میں قحط پڑا۔ بادشاہ نے اپنا خزانہ اور زر و مال رعایا میں تقسیم کر دیا۔امراء و عمائدین نے بھی اس کی تقلید کی جس سے بادشاہ کی رعایا پروری کی دھوم ہو گئی۔ایک دن چوگان بازی میں اس کی آنت پھٹ گئی اور وہ نو سال حکومت کر کے انتقال کر گیا۔بہت رحم دل اور علم پرور بادشاہ تھا۔

یوسف شاہ

۹۸۷ھ میں اس کا بیٹا تخت پر بیٹھا لیکن خاندانی بغاوتوں میں ہزیمت یاب ہوا اور سری نگر چھوڑ کر تھنہ چلا گیا۔

سید مبارک بیہقی

۹۸۸ھ میں بادشاہ ہوا جو پہلے علی شاہ کا وزیر رہا تھا۔وہ ایک سادہ مزاج انسان تھا، نظم و نسق میں ماہر امراء کی خود سری کو اس نے اول دن سے لگام دی اس لئے سب اس کے خلاف ہو گئے اور انہوں نے دوبارہ یوسف شاہ کو لانے کا منصوبہ بنا لیا مگر دونوں میں سے کوئی لڑنے کو تیار نہ تھا۔

ابدال بٹ مبارک بیہقی کا دشمن تھا اس نے ساز باز کر کے لڑوا دیا اور یوسف شاہ شکست کھا کر پھر تھنہ چلا گیا۔ابدال اب بھی باز نہ آیا، اس نے سرداروں سے مل کر بیہقی کے خلاف زہر اگلا اور سب نے مل کر اس کو تخت سے اتار دیا اور لوہر خان کو بادشاہ بنا لیا۔

لوہر خان

وہ ایک درد مند بادشاہ تھا۔اپنے دور میں اس نے اشیائے صرف بہت ارزاں کرائیں۔روٹی اتنی بڑی بنتی تھی کہ "لوہر منڈ" کہی جاتی۔

یوسف شاہ دوسری شکست کے بعد آگرہ چلا گیا تھا چونکہ فن موسیقی کا ماہر تھا لہٰذا اکبر کے دربار میں اس کی پذیرائی ہوئی وہ ایک فوج لیکر کشمیر آیا۔لوہر خان نے ابدال بٹ کو اس کے مقابلے کے لئے روانہ کیا لیکن اس کے بیٹے نے غداری کی اور یوسف سے مل گیا۔پھر بھی لوہر خان ہمت نہیں ہارا۔قبائل کی اکثریت یوسف شاہ کے ساتھ ہو گئی تھی لیکن ابدال بٹ نے مقابلہ کیا اور لڑائی میں مارا گیا اور لوہر خان ہندوستان چلا گیا۔

سری نگر میں یوسف شاہ کا شاندار خیر مقدم کیا گیا اور ۹۸۹ھ میں وہ دوبارہ تخت نشین ہوا۔

بے وفائی اور سازشیں کشمیریوں کا خاصہ مزاج تھیں۔ان کا سابقہ دوسری بار یوسف شاہ کو ہوا۔کچھ دنوں بعد بغاوتیں شروع ہو گئیں۔حبیب چک کو گرفتار کر کے سزا دی گئی۔حیدر چک نکل گیا اس نے کشتواڑ سے مدد لے کر جنگ کی مگر شکست کھائی۔

کچھ دنوں بعد شہنشاہ اکبر کی سفارت کشمیر پہنچی۔جواباً یوسف شاہ نے اپنے بیٹے یعقوب کو روانہ کیا۔وہ دربار اکبری کے حالات لکھ کر یوسف شاہ کو بھیجتا تھا مگر مرزا قاسم انہیں چھپا ڈالتا تھا۔ادھر اکبر نے حکم دیا کہ حکیم علی خود کشمیر جا کر یوسف شاہ کو لائے۔

یعقوب کو درباری حالات کا علم ہوا تو نظریں بچا کر بھاگ کھڑا ہوا مگر مرزا قاسم نے چالاکی سے باپ کو بیٹے سے بدظن کر دیا اور حکیم علی یوسف شاہ کو لینے کے لئے پہنچا تو اس کو کور جواب دلوا دیا۔

ہندوستان کا شاہی مزاج اس خودسری کی تاب نہ لا سکا، نتیجے میں اکبر نے راجہ بھگوانداس کو فتح کشمیر پر مامور کر دیا۔مغل افواج کشمیر کے قریب پہنچیں تو تمام کشمیری اکائی بن کر مقابلے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔مرزا قاسم نے اس موقع پر

سب سے زائد غداری کی۔مغل کیمپ میں جا کر راجہ بھگوان داس سے اپنے لئے وعدے لئے اور یوسف شاہ کو بہکا کر صلح کے لئے راجہ بھگوانداس کے پاس پہنچا دیا۔

غیرت دار بیٹا یعقوب اتنی آسانی سے کشمیر کو مغلوں کے رحم و کرم پر ڈالنے والا نہ تھا اس کے حکم پر ابو طالب نے درہ کھادرہ سے گھیرا ڈالا اور درہ بولیاسہ سے فائدہ اٹھا کر مغل افواج کا راستہ روک دیا......... کشمیریوں کی خوش قسمتی سے بارش اس قیامت کی ہوئی اور برف باری کے سبب سردی اس غضب کی پڑی کہ مغل سپاہی مرنے لگے۔دریا کی طغیانی اس پر مستزاد تھی۔انجام کار راجہ بھگوانداس نے دوراندیشی سے کام لے کر یعقوب سے صلح کر لی اور ہندوستان واپس ہو گیا۔

یوسف شاہ کو اپنی بزدلی کی سزا ملی، اکبر نے اسکو قید کر دیا پھر مان سنگھ کے ساتھ قلعہ رہتاس بھیج دیا۔

۱۴ ذی الحج ۱۰۰۰ھ میں اس کی وفات ہوئی۔وہ بڑا رعایا پرور اور مخیر تھا۔حراست کے عالم میں اس نے تمام زروجواہر خیرات کر دیا تھا۔فارسی، کشمیری اور ہندوستانی کا شاعر تھا اور فن موسیقی کا تو استاد تھا۔اچھا منتظم بھی تھا اور مدبر بھی مگر مرزا قاسم سے فریب کھا گیا۔حد سے زائد اعتماد نے اس کو تباہ کر دیا۔

یعقوب شاہ

جواں سال بادشاہ ۹۹۳ھ میں تخت کشمیر پر بیٹھا۔"وہ ذہانت و فطانت اور عقل و تدبر سے آراستہ اور شہامت و شجاعت میں مشہور تھا۔اس کو ملک کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔اس کے عہد حکومت میں وطن دشمن عنصر نے مذہب کے نام پر تعصب کی آگ لگا دی جس کے نتیجے میں اس بدنصیب ملک کی آزادی سلب ہو گئی۔اس فتنے کا بانی قاضی موسیٰ تھا جو بڑا متعصب تھا اور شاہی خاندان کے مٹانے پر تلا ہوا تھا کیونکہ یہ خاندان شیعہ مسلک کا حامی تھا قاضی موسیٰ شاہی خاندان کے دشمنوں اور غداروں کی کھلم کھلا حمایت کرتا تھا۔"

"حسین شاہ کے عہد حکومت میں جن مفتیوں نے مظلوم یوسف (شیعہ) کے قتل کا حکم جاری کیا تھا۔ان میں قاضی موسیٰ بھی شامل تھا۔" (۴۴)

اس سے قبل تین چار بادشاہوں کے عہد میں بھی وہ سازشوں میں ماخوذ ہوا

تھا اور عمائدین کی سفارش پر معاف کر دیا گیا تھا۔ اس بار مغلوں کے ہاتھوں کشمیر کی پامالی کا راز منکشف ہو جانے پر خود اس کے لوگ در گزر پر تیار نہیں ہوئے لہذا اس کو غداری کی سزا دی گئی۔

اس کے بعد شمس چک نے بغاوت کی، کئی لڑائیاں ہوئیں آخر بزرگوں نے بیچ میں پڑ کر صلح کرا دی۔

لیکن عصبیت کشمیریوں کے خمیر میں داخل ہو چکی تھی۔ سری نگر میں کئی قاضی موسیٰ پیدا ہو گئے، شیعہ سنی فساد عروج پر پہنچ گیا۔ میر شمس الدین عراقی کی خانقاہ جلادی گئی اور منصوبے کے مطابق شیعوں کا قتل عام کیا گیا۔

بعض قبیلے کھلی بغاوت پر آمادہ ہو گئے اور یعقوب شاہ اندورنی اور علاقائی خلفشار میں پھنس کر رہ گیا۔

کشمیر میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ کشمیریوں کے لئے نیا ہو یا پرانا لیکن شیعوں کے لئے یہ ان کی تاریخ کا ایک باب تھا جو اب کشمیر میں کھل رہا تھا ورنہ اس سے قبل ایشیا کے کسی حصے میں ان کا وجود برداشت نہیں کیا گیا، کوئی شیعہ حکومت کے کسی عہدے پر فائز ہوا تو اس کے خلاف سازشیں ہوتی رہیں اور وہ انجانے الزامات سے ختم کیا گیا اور اگر کہیں کوئی حکومت بن گئی تو بغاوتیں اس کا مقدر رہیں۔

سنی اقتدار میں تو وہ اپنا نام بھی کھل کر بتانے کے قابل نہ تھے اور خود ان کا اقتدار تو وہم و گمان میں بھی گزر نہ سکتا، گویا وہ ہمیشہ مظالم کا شکار ہونے ہی کے لئے پیدا ہوتے رہے تھے۔

بغداد کا بویہی دور شاہد ہے کہ لاکھ انصاف و رواداری سے حکومت کی گئی مگر نت نئے فتنے اٹھتے ہی رہے اور جہاں موقع ملا، بیدریغ شیعہ کشی کی گئی۔ شیعوں کو کبھی سکون میسر آیا تو کسی غیر جانبدار حکومت میں...... اور سنی حکومتوں میں پہلے تو دو صدیوں تک انہوں نے تقیہ میں بسر کی، وطن چھوڑ چھوڑ کر دور دراز علاقوں میں چلے گئے پھر اتنے گمنامی میں پڑے کہ بزرگ اپنے پس ماندگان کو اپنی حقیقت بھی بتا نہ سکے اور نسلوں کی نسلیں سنی ہو گئیں۔

فی زمانہ جن مقامات پر سنی حکومت ہے وہاں روز یہ سوال اٹھتا ہے کہ

مجلسیں کیوں ہوتی ہیں، جلوس کیوں نکالے جاتے ہیں اذان میں علی کی خلافت الہیہ کا اعلان کیوں کیا جاتا ہے حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ شیعہ علی ہی کو خلیفہ برحق مانتے ہیں اور مجلسیں اور جلوس ان مظالم کے خلاف احتجاج ہے جو ایک نام نہاد مسلم حکومت نے رسولؐ کی اولاد پر روا رکھا تھا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ رسول کے کلمہ گو اور آل رسول پر ستم کے پہاڑ توڑنے والوں کے حمایتی......! یہ جلوس خود ان کے خلاف تو نکلتے نہیں تو برا کیوں لگتا ہے؟

بات یہ ہے کہ شیعوں کی کوئی بات گوارا نہیں ہے اور خود ان کا وجود تو برداشت ہو ہی نہیں سکتا۔

کچھ ایسی ہی صورت حال کشمیر میں تھی، ایک شیعہ حکومت قائم ہو گئی تھی تو سنی اکثریت ریشہ دوانیوں میں لگی ہوئی تھی، کبھی اندرونی بغاوتیں کراتی اور کبھی باہر کی طاقتوں کو اکسا کر کشمیر پر چڑھا لاتی جس میں اب تک کامیابی نہ ہوئی تھی لہذا اس بار ایک مکمل منصوبے کے ساتھ تحریک چلائی گئی اور یعقوب شاہ کو ملکی خلفشار میں بتلا کر کے ایک وفد اکبر اعظم کے پاس پہنچ گیا۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ اکبر کو کشمیر فتح کرنے کی بڑی تمنا تھی اور اس کی کئی کوششیں ناکام رہی تھیں اس لئے اب کی اس نے کشمیر کی یک جہتی کو ختم کرنے کے لئے پہلے سے اپنے آدمی بھیج کر سنی شیعہ سوال کو ہوا دی بلکہ کشمیر میں آگ لگا دی تھی۔

ان آدمیوں میں بعض نے سنی علماء، صوفیاء اور مشائخ کو خرید لیا تھا جس میں شیخ یعقوب صوفی اور خواجہ حبیب اللہ نوشہری سرفہرست تھے۔ یہ لوگ دکھانے کے لئے ایک وفد لے کر اکبر کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور اس کو کشمیر پر حملے کی دعوت دی۔ تبادلہ خیالات کے بعد باہم طے ہوا کہ:۔

"ملک فتح کرنے کے بعد کشمیریوں کو کسی بھی اعلیٰ اور ذمہ دار عہدے پر تعینات نہ کیا جائے، شیعہ چک خاندان میں سے کسی ایک فرد کو بھی کشمیر میں رہنے نہ دیا جائے"

یہ دو شرطیں منجملہ ان شرائط کے تھیں جو اراکین وفد نے اکبر سے منوائیں

خود اکبر کی طرف سے صرف ایک شرط رکھی گئی جو ان لوگوں نے بڑی خوشی سے تسلیم کر لی بالفاظ دیگر اہل کشمیر کی نسلوں کا سودا کر لیا۔ اکبر نے ان سے منظور کرایا

"کشمیریوں میں سے کوئی بھی ہتھیار استعمال نہ کرے اور نہ سپاہ گری کا پیشہ اختیار کرے۔" (۴۵)

شیعہ دشمنی میں مادر وطن کو بیچ کر سنی وفد بہت خوش ہوا کہ اب چک قبیلے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے جائیں گے اور شیعوں کی حکومت ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔

ان کا یہ مقصد تو کسی حد تک پورا ہوا لیکن ناعاقبت اندیشوں نے ہمیشہ کے لئے طوق غلامی بھی پہن لیا۔

کشمیر کی قسمت کا فیصلہ

شہنشاہ اکبر نے قاسم میر بحر کی سرکردگی میں ایک لشکر جرار روانہ کر دیا جس کی رہنمائی یہ قوم فروش کرتے رہے اور انہوں نے اس کو کشمیر کی سرحد تک پہنچا دیا......... اندر کے انتظامات پہلے ہی ہو چکے تھے، متعصب سنی قبائل بھی اس لشکر سے آملے۔

یعقوب شاہ اطلاع پا کر مقابلے کے لئے نکلا تو راستے ہی سے اسکے سنی سردار اور سپاہی ٹوٹنے لگے پھر بھی وہ دل شکستہ نہیں ہوا۔ شاید وہ اس کے لئے پہلے سے تیار تھا

اس نے یوسف چک، ابہہ چک اور سید ابراہیم کو روکنے کے لئے متعین کیا مگر ان کے سپاہی دشمنوں سے جا ملے۔ مجبوراً وہ واپس آئے۔ بہرام نیایک اور شگی نیایک جو دوسرا راستہ روکنے کے لئے تعینات ہوئے تھے، انہوں نے بھی غداری کی البتہ قاسم نیایک اور حسین چک نے پیر پنچال کے راستے مغل ہراول پر سخت حملے کیے۔ قاسم نیایک جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بیٹے ظفر نیایک نے تابڑ توڑ حملوں سے دشمن کے پروں میں تہلکہ ڈال دیا اور وہ لڑتے لڑتے گر گئے اور کشمیر کا حق ادا کرتے ہوئے جاں بحق ہو گئے۔

یعقوب سے جب مغل افواج کا مقابلہ ہوا تو اس کی سپاہ داد شجاعت دے

رہی تھی مگر ساتھیوں کی بے وفائی سے اس کا دل ٹوٹ گیا، یعقوب خود قلب لشکر میں تھا وہ کسی ضرورت سے گھوڑے سے اترا کہ ایک تیر گھوڑے کو آ کر لگا اور وہ بدک کر سپاہیوں کی طرف بھاگا۔ سپاہی گھوڑے کو خالی دیکھ کر سمجھے کہ یعقوب قتل ہو گیا اس کے بعد ان میں لڑنے کی سکت نہ رہی اور وہ میدان سے فرار ہونے لگے

یعقوب میدان سے بھاگ کر اپنے خسر راجہ کشتوار کے پاس پہنچا اس کی بے رخی سے مایوس ہو کر پرگنہ برنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔

مغل فوج سری نگر پر قابض ہو چکی تھی مگر یعقوب شاہ بھی ہار مان کر بیٹھنے والا نہ تھا اس نے کشمیری حمیت کو للکارا اور دیکھتے ہی دیکھتے جیالوں کا ایک گروہ اپنے گرد جمع کر لیا پھر ان میں بعض قبائل بھی شامل ہو گئے۔

پھر اس نے سری نگر میں داخل ہو کر مغل فوج پر حملہ کیا اور مغربی علاقے کے چند مکانات میں آگ لگا دی۔ مغل سپاہی گھبرا کر باہر نکلے تو انہیں قتل کرا دیا۔ کشتوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اس درمیان اس نے اپنے سپاہیوں کو خزانہ لوٹنے کی اجازت دے دی اور نورنگ خان کو قید کرنے والوں کو قتل کر دینے کا حکم دیدیا۔ اس سے اس کے قریب کی جمعیت میں کمی واقع ہو گئی ایسے میں قاسم میر بحر کو موقع مل گیا اس نے سنبھل کر حملہ کر دیا اور یعقوب کی فتح شکست میں بدل گئی۔

اس دوران سردی کا موسم شروع ہو گیا اور لڑائی بند ہو گئی۔ قاسم میر بحر نے نامہ و پیام سے یعقوب شاہ کے کئی سردار توڑ لئے۔ گرمیاں شروع ہوتے ہی یعقوب نے اپنی طاقت کو مجتمع کیا۔ اس کی خبر ملتے ہی میر بحر نے سات آٹھ ہزار فوج چند سرداروں کے ساتھ مقابلے کے لئے روانہ کی۔ ڈکون میں سخت لڑائی ہوئی۔ اتفاق سے بارش ہو گئی، یعقوب شاہ نے مغلوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔

اس کے بعد مغل سری نگر سے باہر نہیں نکلے۔ آخر ایک دن قاسم میر بحر پوری فوج مقابلہ پر لے آیا۔ صبح سے شام تک لڑائی ہوتی رہی۔ مغلوں کے پاؤں اکھڑنے ہی والے تھے کہ یعقوب کے سپہ سالار نورنگ کی آنکھ پر ایک تیر آ کر لگا اور وہ گھوڑے سے گر گیا اس سے یعقوب کے سپاہی ہمت ہار کر پیچھے ہٹنے لگے پھر بھی یعقوب نے اپنا پڑاؤ اس مقام سے نہیں ہٹایا۔

شمس چک یعقوب شاہ کا حلیف تھا لیکن اس جنگ میں وہ دور کا تماشائی بنا رہا۔ یعقوب شاہ نے اس سے شکایت کی تو اس نے کہلا بھیجا کہ یعقوب اپنا لشکر لے کر بانچک چلا آئے تو دونوں مل کر لڑیں گے۔ یعقوب اس کے کہنے کے مطابق اس سے جا ملا اور دونوں نے مل کر مغلوں پر حملہ کر دیا۔

گھمسان کا رن پڑا۔ اس لڑائی میں حسن ملک نلجی نے شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ مغلوں کی صفیں درہم برہم ہو گئیں شکست کے آثار دیکھ کر میر بحر نے ہاتھیوں کو آگے بڑھا دیا۔ حسن ملک نے تیروں کی بوچھار کر کے انکو الٹا بھگا دیا اور ہاتھیوں نے اپنی فوج کو روند ڈالا۔ مغلوں کو عبرتناک شکست ہوئی اور انہوں نے سری نگر پہنچ کر دم لیا۔

مغلوں پر بڑا سخت وقت تھا۔ وہ سری نگر میں بھی محفوظ نہ تھے۔ قاسم میر بحر نے اکبر کو حالات کی خبر دی۔ اس نے ایک فوج قہار مرزا یوسف خان کی سرکردگی میں کشمیر روانہ کی اور محمد بٹ اور بابا خلیل کو بھی ساتھ کیا۔

محمد بٹ شاہان چک کا وزیر رہ چکا تھا اور بابا خلیل شیعہ رہنما تھا۔ اکبر نے ان کو ساتھ اس لئے کیا تھا کہ موقع پڑنے پر صلح و صفائی کی سعی کر سکیں۔

شمس چک نے اپنے بھائی لوہر چک کو مرزا یوسف کے مقابلے پر بھیجا مگر وہ لڑنے کے بجائے یوسف مرزا سے جا کر مل گیا اس سے سپاہیوں میں بڑی بددلی پیدا ہوئی اور ان میں لڑنے کا حوصلہ ختم ہو گیا۔

شاید اس میں شمس چک کا ایماء بھی شامل تھا جس کو محسوس کر کے یعقوب شاہ کشتوار چلا گیا۔

دوسری بار واپس ہو کر اس نے پھر لشکر جمع کیا۔ محمد بٹ نے مغلوں کی طرف سے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی، دوسرے مقابلے میں یعقوب پسپا ہوا کیونکہ اس کے اکثر سپاہیوں نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

مرزا یوسف کو اندازہ ہو گیا تھا کہ جب تک یعقوب شاہ زندہ ہے، اس کی مداخلت جاری رہے گی اس لئے اس نے نرم رویے کے وعدے پر یعقوب شاہ کو

ہتھیار ڈال دینے کی پیش کش کی۔ یعقوب کی قوت ختم ہو چکی تھی اس لئے شہنشاہ اکبر کے سری نگر پہنچنے پر وہ دربار میں حاضر ہو گیا۔

اکبر نے اس کو دہلی بھیج دیا جہاں سے وہ راجہ مان سنگھ کے حوالے کر دیا گیا اور باپ کی طرح قلعہ رہتاس میں نظر بند کر دیا گیا۔ بظاہر وہ بے دست و پا تھا پھر بھی شیر کے پنجرے سے باہر نکل آنے کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے اس کو زہر دلوا دیا گیا اس طرح کشمیری شجاعت کا آخری پرچم بھی سرنگوں ہو گیا۔

کشمیر میں اب کوئی مغلوں کے سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکتا پھر بھی بعض سورماؤں نے جدوجہد آزادی برقرار رکھی جو ۱۰۲۱ھ تک جاری رہی البتہ اس کے بعد کوئی شیعوں کی فریاد سننے والا نہ رہا۔

کاجی چک اور دولت چک کے بعد یعقوب شاہ کشمیر کی بہادری کا علامیہ تھا اکبر نے دو بار خود اس کا امتحان کیا۔ ایک مرتبہ بغیر ہتھیار ایک مست ہاتھی سے لڑوا دیا۔ یعقوب شاہ نے سرعت کے ساتھ پیچھے جا کر اس کی دم پکڑ لی اور اس وقت تک اس کو کھینچتا رہا جب تک وہ جڑ سے اکھڑ نہیں گئی۔

دوسری بار ایک سرکش راجہ کو تن تنہا اسکو بھیج کر زندہ گرفتار کرایا۔ وہ حقیقتاً یعقوب سے خائف تھا کہ کہیں وہ کشمیر پہنچ گیا تو کشمیر کی بغاوت دبانا مغلوں کے بس کی بات نہ ہو گی لہذا وہ اسکو مروا دینا چاہتا تھا لیکن یعقوب شیر تھا اس کے لئے ایسے خطرے سے کھیلنا معمولی بات تھی۔ اکبر کی یہ تدبیریں کارگر نہ ہوئیں تو قاسم میر بحر نے یعقوب کو زہر دلوا دیا۔

انتقام کا دھارا

کہا جاتا ہے کہ بہادر بہادر کی قدر کرتا ہے لیکن کشمیر میں مغلوں کی حکومت کا آغاز ظلم و ستم سے کیا گیا۔

مغلوں کی کامیابی ہر اعتبار سے سنی علماء و عمائدین کی رہین منت تھی جن کی سازشوں سے چک بادشاہ کے حلیف اس سے غداری کر کے مغلوں کے شریک ہوئے تھے۔ مغلوں نے ان سے کئے ہوئے وعدے کے مطابق پہلے چک بادشاہوں کے محلات کو مسمار کیا جو بلند و بالا پہاڑیوں کے دامن میں بنے ہوئے تھے اور کشمیر

کی سطوت ماضی کے آئینہ دار تھے، پھر دوسری عالیشان عمارتوں کو کھدوایا۔ آخر
میں شاہی مقبرے کو نیست و نابود کیا اور ان کے تراشیدہ پتھر وہاں سے اٹھا کر
مسجدیں تعمیر کیں۔ انسانوں کے مزارات میں استعمال کی ہوئی چیزوں سے خدا کے
گھر کی تعمیر کی جو شاید داخل ثواب ہوگا۔

اس کے بعد چک سردار مختلف بہانوں سے بلائے گئے اور تلوار کے گھاٹ
اتار دیئے گئے۔ بہرام خان اور اس کے بیٹوں کو زہر دلوادیا۔ یوسف خان، علی خان
اور ابراہیم خان وغیرہ کی آنکھیں نکلوادیں۔ مختلف حیلوں سے کئی مرتبہ شیعوں کا
قتل عام کرایا پھر ان چک سرداروں پر توجہ کی جنہوں نے اپنی قوم سے غداری کی
تھی اور مغلوں کے دوست بن گئے تھے۔ ان میں سے اکثر کو آگرہ بھیج دیا جن میں
شیر علی ماگرے، یوسف خان، ابراہیم خان، شمس چک، شمس دونی، سید حسین
خان بیہقی، علی ڈار، اسمٰعیل دولی وغیرہ شامل تھے۔

قصر حکومت کی بنیادوں میں شیعہ رہنماؤں کا خون دینے پر اکتفاء نہیں کی
گئی بلکہ اس کی دیواروں پر شیعہ عوام کے خون سے نقش و نگار بھی بنائے گئے اور
اس خدمت کو بعد کے صوبہ داروں نے انجام دیا۔ چک آبادیاں ویران کر دی
گئیں اور بچے کھچے سردار ترک وطن کر گئے۔ اس طرح سنی اکابرین کا یہ مطالبہ پورا
ہو گیا کہ چک قبائل کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔

پھر شیعوں کو معیشت کی موت مارا گیا، تلوار ان سے چھین لی گئی تھی،
ملازمت کے دروازے بھی بند کر دیئے گئے۔ مجبوراً رزم آزما قبائل کی اولاد اکل
حلال کے لئے دست کار بن گئی تاہم بادشاہوں کی اولاد کوئی نیچا کام کرنے پر آمادہ
نہیں ہوئی۔

یہ ہوا انجام اس شجاع قوم کی نسلوں کا جن کی تلواروں کی جھنکار کشمیر کی پہاڑیوں
سے ٹکرا کر آج بھی سنائی دیتی ہے اور جن کے خون کی آبیاری سے آج بھی پہاڑوں
کی وادیوں میں گل لالہ جیسے پھول اگتے ہیں۔

سنی ابتداً بہت خوش ہوئے کہ انہوں نے اپنا انتقام لے لیا لیکن پھر ان کی
باری بھی آگئی کیونکہ اکبر سنی سے زائد ایک حکمراں تھا اس کو تو کشمیریوں کا دم خم

نکالنا تھا لہذا پہلے اس نے بالادستوں پر ہاتھ صاف کیا پھر زیردستوں کی توانائی خون
چوس کر نکالی تاہم اتنا تو ضرور ہوا کہ مقامی لوگوں میں سے جس کسی کو ضرورتاً
استعمال میں لایا، وہ سنی تھا۔

شیعہ منظر عام سے ہٹ گئے، اکثریت تقیہ کی سی صورت میں گمنام ہو گئی
اور ایک تعداد کشمیر چھوڑ کر چلی گئی۔

چک بادشاہوں پر ایک نظر

ان کی شجاعت کی داستانیں آج بھی کشمیر کی وادیوں میں بیان کی جاتی ہیں۔
ان کی تلواروں کی کاٹ کا لوہا اکبر کے دربار میں بھی مانا گیا۔ کشمیر پر تسلط کا سوال نہ
ہوتا تو شاید مغل شہنشاہ ان پر اتنے مظالم کو روا نہ رکھتا اور وطن کشمیر سے محبت
ان کی کمزوری نہ ہوتی تو یوسف شاہ اور یعقوب شاہ پر اکبر اعتماد کر لیتا اور اس کے
جرنیلوں میں کئی ناموں کے اضافے ہو جاتے۔

کشمیر میں شیعہ علماء کا سلسلہ سید علی ہمدانی سے شروع ہوا تھا جو آہستہ
آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ اسکے بعد سید محمد ہمدانی، سید محمد مدنی، سید حسین قمی، میر
شمس الدین عراقی وغیرہ نے خود کشمیر میں اتنے علماء پیدا کر دیئے کہ ان کی تعداد
سیکڑوں تک پہنچتی ہے اور چک دور حکومت میں تو اتنی سرپرستی کی گئی کہ کشمیر کے
علماء گنتی میں عراق و شام سے زیادہ کم نہیں رہے۔ بابا خلیل اللہ، بابا مہدی، شیخ
حسن، حافظ بصیر، ملا احسن اسود اور ملا عینی وغیرہ نامور اور متبحر عالم گزرے ہیں۔
ان کے علاوہ کچھ عالم ایسے بھی تھے جو مختلف زبانوں کے شاعر تھے جیسے امیر علی، ملا
نامی اول، ملا نامی دوم، بابا طالب اصفہانی، ملا احمد مہری، ملا محمد امین مستغنی، مرزا
علی خان، حسین شاہ چک، علی ملک چک، محمد ملک چوڈری، بادشاہ یوسف شاہ،
ملکہ حبہ خاتون وغیرہ۔

چک حکمرانوں میں اکثریت کا نظم و نسق بہت اچھا تھا۔ عوام کی سہولت کے
خاص انتظامات تھے، تعلیم کے لئے ہر گاؤں، ہر محلے میں درسگاہیں تھیں جن کے
اخراجات حکومت برداشت کرتی تھی، کاملین فن کی سرپرستی کی جاتی تھی، خطاطی
عروج پر تھی۔

افغان اور سکھ

دسویں صدی ہجری کے اختتام اور سولھویں صدی عیسوی کی آٹھویں دہائی میں چک حکومت کا خاتمہ ہوا اور کشمیر میں مغل سلطنت کا سورج طلوع ہوا۔ کشمیر کے مدعیان حکومت باقی تھے۔ وہ مختلف مقامات پر مغل فوجوں سے ٹکر لیتے رہے مگر اس کا کچھ حاصل نہ ہوا۔ مغل سلطنت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی اور دلی وآگرہ سے مغل صوبیدار بدل بدل کر آتے جاتے رہے۔

قیام حکومت کے لئے مغلوں کی سازش ہو یا خود کشمیری سنی دلوں کا غبار نکالنے کے لئے ایسا کرتے ہوں مگر عملی طور پر یہی ہوا کہ جب کوئی سنی صوبیدار دلی سے متعین ہو کر سری نگر آیا تو فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ پھر بھی اب پہلے جیسی فضاء نہیں تھی شیعوں کا فرقہ اب کبھی کبھی اطمینان کی سانس لے لیتا تھا لیکن اس کے پنپنے کے امکانات ختم ہو چکے تھے۔

اس طرح ڈیڑھ سو سال گزر گئے۔۔ مغل حکومت کمزور پڑ گئی اور ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ درانی نے کشمیر فتح کر لیا اور ۱۷۵۶ میں وہ بلند خان سروزئی کو عامل کشمیر بنا کر خود واپس ہو گیا۔ کشمیر پر افغان حکومت کا دورانیہ ساٹھ برس سے زائد کا نہیں ہے۔ اس عرصے میں افغانوں کی طرف سے دو شیعہ صوبیدار بھی آئے مگر کشمیر کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی رہی۔

محمود شاہ اور شجاع الملک اپنی حکومتیں قائم کرنے کے لئے باہم لڑتے رہے مگر دونوں میں سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا --- اور فتح خان بارکزئی نے ۱۸۱۴ء میں رنجیت سنگھ والی پنجاب کی مدد سے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔

کشمیر کے سنی شیعہ ان زمانوں میں لڑے مگر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ سنی غلبہ بڑھ چکا تھا کیونکہ اس عہد کے سکے پر کسی بادشاہ کے بجائے ایک مقبول ولی نور الدین کا نام کندہ ہے...... محمود شاہ انتشار سے فائدہ اٹھا کر بادشاہ بن گیا تھا تاہم اصل حکومت بارکزئی سرداروں کی تھی۔

یہ صورت حال چلنے والی نہ تھی - - ۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ۱۸۱۹ء میں

رنجیت سنگھ نے کشمیر پر حملہ کر دیا اور اس کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ رنجیت سنگھ کسی حد تک منصف مزاج حکمراں تھا لیکن ہری سنگھ کشمیر کا صوبیدار بنا تو اس نے اہل کشمیر پر بڑا تشدد کیا۔

صدیاں گزر گئی تھیں سنیوں اور شیعوں کو لڑتے ہوئے اس سے سنیوں کو یہ فائدہ تو ہوا تھا کہ کل کے حکمراں طبقے کو خستہ حال بنا دیا تھا مگر سکھوں کی چکی میں پسنے کا وقت آیا تو دونوں چکنا چور ہو گئے۔ ظالم و مظلوم، جارح اور مجروح کے صرف حروف اصلی رہ گئے اور ان کا استعمال خود انہیں پر ہونے لگا......... مگر ابھی تو صرف آغاز ہوا تھا، مسلمانوں کو اس سے کہیں زائد صبر آزما حالات سے گزرنا تھا۔

ڈوگرے

جموں کی پہاڑی ریاست کے دعویدار اس زمانے میں تین بھائی تھے جو راجپوت تھے اور ڈوگرہ کہلاتے تھے: دھیان سنگھ، گلاب سنگھ اور سچیت سنگھ۔ رنجیت سنگھ نے دھیان سنگھ کو اپنی حکومت میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز کر دیا اور گلاب سنگھ جموں پر قابض ہو گیا۔ رنجیت سنگھ نے ۱۸۲۰ء میں اس کو بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا لیکن اس سے قبل گلاب سنگھ کشتواڑ، لداخ اور بعض دوسرے پہاڑی علاقوں پر قبضہ کر چکا تھا۔

۱۸۲۹ء میں رنجیت سنگھ کا انتقال ہو گیا تو گلاب سنگھ نے اپنی ریاست میں اضافہ کر لیا۔

رنجیت سنگھ کے بعد سکھوں میں جو انتشار پیدا ہوا، اس میں ایک طرف انگریزوں نے فائدہ اٹھایا، دوسری طرف گلاب سنگھ اپنی طاقت مضبوط کرتا رہا اور انگریزوں سے جب سکھوں کی جنگ ہوئی تو اس نے ثالث کا کردار ادا کیا۔ پھر معاہدے کی رو سے دوآبہ کی حکومت اور پندرہ لاکھ اشرفی تاوان جنگ سکھوں پر عائد ہوا۔ سکھ صرف پانچ لاکھ دینے کے حالات میں تھے، دس لاکھ گلاب سنگھ نے ادا کر دیئے اور اس کے عوض کشمیر کی حکومت سکھوں سے حاصل کر لی۔

حاکم کشمیر امام الدین نے قبضہ دینے سے انکار کیا اور گلاب سنگھ کی فوجوں کو شکست فاش دی تو اس نے انگریزوں کی مدد حاصل کی اور قبیلہ چک کی سرزمین پر

اپنا پرچم لہرا دیا۔

پچھلے سو برس کشمیر کے مسلمانوں پر بڑے سخت گزرے تھے مگر اب جو دور آیا اس میں انہیں سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔

گلاب سنگھ ۱۸۵۷ء میں مر گیا اور اس کا بیٹا رن بیر سنگھ تخت پر بیٹھا تو وہ باپ سے زیادہ ظالم ثابت ہوا۔ اس نے ٹیکسوں میں اضافہ کر دیا۔ ۱۸۷۷ء میں قحط پڑا تو تین سال مسلمان کسانوں کے لئے سب سے زیادہ سخت تھے۔ پھر زلزلہ آیا ۱۸۸۵ء میں رن بیر سنگھ کا بیٹا مہاراجہ پرتاب سنگھ کشمیر کا حکمراں ہوا تو اس نے مسلمانوں پر قیامت ہی ڈھا دی۔ اس پر انگریزوں نے مداخلت کی اور ۱۸۹۲ء میں برطانوی ہند کے اصول پر مالیانے کا تعین ہوا مگر ذرائع نقل و حمل نہ ہونے کے سبب اس سے مسلمانوں کو زیادہ فائدہ نہ پہنچ سکا......... یہ اس علاقے کی بات ہے جس کی ۹۴ فیصد آبادی مسلمان تھی اور ۹۴ فیصد ۶ فیصد کے غلام بنے ہوئے تھے۔

یہ صورت حال اس وقت تک باقی رہی جب تک چودھری غلام عباس اور شیخ عبداللہ نے ۱۹۳۱ء میں اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی اور اہل کشمیر میں آزادی کا شعور پیدا نہیں کیا۔

کشمیر کی تاریخی داستان بھی عراق و ایران اور شام سے مختلف نہیں۔ اس سرزمین پر بھی آپس کی جنگ آزمائی نے اہل اسلام کو اس درجے تک پہنچا دیا۔ کون ظالم تھا کون مظلوم، اس کا فیصلہ تو حال کے تنازعات میں نہیں ہو سکتا پھر بھی یہ ضرور ہے کہ کشمیر کی عظمت میں شیعوں کا بڑا حصہ ہے اور انہیں دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت کا کشمیر کیا تھا؟

شیعوں کی خانقاہیں اور مساجد

چک خاندان کی عمارتیں اگرچہ زمانے سے ناپید ہو چکی ہیں مگر جن کے آثار باقی ہیں، ان سے شان و شکوہ کا ایک اندازہ ہو سکتا ہے۔ جن خانقاہوں نے شیعیت کی تبلیغ و اشاعت کی مہمات انجام دیں، ان کے نام لئے جا سکتے ہیں، خانقاہ سید محمد مدنی، خانقاہ میر شمس الدین عراقی، خانقاہ بابا حسن، حسن آباد، خانقاہ بابا خلیل وغیرہ۔

مساجد میں پتھر مسجد، مسجد حسن آباد، مسجد حاجی عیدی اور مسجد بڈگام قابل ذکر ہیں۔

امام باڑوں میں جڑ بیل، امام باڑہ حسن آباد، امام باڑہ بڈگام اور امام باڑہ احمد پورہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

باغات میں صرف شاہ حسین اور یوسف شاہ کے لگائے ہوئے باغات قدیم دور کی یادگار ہیں جن میں ملکہ نور جہاں آصف خان، صادق خان، علی مردان خان، کفایت خان، امیر خان جواں شیر نے اپنے اپنے باغات کا اضافہ کیا۔

اس طرح کشمیر کی دلکشی بڑھانے میں شیعوں کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ شیعیت کی توسیع میں سید علی ہمدانی کے بعد سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں عالم اس سرزمین پر وارد ہوئے، انہوں نے عمریں مسلک آل محمد کی ترویج میں صرف کر دیں، خود کشمیری علماء ان سے زائد ہیں۔

ہمدانی خاندان کے چند نام ہیں: ملا عبدالرشید، ملا محمد صادق، ملا طالب، ملا غالب، ملا عبدالغنی۔

انصاری خاندان کا ذکر ملا عالم انصاری سے شروع کیا جائے تو ملا محمد، ملا افضل علی، ملا محمد جواد، ملا عبداللہ، مولوی حیدر علی، کتنے ہی اسمائے گرامی ہیں جن کی دینی خدمات لوح زمانہ پر ثبت ہیں۔

تیسرا خاندان موسوی ہے جن میں آغا سید مہدی، آغا سید محمد، آغا سید علی، آقا شیخ علی اصغر، حاجی سید حسن رضوی، آغا سید محمد وغیرہ اتنے گرانقدر نام ہیں جن کے مماثل مشکل سے ڈھونڈھے جا سکتے ہیں۔

شعراء میں صرف جلی نام لئے جائیں تو ان میں سے بعض کو مشاہیر ایران کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ ان میں غزل گو بھی ہیں اور مرثیہ گو بھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ انہیں ہر صنف سخن پر قدرت حاصل تھی۔ کشمیر میں اطمینان کی زندگی میسر آ سکتی تو لقمان کی عقل ان کے پاس موجود تھی۔ فارسی کی بساط ادب پر وہ اتنے گہرے نقوش چھوڑ جاتے کہ حافظ شیراز کی طرح شاعر کشمیر کہلاتے لیکن بد نصیبی سے ان کا حال بھی سرزمین کشمیر جیسا ہوا اور انہیں اس کا موقع نہ مل سکا کہ جریدہ عالم پر مہر دوام لگا سکتے! (۴۶)

سندھ

محمد بن قاسم کا حملہ سندھ میں مسلم اقتدار کا نقطہ آغاز ہے ، راجہ داہر سے جنگ اور تسخیر سندھ مسلم جرنیلوں کی مدبرانہ شجاعت کا کارنامہ ہے۔

حملے کا سبب بیشتر مورخین نے ایک ہی لکھا ہے:۔" ایک مسلمان تاجر لنکا میں وفات پا گیا تھا۔اسکی بیوہ عورت یتیم لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔لنکا کے راجہ نے انکو بڑے آرام سے مع تحفہ وہدایا کے ایک جہاز پر سوار کر کے خلیفہ کے پاس روانہ کر دیا اور اسی وساطت سے اس نے چاہا کہ خلیفہ سے رسم اتحاد بڑھائے۔اس جہاز میں کچھ حاجی بھی تھے۔یہ جہاز جب سندھ کی مشہور بندرگاہ دیبل کے قریب پہنچا تو سندھی قزاقوں نے اسکو لوٹ لیا۔یہ سندھ کی مشہور قوم نیز کے لوگ تھے۔ان قزاقوں نے دیبل کو جائے پناہ بنا رکھا تھا اور اس طرح اکثر جہازوں کو لوٹ کر دیبل چلے آتے تھے"

ان قیدیوں میں سے ایک عورت قبیلہ یربوع کی بے اختیار پکار اٹھی۔

"فریاد اے حجاج!"

جب اسکی خبر حجاج کو ہوئی تو وہ غصے کے مارے بے تاب ہو گیا اور انتہائی جوش میں کہہ اٹھا۔

"ہاں میں آیا!"

اس واقعہ سے حجاج کے دل پہ چوٹ لگی اور اس نے سندھ فتح کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔(۴۷)

تاریخوں میں ایک تواتر سے اس عورت کی فریاد نقل کی گئی ہے اور بعض نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جب یہ آواز ایوان شاہی سے ٹکرائی تو حجاج کہہ اٹھا۔

"ہاں میں آیا!"

لبیک کہنے کا انداز معجزانہ ہے..... مورخین نے حجاج کا کردار پیش نظر رکھے بغیر جو کچھ کان میں ڈالا گیا اسکو قلم بند کر دیا اور وہی تاریخ بن گیا، جیسا کہ آج کل ہوتا ہے کہ حکومت واقعہ کی نوعیت اپنی مصلحتوں کے مطابق بیان کرواتی ہے اور پھر اسی کو شہرت ہو جاتی ہے اور ایک دور گزرنے کے بعد دوسرے دور میں اسی کو اصل واقعہ تصور کر لیا جاتا ہے۔

جہانتک حجاج کا تعلق ہے، بنی امیہ کے پورے عہد سے چند سفاک ترین حکمراں منتخب کیے جائیں تو ان میں حجاج سرفہرست ہوگا۔اسکی سیرت ظلم وجور کی داستانوں کا مجموعہ ہے۔ایسے شخص سے کوئی انصاف اور فریادرسی کی توقع کیا کر سکتا پھر عورت نے حجاج ہی کو کیوں پکارا اور اس انداز سے جیسے کوئی کسی ولی اللہ سے مدد چاہتا ہو۔

فریاد اے حجاج!

اور جواب بھی ویسا ہی ملا

"ہاں میں آیا!"

شاید ستر ہزار سادات کا خون پی کر حجاج میں کراماتی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی اور ایک دل دردمند ودیعت ہو گیا تھا کہ وہ ایک عورت کی فریاد سے تڑپ اٹھا اور تسخیر سندھ کا عزم کر کے اٹھ کھڑا ہوا..... جیتے جاگتے بے گناہ انسانوں کی زبانیں کٹوا لینے والا اور اپنے سامنے زندہ انسانوں کی آنکھیں نکلوا کر تڑپتا چھوڑ دینے والا اسقدر رحم دل ہو گیا تھا کہ ایک عورت کی بے چارگی برداشت نہ کر سکا۔

عجیب ستم ظریفی ہے کہ منتخب بھی کیا گیا فریادرسی کیلئے تو ایسے ظالم کو ، عراق و عرب کی عورتیں جس کا نام لے کر بچوں کو ڈراتی تھیں اور بچے واقعی ڈر کر ماں کی گودوں میں چھپ جاتے تھے۔انہیں کیا معلوم تھا کہ حجاج بچوں کو ماں کی گودوں سے چھین کر بھی ذبح کر دیتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ حملے کا جواز پیدا کرنے کیلئے ایسی کسی توجیہہ کی ضرورت ہی کیا تھی اور کچھ کہنا ہی تھا تو حجاج کے بجائے ولید بن عبدالملک کا نام چسپاں کر دیا جاتا جو یقیناً فتاح عالم بننے کیلئے ساری دنیا کو

زیر نگین کر لینا چاہتا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ حجاج کی نظریں ایک عرصے سے سندھ پر لگی ہوئی تھیں جو اس زمانے میں سادات کی پناہ گاہ بن گیا تھا۔

رسول کی اولاد میں جو لوگ تقیہ میں چلے جاتے اور اپنے ہی وطن میں اجنبی بن جاتے ان میں سے بیشتر بچ جاتے، باقی موقع محل سے ترک وطن کرتے رہتے۔ ان میں مصر و مراقش اور غیر معروف علاقوں کے علاوہ کرمان و سندھ بھی تھا جو وقت کے بیرحم لوگوں کی دسترس سے باہر تھا۔

ان علاقوں سے اہل بیت کا ایک رابطہ عرصے سے قائم تھا۔ حضرت عمر و حضرت عثمان کی تسخیری مہمات میں جو کچھ بھی ہوا ہو لیکن حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے مختصر عہد میں سیستان و مکران کی سنگلاخ زمینیں اور سندھ کے ریگزار سقیفہ بنی ساعدہ سے زائد خانہ سیدہ زہرا کی تجلیوں سے آشنا ہو چکے تھے اور سادات کے ترک وطن سے اس میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا تھا لیکن شکاری کی نظریں بھی شکار کی نقل و حرکت پر لگی ہوئی تھیں۔ حجاج عورت کی فریاد پر تڑپا ہو یا نہ تڑپا ہو مگر جب سننے میں آتا کہ بیس پچیس آدمیوں کا ایک قافلہ فلاں جانب نکل گیا تو وہ ضرور تڑپ اٹھتا اور اسکو ایک فکر سی لاحق ہو جاتی کہ اتنے سادات یا محبان علی بچ گئے۔

سادات کی پناہ گاہوں میں سندھ اسکی دست رس سے دور تھا لہذا اسکے بارے میں اکثر سوچتا رہتا اور کوئی نہ کوئی منصوبہ بناتا رہتا۔

سندھ اور اہل بیت

تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو اہل بیت کرام سے سندھ کا تعارف حارث بن مرہ عبدی کے حملے سے ہوا اس سے قبل دو فوجی مہمیں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بھیجی گئی تھیں لیکن وہ سرحدوں سے واپس آگئی تھیں۔ عبداللہ ابن عباس کے فرستادہ جرنیل نے حسب ہدایت ان خارجیوں کا سراغ لگایا جنہوں نے مکران میں باقاعدہ حکومت قائم کرلی تھی اور تیاری کرکے خلافت اسلامیہ پر نیا حملہ کرنا چاہتے تھے۔

حارث عبدی نے انکو مار بھگایا اور سندھ کے ملحق علاقوں پر حکومت قائم کرلی

"حارث نے مال غنیمت کے ساتھ ہندو اسیروں اور ایک ہزار کنیزوں کو کوفہ بھیجا تھا۔ مرد قیدیوں کو رہا کر دیا گیا اور کنیزیں تقسیم کر دی گئیں۔ ان قیدیوں نے وطن واپس ہو کر آل رسول کی انسانیت کا ایسا بیان کیا کہ برہمنیت کے ستائے ہوئے انسان خود بخود اسلام کے گرویدہ ہو گئے اور ان میں بعض حارث بن مرہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ ایمان ہو گئے۔(۴۸)

یہ علاقہ موجودہ قلات کا تھا۔ حارث عبدی نے اسی تسلسل میں سیستان و مکران کے وہ علاقے بھی مسخر کیے جس میں ایران کے مشہور بادشاہ ضحاک کی اولاد حکومت کرتی تھی۔ حکمراں کا نام مورخین نے شنسب لکھا ہے۔

شنسب کے کانوں میں اسلام کی انسان دوستی کا آوازہ پڑ چکا تھا۔ وہ خود بلوچستان سے چل کر کوفہ پہنچ گیا اور امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر اس نے اسلام قبول کر لیا۔

سندھ و ہند کی سرزمین پر شنسب پہلا شخص تھا جس نے جانشین پیغمبر کے ہاتھ سے سند حکومت پائی اور ایک علم حاصل کیا۔ یہ علم شنسب نے عراق سے واپس ہو کر اپنے تخت پر نصب کر دیا پھر ایک مسجد تعمیر کرائی اس میں حضرت علی ابن ابی طالب کا عطا کردہ فرماں آویزاں کیا۔ بالفاظ دیگر سندھ پر عظمت اہل بیت کا پرچم لہرا دیا۔(۴۹)

شنسب نے اپنی حکومت اسلامی خطوط پر استوار کی تھی جو کئی نسلوں تک باقی رہی۔ کہنے کو یہ ایک چھوٹی سی حکومت تھی لیکن اسکے نتائج دور رس نکلے اور شنسب کے عمل سے سندھیوں کے قلوب پر آل رسول کی صداقت کا سکہ بیٹھنے لگا۔ اس پر کوفہ سے واپس ہونیوالے قیدیوں کے بیانات! سندھ کے کھلے ہوئے انسانوں کے تصور میں خانوادہ رسالت کا تقدس ملکوتی بن گیا پھر جو بنی امیہ کا ستایا ہوا سید سندھ پہنچا تو ہر طرف اسکے لئے دیدہ و دل فرش راہ ہونے لگے۔

"شعیاز اسلام ان انڈیا" کی رو سے بحوالہ فتوح البلدان و تحقیق مولانا سید سبط الحسن ہنسوی، کوفے میں بعض برہمنوں اور جاٹوں کا سراغ ملتا ہے جو حضرت علیؑ کے دور میں ہندوستان سے پہنچے۔ ان میں سے کتنے مشرف بہ اسلام ہوئے اور کتنے

اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے، اسکی کوئی تحقیق نہ ہو سکی۔ یہ واقعہ شنسب کے وارد کوفہ ہونے کے بعد کا معلوم ہوتا ہے۔

جاٹوں کے قیام کی مدت کئی برس معلوم ہوتی ہے کیونکہ جنگ کربلا کے بعد دجلہ کے کنارے کچھ جاٹوں کے نمودار ہونے کی نشاندہی جسٹس امیر علی نے کی ہے ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض جنگ کربلا میں شریک ہوئے ہوں اور پھر کسی نے سلیمان بن صرد خزاعی اور مختار ثقفی کی جنگوں میں بھی حصہ لیا ہو۔ اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے مگر ان کی وطن واپسی ایک عرصے کے بعد ہوئی اور جب وہ پلٹ کر گئے تو ان کے دلوں میں اہل بیت کی صداقت کا سکہ یقیناً بیٹھا ہو گا۔

غزنوی حملوں سے قبل پنجاب اور اسکے ملحق علاقوں میں ایسے لوگوں کی موجودگی ثابت ہے کیونکہ سادات بارہہ کے قبیلے کا جب پنجاب میں ورود ہوا تو کسی نہ کسی مقام پر کوئی نہ کوئی ہم عقیدہ موجود ضرور تھا جنکی رہنمائی اور مشورے سے قبیلے کی ایک تعداد ٹولیوں میں بٹ کر مختلف علاقوں کی سمت آگے بڑھی۔

ایک قیاس یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں محبان آل رسولؐ کی موجودگی کے سبب سادات کے کسی گروہ نے سندھ کی طرح اس طرف بھی ہجرت کی ہو اور کسی ہندو راجہ نے انکی سیرت و حق نمائی سے متاثر ہو کر انہیں اپنی پناہ میں رکھ لیا ہو۔

تاریخ کی روشنی میں اسکے بدیہات تاریکی میں ہیں لیکن حالات کے تحت اسکے امکانات پائے جاتے ہیں پھر بھی سندھ کی طرف ستم رسیدگان کی ہجرت مسلمات میں سے ہے جو تحقیقی دیدہ ریزی سے روشن سے روشن تر ہو رہی ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایک معروف شیعہ سید کے ملتان پہنچنے کا سراغ بھی ملتا ہے جو جعفر الملک کے نام سے ملتان کے حکمراں ہوئے پھر انکی اولاد نے انسانیت و اخلاق کے وہ نمونے پیش کیے کہ ایک بڑی تعداد کو آل رسولؐ کا حلقہ بگوش بنالیا۔

فرج سندھی، خالد سندھی اور آبان سندھی کے نام امام جعفر صادقؑ کے تلامذہ میں لیے جاتے ہیں جن کا دینی تبحر درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا، جنہوں نے نویں اور دسویں صدی عیسوی میں سندھ سے پنجاب تک تعلیمات اہل بیت کی تبلیغ کی، اپنے

بعد شاگردوں کی ایک تعداد چھوڑ گئے۔ اشاعت اسلام کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور ترک وطن کر کے آنے والے اطراف وجوانب میں پہنچتے رہے، ان میں سے ایک بزرگ ملا محمد علی بھی شامل ہیں جن کا مزار گجرات میں بمقام کھبے واقع ہے اور پیر پرواز کے نام سے موسوم ہیں۔ آپ اسمٰعیلیت کے داعیان اولین میں تھے اور مقامی زبان میں ہندوؤں کو درس دیا کرتے تھے۔ ایک بڑی تعداد کو انہوں نے دائرہ آل رسولؐ میں داخل کیا۔

ملتان و سندھ میں اسمٰعیلیت کی تبلیغ اسکے بعد وقوع میں آئی لیکن سندھ عموماً اولاد فاطمہ زہراؑ کی پناہ گاہ بنا رہا جسکے شواہد تاریخ کی روشنی میں جابجا پائے جاتے ہیں اور جنکے نام اتنے جلی ہیں کہ مورخین کی عصبیت بھی انکو نظرانداز نہیں کر سکتی

اسکی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ سندھ میں ان کا خیر مقدم اس طرح کیا جاتا تھا کہ جداعلیٰ کی سرزمین میں اپنی بے وقعتی کے احساس پر ان کے آنسو نکل آتے تھے

بعض سندھیوں نے آباء و اجداد سے سنی ہوئی یہ روایت بھی بیان کی کہ سادات جس راستے پر گزر جاتے سندھی انکے نقش قدم کی خاک اٹھا کر محفوظ کر لیتے کہ اس سے گھر میں برکتوں کا نزول ہو گا۔

سندھ سے خانوادہ رسالت کے تعلق مزید میں یہ روایت بھی فراموش نہیں ہو سکتی کہ حضرت محمد حنفیہ کی والدہ گرامی حنفیہ کا تعلق بھی سندھ سے تھا۔ ان خاتون کا نام مورخین نے خولہ لکھا ہے۔ اس لحاظ سے یہ محمد حنفیہ کی ماں نہیں ہو سکتیں کیونکہ خولہ مال غنیمت کے ساتھ آئی تھیں اور حضرت علی نے ان سے عقد فرمایا تھا۔

بہرحال سندھ سے اہل بیت کے کئی نسلی روابط تھے۔ ایک ربط یہ بھی تھا کہ امام زین العابدین کی ایک زوجہ بھی سندھی تھیں جن کا اسم گرامی حمیداں تھا۔ حضرت زید شہید انھیں کے بطن سے پیدا ہوئے اور ان معظمہ کی بدولت اہل سندھ سے سادات کا رشتہ بہت مضبوط رہا۔ (۵۰)

خود امام زین العابدین کی نظر میں ایک رشتہ بہت زیادہ اہم تھا اور وہ رشتہ

تھا آپ کی پرورش کرنیوالی خاتون کا جو سندھی تھیں اور جن کا نام تھا سلافہ ۔

ایک روایت کے مطابق جناب شہر بانو کا انتقال ۳۴ھ میں امام زین العابدین کی ولادت کے وقت ہو گیا تھا اور اسکے بعد سے آپ کی دیکھ بھال سلافہ نے کی تھی ۔

امامؑ آپ کی بڑی عزت کرتے اور ماں ہی کی طرح سمجھتے تھے ۔ یہ خاتون کربلا میں بھی موجود تھیں ۔ بعض مورخین نے شہدائے کربلا میں ایک پنڈت کا ذکر بھی کیا ہے جو یقیناً ان ہی میں سے کسی خاتون کا قرابتدار ہوگا ۔ اس سے اس روایت کو بھی تقویت پہنچتی ہے کہ کئی سندھیوں نے امامؑ کی طرف سے جنگ کی ۔ ایک کو درجہ شہادت نصیب ہوا اور باقی سخت زخمی ہوئے ۔ ان میں سے ایک دو بچ بچا کر سندھ پہنچنے میں کامیاب ہوگئے اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے مگر سینہ بسینہ روایات سے اسکی شہادت ملتی ہے کہ واقعہ کربلا کی اطلاع سب سے پہلے سندھ پہنچی اور خاندان فاطمہ زہرا سے وابستگی کے سبب وہاں ایک کہرام مچ گیا اور کسی زخمی کے بچ نکلنے کا واقعہ صحیح مان لیا جائے تو چشم دید بیانات سے سندھ میں سیدالشہداء کی پہلی صف ماتم بچھ جانا مسلم ہو جاتا ہے ۔

بہر طور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سندھ میں ترک وطن کر کے سادات کا پہنچنا مسلم تھا اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا جو نہ ولید سے چھپا تھا اور نہ خون آشام حجاج سے جو ان دونوں کی ناگواری کا موجب تھا ۔

سندھی بزرگوں میں ایک روایت سینہ بسینہ چلی آتی ہے کہ سادات چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم ہو کر اموی حدود سلطنت میں سفر کرتے اور سرحد پار کر کے ایک قافلے کی صورت اختیار کر لیتے پھر سیستان، بلوچستان اور مکران جہاں بن پڑتا وہاں اقامت اختیار کر لیتے ۔ انکا تقدس و تقویٰ غیر مسلمین کو بھی ان سے نفرت نہ کرنے دیتا ۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اپنا تعارف کراتے اور اسلام کا درس دیتے تو لوگ متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے ۔

اور جو لوگ اسلام کی صداقت کو قبول نہ کرتے وہ بھی ان بزرگوں کی عظمت کو ضرور مانتے جن کی قبور اب بھی ان علاقوں میں جا بجا مرجع خلائق ہیں ۔

انہیں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو دریائے سندھ کے کنارے کھلے میدانوں میں پہنچے ۔ ایک قافلہ راجہ داہر کے آدمیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا جو اسکے دربار میں حاضر کیا گیا اور اس نے حقیقت حال راجہ کے سامنے بیان کر دی ۔ پیشانیوں پر سجدے کی علامات اور بشرے پر جھلکتا ہوا نور ایمان ان کا گواہ تھا جو راجہ پر انکی صداقت کا اثر ڈالے بغیر نہ رہا ۔ راجہ نے انہیں عزت و احترام سے رکھنے کی ہدایت کر دی ۔

پھر وہ کئی بار اسکے سامنے حاضر ہوئے اور راجہ ان کے علم، زہد، پاکبازی سے متاثر ہوتا رہا ۔ آخر اس نے انہیں اپنے درباریوں میں شامل کر لیا اور وہ سب اسکے معتمد بن گئے ۔

اسکی خبر شدہ شدہ حجاج کو پہنچی تو اس نے ولید کی اجازت سے انکی واپسی کا مطالبہ کیا اور راجہ داہر کو لکھا کہ وہ اسکی حکومت کے باغی ہیں، انہیں حوالے کیا جائے

مبینہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ راجہ داہر نے اس مطالبے کا جواب بڑی نرمی سے دیا تھا کہ سندھ کی تہذیبی روایت اسکی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے مہمانوں کو دشمنوں کے حوالے کر دے پھر جب یہ معلوم ہے کہ یہ لوگ رسولؐ عرب کی اولاد بھی ہیں اور بلند کردار بھی اور اب تو انہیں سندھی قومیت میں داخل بھی کر لیا گیا ہے لہذا انہیں عربوں کے حوالے کر دیا گیا تو سندھ کی زمین مجھ سے محاسبہ کرے گی اس لئے بڑی معذرت کے ساتھ مجبوری کا اظہار کیا جاتا ہے ۔

سندھ کے بزرگ عالم اور سن کی عظیم خانقاہ کے سجادہ نشین نے اپنی کتاب سندھو دیش مطبوعہ جی ایم سید اکیڈمی (۵۶، ۵۷) میں اس واقعہ کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے ۔ ان کی معلومات کا ماخذ غالباً وہ کتابیں ہیں جو ان کے کتاب خانے میں موجود ہیں ۔ "سندھو دیش" کے اکثر حصوں سے اختلاف کے باوجود بعض حقائق قابل تسلیم ہیں، ان میں یہ واقعہ بھی ہے ۔

بزرگ عالم نے محولہ سادات کے قافلہ سالار کا نام محمد بن علفی تحریر کیا ہے اور اسی کے ساتھ راجہ داہر سے بنی امیہ کے اختلاف کے بعض دوسرے اسباب بھی بیان کیے ہیں ۔

سندھ میں نسلاً بعد نسل چلی آنے والی روایت اور جی ایم سید کا بیان اتنی آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، جبکہ ماضی کی تاریخ میں بھی اور آج بھی یہی ہوتا ہے کہ کسی ملک کا آدمی دوسرے ملک میں پہنچ جائے تو اولالذکر ملک دوسرے ملک سے اسکی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے جیسا کہ خود سندھ کی تاریخ میں ابو جعفر منصور عباسی کے دور کا ایک واقعہ ملتا ہے کہ ہندو راجہ نے عبداللہ اشتر کو پناہ دی تھی تو منصور دوانیقی نے سزا دینے کیلئے اس پر فوج کشی کرادی تھی۔

اسکے بعد محمد بن علفی کے واقعہ کو صحیح نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں رہ جاتی۔ رہ گئی بات اس کہانی کی جسکو تاریخ بنا کر حجاج نے پیش کرایا ہے تو وہ حجاج کیلئے حملے کا جواز پیدا کرنے کی خاطر ایک گھڑی ہوئی بات بھی ہوسکتی ہے اور واقعہ بھی لیکن شبہات سے خالی نہیں کیونکہ مبینہ تاریخ اسلام اکثر جھوٹی روایات پر مبنی ہے اور انہیں روایتوں کی بدولت آج اسلام کی بہتر صورتیں موجود ہیں اور ہر صورت اصلی ہونے کی دعوایدار ہے۔

ان حالات میں سادات کا راجہ داہر کی پناہ میں آنا مسلم ہوجاتا ہے اور اسکو جھٹلایا نہیں جاسکتا تاوقتیکہ سادات کے ان مقابر کو کھدوا نہ ڈالا جائے جن کا وجود ابتدائے دور بنی امیہ سے مکران و سندھ میں پایا جاتا ہے۔

اب سندھ میں بیان کی جانے والی اس روایت کو بھی ماننا پڑے گا کہ محمد بن قاسم سے جب راجہ داہر کا مقابلہ ہوا تو یہ سادات راجہ داہر کی طرف سے لڑے تھے اور ان میں کا ایک ایک آدمی میدان جنگ میں اپنے میزبان کو بچانے کیلئے شہید ہوگیا تھا۔ میزبان ہندو تھا یا مسلمان، انہیں اس سے غرض نہ تھی، وہ تو صرف اتنا جانتے تھے کہ ان کے میزبان پر یہ جنگ انہیں پناہ دینے کے جرم میں مسلط کی گئی تھی

فقہاء کا فیصلہ اس سلسلے میں کیا ہے؟ یہ وہ جانیں، تاریخ تو یہی ہے جو بیان کی گئی اور محمد بن قاسم اسی بنا پر راجہ داہر کی گوشمالی کیلئے بھیجا گیا تھا بلکہ تسخیر سندھ پر مامور کیا گیا تھا۔

"فرشتہ" کے بیان کے مطابق ولید بن عبدالملک عرصے سے تسخیر سندھ کے

خواب دیکھ رہا تھا اور اس سے قبل دو کوششیں کرچکا تھا لیکن ان میں اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اسکے وجوہ میں اسکی ہوس حکمرانی بھی ہوسکتی ہے اور سادات کی ایک پناہ گاہ کو ختم کردینے کا جذبہ بھی جو ولید کی افتاد طبع کو دیکھتے ہوئے قابل یقین ہے۔ ایسے میں "فرشتہ" کے مطابق ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹی ہوئی عورت دربار میں جاکر فریادی ہوئی اور اس نے حجاج بن یوسف کو سندھ پر حملے کا حکم دیدیا۔ حجاج کا تو یہ دلی منشاء ہی تھا۔ اس نے محمد بن قاسم کو متعین کردیا۔

سندھ میں اموی حکومت

محمد بن قاسم کی فتوحات حجاج بن یوسف کا کارنامہ شمار کی جاتی ہیں، طارق بن زیاد کی تسخیر اندلس موسیٰ بن نصیر کے تدبر کا نتیجہ اور قتیبہ بن مسلم کی مہمات خود ولید سے منسوب کی جاتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تینوں جرنیلوں کی کامیابی خود انکی شجاعت کا حاصل تھیں۔ بالخصوص محمد بن قاسم کو جو فوری اقدامات کرنا پڑتے ان کا فیصلہ جواں سال ہونے کے باوجود وہ خود کرتا۔ اسی لئے وہ ہفتوں اور مہینوں میں سندھ کے ساحل سے لے کر اندرون ملک چھاتا چلا گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اتنی بڑی مملکت زیر نگیں کرلی جو کسی آزاد سلطنت کے ہم پلہ تھی۔

محمد بن قاسم اموی تھا اور تسخیر سندھ کی وجوہات میں سادات بھی شامل تھے لہذا محمد بن قاسم نے انکی جستجو میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا مگر گنتی کے لوگ ہاتھ لگے، باقی تقیہ میں چلے گئے یا روپوش ہوگئے۔ قرینہ یہ کہتا ہے کہ ایک بڑی تعداد راجہ داہر کے ساتھ رہی ہوگی جو میدان جنگ میں کام آگئی۔

محمد بن قاسم حجاج کا بھتیجا بھی تھا اور داماد بھی لیکن اس سے خونریزی کی وہ داستانیں وابستہ نہیں جو حجاج کا حصہ تھیں۔ مورخین نے اسکے عدل و انصاف کی تعریف کی ہے اور ممکن ہے اپنے اسی انداز طبع کے باعث اس نے سادات کی تلاش میں زیادہ کد و کاوش نہ کی ہو اور چشم پوشی سے کام لیا ہو۔

محمد بن قاسم کا حشر طارق بن زیاد سے زیادہ مختلف نہیں ہوا جو جابر و ظالم حکومتوں کا شعار رہا ہے۔ پھر وہ دن بھی آگیا، جب بنی عباس نے بنی امیہ کا تختہ الٹ دیا امویوں کی قبریں تک کھدوا ڈالی گئیں اور بنی عباس کی خلافت کا آغاز ہوگیا۔

ایک مودبانہ تبصرہ اگر لائق اعتناء قرار پائے تو حق پسندی ہوگی کہ کیا خلافت صرف بزور شمشیر حاصل کرنے کی چیز تھی ؟ کہ حضرت معاویہ نے جنگ صفین میں فریب سے حاصل کی تو خلافت کا تقدس بھی مل گیا اور پھر ہر اموی خلیفہ مقدس رہا اسکے بعد عباسیوں نے ان کا قتل عام کرکے تخت خلافت پر قبضہ کر لیا تو مستعصم باللہ تک ہر خلیفہ سرتاپا مقدس۔ یہ منطق فہم سے بالاتر ہے کہ بنی امیہ میں حضرت معاویہ سے مروان الحمار تک خلیفۂ رسولؐ اور بنی عباس نے انکی قبور تک کھدوا ڈالیں تو وہ بھی نائب رسولؐ قاتل بھی محترم مقتول بھی محترم، ظالم بھی برحق مظلوم بھی برحق خدا کیلئے کوئی اصول تو بنائیں ورنہ حق و باطل کا امتیاز بالکل ختم ہوجائے گا۔ پھر یہی خلافت طاقت کے بل پر فاطمیین مصر نے لے لی اور آخر میں ترکان عثمانی نے، یہ سارے خلیفہ کیا کیا کرتے رہے ؟ کسی سے چھپا نہیں ہے۔ اسکے باوجود جب کمال اتاترک نے ترکی کو بچانے کیلئے خلافت کو ختم کیا تو ہندوستان کے مجاہد ملت مولانا محمد علی جوہر چیخ پڑے کہ مصطفیٰ کمال نے غضب ڈھا دیا۔ خلافت کو ختم کر دیا شاید وہ چاہتے تھے کہ ترکی ختم ہوجائے تو خلافت کہیں اور چلی جائے۔ حالات اجازت دیتے تو اس خلافت کو بچانے کیلئے لاٹھیوں سے مسلح کوئی نہ کوئی فوج ضرور جاتی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ کتنا ہی بڑا ظالم ہو اگر خلیفہ بنجائے تو مستوجب احترام اس کا ہر حکم لائق تعمیل۔ ایک نکتہ اور بھی قابل غور ہے کہ وہ لوگ جو اموی خلیفہ کو ظل الٰہی سے زائد سمجھتے تھے جب سفاح عباسی بے پناہ مظالم توڑ کر خلیفہ بنا تو وہی لوگ اسکے لئے بھی اسی طرح مودب ہوگئے اور اسکے بعد ہر عباسی خلیفہ محترم اور تقدس مآب!

سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر ہلاکو خاں مسلمان ہوکر خلیفہ بن جاتا یا تیمور صاحبقران بایزید یلدرم کو پنجرے میں بند کرنے کے بجائے خود خلافت کو قید کرلاتا خلافت کا لیبل اپنے ماتھے پر چپکا لیتا تو کیا اسکی باچھوں سے بہتے ہوئے انسانی خون کے باوجود وہ احترام خلافت کا سزاوار ہوسکتا تھا ؟ جواب یہی ہوسکتا ہے کہ کوئی مانتا اور کوئی نہ مانتا۔ میرا اعتراض برائے اعتراض نہیں ہے بلکہ برادران ملت کی فکر کو

جھنجھوڑنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے قبل بھی ایسی ہی باتیں زیر غور آچکی ہیں۔ تبھی تو خلفائے راشدین کی اصطلاح وضع ہوئی اور صف خلافت کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ ایک خلیفہ راشد اور دوسرے کی اصطلاح میرے علم میں نہیں، غالباً غیر راشد! اور اگر غیر راشد خدانخواستہ صحیح ہے تو خلیفہ کا عظیم منصب اسپر صادق ہی نہیں آتا۔

ہمارا اس لفظ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں کیونکہ رسولؐ کی نیابت کیلئے ہم امام منصوص من اللہ کے قائل ہیں اور اس کا تسلسل حضرت علی ابن ابی طالب سے شروع ہوجاتا ہے۔ فرماں روا کوئی سنی ہو یا شیعہ اگر وہ امام کی متابعت کرتا ہے تو ہم اسے مانتے ہیں ورنہ نہیں۔ یوں نظام دنیوی کیلئے کوئی بادشاہ بن جائے یا سلطان ہمارے شرعی زاویہ نگاہ سے اسکو کوئی اہمیت نہیں۔

یہی قیمت ہماری نظر میں خلافت کی تھی۔ اسی لئے ہر ایک کے نزدیک ہمارا خون مباح رہا۔ اور اب امویوں کے بعد عباسی برسر اقتدار آئے تھے۔ تب بھی ہم اپنی جگہ پر تھے کل بھی ہم تقیہ کر رہے تھے اور وطن چھوڑ چھوڑ کر مراقش و مصر اور سندھ و ہند میں پناہ لے رہے تھے، آج ہمارے ساتھ اموی بھی شامل ہوگئے تھے وہ سوچتے ضرور ہوں گے کہ ہم نے آل فاطمہ زہرا کو در بدر کیا تھا تو آج خود پناہ ڈھونڈھ رہے ہیں اور کہیں پناہ نہیں ملتی۔

ہمارا خیال ہے کہ عباسی بنی امیہ سے زیادہ ظالم تھے۔ بنی امیہ تو صرف زندوں کا خون بہاتے تھے، مردوں پر تبرا بھجواتے تھے، بنی عباس نے تو زندوں میں سے کسی کو چھوڑا نہیں اور مردوں کے نام و نشان تک مٹا ڈالے۔

اموی نسل میں کتنے بقید حیات رہ سکے اس کا کوئی اندازہ نہیں۔ اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ بہت تھوڑے جو مراقش و اندلس چلے گئے ریگستانوں میں جا چھپے یا کسی طرح بلوچستان کے غیر آباد علاقوں تک پہنچ سکے۔

بہرحال اقتدار مستقل ہونے کے بعد سندھ پر بھی عباسیوں کا قبضہ ہوگیا۔

سندھ میں عباسی دور حکومت

بنی امیہ کے استیصال کے بعد عباسیوں نے تمام ممالک محروسہ پر قبضہ کرلیا جنمیں سندھ بھی شامل تھا۔ منصور دوانیقی نے عمر بن حفص کو سندھ کا حاکم بنا کر بھیجا جسکے کچھ ہی دنوں بعد محمد نفس ذکیہ اور ابراہیم نے حقوق اہل بیت کا علم بلند کیا۔ عباسیوں سے زبردست معرکے ہوئے اور دونوں بھائیوں نے یکے بعد دیگرے شہادت پائی۔ نفس ذکیہ کے جہاد کے بعد عبداللہ الاشتر بن نفس ذکیہ کچھ ساتھیوں کو لے کر عازم سندھ ہوئے۔ عمر بن حفص عباسی حکمراں تھا لیکن وہ حقیقتاً مائل بہ تشیع تھا۔ اس نے ان کا خیر مقدم کیا اور بڑی عزت کے ساتھ رکھا پھر عباسی خلیفہ کے خوف سے ان سب کو ایک بہادر ہندو راجہ کے پاس بھیج دیا۔

مولانا ابو ظفر ندوی مولف تاریخ سندھ نے قیاس ظاہر کیا ہے کہ اس راجہ کا ملک دریائے سندھ کے کسی معاون دریا کے کنارے ریگستان میں واقع تھا۔

عمر بن حفص نے اپنی دانست میں عبداللہ الاشتر کو ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا تھا لیکن منصور دوانیقی کو کسی نہ کسی ذریعہ سے خبر لگ گئی اور اس نے عمر بن حفص سے مطالبہ کردیا کہ عبداللہ کا سر یا خود عبداللہ کو بغداد بھیج دے۔ عمر نے عبداللہ کے بجائے ان کے ایک ہم شکل کو بھیج دیا جو قتل ہوگیا مگر اسکے دوسرے شواہد نہیں ملتے پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ شجاع ابن شجاع کی ہاشمی حمیت اسکو کیونکر گوارا کرسکتی کہ ان کے عوض کوئی دوسرا بے گناہ تلوار کے گھاٹ اتر جائے البتہ عبداللہ کے علم میں لائے بغیر عمر بن حفص نے ایسا کیا ہو تو اور بات ہے۔

حقیقت جو کچھ بھی ہو لیکن اسکے بعد ہی عمر بن حفص کا تبادلہ افریقہ ہوگیا اور ہشام کو سندھ کا حکمراں بنا دیا گیا۔

تاریخ نے سندھ کی سادات نوازی کو نظر امتنان سے دیکھا ہے راجہ داہر نے بھی پیغمبر اسلام کی اولاد کو پناہ دی تھی اور دوسرے ہندو راجہ نے اشتر اور انکے ساتھیوں کو بڑی عزت کے ساتھ رکھا اور ہر سہولت بہم پہنچائی حتی کہ عبداللہ کی

تبلیغ اسلام میں بھی وہ مانع نہیں ہوا۔

امام حسنؑ کے پرپوتے نے اشاعت دین کا پورا حق ادا کیا اور سندھ کے بیشمار لوگوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا ادھر منصور دوانیقی ہشام کو عبداللہ کیلئے تاکید کررہا تھا۔ ہشام کو خاندان نبوت کا احترام ملحوظ تھا کہ ایک دن ہشام کا بھائی اپنی فوج کے ساتھ کسی مہم پر جارہا تھا کہ ایک طرف سے کچھ سوار آتے دکھائی دئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عبداللہ الاشتر دریا کے کنارے تفریح کیلئے نکلے ہیں۔ سطیح نے اپنے لشکر کو آگے بڑھا دیا۔ حسن مثنیٰ کا پوتا ان روباہوں کو پیٹھ کیا دکھاتا حالانکہ وہ تعداد میں بہت زائد تھے ایک اور دس سے زیادہ کا تناسب تھا۔

جنگ شروع ہوئی تو منصور و ابراہیم کی لڑائی کی یاد تازہ ہوگئی۔ عبداللہ نے لاشوں کے انبار لگادئے اور ان کے ساتھی حق سرفروشی ادا کرتے رہے مگر تابہ کے آخر ایک ایک کرکے ان کے تمام ساتھی لہو لہان ہوکر گرگئے اور وہ بھی لاشوں کے درمیان گھوڑے سے زمین پر آرہے۔

میدان جنگ کی شہادت عبداللہ کی میراث تھی۔ فرات کے کنارے ان کے دادا امام حسین کے ساتھیوں نے بھی اسی طرح سر کٹائے تھے۔ زخمی سادات نے کروٹیں بدل بدل کر عبداللہ کی لاش کو اپنے کٹے پھٹے جسموں سے چھپالیا تاکہ ان کا سر بغداد بھیجا نہ جاسکے۔ وہی ہوا کہ عبداللہ کی لاش شناخت نہ کی جاسکی اور بعد میں نو مسلم سندھیوں نے موقع پاکر لاش کو دریا میں بہادیا۔

کلفٹن کراچی پر عبداللہ شاہ غازی کا مزار اس واقعہ کی شہادت دیتا ہے۔ (۵۱)

عباسی خلیفہ عبداللہ الاشتر کی شہادت سے بھی مطمئن نہیں ہوا اس نے ہشام کو اس راجہ کی سرکوبی کا حکم بھیج دیا جس نے آل رسولؐ کو پناہ دی تھی اور اب بھی چار پانچ سو سادات و نو مسلم جسکی حفاظت میں تھے ہشام نے راجہ سے سادات کو حوالے کردینے کا مطالبہ کیا۔ راجہ نے بھی ویسا ہی جواب دیا، جیسا راجہ داہر نے حجاج کو دیا تھا اور نتیجہ بھی وہی نکلا کہ ہشام ایک بڑا لشکر لے کر چلا راجہ اور اسکی فوج نے بڑی جوانمردی دکھائی۔ راجہ کی ساری فوج کٹ گئی تب بھی وہ لڑتا رہا اور لڑتا ہوا مارا گیا۔ سادات میں سے ایک ایک نے وہ داد شجاعت دی کہ

عباسیوں کے دانت کھٹے کر دئے۔ آخر وہ بھی سب کے سب مارے گئے مگر اہل سندھ
کے دلوں پر بہادری کے وہ نقوش ثبت کر گئے کہ خانوادہ رسالت کی شمشیر زنی وادی
مہران میں ضرب المثل ہو گئی۔ اور پھر ایسا کچھ ہوا کہ حکومت عباسیوں کی تھی مگر
سندھی دل و دماغ پر قبضہ اہل بیت کا تھا۔
فتح بظاہر ظالم کی ہوتی ہے مگر مظلومیت بڑے دیرپا اثرات چھوڑ جاتی ہے۔
کربلا کا آوازہ برسوں سے سندھ میں گونج رہا تھا اولاد فاطمہ زہرا کا خون جب اس طرح
آئے دن بہایا گیا تو عوامی ذہن نت نئی ہلچل سے دوچار ہوتے رہے اور اہل بیت کی
صداقت دلوں میں گھر کرتی رہی۔

ہباری حکومت

ان حقائق کے باوجود ستم رسیدہ سادات سندھ کے مختلف حصوں میں پہنچتے
ہی رہے۔ عباسی خلافت کے انحطاط پزیر ہونے پر ۲۴۰ھ میں عمر بن عبدالعزیز ہباری،
جو عباسیوں کی طرف سے سندھ کا والی تھا، ایک طرح پر آزاد حکمراں بن گیا مگر خطبہ
عباسیوں ہی کا جاری رہا۔
۲۵۷ھ میں جب یعقوب بن لیث صفاری کا عروج ہوا تو سندھ اسکے ماتحت
آگیا اور ہباری حکومت اسکی باجگزار بن گئی لیکن اسی دوران ملتان میں اسمٰعیلی
حکومت قائم ہو چکی تھی اور عمر بن شیبانی کو حاکم ملتان بنایا گیا تھا جسکے بعد شیخ حمید
عامل ملتان ہوا۔
فاطمئین مصر نے قیام خلافت کے بعد بھی تبلیغ کا وہی سلسلہ جاری رکھا تھا
کہ ان کے داعی مسلمانوں میں گھس کر منطقی طور پر اپنے موقف کو ذہن نشین
کراتے اور کم تعلیمیافتہ لوگوں کو اپنی جانب ملتفت کر لیتے۔ یہی انہوں نے ملتان و
منصورہ میں کیا تھا اور ایک تعداد کو ہم نوا بنا کر بنوسامہ کا تختہ الٹا تھا۔
بنوسامہ کے بارے میں مورخین کا خیال ہے کہ وہ سندھ کی خانہ جنگی سے
فائدہ اٹھا کر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جنکو اسمٰعیلیوں نے ختم
کیا اور اسمٰعیلیوں کو محمود غزنوی نے۔ ملتان کی اسمٰعیلی حکومت کا دورانیہ زیادہ
طویل نہیں ہے لیکن باطنی طریقہ کار میں تلوار سے زائد زبان کا استعمال ہوتا اس لئے

قیاس غالب یہی ہے کہ اسمٰعیلیوں نے ملتان کی طرح پہلے منصورہ والوں کا ذہن
بدلا پھر تلوار اٹھائی اور اس طرح منصورہ میں بھی ایک جداگانہ اسمٰعیلی حکومت قائم کر لی
ان حکمرانوں نے سادات کے مفاد کیلئے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن ان کے
زمانے میں شیعان علیؑ کی جانوں کو کوئی خطرہ نہ تھا اور عزائے سیدالشہدا کو پوری
آزادی تھی بلکہ مجلس و ماتم میں اسمٰعیلی برابر کے شریک رہتے تھے۔
عراق و ایران میں شیعہ حکومتیں وجود میں آچکی تھیں۔ عباسی خلافت اتنی
کمزور ہو گئی تھی کہ دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ تھی لہذا سادات کی سندھ میں آمد کم
ہو گئی تھی مگر اب اسکی ضرورت بھی نہ تھی۔ سندھ کے گوشے گوشے میں شیعیت
کے چراغ روشن ہو چکے تھے جنکی روشنی صوفیائے کرام کی ضیا سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

ان حالات میں دو صدیاں گزر گئیں۔ سامانی حکومت پیدا ہو گئی اور اسکی
خاک پر سبکتگین نے غزنی کا ایوان سلطنت تعمیر کر لیا۔ پھر سلجوقیوں نے بویہیں، آل
حمدان اور بنی مزید کی لاشوں پر سے گزر کر ایک فاتحانہ نعرہ بلند کیا۔ سلجوقیوں کی جگہ
عمادالدین زنگی نے لی اور زنگیوں کے سہارے صلاح الدین ایوبی نے فاطمئین
مصر کو پامال کیا۔
شیعوں کیلئے یہ کئی سو برس کے دور ابتلاء کی داستان ہے جس کا افتتاح
سلطان محمود نے عراق میں کیا اور اب اسکی نظریں ہند و سندھ پر پڑ رہی تھیں جہاں
ہندوؤں کی دولت اور شیعوں کی حکومتیں تھیں اور یہ دونوں اسکے لئے کشش رکھتیں
لہذا محمود پنجاب کو روند کر سندھ پر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔

سلطان محمود کے حملوں کی نوعیت

سندھ پر مسلمانوں کے قبضے اور سیستان، مکران اور ملتان کے الحاق کے بعد
اندرون ہندوستان کے علاقے اسلام کے متعلق بہت کچھ جانتے تھے لیکن ایسی تمام
معلومات منفی تھیں جن میں سلطان محمود کے حملوں سے اضافہ ہو گیا۔
مقصود سلطان کی منقصت نہیں ہے بلکہ سلطان کے حملوں سے عام ذہنوں
پر جو اثرات مترتب ہوئے ان کی نشاندہی ہے۔ الپتگین اور پھر سبکتگین کے وقت سے

پنجاب اور سندھ پر غزنی کے حملے شروع ہو چکے تھے اور پنجاب کا کچھ حصہ سلطنت غزنی کا جزو بن چکا تھا۔ سلطان محمود نے اس میں توسیع کی۔ ادھر ایران و خراسان، ادھر پنجاب سے آگے تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ پھر ہندوستان کے اندرونی حصوں کی طرف قدم بڑھایا۔

اگر نظریہ توسیع مملکت ہوتا اور جس جگہ کو تسخیر کرنا ہوتا اسپر حملہ کیا جاتا تو ایک مخصوص زاویہ سے اسلام کی اشاعت ہو سکتی تھی اور مفتوحہ مقامات کے ہندو یقیناً دائرہ اسلام میں داخل ہوتے رہتے جیسا کہ محمد بن قاسم کے حملوں سے ہوا اور مسلمان سندھ میں رہ پڑے تو ہندو اور بدھ مت والوں کو پیغمبر عرب کا دین سمجھنے کا موقع ملا اور وہ بتدریج مسلمان ہوتے رہے لیکن سلطان محمود نے تو یہ کیا کہ طوفان بن کر داخل ہوا اور لوٹ کھسوٹ کر غزنی واپس ہو گیا۔

اس سے سمجھا یہ گیا کہ غارتگری کا نام اسلام ہے اور زر و جواہر لوٹنے والا ہی مسلمان ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ محمود بت فروش نہیں تھا بلکہ بت شکن تھا۔ یہ کون سی بت شکنی تھی کہ بتوں کے ہیرے جواہرات نوچ کر انکو توڑ دیا اور دوسرے بت نصب کرانے کیلئے سوم ناتھ کو چھوڑ دیا۔

سوال یہ کیا جائے کہ گئے کس لئے تھے تو جواب اسکے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ درکار تھا، وہ لے لیا اور خطرات سے بچنے کیلئے واپس ہو گئے۔ محمود کے سترہ حملوں میں بیشتر حملوں کا حاصل اتنا ہی ہوا کہ غزنی میں ہندوستان کی دولت کے انبار لگ گئے اور آفت ناگہانی کے گزر جانے کے بعد ہندو اسلام کے پہلے تجربے سے برسوں تک سسکتے رہے اور عربوں کے دین سے انکی نفرت دوبالا ہو گئی۔

سلطان محمود اور ملتان

سندھ و ملتان سے محمود کا رابطہ سبکتگین کے وقت سے رہا تھا مگر سبکتگین نے ملتان پر اس لئے حملہ نہیں کیا تھا کہ ملتان کا حکمران خود ایک مسلمان شیخ حمید تھا جو اس سے لڑائی کے بدلے صلح چاہتا تھا۔ اب محمود کی باری آئی تو پندرہ سولہ سال گزر چکے تھے اور ملتان میں شیخ حمید کے پوتے داؤد بن نصر کی حکومت تھی۔

ملتان کی سرحد پر قلعہ بھاٹیہ واقع تھا۔۔۔۔۔۔ اس نے اپنی طاقت کے

نشے میں سلطان کی کوئی پرواہ نہیں کی اور سلطان کا لشکر جرار اسکی حدود کے قریب پہنچا تو اپنے علاقے سے اسکی رسد کو روک دیا۔ اسپر سلطان نے ملتان کے بجائے اپنا رخ بھاٹیہ کی طرف موڑ دیا۔ ۳۹۰ھ میں بھاٹیہ کے لشکر سے غزنویوں کی خونریز جنگ ہوئی جس میں بجے راؤ والی بھاٹیہ کو شکست ہوئی۔ غیرت دار راجہ نے فرط شرم میں خودکشی کر لی اور محمود کثیر مال و دولت لے کر غزنی واپس ہو گیا۔

دوسری بار اچانک ملتان پر ٹوٹ پڑنے خیال سے وہ درہ بولان کے بجائے درہ خیبر کے راستے سے روانہ ہوا۔ راستے میں انند پال کا علاقہ پڑتا تھا۔ اس نے گزرنے نہ دیا کیونکہ وہ داؤد کا ہم سرحد تھا اور حق ہمسائگی کا تقاضہ تھا کہ اسکی طرف سے دشمن کی کوئی مدد نہ کی جائے۔

ایسا ہی کچھ راجہ بھاٹیہ کے ساتھ پیش آیا تھا اور اسکو جان سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔

محمود کی افواج آگے بڑھیں تو انند پال سے پشاور کے قریب مقابلہ ہوا اور انند پال ہزیمت یاب ہوا، بھاگ کر اس نے کشمیر کے دروں میں پناہ لی اور محمود اس کا تعاقب کرتا ہوا بھٹنڈہ کی راہ سے ملتان جا پہنچا۔

محمود کو شاید داؤد اور ملتان سے پرخاش ہو گئی تھی یا پھر اسکے خاصۂ مزاج کی بات ہو گی کہ شیعہ کا نام آجائے تو وہ مشتعل ہو جاتا تھا، سبب جو کچھ بھی ہو اس کا فیصلہ یہی ہوا کہ وہ ملتان کو مسخر کیے بغیر نہیں رہے گا۔

ادھر داؤد بن نصر نے دیکھا تھا کہ انند پال اتنا طاقتور تھا تو اسکو میدان سے بھاگنا پڑا لہٰذا مقابلے کے بجائے قلعہ بند ہو گیا پھر اس نے دو لاکھ اشرفی سالانہ خراج پر اور ملک کا ایک حصہ دیکر صلح کر لی۔

اس سلسلے میں محمود کو انند پال سے بھی ضد ہو گئی کہ اگر وہ اس کا راستہ نہ روکتا تو ملتان کی فتح نامکمل نہ رہ جاتی۔ لہٰذا انند پال جب ہندوستانی راجاؤں سے مدد لے کر مقابلے پر آیا تو محمود نے ملتان سے تعاون کی امید کی لیکن بجے راؤ بھاٹیہ داؤد کی دوستی میں مارا گیا تھا اور انند پال سے محمود کی دشمنی بھی داؤد ہی کی وجہ سے ہوئی تھی چاہیے تو یہ تھا کہ داؤد محمود کے بجائے انند پال کی مدد کرتا لیکن سوال پیدا ہو گیا تھا

کفر واسلام کا اس لئے داؤد غیر جانبدار بن گیا۔ نتیجے میں محمود نے اسکے لئے ایک فیصلہ کر لیا۔

انند پال سے نپٹ کر اس نے غزنی میں ایک بڑا لشکر تیار کیا اور ۴۰۱ھ میں اس تیزی سے ملتان آگیا کہ ملتانیوں کو تیاری کا موقع ہی نہ مل سکا۔ غالباً یہ لوگ قلعہ بند ہوگئے مگر محمود نے ایک زبردست اور پرزور حملہ کرکے ملتان فتح کر لیا۔ پھر ایک باغی شہر کا جو حال ہو سکتا تھا وہ اس کا ہوا۔ اس نے باغیوں کو سخت سے سخت سزا دی۔ کسی کے ہاتھ اور پیر کاٹے کسی کو قتل کیا اور بڑی تعداد کو قید کر دیا۔ انہی میں شیخ داؤد بن نصر بن حمید بھی تھا جسکو گرفتار کرکے محمود غزنی لے گیا۔ یہ قلعہ غورک میں نظربند رہا حتیٰ کہ اس جہان سے چل بسا۔" (۵۲)

محمود نے ملتان میں ایک حاکم مقرر کر دیا اور دیگر انتظامات کے ساتھ اسمٰعیلی شیعوں کی بنوائی ہوئی مسجد کو برباد کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسمٰعیلیوں نے محمد بن قاسم کی مسجد کو بنی امیہ کی مسجد قرار دے کر بند کر دیا تھا۔ اس کا جواب محمود کی طرف سے دیا گیا۔

سلطان محمود اور منصورہ

ملتان کے بعد منصورہ کی حکومت باقی تھی۔ بعض مورخین نے اس کا یہ جواز پیش کیا ہے کہ گجرات کی طرف جانے کیلئے اپنا مقبوضہ راستہ بنانا تھا اس لئے اسپر حملہ کیا، جیسا کہ اہل ملتان پر مظالم ڈھانے کی خاطر لکھدیا گیا کہ وہ باغی تھے حالانکہ ذرا بھی انصاف سے کام لیا جاتا تو محمود نے بلاوجہ داؤد بن نصر پر حملہ کیا تھا اور راجہ بھاٹیہ کو داؤد کا دوست ہونے کے ناتے خودکشی پر مجبور کر دیا پھر انند پال سے پرانی دشمنی اس لئے تازہ ہوگئی تھی کہ اس نے ملتان جانے کا راستہ نہیں دیا تھا۔

متعصبانہ اور جارحانہ اقدامات کی ان تاویلوں کو نظرانداز کر دیا جائے تو ان تارکین وطن سادات نے محمود کا کیا بگاڑا تھا جو معتصم کے عہد سے جانیں بچا بچا کر سندھ پہنچے تھے اور دریائے مہران کے کنارے کنارے چھوٹی چھوٹی بستیاں بنا کر آباد ہوگئے تھے۔ وہ نہ مسلح تھے نہ پرخطر ان کے مردوں کو محمود نے تہہ تیغ کرا دیا اور عورتیں بچوں کو لے کر جدھر سینگ سمائے ادھر چلی گئیں۔ ملتانیوں کیلئے سلطان

محمود اباء واجداد کے قاتل کی حیثیت رکھتا تھا، وہ اسکے وفادار کیونکر ہو سکتے تھے لہذا ان پر الزام تراشی کرکے ظالم ٹھہرایا۔ منصورہ کیلئے کہنے کو بھی کچھ نہیں تھا پھر بھی مورخین نے بہانے تلاش کرنے کی کوشش کی حالانکہ حقیقت یہ ہے جو ابن اثیر نے لکھی ہے۔

سلطان نے منصور کا قصد کیا۔ یہاں کا والی اسلام سے پھر گیا تھا (یعنی اسمٰعیلیہ ہوگیا تھا) جب اسکو سلطان کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ شہر سے نکل گیا اور اپنے آدمیوں کو لے کر جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ سلطان محمود نے اس کا تعاقب کیا دو طرف سے اسپر حملہ آور ہوا۔ اس میں بہت سے آدمی مارے گئے اور بہت سے دریا میں ڈوب گئے۔ تھوڑے سے لوگ بچ سکے۔ سلطان بھاٹیہ ہوتا ہوا غزنہ چلا گیا جہاں صفر ۴۱۷ھ میں پہنچا" (۵۳)

اسکے بعد محمود نے چھوٹے چھوٹے اسمٰعیلی مقبوضات کو بھی لے لیا اور اسمٰعیلیوں کے قتل میں اتنی ارزانی کی کہ ان کا خون جیسے مباح ہو

سلطان محمود کے سلسلے میں مورخین نے جرائم کی پردہ پوشی کی جتنی بددیانتی کی ہے وہ مورخانہ وقار کو مجروح کرتی ہے۔ بلاشبہ محمود ایک بہادر مسلمان تھا لیکن حد درجہ متعصب، حریص اور بے رحم، چونکہ اس نے ہندوؤں پر بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، شیعوں کو ظالمانہ طریقہ پر کچلا لہذا اسے غازی اور مجاہد قرار دیا گیا۔ حصول زر کیلئے اسکی غارت گری کو نظرانداز کر دیا گیا۔

اسلام اگر تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہو اور غیر مسلم مورخوں کے اس غلط اعتراض کو صحیح مان لیا جائے تو بھی محمود نے تلوار کے زور سے اسلام بھی نہیں پھیلایا۔ کاش یہی کیا ہوتا۔ اس نے تو تلوار کے زور سے دولت اکٹھا کی اور اکٹھا کرتے کرتے اس دولت کا حساب دینے کیلئے خدا کی طرف بلا لیا گیا۔

سومرہ حکومت

ملتان پر غزنی کے حاکم مدت تک باقی رہے پھر منصورہ کا حال بعینہ ویسا ہی ہوا کہ غزنوی لشکر لوٹ مار اور قتل و غارت کرکے چلا گیا اور وہاں سومرہ حکومت قائم ہوگئی جو اسمٰعیلی تھی۔

ابو ظفر ندوی کی تحقیق کے مطابق سومرہ نسلی طور پر مسلمان تھے اور برسوں سے سندھ میں رہنے کے سبب سندھی کلچر میں رنگ گئے تھے اور ان کے نام بھی مقامی تہذیب سے متاثر تھے ۔ منصورہ میں غزنوی طاقت کمزور پڑنے پر جب اسمٰعیلیوں نے غلبہ حاصل کیا تو ان کے شیخ کا نام سومرہ تھا لہٰذا حکومت اسی سے منسوب ہو گئی ۔ بہرحال وہ قدیم مسلم ہوں یا نو مسلم مگر اب اسمٰعیلی شیعہ تھے جن کا تعلق سندھی قومیت سے تھا ۔ سومرہ اول کا زمانہ حکومت کافی طویل تھا ۔ ۴۲۶ھ میں اس کا انتقال ہوا ۔ اس خاندان کی حکومت دریائے سندھ کے کنارے پہلے ہی سے قائم تھی جس میں منصورہ کی شمولیت سے سلطنت کی وسعت کافی بڑھ گئی ۔ سندھ سے ملتان تک ایک اچٹتی نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ فاطمئین مصر کی سلطنت کا سندھ پر کافی اثر پڑا تھا اور اسمٰعیلی کسی مدت سے سندھ کے مختلف حصوں پر قابض تھے ۔ بڑی حکومتیں یقیناً دو ہی تھیں ملتان اور منصورہ ۔

سلطان محمود نے ان دونوں کو فتح تو کیا تھا لیکن منصورہ جلد ہی سومرہ اقتدار میں چلا گیا ۔ ملتان کو جانے میں کچھ دیر لگی تاہم سلطان مسعود کا دور آتے آتے ملتان کیلئے طاقت آزمائی شروع ہو گئی ۔

سومرہ فرمانروا

مسلم دور میں یہ سندھیوں کی پہلی حکومت تھی جسکو وطن پرست ہندوؤں نے بھی قبول کیا جسکی مدت سلطنت چار صدیوں کا احاطہ کرتی ہے ۔ ۵۷۰ھ میں شہاب الدین غوری نے ملتان اور اچھ پر حملہ کیا مگر دیبل سے ٹھٹھہ تک بھٹو کی حکومت قائم رہی

بلاشبہ یہ دور ملتان سے ٹھٹھہ تک اسمٰعیلیوں کی حکومت کا تھا مگر جہاں حکومت کا سوال آتا ہے وہاں بھائی سے بھائی ٹکرانے لگتا ہے ۔ ایسا ہی کچھ "سومرہ" میں بھی ہوا اور وہ وقت بھی آگیا جب ملتان ، اچھ ، دیبل ، ٹھٹھہ علیحدہ علیحدہ حکومتوں کے مراکز بن گئے مگر بعض لحاظ سے اقتدار اعلیٰ منصورہ کی سابقہ حکومت کو حاصل رہا جو اب متھری میں منتقل ہو چکا تھا ۔ بادشاہان سومرہ کا ایک نقشہ تاریخ سندھ از مولانا ابو ظفر سے ماخوذ ہے جو تحفتہ الکرام اور تاریخ معصومی سے قدرے مختلف ہے پھر بھی صحیح معلوم ہوتا ہے ۔

نام	مدت حکومت	سن وفات	کیفیت
سومرہ اول (یا راجہ سوم رائے)	۴۰۱ھ سے	۴۲۲ھ	نسل سومرہ کا یہ پہلا حکمراں خاندان ہے
راجہ پال	۲۲ سال	۴۴۴ھ	
سومرہ دوم	۲	۴۴۶ھ	یہ دوسرا خاندان ہے ،
بھونگر	۱۵	۴۶۱ھ	اس کی حکومت زیر نگرانی وزراء ہوئی کیونکہ کل عمر ۷ا برس کی تھی ،
دودا یا داؤد بن بھونگر اول	۲۴	۴۸۵ھ	مدت عمر ۲۶ سال زیر نگرانی وزراء اس کی حکومت رہی
بائی (تائی یا تاری)	۱۵	۵۰۰ھ	یہ دودا کی لڑکی تھی ،
سنگھ رائے (سنگھر یا سنگھار) ابن دودا	۱۵	۵۱۵ھ	یہ لاولد تھا ، بعض لوگوں نے اس کا نام (سنجر) بھی لکھا ہے ۔
خفیف	۳۳	۵۴۸ھ	نسل سومرہ میں سے یہ تیسرا خاندان ہے
انار (عمر)	۲۳	۵۷۱ھ	عمر ۴۷ سال ، شہاب الدین غوری سے جنگ کے اثناء میں مر گیا
دودا (یا داؤد) دوم	۸	۵۷۸ھ	یہ سومرہ کسی قلعہ کا حاکم تھا مگر آخر میں بادشاہ ہو گیا ،
بھٹو ، دودا بن بھونگر کی اولاد سے ہے	۳۳	۶۱۱ھ	یہ سومرہ دوم کے خاندان سے ہے ، اس کا نام پاتھو یا پھٹو بھی لکھا ہے ،
کھن رائے (کنہرا)	۶	۶۱۷ھ	بعض لوگوں نے اس کا نام "خیرا" لکھا ہے ،
جے سنگھ (جلسی یا جیسہ)	۳	۶۲۰	
محمد تور	۱۵	۶۳۵ھ	یہ سومرہ نسل سے ہے اور اپنے خاندان کا بانی ہے ،
کھن رائے (کنہرا) دوم	۴	۶۳۹ھ	
دودا (یا داؤد) (سوم)	۱۲	۶۵۱ھ	غالباً یہ لاولد تھا ،
بائی	۱۵	۶۶۶ھ	
گنیشن رائے (چنیسر)	۱۸	۶۸۴ھ	غالباً یہ کسی قلعہ کا حاکم یا وزیر تھا جو بائی کے بعد سلطنت پر قابض ہو گیا ،
بھونگر (دوم)	۱۵	۶۹۹ھ	یہ سومرہ دوم یا محمد تور کے خاندان سے تھا ،
خفیف (دوم)	۸	۷۰۷ھ	
دودا (یا داؤد) (چہارم)	۵	۷۱۲ھ	
دتورائے	"	"	یہ کسی ضلع کا حاکم یا باغی تھا
انار (عمر) دوم	۲۵	۷۳۷ھ	غالباً یہ بھونگر دوم کے خاندان سے تھے
بھونگر (سوم)	۱۰	۷۴۷ھ	
امیر (ہمیر) ارمائیل	۵	۷۵۲ھ	سومرہ خاندان کا آخری تاجدار ہے

۶۲۰ھ میں جب جلال الدین خوارزم شاہ تاتاریوں سے شکست کھا کر سندھ پر حملہ آور ہوا تو سومرہ خاندان کی ایک دوسری شاخ ٹھٹھہ پر حکمراں تھی ۔ وہ جلال الدین کے خوف سے ایک جزیرہ میں منتقل ہوگئی مگر جلال الدین جب چنگیزی لشکر کے ڈر سے مکران ہوکر عراق چلا گیا تو جیسی سومرہ واپس آگیا مگر ناصرالدین قباچہ نے اسکو اسکے علاقے سے بیدخل کردیا لیکن سومرہ اس طرح خاموش بیٹھنے والے نہ تھے، انہوں نے جنوب مشرق میں اپنی طاقت سمیٹ کر ایک گاؤں آباد کیا ۔ اس کا نام اپنے سردار کے نام پر محمد تور رکھا پھر اس مقام سے آہستہ آہستہ پورے سندھ پر متصرف ہوگئے ۔

کچھ عرصے بعد ایک سندھی کی شکایت پر علاء الدین خلجی نے ایک فوج سندھ بھیجی جس نے بہت سے مقامات فتح کرلیے اور محمد تور تک چلے گئے جہاں بڑی سخت لڑائی ہوئی اور سومرہ حکمران پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے خلجیوں کے جانے کے بعد انہوں نے دوبارہ حکومت قائم کی ۔

۷۱۶ھ میں علاء الدین خلجی کے بعد قطب الدین تخت نشین ہوا تو سومرہ نے اپنی حدود سلطنت بڑھانا شروع کردیں اسی دوران خلجی ملتان پر قابض ہوگئے ۔ سومرہ نے اس خلفشار سے فائدہ اٹھا کر ٹھٹھہ اور محمد تور کی ازسرنو تعمیر کرلی ۔

۷۲۵ھ میں سلطان محمد تغلق دہلی میں تخت نشین ہوا تو سومرہ پھر سندھ میں نمودار ہوگئے تھے مگر جنوب کی طرف سمٹ گئے تھے اور انکی حکومت بھکر اور اسکے مضافات تک محدود تھی ۔

اس دوران "سمہ" قبیلہ کافی طاقتور ہوگیا تھا اور اس نے مکران پر قبضہ کرکے مغربی سندھ میں ہاتھ پاؤں نکالنا شروع کردئے تھے ۔ سومرہ کو کمزور پاکر انہوں نے جنوب کا رخ کیا ۔ سومرہ میں لڑنے کی طاقت نہ تھی ۔ کاہہ بن تماچی نے انار اور علی شاہ کو گرفتار کرلیا اور بہرام پور لے جاکر دونوں کو قتل کرادیا ۔

۷۳۷ھ میں بھونگر سوم اسکا جانشین ہوا جس نے پھر ایک بڑی حکومت قائم کرلی اور سلطنت دہلی کا باج گزار بن گیا ۔

۷۵۱ھ میں محمد تغلق کا ایک باغی گجرات سے بھاگ کر سندھ پہنچا ۔ سومرہ

نے اسکو ٹھٹھہ میں پناہ دی لہذا محمد تغلق نے باغی کے تعاقب میں ٹھٹھہ کا محاصرہ کرلیا پھر اپنی بیماری کے سبب محاصرہ اٹھا کر واپس ہوا تو سومروں نے اسپر حملہ کیا اور لوٹ مار کرکے واپس چلے آئے ۔

انہیں دنوں سومرہ اور سمہ کی آپس کی جھڑپیں بڑھ گئیں ۔ سمہ موقع پاکر سومرہ کے آدمیوں کو قتل کردیتے تھے اور سومرہ سمہ کے آدمیوں کو آخر سمہ نے مجتمع ہوکر سومرہ پر حملہ کردیا، انکو شکست دے کر ٹھٹھہ پر قبضہ کیا پھر محمد تور پر تسلط حاصل کیا اور ایک نئے شہر ساموئی کو آباد کرکے اپنی حکومت کی بنیاد رکھ دی اس طرح ۷۵۲ھ میں سندھیوں کی پہلی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا ۔

سندھ کا دوسرا حکمران خاندان سمہ

اس خاندان کے نسلی سلسلے میں متعلق مورخین کی مختلف آراء ہیں بعض اسے ابوجہل سے منسوب کرتے ہیں بعض سام بن عمر بن ہشام بن ابولہب کو جداعلیٰ قرار دیتے ہیں بعض ہندو کہتے ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ یہ جمشید شہنشاہ ایران کی نسل ہیں ۔

ہر مورخ اپنے قیاس کے مطابق دلائل رکھتا ہے لیکن سندھ و ایران کا تعلق بہت قدیم ہے اور سندھ زمانہ دراز تک ایران سے ملحق رہا تھا لہذا کہا جاسکتا ہے کہ ایران کا کوئی قبیلہ سندھ آکر بس گیا اور اس نے بدھ مت یا ہندو مذہب اختیار کرلیا پھر سومرہ کی طرح حلقہ بگوش اسلام ہوگیا ۔

قبول اسلام کے وقت کا تعین مشکل ہے مگر جب سمہ برسر اقتدار آئے تو وہ مسلمان تھے اور ان کے حکمرانوں نے "جام" کا لقب اختیار کیا جو جم سے مشتق ہے اور کثرت استعمال میں جم سے جام بن گیا ہے ۔

اپنے اٹھان میں اس قبیلے نے بھی بڑی شجاعت اور تلوار کے جوہر دکھائے اور ایک قابل ذکر حکومت قائم کرلی ۔

فیروز الدین جام آنر بن بابنھنیہ

۷۵۱ھ تا ۷۵۳ھ ۔ جام آنر نے اپنی حکومت کا آغاز سیوستان سے کیا تھا ۔

ساڑھے تین سال کی مدت حکومت میں اس نے اسکو مضبوط بنادیا اور ایک فوج تیار کر دی جو دشمن کی مدافعت کر سکتی ۔

علاو الدین جام جونہ بن جام آنر

۷۵۳ھ تا ۷۶۸ھ ۔جام جونہ بڑے بھائی جام آنر کے بعد تخت پر بیٹھا ۔ اسکے دل میں اول دن سے کشورکشائی کا جذبہ تھا ۔ اس نے بکھر پر بزور شمشیر قبضہ کیا اور سمہ حکومت کو پہلے سے زائد طاقتور بنالیا مگر کچھ دنوں بعد سلطان علاء الدین کے بھائی الغ نے ملتان فتح کر کے ایک فوج سندھ بھیج دی لیکن اس سے قبل جام جونہ کا انتقال ہو چکا تھا لہذا اس فوج نے بکھر پر باسانی قبضہ کرلیا۔

جام تماچی بن جام آنر

۷۶۸ھ تا ۷۷۷ھ اس کو سلطان علاء الدین کے لشکر سے مقابلہ کرنا پڑا اور وہ دل میں اول دن سے کشور کشائی کا جذبہ تھا ۔ اس نے بکھر پر بزور شمشیر قبضہ کیا اور سمہ عرصے بعد جام تملاچی کا بیٹا خیرالدین دہلی سے سندھ آیا اور اپنے علاقہ پر قابض ہو گیا۔
انھیں دنوں محمد تغلق کا سندھ میں انتقال ہو گیا اور فیروز تغلق زمام حکومت ہاتھ میں لینے کیلئے دہلی روانہ ہوا تو خیرالدین نے اسکے لشکر پر چھاپے مارے ۔ پھر چند سال منصفانہ حکومت کر کے وفات پا گیا۔

جام علاء الدین جونہ

۷۷۷ھ تا ۷۹۱ھ ۔جام خیرالدین کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا ۔ اسکے پندرہ سال بعد فیروز تغلق سندھ پر حملہ آور ہوا اور جام علاء الدین کو دہلی لے گیا جہاں جام نے فیروز تغلق کی خوشنودی حاصل کی اور سلطان کی طرف سے دوبارہ سندھ کا حکمراں بنادیا گیا۔

جام تماچی ثانی

۷۹۱ھ تا ۷۹۵ھ ۔جام تملاچی جام جونہ کا بھائی تھا، عیش و عشرت کا دلدادہ اس نے ایک لڑکی نوری سے عشق کیا تھا اور اسکے لئے جھیل کھنجر کے کنارے ایک محل تعمیر کرایا تھا۔

جام صلاح الدین

۷۹۵ھ تا ۸۰۶ھ ۔یہ جام تملاچی کا بیٹا تھا ۔ اس نے باغیوں کی سرکوبی کر کے بدامنی دور کی پھر کچھ پر حملہ کیا اور فتح یاب ہوا اس نے اپنے زمانے میں فوج اور رعایا پر خاص توجہ کی۔

جام نظام الدین

۸۰۷ھ تا ۸۰۹ھ ۔جام نظام الدین بن جام صلاح الدین نے نظام حکومت اپنے چار چچاؤں کے حوالے کر دیا جو موقع پا کر اسپر چڑھ دوڑے ۔جام نظام الدین گجرات کی طرف فرار ہوا اور امرائے سلطنت نے جام علی شیر کو تخت پر بٹھا دیا جام نظام الدین گجرات پہنچنے سے قبل ہی مر گیا۔

جام علی شیر

۸۰۹ تا ۸۱۵ھ ۔یہ جام تملاچی کا بیٹا تھا جو نہایت مدبر اور عدل پرور تھا ۔ رعایا کو اسکے دور میں بڑا اطمینان میسر تھا ایک رات وہ دریا کی سیر کو نکلا تھا کہ جام نظام الدین کے چچاؤں نے اسپر حملہ کر کے قتل کر دیا اور ان میں سے ایک چچا تخت نشین ہو گیا

جام کرن بن جام خیر الدین

۸۱۶ھ ۔اسکو تخت نشینی کے تھوڑے ہی دنوں بعد بھائیوں نے قتل کر دیا اور جام سکند بن خیرالدین تخت نشین ہو گیا۔

جام سکندہ شاہ

۸۱۶ھ ۔اسکی سلطنت ایک سال سے کم رہی لیکن مختصر سے وقت میں اس نے رفاہ عامہ کے کئی کام کیے۔

جام فتح خاں

۸۱۶ھ تا ۸۳۶ھ ۔یہ سکندر کا بیٹا تھا ۔ اس کے دور میں ہندوستان پر تیمور کا حملہ ہوا اور اسکے ایک جرنیل مرزا پیر محمد نے ملتان فتح کرلیا ۔ اہل سندھ کو معلوم تھا کہ تیمور سادات کا بہت احترام کرتا ہے لہذا سادات سکھر میں سے ایک متقی اور

عبادت گزار بزرگ ابو الغیث مرزا پیر محمد کی خدمت میں ملتان بھیجے گئے اس نے بڑی عزت کے ساتھ ابو الغیث کا خیر مقدم کیا، گرانقدر تحائف دے کر واپس کیا اور ان کے کہنے کے مطابق سندھ میں غارت گری نہیں کی ۔ اس طرح فتح خاں بڑے اطمینان اور سکون سے پندرہ سال حکمران رہا۔

جام تغلق شاہ

۸۳۶ ھ تا ۸۵۷ ھ ۔جام تغلق فتح شاہ کا بیٹا تھا۔ بڑا منتظم اور ہوش مند فرمانروا تھا۔اس نے گجرات سے اپنے رشتوں کو استوار کیا اور دہلی سے روابط قائم کیے ۔ اٹھائیس سال کی کامیاب حکمرانی کے بعد فوت ہوا۔

جام مبارک

۸۵۷ ھ ، جام سکندر مبارک ۸۵۷ ھ تا ۸۵۸ ھ ۔ تاریخ معصومی میں جام مبارک کے بجائے جام سکندر لکھا ہے جو جام تغلق کا نابالغ بیٹا تھا اور مبارک اس کا اتالیق ۔ تخت پر بیٹھتے ہی جام سکندر کو اندرونی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ٹھٹھہ میں مزید ڈیڑھ سال حکومت کے بعد وہ فوت ہو گیا۔

جام رائڈنہ

۸۵۸ ھ تا ۸۶۶ ھ ۔جام رائڈنہ جام سکندر کے وقت میں ایک سرحدی حاکم تھا ۔ وہ امراء کو ملا کر تخت نشین ہوا باتمیز اور مدبر تھا ۔ آٹھ سال تک کامیاب حکومت کرنے کے بعد اسکے ایک مصاحب جام سنجر نے زہر دے کر مار ڈالا اور خود فرمانروا بن گیا۔

جام سنجر

جام سنجر بہت خوبصورت آدمی تھا ۔ ٹھٹھہ کے تخت پر اس سے قبل اتنا حسین و جمیل بادشاہ نہ بیٹھا تھا ۔ یہ جام بڑا منصف مزاج اور رعایا پرور تھا ۔ اسکے انصاف کے بہت سے قصے مشہور ہیں ۔مورخین میں ان دونوں حکمرانوں کے سلسلے میں اختلافات ہیں ۔ تاریخ معصومی میں رائے ڈنہ کے بعد سنجر کا ذکر نہیں ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ رائے ڈنہ سرحد اور شہروں کا حاکم تھا اور سنجر ٹھٹھہ کا اور سنجر نے رائے ڈنہ کو کسی مصاحب کے ذریعہ زہر دلوا دیا تھا اور ٹھٹھہ کے ساتھ رائے ڈنہ کے مقبوضات کا بادشاہ بھی بن گیا تھا۔

جام نظام الدین ثانی

المعروف بہ جام نندہ ۸۶۶ ھ تا ۹۱۳ ھ ۔جام نندہ کو سمہ حکومت کی آبرو کہا جاسکتا ہے: مدبر، خلیق، متواضع، انصاف پرور، خداترس، ذہین، نکتہ رس اور بہادر اسکے بارے میں کئی داستانیں سندھ میں زبان زد ہیں ۔

سندھ کی تاریخ میں اس کا عہد سب سے زیادہ پرامن تھا۔ رعایا کو اس پر پورا اعتماد تھا اور وہ بھی ایک بادشاہ کی طرح عوام کے مسائل اور تکالیف پر نظر رکھتا تھا اس کا دربار علماء، فضلاء اور اکابر سے بھرا رہتا اور یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس نے ٹھٹھہ کو بغداد و قاہرہ اور قرطبہ بنا دیا تھا۔ قدیم ٹھٹھہ کے متصل ایک شہر آباد کیا تھا جو ٹھٹھہ ہی کہلایا۔

۸۹۰ ھ میں شاہ بیگ ارغون نے قلعہ سیوی پر حملہ کیا اور قندھار واپس چلا گیا اور علاقے پر اپنے بھائی سلطان محمد کو حاکم بنا گیا۔جام نندہ نے اسکے مقابلے کیلئے ایک لشکر بھیجا جو بری طرح ہزیمت یاب ہوا۔ اسکے بعد ارغون لشکر نے بکھر سمیت کئی قلعے فتح کر لیے ۔جام نندہ نے بہت کوشش کی کہ ایک بڑا لشکر اپنے مقبوضات کو واپس لانے کیلئے روانہ کرے مگر سندھی پچھلی جنگ سے اتنے ڈر گئے تھے کہ دوبارہ مقابلے پر جانے کی ہمت نہ کرسکے ۔

اور بقول تاریخ فرشتہ ، جام نندہ ناکامی کی غیرت میں بیمار پڑ کر مر گیا

دریا خان

دریا خان جام نندہ کے دیوان کا غلام تھا جو اپنی ذہانت کے سبب جام نندہ کا مقرب بن گیا تھا وہ اپنی صلاحیت کے لحاظ سے تخت نشین ہوا۔ اس نے شاہ بیگ ارغون کا مقابلہ کیا اور سخت زخمی ہو کر ٹھٹھہ میں انتقال کیا۔

ناصر الدین ابو الفتح

سلطان فیروز شاہ ۹۱۴ ھ تا ۹۲۶ ھ ۔جام فیروز جام نندہ کا کم سن بیٹا تھا۔ جام صلاح الدین اس کا مخالف تھا وہ سلطان مظفر گجراتی سے مدد لایا اور جام فیروز کو شکست دے کر تخت پر قابض ہو گیا۔

دریاخان نام کا ایک سردار جام فیروز کا پشت پناہ تھا۔اس نے جام نندہ کے
نام پر منتشر قوت کو یکجا کیا اور جام صلاح الدین نے ٹھٹھہ سے جو فوج بھیجی تھی ،
اس کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی جام صلاح الدین کے سپہ سالار نے فتح کے بعد جو
خط ٹھٹھہ روانہ کیا تھا وہ اتفاق سے دریاخان کے ہاتھ پڑ گیا اس نے خط بدل کر ایک
خط جام صلاح الدین کو بھجوادیا کہ وہ فوراً ٹھٹھہ خالی کردے ۔جام صلاح الدین نے
ایسا ہی کیا اور دریاخان نے جام فیروز کو ٹھٹھہ لے جاکر تخت نشین کردیا۔

جام فیروز اسکے بعد کئی سال تک حکومت کرتا رہا۔ حتی کہ ۹۲۶ ھ میں شاہ
بیگ ارغون نے پھر سندھ پر حملہ کیا اور سیوہن ہوتا ہوا ٹھٹھہ جا پہنچا دریاخان
نے ٹھٹھہ سے نکل کر مقابلہ کیا اور لڑتا ہوا مارا گیا اور سمہ سلطنت ارغونوں کے
قبضے میں چلی گئی۔

سمہ حکومت کا دورانیہ پونے دوسو سال ہے ۔اس میں سمہ بادشاہوں نے
سندھ کیلئے بہت کچھ کیا۔شہری ترقی کے ساتھ علوم وفنون پر بڑی توجہ دی ۔ باہر سے
آنیوالے سادات اور اہل تصوف کے سوا خود سندھیوں میں بھی بڑے بڑے عالم و
فاضل پیدا ہوئے اور بجا طور پر سندھ کے اس دور کو عہد آفرین کہا جاسکتا ہے ۔

سندھیوں کا عمومی مذہب حنفیت رہا لیکن شیعوں کی ایک بڑی تعداد ملک
کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ان میں اسمٰعیلی بھی تھے اور بکثرت اثناعشری جو ان
سادات کے طفیل جنکے مزارات آج بھی سندھ کا امتیاز ہیں اور جنکی نسلیں عقائد
راسخہ کے ساتھ اب بھی سندھی کہے جانے پر فخر کرتی ہیں ۔

خود سمہ قبائل میں بھی بہت سے شیعہ موجود تھے اور موجود ہیں اور علماء
فضلاء اور شعراء میں تو اکثریت شیعوں کی تھی جن میں آل رسول کو فضیلت حاصل
رہی ۔(۵۴)

ارغون خاندان

۹۲۷ھ تا ۹۶۲ھ

ارغون ،چنگیز خاں کی نسل سے ہیں ۔انکا سلسلہ ، نسب ہے: ارغون خاں
بن اباقاخان بن ہلاکو خاں بن تولی خاں بن چنگیز خاں ۔اپنے باپ اباقاخان کے زمانہ
میں وہ خراسان کا بادشاہ تھا۔ باپ کی موت کے بعد اس کا بیٹا غازی (غازان) خان ،
تخت خانی (سلطانی) پر متمکن ہوا۔

خدا نے اس کے دل میں اسلام کا نور روشن کیا اور وہ خراسان کو غازان خان
کے سپرد کرکے خود حضرت سیدالانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے لئے
مدینہ طیبہ روانہ ہوا۔وہاں وہ آنحضرتؐ کے حکم سے خواب میں امیرالمومنین حضرت
علیؑ اور حضرت امام حسینؑ سے بغل گیر ہوا۔اسی وجہ سے وہ سادات کے احترام میں
مبالغہ سے کام لیتا تھا۔

امام حسینؑ کی جائے شہادت تک اس نے ایک ایسی کشادہ اور عمیق نہر
کھدوائی تھی کہ دجلہ وفرات سے کشتیاں کربلا تک آتی جاتی تھیں۔
غازان خاں کے بارے میں بھی اسی قسم کی ایک روایت ملتی ہے۔

شاہ بیگ

ارغون خاندان کی اولاد میں سے جب شاہ بیگ ابن امیر ذوالنون ابن میر
حسن بصری نے ٹھٹھہ پر قبضہ کیا اور وہاں کی لوٹ مار اور قتل وقید سے فارغ ہوا تو
جام فیروز ، جس کے اہل وعیال اسیر ہوگئے تھے ، اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھ کر
حاضر خدمت ہوا۔شاہ بیگ اس سے بڑی نوازشوں کے ساتھ پیش آیا، اسے اپنا بیٹا
بنا کر سیوستان تک کا ملک عنایت کیا اور کوہ لکی کو سرحد قرار دیا۔اس کے بعد میر
علیکہ ارغون ، سلطان مقیم بیگلار ، کیبک ارغون اور احمد ترخان کو فیروز کے پاس
چھوڑ کر سیوستان کے نواح سے دریاخان کے بیٹوں کا صفایا کیا پھر شال اور سیوی کی
طرف بڑھ گیا۔

سمہ قوم کے لوگ ،جو اس افراتفری کے دور میں ادھر ادھر منتشر ہوگئے تھے ، وہ

جام صلاح الدین کو گجرات سے لے آئے۔ کچھ کے والی رائے کھنگار کی مدد سے وہ دس ہزار جانبجہ ساتھ لے کر ٹھٹے پر حملہ آور ہو گیا۔ مرزا شاہ حسن ابن شاہ بیگ یہ خبر پاکر ۱۴ محرم کو شال سے نکلا اور بیس دنوں کے اندر ٹھٹھہ آپہونچا۔ فریقین نے جب ایک دوسرے کے سامنے صفیں آراستہ کیں تو صلاح الدین کا بیٹا ہیبت خان جو سلطان مظفر گجراتی کا نواسہ تھا اور لشکر کا افسر مقدمہ تھا، آگے بڑھا۔ مرزا عیسیٰ ترخان، میر علیکہ اور سلطان قلی بیگلار نے ایک زبردست یلغار کرکے ہیبت خان کو قتل کر دیا۔

صلاح الدین، بیٹے کے مارے جانے سے انتہائی جوش و غضب کے ساتھ میدان جنگ میں کود پڑا۔ اس طرف سے مرزا شاہ حسن نے بھی سخت حملہ کرکے شجاعت کا حق ادا کیا اور آن واحد میں دشمن کا سارا لشکر درہم برہم کر دیا اکثر کو قتل اور باقی ماندہ کو بھگا دیا۔ رائے کھنگار کا بھائی آمر آمرانی میدان جنگ میں کام آیا۔ مرزا شاہ حسن حملہ آوروں کو گجرات کی طرف بھگا کر تین دن کے بعد واپس ہوا۔ ماہ ربیع الثانی میں شاہ بیگ خود بھی باغبان کے نواح میں آپہونچا اور مرزا شاہ حسن کو طلب کیا۔ اسی درمیان اس نے ماچھیوں کو جو خود مختار ہو گئے تھے ختم کرکے ان کے قلعہ کی بنیادیں بھی اکھاڑ پھینکیں۔

مرزا شاہ حسن نے باپ کے حکم کے مطابق سیوستان جاکر وہاں قابل اعتماد افراد مامور کئے اور انہیں نئے سرے سے عمارتیں تعمیر کرنے کے لئے زمینیں تقسیم کیں پھر باپ کی خدمت میں واپس آگیا۔

انہیں دنوں میں شاہ بیگ نے جام فیروز کو لکھا تھا "میں نے گجرات فتح کرنیکا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔ جیسے ہی یہ تمنا پوری ہوئی، مملکت سندھ حسب سابق تیرے حوالہ کر دی جائے گی"۔ اس کے بعد وہ بکھر کو روانہ ہو گیا۔ وہاں پہونچ کر اس نے قلعہ کے اندر رہنے والے سادات کو روہڑی میں رہائش گاہیں عطا کیں اور اروڑ شہر کے کھنڈروں کی اینٹوں سے ایک نیا قلعہ تعمیر کرایا۔

سال بھر میں جب قلعہ کی عمارت تیار ہوئی تو اس نے میر فاضل کو کلتاش، ملک محمد کوکہ، میر محمد ساربان اور سلطان محمد مہردار جیسے امرا کو وہاں مقرر کیا پھر

بلوچ فسادیوں کی سرزنش کے لئے فوجیں مامور کیں جنہوں نے منصوبہ کے مطابق سارے مقامات پر ایک ہی وقت میں اس گروہ کو برباد کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر شاہ بیگ شال اور سیوی کی طرف واپس گیا۔ اس کے بعد سنہ ۹۲۸ھ میں وہ پھر بکھر آیا اور باشندہ محمد ترخان کو وہاں کی حکومت تفویض کرکے گجرات کے ارادہ سے موضع اگھم کے قریب جاکر جام فیروز کا انتظار کرنے لگا۔ اتفاقاً ۲۲ ماہ شعبان سنہ ۹۲۸ھ کو وہ سکرات میں مبتلا ہوا اور پیش امام حافظ شریف کو سورۃ یاسین پڑھنے کا حکم دیا وہ جب تلاوت کرتے کرتے آیت "ومالی لا اعبد الذی" پر پہونچا تو اس نے کہا کہ "مکرر پڑھ" چنانچہ دوسری مرتبہ جب حافظ، آیت "یالیت قومی یعلمون بما غفرلی" پر پہونچا تو اس نے اپنی جان جان آفرین کے حوالہ کر دی۔ "شہر شعبان" اس کی تاریخ وفات ہے۔

پھر اس کی لاش کو مکہ معظمہ لے جاکر دفن کیا گیا۔ عہد شباب میں وہ خواجہ عبداللہ کی خدمت میں حاضر رہ کر اور علمی کمالات حاصل کرکے بلند درجہ پر فائز ہوا تھا جب وہ باپ کے ساتھ ہرات میں رہا کرتا تھا تب بھی ہمیشہ علما کی صحبت میں رہتا اور ہفتہ میں دو بار انہیں اپنے مکان میں مدعو کرکے ان کی خدمت کیا کرتا اور ان سے فیض حاصل کرتا تھا۔ اس کی تصنیفات میں "شرح کافیہ" اور بعض رسالوں کے حواشی مشہور ہیں۔

مرزا شاہ حسن

مرزا شاہ حسن، ۹۲۸ھ تا ۹۶۲ھ، باپ کے انتقال پر نصرپور میں تخت نشین ہوا اور اس نے شہنشاہ بابر کے نام کا خطبہ پڑھا۔ بعض خیر خواہ اس پر کافی ناراض ہوئے لیکن اس نے کہا کہ "قدیمی ولی نعمت کے ہوتے ہوئے اس کا نام خطبے شامل نہ کرنا ہمارے لئے مناسب نہیں۔" جام فیروز نے شاہ بیگ کی وفات کی خبر سن کر خوشی منائی اور فاتحہ خوانی کو نظر انداز کرکے اطاعت سے منحرف ہو گیا۔ مرزا شاہ حسن نے یہ خبر پاکر اس کی بیخ کنی کا ارادہ کیا۔ جام فیروز نے اسکی اطلاع پاتے ہی حافظ رشید خوش نویس اور مفتی قاضی قاضن کے ہاتھوں تحائف بھیج کر معذرت چاہی لیکن ساتھ ہی ساتھ خفیہ طور پر جنگ کی تیاری میں بھی مشغول رہا۔ مرزا کو یہ حال

معلوم ہوا تو اس نے ٹھٹے پر چڑھائی کردی ۔جام فیروز نے لپنے میں مقابلہ کی سکت نہ پاکر وزیر مانک اور شیخ ابراہیم داماد کو جنگ پر مامور کیا اور دریا پار کرکے فرار ہوگیا ان دونوں نے بڑی کوششیں کیں ، توپچیوں اور تیر اندازوں سے بھری ہوئی کشتیاں حائل کرکے راہ روکنی چاہی ، لیکن مرزا کا لشکر ان سب کو ہٹاتا ہوا ٹھٹے میں داخل ہوگیا۔

بدنصیب جام فیروز کچھ بھاگ گیا وہاں سے پچاس ہزار پیادوں اور سواروں کے ساتھ چاچکپ اور راحمہ کے قریب آکر ٹھہر گیا۔مرزا شاہ حسن نے کچھ آدمی ٹھٹے کی حفاظت کے لئے چھوڑے اور اس کے مقابلہ پر آگیا ۔ دونوں فریق جب ایک دوسرے کے سامنے آئے تو سندھی اور کچھی بہادر سروں سے پگڑیاں اتار کر رسم کے مطابق چادروں کے کونے ایک دوسرے سے باندھ کر ، گھوڑے سے اتر کر پیادہ ہوگئے اور جنگ کے لئے مستعد ہوگئے ۔ سندھ اور ہند کے لوگوں کا یہ دستور ہے کہ جب وہ مرتے دم تک جنگ کرنے کا تہیہ کرتے ہیں تو اسی طرح لڑائی شروع کرتے ہیں ۔

کہتے ہیں کہ مرزا شاہ حسن نے یہ حالت دیکھ کر امرا کو مبارکباد دی اور کہا کہ " انہوں نے خود ہی لپنے آپ کو باندھ کر ہمارے سامنے کردیا ، انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا " ۔ یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے اترا اور وضو کرکے مناجات کی نیت سے دو رکعت نفل ادا کی ، بارگاہ ایزدی میں کامیابی کے لئے دست بدعا ہوگیا اور اس کی دعا قبول ہوئی ۔ لشکر اسکے حکم کے مطابق تیر برسا رہا تھا ، جب وہ مناجات سے فارغ ہوا تو اس نے گھوڑے پر سوار ہوکر ہلہ بول دینے کا اشارہ کیا۔ صبح سے شام تک جنگ ہوتی رہی جس میں تقریباً بیس ہزار آدمی قتل ہوگئے ۔جام فیروز پہلے ہی گجرات بھاگ گیا تھا اسکے بعد مرتے دم تک وہیں رہا ۔مرزا نے تین دن تک اس مقام پر قیام کیا ، غنیمت میں ، گھوڑے اور جو دوسرا سامان ہاتھ آیا تھا اسے اس نے لپنے آدمیوں میں تقسیم کیا ۔ پھر شہر ٹھٹہ میں منزل انداز ہوا اور وہاں سے تغلق آباد آگیا۔

چھ ماہ بعد وہ ہالا کنڈی کی راہ سے پہلے سیوستان گیا ۔ وہاں دربیلہ کا پرگنہ میر فرخ کو عطا کرکے شکار کھیلتا ہوا " ببرلو " پہنچا جو بکھر سے تین کوس کے فاصلہ پر واقع ہے راہ میں اس نے ہر مقام پر بستیوں اور باشندوں کو مطیع کیا ۔ حدود اباوڑی میں

اس کے لشکر نے ڈھیر اور ماچھی قبائل کو شکست دی اور " اباوڑی " پر قبضہ کیا۔

آخر سنہ ۹۳۰ ھ میں تسخیر ملتان کا ارادہ کرکے پہلے ایک ہفتہ کے لئے وہ سیوی گیا ، وہاں قلعہ کی نئے سرے سے تعمیر کرائی ۔ واپسی میں رند ، مگسی اور بلوچ قبائل کو مطیع کرتا ہوا بکھر آگیا۔ سنہ ۹۳۱ھ میں وہ ملتان کی طرف روانہ ہوا ۔ راستہ میں " سیورائی " کے قلعہ کو تاراج کرکے " قلعہ مئو " کا رخ کیا لیکن قطب العارفین شیخ روح اللہ قدس سرہ کی سفارش پر اس سے درگزر کیا ۔ ملتان کے بہادروں میں سے " رحمو " اور " بندہ ڈھر " خود اسکی خدمت میں حاضر ہوگئے ۔ لانگاہ شہزادے اور بلوچ جو اس کے مقابلہ کے لئے نکلے ، انہیں شکست دے کر اور قلعہ اچ فتح کرکے اس نے اسے مسمار کردیا۔ اس کے بعد ہی سلطان " محمود لانگاہ " بلوچ ، رند ، دودا ، کورائی اور چانڈیہ قبائل کے اسی ہزار بہادروں کو لیکر اس کے مقابل آیا لیکن مرزا نے لانگاہوں سے صلح کرلی اور گھارو واہ کو سرحد مقرر کرکے معتمد افراد کو اچ میں مامور کردیا۔

اس کے بعد اس نے دلاور کے قلعہ پر چڑھائی کی جو شوریدہ زمین پر واقع تھا اور مضبوطی کے اعتبار سے دور دراز کے ملکوں تک مشہور تھا اس نے کچھ ہی عرصہ میں اسکو فتح کرلیا اور اہل قلعہ میں سے اکثر کو قتل و زخمی کرکے باقی ماندہ کو گرفتار کیا اور بے اندازہ زر و مال کے ساتھ پندرہ دن کے اندر بکھر واپس آگیا۔

سنہ ۹۳۲ ھ میں وہ دوبارہ ملتانیوں کی نافرمانی کی وجہ سے ان پر حملہ آور ہوا اور ایک سال کے محاصرے میں کافی قتل و غارت کیا بالآخر شہر فتح ہوا ۔ سلطان محمود لانگاہ کی بیٹی اور بیٹے کو اس نے مسکین ترخان کے حوالہ کیا ، جو ان دونوں کو اپنا جگر گوشہ اور فرزند تصور کرنے لگا ۔ دو ماہ وہاں قیام کرکے اس نے خواجہ شمس الدین کو ملتان پر مامور کیا اور خود بکھر واپس آگیا ۔ کچھ عرصہ بعد نذرانہ کے طور پر ملتان بابر بادشاہ کے حوالہ کردیا اور خواجہ شمس الدین کو بکھر واپس بلالیا ۔ بابر نے ملتان لپنے فرزند کامران کو عطا کردیا۔

اس عرصے میں والی کچھ راؤ کھنگار نے ، جو جام صلاح الدین کی حمایت میں آیا تھا اور شکست کھا کر فرار ہوگیا تھا ، ٹھٹے کی تسخیر کا ارادہ کیا اور شاہ حسن کو خط بھیجا کہ " میرا بھائی آمر آمرانی تمہارے ہاتھوں قتل ہوگیا تھا ، اس کے اقارب ٹھٹے پر حملہ کرنا

چاہتے ہیں لیکن تمہاری غیر حاضری میں خالی ملک پر فوج کشی کرنا جائز نہ تھا لہذا تمہیں اطلاع دی جاتی ہے، اگر تم ولایت ٹھٹہ کا کچھ حصہ مقتول کے ورثا کو دے دو تو بہتر ہے ورنہ ہم آرہے ہیں"۔

مرزا نے جواب لکھ بھیجا کہ "آمر کے خون کا جوش ابھی سرد نہ ہوا ہوگا اس لئے ہم خود تمہاری طرف آرہے ہیں۔یہاں آنے کی تکلیف نہ اٹھاؤ"۔

مورخین کا کہنا ہے کہ مرزا نے خود پہل کرکے اس کو خط لکھا تھا کہ " میں تیرے بھائیوں کا سارا ملک اپنے قبضہ میں کر چکا ہوں تعجب ہے کہ تجھ جیسے غافل نے اس قدر قریب ہونے کے باوجود نہ کوئی تحفہ بھیجا، نہ اطاعت اختیار کی اور نہ اتحاد ہی کی ضرورت محسوس کی ہے۔بہرحال اب ہم گجرات فتح کرنے کا عزم کررہے ہیں۔بہتر ہے کہ خواہ مخواہ خود کو پامال نہ کر، اطاعت قبول کرلے اور کسی تعداد میں کچھ گھوڑے نذرانہ کے طور پر روانہ کر۔دوسری صورت میں جنگ کے لئے تیار رہ"۔

رائے کھنگار کو اپنے لشکر اور بہادروں پر ناز تھا اور وہ اپنے تکبر پر بدستور قائم تھا اس لئے مرزا تیزی کے ساتھ اس کی طرف روانہ ہوگیا مگر کچھ کے قریب پہونچتے ہی لشکر میں رسد کی سخت قلت ہوگئی جس سے سپاہی تنگ دل ہوگئے لہذا صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے مرزا نے فوج کو چار حصوں میں تقسیم کردیا اور حکم دیا کہ ہر حصہ مختلف سمتوں سے کھنگار پر حملہ کرے لیکن ایک دوسرے سے غافل نہ ہو اور خود کو اس طرح اس کے سامنے ظاہر کرے کہ حریف دوسری فوجکے وجود سے بے خبر ہو کر مقابلہ پر آجائے۔

چنانچہ پہلا دستہ "سلطان محمود خان" کی معیت میں بڑھا، دوسرا میر فرخ اور خود مرزا شاہ حسن کی سرکردگی میں تیسرا دستہ شاہ حسن تکدری کی کمان میں اور چوتھا دستہ مرزا عیسیٰ اور میر علیکہ کی سرکردگی میں۔

کھنگار کو جب خبر ملی کہ مرزا شاہ حسن ایک مختصر فوج کے ساتھ جنگ کرنے آرہا ہے تو وہ جنگ کے لئے مستعد ہوکر دس ہزار سوار اور بے شمار پیادے ساتھ لے کر مقابلہ پر آگیا۔سلطان محمود کے دستے کو کھنگار کے آنے کی خبر ملی تو فی الفور اس کی راہ روک کر اس نے مرزا کو اس کی خبر دی اور ایک تیز رفتار قاصد میر فرخ کی طرف

روانہ کیا۔کھنگار کا لشکر گھوڑوں سے اتر کر پیادہ ہوگیا اور چادریں ایک دوسرے سے باندھ کر اور باہم ڈھالیں ملاکر نیزہ بازی شروع کردی۔اس طرف سے مغلوں نے اپنی رسم کے مطابق تیر برسانے شروع کردیئے۔دو تین ساعت جنگ ہوئی ہوگی کہ خدا کی مدد سے غنیم نے صرف سلطان محمود کی فوج سے مکمل شکست کھائی اور فرار ہوتے وقت میر فرخ کی فوج کے ہتے چڑھ کر خونخوار تلواروں کی خوراک بن گیا۔ جب مرزا کے لشکر کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوگئی تو اس نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے اور صبح کے وقت شہروں اور قریوں کو لوٹنے کے لئے لشکر روانہ کیا جو بے شمار اسباب، گھوڑے، قیدی اور مویشی ساتھ لے کر واپس ہوا۔

مرزا کا پٹن پر حملہ

مرزا شاہ حسن کچھ سے مظفر و منصور نہایت شان وشوکت سے واپس ہوا اور ایک عرصے تک سندھ میں آرام وآسائش سے وقت گزارتا رہا۔سنہ ۹۴۲ھ میں جب ہمایوں نے دہلی سے آکر چتور پر حملہ کیا اس موقع پر چتور کے بادشاہ کی سفارش میں سلطان محمود بہادر گجراتی نے اسے ایک سخت خط لکھا، جو ہمایوں کے دل پر گراں گزرا۔وہ یلغار کرکے خود سلطان محمود کے ملک پر حملہ آور ہوگیا اور اسے شکست دی۔ اسی زمانے میں اس نے مرزا شاہ حسن کو بھی پٹن پہنچنے کیلئے لکھا تاکہ شکست خوردوں کی راہ فرار مسدود ہوجائے۔

یہ تحریر موصول ہونے پر مرزا شاہ حسن بسرعت لشکر لیکر نصرپور سے رائدن پور، رادھن پور کے راستے پٹن جا پہونچا۔پٹن کے حاکم خضر خاں کو محصور کرکے اس نے قرب وجوار میں لوٹ شروع کردی۔بکھر کا حاکم سلطان محمود خاں ہراول پر تھا۔اس نے جنید اور "جونہ دھاریجہ" کو خضر خاں کے پاس پٹن بھیج کر پیغام دیا کہ مرزا کی خدمت میں حاضر ہو۔خضر خاں نے جواب دیا کہ "سلطان محمود بہادر کرنال میں صحیح سلامت موجود ہے، میں اس کے حکم کے بغیر قلعہ کس طرح حوالہ کرسکتا ہوں"۔یہ جواب پاکر قاصد اس کی والدہ کے پاس گئے۔آخر پٹن سے لشکر کی چھاؤنی اٹھالینے کے لئے ایک لاکھ فیروزشاہی مرزا شاہ حسن کو، اور تیس ہزار فیروزشاہی سلطان محمود خاں کو نذرانہ دینے کا فیصلہ ہوا۔نذرانہ وصول کرکے مرزا شاہ حسن نے اپنے آنے

کی اطلاع عبدالقدوس کے ذریعہ ہمایوں کی خدمت میں روانہ کی اور خود پندرہ دن تک پٹن کے نواح میں مقیم رہا۔

اس دوران سلطان محمود خاں، محمود آباد تک جاکر تاخت کر چکا تھا اور کثیر مال و متاع لے کر واپس آگیا تھا۔ میر فرخ نے مرزا شاہ حسن کو مشورہ دیا کہ "اگر ہمایوں نے مرزا کو اپنی چھاؤنی میں طلب کیا تو ضرور جانا پڑے گا۔ اندیشہ ہے کہ ارغون، ترخان اور سندھی سپاہی سلطانی سازوسامان اور عطاو بخشش دیکھ کر ہمارا ساتھ نہ چھوڑ دیں اس لئے بہتر یہ ہے کہ کوئی بہانہ بنا کر یہیں سے سندھ واپس لوٹ جائیں"۔

اس تجویز سے متفق ہو کر مرزا حسن نے مرزا قاسم بیگ کے ہاتھ ایک عریضہ بھیجا کہ "شاہی حکم کی تعمیل میں وہ اپنا سارا لشکر لیکر آگیا تھا لیکن ابھی ابھی ٹھٹہ اور بکھر کے امراء کی جانب سے خطوط موصول ہوئے ہیں کہ کلمتی، جتوئی اور دیگر زمینداروں نے سندھ کو خالی دیکھ کر لشکر جمع کر لیا ہے اور ہر طرف لوٹ مار کر رہے ہیں اس لئے مجبوراً میں ادھر واپس جا رہا ہوں"۔

سنہ ۹۴۵ھ کی ابتداء میں وہ رادھن پور کی راہ سے ٹھٹے کی طرف لوٹتا ہوا ٹھٹہ پہنچ گیا۔ سنہ ۹۴۶ھ میں اس نے میر علیکہ ارغون کو گجرات اور بنگالہ کی فتوحات کی مبارکباد دینے کے لئے ہمایوں بادشاہ کے حضور میں بھیجا، اور میر خوش محمد ارغون کو قندھار کی تسخیر کی تہنیت میں مرزا کامران کی خدمت میں روانہ کیا۔ میر علیکہ نے شاہی چھاؤنی سے بغیر اجازت واپس آکر مرزا شاہ حسن سے کہا کہ "بادشاہ کی لاپرواہی سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ عنقریب کوئی غنیم اس پر حملہ آور ہو جائے گا اسی لئے میں فوراً واپس چلا آیا" اور ہوا ایسا ہی، کچھ ہی دنوں بعد شیر خاں نے ہمایوں پر حملہ کر دیا۔ ہمایوں کے شکست کھا جانے کی خبر سندھ پہنچی تو مرزا شاہ حسن نے میر علیکہ کی دور اندیشی پر آفرین کی اور مجلس مشاورت طلب کی۔ اس میں اچ سے لیکر بکھر تک دریا کے دونوں کناروں کو ویران اور برباد کر دینے کا فیصلہ ہوا۔

(۵۵)

ہمایوں کی سندھ میں آمد

شعبان سن ۹۴۷ھ کے آخر میں ہمایوں کا لشکر اچ پہونچا۔ وہاں بخشو لانگاہ بذات خود حاضر نہ ہوا البتہ لشکر کے خرچ کے لئے غلہ کی کچھ کشتیاں بھیج دیں۔

۲۸ رمضان کو شاہی لشکر، نے روھڑی میں پڑاؤ ڈالا اور ببرلو کا "چار باغ"، جو فرحت و نظارہ کے اعتبار سے آپ اپنا جواب تھا، بادشاہ ہمایوں کی اقامت گاہ بنا۔ سلطان محمود خاں نے قلعہ کو مستحکم کر کے ساری کشتیاں منگوا کر اپنی طرف لنگر انداز کرائیں۔ بادشاہ نے حاضر ہونے کے لئے حکم بھیجا تو اس کے جواب میں اس نے عرض کیا کہ "میں مرزا شاہ حسن کا نمک خور ہوں جب وہ حکم دے گا، قلعہ حوالہ کروں گا" لیکن شاہی لشکر گاہ میں غلہ کی قلت کا حال سن کر اس نے تقریباً پانچسو خرار غلہ بھیج کر حق خدمت ادا کیا۔ یہ خدمت پسند کی گئی۔

بادشاہ نے امیر طاہر صدر اور سمندر بیگ کی معرفت مرزا شاہ حسن کو پیغام بھیجا۔ مرزا نے قاصدوں کا شایان شان استقبال کیا اور اقرار کیا کہ حضرت کے تشریف فرما ہونے پر ہالہ کنڈی سے لے کر بٹھورہ تک دریا کے اس پار والے مواضعات حرم سرا کے اخراجات کے لئے حوالہ کر دے گا اور عہد و اقرار پختہ کرنے کے بعد حاضری کا شرف حاصل کرے گا، پھر اپنی کل فوج سمیت ہمرکاب رہتے ہوئے گجرات فتح ہونے کے بعد ہی واپس آئے گا۔

ترخانوں نے مرزا شاہ حسن کے اس انداز کو ٹال مٹول پر محمول کیا اور بکھر کا محاصرہ کر لیا پھر یادگار مرزا کو بکھر میں چھوڑ کر سیوستان کا عازم ہو گیا لیکن ہمایوں کے پہنچنے سے قبل شاہ محمود ارغون وغیرہ نے آس پاس کی عمارتیں منہدم کر کے چاروں طرف خندقیں کھدوا رکھی تھیں اور کشتیاں بھی جمع کر لی تھیں۔

ایسا ہی کچھ انتظام ٹھٹھہ میں بھی کیا گیا۔ ہمایوں نے بہت کوشش کی مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس اثناء میں راجہ جودھپور نے اپنی طرف آنے کی دعوت دی اور وہ سندھ سے جودھپور کا عازم ہو گیا لیکن یہ سراسر فریب تھا لہٰذا ہمایوں راستہ بدل کر جیسلمیر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اسی سفر میں عمر کوٹ کے مقام پر اکبر کی ولادت ہوئی۔

مرزا شاہ حسن نے ہمایوں کے جانے کے بعد تمام مقامات پر پھر قبضہ کرلیا اور جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی اسکو درست کرالیا۔

سنہ ۹۵۵ ھ میں مرزا کامران ہزارہ سے سندھ پہنچا۔ مرزا شاہ حسن نے اپنی بیٹی اسکو بیاہ دی۔ اسکے کچھ ہی دنوں بعد ہمایوں نے کامران کو اندھا کردیا۔

کہتے ہیں کہ مرزا شاہ حسن نے برے وقت میں ہمایوں سے بدسلوکی کی تھی اور ارغونوں اور ترخونوں پر مظالم ڈھائے تھے لہذا وہ فالج میں مبتلا ہوگیا۔

۹۶۲ ھ میں مرزا عیسیٰ ترخان نے امراء کو ملاکر مرزا شاہ حسن کو ہٹانے کی سازش کی۔ مرزا حسن بے دست و پا ہوچکا تھا۔ انجام کار مرزا عیسیٰ اور محمود خان نے سندھ کو آپس میں نصف نصف بانٹ لیا اور ٹھٹھہ و بکھر کی دو حکومتیں وجود میں آگئیں اور مرزا حسن ان دونوں کے رحم و کرم پر زندہ رہا۔ اس نے ۶۶ سال کی عمر پائی اور ۳۴ سال حکومت کی۔

مرزا شاہ حسن ایک سخت گیر حکمراں تھا مگر نہایت شجاع اور باہمت مورخین اسپر ہمایوں سے بیوفائی کا الزام لگاتے ہیں مگر امور مملکت میں وفا کے معنی کبھی متعین نہیں ہوسکے۔ مرزا شاہ بیگ نے اپنے زور بازو پر اقتدار حاصل کیا اور مرزا شاہ حسن اس کا جانشین تھا۔ ربط قدیم کو ملحوظ رکھ کر مرزا حسن نے اپنی خوشی سے بابر کا خطبہ جاری رکھا تھا جو امرائے سلطنت کی مرضی کے خلاف تھا۔ اب وہ ایسا تو نہ کرسکتا کہ اپنی سلطنت ہمایوں کے حوالے کردیتا اور خود اس کا دست نگر بن کر رہ جاتا۔ یہی سلطنت ہی تو تھی جسکے لئے ہمایوں نے اپنے بھائی کامران کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروادی تھیں۔

چند لفظوں میں مرزا شاہ حسن پر تبصرہ کیا جائے تو وہ سندھ کا عظیم حکمراں تھا۔ خود بھی عالم و فاضل تھا اور علماء و فضلا اور سادات کی عزت کرتا تھا۔ اس کا شمار ہمیشہ سندھ کے بڑے فرمانرواؤں میں کیا جائے گا۔

ترخان دور

مرزا عیسیٰ خان اول ۹۶۲ ھ میں تخت پر بیٹھا، ۹۷۳ ھ میں وفات پاگیا۔ اسکے

تین بیٹے بقید حیات رہے جن میں سے مرزا محمد صالح نے بغاوت کرکے مرزا محمد باقی اور چھوٹے بھائی مرزا جان بابا کو جلاوطن کردیا اور مرزا عیسیٰ کو نظربند کردیا آخر مرید بلوچ نامی شخص نے ذاتی دشمنی کی بناپر مرزا صالح کو قتل کردیا تو مرزا باقی واپس آگیا

اس کا دور حکومت بارہ سال رہا۔ اس درمیان ایک مرتبہ وہ بکھر گیا ہوا تھا تو گوا کے بندرگاہ سے نکل کر فرنگی ٹھٹھہ پر حملہ آور ہوگئے۔ انہوں نے پورے شہر اور حویلی کو تباہ کردیا۔ واپسی پر مرزا عیسیٰ نے ٹھٹھہ کو سمندر سے ملانے والی نہر میں پتھر ڈلوا کر کشتی چلانے کے قابل نہیں رکھا اور شہر کو محفوظ کردیا۔

مرزا باقی

مرزا عیسیٰ کے بعد ٹھٹھہ کا حکمران ہوا۔ وہ حد درجہ بخیل اور جزرس تھا اور ظالم بھی۔ کئی عالموں اور مشائخ کو اس نے قتل کرادیا اور خزانہ بھرنے کیلئے رعایا کو بہت ستایا لوگ اسکی مملکت سے ترک وطن کرگئے۔ ۹۹۳ ھ میں اپنے بیٹے شاہرخ کی موت پر اسکو اتنی پشیمانی ہوئی کہ خود اپنے کو ہلاک کرلیا۔ اس کا بیس سالہ دور سندھ کیلئے سیاہ ترین دور تھا۔ مرزا جان بابا اس کا چھوٹا بھائی تھا، اسکو اس نے قتل کرادیا تھا۔ اس کا بیٹا پائندہ بیگ اسکی زندگی ہی میں جانی بیگ کو اپنی یادگار چھوڑ کر مرگیا تھا جو دادا کے بعد تخت نشین ہوا۔

مرزا جانی بیگ

۹۹۳ ھ سے وہ دادا کے مظالم کا کفارہ ادا کرتا رہا۔ اس نے علم دوستی اور فیاضی کی وہ روایات قائم کیں کہ جلد ہی لوگ مرزا باقی کے عہد کو بھول گئے۔

اسکے عہد میں ٹھٹھہ کے نئے دور کا آغاز ہوا کہ اکبر اعظم کے حکم پر عبدالرحیم خانخانان نے ٹھٹھہ کا محاصرہ کرلیا۔ جانی بیگ سے مغل فوجوں کے کئی معرکے ہوئے جن میں اہل سندھ نے شکست کھائی۔ سنہ ۱۰۰۱ ھ میں جانی بیگ نے مغلوں کی اطاعت کرلی۔ اکبر اعظم نے اسے منصب جلیل سے سرفراز کیا۔ سندھ مغل حکومت کا حصہ بن گیا اور جانی بیگ کا کمسن بیٹا ٹھٹھہ کا گورنر بنادیا گیا۔ (غازی بیگ)

سلطان محمود بھکری

مرزا شاہ حسن کے بعد وہ بھکر پر قابض ہوگیا تھا مگر بہت سفاک حکمران تھا۔

مرزا عیسی سے اسکی کئی لڑائیاں ہوئیں پھر صلح ہو گئی۔ اکبر اعظم کو بھکر کے حالات کا علم ہوا تو اس نے محب علی خاں کو متعین کیا جس نے اس کا نصف سے زائد علاقہ فتح کر لیا۔ اسپر محمود خاں نے اکبر کو لکھا کہ محب علی خاں کے علاوہ کسی اور کو بھیجا جائے تو بھکر حوالے کر دے گا۔ اکبر نے گیسو خاں کو روانہ کیا لیکن اس سے قبل محمود خاں بیس سال حکومت کر کے مر گیا اور ۹۸۲ھ میں بھکر سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گیا۔

سندھ کے مغل گورنر

مرزا غازی بیگ

خسرو خاں، مرزا احمد بیگ اور بندو خاں اکبر کی طرف سے اسکے اتالیق تھے۔ آٹھ سال تک اس نے بڑی کامیاب حکومت کی۔ رعایا بھی اسکے عہد میں مطمئن اور خوشحال رہی۔ ۱۰۱۳ھ میں اسکو پنج ہزاری منصب ملا۔ پھر دور جہانگیری میں مزید اعزاز سے نوازا گیا۔ ۱۰۲۱ھ میں کسی نے اسکو زہر دیدیا۔ منتظم، شجاع، علم پرور تھا اور خود بھی بہت اچھا شاعر تھا۔

مرزا عیسیٰ خان ترخان دوم

عیسیٰ خان اول کے بیٹے جان بابا کا بیٹا تھا، ۱۰۱۳ھ میں دربار اکبری میں پہنچا مختلف صوبوں کا گورنر رہا، ۱۰۳۸ھ میں ٹھٹھہ آیا، نو ماہ کے بعد پہلے گجرات پھر دکن بھیجدیا گیا۔ یہ زمانہ جہانگیر کا تھا پھر عہد شاہجہانی میں مختلف عہدوں پر فائز رہا، ۱۰۶۲ھ میں طویل عمر پاکر وفات پائی۔

سندھ مرزا غازی بیگ کے عہد میں مغلوں کے قبضے میں آیا۔ اس وقت سے گورنری ترخانی خاندان کی رہی۔ انکی نیابت میں مغل امراء کام کرتے رہے۔ دور اکبری میں شاہرخ مرزا اور خسرو چرکس، عہد جہانگیری میں ۱۰۰۹ھ سے ۱۰۲۱ھ تک غازی خان ترخان کی نیابت میں مرزا عیسیٰ خان، بندو خان اور خسرو خاں چرکس کام کرتے رہے۔ پھر مرزا عیسیٰ خاں کا زمانہ آیا اس لئے مغل گورنر با اختیار ہو گئے۔

مرزا عبدالعلی ترخاں، مرزا رستم قندھاری، تاج خاں، ارسلان بیگ، میر عبدالرزاق گورنر رہے۔ مرزا شاہ بیگ ارغون، سید بایزید بخاری، سید ابراہیم، شریف الملک اور مرزا ابو سعید ان کے بعد متعین ہوے۔ پھر عہد شاہجہانی میں عیسیٰ

ترخاں کے بعد سید بادشاہ، مرتضیٰ خاں، میر ابو البقا امیر خاں، یوسف محمد خاں، دولت خاں خواص، غیرت خاں، مغل خاں، میر ابو البقا بار دوم، عالمگیر، سعید خاں جعفر خاں مغل خاں سردار خاں اور ظفر خاں احسن گورنری کے عہدے پر فائز ہوئے۔

عہد اورنگزیب میں قباد بیگ اوزبک، لشکر خاں، غضنفر خاں، عزت خاں، ابو النصر خاں، سعادت خاں، کفایت خاں، سید عبدالرزاق، خانہ زاد خاں، سردار خاں، مرید خاں، ابو النصر خاں، نواب حفظ اللہ خاں، سعید خاں، یوسف خاں احمد یار خاں سندھ بھیجے گئے۔

اورنگزیب کی وفات کے بعد سعید خاں، مہین خاں، شاکر خاں اور مہین خاں متعین ہوئے پھر یکے بعد دیگرے بارہ صوبہ دار دہلی سے آئے اور سندھ کا نظم و نسق دیکھتے رہے مگر مغلیہ سلطنت کے کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ سندھ میں بھی حکومت کی باگ ڈھیلی پڑتی رہی۔

۱۱۴۳ھ میں نواب دلیر خاں سندھ کا صوبہ دار ہوا۔ وہ دو سال رہا۔ اسکے بعد صوبہ ٹھٹھہ عمدۃ الملک امیر خاں کو اجارہ داری پر بطور انعام دیا گیا۔ ۱۱۴۵ھ میں دلیر خاں کے بیٹے نے امیر خاں سے پٹے پر لے لیا اور چار سال تک اس کا انتظام سنبھالتا رہا اس مدت کے بعد ۱۱۴۵ھ میں نواب صادق علی خان نے اجارے پر امیر خاں سے لے لیا۔ دو سال بعد نور محمد کلہوڑا کے وکیل شیخ غلام محمد نے لے لیا اور اسکے بعد مغل حکومت ختم ہو گئی اور کلہوڑا دور کا آغاز ہوا۔ جسکے پہلے فرمانروا نور محمد کے والد یار محمد تھے جنکو معمار اول کی حیثیت حاصل ہے۔

ارغونوں کی حکومت سے آخری مغل صوبہ دار تک سندھ کا جائزہ لیا جائے تو ترخانوں تک سب شیعہ مسلک کے لوگ تھے اور مغل صوبہ داروں میں بھی بعض یہی عقیدہ رکھتے تھے، باقی سنی المسلک۔ کلہوڑے سارے کے سارے حنفی العقیدہ تھے، بعض روادار اور بعض بہت کٹر ان میں اثنا عشریوں کی بھی ایک تعداد تھی جن میں بعض نو شیعہ تھے اور بعض کا آبائی مسلک یہی تھا لیکن اہل سندھ میں وطنیت ہمیشہ سے غالب رہی لہذا عقیدے کو بہت کم اہمیت دی گئی۔ مجموعی طور پر کلہوڑا عہد پچھلے ادوار کے مقابلے پر صبر آزما رہا۔

کلہوڑا دور حکومت

یہ خاندان نسلی طور پر عباسی تھا جسکے اسلاف ۲۵۹ھ میں سندھ آئے ۔ پھر دوسرے لوگ مختلف سنین میں پہنچتے رہے ۔ چونکہ یہ لوگ کلورا نام کے پہاڑ پر مقیم ہوئے تھے لہذا پہلے کلورا کہلائے پھر کلہوڑا بن گئے ۔ دوسرے قبیلوں کی طرح یہ خاندان بھی طالع آزمائی کرتا رہا مگر سندھ میں اسکی حیثیت اس وقت سے موثر ہوئی جب اس نے صوبہ ٹھٹھہ کی حکومت ٹھیکے پر لی اور یہی سندھ میں اسکی حکومت کا نقطہ آغاز ہے ۔

۱۱۲۳ھ میں میاں نور محمد کو استقرار حکومت میں پہلے اپنوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا پھر دوسرے مدمقابل ہوئے لیکن اس نے زور بازو سے ہر مشکل کو آسان بنالیا اور اسی دوران سلطنت دہلی سے رابطہ قائم کر کے سند حکومت حاصل کرلی پھر داؤد پوتوں سے جنگ ہوئی جو عباسیوں ہی کی ایک شاخ تھے اسکے بعد بروہیوں سے لڑنا پڑا جو قلات کے حکمراں تھے ۔

ہندوستان پر نادر شاہ کے حملے سے سندھ بھی محفوظ نہ رہا ۔ میاں نور محمد اس سے ایک ٹکر بھی نہ لے سکتا تھا لہذا مجبوراً اسکو اطاعت کرنا پڑی ۔ محرم ۱۱۵۳ھ میں نادر شاہ لاڑکانہ میں تھا ۔ یوم عاشور گزار کر ۱۱ محرم کو وہ قندھار روانہ ہو گیا ۔

چلتے وقت اس نے سندھ کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا: سبی اور کچھ محبت خاں والی قلات کو، شکار پور داود پوترہ کو دیا اور بقیہ سندھ نور محمد کلہوڑہ کیلئے چھوڑ دیا اور نور محمد کے دو بیٹوں کو ساتھ لے گیا جو اسکے قتل کے بعد سندھ واپس ہو سکے ۔

میاں نور محمد نے اسکے جانے کے بعد ملک پر قابو حاصل کرلیا کہ احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا ۔ نور محمد نے اسکو بھی جھیلا اور ۱۲ صفر ۱۱۶۷ھ میں وفات پائی ۔ بڑا منتظم، اولوالعزم، علم دوست اور رعایا پرور حکمراں تھا ۔ عقیدے میں حنفی تھا لیکن اپنے بیٹوں کیلئے جو وصیت نامہ چھوڑا ہے، اس میں لکھا ہے "اہل بیت کی محبت ہمیشہ یکساں اور ہر وقت ہونا چاہیئے اور ذوی القربیٰ کی محبت فرض عین اور عین فرض ہے" ۔ اس نے بلا تفریق مذہب و مسلک بڑے بڑے علماء و شعراء اپنے دربار میں جمع کیے تھے ۔

محمد مرادیاب خاں

۱۱۶۷ھ میں باپ کے بعد تخت نشین ہوا ۔ وہ ایک صوفی منش آدمی تھا ۔ بہت جلد اس نے ایک بڑا حلقہ ارادت پیدا کرلیا جس میں فقراء، بلوچ اور جاٹ سب شامل تھے ۔ اسپر امرائے سلطنت سے اختلاف پیدا ہوا اور مرادیاب نے کسی خطرے کے پیش نظر اپنا خزانہ مسقط منتقل کرنا شروع کر دیا جس پر عمائدین نے باہمی صلاح و مشورہ سے اسکو معزول کر دیا اور ۱۱۷۰ھ میں اسکے بھائی میاں غلام شاہ کو تخت نشیں کر دیا ۔

میاں غلام شاہ

اس نے خداباد نام کا ایک شہر بسا کر اسکو دارالحکومت قرار دیا مگر اسکے بھائی احمد یار خان نے اسکی بادشاہت کو تسلیم نہیں کیا اور دوسرا بھائی محمد عطر خان احمد شاہ ابدالی سے حکومت سندھ کی سند لے آیا ۔ غلام شاہ پہلے جیسلمیر پھر بیکانیر گیا اور وہاں سے بہاولپور کے رئیس محمد مبارک خاں کے پاس پہنچ گیا ۔ پھر اسکی مدد لیکر سندھ آگیا ۔

روہڑی میں اس سے دونوں بھائیوں کے لشکر کا مقابلہ ہوا جس میں غلام شاہ کامیاب ہوا اور ایکبار پھر بھائیوں میں سندھ کی تقسیم ہو گئی لیکن غلام شاہ نے ہر شورش کو دبا دیا اور ہر جنگ میں فتح حاصل کی اسپر اسکو افغانستان کے دربار سے خطابات عطا ہوئے ۔ اسکو نظم و نسق کا شعور اور تعمیرات کا بڑا ذوق تھا دریائے سندھ کے کنارے نیرون کوٹ کے مقام پر ذی قعد ۱۱۸۲ھ میں اس نے ایک شہر آباد کیا جس کا نام حیدرآباد رکھا ۔ جمادی الاول ۱۱۸۶ھ میں سولہ سال کامیاب حکومت کر کے اس کا انتقال ہو گیا ۔

رعب و دبدبہ کے لحاظ سے وہ سندھ کا بڑا حکمراں تھا مگر مخدوم محمد ہاشم کی تحریک پر اس نے جلوس ماتم اور تابوت نکلنے پر پابندی عاید کی تھی ۔

میاں محمد سرفراز خان

غلام شاہ کا یہ بیٹا ۱۱۸۶ھ میں تخت نشین ہوا ۔ اس نے نظم حکومت سنبھالنے کے بعد ۱۱۸۸ھ میں کچھ کو مسخر کیا ۔ تالپروں سے اسکے خاندان کا بڑا پرانا رابطہ رہا تھا ۔

میاں یار محمد کے وقت میں میر شہداد اس کا دست راست تھا۔ اسکے تین بیٹے تھے۔ میر جام نندو، میر چاکر اور میر بہرام۔ یہ سب نور محمد کلہوڑا، مرادیاب خاں اور غلام شاہ کے ادوار میں بڑی دیانت سے خدمات کی بجاآوری کرتے رہے تھے لیکن سرفراز خان کو درباریوں نے بہرام خاں کے خلاف کر دیا جس میں تاجہ اللہ بخش لیکھی پیش پیش تھا۔ بہرام خان کو ان حالات کا علم ہوا تو اس نے اطاعت کو بغاوت پر ترجیح دی اور اپنے بیٹے میر بجار کو حج کے بہانے سے ہٹادیا۔ میر صوبدار باپ کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوا۔

آخر ایک دن وہی ہوا۔ میر بہرام کو بہانے سے بلایا گیا اور اس کا سر اتار لیا گیا بیٹے نے باپ کا یہ عالم دیکھا تو خنجر نکال کر تاجہ لیکھی کے پیٹ میں گھونپ دیا وہ تو بچ گیا لیکن صوبدار خاں خود قتل ہو گیا۔

میروں کو اپنے اخلاق اور حسن سلوک سے "برمکیوں" کی سی حیثیت حاصل تھی۔ وفاداروں کے قتل ناحق پر سرفراز خاں کے خلاف عام نفرت پھیل گئی اور میروں کے خاندان والے تو جوش انتقام میں دیوانے ہو گئے۔ بہرام کے چچیرے بھائی میر فتح خان نے ٹالپروں اور بلوچوں کو جمع کیا اور خداباد پر ہلہ بول دیا۔ ظالم بہت بزدل ہوتا ہے۔ سرفراز بدحواس ہو کر صرف چند ساتھیوں کے ساتھ پاپیادہ بھاگ نکلا اور حیدرآباد پہنچ کر دم لیا۔

خداباد پر قبضہ کر کے میر فتح خاں نے پرانے روابط کو ملحوظ رکھا اور سرفراز کے چھوٹے بھائی محمود خاں کو ۱۱۸۹ھ میں تخت پر بٹھادیا۔

میاں محمود خاں

میر فتح خاں میر بجار کو سربراہ خاندان سمجھتا تھا لہذا جب راجہ لیکھی نے خزانے کنجیاں اسکو پیش کیں تو اس نے انتظار کرنے کو کہا جس سے تاجہ لیکھی نے فائدہ اٹھایا۔ میاں محمود خاں کو ایک مقام پر لے جاکر قید کر دیا اور اسکی جگہ نور محمد کے بیٹے غلام نبی کو حکمراں بنادیا۔

میاں غلام نبی

غلام نبی کو تخت نشیں ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ میر بجار حج سے

واپس ہوا۔ کراچی کی بندرگاہ پر اتر کر وہ قلات آیا جہاں محمد نصیر خاں والی قلات نے اس کا استقبال کیا اور اسکی مدد کیلئے ایک فوج تیار کی۔ اسپر میر بجار نے کہا۔

"میرے لئے باعث شرم ہے کہ میں اپنے ہی ملک پر فوج لیکر چڑھائی کروں!

"میں نے خدا سے مدد چاہی ہے۔ پنجتن پاک میرے مددگار و ناصر ہیں۔ تم تو صرف میرے لئے دعا کرو اور مجھے خدا کے حوالے کرو!" (۵۶)

اس سے رخصت ہو کر میر بجار سندھ پہنچا تو اس کا بیٹا میر عبداللہ میر فتح خاں میر فتح علی خاں، میر غلام علی، میر سہراب، امیر محمود خاں، میر [illegible] یار اور میر ٹھارہ خاں وغیرہ نے اسکے لئے آنکھیں بچھادیں۔ وہ سب کے سب فوراً کلہوڑوں پر حملہ کر دینے کے حق میں تھے مگر میر بجار نے توقف سے کام لینے کی ہدایت کی۔ اسکے بعد میاں غلام نبی کا فرمان پہنچ گیا کہ اگر وہ جنگ کرنا چاہتا ہے تو آگے بڑھے ورنہ اپنا راستہ لے۔

کہا جاتا ہے کہ تاجہ لیکھی، اسکے بیٹے اور افراد و اقربا میاں غلام نبی پر چھائے ہوئے تھے، انہیں نے یہ فرمان میر بجار کے نام بھجوایا تھا۔ بالفاظ دیگر اسکو للکارا تھا۔ میر بجار نے پھر بھی کسی جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ عمر کوٹ کی طرف روانہ ہوا اور قلعہ پر قابض ہو گیا۔

تاجہ لیکھی غلام نبی کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ لیکر بڑھا اور ایک شخص اللہ بخش جھنجن کو بھیج کر میر بجار سے کہلوایا کہ میاں غلام نبی اس سے لڑنا نہیں چاہتا وہ قلعہ سے باہر نکلے تو دونوں میں صلح ہو جائے گی۔ میر بجار خود صلح پسند آدمی تھا وہ اسکے فریب میں آگیا اور اپنے ساتھیوں کو لیکر قلعہ سے باہر آکر مقیم ہو گیا مگر دو ماہ گزر جانے کے باوجود کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔

بات یہ تھی کہ قلعہ کا فتح ہونا آسان نہ تھا لہذا تاجہ لیکھی نے اس ترکیب سے میروں کو باہر بلالیا تھا جسکو بہت دیر میں میر بجار سمجھ سکا۔ تاجہ لیکھی تیس ہزار کا لشکر لیکر آیا تھا جسکے مقابلے میں چھ ہزار کی کچھ حقیقت نہ تھی لیکن میروں کے سپاہی ایک مقصد کیلئے لڑنے آئے تھے انہوں نے تیس ہزار کو کاٹ کر رکھ دیا۔

میاں غلام نبی نے جب شکست کو یقینی دیکھا تو میر بجار کے پاس قرآن بدست آدمی بھیجا کہ وہ تاجہ لیکھی کے ہاتھوں مجبور ہو کر آیا تھا اسکی خبر تاجہ لیکھی کو

ہو گئی اور وہ میاں غلام نبی کو قتل کر کے فرار ہو گیا۔

میر بجار نے بڑے شان و شکوہ سے میاں غلام نبی کا جنازہ حیدرآباد بھجوایا اور مفتوحین کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔

میاں غلام نبی ایک عالم و فاضل، فیاض، غریب نواز، شاعر اور ادب پرور حکمراں تھا مگر قسمت کا ہیٹا تھا، عمر بھر دشمنوں کے چنگل میں گرفتار رہا اور آخر میاں سرفراز کی ناعاقبت اندیشی کی بھینٹ چڑھ گیا۔

میاں عبدالنبی

میاں غلام نبی کا تابوت حیدرآباد پہنچنے پر میاں نور محمد کا چھوٹا بیٹا عبدالنبی ۱۱۹۰ھ میں تخت نشین ہو گیا۔ میاں بجار نے اسکو ہالہ کندی بلوا کر اسکی حکومت کو تسلیم کر لیا اور نظام سلطنت خود سنبھال لیا۔

سندھ کے حالات کی خبر پا کر احمد یار خاں کا بیٹا عزت یار افغانستان سے ایک بڑا لشکر لے کر سندھ پر حملہ آور ہوا اور لکھی اور شکارپور کے درمیان میر بجار سے شکست یاب ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ کو اسکی خبر ملی تو وہ ایک لشکر ذخار کے ساتھ سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔

میر بجار کو اس سے ایک پریشانی لاحق ہوئی پھر بھی اس نے ہوش و حواس برقرار رکھے۔ میاں عبدالنبی کو لے کر وہ روہڑی آیا اور دریا پر کشتیوں کا ایک پل بنوادیا پھر اس نے ایک عریضہ تیمور شاہ کو روانہ کیا کہ آپ کے بھیجے ہوئے افغانوں نے سندھ کے حکمراں کے ساتھ ہتک آمیز برتاؤ کیا۔ انکی عزت آپ ہی کی دی ہوئی ہے۔ اس لئے ان سے لڑنا پڑا۔ آپ آنا چاہتے ہیں تو روہڑی میں دریا پر کشتیوں کا پل بنوادیا گیا ہے تاکہ لشکر کو عبور کرنے میں دشواری نہ ہو۔

اس خط کے پہنچنے سے تیمور شاہ کچھ نرم پڑا پھر میر بجار خود تیمور شاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور ایسی چکنی چپڑی باتیں کیں کہ تیمور شاہ نے عبدالنبی کو سندھ کی حکومت عطا کی اور افغانستان واپس ہو گیا۔

یہ میر بجار کا کارنامہ تھا اور صرف اسی پر موقوف نہیں، سندھ کیلئے اسکی خدمات ناقابل فراموش تھیں۔ میاں عبدالنبی کو اس نے کسی قیدی بادشاہ کی طرح

نہ رکھا تھا بلکہ وہ ہر لحاظ سے آزاد تھا۔ میر بجار کوئی کام اسکے مشورے کے بغیر نہ کرتا اور خود اس کا سلوک عوام کے ساتھ بیٹوں جیسا تھا۔ ہر چھوٹا، بڑا اس کا گرویدہ تھا اور اہل خاندان تو اسکے فدائی تھے۔

میروں کے خاندان کا حفظ مراتب اور انسان دوستی ہمیشہ سے ضرب المثل رہی تھی اور انہیں اوصاف کی بنا پر ہم عصر علماء اور درباری ان سے خار کھاتے رہے تھے۔ ایسے ہی کچھ حالات تھے جن میں میر بہرام خاں قتل ہوا، اب بیٹے نے باپ کی جگہ لی تھی تو وہ بھی ویسی ہی صورت حال سے دوچار تھا۔ آخر عبدالنبی نے مسلسل کان بھرے جانے کے بعد اسکو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا اور اتنی احتیاط کی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔

میر بہرام خاں بھرے دربار میں مارا گیا تھا، میر بجار کو حیلہ کر کے الگ بلایا گیا اور اچانک کئی آدمیوں نے اسپر تلوار کے بھرپور وار کر دئے اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

قتل کی خبر پھیلتے ہی سارے شہر میں کہرام برپا ہو گیا۔ ہر شخص اسکو اپنے کسی بزرگ کی موت کے مترادف سمجھتا۔ عورتیں تو دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ سندھ کی سرزمین نے ایسے بہادر، مدبر اور فرشتہ خصلت انسان کم ہی پیدا کئے تھے۔

میر فتح خان نے تجہیز و تکفین کے انتظامات کیے میر عبداللہ بن میر بجار باہر گیا ہوا تھا اسکے آنے پر سب نے اسکو سربراہ خاندان بنالیا۔ اس نے لوگوں کے کہنے کے باوجود عبدالنبی کو قاتل قرار نہیں دیا مگر خود عبدالنبی کے دل میں چور تھا۔ اس نے اپنے بیٹوں کو جودھ پور بھیجدیا اور خود جھنجن اور جتوئی قبیلے کے آدمیوں کو لیکر قلات کی طرف بھاگ گیا جسکے بعد وجہ قتل اور دست قاتل دونوں روشنی میں آگئے۔

میر عبداللہ نے پھر بھی عبدالنبی کے بجائے بعض اہل دربار کو قتل کا ذمہ دار ٹھہرا کر عبدالنبی کو بلوانے کی کوشش کی مگر وہ مجرم تھا لہذا مارے ڈر کے نہیں آیا اور میر عبداللہ نے اسی خاندان کے ایک شخص صادق علی عباسی کو تخت پر بٹھا دیا۔

صادق علی خان

یہ فقیر صفت آدمی تخت نشین ہوا ہی تھا کہ عبدالنبی کی تحریک پر ایک طرف مہاراجہ جودھ پور کا لشکر، دوسری طرف سے قلات کی فوجیں سندھ پر چڑھ دوڑیں۔ میر عبداللہ نے پہلے جودھ پوری لشکر کی طرف پیش قدمی کی اور فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور چوتھا حصہ سب کے آگے رکھا جس میں میر فتح خاں، میر فقیر اور اس کا بیٹا باغہ فقیر تھے اور فوج زیادہ تر نظامانیوں، لغاریوں اور جمالیوں پر مشتمل تھی۔

جودھپوری بڑے طمطراق سے آئے تھے مگر میر فتح علی خاں نے میسرے پر اتنے زور کا حملہ کیا کہ راٹھوروں کے پاؤں اکھڑ گئے اسکے بعد دوسرے حصوں کی یلغار میں جودھ پوری جنس، خیمے، توپیں، اونٹ اور ہاتھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس عرصے میں بروہی لشکر لاڑکانہ سے آگے بڑھ کر قریب پہنچ چکا تھا۔ اس لشکر میں خود عبدالنبی اور محمد نصیر کا داماد زرق خاں موجود تھا۔ میر عبداللہ جانتا تھا کہ یہ لشکر زیادہ جاندار ہے لہذا اسکے مقابلے کیلئے لشکر کی ترتیب میں اس نے بڑی احتیاط سے کام لیا اور افسران فوج کو بعض ہدایات بھی دیں۔

پل چالک کے قریب اہل سندھ کا اس سے ٹکراؤ ہوا۔ ایک ہولناک معرکہ پیش آیا اور لاشوں پر لاش گرنے لگیں۔ آخر خود میر عبداللہ نے قلب پر اتنا زبردست حملہ کیا کہ زرق خاں کو سنبھلنا مشکل ہو گیا مگر اس نے میدان نہ چھوڑا آخر وہ لڑتا ہوا مارا گیا۔

یہ فتح میر عبداللہ کی عظیم فتح تھی جسکے بعد سندھ پر اسکی دھاک بیٹھ گئی۔

عبدالنبی میدان جنگ سے قلات پہنچا پھر افغانستان جاکر تیمور شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس زمانے میں افغانستان کا ایک سردار مددخاں اسحٰق زئی محمد بہادر کے ملک میں آیا ہوا تھا۔ عبدالنبی محمد نصیر کے واسطے سے اسکے پاس پہنچا اور تیمور شاہ کا فرمان اسکو پہنچایا جس میں عبدالنبی کی مدد کا حکم دیا گیا تھا۔ مددخاں نے اخراجات لشکر کا سوال اٹھایا تو عبدالنبی نے سندھ میں لوٹ مار کا راستہ دکھا دیا۔

میر عبداللہ سرزمین سندھ کی غارت گری اور سندھیوں کی خونریزی پر تڑپ اٹھا۔ اس میں افغانستان کے اتنے بڑے لشکر سے متصادم ہونے کی طاقت نہ تھی مگر وہ سندھ کی تاراجی بھی برداشت نہ کر سکتا اس لئے اس نے میر اور بلوچ سرداروں کو جمع کیا، انہیں حمیت اور غیرت دلائی تو وہ جذبہ وطنیت سے بے چین ہو گئے اور سب لڑنے کیلئے تیار ہو گئے۔

اسکی خبر مددخاں کو پہنچی تو اس نے میر عبداللہ کو خط لکھا کہ وہ لڑنا نہیں چاہتا۔ بادشاہ کو لکھے گا، جیسا جواب آئے گا اسپر عمل کیا جائے گا۔ میر عبداللہ نے اس کا بڑا نرم جواب دیا پھر مددخان قسم پوری کرنے کیلئے دریائے [illegible] رستے خدا باد پہنچ گیا جہاں اس نے عبدالنبی سے خزانہ مدفون کا پتہ دریافت کیا اور وہ جب کچھ بتا نہ سکا تو اس نے پہلے سے کہیں زائد لوٹ کھسوٹ شروع کر دی۔

اسکی اطلاعات میر عبداللہ کو ہوئیں تو اس نے مزید جنگی تیاری شروع کر دی اور مددخاں کو لکھا کہ اس نے وعدے کے خلاف اہل سندھ کو اسقدر مصائب سے دوچار کر دیا ہے جو اسکے شایان شان نہیں ہے۔ اس کا جواب مددخاں نے یہ دیا کہ آئندہ وہ ایسی باتوں کی روک تھام کرے گا لیکن اگر وہ شاہ افغانستان کا مطیع ہے تو فوج کو واپس کر دے اور خود ہمارا بننا قبول کرے تاکہ ہم اپنے بادشاہ کو لکھ سکیں کہ اہل سندھ باغی نہیں ہیں۔

میر عبداللہ نے اسکو چال قرار دیا مگر فتح خاں اور میر سہراب مددخاں کے پاس جانے کو تیار ہو گئے۔ آخر میر عبداللہ فوج کو لیکر دین گڑھ کی طرف چل پڑا اور فتح خاں مددخاں کیطرف روانہ ہو گیا۔

مددخاں نے فتح خاں کے پہنچتے ہی اسکو حراست میں لے لیا اور اسکے گلے پر چھری رکھ کر ایک خط عبداللہ کو لکھوایا کہ وہ تمام بڑے سرداروں کے ساتھ آجائے۔ فتح خاں نے یہ خط تو لکھ دیا مگر رات کے اندھیرے میں بھیس بدل کر نکل بھاگا اب مددخاں نے میر عبداللہ کو پھانسنے کی ایک تدبیر اور کی مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو وہ عبدالنبی کو چھوڑ کر افغانستان چلا گیا۔

اب عبدالنبی نے بہاول خاں نواب بہاول پور کو بیچ میں ڈالا اور بعض

دوسرے لوگوں کے ذریعہ صلح کی درخواست کی اور سب کے آخر میں ایک کلام پاک پر ایفائے عہد کا اقرار لکھ کر میر عبداللہ کے پاس بھیج دیا۔ اس نے قرآن مجید کو بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور سر پر رکھ کر کچھ سوچتا رہا۔ شاید اسے جنگ صفین یاد آگئی ہو، جب لیلتہ الحریر میں شکست ہونے سے قبل لشکر شام سے نیزوں پر قرآن بلند کر دئے گئے تھے۔

میر عبداللہ نے کہا۔

"میں اپنے باپ اور چچا کے طریقے پر چلوں گا اور انہیں کے طریقے پر اس دنیا سے رخصت ہوں گا"۔

پھر وہ میر فتح علی خاں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میرے بعد میرے بچے بہرام خاں اور غلام حسن خاں یتیم ہو جائیں گے۔ انہیں تمہارے سپرد کرتا ہوں"۔

پھر وہ اٹھا اور عبدالنبی کے خیمے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے میر عبداللہ کو بڑی عزت اور احترام سے ٹھہرایا اور اس کا اعتماد بڑی حد تک حاصل کیا۔ میر فتح خاں بھی اسکے ساتھ تھا۔ ان دونوں کو اس نے اتنا مطمئن کر دیا کہ وہ محافظ لیے بغیر اس سے ملنے لگے اور آخر ایک دن اس نے انہیں گرفتار کر لیا اور پھر ان کے سر قلم کروا دئے

سندھ کی فضا ایکبار بہرام خاں کی موت پر سوگوار ہوئی تھی، دوبارہ میر بجار کے غم میں اب میر عبداللہ انہیں کے راستے پر گیا تو گھر گھر صف ماتم بچھ گئی۔ ٹالپروں نے خبر پاتے ہی بیوی بچوں کو دین گڑھ بھیجا اور چھ ہزار بلوچوں کو لیکر عبدالنبی پر حملہ کر دیا۔ اسکے پاس کافی فوج تھی لیکن اس نے شکست کھائی اور وہ میدان چھوڑ گیا لیکن مسلسل تگ و دو کرتا رہا اور تیس ہزار کا لشکر لیکر پھر میروں پر چڑھ دوڑا۔

میروں کے پاس بہت تھوڑی فوج تھی لیکن انتقام کے جنون میں وہ مقابلے پر آگئے پیکان اندازی کے بعد میر فتح علی خاں نے تلوار سونت لی اور گھوڑے سے اتر کر بھوکے شیر کی طرح قلب لشکر پر ٹوٹ پڑا، دوسری طرف سے میر سہراب اور میر حسن نے مردانہ وار یلغار کی اور حریفوں کو کھیرے ککڑی کیطرح کاٹنا شروع کر دیا۔ ایسے

بہادروں کا مقابلہ کون کرتا۔ میدان لاشوں سے پٹ گیا اور عبدالنبی اس طرح بھاگا کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور سیدھا قلات پہنچ گیا۔

میر نصیر خاں اب اسکی مدد کیلئے تیار نہ تھا لیکن جب وہ قدموں پر گر گیا تو اس نے ایک فوج ساتھ کر دی جس نے اسکو دریا پار اتار دیا۔ فتح علی خاں نے نصیر خاں سے خفیہ معاہدے کے تحت بروہی فوج پر حملہ نہیں کیا اور وہ قلات واپس ہو گئی۔ آخر عبدالنبی بھاگ کر پھر افغانستان جا پہنچا۔

اس اثناء میں میر فتح علی خاں میرآباد فتح کر کے سندھ کا فرمانروا بن چکا تھا۔ تیمور شاہ نے عبدالنبی کی فریاد پر میر فتح علی خان سے واقعات دریافت کیے اور اس نے بے کم و کاست سب کچھ لکھ بھیجا۔ تیمور شاہ نے نصف ملک عبدالنبی کو دینے کا حکم صادر کر دیا اور دو افغان سرداروں کو فوج دے کر اسکے ساتھ کر دیا۔

میر فتح علی خاں شاہ افغانستان کی مسلسل مداخلت سے عاجز آچکا تھا اس نے تقسیم سندھ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور چالیس ہزار فوج لے کر روہڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

اسکے ساتھ ہی اس نے تیمور شاہ کی خدمت میں اپنے سفیر بھیج دئے اور پورے سندھ کی سند حکومت حاصل کر لی۔ ۱۱۹۹ھ میں اس نے ایک شہر کی بنیاد ڈالی جس کا نام فتح آباد رکھا۔

ٹالپروں کی یگانگت اور یک جہتی نے انکو اس عروج پر پہنچا دیا تھا لیکن جب زمین اور زر درمیان میں آیا تو ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ میر فتح علی خاں نے سارے ملک کو سات حصوں میں بانٹ کر چار حصے اپنے اور اپنے تین بھائیوں کیلئے رکھے تھے دو حصے میر سہراب کے اور ایک ٹھارہ خاں کا لیکن سہراب اور ٹھارہ خاں اس پر راضی نہیں ہوئے سہراب نے روہڑی پر مستقل اقتدار حاصل کر لیا جو ریاست خیرپور کی بنیاد بنا۔ ٹھارہ خاں نے شاہ بندر میں حکومت قائم کر لی۔

عبدالنبی بے سہارا اور مایوس ہو چکا تھا لیکن اس نے اپنی جدوجہد ترک نہیں کی اور دربار افغانستان میں لگا رہا۔ وہاں اس نے یہ خبر بھی پہنچائی کہ سندھ تین حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ اس پر تیمور شاہ نے پھر اسکو سند حکمرانی عطا کر دی اور

احمد خاں نورزئی اور بوستان خاں کو اسکے ہمراہ کر دیا۔ اسی کے ساتھ والی قلات کو بھی مدد کیلئے لکھ دیا۔

خیر پور کے قریب پہنچ کر عبدالنبی نے میر سہراب خاں کو توڑنے کی کوشش کی لیکن اس نے فریب کھانے کے بجائے میر فتح علی خاں کو باخبر کر دیا میر فتح علی خاں نے اہل و عیال کو کچھ اور جیسلمیر بھیج دیا اور خود سینہ تان کر مقابلے پر آگیا۔ میر سہراب نے ساتھ نہ دیا اور قلعہ شاہ گڑھ میں غیر جانبدار بن کر بیٹھ گیا۔ اب فتح علی خاں تنہا تھا اور افغانستان کا ٹڈی دل! لیکن موت یا زندگی کی اس جنگ میں ٹھارہ خاں نے اس کا ساتھ دیا۔ دس ہزار کا چالیس ہزار سے مقابلہ تھا اور دونوں فوجوں کے بیچ میں ایک نالہ حائل تھا۔

افغان فوج نے یہ التزام کیا کہ میروں کا لشکر نالہ عبور نہ کرنے پائے لہذا جیسے ہی ٹالپری سپاہی آگے بڑھے بندوقوں سے گولیاں برسنے لگیں اس پر فتح علی خاں نے حکم دیا کہ نالے میں کود پڑو اور سپاہیوں کے ساتھ وہ خود بھی نالے میں اتر گیا پھر اچانک وہ تلوار بے نیام کر کے دشمن پر حملہ آور ہو گیا۔

بلاشبہ میر فتح علی خاں کے فوجی فرزندان شمشیر کہے جاسکتے تھے۔ انہوں نے تلواریں جو چلائیں تو ایک ساتھ دو دو سر گیندوں کی طرح اچھل اچھل کر گرنے لگے اور افغان فوج اس طرح بھاگی کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی۔ عبدالنبی اور افغان سردار بھی جانیں بچالے گئے۔ باقی سپاہیوں نے قرآن مجید کا واسطہ دے کر جان بخشی کرائی۔

تیمور شاہ اس شکست پر جوش انتقام میں خود بہاولپور تک پہنچ گیا تو میر فتح علی خاں نے اسکو لکھا کہ وہ بادشاہ سے جنگ کرنے کا اہل نہیں ہے اگر شاہ سندھ کسی اور دنیا چاہتا ہے تو وہ سندھ چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اسکے ساتھ ہی اس نے گراں قدر تحائف روانہ کئے۔ تیمور شاہ نرم پڑ گیا اس نے جو لشکر سندھ کی طرف بھیجا تھا اسکو واپس بلالیا۔

۱۲۱۷ھ میں تیمور شاہ کا انتقال ہو گیا اور ۱۲۲۰ھ میں عبدالنبی بھی دردر کی ٹھوکریں کھا کر مر گیا۔

ٹالپرا فرمانروائے سندھ

حسب و نسب

یہ قبیلہ حضرت حمزہؓ کی اولاد میں تھا جو کرمان و مکران سے پانچویں صدی ہجری میں موجودہ بلوچستان کے علاقے میں وارد ہوا۔ کچھ لوگ وہیں رہ گئے اور کچھ سندھ میں منتقل ہو گئے۔ ٹالہ ان کے ایک بزرگ کا نام تھا اور پور بمعنی اولاد۔ اس طرح ٹالہ پور کہا گیا پھر ٹالپر ہو گیا۔

انہیں میں سے ایک بزرگ گلہ یاکو خاں عرف سلیمان خاں تھے جنکے آٹھ بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام ہوتک خاں اور تیسرے کا نام مانک خاں تھا ایک بیٹے کا نام شہداد خاں، جس نے شہداد پور آباد کیا۔ اسکے بیٹوں میں میر چاکر خاں اور میر بہرام خاں تاریخ میں بہت نامور ہوئے۔ چاکر خاں نے شاہ پور چاکر آباد کیا میر سہراب خاں اسی کا بیٹا تھا جو میران خیرپور کا جد تھا۔

بہرام خاں کا بیٹا میر صوبدار خاں میاں سرفراز کے ہاتھوں ۱۱۸۹ھ میں باپ کے ساتھ قتل ہوا تھا۔ اسکے چار بیٹے تھے، میر فتح علی خاں فاتح سندھ، میر کرم علی خاں، میر مراد علی خاں اور میر غلام علی خاں۔ حیدرآباد کے میر بہرام خاں کی اولاد میں ہیں۔

مانک خاں کے بڑے بیٹے کا نام میر اللہ یار خاں تھا۔ اللہ یار خاں کا ایک بیٹا سموخاں تھا۔ سموخاں کا ایک بیٹا میر فتح خاں اور فتح خاں کا بیٹا میر ٹھارہ خاں تھا جسکی اولاد میں میران میرپور ہیں۔

ان سب نے کلہوڑا دور میں نمایاں کردار ادا کیے اور میر فتح علی خاں کے زور بازو بن کر اسکو کامیاب کرایا۔

میر فتح علی خاں فاتح سندھ

۱۱۹۹ھ میں استقرار حکومت کے بعد میر فتح علی خاں نے حیدرآباد کو مرکز حکومت قرار دیا۔ میر سہراب خاں نے خیرپور میں حکومت قائم کی تھی اور ٹھارہ خاں نے میرپور میں۔ ان حکومتوں کو اس نے تسلیم کیا۔ کچھ دنوں تک انہوں نے کابل کو خراج دیا پھر بند کر دیا۔

حیدرآباد کی حکومت میر فتح علی خاں اور اسکے بھائیوں میر غلام علی، میر کرم علی اور میر مراد علی پر مشتمل تھی اور انکی مرکزیت کو خیرپور اور میرپور تسلیم کرتے تھے۔

یہ پورا قبیلہ منظر تاریخ پر آنے سے قبل شیعہ تھا۔ایرانی بلوچستان سے ترک وطن کے اسباب کیا تھے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ہو سکتا ہے کہ شیعیت کے سبب سنجوقی دباؤ پڑا ہو یا اسی طرح کی کوئی اور وجہ ہو لیکن وطن چھوڑنے کیلئے کسی مجبوری کا ہونا مسلم ہے ۔ اس طرح پورے کا پورا قبیلہ موجودہ بلوچستان آگیا پھر کچھ بلوچستان میں رہ گئے اور کچھ سندھ میں داخل ہوگئے۔

بلوچستان میں رہ جانے والے بھی یقیناً شیعہ تھے ۔جیسے میر محمد نصیر خاں والی بلوچستان اور اسکے ساتھ اسکے اہل خاندان ۔دوسرے لوگوں کو تاریخ کے جنگل سے ڈھونڈھ نکالنا مشکل ہے لیکن سندھ کے میر سب ایک ہی عقیدے کے ماننے والے تھے اور بڑے راسخ کہ انتہائی نامساعد حالات میں بھی ڈانواڈول نہیں ہوئے۔

میر فتح علی خاں صرف ایک اچھا جرنیل ہی نہیں تھا بلکہ مدبر بھی تھا۔اس نے کلہوڑا عہد کے وہ تمام علاقے ایک ایک کر کے واپس لے لیے جن پر انتشاری حالات میں دوسروں نے قبضہ کر لیا تھا۔اس نے سبزل کوٹ، نواب بہاولپور سے، کراچی خان قلات سے، شکارپور افغانستان سے لکھ پت اور بست راجہ بھوج سے، عمر کوٹ راجہ جودھپور سے واپس لیا اور ۱۸ سال تک بڑی سطوت و شوکت سے حکومت کر کے ۹ محرم ۱۲۱۷ھ میں انتقال کر گیا۔افغانستان میں اس سے دو سال قبل شاہ زمان بن تیمور شاہ معزول ہو چکا تھا۔

میر فتح علی خاں کو اپنی ذات سے فاتح سندھ کہا جاتا ہے لیکن حقیقتاً وہ سندھ کا وقار تھا۔اسکی حکومت ایک مثالی حکومت تھی۔یوں تو میروں کے پورے قبیلے کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ عوام میں ہر دل عزیز اور مقبول ہوتے تھے لیکن میر فتح علی خاں کا نام میر بہرام خاں، میر بجار خاں میر عبداللہ خاں کے ذیل میں لیا جاتا تھا۔

بادشاہوں کی اولاد میں عموماً تاج و تخت کیلئے نبرد آزمائی ہوتی ہے ۔ ایک

دوسرے کے خون کا پیاسا بن جاتا ہے لیکن میر فتح علی خاں نے خاندانی شیرازے کو بکھرنے نہیں دیا اور بادشاہ ہونے کے بعد چھوٹے بھائیوں کو چھوٹا بھائی اور بڑوں کو بڑا سمجھا۔ بلوچوں کو بلاامتیاز عقیدہ اور بقدر صلاحیت عہدے دئے اور ان کے ذہن نشین کرایا کہ حکومت خود انکی ہے اور وہ اپنا ہی کام کر رہے ہیں ۔وفات سے کچھ گھنٹے پہلے اس کا ایک بیٹا پیدا ہوا تھا جو باپ کے بجائے سندھ کی چویاری (چار بھائیوں کی) حکومت کا رکن بنا۔

دوسری خصوصیات کے ساتھ وہ ایک درد مند انسان اور ایک علم پرور حکمراں تھا۔اس کا دربار باکمالوں سے بھرا رہتا جن میں ثابت علی شاہ، مائل ٹھٹھوی اور ملک الشعرا عظیم ٹھٹھوی نمایاں تھے۔

میر غلام علی خاں

فتح علی خاں کا بھائی ۱۹ محرم ۱۲۰۷ھ کو سربراہ مملکت بنا خاندان کے تمام اکابر کی موجودگی میں اسکی دستار بندی ہوئی کیونکہ اب وہ فتح علی خاں کے بجائے ملک و قبیلہ دونوں کا سردار تھا۔وہ ایک شریف النفس، ہوشمند اور ذی شعور انسان تھا اور امور جہانبانی سے بھی واقف تھا۔اسکے زمانے میں رعایا خوش حال تھی اور ہر طرف امن و چین تھا۔حکومت کے نظم و نسق، اخلاقی اقدار اور اصول دین پر عملدرآمد کی طرف اسکی خاص توجہ تھی لیکن مذہب میں جبر کو اس نے کبھی روا نہیں رکھا۔

اس نے اپنا سکہ تیمور شاہ کے سکے کے برابر خود ڈھلوایا تھا جس کا نام روپیہ کورہ تھا۔

میر غلام علی کسی طرح میر فتح علی خاں سے کم نہ تھا لیکن اسکے دور میں خاندانی اختلاف شروع ہو گیا۔میر ٹھارہ خاں خم ٹھونک کر میدان میں آگیا۔میر غلام علی نے میر محمود کو مقابلے پر بھیجا جس نے ٹھارہ خاں کو شکست دی اور زخمی حالت میں کشتی پر بٹھا کر لایا۔میر غلام علی بڑی شفقت کے ساتھ پیش آیا اسکے زخموں کا علاج کرایا اور صحت یاب ہونے پر عزت و احترام کے ساتھ خلعت دے کر رخصت کر دیا۔

انگریزوں سے میاں غلام شاہ کلہوڑا کے وقت سے سندھ کے روابط تھے۔ان کی کوٹھیاں ٹھٹھہ اور شاہ بندر میں بنی ہوئی تھیں لیکن شاہ زمان بادشاہ افغانستان

نے دباؤ ڈال کر انکو بند کرادیا تھا۔ میر غلام علی خاں نے کسی تحریک پر انگریز نمائندے کو بمبئی سے بلوایا اوران سے ایک تجارتی معاہدہ کیا جو بظاہر دوستانہ تھا لیکن اس میں انگریزوں نے بعض شاطرانہ شرائط رکھ دی تھیں۔ پھر ایک دوسرا معاہدہ ۱۲۲۳ھ میں ہوا اور اس طرح میر غلام علی خاں کے ہاتھوں سندھ کے گلے میں وہ طوق پڑگیا جو آخر کار پھانسی کا پھندا ثابت ہوا۔

مجموعی طور پر میر غلام علی کا دور سندھ کیلئے ایک پرامن اور کامیاب دور تھا۔ ۶ جمادی الثانی ۱۲۲۷ھ میں اس نے انتقال کیا۔

میر کرم علی خاں

میر فتح علی خاں کے بنائے دستور کے مطابق میر کرم علی خاں سندھ کا فرمانروا ہوا تو اس نے چھوٹے بھائی میر مراد علی کے مشورے سے جہانبانی کا آغاز کیا اور اسکو سرکار عظمت مدار کہہ کر ملقب کیا گیا۔

کابل کے تخت پر جب شاہ شجاع الملک متمکن ہوا تو ۱۲۲۱ھ میں وہ خراج وصول کرنے کیلئے سندھ آیا تھا۔ میروں میں اس سے جنگ کرنے کی طاقت نہ تھی۔ اس لئے سترہ لاکھ ادا کردئے۔ ۱۲۲۵ھ میں وہ پھر آیا اور اسکو بیس لاکھ روپیہ اور بعض بیش قیمت تحائف دینا پڑے۔ وہ پشاور پہنچا ہی تھا کہ اسکے وزیر شیر محمد خان نے کشمیر سے واپس آکر اسپر حملہ کردیا۔ سبب یہ تھا کہ سید احمد کابل کے سخت متعصب سنی عالم تھے۔ انہوں نے شیعوں کے قتل عام کا فتویٰ دیدیا اور ۱۲۱۹ھ میں سخت شیعہ سنی فساد ہوگیا کافی شیعہ شہید ہوئے۔ انہوں نے ۱۲۲۵ھ میں سید احمد کو قتل کردیا۔

شیر محمد کو گمان ہوا کہ یہ قتل شاہ شجاع الملک کے ایماء پر ہوا ہے لہذا اس نے اسپر حملہ کردیا۔ شیر محمد لڑائی میں مارا گیا۔ پھر فتح خان نے محمود شاہ کو تخت پر بٹھا کر شاہ شجاع پر حملہ کیا اور وہ ہزیمت یاب ہوکر پنجاب میں رنجیت سنگھ کے پاس پناہ گزیں ہوا پھر اسکو انگریزوں نے اپنا آلہ کار بنالیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب رنجیت سنگھ ملتان پر قابض ہوچکا تھا اور اس نے سندھ فتح کرنے کے بہانے تلاش کرنا شروع کردئے تھے لیکن میروں نے انگریزوں سے رجوع کیا اور ان کے دباؤ میں آکر رنجیت سنگھ نے سندھ کا خیال چھوڑ دیا۔

کچھ دنوں بعد شاہ شجاع سردار محمد عظیم سے شکست کھاکر شکارپور آیا۔ اس نے اخلاقی اثر ڈال کر میران حیدرآباد سے وقت پر مدد کرنے کا معاہدہ کیا لیکن جب وہ خیرپور پہنچا تو سہراب نے کسی مزید معاہدے سے انکار کردیا۔

شاہ شجاع دو سال شکارپور میں رہا اور جنگی مشقیں کرتا رہا۔ اس درمیان اسکی لوٹ مار اور مظالم حد سے بڑھ گئے۔ میروں نے مجبور ہوکر نہایت خاموشی سے محمد عظیم والی افغانستان کو سندھ آنے کی دعوت دیدی۔ سردار محمد عظیم ۱۲۳۶ھ میں سندھ پہنچا تو میران سندھ دوطرفہ بازی سے پریشان ہوگئے۔ آخر بدقت تمام شاہ شجاع سے پیچھا چھوٹا اور وہ لدھیانہ کی طرف چلا گیا۔ پھر محمد عظیم خاں شکارپور کی حکومت پر قبضہ کرکے خراسان کا عازم ہوگیا۔

کچھ وقفے سے یہ خبر مشہور ہوئی کہ رنجیت سنگھ شکارپور پر قبضہ کرنے کیلئے آرہا ہے اس لئے میران حیدرآباد و خیرپور و میرپور نے متحد ہوکر حکمت عملی سے شکارپور کو آپس میں تقسیم کرلیا۔

۱۲۴۲ھ میں "سید احمد شہید" سندھ آئے اور اہل سندھ کو انہوں نے دعوت جہاد دی مگر انہیں فی الفور کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی پھر بھی سید صبغتہ اللہ نے حروں کی تنظیم کرلی۔

۱۲۴۴ھ میں میر کرم علی خاں نے وفات پائی۔ بڑا سخن سنج اور اہل علم و فضل بادشاہ تھا۔ اسکی علم و ادب پروری کے باعث ایران و خراسان کے کئی باکمال حیدرآباد آکر آباد ہوئے۔

میر مراد علی خاں

میر فتح علی خاں کا سب سے چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے اپنے تدبیر سے ملک میں کسی شورش کو ابھرنے نہ دیا۔ اس میں بہت سے محاسن تھے مگر بخل اسکی کمزوری تھی ۱۸ ذی قعد ۱۲۴۷ھ کو اس نے انگریزوں سے تیسرا معاہدہ کیا جس سے انگریزوں نے سندھ میں مزید حقوق حاصل کرلیے اس طرح وہ اس پھندے کو تنگ کرتے جارہے تھے جو انہوں نے سندھ کے گلے میں ڈالا تھا۔

اسکے بعد شاہ شجاع پھر سندھ آیا۔ میر مراد علی خاں نے اسکو اخراجات کیلئے

چالیس ہزار روپے دئے مگر وہ جانے میں ٹال مٹول کرتا رہا کہ ۹ جمادی الثانی ۱۲۴۹ھ کو میر مراد علی خاں کا انتقال ہو گیا۔ دانشور اور ادیبوں کا قدرداں تھا، خود بھی ادیب اور شاعر تھا۔

میر نور محمد خاں و میر محمد نصیر خاں

میر نور محمد میر مراد علی خاں کا بیٹا تھا۔ وہ سریر آرائے حکومت ہوا تو اس نے اپنے بھائیوں اور عزیز و اقارب سب کو شریک حکومت بنایا۔ شاہ شجاع الملک ابھی شکارپور میں مقیم تھا۔ اس نے وقت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور میروں کو اسکی طرف سے غلط فہمی پیدا ہو گئی پھر میروں کے کارندوں نے شکارپور چھوڑ دیا اور شاہ شجاع نے اپنے آدمی مقرر کر دئے۔ یہ گویا طرفین سے اعلان جنگ تھا۔

اس وقفے میں خیرپور کی کچھ فوج روہڑی میں جمع ہوئی۔ منصوبہ یہ تھا کہ مزید فوج یکجا ہونے پر حملہ کیا جائے گا مگر فقیر عالم خاں مری حکومت شکارپور کے لالچ میں خود رائی کرکے اس فوج کو چڑھالے گیا جس سے شاہ شجاع کے ایک دستے کا مقابلہ ہو گیا۔ حاجی ہدایت اللہ اس کا افسر تھا۔ مری اس سے لڑ گیا اور مارا گیا۔ اسکے بیٹے خاں جہاں نے حاجی ہدایت اللہ کو قتل کر دیا۔

اسکی اطلاع شاہ شجاع کو ہوئی تو اس نے سمندر خاں کو تین ہزار پیادے دے کر سات توپ بردار کشتیوں کے ساتھ خیرپور کی سمت روانہ کر دیا۔ ۱۲۴۹ھ میں کھوڑی کے مقام پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ میروں کے لشکر نے طریق جنگ میں فریب کھایا۔ اسکے باوقار افسر مارے گئے جس سے فوجیوں میں بددلی پیدا ہو گئی وہ غلطیوں پر غلطیاں کرتے رہے اور انہیں سخت شکست ہوئی۔

صفر ۱۲۴۹ھ میں میران حیدرآباد اپنا لشکر جمع کرکے روہڑی پہنچے جہاں خیرپور کی فوجیں بھی آگئیں۔ ادھر شاہ شجاع نے بھی تیاری کی مگر چند دانش مندوں نے دوسری لڑائی کی نوبت نہیں آنے دی۔ شاہ شجاع پانچ لاکھ روپیہ اور پانچ سو اونٹ باربرداری کے لیکر خراسان روانہ ہو گیا مگر جلد ہی دوست محمد خاں سے شکست کھا کر سندھ آگیا۔ میروں نے اسکی تواضع اور ضیافت کی اور زاد راہ دے کر رخصت کر دیا۔

سندھ اور انگریز

اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی یعنی بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں انگریزوں نے ساری دنیا میں بالخصوص ایشیا میں ہر طرف سازشوں کا جال بچھا رکھا تھا۔ وہ زمین کے چپے چپے پر خود اپنی یا اپنے قابو کے آدمیوں کی حکومت چاہتے تھے افغانستان میں ان کے پاس شاہ شجاع الملک کا مہرہ تھا جسکو وہ دوست محمد کی جگہ پر رکھنا چاہتے تھے جس میں انہیں کامیابی نہ ہو سکی تو انہوں نے سندھ کیلئے ایک ذہنی منصوبہ بنایا اور لشکر کے خراسان جانے کیلئے میروں سے راستہ دینے کی استدعا کی اور میران کے فریب میں آگئے۔

اس سازش میں شاہ شجاع اور رنجیت سنگھ دونوں شامل تھے۔ ۲۹ دسمبر ۱۸۳۸ء کو انگریزی فوج شاہ شجاع کے ساتھ بہاول پور پہنچی، ۲۴ جنوری ۱۹۳۹ء کو وہاں سے روہڑی پہنچی اور دریائے سندھ کے کنارے خیمہ انداز ہوئی پھر میر رستم خاں سے اجازت لے کر قلعہ بکھر سے گزرنے اور دریا پر پل بنانے کی اجازت لی اور ۳ فروری ۱۹۳۹ء کو اس پل کے ذریعے دریا عبور کیا۔ پھر رستم خاں والی خیرپور کو دھوکے میں رکھ کر قلعہ بکھر پر قبضہ کر لیا۔

ادھر بمبئی کی فوج ۱۸۴۰ء مطابق ۱۲۵۵ھ میں کراچی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئی پھر اس نے ٹھٹھہ کی طرف پیش قدمی کی۔ میران حیدرآباد، میرپور کو اسکی اطلاع ہوئی تو انہوں نے مقابلے کیلئے لشکر جمع کیا جس نے ۱۰ فروری ۱۸۴۳ء کو کراچی کی انگریز چھاؤنی لوٹ لی۔ اسپر انگریزوں نے شکارپور کے عامل کے ذریعے میروں کو دھمکی دی۔ میر نور محمد خاں انگریزوں سے لڑنے کے حق میں نہ تھا اس لئے تاوان جنگ ادا کرکے انگریزوں کو ہموار کر لیا۔ وہ شکارپور اور لاڑکانہ ہوتے ہوئے خراسان کی طرف روانہ ہو گئے پھر بھی انہوں نے راستے میں جیکب آباد کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

انگریزوں نے بنگال کی طرح جب سے ٹھٹھہ اور شاہ بندر میں اپنی تجارتی کوٹھیاں بنائی تھیں اس وقت سے بڑی گہری نظر سے سندھ کا جائزہ لے رہے تھے لیکن میروں میں جزوی اختلافات کے باوجود خاندانی حمیت اور وطنیت کا جذبہ تھا اور

میر کرم علی خاں و میر مراد علی خاں فرمانروایاں حیدرآباد اور ان کے وفادار اور دور بین مشیر زندہ تھے انہوں نے انگریزوں کو حد سے تجاوز نہ کرنے دیا لیکن اب انکی جگہ میر نور محمد خاں اور میر محمد نصیر خاں نے لے لی تھی۔ خیرپور میں میر سہراب کے بعد میر رستم خاں، میر مبارک خاں اور میر علی مراد خاں مسند نشین حکومت تھے۔ ان میں آپس کا اتحاد بھی کم ہو گیا تھا اور بزرگوں کی سی سوجھ بوجھ بھی نہ تھی لہذا انگریزوں نے انہیں شیشے میں اتار لیا اور ان کے تحفظ کے نام پر کوٹلہ میں ایک چھاؤنی بنانے کی اجازت لے لی جسکے اخراجات خود میروں کے ذمے ڈال دئے۔ فوج انگریزوں کی اور مصارف میروں کے!

شکارپور میں ایک چھاؤنی انگریز پہلے ہی قائم کر چکے تھے۔ اسکو بھی سندھ کی بدنصیبی کہنا چاہیئے کہ ۱۲۵۵ھ میں میر نور محمد خاں والی حیدرآباد کا بھی انتقال ہو گیا اور تدبر و دانش کا ایک بڑا ستون گر گیا۔

انہیں دنوں انگریز خراسان میں پسپا ہو کر سکھر و شکار پہنچے اور انہوں نے میروں سے کراچی، قلعہ بکھر اور کیتی کا مطالبہ کر دیا۔ میروں کے باقیات الصالحات شاطران فرنگ کی چالوں کو سمجھ چکے تھے کہ کلائی پکڑ کر وہ پورے ہاتھ کی گرفت کر لیں گے لہذا انہوں نے بھی لشکر کی تنظیم و تربیت شروع کر دی مگر میروں کے پاس کوئی دوراندیش جرنیل نہیں تھا اس لئے بعض بلوچ دستوں نے انگریزوں پر شب خوں مارنا شروع کر دئے۔

انگریزوں نے جواباً تلوار کے بجائے زہر کا استعمال کیا اور لوگوں کو درمیان میں ڈال کر میروں سے ایک نیا معاہدہ کرنے کی پیش کش کی جس سے سندھ میں انگریز مداخلت بڑھ جاتی اور ان کا سکہ بھی رائج ہونے کے امکانات پیدا ہوتے تھے۔ میروں نے اسکو منظور نہیں کیا تو انگریز حیدرآباد اور خیرپور میں پھوٹ ڈالنے کی تدبیر کرنے لگے۔

صوبدار خاں میر فتح علی خاں کا بیٹا تھا۔ اسکو باپ کے بجائے سربراہ بنوانے کا وعدہ کیا۔ خیرپور جا کر میر علی مراد خاں کو دستار بندی کا لالچ دیا مگر ایک دو کے علاوہ کوئی ان کے فریب میں نہیں آیا۔

اس دوران انگریزی ریشہ دوانیوں کی خبریں سندھ میں گشت کرنے لگیں۔ سندھیوں کا جذبہ حب الوطنی اچانک بیدار ہو گیا۔ بختیار خاں لغاری ایک نشہ باز سردار تھا مگر ان حالات نے اسکو جواں مرد بنا دیا۔ اس نے اپنے قبیلے کو سوتے سے جگایا اور بلوچوں سے ان کے پرانے اختلاف کو دور کیا۔

اس موقع پر سندھ کی سرزمین نے میر فتح علی خاں کو آواز دی مگر میروں میں سے کوئی بھی ویسا مدبر نہ نکل سکا جو لغاری اور بلوچ مردان جنگ آزما کو حربی اصول پر منظم کر سکتا اور انگلستان کی مکار قوم سے خود ان کے طریقوں پر نبرد آرائی کر سکتا۔ پھر بھی پورے ملک میں سندھ کو بچانے کے نعرے بلند ہو گئے۔

میر صوبدار خاں اور میر نصیر خاں دونوں جنگ کرنے کے حق میں نہ تھے۔ انہیں انگریزوں سے عہدہ برآ ہونے کی امید نہ تھی لیکن جب ساری قوم ایک پرچم تلے جمع ہو گئی تھی تو کوئی اپنے کو ان سے علیحدہ کیونکر رکھتا۔ وہ بھی سوار ہو کر باغ میر فتح علی خاں میں آ گئے۔ اس اثنا میں حیات خاں مری اور فہیم خاں مری کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا اور بلوچوں نے حملہ کر کے انکی چھاؤنی میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔

انگریز میران حیدرآباد کی شکارگاہ میں جمع تھے۔ میر محمد نصیر خاں، میر شہداد خاں، میر رستم خاں اور میر صوبدار خاں کا بیٹا بارہ ہزار لشکر اور چند توپوں کے ساتھ حیدرآباد سے چھ میل پر میانی میں خیمہ زن ہو گئے۔

۱۷ فروری ۱۸۴۳ء کو سورج بلند ہونے پر انگریزی فوج دور سے نمودار ہوئی تو میر جان محمد نے بلوچوں کو للکارا۔

"تم نے کلام اللہ کی قسم کھائی تھی، مردانگی کا وقت ہے سندھ پر قربان ہو جاؤ"

اس آواز پر بھی بلوچوں نے حرکت نہ کی البتہ حاجی خدابخش پچاس سواروں کے ساتھ، مراد علی خاں چانڈک، نصیر خاں چانڈک، غلام محمد خاں ٹالپر، مبارک خاں ٹالپر، میر غلام شاہ ولد میر محراب خاں ٹالپر اور میر جان محمد خاں مردانہ وار بڑھے اور لوہے کی سفید دیوار سے ٹکرا گئے۔ پھر باقی بلوچوں نے بھی یلغار کی۔

انگریزوں کی جنگ کا انحصار توپوں اور بندوقوں پر تھا اس طرف صرف چند توپیں تھیں اور بلوچ عموماً تلوار کے دھنی تھے پھر بھی وہ جوش شجاعت میں بڑھتے چلے گئے اور جو توپوں اور بندوقوں کی مار سے بچ سکے، وہ انگریز صفوں کو توڑ کر گھس گئے اور چشم زدن میں انہوں نے میدان لاشوں سے پاٹ دیا۔

بلوچوں کی بہادری انگریزوں کو کبھی فراموش نہ ہو سکی ۔ عبداللہ خاں نظامانی اور میر زاخاں نظامانی نے اپنے دستوں کے ساتھ ان گنت جسم سروں سے علیحدہ کر دئے لیکن جب وہ گر گئے اور محمد علی خاں لغاری، دریا خاں لغاری اور غلام حیدر لغاری بھی وطن پر قربان ہو گئے تو سرفروشوں کی ہمتیں پست ہو گئیں اور جو اپنے کو بچا سکے وہ میدان سے نکل گئے۔

میر بھی سب کے سب زخمی ہوئے تھے ۔ حیدرآباد کے قلعہ میں دم لے کر انہوں نے انگریزوں سے رابطہ قائم کرنے کے سوا چارہ نہ دیکھا لہذا انہیں خط لکھا۔ میر صوبدار خاں نے اس جنگ میں حصہ نہ لیا تھا۔ اس کا بیٹا میدان میں گیا تھا اس لئے میر اسکی طرف سے بھی مطمئن نہ تھے۔

انگریزوں نے میروں کے جواب خط میں انہیں بلا بھیجا اور ان کے پہنچتے ہی چارلس نیپیئر نے انکو گرفتار کر لیا۔ پھر قلعہ حیدرآباد پر قبضہ کیا اور میر صوبدار خاں کو بھی گرفتار کر لیا۔ قوم کا ساتھ چھوڑنے والے کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔

اب سندھ انگریزوں کا تھا۔ انہوں نے اہل سندھ پر وہ مظالم کیے کہ بنگال کے ستم زدگان کی داستانیں اسکے سامنے ماند پڑ گئیں ۔ میروں کو گرفتار کر کے انہوں نے بمبئی بھیج دیا جہاں سے وہ مختلف قلعوں میں نظر بند کر دئے گئے ۔ ۶ ربیع الاول ۱۲۶۱ھ (۱۴ اپریل ۱۸۴۵ء) کو حالت نماز میں میر محمد نصیر خاں کا انتقال ہو گیا۔

علی و حسین و حسن دستگیر، خدا یار و یاور محمد نصیر۔

اس جواں مرد سے شکست کا صدمہ برداشت نہ ہو سکا۔

بلوچوں نے اسکے بعد مختلف مقامات پر بغاوتیں کیں مگر بجز تباہی و بربادی کچھ حاصل نہ ہوا۔

اس طرح بنگال سے لیکر سندھ تک انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

میران سندھ ایک نظر میں

حیدرآباد

میر محمد نصیر خاں، نور محمد خاں ٹالپر کا بھائی تھا جو اسکے بعد حیدرآباد میں تخت نشین ہوا اور زوال سندھ کے بعد شدت غم میں دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا۔ نہایت تعلیم یافتہ، بہادر، مستقل مزاج، ادیب و شاعر تھا اور علماء و فضلاء کا قدر داں بھی ۔ دیوان فارسی، دیوان اردو اور کئی دوسری کتب اس کا سرمایہ ادب ہیں۔

میر حسن علی خاں میر محمد نصیر خاں کا بیٹا تھا، کلکتہ میں انگریزوں کا قیدی رہا، ۱۸۶۳ء میں رہا ہو کر حیدرآباد آیا، ۱۹۰۶ء میں اس نے وفات پائی، ۱۹۱۲ء میں کربلائے معلی میں دفن کیا گیا، بہادر، عالم و فاضل اور کئی علمی کتابوں کا مصنف اور شاعر تھا

میر عباس علی خاں مومن بن محمد نصیر خاں نے ۱۹۵۷ء میں بمقام کلکتہ ۲۸ سال کی عمر میں وفات پائی ۔ دیوان فارسی اور ایک مثنوی اسکی یادگار ہے۔

میر حسن علی خاں بن نور محمد خاں نے ۱۸۷۸ء میں وفات پائی، متعدد اردو و فارسی کتابوں کا مصنف اور شاعر تھا۔

میر صوبدار خاں بن میر فتح علی خاں گہوارے ہی سے سنی آغوش کا پروردہ رہا اس لئے مذہب کے لحاظ سے اہل السنت والجماعت تھا اس نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا مگر انہوں نے اسکو معاف نہیں کیا ۔ کلکتہ کی قید میں ۱۸۴۶ء میں فوت ہوا اور میت حیدرآباد لاکر میروں کے قبرستان میں دفن کی گئی ۔ صاحب تصنیف اور شاعر تھا

میر محمد علی خاں بن صوبدار خاں نے ۱۸۹۱ء میں بمقام کلکتہ وفات پائی ۔ کئی منظوم کتابوں کا مصنف تھا۔

میر شہداد خاں حیدری بن نور محمد خاں سورت میں قید رہا ۔ اسپر کپتان انس کے قتل اور آتش زنی کا الزام تھا جس سے بری ہو گیا مگر کلکتہ بھیج دیا گیا اور ۱۸۵۷ء میں وہیں وفات پائی، لاش حیدرآباد لاکر دفن کی گئی ۔ خاک پائے مرتضیٰ شہداد خاں!

میر یار محمد خاں بن مراد علی خاں نے ٹالپر کے حالات تحقیق سے لکھے ہیں ۔
فارسی نثر میں استاد کا درجہ رکھتا تھا، ۱۸۶۲ء میں فوت ہوا۔

خیر پور

میر سہراب خاں " فاتح سندھ " کا چھوٹا بھائی تھا ۔ ۱۷۸۴ء مطابق ۱۱۹۹ھ میں
اس نے اپنی علیحدہ حکومت قائم کی اور دور اندیشی کے تحت خیرپور سے تھوڑے
فاصلے سے پہاڑی پر ایک نہایت مضبوط اور مستحکم قلعہ تعمیر کرایا جو کوٹ ڈیجی کہلاتا
ہے، میروں کے تمام معرکوں میں شریک رہا ، کئی علاقے فتح کرکے اپنی مملکت میں
شامل کئے اور رعایا کی فلاح وبہبود کے بہت سے کام کیے ۔ ۱۸۲۹ء میں ملک اپنے
بیٹوں میں تقسیم کرکے گوشہ نشین ہو گیا۔ ۲۷ صفر ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ء میں وفات

بلند اقبال، غریب پرور، قدر شناس اور متواضع حکمراں تھا۔

میر رستم خاں میر سہراب خاں کا بیٹا تھا۔ اس نے بھی میر فتح علی خاں کی طرح
بیٹوں میں جاگیر کی تقسیم کردی تھی لیکن اختلاف رونما ہو کر رہا اور دوسرے بھائیوں
کے درمیان خونریزی ہو کر رہی تاہم رستم خاں نے بڑے ہونے کا کردار ادا کیا۔

۴ جنوری ۱۸۳۹ء میں اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے دوستانہ معاہدہ کیا اور
میران حیدرآباد کی سی صورت حال پیدا ہو گئی ۔ ۲ نومبر ۱۸۴۲ء کو انگریزوں سے دوسرا
معاہدہ کیا ۔ میر رستم خاں خاندانی تنازعوں کو حل کرنا چاہتا تھا لیکن آگے چل کر
نونہار کے مقام پر ان کے مابین جنگ ہو کر رہی ۔ یہی وہ حالات تھے جن سے
انگریزوں نے فائدہ اٹھایا ۔ بزرگان قبیلہ میں تہذیبی روایات برقرار رکھنے کا جذبہ تھا
لیکن جب وہ ایک ایک کرکے اٹھ گئے تو میروں میں امیرزادوں کی سی خودغرضی پیدا
ہو گئی جو زوال سندھ کا باعث ہوئی ۔

انگریز مختلف طریقوں سے اس باہمی اختلاف کو مسلسل ہوا دیتے رہتے ۔
کبھی ایک کو چڑھاتے کبھی دوسرے کی پشت پر ہاتھ رکھتے ۔ نتیجے میں میر رستم خاں میر
مراد علی خاں کے حق میں تاج وتخت سے دست بردار ہو گیا۔ انگریز اسکی گرفتاری کی
فکر میں تھے لہذا وہ ریگستان سے گزرتا ہوا شہداد پور پہنچا پھر بچتا بچاتا جنگ میانی میں

اہل خاندان کا شریک ہوا اور زندان فرنگ میں بمقام پونا ۱۸۴۶ء میں قید ہستی سے
آزاد ہو گیا۔

بلند کردار امیر تھا۔ انگریز اقتدار کو حقیقتاً اس نے ایک لمحے کیلئے پسند نہیں
کیا اسی لئے تمام عمر پریشانیوں میں گزر گئی۔

میر علی مراد خاں

میر رستم خاں کے بیٹوں میں میر علی مراد خاں شروع ہی سے انگریزوں کا یار
وفادار تھا جسکے صلے میں میروں کا انتزاع حکومت ہونے پر وہ خیرپور کا حکمراں تسلیم کیا
گیا۔ میروں میں یقیناً اختلاف تھا لیکن سب میر صوبدار خاں اور میر علی مراد خاں کے
سے لوگ نہیں تھے ۔ میر صوبدار خاں نے تو اتنا ہی کیا تھا کہ جنگ میانی میں
شرکت نہیں کی لیکن میر علی مراد خاں نے تو قیامت یہ کی کہ جب میر شیر محمد خاں
والی میرپور انگریزوں کے مدمقابل آیا تو اس نے بلوچوں کے پروں میں داخل ہو کر
بلوچ سرداروں کو میر شیر محمد خاں کا ساتھ چھوڑ دینے پر اکسایا اور مختلف قسم کے لالچ
دے کر ان کو توڑ لیا جس سے شیر سندھ میر شیر محمد خاں کی طاقت کمزور پڑ گئی۔

میر علی مراد خاں کا کردار حب الوطنی کے زاویہ نگاہ سے کسی طرح مستحسن
نہیں ہو سکتا لیکن اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ ایک بڑی سلطنت کا کچھ حصہ بچ گیا جو
مستقبل میں بعض مظلوموں اور کمزوروں کی پناہ گاہ بن گیا۔

نظام حیدرآباد اور والی خیرپور سفید فام شکاریوں کے یار وفادار ہونے کے
سبب پوری طرح تباہی کا شکار نہیں ہوئے لیکن انہوں نے حریت پسندوں کا ساتھ نہ
دے کر اور وطن کی جڑیں کھوکھلی کرکے اپنے کو ہمیشہ کیلئے مطعون کرالیا، پھر ان کو
وہ عزت بھی نصیب نہیں ہوئی جو آزاد دکن یا آزاد سندھ میں حاصل تھی ۔ انگریزوں کا
جہاں تک تعلق ہے ، وہ ہندوستان میں ہمیشہ سے اپنا آلہ کار ڈھونڈتے رہے تھے اور
انہیں کے ہاتھوں انہوں نے سلطان ٹیپو اور سراج الدولہ کی قبریں کھدوائیں اور شیر
سندھ کا مقبرہ بھی تیار کرایا لیکن وہ خود کسی کے یار وفادار ہونا تو درکنار یار بھی نہ تھے
ایسا ہی انہوں نے میر علی مراد خاں کے ساتھ بھی کیا اور نونہار کی جنگ میں

اسکے کردار کو مشتبہ قرار دے کر خیرپور کی ضبطی کا حکم دیدیا پھر علی مراد خاں خود لندن گئے تو انکی ریاست واگزار ہوئی ۔

اس میں انگریزوں کے رحم یا مروت کو کوئی دخل نہ تھا بلکہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے انکی آنکھیں کھول دی تھیں کہ ہندوستان کی مردہ لاش میں کسی وقت بھی جان پڑسکتی ہے اور وہ کوئی کروٹ بدل سکتا ہے پھر سندھ میں میر علی مراد خاں کی ہدایت پر اسکے بیٹے میر شاہنواز خاں نے اس دور میں انگریزوں کی مدد کی تھی اور ایک تجربے کے بعد حکومت برطانیہ کو اہل ہند کی اشک شوئی بھی کرنا تھی اس لئے خیرپور کو واگزار کردیا گیا ورنہ میر علی مراد خاں کا بھی وہی حشر ہوتا جو میر صوبدار خاں کا ہوا تھا۔

۲۵ رمضان ۱۳۱۱ھ مطابق اپریل ۱۸۹۴ء کو میر علی مراد خاں کا انتقال ہوگیا اور لاش کربلائے معلیٰ لے جاکر دفن کی گئی ۔ انگریز نواز پالیسی سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو میر علی مراد خاں ایک عالم وفاضل ، دوراندیش اور ادب پرور حکمراں تھا خیرپور کے اگلے حکمرانوں کے عہد کی سیاست ماضی سے بالکل مختلف تھی انہیں سارے ہندوستان کی طرح انگریز کے زیر سایہ زندہ رہنا تھا ۔ شیعی زاویہ نگاہ سے ان سب نے گرانقدر خدمات انجام دیں ، عزاداری کو فروغ دیا کتنے ہی مذہبی ادارے انکی یادگار ہیں ۔

میرپور

میران سندھ کی تیسری حکومت میرپور کی تھی جس کا بانی ٹھارہ خاں بن میر فتح خاں تھا ۔ ٹھارہ خاں نے بعض ریگستانی علاقے اپنی مملکت میں شامل کرکے اسکو وسیع کیا اور ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں ایک پائیدار حکومت چھوڑ کر چل بسا: بہادر اور مدبر حکمراں تھا ۔

میر علی مراد خاں اس کا بیٹا تھا جو ایک خداترس اور رعایا پرور حکمراں تھا ۔ ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں اس کا انتقال ہوا ۔ اسکے بعد اس کا بیٹا میر شیر محمد خاں تخت میرپور پر بیٹھا ۔ انگریزوں نے دوسرے میروں کی طرح اسپر بھی ڈورے ڈالے اور اس سے بھی ایک معاہدہ کیا ۔

میر شیر محمد خاں کا جنگ میانی میں شریک ہونا ثابت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تعلقات کی کشیدگی کے سبب میران حیدرآباد و خیرپور نے اسکو دعوت نہ دی ہو لیکن جب جنگ میانی کے بعد میروں کے انجام کی خبر شیر محمد خاں کو معلوم ہوئی تو وہ تڑپ اٹھا ۔ سب اس کے بھائی بند تھے ۔ انگریزوں سے اسکو اتنی نفرت ہوگئی کہ انتقام لینے کیلئے راتوں کی نیند اسپر حرام ہوگئی ۔ اس نے شب و روز محنت کرکے لشکر کو آراستہ کیا اور حیدرآباد کیطرف چل پڑا ۔

سقوط حیدرآباد اور میروں کے انجام کا اہل سندھ پر اتنا اثر پڑا تھا کہ لوگوں نے مختلف مقامات پر ٹولیوں اور دستوں کی صورت میں انگریزوں پر حملے کئے تھے اور جابجا قتل وغارت گری بھی کی تھی مگر جواباً انگریزوں کی طرف سے اتنا ظلم ڈھایا گیا تھا کہ ایک عام دہشت طاری تھی لیکن جب شیر محمد شیر سندھ کا نعرہ انتقام بلند ہوا تو لوگ کونوں کھدروں سے نکل آئے اور میرپور پہنچنے لگے ۔

ان میں بلوچ بھی تھے اور میر بھی ، نظامانی بھی تھے اور لغاری بھی ۔ یہ سب سندھ کی آزادی کیلئے جمع ہوئے تھے اور ان کے جذبے کو دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ سندھ کی سرزمین سفید فام نسل کیلئے تنگ ہوجائے گی لیکن انگریزوں نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بعض ضمیر فروشوں کو خرید لیا جو وفادار سندھیوں کے نقاب چہروں پر ڈال کر فداکاروں میں شامل ہوگئے ۔ ان کے دو کام تھے ایک یہ کہ اہل سندھ کو دہشت زدہ کریں اور انگریزوں کی طاقت سے ڈرا کر خوف وہراس پیدا کریں ، دوسرا یہ کہ موقع ملے تو پیٹھ میں چھرے گھونپ دیں ۔

کہا جاتا ہے کہ سندھیوں کے جوش وولولہ کا یہ عالم تھا کہ وہ سوتے میں بھی نعرے لگانے لگتے تھے ۔

میر شیر محمد خاں کا لشکر حیدرآباد سے آٹھ میل پر ٹنڈو موسیٰ خاں کھتران میں پھلیلی کے مشرق میں خیمہ زن ہوا ۔ انگریزوں نے بھی حیدرآباد میں اپنی قوت کو یکجا کرلیا تھا ۔ وہ بھی بڑے توپخانے لے کر میدان میں آئے ۔ ۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء کو سندھ کی آخری جنگ آزادی وقوع پذیر ہوئی جو جنگ دبہ کے نام سے مشہور ہے ۔

ہوش محمد میر صوبدار خاں کا غلام تھا ۔ غیر معمولی ہمت وشجاعت دیکھ کر شیر

محمد خاں نے اسے سپہ سالار لشکر بنایا تھا۔اس نے بڑی تنظیم کے ساتھ اپنے لشکر کو آگے بڑھایا۔انگریز توپوں نے اپنے دہانے کھول دئے جسکے لئے وہ تیار تھے لہذا اپنی چھوٹی چھوٹی توپوں کی آڑ لیکر وہ آگے بڑھے اور ایک بڑی تعداد کی بھینٹ دے کر انگریز فوجوں سے جاٹکرائے۔

میر غلام علی خاں ولد میر عبداللہ ٹالپر، رحیم خاں ٹالپر، علی خاں ٹالپر اور دیگر بچے کھچے میر اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان میں شامل تھے۔کمال خاں مری، نبی بخش مری اور نوحانی بلوچ انگریزوں پر بلائے بے درماں کی ٹوٹ پڑے۔ان سب نے وہ شمشیر زنی کی کہ سندھ کو ہمیشہ ان پر فخر رہے گا۔

ہوش محمد کا نعرہ تھا ہم مرجائیں گے مگر سندھ کو جانے نہ دیں گے۔وہ انگریزوں کے سروں پر بجلی کی طرح کڑک رہا تھا۔انگریزوں کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔وہ وقت دور نہ تھا کہ سندھ کی آزادی کا سورج ایک بار پھر طلوع ہوجاتا مگر اسکو مشیت ایزدی ہی کہنا چاہیئے کہ اچانک تیز و تند ہوائیں چلنے لگیں جن سے اتنا گرد و غبار بلند ہوا کہ آدمی کو آدمی دکھائی نہ دیتا۔

ایسے میں انگریزوں کا زرخرید محمد خاں تھوڑہ جو سندھی لشکر میں شامل تھا وہ ہلکے ہلکے قدم اٹھاکر میر شیر محمد کے ذخیرہ بارود کے قریب پہنچا اور اس میں اس نے آگ لگادی۔غداری کی یہ نظیر صفحات تاریخ میں ڈھونڈھنے سے نہ ملے گی کہ آگ کی ایک چنگاری سے محمد خاں تھوڑہ نے سندھ کی پشت کے بجائے ماتھے پر غلامی کا داغ لگادیا۔

بارود ایک دھماکے کے ساتھ اڑی تو ہر طرف ہلچل پڑگئی اور انگریزوں نے مقدر کو سازگار دیکھ کر ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو جمادیا۔شکست یقینی ہوچکی تھی۔سپاہیوں کے دل ٹوٹ چکے تھے پھر بھی سندھ کے سالاران لشکر آخری سانس تک لڑتے رہے اور انگریزوں کی لاشیں دور دور تک پھیلاتے رہے۔

ہوش محمد کا تو یہ عالم تھا کہ وہ جدھر جاتا دور دور انگریز زخمیوں کی قطاریں بناکر بڑھتا رہتا۔قبضہ شمشیر اسکی انگلیوں میں پیوست تھا وہ بڑھتا جارہا تھا اور شمشیر گویا خود بخود گردش کررہی تھی مگر تابہ کے۔آخر وہ بھی گرگیا لیکن مرنے کے بعد اسکی

انگلیاں تلوار کے قبضے میں پیوست رہیں جو کئی اوزاروں کی مدد سے ڈھیلی کی گئیں۔

انگریز کمانڈر چارلس اسکی بہادری سے اتنا متاثر تھا کہ اس نے اسکی تجہیز و تکفین فوجی احترام کے ساتھ کرائی اور اعزاز کیلیئے اسکی قبر پر ایک توپ نصب کرادی

میر شیر محمد خاں کے بڑے بڑے جیالے سپاہی اور سردار مارے جاچکے تھے۔وہ خود زخموں سے چور چور تھا مگر میدان چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔اب وہ فتح کے بجائے میدان جنگ کی موت کیلیئے لڑرہا تھا لیکن بعض ہواخواہ کھینچ کھانچ کر اسکو نکال لے گئے اور وہ نصرپور ہوتا ہوا میرپور چلا گیا۔وہاں سے سازوسامان لیکر ریگستان آگیا جہاں اسکے اہل و عیال پہلے ہی جاچکے تھے۔

سندھ کی شجاعت کے بچے کھچے عناصر اب بھی اسکے ساتھ تھے۔چانڈیہ بلوچ اور ٹالپر امراء دریا عبور کرکے سکرنڈ میں اس سے ملنے والے تھے۔شیر محمد شاہ پور جاکر سے سکرنڈ کی طرف روانہ ہوا کہ انگریزوں کی گھوڑ سوار فوج نے اسکو آگھیرا۔شیر محمد خاں نے پیٹھ دکھانا ننگ قرار دیا۔کونہیرہ کے مقام پر پیدل فوج نے سواروں کا مقابلہ کیا اور دو سو لغاری جوان مارے گئے۔

رات کے اندھیرے میں وہ میرپور ماتھیلہ روانہ ہوا۔اہل سندھ نے ابھی ہمت نہیں ہاری تھی لوگ اس کا پتہ لگالگا کر اسکے گرد جمع ہورہے تھے اور ایک بڑا لشکر اسکے پاس جمع ہوگیا تھا کہ میر علی مراد خاں نے اپنے وسائل سے اسکے امراء میں پھوٹ ڈلوادی۔وہ اس کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر جانے لگے اور سندھ کا شیر قندھار کا عازم ہوگیا۔وہاں کے سرداروں نے اسکی مدد کی لیکن انگریزوں کے مقابلے میں انکی حیثیت ہی کیا تھی۔

ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد میر شیر محمد نے اپنے آپ کو گورنر پنجاب کے حوالے کردیا۔عام حالات میں اسکو تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا لیکن اب ہندوستان میں انگریزوں کی پالیسی بدل رہی تھی اس لئے گورنر نے اسکی ہمت اور بہادری کے صلے میں کچھ وظیفہ مقرر کردیا۔

عمر کے آخری حصے میں وہ اپنے بھائی کے ساتھ میرپور آیا تھا۔کبھی کا نسلی حکمراں اب ایک عام شہری تھا مگر وہاں کا ذرہ ذرہ اب بھی اسکے قدموں کے نیچے بچھ

جاتا تھا آخر ۱۸۷۷ء میں وہ وہیں کی خاک کا پیوند ہو گیا۔

میران سندھ اب ماضی کی ایک کہانی بن چکے ہیں مگر ان کا حب وطن ، رعایا پروری ، غریب نوازی اور علم دوستی آج بھی سندھ میں ضرب المثل ہے ۔ کاش ان میں بہادری کے ساتھ باہمی اتحاد بھی ہوتا تو سندھ سات سمندر پار کے تاجروں کے ہاتھوں لٹنے سے بچ جاتا ۔(۵۷)

ہندوستان

اسلام کا پہلا آوازہ کوہ صفا کی چوٹی سے بلند ہوا جو مکے کے در و دیوار میں گونج کر ریگزار عرب کے ذرے ذرے کو سنائی دیا ۔ پھر سفارت الہی کے آخری نمائندے کی معجز نمائی سے ایوان کسریٰ کے منہدم کنگروں سے جاکر ٹکرایا تو اسکی آواز بازگشت چین کے قصر شہنشاہی میں گونجی اور فضائے بسیط میں جذب ہو کر اطراف واکناف عالم میں پھیلی اور غیر شعوری طور پر بندرا بن کے گوپیوں اور اجودھیا کے برہمنوں کے کانوں میں پڑی اور جب عکاظ کا میلہ مشرف بہ اسلام ہو گیا اور ایام حج میں شمال وجنوب ، مشرق و مغرب کے تاجر مکے میں جمع ہوئے تو پیغمبر عرب کا ابتدائی پیغام لے کر اپنے اپنے اوطان کو واپس ہوئے ۔ یہ پیغام خلاصہ تھا پچھلے چالیس سال کی بے نام تعلیمات کا جو وحدانیت اور انسانیت پر مشتمل تھیں ۔ کرشن کنھیا اور رام چندرجی کے حلقہ بگوش اسکو سن کر کچھ چوکنا ضرور ہوئے مگر انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے کسی ترمیمی شکل میں خود ان کے عقائد پیش کیے جا رہے ہوں ۔

عرب تاجروں نے سواحل ہند کو اسلام کے ابتدائی خال و خد سے آشنا کیا مگر کوئی واضح تصویر سامنے نہ آسکی ۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے کچھ لوگ وقتاً فوقتاً عرب پہنچے اور حضورؐ کی حیات میں اور حضورؐ کے بعد اسلام کو سمجھنے کی کوششیں کرتے رہے ۔ بعض روایات کے مطابق امام جعفر صادقؑ کی درس گاہ سے بھی کسی پنڈت نے فیض حاصل کیا تھا ۔ ہو سکتا ہے کہ انفرادی طور پر وہ اسلام کی حقانیت سے متاثر ہوا ہو لیکن مجموعی طور پر ہندوستان اسلام سے ناآشنا رہا اور اس سرزمین پر اسلام ایک علامت استفہامیہ بنا رہا؟

ہندوستان سے مسلمانوں کا ربط عملی طور پر غزنی کے عروج سے شروع ہوا اور سبکتگین کے پہلے حملے کے بعد سے درہ خیبر کے دامن میں اسلام کو کچھ کچھ سمجھنے کے حالات پیدا ہوئے لیکن گنگا وجمنا کا متمدن دوآبہ اور گھاگرا اور سرجو کے کنارے پہلے

کی طرح اسلام سے انجان بنے رہے ۔ دین عرب کا کوئی صحیح مفہوم ان کی سمجھ میں آ ہی نہ سکتا کیونکہ اب تک کسی نے ان کو کچھ بتایا ہی نہ تھا لہٰذا ان کے ذہنوں میں اسلام پہلے ہی کی طرح استفسار طلب تھا ۔

یہ تو انہیں سلطان محمود کے حملوں کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام کیا ہے ؟

غزنی

سلطان محمود کا مقصد دوسرے سلاطین کی طرح شاید ملک گیری نہ تھا بلکہ صرف لوٹ مار ، غارت گری اور حصول دولت تھا ۔ تب ہی تو جب وہ حملے کے بعد غزنی واپس ہوتا تو میدان کے میدان لاشوں سے پٹے ہوئے چھوڑ جاتا ، معبدوں کو ویران اور انسانوں کو کنگال بنا جاتا ۔ مہاتما گوتم کی سرزمین پر اسی کو اسلام سمجھا گیا ۔

اسلامی اقتدار کا یہ کردار شرعی نقطہ نظر سے متنازعہ مسئلہ رہا ہے ۔ ہمیں اس پر کوئی بحث مقصود نہیں ہم تو غزنی کے اس عظیم فرمانروا کو شیعہ زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہمیں دمشق و بغداد کے بعد غزنی کے ایوان سادات کے خون سے رنگین دکھائی دیتے ہیں ۔ بلاشبہ محمود نے شیعوں کے خون کی اتنی ارزانی نہیں کی ، جسکی مثالوں سے بنی امیہ کا پورا عہد بھرا ہوا ہے اور جس کی نظریں منصور دوانیقی اور متوکل نے پیش کی ہیں لیکن اس کو تو اکثر مورخین تسلیم کرتے ہیں کہ سلطان محمود کو شیعوں سے سخت دشمنی تھی ۔ وہ ان کی پرچھائیں تک برداشت نہ کر سکتا ۔ چند اکابر کو جو اس نے نظرانداز کر دیا تھا اس کا سبب صرف یہ تھا کہ اس کے دور میں ان کا مثل مل نہ سکتا ۔ کہاں سے لاتا محمود حکیم فردوسی جیسا باکمال اور ابو ریحان البیرونی کا ساہمہ جہت عالم اور ریاضی داں ۔

محمود کی شیعہ دشمنی کے یوں تو بہت سے واقعات ہیں ان میں ایک سامنے کی بات سندھ پر اسکا حملہ ہے بعض مورخین نے اس کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر ابن اثیر جیسے بے باک مورخ نے لکھ ہی دیا کہ منصورہ پر محمود کا حملہ صرف اس لئے ہوا تھا کہ اہل منصورہ مذہب سے پھر گئے تھے یعنی اسمٰعیلی شیعہ ہو گئے تھے ۔

اس میں شک نہیں کہ محمود نے بعض بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ۔ اس کے حملوں کے نتیجے میں کچھ مسلمان ہندوستان کے مختلف حصوں میں رہ گئے مگر ہمارے نزدیک اس سے شیعیت اور اسلام دونوں کو شدید دھچکا لگا البتہ اس زاویہ

نگاہ سے اسکے بھانجے مسعود غازی نے دین کی گرانمایہ خدمات انجام دیں جن کا مزار بہرائچ میں آج بھی عقیدت گاہ عوام و خواص ہے اور ہندوستان میں جسکے ورود سے مختلف مقامات پر مسلم خاندان بس گئے جنہوں نے آگے چل کر شہاب الدین غوری کا خیر مقدم کیا ۔ شیعیت کو محمود سے کوئی شکایت نہیں کیونکہ وہ تو اول دن سے ظلم و تشدد سہنے کی عادی رہی تھی لیکن اسلام کی ایک غلط تصویر اجنبی ملک میں پیش ہو جانا بہر طور قابل غور ہے جس کو معین الدین اجمیری جیسے اولوالعزم بزرگ نوک پلک سے درست نہ کرتے تو پوری ہندو قوم نہ جانے کب تک غلط فہمی میں پڑی رہتی اور یہی سمجھتی رہتی کہ اسلام نام ہے قتل و غارت کا اس میں انسان اور انسانیت کیلئے کوئی جگہ نہیں لیکن خدا رحمت کرے ان صوفیائے کرام کا جن کا مقصد حیات ہی پیغمبر عرب کے دین کو اطراف و اکناف عالم میں پہنچانا تھا ۔ وہ ایک جذب و کشف کی کیفیت میں ہر کفرستان کی طرح ہندوستان میں بھی وارد ہوئے ۔ اپنے مخصوص انداز میں پہلے عوام سے خلا ملا پیدا کیا پھر انہیں کی زبان میں عبد و معبود کی حقیقتوں کو بیان کرنا شروع کیا اور اسکی تان اسلام پر جا کر توڑی ۔

یہ صوفی نہ شیعہ تھے نہ سنی ، ان میں کی اکثریت صرف محمدؐ اور آل محمدؐ کو جانتی تھیں اور انہیں کا تعارف اس نے اجنبی لوگوں سے کرایا ۔ حتیٰ کہ غزنویوں کا پورا زمانہ گزر گیا اور حکومت غزنی کے افق پر غور کا سورج طلوع ہونے لگا

غور

امیرالمومنین حضرت علیؑ کی خلافت ظاہری میں شنسب ابن حریق سیستان کی ایک بڑی حکومت کا فرمانروا تھا جسکی حدود ایک طرف ایران سے مکران تک ، دوسری طرف غور اور فیروزہ کوہ کے اس پار تک پھیلی ہوئی تھیں ۔ شنسب خود کوفہ جا کر امیرالمومنین کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا تھا اور اس وقت سے اسکی مملکت میں نعرہ ہائے اہل بیت بلند ہوتے رہے تھے ۔

یہ حکومت مختلف اوقات میں اپنی سرحدیں بدلتی رہی مگر فرمانروائی آل شنسب کے ہاتھ میں رہی ۔ آل شنسب اب ایک قبیلہ نہ رہا تھا بلکہ اسکی بہت سی شاخیں ہو گئی تھی مگر وہ سب اولاد فاطمہ زہرا کی حلقہ بگوش تھیں اور اسکے اثرات اندرون سندھ تک وسعت پذیر تھے ۔

بنی عباس نے جب کالا لباس پہن کر انتقام خون حسین کا آوازہ بلند کیا تو آل شنسب کا ایک قبیلہ ابو مسلم کے ساتھ تھا پھر بنی صفار کے عروج میں بھی ایک شنسبی سردار مصروف جہاد پایا گیا اس دوران کس کس نے خلافت کو تسلیم کیا اسکا کوئی سراغ نہیں ملتا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دامن اہل بیت کسی فرد واحد کے ہاتھ سے بھی نہیں چھوٹا اوران کی حکومت نوعیت بدل بدل کر باقی رہی۔

غزنی میں سبکتگین کی حکومت کے قیام کے بعد نسل ضحاک کی یہ حکومت مصائب کا شکار ہونا شروع ہوئی اور سلطان محمود کے دور میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

بقول "فرشتہ" ذریت ضحاک میں دو بھائی سور اور سام غزنوی غلبہ کا بری طرح شکار ہوئے، کتنے قتل ہوئے، کتنے جلاوطن ہوگئے اس کا اندازہ کسی تاریخ سے نہیں ہو سکتا البتہ یہ کہا جاسکتا ہے آل شنسب سلطان محمود کے ہاتھوں اس طرح تباہ ہوئی کہ فیروزہ کوہ کے پھیلے ہوئے دیہات میں کچھ لوگ نہایت بدحالی میں باقی رہ گئے باقی مخلوط آبادی میں ضم ہوگئے یا ناپید ہوگئے۔

سام ہندوستان کے طرف بھاگ گیا اور ایک طویل مدت کے بعد وہ وطن واپس ہو رہا تھا کہ کشتی دریا میں غرق ہو گئی اور اس کا جواں سال بیٹا اعزالدین حسین بچ کر ساحل بکنار ہو گیا اور کسی طرح فیروزہ کوہ تک جا پہنچا جہاں وہ ڈاکوؤں کا سردار بن گیا پھر گرفتار ہو کر قید کر دیا گیا سات سال بعد اس نے زندان سے رہائی پائی تو اپنے قبیلے کو منظم کرنے کی فکر کی۔

دوسرے بھائی سور کی اولاد نے غزنی کی پناہ لے لی تھی جو بالآخر فیروزہ کوہ میں آکر آل شنسب کے باقیات الصالحات سے آملی۔

پھر علاء الدین حسین جہاں سوز بن اعزالدین حسین نے غزنی پر چڑھائی کی اسکو جلا کر خاک کر دیا سلاطین غزنویہ کی قبروں تک کو کھدوا ڈالا اور خود واپس آگیا

بہاء الدین سام اعزالدین کے بیٹے غیاث الدین اور معزالدین اسکے بھتیجے تھے جو استقرار حکومت میں اسکے دوش بدوش رہے۔ یہ دونوں شجاعت و سخاوت میں چچا سے بہت بڑھے چڑھے تھے۔ علاء الدین حسین نے کسی غلط فہمی میں انکو قید کر دیا جو اسکے بیٹے سیف الدین محمد کے عہد میں رہا ہوئے اور برسر اقتدار آئے۔ (۵۸)

غیاث الدین جب غور کا بادشاہ ہوا تو اسکے بھائی معزالدین عرف شہاب الدین نے توسیع مملکت کیلئے پہلے سلطنت غزنویہ کی حدود کو منتخب کیا پھر فتح ہندوستان کا منصوبہ بنایا۔

خاندانی ناموں کے لحاظ سے ان کے نام غیاث الدین حسین اور معزالدین حسین تھے مگر زباں زد صرف غیاث الدین اور معزالدین ہوئے۔

اس طرح سلطنت غزنی کے کھنڈروں پر غور کا ایوان حکومت تعمیر ہوا سلطان غیاث الدین بڑا بھائی ہونے کے باعث بادشاہ تھا اور شہاب الدین اس کا نائب لیکن عملی طور پر سارا نظم مملکت شہاب الدین کے ہاتھ میں تھا۔

امیر سبکتگین اور سلطان محمود نے آل شنسب کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو اٹھا رکھا ہو بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا نام ونشان تک مٹا دیا تھا۔ اسکو تو مشیت الہی کہنا چاہئے کہ باقیات الصالحات فیروزہ کوہ میں موجود تھے اور خاندان کے مختلف گروہ جو ادھر ادھر منتشر ہوگئے تھے، ان کی نسلیں، جہاں جہاں تھیں، اطلاع پا کر یکجا ہو گئیں اور تاراجی اور بربادی کی وہ داستانیں بیان کی جانے لگیں جو سینہ بسینہ چلی آرہی تھیں۔

غزنوی طوفان نے ذریت ضحاک کو مٹا کر خاک کر دیا تھا مگر ہوا کا رخ بدلنے پر اس خاک سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں پھر یہ چنگاریاں شعلہ بن گئیں۔ سلاطین غزنی نے ستم کے جو پہاڑ ڈھائے تھے، وہ مرنے کے بعد خود ان پر ٹوٹے۔ دانستہ یا نادانستہ محمود کی قبر تو رہ گئی باقی تمام مزارات منہدم کر دئے گئے اور سبکتگین کی قبر کھود کر اسکی ہڈیاں تک نکال کر پھینک دی گئیں۔ سبکتگین نے اپنے جور و ستم کا آغاز بھی اسی طرح کیا تھا اور بعض امرائے شنسب کی لاشیں تک جلوا دی تھیں کیونکہ وہ آل رسولؐ کے طرفدار تھے۔

شنسبین حریق کی نسلوں کو چار سو سال سے زائد گزر چکے تھے۔ دو ڈھائی صدی تک تو وہ اپنے مسلک پر سختی سے قائم رہیں اور یونہی سلطنت کے وجود تک ان کے عقائد میں کوئی تبدیلی نہیں آئی مگر سلطنت غزنی نے جب اطراف وجوانب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو جانیں تک محفوظ نہ رہیں اور عقیدے میں جبریہ تبدیلی

شروع ہو گئی پھر کھلے قتل عام کے بعد بقیتہ السیف نے تقیہ اختیار کر لیا اور اس طرح
شنسب جیسے راسخ العقیدہ شیعہ کی نسلیں آہستہ آہستہ غزنوی عقیدے کی حامی بن
گئیں لیکن ایک بڑی تعداد اب بھی شیعہ تھی۔ غیاث الدین اور شہاب الدین کے
بارے میں یقین سے کہا نہیں جا سکتا کہ وہ شیعہ تھے یا سنی مگر یہ بات تاریخی طور پر
ثابت ہے کہ:۔

" بنی امیہ کے عہد میں جمیع ممالک اسلام میں بر سر منابر اہل بیت کو ناسزا
کہتے تھے مگر غور والے مرتکب اس امر شنیع کے نہیں ہوئے۔" (۵۹)

خود سلطان غیاث الدین کو بھی اسپر فخر تھا کہ غور میں علیؑ اور اولاد علیؑ پر
کبھی تبرا نہیں کیا گیا، نہ سلطنت غزنی کے قیام سے پہلے اور نہ سلطنت غزنی کے
نیست و نابود ہونے کے بعد۔ اس سے مطلب واضح طور پر یہی نکلتا ہے کہ شہاب
الدین غوری کے پیش رو اور بعد میں آنے والے جنہوں نے اپنا قدیم عقیدہ بدل دیا
تھا، وہ بھی کسی طرح دشمن اہل بیت نہ تھے بلکہ حضرت علیؑ کی فضیلت کے قائل
تھے۔ اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ شیعہ تھے۔ ان سے بھی کہیں کہیں شیعوں کو
نقصان پہنچا ہے مگر سبکتگین کی طرح شیعہ کشی انکی گھٹی میں نہیں پڑی تھی کیونکہ
شیعہ اسلاف کی سنی اولاد تھے۔

غزنی و غور

غور و غزنی کا توازن و تقابل کیا جائے تو مسلمان ہونے کے باوجود دونوں
میں کئی تضادات نظر آئیں گے اور محسوس ہوگا کہ غزنی کی تعمیر دمشق کی مٹی سے
کیگئی تھی۔ بنی امیہ نے جو کچھ سادات کے ساتھ کیا تھا غزنی میں اسکی پوری تقلید کی
گئی اور دور دور تک جہاں کہیں علیؑ کے دوستوں کا پتہ چلا، کوشش کر کے انکا قلع قمع
کر دیا گیا۔

تبرا میں غزنی دمشق کی پوری تقلید نہ کر سکا کیونکہ دمشق میں ستر ہزار
منبروں سے علیؑ اور اولاد علیؑ کو برا کہا جاتا تھا غزنی میں صرف ایک محفل منعقد کی جاتی
اور اس میں نام بنام لعنت بھیجی جاتی تھی۔ شنسبی حکومت ختم ہو چکی تھی ورنہ اسکے
جواب میں وہاں مدح علیؑ کے قصیدے پڑھے جاتے۔ اب اسکی جگہ غور کی سلطنت

قائم ہوئی تو سلطان غیاث الدین نے اعلان کر دیا کہ غور آل رسولؐ کا دوست ہے
دشمن نہیں۔

سلطان محمود اور شہاب الدین غوری کا موازنہ کیا جائے تو دونوں میں یہی
نمایاں فرق دکھائی دے گا۔ ایک کے دل میں علیؑ کی دشمنی کا ابال، دوسرے کے دل
میں علیؑ کی محبت کے سوتے پھوٹتے نظر آئیں گے۔ شہاب الدین کی حد تک کہا جا سکتا
ہے کہ اسکی رگوں میں دوڑنے والا شنسب کا خون اس سے حب آل رسولؐ کا تقاضا
کرتا رہا ہوگا۔

مورخین سلطان محمود کے اسلامی کارناموں کو اچھالتے ہیں۔ شاید محبان علیؑ
کی عداوت بھی ان کارناموں میں شامل ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ فقیہان
اسلام نے بھی ناروا خونریزی اور کھلی ہوئی غارت گری پر کوئی فتویٰ نہیں لگایا اور غیر
مسلم عبادت گاہوں پر ڈاکہ ڈالنے کو جہاد کہہ دیا۔ حالانکہ ان کے زاویہ نگاہ سے بھی
دیکھا جائے تو جہاد سلطان شہاب الدین غوری کا تھا جو ہندوستان پر اس لئے حملہ آور
ہوا تھا کہ وہاں مسلم حکومت قائم کرے۔

پرتھوی راج کے مقابلے میں سلطان غوری کی پہلی شکست سے اسکی شجاعت
پر کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ وہ حد سے زائد زخمی ہونے کے باوجود میدان سے ہٹنا نہ
چاہتا تھا مگر اس کا غلام رزم گاہ سے اسکو نکال لے گیا۔

بلاشبہ شہاب الدین بہادروں کی نسل سے تھے۔ اس شکست کو وہ بھول نہ
سکا۔ دو سال تک اس نے خون آلود کپڑے نہیں اتارے، اوپر سے شاہی لباس پہنتا
رہا۔ دو سال تک زمین پر لیٹتا رہا اور جب پوری فوجی تیاری کر لی تب دوبارہ فتح یا
موت کا نعرہ لگا کر غور سے روانہ ہوا۔

پرتھوی راج ہندوستان کی راجپوت شجاعت کا ورثہ دار تھا۔ اسکو شکست دینا
آسان نہ تھا مگر نوشتہ ازل میں ہندوستان میں مسلمان حکومت کا قیام خوش نصیب
شہاب الدین کے نام لکھ دیا گیا تھا۔ وہ بڑی بے جگری سے لڑا اور دہلی پر اس نے اپنا
پرچم لہرا دیا۔

ہمارا زاویہ نگاہ تسخیر ممالک کے اس انداز کا متحمل نہیں ہوتا ہم تو اسلام کو

دلوں میں آباد کر دینے کے قائل ہیں ۔ شنسب کا نام جسکی نظیر بن سکتا ہے تاہم تسخیری
نظریے سے شہاب الدین کے طریقے کو برداشت کیا جاسکتا ہے جس کا نتیجہ کم سے کم
اتنا ضرور نکلا کہ قطب الدین ایبک کی پہلی مسلم سلطنت کی بدولت مسلمان تیزی
کے ساتھ ہندوستان پہنچنے لگے اور اہل ہند کو پیغمبرؐ عرب کا مذہب کسی حد تک سمجھنے کا
موقع ملا۔

سلطان محمود نے غزنی کا خزانہ زروجواہر اور سومناتھ کی مورتیوں سے بھر دیا
تھا لیکن اس کا انجام کیا ہوا؟ خود وہ مرنے سے قبل اس انبار کو دیکھ دیکھ کر روتا تھا،
اپنے ساتھ کیا لے گیا؟ اسکے برعکس شہاب الدین غوری کا جب نام آتا ہے تو وہ
ہندوستان کی مسلم فرمانروائی کا نقطہ آغاز قرار پاتا ہے۔

مسلمانوں کی جنگوں کا فیصلہ فقہی نقطہ ہائے نگاہ سے ذرا مشکل ہے ۔ فقہاء
سے کسی جنگ کے بارے میں استفتاء لیا جائے تو فتاوے مختلف ہوں گے ۔ فقہ
امامیہ تو صرف ان جنگوں کو اسلامی کہے گی جو اسلام اور صرف اسلام کیلئے لڑی گئی
ہوں اور انکی نوعیت بھی دفاعی ہو جارحانہ نہ ہو ۔ فقہ امامیہ کسی متمدن قوم پر
بلا سبب حملے کو جائز قرار نہیں دیتی تاوقتیکہ اس قوم کی طرف سے خود مسلمانوں پر
حملے کا خطرہ نہ ہو اور مسلمانوں پر مسلمانوں کی یلغار تو صرف ازالہ ظلم کیلئے جائز
ہو سکتی ہے ۔ فقہ حنفی میں بھی اسی طرح کی پابندیاں ہیں مگر ان میں قدرے لچک
پائی جاتی ہے لیکن بعد کے مجتہدین اور ائمہ نے ان میں بڑی کشادگی پیدا کر دی ہے ۔
امام احمد بن حنبل، امام غزالی اور امام ابن تیمیہ کے موقف اگرچہ یکساں نہیں پھر
بھی وہ اس مسئلے میں زیادہ پابندیاں عائد نہیں کرتے انجام کار بعض مقامات پر ان
میں ایک الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

بات صرف سلطان غزنی یا شہاب الدین غوری کے حملوں کی نہیں ہے، ان
سلاطین کی بھی ہے جو تسخیر ملک کیلئے ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے ۔ سلطان محمود
نے کسی کمزور شیعہ مملکت کو ہڑپ کر لیا تو فقیہہ کہہ دے گا کہ محمود کٹر سنی تھا، اسکو
حق پہنچتا تھا، اہل بدعت کو قتل کر دے مگر جب سنی حکمراں سنی سے ٹکراتا ہے تو کچھ
کہتے بن نہیں پڑتا۔

تاریخ میں ایسے ان گنت محاربات ہیں اور حیرت ہوتی ہے جب ان کو بھی
جہاد قرار دیا جاتا ہے ۔ امیر تیمور جب ترکان عثمانی پر حملہ آور ہوتا ہے تو دونوں طرف
سے نعرہ ہائے اللہ اکبر بلند ہوتے ہیں ۔ بابر جب ابراہیم لودی سے ٹکر لیتا ہے اور شیر
شاہ سوری جب ہمایوں پر یلغار بولتا ہے تو نعرے وہی بلند ہوتے ہیں جو اسلامی
جنگوں میں لگائے جاتے رہے ۔ ان مواقع پر فقیہوں سے دریافت کیا جائے تو دونوں
طرف سے حق بجانب ہونے کے فتوے مل جائیں گے لیکن فقہ امامیہ کسی کو حق
بجانب قرار نہ دے سکے گی ۔ ملک گیری کیلئے کوئی جنگ ہمارے نزدیک اسلامی
نہیں ہو سکتی خواہ وہ محمود نے لڑی ہو یا شہاب الدین نے۔

لیکن شہاب الدین کا ہندوستان پر حملہ کفرستان میں اسلامی حکومت قائم
کرنے کیلئے تھا اس لئے وہ ماضی کی بعض جنگوں کی تعریف میں آسکتا ہے جن میں
ہونیوالی خونریزی کسی طرح مستحسن نہ تھی تاہم نتائج کے اعتبار سے بعض افادی پہلو
ضرور برآمد ہوئے۔

ہمارے مولیٰ علی ابن ابی طالب نے ایسی کسی جنگ کو کبھی نہیں سراہا
لیکن مسلمان جب جنگ میں پھاند ہی پڑے تو اہل اسلام کی بقاء کی خاطر حضرت عمرؓ
کو گرانقدر اور بروقت مشورے دئے اور تعاون بھی کیا۔

اسی طرح شہاب الدین غوری کے پرتھوی راج پر حملے کا کوئی جواز نہیں ہے
مگر چونکہ اسکی نیت میں غارت گری اور لوٹ مار کے بجائے مسلمانوں کی حکومت کا
قیام تھا لہذا شرع کی حدود و قیود سے قطع نظر اس کے حملہ میں ایک پسندیدہ پہلو بھی
ہے اور ممکن ہے کہ اس کا کوئی فقہی جواز بھی مل جائے۔

احسان ہے شہاب الدین غوری کا کہ اس نے ہندوستان میں قطب الدین
ایبک کے استقرار حکومت سے اسلام کا وہ پرچم نصب کر دیا جس نے کوہ ہمالہ سے
راس کماری تک اور غور سے بنگال تک چپے چپے کو اپنے سائے میں لے لیا اور اس
عہد کا آغاز کر دیا جو مستقبل کے ہزار سال تک چلتا رہا اور جسکی بدولت مشرکوں کی
سرزمین پر توحید کا بول بالا ہوتا رہا۔

ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ

قطب الدین ایبک

قطب الدین ایبک کا عقیدہ کیا تھا؟ اسکو سمجھنے کیلئے اس پورے دور کا جائزہ لینا پڑے گا، جب آل شنسب غزنوی غلبے میں پس رہی تھی۔ زندگیاں بچانے کا اسکے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ عقیدہ بدل دیا جائے یا ترک وطن کرکے غزنویوں کی دست رس سے دور نکل جائے۔ یہی ہوا کہ ایک تعداد ہندوستان میں جابسی، کچھ لوگوں نے عقیدہ کا سودا کرلیا، تھوڑے سے لوگ روپوش ہوگئے۔ نسلوں پر نسلیں گزرتی چلی گئیں اور کئی سو برس کے بعد فیروزہ کوہ سے آل شنسب کے باقیات الصالحات انگڑائیاں لیکر نکلے تو تھوڑے سے لوگ اثنا عشری عقائد کے حامل تھے باقی خلافت کے قائل مگر حضرت علیؑ کی افضلیت کو مانتے تھے اور خلافت علیؑ کے بعد صرف سلسلہ اہل بیت ان کا مرجع عقیدت تھا۔

معزالدین حسین المعروف بہ شہاب الدین کا مسلک بھی یہی تھا لہذا قطب الدین ایبک کے بارے میں بھی ایسا ہی کچھ سمجھا جاسکتا ہے جبکہ اسکے ساتھ ہندوستان میں رہ جانیوالے بارہ امامی بھی تھے اور چار یاری بھی لیکن ایسے چار یاری جو حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علیؑ کے بعد صرف آل رسولؐ کے قائل تھے۔ یہی عقیدہ ہندوستان میں حنفی اکثریت کا رہا۔

تاج الدین یلدوز اور دوسرے امراء کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ ان میں سے بعض شیعہ بھی تھے۔

سلطان شمس الدین التمش

ایک عالم و فاضل اور درویش صفت فرمانروا تھا حنفی العقیدہ مگر محب اہل بیت اسکی بیٹی رضیہ سلطانہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شیعہ ہوگئی تھی لیکن اس زمانے میں عقیدے کی تفریق اتنی نمایاں نہ تھی کہ کوئی امتیاز کیا جاتا۔ عاشور محرم کو شہادت نامہ پڑھا جاتا تو اس میں سب ہی شریک ہوتے شیعوں کے گھروں میں جو مجلسیں ہوتیں ان میں بھی اہل سنت شرکت کرتے۔

معز الدین بہرام شاہ

اس کے دور کی بھی یہی کیفیت رہی۔

سلطان علاء الدین مسعود شاہ

یہ بھی اسی مسلک پر قائم رہا۔

سلطان ناصر الدین محمود

عالم و فاضل اور مرد فقیہہ تھا۔ یہ بھی اہل بیت کرام کی عظمت کا قائل تھا۔

سلطان غیاث الدین بلبن

اس کی بھی اہل بیت دشمنی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بات یہ تھی کہ ان سب کے سامنے امور مملکت کے سوا دوسرے مسائل زیادہ اہمیت نہ رکھتے۔ جو امراء خلافت کے قائل نہیں تھے، وہ اس موضوع کو زیر بحث نہ لاتے۔ رہ گیا ذکر کربلا تو اس سے کسی سنی کو بھی کوئی اختلاف نہ تھا۔ جہاں کہیں مجلس منعقد ہوتی جس کا جی چاہتا اس میں شریک ہوجاتا۔ اس وقت تک ہندوستان میں بدعت کی ہوا پھیلی نہ تھی۔

سلطان معز الدین کیقباد

اس کی تین سالہ حکومت فیروزشاہ خلجی کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ اسکے بعد علاء الدین خلجی، شہاب الدین خلجی، قطب الدین مبارک شاہ، تخت سلطنت پر بیٹھے جن کا شیعوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر غیاث الدین تغلق نے تخت پر قبضہ کرلیا۔

غیاث الدین تغلق

اس کے بعد ۷۲۵ھ میں سلطان محمد تغلق سریرآرائے سلطنت ہوا۔ اسکی طویل حکومت کے بعد ۷۵۲ھ میں فیروز شاہ تخت نشین ہوا پھر غیاث الدین تغلق باربک، ابوبکر شاہ، سلطان ناصرالدین محمد، سکندر شاہ، ناصرالدین محمود عنان سلطنت سنبھالتے رہے اور اسی زمانے میں امیر تیمور صاحبقران ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔

یہ تمام حکمراں سنی تھے لیکن ان سب کے عہد میں شیعہ مسلک کے امراء کسی نہ کسی حد تک حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ ان میں سے

بعض اپنے عقائد میں متعصب بھی تھے پھر بھی کسی نے شیعوں پر ایسا ظلم نہیں کیا کہ غزنی کی یاد تازہ ہو جاتی بلکہ بکثرت ایسے شواہد ملتے ہیں کہ بعض سلاطین نے شیعہ دوستی کا ثبوت دیا۔

ہندوستان میں امیر تیمور کی فتوحات کا تعلق شیعوں سے صرف اسقدر ہے کہ اسکی فوج میں شیعہ مسلک کے بہت سے امراء اور شیعہ سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد شامل تھی ورنہ ایسی کوئی تسخیری مہم کو ہمارے عقیدے سے کوئی واسطہ نہیں۔

تیمور خونخوار تھا یا ظالم اسکو ہندوستان کی سرزمین جانتی ہوگی جس نے اس سے قبل سکندر اعظم سے سلطان محمود غزنوی تک کتنے ہی فاتحین کی یلغاروں کو جھیلا تھا اور زمانے کی گرد سے خون آلود مٹی کی سرخی کو صاف کیا تھا ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ تیمور بھی دوسرے جنگ آزماؤں کی طرح تلوار سے اپنا مقدر بنانے کیلئے نکلا تھا۔ بڑا مال غنیمت حاصل کیا اس نے اور اسے دل کھول کر سپاہیوں میں تقسیم کیا۔

پھر جب وہ پلٹا تو ملتان و دیپالپور کی حکومت خضر خاں کو تفویض کی۔ دوآبے پر ملو اقبال خان نے قبضہ کر لیا۔ گجرات خان اعظم خاں، مالوہ دلاور خاں، قنوج اودھ، کڑہ اور جونپور سلطان الشرق خواجہ جہاں کے حصے میں آیا جن میں باہم نبرد آزمائی ہوتی رہی۔ شہاب الدین غوری کے لواحقین کا آخری حکمراں ناصرالدین محمود بھی ان میں ایک فریق تھا وہ ۸۱۶ھ میں انتقال کر گیا اور سید خضر خاں حاکم پنجاب دہلی کے تخت پر بیٹھ گیا۔

سید خضر خاں ولد ملک سلیمان

امیر تیمور کا معتمد تھا۔ شروع میں اس نے سکہ و خطبہ بھی میرزا شاہرخ کا جاری کیا تھا عقیدہ اثنا عشری نہیں تھا لیکن آل رسولؐ کی عظمت کا قائل تھا اور سادات کی عزت کرتا تھا۔

مبارک شاہ

۸۲۳ھ میں باپ کے انتقال پر تخت نشین ہوا۔ تیرہ سال بڑی خوبی سے حکومت کی، سازش سے قتل ہوا۔ تاریخ مبارک شاہی اسکے نام پر ہے۔

سلطان محمد شاہ

غدار امراء میں گھرا ہوا تھا۔ ۸۴۹ھ میں اس نے وفات پائی۔

علاء الدین بن محمد شاہ

اس کی تخت نشینی میں بہلول لودھی حاکم پنجاب نے شرکت نہیں کی۔ اس نے دہلی کے بجائے بدایوں کو پایہ تخت بنالیا۔ بہلول لودھی نے امراء کو ملا کر دلی پر قبضہ کر لیا اور ۸۸۴ھ میں علاء الدین کے مرنے پر بادشاہ بن گیا۔

سلطان بہلول لودھی

نسلاً افغان تھا اسکے زمانے میں جونپور میں سلطان شرقی کی حکومت قائم ہو چکی تھی جس سے بہلول کے کئی معرکے ہوئے مگر وہ مملکت شرقیہ پر قبضہ نہ کر سکا ۸۹۴ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

سلطان سکندر لودھی

ایک کامیاب فرمانروا تھا، خداترس اور منصف مزاج بھی۔ اسکی سلطنت اور مدت سلطنت دونوں وسیع تھیں۔ ۹۲۳ھ میں انتقال کیا۔

ابراہیم لودھی

سکندر لودھی کا بڑا بیٹا تھا۔ باپ کے مرنے پر بادشاہ ہوا۔ ایک باصلاحیت حکمراں تھا مگر بعض امراء اس سے خوش نہ رہ سکے۔ ظہیر الدین محمد بابر نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو پانی پت کے میدان میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ (۶۰)

شاہان شرقیہ

امیر تیمور کے پنجاب کی جانب مراجعت کرنے کے بعد خواجہ جہاں نے بھی دوسرے علاقائی حکمرانوں کی طرح جونپور میں اپنی آزاد حکومت قائم کرلی۔ خواجہ تغلق عہد میں مختلف عہدوں پر فائز رہا تھا اور اس علاقے کا گورنر بھی جس پر اب اس نے اپنی آزاد سلطنت کا پرچم لہرایا تھا۔

جونپور کی بنیاد ۷۶۰ھ میں فیروز شاہ تغلق نے ڈالی تھی اور اسکو آباد کرنے میں بڑا التزام کیا تھا۔ اس وقت خواجہ جہاں دلی میں بادشاہ کی نیابت کر رہا تھا۔ اب ۸۰۱ھ میں اس نے اسی شہر کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا تھا۔ سلطان الشرق اور اتابک اعظم کے خطابوں کے ساتھ اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کیا تھا، کول، قنوج، بہار اور ترہٹ کے علاقے اسکے زیرنگیں تھے۔

خواجہ جہاں بہت جہاندیدہ، تجربہ کار اور شجاع حکمراں تھا لیکن وہ اپنی مملکت کو قدرے وسیع کرنے کے سوا کوئی کارنمایاں انجام نہ دے سکا اور ۸۰۲ھ میں خالق حقیقی سے جاملا۔

شمس الدین مبارک شاہ

خواجہ جہاں کا بیٹا تھا جو باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔ بعض مورخین نے اسکو گود لیا ہوا بیٹا تحریر کیا ہے۔ ملو اقبال خاں حاکم بیانہ سے مدد لے کر اس پر چڑھ دوڑا مگر شکست کھا جانے کے ڈر سے واپس ہوگیا۔ ۸۰۴ھ میں ناصرالدین محمود ایک لشکر جرار کے ساتھ عازم جونپور ہوا لیکن قنوج پر قبضہ کر کے واپس ہوگیا۔ مبارک شاہ اسکو جواب دینے کیلئے جونپور سے چلا مگر راستے میں اس کا انتقال ہوگیا۔

ابراہیم شاہ

اس کا جانشین ہوا۔ اس نے اپنی حکومت کا آغاز فوج کی نئی تنظیم سے کیا پھر ایک لشکر لیکر محمود شاہ سے انتقام لینے کیلئے روانہ ہوا۔ دونوں فوجیں جب آمنے سامنے خیمہ زن ہوئیں تو محمود شاہ کے کئی سردار ابراہیم شاہ کا پلڑا بھاری دیکھ کر اس سے آملے اور مقابلے میں سلطان محمود شاہ کو شکست فاش ہوئی۔

ابراہیم شاہ شرقی سنبھل کی طرف روانہ ہوا اور اسکو مسخر کر کے تاتار خاں کو وہاں گورنر بنادیا۔

محمود شاہ دلی واپس ہوچکا تھا۔ ۸۱۶ھ میں ابراہیم نے پھر جونپور سے دلی کا رخ کیا، راستے میں ناصرالدین محمود شاہ کے خود اپنی طرف پیشقدمی کرنے کی خبر ملی تو ابراہیم شاہ فوراً پلٹ پڑا محمود شاہ نے سنبھل فتح کرلیا اور دلی واپس ہوگیا۔ اسکے بعد ہی اسکا انتقال ہوگیا۔

کچھ دنوں بعد سلطان ابراہیم شاہ تسخیر کالپی کے ارادے سے چلا اور بھوگاؤں فتح کر کے بدایوں کی طرف بڑھا کہ حاکم بیانہ کا قاصد مدد کیلئے اس سے آکر ملا۔ بیانہ مبارک شاہ کی طرف سے ملک مبارز نے فتح کرلیا تھا اور کالپی کا عازم تھا۔ سلطان شرقی حاکم بیانہ کی درخواست پر اسکی جانب متوجہ ہوا تو خود مبارک شاہ دلی سے چل کر مقابلے پر آگیا۔ جمنا کے کنارے موضع اترولی کے قریب دونوں لشکر قریب پہنچے۔ سلطان شرقی دریا عبور کر کے برہان آباد میں خیمہ زن ہوا اور مبارک شاہ قصبہ مالی کوٹہ میں۔

سلطان شرقی نے صورت حال کو سمجھ کر بیانہ کا رخ کیا اور دریائے کنہری کے نزدیک جاکر ٹھہر گیا اور مبارک شاہ اس سے دس میل کے فاصلے پر آکر مقیم ہوا اور دونوں نے اپنے اپنے لشکروں کے گرد خندقیں کھودلیں۔

اس اثناء میں مبارک شاہ نے شرقی لشکر پر شب خوں مارنا شروع کردیا آخر ایک دن دونوں فوجوں کے سرداروں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی اور اندھیرا ہونے پر لشکر اپنے اپنے پڑاؤ پر واپس آگئے۔

سلطان شرقی شروع ہی سے محسوس کر رہا تھا کہ مبارک شاہ بہت بڑے لشکر کو لیکر آیا ہے جسکو شکست دینا آسان نہیں ہے اسی لئے وہ مقابلے کو ٹال رہا تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ موقع سے ٹل جائے اور دوسرے ہی دن اس نے میدان سے کوچ کر دیا۔

مبارک شاہ بھی اپنی جگہ خائف تھا۔ اس نے تعاقب نہیں کیا اور بڑھ کر بیانہ پر حملہ آور ہو گیا۔ محمود خاں حاکم بیانہ قلعہ بند ہو گیا مگر اب اسکو سلطان شرقی سے مدد کی امید نہ رہی تھی لہذا اس نے مبارک شاہ کی اطاعت کر لی۔

۸۳۷ھ میں سلطان مبارک شاہ نے دریائے جمنا کے کنارے ایک شہر مبارک آباد کے نام سے بسایا۔ اس درمیان اسکو خبر ملی کہ ابراہیم شاہ شرقی اور ہوشنگ شاہ مالوی کے درمیان کالپی کیلئے جنگ ہو رہی ہے۔ مبارک شاہ کو بڑا ارمان تھا کہ وہ ایک بار سلطان شرقی کو ہرادے لہذا موقع سے فائدہ اٹھاکر وہ دلی سے مبارک آباد آیا جہاں سرور الملک وزیر کے آدمیوں نے اسپر حملہ کر دیا۔

سرور الملک عرصے سے گھات میں لگا ہوا تھا۔ مبارک شاہ کے قتل کے بعد اس نے محمد شاہ کو برائے نام بادشاہ بنا دیا اور سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے

سلطان الشرق ابراہیم کیلئے دلی پر حملہ کرنے کا بہترین وقت تھا۔ ۸۴۴ھ میں وہ جونپور سے نکلا اور نواح دلی کے اکثر مقامات مفتوح کر لیے۔ محمد شاہ میں مقابلے کی طاقت نہ تھی۔ اس نے صلح کی درخواست کی اور اپنی بیٹی کی شادی شاہزادہ حسین بن ابراہیم شاہ کے ساتھ کر دی۔

اس عرصے میں قادر خاں حاکم کالپی نے میدان خالی پاکر جونپور پر حملہ کر کے بڑی غارت گری کی اور کافی آدمی قتل کر ڈالے۔ ابراہیم شاہ یہ خبر پاکر تیزی کے ساتھ واپس ہوا اور کالپی اور اسکے مضافات کو تہس نہس کر دیا پھر مظفر و منصور جونپور واپس آگیا۔ اسی سال اس عظیم فرمانروا نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

وہ صحیح معنی میں سلطان الشرق تھا۔ سخی و شجاع، رعایا پرور اور علم دوست۔ سارا ملک اسکے عہد میں خوشحال رہا اور جونپور نے تو اتنی ترقی کی کہ شیراز ہند مشہور

ہو گیا۔ دور دور سے صوفیائے کرام، علمائے عظام، شاعران باکمال اور ادبائے ذی منزلت جونپور آکر آباد ہوئے۔

یوں تو سارے سلاطین شرقیہ اثنا عشری عقیدہ رکھتے تھے لیکن سلطان ابراہیم شاہ ان میں ممتاز تھا، بڑا عبادت گزار متقی اور پرہیزگار کتنی ہی عمارتیں اسکی یادگار ہیں اور بعض مسجدیں اور امام باڑے شہادت دیتے تھے کہ وہ ابراہیم شاہ کے بنوائے ہوئے ہیں۔

اسکے قبول عام کا یہ عالم تھا کہ موت کی خبر سنتے ہی سارا شہر ماتم کدہ بن گیا اور بڑے بڑے درویش تک سیاہ پوش ہو گئے۔

سلطان محمود شاہ

سلطان ابراہیم کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا محمود تخت شرقیہ پر بیٹھا اور بزرگوں کی طرح رعایا اور فوج کی فلاح و بہبود کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سلطان محمود خلجی حاکم مالوہ سے سلطان ابراہیم کے تعلقات اچھے رہے تھے اور کالپی اس کا تابع تھا لیکن نصیر خاں بن قادر خاں حاکم کالپی نے خلاف اسلام روش اختیار کر لی تھی لہذا سلطان محمود شرقی نے اسکی شکایت حاکم مالوہ کو لکھ بھیجی لیکن نصیر خان نے کچھ ایسی چالیں چلیں کہ جونپور اور مالوہ کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اور سلطان محمود خلجی ایک لشکر لے کر مملکت شرقیہ پر چڑھ دوڑا۔

محمود شرقی بھی اطلاع پاکر مقابلے پر آیا۔ دونوں میں کئی جنگیں ہوئیں۔ آخر شیخ الاسلام جائیلدہا نے بیچ میں پڑکر صلح و صفائی کرادی۔ طے پایا کہ چار ماہ بعد نصیر خاں کالپی اور ایرچہ سلطان الشرق کے حوالے کردے۔

کچھ دنوں بعد سلطان محمود نے جسادن کے خلفشار کو دور کیا اور بعض پرگنوں اور قصبوں میں تھانے قائم کیے پھر اوڈیسہ پر حملہ کیا جہاں ہندوؤں نے مسلمانوں کو پریشان کر رکھا تھا اور اسکو مسخر کر کے واپس ہوا۔

۸۸۵ھ میں بہلول لودھی دلی کے تخت پر قابض ہو چکا تھا اور ہر طرف ایک انتشاری کیفیت تھی لہذا ۸۵۶ھ میں سلطان شرقی بھی طالع آزمائی کیلئے نکلا اور اس

نے پہنچتے ہی دلی کو حصار میں لے لیا۔ سلطان بہلول لودھی اسکے دفاع کیلئے دیپال پور سے چلا لیکن اسکے ساتھ ہی اس نے سلطان الشرق کے لشکر میں سازش کا جال بچھا دیا اور عین لڑائی میں شرقیوں کا ایک افسر فوج لودھیوں سے جا ملا۔

سلطان محمود شرقی نے شکست سے بچنے کیلئے میدان جنگ سے کوچ کر دیا لیکن لودھی لشکر عقب سے حملہ آور ہو گیا۔ مقابلے میں ایک بڑا شرقی افسر فتح خاں ہروی کام آیا اور سات جنگی ہاتھی لودھی پکڑ لے گئے۔

آخر ایک دن طرفین میں سخت معرکہ ہوا مگر فتح و شکست کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ شام کو فوجیں واپس ہوئیں تو طرفین کے بعض سرداروں سے نامہ و پیام شروع کر دیا اور فیصلہ اسیر ہوا کہ جتنا ملک مبارک شاہ کے پاس تھا، بہلول لودھی اسیر قانع رہے اور جو حدود سلطان ابراہیم کی سلطنت کی تھیں محمود شاہ ان سے تجاوز نہ کرے

لیکن بہلول لودھی نے معاہدے کی خلاف ورزی کی، شمس آباد پر لشکر کشی کر کے اسے رائے کرن کے حوالے کر دیا اور سلطان محمود شاہ کو شمس آباد کی طرف کوچ کرنا پڑا۔ دریا خاں اور قطب خاں نے اسکو روکا اور رات میں خاموشی سے اسپر حملہ کر دیا مگر شرقی سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔

اسی درمیان ۸۶۲ ھ میں محمود شاہ کا انتقال ہو گیا اور امرائے سلطنت نے جونپور میں اسکے بڑے بیٹے محمد شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔

سلطان محمود شاہ سے بہلول لودھی کی صلح ہو گئی تھی جب وہ واپس دلی پہنچا تو اسکی بہن نے اپنے شوہر قطب خاں کا مطالبہ کیا جو جونپور میں قید تھا۔ سلطان بہلول پھر پلٹ پڑا۔ سرستی پور کے قریب سلطان محمد شاہ اسکے مقابل آکر خیمہ زن ہوا۔

کوئی خاندان جب ادبار کی زد پر آتا ہے تو پہلے اس میں پھوٹ پڑتی ہے۔ ایسا ہی کچھ جونپور کے اس شاہی خاندان میں بھی پیش آیا اور سلطان محمد شاہ کی ناعاقبت اندیشی اور فرعونیت نے شاہی افراد کے مابین رخنے ڈال دئے۔

غلط فہمیاں دلوں میں گھر جاتی ہیں تو مشکل سے نکلتی ہیں اور محمد شاہ کا انداز تھا بھی ایسا ہی کہ ماں اور بھائی سب اس سے مشتبہ تھے لہذا اس کا چھوٹا بھائی

شاہزادہ حسین بہلول لودھی کے ہراول کو روکنے کے بہانے ایک فوج لے کر اس سے علیحدہ ہو گیا پھر شاہزادہ جلال اسکے پیچھے ہو لیا۔

بہلول لودھی کی فوج کو اس نے شاہزادہ حسین کا لشکر سمجھا اور اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ بہلول کی فوج نے اسکو گرفتار کر لیا اور بہلول نے اسکو دلی بھیج دیا۔ اسکے بعد محمد شاہ تاب مقابلہ نہ لا سکا اور قنوج کا عازم ہو گیا۔

ماں کو ان واقعات کی خبر ہوئی تو اس نے امراء کے مشورے سے محمد شاہ کو معزول کر دیا اور اسکے بجائے شاہزادہ حسین کو تخت نشین کر دیا۔

یہ تھی اس عظیم سلطنت کے زوال کی ابتداء جس نے تقریباً ایک صدی سے تدبر اور بہادری کی بے مثال نظیریں پیش کی تھیں اور معاشرے کی وہ خدمات انجام دی تھیں جنکے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔

محمد شاہ دریائے گنگا کے کنارے گھاٹ اجگر کے قریب فرد کش تھا۔ شرقی لشکر اسکو گرفتار کرنے کیلئے پہنچا تو اس نے مقابلہ کیا اور لڑتا ہوا مارا گیا۔

سلطان حسین شاہ ، سلطان الشرق

سلطان حسین ایک جیالا فرمانروا تھا۔ وہ بہلول لودھی سے صلح کر کے اوڑیسہ پر لشکر کش ہوا۔ راجہ نے اطاعت کر لی اور سلطان کامگار و کامراں جونپور واپس ہو گیا۔

۸۷۱ ھ میں اس نے قلعہ بنارس کی مرمت کرائی اور وہاں سے راجہ گوالیار کو مطیع کیا۔

۸۷۸ ھ میں سلطان حسین نے تسخیر دلی کا عزم کیا۔ بہلول لودھی نے سلطان محمود خلجی سے مدد طلب کی مگر اس کا جواب آنے سے قبل سلطان حسین جا پہنچا اور تمام اطراف دلی پر متصرف ہو گیا۔ بہلول لودھی نے دلی کے ارد گرد اٹھارہ کوس تک کا علاقہ چھوڑ دینے کی درخواست کی مگر اسکو شاہ حسین نے منظور نہ کیا۔ مجبوراً بہلول لودھی اٹھارہ ہزار سوار لیکر دلی سے نکلا اور دریا کے کنارے سلطان حسین کے مقابل آکر ٹھہر گیا۔

شاہ حسین کے سردار مضافات پر غارت گری کرنے کیلئے گئے ہوئے تھے۔

بہلول نے ایک مقام پر دریا کو عبور کیا اور اچانک اسکے سر پر جا پہنچا۔ سپاہ بادشاہ کی غفلت کے باعث قتل ہونے لگی اور اس نے راہ فرار اختیار کی۔ مجبوراً شاہ حسین کو بھی بھاگنا پڑا۔ ملکہ جہاں اور خواتین بھی گرفتار ہو گئیں مگر بہلول نے انہیں بعزت شاہ حسین کے پاس بھجوادیا۔

ملکہ جہاں نے پہلی بار بھی شاہ حسین کو دلی کی فتح پر اکسایا تھا۔ اسکی پھر اس نے آمادہ کرنا شروع کیا۔ شاید وہ اپنے اسلاف کی حکومت شوہر کو دلوانا چاہتی تھی۔

سلطان حسین جب اپنے لشکر کے ساتھ دلی کے قریب پہنچا تو بہلول لودھی نے پھر معذرت کی مگر شاہ حسین کو اپنی طاقت پر ضرورت سے زائد اعتماد تھا یا مشیت الہی میں یہی لکھا تھا کہ وہ تدبر سے کام نہ لے۔ انجام کار مقابلہ ہوا اور جونپور کی فوجیں ہزیمت یاب ہوئیں۔

سلطان حسین ذرا بھی عقل سے کام لیتا تو تباہی اس کا مقدر نہ بنتی لیکن پہلی شکست کے بعد دوبارہ وہ زیادہ تیاری سے گیا اور منہزم ہوا۔ اسکی پھر اسکے لئے سنبھل جانے کا موقع تھا مگر بد نصیبی دامن کش تھی وہ پھر بھی ہوش میں نہ آیا اور تیسری بار پھر حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ تو اسکو ایسی شکست ہوئی کہ وہ گھوڑے سے کود کر فرار ہوا اور دور کے مقبوضات میں پناہ گزیں ہوا۔

بہلول لودھی نے جونپور پر قبضہ کرلیا جسکے بعد وہ صحیح معنی میں بادشاہ ہندوستان تھا۔

جونپور کی حکومت بہلول نے اپنے بیٹے باربک شاہ کو دیدی تھی۔ بہلول کی وفات کے بعد شاہ حسین نے باربک شاہ کو بھڑکا کر دلی پر حملہ کرادیا مگر سکندر لودھی کے مقابلے میں باربک شاہ نے شکست کھائی اور بھاگ کر جونپور میں پناہ لی۔ سلطان حسین نے اسکے بعد دو مرتبہ سکندر لودھی کا مقابلہ کیا مگر قسمت اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی ہر مرتبہ اسکو ناکامی ہوئی۔ وہ اپنے خسر سلطان علاء الدین کے پاس چلا گیا جہاں اسکو باقی زندگی عیش و آرام سے گزارنے کا موقع تو مل گیا مگر اسکی ہمت اتنی پست ہو چکی تھی کہ پھر اس نے ملک گیری کا تصور تک نہیں کیا اور باقی زندگی

دوسروں کے رحم و کرم پر گزار لے گیا۔

سلطان حسین میں بہادری کی کمی نہ تھی۔ وہ دوسرے سلاطین ماسبق کی طرح تلوار کا دھنی تھا لیکن شاید فہم و فراست سے بالکل خالی تھا جسکے نتیجے میں ۸۸۱ھ میں اسکے ہاتھوں سلطنت شرقیہ کا چراغ گل ہو گیا۔

شرقی سلطنت کے بعد

سلطنت شرقیہ کا دورانیہ صرف اسی سال کا تھا لیکن اس مدت میں عوام پر اسکے اثرات اتنے گہرے تھے کہ سلطان حسین کے بعد لودھی حکمراں شرقی حدود میں بہت دنوں چین سے بیٹھ نہ سکے۔ بات یہ تھی کہ سلاطین شرقیہ صحیح معنی میں رعایا کو اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ بلا امتیاز مذہب و ملت وہ سب کے آرام کا خیال رکھتے اور انفرادی و اجتماعی سطح پر ان کے مسائل پر توجہ دیتے۔ اسی لئے وقتاً فوقتاً ہندو و مسلمان رعایا بغاوت کرتی رہی۔

ایک بار تو ٹھاکروں نے باربک شاہ پر حملہ کر کے اسکو جونپور سے نکال دیا اور قلعہ میں آگ لگادی۔ تفصیل یوں بیان کی جاتی ہے کہ انہوں نے جوگا سنگھ کی قیادت میں ایک فوج مرتب کی۔ اس میں وہ سپاہی بھی شامل تھے جو سلطنت الشرق کے لشکر میں شامل رہے تھے۔ انہوں نے جونپور فتح کر کے مبارک خاں لوہانی کو دریا پار کرتے ہوئے گرفتار کرلیا۔ سکندر لودھی خبر پاکر اپنی پوری طاقت یکجا کر کے جونپور پہنچا۔ رائے بھید نے خائف ہو کر مبارک خاں لوہانی کو رہا کردیا۔ چونکہ راجپوت سکندر کے طوفانی لشکر کا مقابلہ نہ کرسکتے اس لئے جوگا سنگھ فرار ہو کر سلطان حسین شاہ کے پاس چلا گیا۔

سلطان الشرق قلعہ بند ہو گیا لیکن بزرگوں کے گرم اور شریف خون نے بزدلی کی موت مرنے کے عار قرار دیا اور ایک دن وہ پھاٹک کھول کر مقابلے پر آ گیا۔ ایک غیر متوازن مگر گھمسان کا معرکہ ہوا۔ راجپوت اور مسلمان بہادر زخم کھا کھا کر گرتے رہے مگر انہوں نے میدان نہ چھوڑا مگر تابہ کے آخر سلطان حسین کے ساتھ صرف چند جانباز رہ گئے جو سلطان حسین کو نکال لے گئے۔ یہ اسکی آخری جنگ تھی جسکے بعد وہ بنگال کی طرف چلا گیا اور پھر اس میں کبھی مقابلے کی طاقت پیدا نہ ہو سکی

خلیق احمد نظامی کمپر ہینسیو ہسٹری آف انڈیا نے اسکو خراج تحسین پیش کیا تھا۔

سلطان الشرق مبارک شاہ کے بعد سلطان الشرق حسین شاہ سلاطین شرقی میں دوسرا نامور بادشاہ ہوا جو صاحب علم و صاحب سیف تھا۔ سکندر لودھی سے بار بار شکست کھانے کے بعد اس نے مرتے دم تک شکست قبول نہیں کی اور بار بار مقابلے پر آتا رہا۔ رعایا اس سے محبت کرتی تھی اور وفادار تھی۔

یہانتک کہ چھتریوں نے جونپور پر حملہ کرکے سکندر لودھی کے بھائی کو زبردست شکست دے کر جونپور پر قبضہ کرلیا۔ سلطان حسین شاہ نے جتنے دن بادشاہت کی کبھی سکون نصیب نہیں ہوا ہمیشہ میدان جنگ میں نظر آیا لیکن رعایا سے کبھی غافل نہیں ہوا۔ وہ ایک متقی، پرہیزگار، عبادت گزار اور نیک سیرت بادشاہ تھا۔(٦١)

یہ سلطنت اب ماضی کی ایک کہانی بن چکی ہے لیکن اس نے جونپور کو جو زندگی دی تھی اسی کی بدولت وہ ابتک زندہ ہے۔ کہاں فیروز شاہ تغلق کا وہ شہر جو اس نے ۷٦٠ ھ میں آباد کیا تھا اور کہاں سلاطین الشرق کا جونپور جو اہل علم اور صاحبان کمال کے سبب شیراز مشرق تھا اور ہندوستان کے عظیم شہروں میں اسکو برتری حاصل تھی۔

سلاطین الشرق کی تعمیرات بھی منفرد تھیں اور مسجدیں اور امام باڑے خستہ حالی کے باوجود اپنے بانیوں کی بے پناہ عقیدت اور شغف ایمانی کے شاہد ہیں!

مغل سلطنت

(ہندوستان میں)

ظہیر الدین محمد بابر ہندوستان میں مغل حکومت کا نقطہ آغاز تھا اور تیمور کی سلطنت کا پانچواں وارث۔ اسی لئے اس نے ابراہیم لودھی کو لکھا تھا کہ اگر وہ پنجاب اور وہ تمام علاقے جو تیمور نے اپنی سلطنت میں شامل کیے تھے اسکو واپس کردے تو بابر باقی ہندوستان کیلئے کوئی تعرض نہ کرے گا۔

فی الوقت بابر کے پاس نہ کوئی بڑی حکومت تھی اور نہ بڑی فوج لیکن اسکو اپنے جنگ آزمودہ سرداروں پر اعتماد تھا اور فرمانبردار سپاہیوں کی شجاعت پر پورا بھروسا لہذا بارہ چودہ ہزار کے لشکر کو وہ لاکھوں پر بھاری سمجھتا۔

محمد بابر مرزا ہوش سنبھالنے کے بعد سے خود اپنے خویش واقارب اور چنگیز خاں کی اولاد سے برسرپیکار رہا تھا، قدم قدم پر نت نئی مشکلات سے دوچار رہا تھا اور زور بازو کے بل پر ہر بھنور میں اپنا راستہ خود بناتا آیا تھا، البتہ وہ شکر گزار تھا شاہ اسمٰعیل صفوی کا جس نے شیبانی خاں کو قتل کرنے کے بعد اوزبکوں کے مقابلے میں دس ہزار فوج سے اسکی مدد کی تھی۔ بابر بخارا کی فتح کو صفوی بادشاہ کی دین سمجھتا تھا مگر شیبانی خاں کے جانشین تیمور سلطان نے جلد ہی اسکو واپس لے لیا۔

دوسری بار پھر قزلباش سپہ سالار نجم الثانی نے اسکی تحریک پر اوزبکوں سے جنگ کی اور اپنے غرور کے سبب مارا گیا۔ بابر مرزا کو بے سروسامانی میں یہ علاقے خالی کرنا پڑے مگر ہمت مرداں کے سہارے اس نے افغانوں کا بڑا علاقہ مسخر کرلیا پھر ۹۲۵ ھ میں قندھار فتح کیا ۹۳۰ ھ میں داخل ہندوستان ہوا۔

بابر کو بارہا ساتھیوں کی بیوفائی کے سبب میدان چھوڑنا پڑا تھا پھر بھی بہت سے ساتھی اور سپاہی ایسے تھے جن پراسے پورا اعتماد تھا جن میں بڑے ناموں، خواجہ مہدی وغیرہ، کے ساتھ ایک چھوٹے سے افسر جواں سال بیرم خاں ترکمان کا نام بھی تھا جسکو بابر نے چھوٹی سی عمر میں ایک سپاہی کی حیثیت سے بھرتی کیا تھا اور کچھ ہی دنوں میں ایک دستہ فوج کا افسر بنادیا تھا۔

پنجاب اور پنجاب سے آگے بڑھتے ہی اسکے افسروں کا بار بار لودھی فوجوں سے سامنا ہوا لیکن فتح بابر کا مقدر بن چکی تھی۔ پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی سے بابر کا فیصلہ کن معرکہ ہوا اور یہ معرکہ ہندوستان میں مغل سلطنت کا سنگ بنیاد بن گیا۔

دوسری شہرہ آفاق جنگ رانا سانگا مہارانا چتور سے ہوئی اور اسکی فتح نے بابر کو شہنشاہ ہندوستان بنادیا۔ اسکے بعد دہلی میں اقامت گزیں ہوکر بابر نے تحائف اور بعض نادرات مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، نجف اشرف اور کربلائے معلی روانہ کیے اور جو علماء و فضلا اسکے ساتھ تھے انکو بھی نذرانے پیش کیے

بابر عقیدے کے لحاظ سے حنفی المسلک تھا مگر ہر قسم کی عصبیت سے پاک اور محب اہل بیت اور غیر شیعہ اولاد تیمور میں بیشتر کا یہی مسلک تھا۔ اسی لئے اسکی فوج میں افسروں اور سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد شیعہ تھی اور وہ اسکے وفادار بھی تھے صفویوں سے اسکے گہرے روابط تھے اور بنظر غائر دیکھا جائے اور بابر کی پچھلی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو بابر کے ارتقاء میں اسکی خداداد صلاحیت کے بعد صفویوں کے تعاون کو دخل تھا۔

۹۳۷ھ میں اس کا انتقال ہوا اور ہمایوں اسکے بجائے ہندوستان کے تخت پر بیٹھا

نصیر الدین محمد ہمایوں

بابر اعظم کا ہونہار بیٹا تھا مگر قسمت کا ہیٹا تھا بابر نے ایک وفادار فوج اسکے لئے چھوڑی تھی مگر نزدیک و دور کے بعض حکمرانوں نے غداری کی۔ ہمایوں نے مختلف

جنگوں میں مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن نامساعد حالات میں شکست کھانا پڑی۔ مقدر ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اپنے خون جگر دشمن ہوگئے اور ہمایوں ہر طرف سے دشمنوں میں گھر گیا۔ آخر شیر شاہ سوری کے ہاتھوں ہزیمت یاب ہوکر سندھ کی طرف روانہ ہوا اور وہاں سے کابل کا عازم ہوگیا۔

بھائیوں سے ہمایوں کے معرکے اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ہوس ملک گیری میں خون کے رشتے بھی قابل لحاظ نہیں ہوتے بلکہ حق وراثت کے سبب مستوجب قتل قرار پاتے ہیں۔

اب سمرقند و بخارا کے فرمانروا اور ہندوستان کے شہنشاہ بابر کا وارث پوری طرح سپاہ ہوچکا تھا۔ تھوڑے سے وفادار ساتھی رہ گئے تھے جن میں ایک بیرم خاں ترکمان بھی تھا جسکو بابر کی مردم شناس نظر کا انتخاب کہنا چاہئے کہ آغاز شباب میں جب وہ اسکی فوج میں شامل ہونے کیلئے گیا تو پہلی ہی نگاہ میں بابر نے ہاتھ پکڑ کر اسکو صف سے الگ کرلیا۔

وقت اتنا بدل چکا تھا کہ ہمایوں جدھر جاتا دوستوں کی طرف سے دشمنی کا سلوک کیا جاتا ایسے میں بیرم خان نے سابقہ روایات کے مطابق شاہ صفوی سے رجوع کرنے پر توجہ دلائی تو ہمایوں کو بھی اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اب بیرم خاں ہمایوں کا واحد سہارا رہ گیا تھا۔ وہ بابر کے عہد سے ترکمانوں میں جانا پہچانا جاتا تھا اور بہت سے معزز ایرانی اسکے دوست رہے تھے جو شاہ طہماسپ صفوی کے دور فرمانروائی میں معزز عہدوں پر فائز تھے۔ بیرم خاں نے پہلے سے خطوط بھیج کر ان سے رابطہ قائم کرلیا تھا جنہوں نے ہمایوں کے حالات شاہ طہماسپ کے گوش گزار کردئے تھے۔

بیرم خاں نہیں چاہتا تھا کہ ہمایوں کو کسی سائل کی طرح شاہ صفوی کے پاس لے جائے اس لئے اس نے پہلے سے زمین ہموار کرلی تھی۔

" ہمایوں بیرم خاں اور اکیس آدمیوں کے ساتھ پہلے خراسان پہنچا پھر وارد سیستان ہوا۔ سرحد پر شاہ طہماسپ کی ہدایت کے مطابق احمد شاہ شاملو نے استقبال

کیا اور سیستان لے جا کر بعزت وتکریم فرائض میزبانی بجالایا۔ عورتوں نے اسی طرح
مریم مکانی کو ٹھہرایا۔ وہاں سے ہمایوں ہرات آیا جہاں بڑے شاہزادے سلطان محمد
کی طرف سے اسکے اتالیق محمد خاں تکلو نے خیر مقدم کیا اور احترام و تعظیم میں کوئی
دقیقہ فرگزاشت نہ کیا۔

ہمایوں بے سروسامانی کے عالم میں تھا۔ شاہ طہماسپ نے قبل سے تمام
حکام کو فرامین بھیج دئے تھے کہ شاہ ہمایوں کیلئے تمام لوازمات شاہی فراہم کیے جائیں
اسے پورا عمل کیا گیا اور ہمایوں نے حدود ایران میں اسی جاہ و حشم سے سفر کیا گویا
وہ شہنشاہ ہندوستان اور فرمانروائے سمرقند ہو۔

پھر ہمایوں نے ہرات سے مشہد مقدس کا سفر کیا اور زیارت سے مشرف
ہو کر قزوین کی طرف قدم بڑھایا۔ راستے میں اکابر و امرائے عراق ضیافت کا اعزاز
حاصل کرتے رہے۔ قزوین میں ہمایوں اقامت گزیں ہو گیا اور دوست صادق بیرم
خاں کو شاہ طہماسپ کی خدمت میں روانہ کیا۔" (۶۲)

بیرم خاں شاہ طہماسپ کی خدمت میں باریاب ہوا اور پوری طلاقت لسانی
کے ساتھ عرض مدعا کیا۔ وہ صرف رزم گاہ کا شیر ہی نہ تھا کئی علوم کا ماہر اور بلبل ہزار
داستان بھی تھا اس نے شاہ طہماسپ کو متاثر کر لیا اور جمادی الاول ۹۵۱ھ میں قزوین
سے تھوڑے فاصلے پر "بیلاق قیدار نبیؑ" میں ہمایوں سے اسکی ملاقات کرادی۔

ایران میں ہمایوں کے ساتھ جس عزت و احترام کا برتاؤ کیا گیا اور اسکے آرام و
اسائش اور تفریح کے جو لوازمات مہیا کیے گئے انکو وہ کبھی فراموش نہ کر سکا۔

شاہ طہماسپ تقریباً مدد دینے کیلئے ہموار ہو چکا تھا مگر امراء اور ارا کین دولت
میں ایک بڑی تعداد اسکے حق میں نہ تھی کہ ایرانی لشکر کا کوئی حصہ صرف اخلاقی
تقاضے پورے کرنے کیلئے داؤں پر لگایا جائے۔ شاہی خاندان کے بعض لوگ بھی
اسکے حامی تھے۔

ایک دن شاہ طہماسپ کی بہن سلطان بیگم، ناظر دیوان قاضی جہاں قزوینی
اور حکیم نورالدین جو محرموں میں تھے، ان سب نے باہم ایک مشورہ کیا اور ہمایوں

کے اعزاز میں ایک مخصوص دعوت کا التزام کیا اور سلطان بیگم براہ راست ہمایوں
سے مخاطب ہو گئی۔ پہلے اس نے ایک رباعی پڑھی جسکا مطلب یہ تھا۔

"ہم دل و جان سے اولاد علی کے غلام ہیں، ہمیشہ علیؑ کا ذکر کے خوش ہوتے
ہیں اور چونکہ علی کی ذات گرامی سے اسرار ولایت ظاہر ہوتے ہیں اس لئے ناد علی کو
وردزبان رکھتے ہیں"۔

ہمایوں اس رباعی سے محظوظ ہوا تو سلطان بیگم نے کہا۔

"اگر آپ وعدہ کریں کہ اپنے ممالک محروسہ کے منبروں کو منقبت خواناں
آئمہ معصومین سے مزین کریں گے تو آپ کو ممالک موروثی حاصل کرنے کیلئے
کمک دی جا سکتی ہے۔"

یہ جواب تھا ان معترضین کا جو یہ کہتے تھے کہ ہمایوں کی مدد کرنے میں ایران
کا کیا فائدہ ہے؟ ہمایوں نے شاہزادی کے گوش گزار کیا۔

"میرے دل میں تو بچپن ہی سے خاندان رسالت کی محبت جاگزیں ہے۔
کامراں مرزا اور بعض چغتائی امراء سے اختلاف کا یہی سبب ہے۔"

فرشتہ کے اس بیان کی بعض تذکرہ نگاروں نے صراحت کی ہے کہ ہمایوں
شروع ہی سے مائل بہ تشیع تھا اور بیرم خاں کی صحبت نے اس پر جلا کر دی تھی۔
شاہزادی سلطان بیگم کی دعوت میں اس نے کھلم کھلا شیعیت کا اعلان کر دیا تھا اور
ہندوستان میں ترویج شیعیت کا عہد بھی کیا تھا لہذا شاہزادی نے مطمئن ہو کر شاہ
طہماسپ سے سفارش کی اور شاہ صفوی نے داغ خاں قاچار کو دس ہزار سوار دے کر
ہمایوں کے ہمراہ کر دیا۔

ہمایوں شاہ طہماسپ سے رخصت ہو کر پہلے تبریز آیا پھر اردبیل میں مزار شیخ
صفی الدین پر فاتحہ خوانی کی اسکے بعد مشہد پہنچا اور امام رضا کی قبر مبارک کی زیارت کر کے
قندھار کی طرف روانہ ہوا۔

ہمایوں نے ۹۴۷ھ میں شیر شاہ سوری سے شکست کھائی تھی۔ ۹۵۲ھ میں
شاہ طہماسپ سے مدد لیکر افغانستان پہنچا۔ اس عرصے میں شیر شاہ سوری کا شاندار دور
حکومت گزر چکا تھا اور اسکا بیٹا سلیم شاہ تخت نشین ہو چکا تھا۔ ۹۶۰ھ میں سلیم شاہ

کے انتقال پر اس کا کم سن بچہ فیروز شاہ بادشاہ ہوا جسکو اسکے ماموں محمد شاہ نے قتل کر دیا اور خود تخت نشین ہو گیا جسکے عہد میں ہیمو بقال سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا اور مجموعی طور پر شیر شاہ کی سلطنت پانچ حصوں میں بٹ گئی۔ ہمایوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور ۹۶۲ھ میں اس نے دلی اور آگرہ فتح کر لیا۔

مفتی شوکت علی فہمی نے ہمایوں پر تبصرہ کیا ہے

"مذہبی معاملات میں وہ بابر کی طرح فرقہ پرستی سے بہت بلند تھا۔ اسکے دور حکومت میں کسی ایک غیر مسلم کو بھی محض اختلاف مذہب کی بنا پر تکلیف نہیں پہنچی۔ ہمایوں کی اس مذہبی رواداری سے اسکے بھائی کامران نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اس نے کابل میں ہمایوں کے خلاف پروپگینڈا کیا کہ وہ شیعیت اور بے دینی کی طرف جھکا ہوا ہے اور اس کا اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ افغانستان کے علماء نے اسے ہندو نواز کہہ کر اسکے خلاف کفر کے فتوے جاری کر دے تھے۔ ہمایوں نے جب دوبارہ کابل پر قبضہ جمایا تو ان تمام علماء کو قتل کرا دیا جنہوں نے اسکے خلاف کفر کے پروپیگنڈے میں حصہ لیا تھا۔ ہمایوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ شیعہ تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ پکا سنی تھا مگر اہل بیت سے اسکو عشق تھا اس لئے لوگ اسکو شیعہ سمجھنے لگے تھے۔" (۶۳)

ہمایوں حقیقت میں سنی ہو یا شیعہ مگر ایران میں وہ شیعہ تھا اور ہمایوں کے کردار کو دیکھتے ہوئے ناقابل یقین ہے کہ اس نے منافقت کا رویہ اختیار کیا ہو۔ پھر بھی یہ تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ دلی میں وہ سنی تھا بابر کی طرح سنی مگر غلو کی حد تک محب اہل بیت! ہمارا معیار کسی مسلمان کو پرکھنے کا ہے بھی یہی کہ وہ آل رسولؐ کا کس حد تک دوست ہے اور جو آل رسولؐ کا دوست ہے وہ اسکے دشمنوں کا دشمن ضرور ہوگا اور ہمایوں اگر ایسا تھا تو اس نے شاہزادی سلطان بیگم کے سامنے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔

پھر بھی ہمایوں نے منبروں پر ثنائے اہل بیت کرانے کا وعدہ پورا نہیں کیا شاید اسکی الجھنوں یا سیاسی مصلحتوں نے اسکی اجازت یا موقع نہ دیا ہو کیونکہ ۱۱ ربیع الاول ۹۶۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ سال ڈیڑھ سال کی مدت جن حالات میں

گزری وہ صفحات تاریخ میں روشن ہے اس لئے ہمایوں پر بدعہدی کا کوئی الزام لگایا نہیں جا سکتا کیونکہ زمرد کا تعزیہ اس سے منسوب ہے جو اسکے عزادار ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ خدا اسکی مغفرت کرے!

شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر

اکبر ہمایوں کا شہرہ آفاق جانشین تھا جس نے مغل سلطنت کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا، جو اندرونی اور بیرونی طوفانوں کو روکتی ہوئی تقریباً ساڑھے تین سو سال تک ایستادہ رہی۔ مورخین کا فیصلہ ہے کہ یہ دیوار بیرم خاں ترکمان کے کاندھوں پر کھڑی ہوئی تھی۔

بیرم خاں کے مسلک کے بارے میں یہ بدیہی حقیقت ہے کہ وہ شیعہ تھا اور اس کا خاندان کئی پشتوں سے شیعہ تھا پھر بھی بعض مورخین نے لکھ دیا کہ وہ حنفی تھا مگر حضرت علی کو بھی افضل مانتا تھا اور بارہ امام کا بھی قائل تھا۔ عجیب ستم ظریفی ہے کہ اثنا عشری امامت قائل اور سنی!

بہرحال اس کا عقیدہ اگر یہی تھا تب بھی وہ شیعوں میں شامل تھا کیونکہ خلافت کا ماننے والا کبھی سلسلہ امامت کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

تاریخ شیعان علی کا مقصود محبان علیؑ کے کارنامے ہیں اس لئے اس میں بابر کی بھی گنجائش ہے اور ہمایوں کی بھی

بابر حنفی المسلک مگر حد درجہ محب اہل بیت اور شاید اسکے غلو ہی سے بعض متعصب علماء نے اسپر شیعہ ہونے کا فتویٰ لگا دیا تھا اور ہمایوں کو کامران مرزا کی تحریک پر کافر ہی بنا دیا تھا۔ تب ہی ہمایوں نے ایران سے واپسی پر ایسے تمام علماء کو چن چن کر تہہ تیغ کرا دیا تھا۔ یہ انتقام اس نے شیعہ ہونے کی حیثیت سے نہیں لیا تھا اگر اسکو شیعہ کہا جاتا تو وہ بابر کی طرح خاموش ہو جاتا مگر اسکے لئے تو یہ فتویٰ تھا کہ شیعیت کے دائرے میں داخل ہو کر اس نے کفر اختیار کیا ہے۔ ہمایوں کفر کے بہتان کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے ضمیر فروش علماء کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

شیعیت اور کفر صرف آج کے مذہبی بازار کا کھرا سکہ نہیں ہے ابن الوقت

علماء نے ہر دور میں اپنی دوکان چلانے کیلئے اسکو پر کھا ہے اور اپنے حلقے میں چلایا بھی ہے لہٰذا ہمایوں کو اسپر برا فروختہ نہ ہونا چاہیئے تھا۔ سلاطین، علماء اور سیاستدان ہمیشہ کفر و ایمان کے حوالے سے اپنا الو سیدھا کرتے رہے ہیں جیسا کہ اورنگزیب نے داراشکوہ کیلئے کیا تھا اور فی الوقت کامران مرزا مسلم عوام کو ہمایوں کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔

جہاں تک ہندوستان کی مغل حکومت کا تعلق ہے، تاریخی حقائق شاہد ہیں کہ وہ سلطنت صفویہ کی ساختہ تھی۔ بابر نے دو بار شاہ اسمٰعیل سے مدد لی اور ہمایوں جب ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا زمین اسپر تنگ اور آسمان دور تھا تب بیرم خاں آخری سہارے کیلئے اسکو شاہ طہماسپ کی خدمت میں لے گیا تھا اور وہ قزلباشوں کا لشکر ہی تھا جس نے کابل و قندھار فتح کیا تھا اور ہمایوں ان قزلباشوں کا سربراہ تھا قزلباشوں کی وردی پہنے ہوئے اور انکی مخصوص ٹوپی سر پر لگائے ہوئے، فتوحات شاہ طہماسپ صفوی کے پرچم تلے ہوئیں اور ملک ہمایوں کا کہلایا۔

بابر یا ہمایوں کا کوئی قرض سلطنت صفویہ پر نہ تھا جسکو انہوں نے واپس لیا ہو بلکہ برے وقت میں ایک احسان عظیم تھا ان کا جسکو بتقاضائے شرافت کبھی بھولنا نہ چاہیئے تھا۔ ہمایوں ڈوب چکا تھا۔ اس نے ڈوبتے ڈوبتے شاہ طہماسپ کو آواز دی شاہ دوڑ کر آیا اور اس نے ہاتھ پکڑ کر ہمایوں کو باہر نکال لیا۔

اب ہمایوں ملک عدم کا راہی ہو چکا تھا اور اکبر اعظم ہندوستان کا مقدر بن کر دلی کے تخت پر جلوہ افروز تھا تو پھر "شیعہ کافر ہیں" کا نعرہ بلند ہو رہا تھا۔ اکبر کے عہد حکومت میں جس کسی پر شیعہ ہونے کا شک بھی ہو جاتا علماء اسکو ماخوذ کرتے اسکی سزا قتل یا قید دوام سے کم نہ ہوتی۔ اکبر نامہ اور دربار اکبری میں ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں جنکو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اکبر اعظم کا عہد اور یہ ظلم و ستم!

اسکے بعد ابوالفضل ہوں یا فیضی یا خود بیرم خاں، ان کا تقیہ اختیار کر کے اپنے کو حنفی کہہ دینا تعجب خیز نہیں۔

کوئی حد ہے احسان فراموشی کی۔ ہمایوں ابھی کل ایک شیعہ کے دربار میں دامن امید پھیلا کر گیا تھا اس نے یہ دامن بھر دیا تو آج اسکے بیٹے کے عہد معدلت

گستر میں شیعہ گردن زدنی۔ ہمیں اس روش پر کوئی استعجاب نہیں بلکہ امکان اس کا بھی ہے کہ جواباً یہ فرما دیا جائے کہ شاہ طہماسپ خود سنی تھا جیسا کہ پاکستان میں بانی پاکستان محمد علی جناح کو سنی ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔

اتحاد و رواداری بڑی چیز ہے۔ امیر تیمور صاحب قران جس کا علم بردار تھا۔ بابر و ہمایوں اسکے وارث تھے سلاطین صفویہ نے اسلام کی مضبوط رسی کے سہارے ان سے ایسا تعاون کیا جسکی نظیر ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملے گی لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد دلی کے متعصب علماء نے یہ رسی توڑ دی۔ حالات کو سمجھنے کیلئے صرف ایک واقعہ کافی ہوگا۔

"علماء مذکور نے ایک موقع پر چند اہل بدعت تشیع بدمذہبی کے جرم میں پکڑے۔ بعض کو قید کیا بعض کو جان سے مار ڈالا۔

ابوالفضل کہتے ہیں، بعض بدگو ہر میرے والد کو شیعہ سمجھ کر برا کہنے لگے اور نہ سمجھے کہ کسی مذہب کے اصول و فروع کو جاننا اور شئے اور ماننا اور شئے ہے۔

خاص مقدمہ یہ ہوا کہ ایک سید عراق (ایران) کا رہنے والا یگانہ زمانہ تھا۔ وہ ایک مسجد میں امام تھا اور علم کے ساتھ عمل کا پابند تھا۔ علمائے وقت اس سے بھی کھٹکتے تھے مگر اکبر کی توجہ ہر بات پر تھی اس لئے کچھ صدمہ نہ پہنچا سکے۔

آخر ایک دن دربار میں یہ مسئلہ پیش کیا کہ میر کی پیش نمازی درست نہیں یہ عراقی ہیں اور حنفی مذہب کی ایک روایت ہے کہ اہل عراق کی گواہی معتبر نہیں تو اسکی امامت کیونکر صحیح ہو سکتی ہے؟

امامت جانے سے سید کا گزارا مشکل ہو گیا۔ وہ شیخؒ سے اتحاد برادرانہ رکھتا تھا ان سے درد دل بیان کیا انہوں نے بہت سی ہوش افزا تقریریں سنا کر اسکی خاطر جمع کی

اور رد جواب پر دلیری سے سمجھایا کہ یہ لوگ روایت کے معنی نہیں سمجھتے جو سند لائے ہیں۔ اس میں عراق سے عراق عجم مراد نہیں بلکہ عراق عرب مراد ہے (۶۴)"

اس طرح غریب ایرانی سید پھر اپنی ملازمت پر بحال ہو گیا۔ نماز وہ پہلے بھی

حنفی طریقہ پر پڑھاتا تھا پھر اسی طرح پڑھانے لگا۔ اپنی نماز پہلے بھی گھر بند کر کے پڑھ لیتا تھا پھر اسی طرح پڑھنے لگا۔ ہمایوں کے بارے میں پتہ نہیں کہ دلی میں نماز ہاتھ کھول کر پڑھتا تھا یا ہاتھ باندھ کر مگر جب تک وہ قزلباشوں کے لشکر کا افسر تھا اس وقت تک تو اس نے شیعہ اصول پر نماز ادا کی۔

تحیر خیز ہے ایسے ماحول میں ان شیعہ امراء کا وجود جو عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز تھے لیکن ابوالفضل کا محولہ بالا جواب ہر تعجب کو دور کر دیتا ہے جو اس نے اپنے والد کے سلسلے میں دیا تھا کہ وہ شیعہ اصول و فروع سے واقف ہیں مگر انہیں مانتے نہیں۔ یہی صورت حال تمام شیعوں کیلئے رہی ہوگی اور خود بیرم خاں کیلئے بھی جو سلطنت مغلیہ کا بانی نہیں تو معمار اعظم ضرور تھا۔

بیرم خاں امرائے ترکمان کی براہ راست اولاد میں تھا مگر نیرنگ زمانہ سے حکومت چھن گئی تھی کم سنی میں بابر کی ملازمت کرنے پر مجبور ہوا اور ہمایوں کا منظور نظر بن گیا۔ سولہ سال کی عمر سے جو داد شجاعت دینا شروع کی تو آخر عمر تک گھوڑے کی پیٹھ اور رزم گاہ سے سابقہ رہا۔ ہمایوں کی جو خدمات اس نے انجام دیں وہ اظہر من الشمس ہیں لیکن پونے چودہ سال کی عمر میں اکبر کی تخت نشینی کے بعد جب ہر طرف بغاوت کے آثار تھے تو اکبر کے بجائے کہن سال بیرم خاں مغل سلطنت کا علم بردار تھا پھر ہر چھوٹے بڑے معرکے میں بیرم خاں کی شمشیر آبدار تاج اکبری پر سایہ فگن رہی اور بیرم خان نے وہی کیا صغیر سن اکبر کے خان بابا سے جسکی زائد سے زائد توقع ہو سکتی اسی لئے بڑے سے بڑے دشمن نے بھی اسکو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے۔

"یکایک اسکی جانفشانیاں خدمتیں اور بے خطا تدبیریں سفارش کو آئیں، ساتھ شیرانہ حملے اور رستمانہ کارنامے مدد کو آپہنچے۔ وہ شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ اسے لائے دربار اکبری میں درجہ اول پر جگہ دی اور نعرہ شیرانہ کی آواز میں کہا

یہ وہی سپہ سالار ہے جو ایک ہاتھ پر نشان شاہی لیے تھا کہ خوش نصیبی اسکی جسکے پہلو میں چاہے سایہ کر کے قائم ہو جائے دوسرے ہاتھ میں تدابیر وزارت کا

ذخیرہ تھا کہ جسکی طرف چاہے نظام سلطنت کا رخ پھیر دے۔ نیک نیتی کے ساتھ نیکوکاری اسکی مصاحب تھی اور اقبال خدا مددگار تھا کہ وہ فیروزمند، جس کام پر ہاتھ ڈالتا پورا پڑتا تھا۔"

شیخ اسلام ملا عبداللہ سہانپوری دربار اکبری کے سب سے متعصب سنی عالم تھے، وہ بھی تحریر فرماتے ہیں۔

"وہ مرزا جہاں شاہ کی اولاد میں تھا۔ رموز دانش، سخاوت، راستی، حسن خلق نیاز و خاکساری میں سب پر بازی لے گیا۔ ابتدائے حال میں بابر بادشاہ کی خدمت میں بچ میں ہمایوں بادشاہ کے حضور میں رہ کر بڑھا چڑھا اور خانخانان کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ پھر اکبر نے وقت بوقت القاب میں ترقیاں دیں۔ نہایت فقیر دوست صاحب حال اور نیک اندیش تھا۔ ہندوستان جو دوبارہ فتح ہوا اور آباد بھی ہوا یہ اسی کی کوشش اور بہادری اور حسن تدبر کی برکت سے ہوا۔ اخیر عمر میں بسبب اہل نفاق کی عداوت کے بادشاہ کا دل اس سے پھر گیا اور وہاں تک نفرت پہنچی جس کا ذکر حالات سالانہ میں لکھا گیا۔" (۶۵)

مورخین نے تاریخ ساز بیرم خاں سے اکبر کے اختلاف کی وجہ اسکی مطلق العنانی لکھی ہے بلکہ رشک و حسد اور مذہبی تعصب، بہت سے اسباب نے مل کر بدگمانی کی ایک خلیج پیدا کر دی اور شہنشاہ ہندوستان نے اس بوڑھے وفادار سے نگاہیں پھیر لیں جسکی مثال تاریخ ہند تو کیا تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔

آج مغلیہ سلطنت سے بیرم خاں کو نکال دیا گیا تو اس پر کوئی اثر نہیں پڑا لیکن اس وقت وہ ہمایوں کی زندگی سے نکل جاتا، جب صرف بیس یا اکیس وفادار اسکے ساتھ رہ گئے تھے تو کیا ہوتا؟ ہمایوں کی وفات کے بعد جب سلطنت ڈانواڈول ہو رہی تھی اور خود اکبر جوان بھی نہ ہوا تھا اگر اس وقت بیرم خاں کی تلوار اور تدبر آڑے نہ آتا تو ہندوستان کے تخت و تاج پر کس کا نام لکھا ہوتا جواب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے کہ خدا کوئی اور راستہ پیدا کر دیتا۔

انسان کو مجبور محض ماننے کا عقیدہ اسکے سوا اور کہہ ہی کیا سکتا ہے کہ بیرم خاں کو اسی نے پیدا کیا تھا اور آج اکبر سے بیرم خاں کو نکلوایا بھی اسی نے تھا سب

کچھ وہی کرتا ہے لہٰذا کوئی سوال بھی اسی سے کیا جائے ؟ تو پھر ہمارے دلوں میں جو محبت اہل بیت ہے وہ بھی اسی نے پیدا کی ہے آپ ہم کو اس کا مجرم قرار دے کر قتل کیوں کرتے ہیں، ہم تو خدا کے حکم سے آل محمدؑ کے دیوانے ہیں۔

بہرحال اکبر کے ابتدائی دور میں ایک عرصے تک جو کچھ ہوتا رہا یقیناً اس میں اکبر کی مرضی کو زیادہ دخل نہیں تھا علمائے مجاز اسلام کے نام پر بے گناہ شیعوں کو قتل کراتے تھے۔ خود اکبر جادہ تصوف میں اسلام پر عمل پیرا ہونے کی کوشش میں لگا ہوا تھا لیکن بادشاہ وقت ہونے کی حیثیت سے وہ بری الذمہ نہیں ہو سکتا کہ شیعہ تو واجب القتل تھے اور ہندوؤں سے کوئی پرسش نہ ہو سکتی۔

یہی سوال پاکستان کے ان علماء سے بھی ہے جو شیعوں کے کفر کا نعرہ لگاتے ہیں لیکن جو کھلے ہوئے کافر یا مشرک ہیں ان کی طرف دیکھنے کی جرئت بھی نہیں کر سکتے۔ کم از کم ان میں اسلام کی تبلیغ ہی کریں جا کر یا اخلاقی طریقے پر شیعوں ہی کو اپنی راہ حق دکھائیں۔ تلوار تو اجتک صرف سر کاٹ سکی ہے دلوں کو خم نہیں کر سکی یہ کام تو علماء کی صداقت ہی کر سکتی ہے مگر وہ ایسا کوئی اقدام نہیں کرتے شاید تعقل کے راستے پر چلنے کی ان میں سکت نہیں ہے اور کمزور پر طاقت آزمائی انکا شعار رہا ہے

مغل سلطنت کی نشاہ ثانیہ میں شیعوں کا یہ خون رائگاں نہیں گیا اور جلد ہی اکبر اعظم ہندو مسلم اتحاد کا علامیہ بن گیا پھر نہ کوئی شیعہ رہا اور نہ سنی بلکہ ہر ایک دین الٰہی کا پابند بن گیا اور ان میں سے اکثر لوگوں کو اکبر کے مذہب کا تحریری عہد کرنا پڑا جو کل شیعوں پر کفر کے فتوے لگایا کرتے تھے۔

اکبر کا یہ ذہنی انقلاب کن اسباب و عوامل کا رہین منت تھا، اسکے لئے کوئی حکم لگایا نہیں جا سکتا، بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ خدا ہر انسان کو ایک نظر سے دیکھتا ہے اور بادشاہ خدا کا سایہ ہوتا ہے لہٰذا اسکو بھی رعایا میں کوئی تفریق نہ کرنا چاہیئے اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب تمام رعایا ایک ہی مسلک کی راہ رو ہو لہٰذا اکبر اعظم نے ایک مسلک اپنی رعایا کو دیدیا تھا اور وہ تھا دین الٰہی۔ اکبر میں یہ تبدیلی

جس ماحول میں پیدا ہوئی تھی اس میں سیکڑوں نام ہیں جو دربار اکبری کی زینت تھے چند نام ملاحظہ ہوں۔

مہیش داس راجہ بیربل، راجہ ٹوڈرمل اور راجہ مان سنگھ، منعم خاں، مرزا عزیز کوکلتاش، شیخ عبدالقادر بدایونی، شیخ عبدالنبی صدر اور شیخ اسلام ملا عبداللہ سہارنپوری جنکے ماتحت درجنوں علماء جو اپنے کو یگانہ روزگار سمجھتے تھے۔ مذہبی صف میں بعض عمائدین اور امراء بھی شامل تھے۔

شیعوں کی تعداد بھی قابل ذکر تھی جو اپنے کو شیعہ ظاہر نہ کرتے: بیرم خاں علی قلی خان، میر مرتضیٰ شریفی، حسین خاں ٹکریہ، شیخ مبارک اللہ، ابوالفضل، فیضی، حکیم ابوالفتح گیلانی، بعض متعصب علماء انکی حقیقت سے واقف تھے مگر وہ شیعیت کا ادعا نہ کرتے، اکبر کے دربار میں انکی قیمت تھی اور خود اکبر عقیدے کی بنا پر کسی کو قتل کر دینے کے حق میں نہ تھا لہٰذا علماء کو جرئت نہ ہوتی کہ اپنے دارالقضاہ میں انکو گردن زدنی قرار دیں اس لئے وہ بچے ہوئے تھے۔

اور جب دین الٰہی نافذ ہو گیا تو قدیم مسلک کسی کا کوئی بھی رہا ہو، اس کو دین الٰہی کے عہد نامے پر دستخط کرنا ہی تھے۔ اسکے بعد نہ کوئی ہندو تھا اور نہ مسلمان نہ کوئی شیعہ تھا اور نہ سنی۔ اکبر کی اس بے دینی کے ذمہ دار شیخ الاسلام کے نزدیک بیربل، ابوالفضل اور فیضی تھے۔

مذہبی نقطہ نگاہ سے دین الٰہی جتنا بھی برا ہو لیکن اسکو اکبر کی وسیع النظری پر محمول کیا گیا۔ اس میں خود اسکی عظمت اور اسکی عظیم سلطنت کا راز پنہاں تھا۔

بابر و ہمایوں بلاشبہ ہندوستان کی مغل سلطنت کا نقطہ آغاز تھے لیکن اکبر وہ عظیم شہنشاہ تھا جس نے مغل دور کو تاریخ عالم میں جگہ دلوائی اور ہر دور کے مورخ نے جلی حروف میں جس کا ذکر کیا۔

اکبر اولوالعزم، شجاع، مدبر، کشادہ دل، سخی اور عالی ظرف شہنشاہ تھا۔ اس کا دامن بعض حق تلفیوں سے آلودہ ضرور ہے مگر حصول اقتدار اور استقرار حکومت کیلئے تمام دنیا میں ایسا ہوتا ہی رہا ہے اور اسکی اولاد نے تو آگے چل کر اس سے کہیں زائد کیا۔ مجموعی طور پر اس کا شمار عالمی سطح پر عظیم فرمانرواؤں میں ہوتا ہے۔

۳ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ میں وہ عالم بقا کا راہی ہوا۔

عہد اکبری کا آغاز شیعوں کیلئے ستم آفریں تھا۔ اکبر پر مذہبیت کا غلبہ تھا۔ علماء دربار پر چھائے ہوئے تھے۔ اسی میں بیرم خاں پر عتاب آیا۔ وہ حج کیلئے چلا تو راستے میں قتل کر دیا گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ قتل کرنے والے خود اکبر کے آدمی تھے۔ اسکے بعد مختلف حیلوں اور بہانوں سے بے شمار شیعوں کی گردنیں اتاری گئیں مگر اس طوفانی دور کے گزر جانے کے بعد مغل سلطنت ہر عقیدے کے آدمی کیلئے ایک پناہ گاہ رہی۔

مجموعی طور پر شیعوں کی تعداد بہت زائد تھی اور وہ بڑے بڑے عہدوں پر بھی فائز تھے۔ اس میں عنایات شاہی کے بجائے خود انکی صلاحیت کو دخل تھا۔

شہنشاہ نور الدین جہانگیر

اکبر کے انتقال پر شاہزادہ سلیم جہانگیر کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ دین الہی اکبر کے ساتھ دفن ہو گیا تھا۔ اب پھر کھل کر اسلام کا دور دورہ ہوا جہانگیر اگرچہ مذہبی آدمی نہ تھا تاہم اس نے تمام مذاہب کے لوگوں کو چھوٹ دیدی جس میں ہندو بھی تھے مسلمان بھی، شیعہ بھی تھے اور سنی بھی مگر سنی علماء کو غلبہ حاصل تھا۔ شیعہ تعداد میں سنیوں کے مقابلے میں بہت کم تھے مگر ممتاز اور قابل ذکر۔

اکبر کے عہد میں بھی شیعوں کی تلوار متعدد محاذوں پر چمکی تھی اور کتنی ہی فتوحات ان کی تلواروں کی رہین منت رہی تھیں اور سادات بارہہ کی شجاعت نے تو بعض جنگوں میں بہادری کے وہ جوہر دکھائے تھے کہ مرزا عزیز کو کلتاش کو کہنا پڑا تھا کہ سادات بارہہ سلطنت مغلیہ کے فداکار ہیں

عمائدین اور امراء میں ان گنت نام شیعوں کے شامل تھے۔ مہابت خاں، آصف خاں، علی قلی بیگ وغیرہ وغیرہ اور محل سرا میں تو مستورات بھری پڑی تھیں۔ خود شاہی خواتین میں بھی شیعہ عقیدے کی کارفرمائی تھی اور ایرانی خواتین تو چہار جانب چھائی ہوئی تھیں۔ انہیں میں سے مہرالنساء نام کا گوہر نایاب جہانگیر نے منتخب کیا تھا جو ملکہ نور جہاں بیگم کے نام سے مغل تاج و تخت کی زینت بنی۔

مہمات جنگی و ملکی میں بھی شیعوں کا کردار نمایاں تھا مگر جو کچھ بھی تھا، وہ ہر شخص

کی ذاتی صلاحیت و استعداد کی بدولت، اجتماعی مساعی کا نہ امکان تھا اور نہ مصلحت ہر ایک کی جداگانہ حیثیت تھی۔ بعض لوگ اکبر کے وقت سے ممتاز اور بااقتدار چلے آ رہے تھے۔ ان میں ابوالفضل بھی تھا۔ جہانگیر کو اس سے پرخاش تھی۔ "ابوالفضل سے جہانگیر کی دشمنی کے دو سبب تھے۔ پہلا سبب تو یہ تھا کہ جہانگیر کو یقین ہو گیا تھا کہ ابوالفضل شہنشاہ اکبر کو جہانگیر کی طرف سے بھڑکاتا رہتا ہے دوسری وجہ یہ تھی کہ جہانگیر کو ابوالفضل کے ملحدانہ عقائد اور خیالات سے سخت نفرت تھی اور اس کا خیال تھا کہ ابوالفضل نے اسکے باپ کو قطعی بے دین اور ملحد بنا دیا ہے اسی لئے جہانگیر نے اسے موقع ملتے ہی قتل کرا دیا۔" (۶۶)

جہانگیر کے نامۂ اعمال میں دوسرا قتل شیرافگن علی قلی بیگ کا ملتا ہے جو اس نے مہرالنساء کو حاصل کرنے کیلئے کرایا۔ شیرافگن کی شجاعت اسکے لقب سے ظاہر ہے۔ وہ حقیقتاً اپنے وقت کا رستم تھا اور مہرالنساء کو جہانگیر سے بچانے کیلئے اپنی امارت بردوان لے گیا تھا لیکن شاہی اختیارات مغل شہنشاہ کی دیوانگی کے ساتھ تھے شیر افگن حیلہ سازی سے بردوان میں گھیر لیا گیا اور مردانہ وار لڑتا ہوا قتل ہو گیا۔

مہرالنساء ملکہ نور جہاں بن گئی مگر وہ جہانگیر کے محل میں چراغ خانہ بن کر نہیں رہی بلکہ اس نے رزم اور بزم دونوں میں حصہ لیا۔ نور جہاں اپنے شوہر کی ایک محبوب بیوی بھی تھی اور سلطنت کے کاموں میں بادشاہ کی بہترین مشیر بھی تھی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ سلطنت کے کاموں میں جو اختیارات نور جہاں کو حاصل تھے وہ کسی شاہ بیگم کو اس سے قبل حاصل نہ ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ اسکے نام کا سکہ تک چلا اور شاہی کاغذات پر اسکے نام کی مہریں بھی لگنے لگیں۔

امور ملکی میں وہ بادشاہ کے دوش بدوش کارفرما رہی۔ ایک لمحے کیلئے بھی بادشاہ سے جدا نہ ہوتی تھی۔ جہانگیر جس وقت دربار میں بیٹھتا تو نور جہاں پردے کے پیچھے اسکی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھتی تھی اور امور ملکی میں قدم قدم پر بادشاہ کو صلاح دیتی تھی۔ سچ پوچھا جائے تو حکومت ہی وہی کرتی تھی۔

جب بادشاہ ہاتھی پر سوار ہوتا تو پس پردہ وہ بھی بادشاہ کے پاس ہی بیٹھتی تھی بادشاہ جنگ کیلئے جاتا تو وہ بھی نبرد آزمائی کیلئے بادشاہ کے ہمراہ ہوتی۔ بادشاہ کے

ساتھ شکار میں بھی وہ ساتھ رہتی بڑی بہادری کے ساتھ مردانہ وار شیر کا شکار کھیلتی تھی۔گھوڑے کی سواری میں اسے کمال حاصل تھا۔غرض کہ بزم میں رزم میں ہر موقع پر وہ بادشاہ کے ساتھ رہتی ۔ سلطنت کے کاموں میں اسکی سوجھ بوجھ اور تدبر کے سب قائل تھے ۔(٦٧)

اسکے علاوہ ایک شیریں بیان شاعرہ تھی، حاضر جوابی میں بھی وہ بے مثال تھی اور لطیفہ گوئی میں تو اسے ملکہ حاصل تھا۔جہانگیر سے نکاح کرنے کے بعد اس نے جہانگیر کی زندگی کو بالکل بدل ڈالا تھا۔اسکی شراب نوشی کو بڑی حد تک کم کر دیا تھا۔ جہانگیر کہا کرتا تھا کہ "میں نے اپنی ساری سلطنت نورجہاں کے ہاتھ دو شراب کے پیالوں اور سیخ کباب کے عوض بیچ دی ہے"۔

نورجہاں ایک شیعہ خاندان کی فرد تھی، بالکل اسی طرح جس طرح جہانگیر ایک سنی باپ کا بیٹا لیکن دونوں میں سے کسی نے عقیدے کی بناپر کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ۔جہانگیر نے عدل کی جو زنجیر اپنی محل سرا میں لٹکا رکھی تھی ہمیشہ اس کا احترام کیا لیکن اسکو کیا کیا جائے کہ سنی علماء کا ایک گروہ عصبیت کا زہر پھیلانے سے غافل نہیں رہا۔

جہانگیر کی منصف مزاجی اور شیعہ امراء کے اقتدار کے سبب شیعہ علماء کی تعداد بھی اس زمانے میں کچھ بڑھ گئی تھی جن میں ایک یگانہ روزگار عالم حضرت نوراللہ شستری بھی تھے ۔سنیوں کے بعض علماء نے بڑے تکبر کے ساتھ اکثر ان سے مناظرہ کیا مگر ہر بار منہ کی کھائی لہذا نوراللہ شستری سے ان کو ضد ہو گئی اور انہیں نیچا دکھانے کی تدابیر میں لگ گئے۔

اتفاق سے نوراللہ شستری نے تصوف پر ایک رسالہ لکھا تھا ان علماء کو خبر لگ گئی ۔انہوں نے ایک آدمی کے ذریعہ وہ رسالہ اڑالیا اور اس میں سلیم چشتی کے بارے میں بعض نازیبا فقرے بڑھا دئے پھر رسالے کو اسی مقام پر رکھوادیا جہاں سے وہ چرایا گیا تھا۔

یہ کام اتنی احتیاط سے کیا گیا کہ حضرت نوراللہ شستری کو اسکی بھنک بھی نہ مل سکی اور بھنک کیسے ملتی، ایک تہجد گزار باعمل عالم عبادت سے جو وقت پاتا

اسکو مطالعے اور تحریر میں گزارتا۔رسالہ مکمل کرکے وہ رکھ چکے تھے لہذا اسکو دیکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی ۔

ادھر ان علماء نے جہانگیر کو خبر کی کہ سلیم چشتی کے خلاف انہوں نے ایک رسالہ لکھا ہے ۔ سلیم چشتی جہانگیر کے مرشد تھے بلکہ بعض روایات کی بناپر انہیں کی دعا سے جہانگیر کی ولادت ہوئی اور انہیں کے نام پر سلیم نام رکھا گیا تھا ۔ علماء کی تحریک پر نوراللہ شستری کے مکان پر اچانک آدمی بھیجے گئے اور وہ رسالہ برآمد کرلیا گیا

جہانگیر اسکو دیکھ کر آگ بگولہ ہوگیا۔اس نے علماء کا ایک پنچ بٹھا دیا اور اسکو شرعی سزا دینے کا مجاز کر دیا۔

علماء نے منصب قضاۃ پر بیٹھ کر حضرت نوراللہ شستری کا بیان لیا۔انہوں نے اضافہ شدہ عبارت سے انکار کیا لیکن تحریر ملا کر لکھی گئی تھی اور روشنائی اور قلم کا التزام بھی کیا گیا تھا۔ان کے بیان کو صحیح تسلیم نہیں کیا گیا اور حکم قتل صادر ہو گیا

چنانچہ پہلے اس تہجد گزار عالم کے کوڑے لگائے گئے اور جب وہ بیہوش ہوگئے تو ہاتھ پاؤں کاٹے گئے پھر رمق جان باقی دیکھ کر تلواروں کے وار کیے گئے اور لاش جنگل میں پھنکواکر اعلان کرایا گیا جو لاش کو دفن کرنے کی کوشش کرے گا وہ مستوجب قتل ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ لاش سے اتنی مہک نکل رہی تھی کہ پورا جنگل بس گیا تھا۔

آگرہ میں خبر قتل سے ایک کہرام مچ گیا تھا پھر لوگ شاہی حکم سے خائف ہوگئے ۔بعض سادات ہمت کرکے پہنچے اور سید راجو نے لاش اٹھا کر [illegible] پر رکھ لی۔

اسی رات گوالیار میں ایک ایرانی سردار نے خواب میں سیدہ کونین کو دیکھا آپ نے فرمایا کہ میرا بیٹا وہاں قتل ہوگیا اور تو آرام کی نیند سو رہا ہے ۔ سردار اپنے ساتھیوں کو لے کر اسی وقت آگرہ کی طرف چل پڑا۔

پھر جہانگیر نے حضور سرور کائنات کو خواب میں دیکھا آپ نے غیظ کے عالم میں جہانگیر کو فہمائش کی کہ تو نے میرے فرزند کو قتل کرادیا اور اب لاش بھی دفن نہیں ہونے دیتا۔

جہانگیر نے صبح ہوتے ہی بعض امراء کو بھیجا۔اس طرف سے ایرانی سردار آکر پہنچا تو سید راجو لاش کے قریب بیٹھے گریہ وزاری کررہے تھے۔ حضرت نوراللہ شستری کی لاش تو دفن کردی گئی مگر آگرہ پر غم کے بادل چھائے رہے اور انکے بعد عالم شہید کو شہید ثالث کہہ کر یاد کیا گیا۔

جہانگیر کے دامن پر خون ناحق کا یہ تیسرا داغ تھا جو شاید نادانستگی میں لگا۔

کہا جاتا ہے کہ ملکہ نورجہاں کو جب اس المناک سانحے کی اطلاع ہوئی تو اسے بھی بہت صدمہ ہوا مگر موقع شناس خاتون خاموش رہی۔ کچھ دنوں بعد جب تلاطم سکون میں بدلا تو اس نے ان تمام علماء کی دعوت کی جنہوں نے سازش کی تھی اور وہ بھی جنہوں نے شرعی عدالت میں انصاف کا حق ادا کیا تھا۔

ان سب کو اچھے اچھے کھانے کھلائے گئے پھر مشروبات سے تواضع کی گئی۔ جب وہ زود خوری سے سست پڑگئے تو پردے کے پیچھے چھپے ہوئے حبشی غلام نکلے اور نیچے تلے ہاتھوں سے ان سب کا کام تمام کردیا۔لاشیں جمنا کی لہریں بہالے گئیں۔ کچھ دنوں تک انکی تلاش جاری رہی پھر لوگوں کو پتہ چل گیا مگر زبان کون ہلاتا ملکہ ہندوستان کے خلاف اتنا بڑا اتہام مستوجب قتل قرار پاتا۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ملکہ کے عمل میں خود جہانگیر کا ایماء شامل تھا۔وہ آنحضرتؐ کے غصے سے ڈر گیا تھا۔

اس طرح جہانگیر کا عدل پرور دور آگے بڑھتا رہا اور ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ میں ساٹھ برس کی عمر میں وہ انتقال کرگیا۔جہانگیر بہادر، منصف مزاج اور رعایا پرور حکمران تھا

محمد شہاب الدین شاہجہان

شاہزادہ خرم ملکہ ممتاز محل کا شوہر اور اصف خاں کا داماد تھا جو جہانگیر کی زندگی میں اپنے بھائیوں سے برسرپیکار رہا تھا۔ان میں سے خسرو اور پرویز کا انتقال ہوچکا تھا۔شہریار جو نورجہاں کا داماد تھا اسے بھی خرم نے قید خانے میں اندھا کرادیا اس طرح آصف خاں اور نورجہاں میں نااتفاقی پیدا ہوگئی تھی پھر بھی شاہجہاں کے دور حکومت میں وہ زندہ رہی اور لاہور میں حیات مستعار کے دن پورے کر کے شہدرہ لاہور میں ۲۹ شوال ۱۰۵۵ھ کو ہمیشہ کی نیند سوگئی۔

ممتاز محل خوبصورت نورجہاں کی حسین ترین بھتیجی تھی اسکی شادی ۱۰۲۱ھ میں شاہجہاں کے ساتھ ہوئی تھی جبکہ وہ ۱۹ سال کی اور شاہجہاں ۲۱ سال کا تھا۔اسکے علاوہ شاہجہاں کے دو بیویاں اور تھیں مگر ممتاز محل کو وہ پرستش کی حد تک چاہتا تھا اس کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ ۱۷ ذی قعدہ ۱۰۴۱ھ کو جب بیٹی کی ولادت کے سلسلے میں ممتاز محل کا انتقال ہوا تو اسکی لاش اس نے برہانپور کے ایک باغ میں بطور امانت رکھوادی تاکہ مدت معینہ کے بعد اسے آگرہ لے جاسکے۔اسکے بعد شاہجہاں کا یہ عالم ہوگیا کہ اس نے حرم سرا میں داخل ہونا ہی چھوڑ دیا۔شب و روز روتا رہتا۔ ایک سال کے اندر اسکی سیاہ ڈاڑھی سفید ہوگئی۔

ممتاز محل نورجہاں کی طرح امور مملکت میں دخیل نہ تھی مگر نزاکت مزاج اور نفاست طبع کے ساتھ ساتھ اتنی دانشمند تھی کہ شاہجہاں کے منہ کھلنے سے قبل اسکی بات سمجھ لیتی تھی اور آداب محفل میں تو کوئی اس کا ثانی تھا ہی نہیں۔حوروں کے جمال کے ساتھ تہذیب کا شاہکار، اسپر شگفتگی اور خوش مزاجی، ان تمام خوبیوں نے یکجا ہوکر شہنشاہ ہندوستان کو اس کا دیوانہ بنادیا تھا اور محبت کی یہی دیوانگی تھی جس نے شاہجہاں سے تاج محل جیسی عمارت بنوالی جو آج بھی اپنی دیدہ زیبی میں خود ممتاز محل کی طرح یگانہ روزگار ہے۔

بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مغل دور نے دو عورتیں پیش کی ہیں:ایک زیب و زین کشور آرائی کا پیکر، دوسرا حسن و محبت کا وہ مجسمہ جس کا مزار صدیوں تک نظر فریب عالم رہے گا اور ممتاز محل کے ساتھ شاہجہاں کو بھی زندہ رکھے گا۔

شاہجہاں کو امور مملکت اپنی طرف متوجہ نہ کرلیتے تو وہ ممتاز محل کی قبر کو چھوڑ کر آگرے سے قدم باہر نہ نکالتا پھر بھی اسکے بعد شاہجہاں میں پہلی سی چستی باقی نہیں رہی۔وہ دکن بھی گیا، پرتگیزیوں کے مظالم کا تدارک بھی کیا، کشمیر بھی گیا اور اس نے کوشش کرکے اپنے کو مختلف مشاغل میں الجھالیا پھر بھی ممتاز محل کو بھول نہ سکا

شاہجہاں کو کچھ تسکین ہوتی تو ممتاز محل کی چہیتی یادگار جہاں آرا بیگم کے پاس جو اب ماں کی تمام ذمہ داریاں سنبھال چکی تھی اور باپ سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔

ان حقائق کے باوجود شاہجہاں ہندوستان کا عظیم شہنشاہ تھا۔ اسکو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس تھا لہذا اس نے اس طرف سے غفلت نہیں کی۔ فتوحات بھی کرتا رہا اور نظم و نسق بھی دیکھتا رہا۔ آخر ۱۰۵۸ھ میں اس نے آگرہ کے بجائے دلی کو پایہ تخت قرار دیا اور وہاں ایک نیا شہر آباد کرایا جس کا نام شاہجہاں آباد رکھا۔ لال قلعہ اسی میں واقع ہے۔

۷ ذی الحج ۱۰۶۷ھ کو وہ اچانک بیمار پڑا اور اسکے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو داراشکوہ نے ولی عہد کی حیثیت سے نظم حکومت ہاتھ میں لے لیا۔

شاہجہاں اپنے بچوں میں جہاں آرا اور داراشکوہ کو بہت چاہتا تھا۔ جہاں آرا کو اس لئے کہ وہ صورت و سیرت میں ممتاز محل سے مشابہت رکھتی اور بیٹی کی حیثیت سے شاہجہاں کو پروانہ وار چاہتی تھی۔ مغلوں میں جہاں آرا کی سی عالمہ اور باسلیقہ خاتون نظیر میں نہیں ملتی۔ وہ ممتاز محل کی تربیت یافتہ تھی اور عقیدے میں بھی اسی کی طرح شیعہ تھی۔

دارا شیعہ تو نہ تھا لیکن مختلف السنہ اور ادیان عالم کا عالم تھا وہ لوگوں کو مذہب کے بجائے انسانیت کی سطح پر پرکھتا تھا۔ ایک بادشاہ کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے فنون حرب سے واقف تھا لیکن اسکو رزم سے زیادہ بزم سے دلچسپی تھی پھر بھی شاہجہاں کی حالت خراب ہونے پر اس نے عنان سلطنت ہاتھ میں لے لی۔

داراشکوہ نے شاہجہاں کے پاس آنے جانے کی پابندی لگادی تھی جس سے عام غلط فہمی پیدا ہوئی کہ شاید بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔ اس خبر پر اورنگزیب نے اندر ہی اندر فوجی تیاریاں شروع کردیں پھر مراد کو بھی ملالیا۔

شاہ شجاع کو تو دارا نے شکست دیدی مگر اورنگزیب کے مقابلے میں پسپا ہوا بات یہ تھی کہ اورنگزیب نے داراشکوہ کے غیر اسلامی عقائد کے خلاف سخت پروپگینڈا کیا تھا لہذا مسلم فوج نے اس سے غداری کی، صرف راجپوت بہادری سے لڑے مگر انکی تعداد اورنگزیب اور مراد کے متحدہ لشکر کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ داراشکست یاب ہوکر آگرہ میں پناہ گزیں ہوا۔ شاہجہاں روبہ صحت تھا مگر وہ شرم سے باپ کے سامنے نہ جاسکا اور دس بارہ سواروں کے ساتھ بیوی بچوں کو لیکر آگرہ سے دہلی آگیا

اورنگزیب نے آگرہ پہنچ کر شاہجہاں کو قلعہ میں نظربند کردیا۔ یہ کامیابی اس نے مراد کے تعاون سے حاصل کی تھی لیکن وہ بھی بادشاہت کا امیدوار تھا اورنگزیب نے چالاکی سے اسکو ملاقات کیلئے بلایا اور گرفتار کرلیا۔ پھر اپنی شاطرانہ چالوں سے دارا کے سب سے بڑے دوست راجہ جسونت سنگھ کو بھی توڑلیا اور اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔

شاہجہاں کے ایام اسیری عبرت کی ایک داستان ہیں۔ تاج محل اور لال قلعہ کا خالق قلعہ آگرہ کے ایک گوشے میں زندگی کے دن پورے کررہا تھا۔ تین چیزیں اسکی رفیق تنہائی تھیں، ممتاز محل کے ساتھ بتائے ہوئے دنوں کی یاد، حدیث و فقہ کی کتابیں اور پیکر اخلاص ووفا جہاں آرا بیگم جس نے خود اپنے کو باپ کے ساتھ قید کرلیا تھا، سات سال تک شب و روز باپ کی خدمت کی اور باقی زندگی ریاضت و عبادت میں گزاردی۔ سن سے اترجانے کے باوجود کئی آدمیوں نے اسکے لئے دامان آرزو پھیلایا مگر جہاں آرا کو دنیا سے اتنی نفرت ہوچکی تھی کہ وہ خوشی کے نام سے دور بھاگتی تھی۔

شاہجہاں فخر زمانہ بیٹی کو دیکھ دیکھ کر جیتا رہا اور سات برس گزار لے گیا۔ اس دوران اس نے کئی مرتبہ اورنگزیب کو بلا بھیجا مگر وہ کون سا منہ لے کر باپ کے سامنے جاتا۔ تعجب انگیز تو یہ بات ہے کہ اورنگزیب کے ساتھ شاہجہاں کی دوسری بیٹی روشن آرا نے بھی باپ کو منہ نہیں دکھایا۔ دنیا اسی کا نام ہے۔

ہمارے بزرگ بلا استناد تاریخ ایک روایت بیان کرتے تھے کہ اورنگزیب نے شاہجہاں سے کہلوایا تھا کہ غلہ کی اقسام میں سے اسکو کوئی ایک اناج مل سکتا ہے شاہجہاں کے بادہتی نے چنے کو انتخاب کیا تھا۔ اسی سے وہ اتنے قسم کے کھانے تیار کردیتا تھا کہ شاہجہاں کا دسترخوان بھرجاتا تھا۔

آخر یہ عبرتناک زندگی گزارتے گزارتے وہ ۲۶ رجب ۱۰۷۶ھ کو خالق حقیقی سے جاملا اور جہاں آرا سے جینے کا یہ سہارا بھی چھن گیا۔ شاہجہاں کو ممتاز محل کے پہلو میں دفن کیا گیا تھا۔ جہاں آرا اکثر انکی قبروں پر جاتی تو اسکو غیر شعوری طور پر محسوس ہوتا کہ جیسے وہ انکی محبت کی واحد یادگار ہو۔

محی الدین محمد اورنگزیب عالمگیر

شاہجہاں کے بیٹوں میں مراد اورنگزیب کی قید میں تھا، شجاع بنگال میں اور دارا دہلی سے لاہور پہنچ گیا تھا اورنگزیب نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ بچ کر نکل گیا۔ اس اثناء میں شجاع بنگال سے الہ آباد پہنچ گیا۔ وہاں اورنگزیب کی فوجوں سے اس کا مقابلہ ہوا اور شجاع نے شکست کھائی پھر اورنگزیب کی فوجوں سے اسکے کئی مقابلے ہوئے مگر بدقسمتی شجاع کے ساتھ رہی۔ وہ پہلے بنگال گیا پھر آسام اسکے بعد اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔

جسونت سنگھ نے داراشکوہ سے دغا کی تھی مگر دارا نے خط و کتابت کر کے اسکو ہموار کیا اور جودھپور کا عازم ہوا لیکن جسونت سنگھ نے پھر وعدہ خلافی کی۔ شاہی لشکر تعاقب میں تھا۔ اس نے دارا کو گھیرا تو جسونت بھی اس سے جاملا اور دارا شکست کھا کر احمد آباد کی طرف بھاگ نکلا۔

راستے میں راجپوتوں نے اس طرح لوٹا کہ عورتوں کا زیور تک نہ چھوڑا۔ بدنصیب دارا ٹھوکریں کھاتا ہوا سندھ پہنچا جہاں سندھ کے ایک زمیندار ملک جیون نے دعوت کے بہانے گرفتار کر لیا اور دہلی بھیجدیا۔

شاہجہاں کے دارالسلطنت میں دارا اور اسکے بیٹے سپہر شکوہ کو ہاتھی پر بٹھا کر تشہیر کی گئی۔ اسپر عوام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے جلوس اور ملک جیون پر پتھراؤ کیا۔ کئی آدمی اس سلسلے میں قتل کئے گئے اور دارا کو مع اسکے بیٹے کے قید کر دیا گیا۔

شہزادہ داراشکوہ پر الزام تھا کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا ہے۔ اس نے تصوف کو بدنام کیا ہے۔ وہ کافر و ملحد ہے۔ چنانچہ علماء کے فتوے کے رو سے اسے کافر قرار دینے کے بعد قتل کیا گیا۔ اسکی لاش کو ہاتھی پر ڈال کر سارے شہر میں تشہیر کرائی گئی۔ داراشکوہ کی اس بے بسی کی وجہ سے عوام کو اس سے غیر معمولی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ جس طرف بھی داراشکوہ کی لاش گزرتی لوگ دھاڑیں مار مار

کر روتے تھے۔ لاش کو شہر میں گھما کر ہمایوں کے مقبرے میں ۱۰۶۹ھ میں دفن کر دیا گیا۔(۶۸)

دوسری تاریخوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگزیب نے پہلے اسکی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروائی تھیں پھر بھی اطمینان نہ ہوا تو قتل کرا کے لاش گشت کرائی تاکہ دارا کے طرفدار عبرت حاصل کریں۔

یہ خبریں آگرہ کے قلعہ میں جہاں آرا اور شاہجہاں کو پہنچی ہونگی اور ان کے دلوں کا جو عالم ہوا ہوگا، اسکو کوئی بہن یا باپ محسوس کر سکتا ہے۔ اسکے بعد اورنگزیب انہیں منہ کیونکر دکھاتا۔

اب صرف شہزادہ مراد بخش باقی تھا۔ اسے بھی گوالیار کے قیدخانے میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جسکے بعد سلطنت کے دعویداروں میں کوئی باقی نہ رہا۔

اورنگزیب نے اسلام کا نعرہ لگا کر کامیابی حاصل کی تھی اور فراست و تدبر میں کوئی بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکا لیکن حقیقت یہ ہے کہ داراشکوہ اپنے ذہن و فکر کے اعتبار سے دوسرا اکبر اعظم تھا بلکہ اکبر سے بہتر تھا کیونکہ اکبر پڑھا لکھا نہ تھا اور دارا مختلف زبانوں اور بیشتر مذاہب کا ماہر تھا۔ اگر دارا کے ساتھ کوئی بیرم خاں ہوتا تو اسکو ناکامی کا منہ دیکھنا نہ پڑتا اور اس کا یہ عبرتناک انجام نہ ہوتا۔

اورنگزیب نے دارا کیلئے علماء کے فتوے حاصل کرلیے تھے اور قتل کا شرعی جواز پیدا کر لیا تھا لیکن شاہجہاں کی قید کیلئے فتویٰ لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور باپ کے ساتھ جو سلوک روا رکھا اسکے لئے حقوق والدین کے شرعی احکامات میں کوئی تبدیلی نہیں کرائی۔ شاہجہاں میں ذرا بھی دم خم باقی ہوتا تو دارالفتاویٰ کے دروازے بند نہ تھے۔ اورنگزیب کو اس کا بھی شرعی جواز مل جاتا کہ باپ کی خدمت بیٹے کا فرض نہیں اسکی ذمہ دار صرف لڑکی ہوتی ہے۔

جہانگیری اور جہانبانی کے مصالح کو سامنے رکھا جائے تو اورنگزیب کا عمل بر محل نظر آئے گا۔ اسکے دور میں مغل سلطنت کی حدود شمال و جنوب اور مشرق و مغرب میں پورے ہندوستان کا احاطہ کرتی تھیں لیکن یہ سب کچھ اس وقت حاصل

ہوا تھا جب اس نے پوری زندگی جنگ و جدل میں گزار دی تھی لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا تھا کہ بغاوت و بدامنی ایک معمول سا بن گیا تھا۔ وہ ایک علاقے پر قبضہ کرتا تو دوسرے میں خلفشار پیدا ہو جاتا اور انجام کار کسی طرف سے اطمینان نہ ہوتا۔

مہابلی اکبر کے ہندوستان میں اس نے ہندوؤں پر جزیہ لگایا تھا اور شیعہ ہونا شرعی جرم قرار دیا تھا نتیجے میں شیعہ پہلے تو گردنیں کٹواتے رہے پھر تقیہ میں چلے گئے لیکن ہندوؤں نے اپنا مذہب کم سے کم بدلا۔ وہ دباؤ پڑنے پر جزیہ ادا کر دیتے مگر تھوڑی سی آزادی پاتے ہی ایسا اسلامی ٹیکس دینے سے انکار کر دیتے۔

دوسری سب سے بڑی سیاسی غلطی اورنگزیب نے یہ کی تھی کہ دکن کی تمام حکومتوں کو ختم کر دیا جو مرہٹوں کو دبائے رکھتی تھیں ان کے علاقے سلطنت مغلیہ میں شامل ہوتے ہی مرہٹے ایک ہندو طاقت بن کر ابھر آئے اور سلطنت کیلئے وبال بن گئے

شیعہ اکبر کے وقت سے مسلمان ہونے کی حیثیت سے سلطنت کے مختلف عہدوں پر فائز رہے تھے اورنگزیب نے ان پر پابندی لگادی۔ اس طرح جو لوگ اپنا عقیدہ چھپالے گئے وہ باقی رہے جیسے نعمت خاں عالی، باقی برطرف کر دئے گئے یا خود جانیں بچانے کیلئے کسی طرف چلے گئے۔ ایام عزا کی مجلسیں جو ہندوستان میں مسلم حکومت کے آغاز سے ہوتی آئی تھیں وہ بھی بند کر دی گئیں اور جلوس عزا پر تو قطعی پابندی لگادی گئی۔

اورنگزیب کے اصلاحی احکامات کی ایک دفعہ نقل کی جاتی ہے

"چونکہ برہان پور میں ایام محرم میں تابوت نکلنے پر مسلمانوں میں خانہ جنگی برپا ہو گئی تھی اس لئے اس نے حکم دیا کہ آئندہ سے تابوت یا اس قسم کی کوئی چیز ایام محرم میں نہ نکالی جائے"۔ (۶۹)

یہ حقائق ناقابل انکار ہیں اور ان پر پردہ ڈالا نہیں جاسکتا۔ وہ ایک کٹر اور متعصب سنی مسلمان تھا۔ ہو سکتا ہے کہ شروع میں اس نے اسلام کا نعرہ داراشکوہ پر فتح پانے کیلئے لگایا ہو لیکن بعد میں یہی اسکا مزاج بن گیا۔ جہانتک مسلمان ہونے کا تعلق ہے، شاہجہاں بھی پکا مسلمان تھا مگر اسلام میں جو رواداری پائی جاتی ہے اس پر

شاہجہاں پورا عمل کرتا تھا۔ اس کا اسلام ایک معتدل راستے پر تھا۔ اس میں کسی موڑ پر انسانیت کا ناتہ نہیں ٹوٹا اور انسانی خون اسلام کے نام پر ارزاں نہیں ہوا۔ اسکے برخلاف اورنگزیب نے ایک طرف شیعوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا، دوسری طرف ہندوؤں سے وہ سلوک کرنا شروع کر دیا جسکے وہ مغل حکومت کے آغاز سے عادی نہیں رہے تھے۔

اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس نے سلطان محمود غزنوی کی اتاری ہوئی عینک اپنی آنکھوں پر لگالی تھی۔

یوں تو وہ ایک مہم جو فرمانروا تھا لیکن جس طرح سلطان محمود کو سندھ کی اسمٰعیلی حکومت سے ضد ہو گئی تھی اسی طرح وہ دکن کی شیعہ حکومتوں کے پیچھے پڑ گیا اور انکو ختم کر کے دم لیا جو سلطنت مغلیہ کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

تبرا

شیعوں پر اورنگزیب کی خصوصی توجہ تھی۔ اس نے ہندوستان میں محافل تبرا منعقد کرنے کا سنگ بنیاد رکھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علیؑ کے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی شام کے در و دیوار نے مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ پر سب و شتم کے نعرے سنے تھے پھر شام کی حدود مملکت میں ستر ہزار منبروں سے بریت کا اظہار کیا گیا اور آل رسولؐ سے اجنبی شام نے یہی سمجھا کہ ایسا ہی برا ہو گا یہ شخص جسپر پورا ملک تبرا کرتا ہے۔

امام حسنؑ نے شرائط صلح میں لکھوالیا تھا کہ آئندہ اہل بیتؑ میں سے کسی پر لعن طعن نہیں کی جائے گی مگر اسپر عملدرآمد نہیں کیا گیا اور بنی امیہ کا تقریباً پورا دور یہ نعرے لگاتے گزر گیا۔ پھر بنی عباس میں سے بعض خلفاء نے خلفائے بنی امیہ کی اس سنت کو دہرایا۔

اسکے جواب میں سلطان معزالدولہ بویہیؒ نے شیعوں کی طرف سے سنی اکابر کیلئے ایسے ہی نعرے لگوائے۔

سلطان محمود غزنوی کا دور آیا تو اس نے بویہی سلطان کا جواب دیا ہو یا بنی امیہ کے عمل کا اعادہ کیا ہو مگر مجالس تبرا منعقد کرائیں اور ان میں محبان علیؑ پر

لعنت بھجوائی جواب روافض کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔

سلجوقیوں میں ایسی مجالس کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ملا لیکن شیعوں پر تبرا کیا ضرور جاتا تھا کیونکہ ایک استفتاء کے جواب میں امام غزالی نے لکھا ہے۔

" معین لوگوں کی لعنت میں خرابی ہے اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی بالفرض شیطان ہی پر لعنت نہ کرے اور سکوت اختیار کرے تو کچھ اندیشہ نہیں رہا یزید کی لعنت کا حال تو قتل واجازت دونوں پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتیں۔ لعنت کا کیا ذکر ہے جب تک قتل و اجازت کا ثبوت نہ ہو، تب تک اسکو قاتل و اجازت دہندہ بھی نہ کہنا چاہیئے اس لئے کہ قتل گناہ کبیرہ ہے اسکی نسبت مسلمان کی طرف بلا ثبوت کامل نہیں ہو سکتی۔

جو صفات مقتضی لعنت کے ہیں وہ تین ہیں، کفر، بدعت اور فسق اور ان میں لعنت کے تین طور ہیں پہلا تو یہ کہ وصف تمام کے ساتھ لعنت مثلاً یوں کہ کافروں، بدعتیوں اور فاسقوں پر خدا کی لعنت ہو۔ دوسرا یہ کہ وصف کو اس سے خاص کرکے کہے، جیسے خدا کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ مجوسی، قدریہ، خوارج، روافض زانی اور سود خور پر اور یہ دونوں شقیں جائز ہیں مگر اہل بدعت پر لعنت کہنے میں تامل ہے کیونکہ بدعت کا پہچاننا امر مشکل ہے۔" (۷۰)

یہ فتاوے دلالت کرتے ہیں اس حقیقت پر کہ سلجوقی عہد میں شیعوں پر لعنت کی جاتی تھی اور بعض لوگ اسکو مناسب نہیں سمجھتے تھے جنہوں نے امام غزالی سے رجوع کیا اور جب فتویٰ مل گیا تب انہوں نے اسکو جائز قرار دیا۔

ایوبی دور کے بارے میں کہنا کیا اترکان عثمانی کے عہد سے متعلق تحقیق نہ ہو سکی مگر دشمنی عروج پر تھی اس لئے لعنت یقیناً کی جاتی ہوگی۔ اب اورنگزیب نے اسکو تازہ کیا تھا اور طریقہ وہی تھا جس کا فتویٰ امام غزالی نے دیا تھا۔ ایک آدمی منبر پر جاتا اور قابل لعنت وصف کے حوالے سے نام لیتا: فلاں ابن فلاں رافضی بود!

حاضرین یکزبان ہو کر کہتے: بر پدرش لعنت!

لیکن تبرے کی یہ مجالس مرکزوں تک محدود رہیں۔ ان میں ان لوگوں کو شرکت پر مجبور کیا جاتا جن پر شیعہ ہونے کا شبہ ہوتا۔

مغلوں کے اگلے ادوار میں یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

میں نے ایک بے تکلف سنی دوست سے پوچھا۔

"سچ سچ بتاؤ کہ سنی شیعوں سے اتنا جلتے کیوں ہیں؟"

اس نے بتایا۔

"تم لوگ صحابہ کو برا جو کہتے ہو۔"

"یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے!" میں نے مسکرا کر جواب دیا اور کہا۔ "بھائی ہزار سال تک تو علیؑ اور محبان علیؑ پر لعنت تم بھیجتے رہے ہم نے کبھی کبھی موقع محل سے طبع آزمائی کر لی تو ہم سے ناراض ہوتے ہو!"

دوستی کی بات تھی وہ بھی مسکرا دیا۔ بات ختم ہو گئی مگر ایک لمحہ فکر یہ طویل ہوتا چلا گیا۔

"آخر اتنی عداوت ہم سے کیوں؟ صدیاں بیت گئیں مگر نفرت کی خلیج پاٹے نہ پٹ سکی!"

بات اگر سقیفہ بنی ساعدہ کے انتخاب کو نہ ماننے کی ہے تو وہ ہمارے اصول سے جائز نہیں تھا پھر یکطرفہ طور پر کر لیا گیا تھا ہم نے نہ پہلے مانا تھا اور نہ کبھی مانیں گے۔ بات کرنا تھی تو اسپر کی جاتی۔ صداقت اپنے دلائل رکھتی ہے۔ ہم سمجھنا چاہتے تھے اور سمجھانا چاہتے ہیں مگر ہمیشہ تلوار سے سمجھانے کی کوشش کی جاتی رہی کسی نے زبان سے نہیں سمجھایا بلکہ اپنے متبعین سے کہہ دیا کہ شیعوں کے پاس نہ بیٹھا کرو وہ جادو کر دیتے ہیں!

اور پھر اکتفا اتنے ہی پر نہیں کی گئی بھولے بھالے مسلمانوں کے کانوں میں ڈالا گیا۔

"شیعہ علیؑ کو خدا مانتے ہیں۔"

"شیعہ روز عاشور سنی بچوں کو پکڑ لے جاتے ہیں اور انکو تعزیے کے سامنے ذبح کرتے ہیں"۔

لاکھ صفائی دو اور بتاؤ کہ یہ غلط ہے مگر جواب ایک ہی ملتا ہے تم لوگ چھپاتے ہو اور ایک دوست نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مردے کو نہلاتے ہو تو

"گزمی کنم" کرتے ہو۔ میں حیران ہوا کہ "گزمی کنم" کیا ہے؟ اس پر اس نے صراحت کی کہ مردے کے نیچے سے لکڑی ڈالکر اندر کی آلائش نکالتے ہو اور گزمی کنم کہتے جاتے ہو

میں نے اسکو بھی اتہام سمجھا مگر سوچتا رہا کہ یہ معمہ کیا ہے؟ آخر بزرگوں سے پوچھا تو انہوں نے بیان کیا۔

ایک بار علماء ایک وفد کی صورت میں اورنگزیب سے جاکر ملے اور اس سے کہا کہ گورکن عموماً میلے کچیلے اور گندے ہوتے ہیں۔ ان کا پسینہ قبروں میں گرتا ہے اور انہیں میں مسلمان مردے دفن کردئے جاتے ہیں جس سے انکی بے حرمتی ہوتی ہے اورنگزیب نے پوچھا

"پھر کیا کیا جائے؟"

"قبریں کھودنے کیلئے صاف ستھرے لوگوں کا انتظام کیا جائے۔" اسے ایک متفقہ جواب دیا گیا اورنگزیب نے استفسار کیا۔

"آپ لوگوں نے کچھ تجویز کیا ہے"؟

"میرے خیال میں تو یہ کام سادات کے سپرد کردیا جائے، وہ متقی اور پرہیزگار بھی ہوتے ہیں اور پاک و طاہر بھی۔" ایک عالم نے منصوبے کے مطابق اپنی تجویز پیش کی اور اورنگزیب نے ان سے اتفاق کرلیا پھر اسی وقت حکم جاری کردیا گیا اور سادات گورکنی پر متعین ہوگئے۔

اورنگزیب کے عہد میں نعمت خاں عالی شیعوں کا واحد سہارا تھا جو تقیہ اختیار کئے تھا ایک بزرگ سید بہت احتیاط کے ساتھ اس سے جاکر ملا اور نعمت خاں عالی نے خفیہ طور پر اسے بعض ہدایات دیدیں۔

نعمت خاں ایک موقر امیر تھا جو مختلف عہدوں پر فائز رہا تھا اور اب داروغہ مطبخ اور میر منشی کے عہدے پر تھا۔ لوگوں نے عالمگیر سے اسکی شکایت کی کہ وہ رافضی ہے؟ اورنگزیب خود جانتا تھا مگر وہ غیر معمولی صلاحیت کا مالک تھا اور حد درجہ وفادار اس لئے اورنگزیب نظرانداز کرتا تھا۔ اس نے ان لوگوں سے کہا کہ تمہیں شک ہے تو اس سے مجلس میں لے جاکر تبرا کراؤ۔ چنانچہ نعمت خاں کو مجبور کیا گیا۔

وہ مجلس میں منبر پر گیا اور اس نے آواز لگائی۔

"محمد بن ابی بکر رافضی بودا"

اکثر لوگ بر پدرش کہہ کر رک گئے اور جن لوگوں نے روانی میں جملہ پورا کردیا وہ منہ پیٹنے لگے۔ نعمت خاں منبر سے اتر کر چلا گیا۔ اسکی شکایت پھر اورنگزیب سے کی گئی تو اس نے کہا۔

"تم لوگ علمی تبحر کے دعویدار ہو۔ جب اس نے ایک رافضی کا نام لیا اور مع ولدیت کے پکارا تب بھی تمہیں ہوش نہ آیا اور تمہاری اجتماعی ذہانت اس ایک آدمی سے مات کھا گئی۔ میں بھی جانتا ہوں کہ وہ شیعہ ہے اس جیسا کوئی لے آؤ تو میں اسے نکال دوں"

اسی نعمت خاں عالی نے بزرگ سید کو ایک راستہ دکھا دیا اور جاتے ہی پورے خاندان کو لے جاکر اس نے چھوٹی بڑی قبریں کھدوانا شروع کردیں۔ جب مسلمان ایک مردے کو لے کر پہنچے تو ہر پیمائش کی قبریں تیار تھیں۔ انہوں نے مردے کو ناپا اور ایک قبر کی طرف اشارہ کردیا۔ یہ مردہ نہلا دھلا کر اور کفنا کر لایا گیا تھا اسکی تدفین کردی گئی مگر اسکی شکایت کی گئی کہ قبریں پہلے سے کھود کر رکھنا بڑی بدشگونی ہے۔ سیدوں سے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا۔

"ہم تھوڑے سے آدمی ہیں۔ شہر میں مرنے والی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ ہم عین وقت پر اتنی قبریں کیونکر تیار کرسکتے ہیں۔ پھر بعض مردوں کا غسل و کفن بھی ہمیں کرنا پڑے گا۔"

جواب معقول تھا لہٰذا اس اعتراض کو نظرانداز کردیا گیا۔

شیعوں کے کفنانے کے طریقہ میں کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ نہلانے میں بھی ایک غسل اس طرح دیا جاتا ہے کہ پانی میں بیر کی پتی ملی جاتی ہے۔ بیر کی پتلی شاخوں کی دو بیساکھیاں بغلوں میں دی جاتی ہیں جو سیدوں نے پہلے سے تیار کرلیں۔ ایک مردہ نہلانے کیلئے لایا گیا تو انہوں نے بیر کی پتی اور بیر کی بیساکھیاں اٹھائیں۔ لوگوں نے پوچھا۔

"ان بیساکھیوں کا کیا ہوگا؟"

"نہلانے سے قبل ان کے ذریعہ اندر کی آلائش نکالی جائے گی" ۔ ایک سید نے بتایا، مردے کے قریب جا کر بیساکھی ہاتھ میں لی اور کہا

"گزمی کنم ۔"

اسکے ساتھ ہی اس نے بیساکھی نیچے کی طرف لگائی ۔ مردے کے وارث چیخ پڑے ۔

"یہ کیا کرتے ہو، اس سے مردے کی بے حرمتی ہوگی ۔"

سید رک گیا اور بڑی متانت سے بولا

"ہم تو اپنے ہی طریقہ پر غسل دیں گے ۔ ہمیں اسکے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں معلوم"

سید الگ بیٹھ گیا اور لوگ مردے کو اٹھا لے گئے

اس وقت سے یہ مشہور ہو گیا کہ شیعوں میں مردے کے ساتھ "گزمی کنم" ہوتا ہے ۔

سادات نے گورکنی غسل و کفن اور تدفین کسی بات سے انکار نہیں کیا لیکن انکے طور طریقہ کو کون مانتا لہذا پھر پرانا طریقہ رائج ہو گیا لیکن اسکے بعد سادات دلی چھوڑ کر چلے گئے ۔ اس طرح دلی شیعوں سے خالی ہوتی رہی اور پھر کوئی عوامی آبادی نہ ہو سکی ۔

اورنگزیب کی شخصیت کا ایک پہلو تو یہ تھا، دوسری طرف خود اسکی ایک بیوی راجپوت تھی اور شاہزادہ معظم کی شادی بھی اس نے راجپوت لڑکی سے کی تھی اور یہ دونوں اپنے سابقہ عقیدے پر قائم تھیں ۔ ان دونوں پر تبدیلی مذہب کیلئے کوئی زور ڈالا نہیں گیا، نظیریں اسکی بھی ہیں کہ اورنگزیب نے بعض مندروں کو عطا یا دئے اور سادات کو بھی جاگیریں دیں ۔

شیعوں کے مسائل بالکل علیحدہ تھے ۔ وہ مختلف ادوار میں مختلف حالات سے دوچار رہے تھے اور انکو شدائد میں زندہ رہنے کی عادت تھی ۔ وہ اپنی صلاحیت کے بل پر زندہ رہنے کے چلن جانتے تھے لہذا اب بھی بہت سے کلیدی عہدوں پر موجود تھے اور محلسرا میں شیعہ خواتین مغل بیگمات میں گھلی ملی رہتیں ۔ علماء بھی اکبر کے ابتدائی دور کی طرح موجود تھے اور بعض شاہی بچوں کی تعلیم پر بھی مامور تھے ۔

شاہزادی زیب النساء

عجیب ستم ظریفی ہے کہ اورنگزیب کی یگانہ عصر بیٹی زیب النساء شیعہ تھی اور ولی عہد سلطنت شہزادہ معظم بھی اثنا عشری ۔ کن اسباب و عوامل نے ان کو اس راہ پر لا ڈالا تھا؟ اسکے بارے میں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ماحول میں ایسے عناصر موجود تھے جنہوں نے بحث مباحثے سے ان کے ذہن میں انقلاب پیدا کر دیا ۔

اس سلسلے میں پہلا نام ممتاز محل کا آتا ہے جو جہاں آرا کی ماں تھی اور زیب النساء کی حد تک ایک نام نواب بائی راجہ کشتورا کی بیٹی کا بھی لیا جا سکتا ہے جسکی گود میں اس نے پرورش پائی اور جو ایک طرح پر شہزادی کی ماں ہی تھی ۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ وہ محب اہل بیت تھی ۔

ابتدائی تعلیم دینے والوں کا کچھ سراغ نہیں ملتا لیکن دینیات ملا محمد سعید اشرف خلف محمد صالح مازندرانی نے پڑھائی پھر شاہزادی کا علمی دربار منعقد ہونے لگا جس میں باکمال علماء و فضلاء ادباء و شعراء کی شرکت مسلم ہے ۔ بعض کو خود اورنگزیب منتخب کر کے بھیجتا تھا ۔

زیب النساء کا پورا ماحول شاعرانہ تھا ۔ اسکی کنیزیں تک شاعر تھیں ۔ ایک دن وہ چہل قدمی کے دوران اپنا ایک شعر پڑھ رہی تھی ۔

چہار چیز کہ دل می برد کدام چہار
شراب و ساقی و گلزار و قامت دلدار

کہ اورنگزیب عقب سے ٹہلتا ہوا پائیں باغ میں آگیا اور اس نے دوسرا مصرعہ بدل کر پڑھ دیا ۔

نماز و روزہ و تسبیح و دیگر استغفار

امیر عاقل خاں کے معاشقہ کو اکثر اکابر نے غلط قرار دیا ہے جن میں نیاز فتحپوری بھی ہیں حالانکہ سن وسال کو دیکھتے ہوئے وہ ناممکن نہیں ہے۔ شہزادی حسین و جمیل تھی اور شاعرہ بھی اور عموماً محسوسات تغزل خود دل پر چوٹ کھائے بغیر پیدا نہیں ہوتے ۔ پھر اس سے اسکی عظمت پر حرف بھی نہیں آتا ۔ اگر عاقل خاں

پائیں باغ میں چہل قدمی کے ہنگام اسکو چھپ کر دیکھتا رہا ہو اور جب اسکو پکڑنے کیلئے اورنگزیب کے سپاہی دوڑے ہوں تو وہ باورچیخانے کی خالی دیگ میں جا گھسا ہو۔ یہ دیگ چولھے پر چڑھادی گئی اور عاقل خاں عظیم المرتبت شہزادی کو بدنامی سے بچانے کے لئے کوئی آواز نکالے بغیر جل کر کباب ہو گیا۔ محبت اور تحیر خیز شجاعت کی ایک داستان جو نہ غیر فطری ہے اور نہ شہزادی کیلئے باعث توہین پھر اسپر پردہ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔

اسی طرح کا واقعہ ناصر علی سرہندی کا ہے کہ جب اسکو زیب النساء کا مصرعہ

" از ہم نمی شود ز حلاوت جدا لبم "

اسپر مصرعہ لگانا واقعی مشکل تھا مگر ناصر علی کے منہ سے برجستہ نکل گیا۔

گویا رسید بر لب زیب النساء لبم

اس کو سن کر شاہزادی آگ بگولا ہو گئی مگر گستاخی کے ساتھ ناصر علی کی حاضر جوابی اور مہارت فن نظرانداز نہ ہو سکی۔ شہزادی نے ایک شعر لکھ کر اسکو معاف کر دیا

ناصر علی بنام علی بردی پناہ
ورنہ بذوالفقار علی سر بریدئی

اس کمال فن کے ساتھ شہزادی مذاہب عالم کی عالمہ تھی، اپنے چچا دارا کی طرح اس نے ایک تفسیر قران بھی لکھنا شروع کی تھی جس سے اسکے عقائد کا پتہ چلتا مگر وہ ناپید ہے۔ اس کا دیوان دیوان مخفی کے نام سے پایا جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی قدیم کتب خانے میں اسکی کوئی کاپی محفوظ ہو۔

شہزادی نے اپنی جو مہر بنوائی تھی اسپر کندہ تھا۔ کنیز فاطمہ زیب النساء۔ پھر اپنی تحریروں اور گفتگو میں وہ جو کچھ بیان کرتی وہ تولا کے ساتھ تبرا کی آئینہ دار بھی ہوتی اسی لئے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ خود اورنگزیب نے اسکو زہر دلوادیا۔ مرتے وقت اورنگزیب کے استفسار حال پر اس نے ایک شعر پڑھا تھا

ترا نہ تکمۂ لعلش در قبائے حریر
شداست قطرہ خوں منت گریباں گیر

اور اس وقت اورنگزیب کے گلوئے قبا میں لعل کی گھنڈی تھی۔

اورنگزیب: نہ ظالم نہ ستم گر

ہم نہیں کہتے کہ بیٹی کا خون اسکی گردن پر ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کام اس عہد کے علماء کا ہو کیونکہ بے گناہ شاہزادی نے اسکی شکایت نہیں کی کہ اسکو حب علیؑ کی پاداش میں زہر دیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی متعصب نے اختلاف مذہب کی بنا پر زہر دلوادیا ہو مگر یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ۱۱۰۷ھ میں مغلوں کی فخر روزگار خاتون اس دنیا سے سدھار گئی۔

باپ کی حیثیت سے اورنگزیب کو اس کا دکھ ضرور ہوا ہوگا وہ بہر صورت اپنے پہلو میں انسان ہی کا دل رکھتا تھا مگر توسیع سلطنت کے جنون نے اسے بہلالیا اور وہ دکن کی شیعہ حکومتوں کا استیصال کرنے میں لگ گیا۔

عصبیت سے قطع نظر کرکے اورنگزیب کو دیکھا جائے تو وہ ایک جیالا سپاہی اور بہادر جرنیل تھا۔ اسکی کامیابیوں میں حالات سے زائد خود اسکے تدبر کو دخل تھا اور اس نے سلطنت مغلیہ کے اس جگہ پہنچادیا تھا جسکے بعد زوال ناگزیر تھا جو ہو کر رہا

گردنیں قلم کرکے تسخیر ممالک کی پالیسی جو شروع ہی سے مسلمانوں کا شیوہ رہی تھی اسی کو اورنگزیب نے اپنایا اور دلوں کو مسخر کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی جس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا کہ تلواروں کا سایہ سر سے ہٹتے ہی بغاوتیں شروع ہو گئیں۔

لیکن محسوس ہوتا ہے کہ آخر عمر میں وہ کچھ بدل رہا تھا۔ علماء کے مشورے پر جب اس نے تعزیہ داری بند کرنے کا حکم دیا تو کسی نے بند کمرے میں تعزیہ رکھ کر بڑھا دیا، کسی نے رکھا ہی نہیں مگر ایک ضعیفہ جس چوک پر تعزیہ رکھتی آئی تھی اس نے اپنے طریقہ پر اسی چوک میں تعزیہ رکھا اور مرنے کیلئے تیار ہو کر بیٹھ گئی۔ لوگوں نے حکم شاہی سے سرتابی پر بہت ڈرایا دھمکایا مگر ضعیفہ کی عقیدت نے امامؑ کی مودت میں جان عزیز کو کم قیمت قرار دیا۔

اورنگزیب کو خبر ہوئی تو وہ خود اسکو دیکھنے کیلئے روانہ ہوا ۔ ضعیفہ تعزیے
کے آگے ایک ٹمٹماتا ہوا دیا جلائے بیٹھی تھی جو ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہا تھا مگر
روشنی دے رہا تھا اور ضعیفہ بڑے اطمینان اور سکون سے تعزیے کی طرف دیکھے جا رہی
تھی ۔ بادشاہ کے پہنچتے ہی مجمع بڑی تیزی سے چھنٹ گیا مگر ضعیفہ اسی طرح بیٹھی رہی

اورنگزیب سواری سے غیظ کے عالم میں اترا مگر تعزیے کے قریب پہنچ کر نرم
پڑ گیا ۔ دیر تک تعزیے کو دیکھتا رہا ۔ ساتھ والے منتظر تھے کہ وہ حکم دے تو ضعیفہ کا
سر اتار لیا جائے اور ضعیفہ بھی اپنے انجام کو سمجھ رہی تھی مگر اس نے تعزیے پر سے اپنی
نظریں ہٹائیں نہیں ۔ شاید خیال ہی خیال میں رسولؐ کی بیٹی سے کچھ کہہ رہی ہو
اورنگزیب نے ایک عجیب سی نگاہ ضعیفہ پر ڈالی اور الٹے قدم واپس ہو گیا ۔

کس میں ہمت تھی جو اس سے کچھ پوچھتا مگر حیرت ہر ایک کو تھی کہ عورت
کو عدول حکمی اور بدعت کی سزا کیوں نہیں دی گئی ۔

جسکے نتیجے میں دوسرے لوگ بھی قدرے احتیاط سے عزاداری کرتے رہے
جشن نوروز بھی ہوا اور ۹ ربیع الاول کو عید زہراؑ بھی منائی گئی ۔(۱۷)

ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ایسے ہی بعض واقعات پیش آئے اور
انسداد عزا کا فرمان پوری طرح نافذ العمل نہ ہو سکا ۔ اورنگزیب نے بھی سختی نہیں کی
شاید وہ دیوانی قوم کی اندھی عقیدت کو سمجھ چکا تھا یا ہو سکتا ہے کہ صداقت کچھ کچھ
اپنا اعجاز دکھانے لگی تھی ۔ اس کا اندازہ اس طرح سے ہوتا ہے کہ ۱۱۱۷ھ میں جب
اس کا وقت قریب آیا تو اس نے بارہ دفعات پر مشتمل ایک وصیت نامہ تحریر کیا ۔

ان وصایا میں کئی وصیتیں اسکے آخری عقیدے پر دلالت کرتی ہیں ۔ سادات
کے ساتھ حسن سلوک روا رکھا جائے ، خاک تربت امام مظلوم قبر میں رکھی جائے اور
قبر بنانے کی جو ہدایات ہیں وہ بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں ۔ بعض اکابر کی رائے
ہے کہ اورنگزیب مرتے وقت شیعہ ہو گیا تھا ۔ ان میں ایک رائے مولوی احمد
دیوبندی کی بھی ہے ۔ مقالہ مشمولہ سرفراز لکھنؤ محرم نمبر ۱۳۷۷ھ میں مولانا نے لکھا
ہے "در مذہب امامیہ متعصب بود" ۔ شیعیت کو عالمگیر کے تبدل ذہن سے کوئی

فائدہ نہیں پہنچا لیکن یہ بات ضرور روشن ہوتی ہے کہ عاقبت کیلئے اسے ان اصول کی
ضرورت لاحق ہو گئی تھی جنکی وہ عمر بھر تکذیب کرتا رہا اور جو اسکے نزدیک لائق
عقوبت تھے ۔

محمد معظم، بہادر شاہ اول

اورنگزیب کی وفات پر محمد معظم نے یکم صفر ۱۱۱۷ھ کو لاہور میں اپنی
بادشاہت کا اعلان کیا ۔ محمد اعظم دہلی میں تخت نشین ہو چکا تھا ۔ دونوں بھائیوں
میں آگرہ کے قریب لڑائی ہوئی ۔ شہزادہ اعظم شکست یاب ہو کر مارا گیا ۔ سب سے
چھوٹا بھائی کام بخش دکن میں تھا اس نے وہاں اپنی حکومت کا اعلان کیا ، محمد معظم
بہادر شاہ کا لشکر مقابلے پر پہنچا تو گھمسان کی جنگ ہوئی کام بخش میدان جنگ میں
اتنا زخمی ہوا کہ جانبر نہ ہو سکا ۔

بہادر شاہ میں شجاعت کی کمی نہ تھی ۔ اس لحاظ سے وہ تاج و تخت کا سزاوار تھا
لیکن اس میں تدبر کی کمی تھی ۔ بادشاہ بننے سے بہت پہلے وہ مذہب اثنا عشری اختیار
کر چکا جس کا اس نے اعلان کر دیا ۔ اورنگزیب کی کٹر حکومت کے بعد مغل تخت پر
ایک شیعہ کا فروکش ہونا اکثر لوگوں کو نہ بھایا مگر بہادر شاہ اتنا کمزور نہ تھا کہ امراء
کے خوف سے اپنے عقیدے کو چھپائے رکھتا ۔ اسکے رعب و دبدبہ کو دیکھ کر کسی
نے سر اٹھانے کی جرات نہیں کی پھر بھی بہت سے لوگوں میں ایک بددلی پیدا ہو گئی

راجپوتوں کی بغاوت تو بہادر شاہ نے آسانی سے فرو کر دی لیکن سکھ ،
جو جہانگیر کے وقت سے طاقت پکڑ رہے تھے ، ان کے فتنے کو دبانے میں اسے بڑی
دشواریاں پیش آئیں ۔ سکھوں نے پنجاب میں لوٹ مار شروع کر دی ۔ بہادر شاہ نے
وقتی طور پر انہیں دبا لیا مگر انکی جڑیں اندر ہی اندر پھیلتی رہیں ۔ اسی دوران جنوبی ہند
میں مرہٹوں نے سر اٹھایا ۔ انہیں بھی دبا لیا گیا ۔ بہادر شاہ زندہ رہتا تو ممکن تھا کہ
حالات پر قابو پا لیتا مگر ۱۹ محرم ۱۱۲۲ھ کو ۷۳ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا ۔
اسکی مدت حکومت ۵ سال دو ماہ رہی ۔ کہا جاتا ہے کہ کسی نے اسکو زہر دیدیا تھا

جہاندار شاہ

بہادر شاہ کے چار بیٹے تھے جہاندار شاہ، عظیم الشان، رفیع الشان اور جہاں شاہ۔ باپ کے مرتے ہی وہ آپس میں لڑنے لگے۔ آخر میں جہاندار شاہ کامیاب ہوا مگر وہ میراثیوں اور ڈومنیوں کی سرپرستی کرنے لگا اور اسکے بھتیجے فرخ سیر بن عظیم الشان نے اسکے خلاف بغاوت کر دی۔ سید حسین علی خاں اور سید عبداللہ سادات بارہہ اسکے ساتھ تھے۔ جہاندار شاہ کو شکست ہو گئی اور فرخ سیر تخت مغلیہ پر فروکش ہو گیا

فرخ سیر

یہ بادشاہ سید حسین علی خاں حاکم بہار اور سید عبداللہ خاں حاکم الہ آباد کی بدولت تخت نشین ہوا تھا لہذا ان کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا رہا۔ سید عبداللہ خاں کو اس نے ظفر جنگ یار وفادار اور قطب الملک کے خطابات دئے اور وزارت عظمیٰ کا عہدہ تفویض کیا۔ امیر الامراء بہادر فیروز جنگ کو سپہ سالار بنایا اسی طرح دوسرے متعلقین کو بھی مختلف مناسب عطا کیے پھر دہلی پہنچ کر تمام مخالفین کو قتل کرا دیا۔

شیعہ ہر دور کے مدوجزر سے گزرتے آئے تھے کبھی تقیہ کا نقاب منہ پر ڈال کر کبھی کھلے خزانے روشن جبینوں کا عکس ڈالتے ہوئے اورنگزیب کے وقت میں بھی وہ زندہ تھے اور بہادر شاہ اول سے لے کر اس وقت تک کھلی فضا میں سانس لے رہے تھے اور یہ زمانہ ایک طرح پر خود انکی بادشاہت کا تھا جس میں شیعوں کو بھی اپنے طور پر جینے کا حق تھا۔

سادات بادشاہ گر

سیدوں کا ایک قبیلہ عراق و ایران میں بویہی سلطنت کے زوال کے بعد ترک وطن کر کے پنجاب آیا۔ یہ وہ دور تھا جب غزنی کی سلطنت خراسان سے سرحد [illegible] پنجاب کے ایک حصے تک پھیل چکی تھی اور ہندوستان پر محمود کے حملے شروع ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر صفدر حسین کی تحقیق کے مطابق یہ قبیلہ محمود کی فوج میں شامل ہو کر آیا تھا اور پنجاب میں رہ گیا تھا پھر وقت کے تدریجی ارتقا کے ساتھ گنگا و جمنا کے دوآبے میں آکر آباد ہو گیا۔ بعض شاخیں دوسرے اطراف میں بھی منتقل ہوئیں۔

مولانا محمد حسین آزاد کا کہنا ہے۔

ضلع مظفر نگر میں کہ دوآبہ گنگ وجمن میں واقع ہے صدہا سال سے ۱۲ گاؤں مشہور چلے آتے ہیں ان میں سادات کی آبادی ہے سبہاں کے سید صحیح النسب اور بڑے بہادر تھے۔ سلاطین سلف کے عہد میں انہوں نے بڑے بڑے کارنامے کئے۔

اکبری فوج میں بھی دلاوری کے چہرے کو سرخرو کرتے رہے۔ اول ان میں سید محمود بارہہ تھے کہ پہلے سکندر سور کے قلعہ مانکوٹ میں قید تھے۔ جب اکبری فوج نے محاصرہ کا دائرہ بہت تنگ کیا تو سردار ساتھ چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ یہ مع اپنے ہمراہیوں کے اکبری لشکر میں آئے اور ملازمت بادشاہی اختیار کی۔ ان کی خدمات جانفشان نے منصب کا درجہ چار ہزاری تک بلند کیا۔ ان کے بیٹے سید ہاشم بارہہ برابری منصب تک پہنچے تھے کہ شہادت کا منصب نصیب ہوا۔ سید عبدالمطلب، سید عبداللہ خاں بارہہ وغیرہ نامی سردار اسی خاندان کے تھے اور ہر میدان میں اتنے بے جگر ہو کر لڑتے تھے کہ انکی شجاعت آجتک ضرب المثل چلی آتی ہے۔ مرزا عزیز کو کلتاش کہا کرتے تھے کہ سادات بارہہ دولت اکبری کے فدا ہیں (۲۰)

اس خاندان کا سلسلہ نسب حضرت زید شہید سے شروع ہوتا ہے اور واسط میں آباد ہونے والے زیدی سادات میں مرکوز ہو جاتا ہے جو انقلابات زمانہ میں مختلف مقامات پر پھیل جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صفدر حسین کے مرتبہ خاندانی شجرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید ابوالفضائل کی اولاد نے ترک وطن کیا جو زید شہید کی چودہ پشتوں کے بعد گزرے ہیں۔ کچھ لوگ پنجاب و گجرات میں رہ گئے باقی نے دوابہ کا رخ کیا اور آہستہ آہستہ بہت سی شاخوں میں بٹ گئے۔ مظفر نگر، میرٹھ، تسہ، میران پور، جولی، بلاسپور، چتوڑہ، بہادر پور، سنبھل ہیڑہ، مورنہ، جنواڑہ، سرسی، میمن ضلع بجنور، جانسٹھ، ہاشم پور، کوال، کوٹلہ، کہلاوڈہ، کھرودہ جلال پور کیتھوڑہ، ننڈھیرہ، بڑھانا، ندی والا وغیرہ

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک بڑی تعداد نے ترک وطن کیا تھا جو سب کے سب صاحبان سیف و قلم تھے۔ تب ہی تو مسلم حکومت کے دور میں کوئی نہ کوئی صاحب طبل و علم رہا اور قبیلہ کے افراد مختلف مقامات کو اقامت گاہ بناتے

رہے جن میں دلی آگرہ، تغلق آباد اور دکن بھی شامل ہیں اور بدایوں کا نام بھی آتا ہے جہاں نواب سید جعفر کا مزار ہے۔ یہ بات لودھی عہد کی معلوم ہوتی ہے۔

سادات بارہہ میں اس سے قبل جو مشاہیر گزرے وہ تاریخ میں خلط ملط ہیں البتہ دور اکبری سے انکا سراغ ملتا ہے اور نواب سید محمود کا نام آتا ہے۔ بارہ گاؤں کا حوالہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ ممکن ہے بارہ پرگنے ہوں۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ تمام علاقے کس بادشاہ سے ملے یا کس دور میں انہوں نے بزور شمشیر ان پر قبضہ کیا پھر بادشاہ وقت سے سند جاگیر حاصل کرلی۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلم حکومت کے آغاز پر یہ سادات پنجاب سے آگے بڑھے اور ان علاقوں پر قابض ہوکر حکومت سے وابستہ ہوگئے پھر ان کے جوہر شمشیر نے خود اپنے وجود کو تسلیم کرالیا

نواب سید محمود کے بعد سید ابوالحسن، سید بہادر علی، سید مبارک علی، سید جمعیت علی خاں تلوار کے دھنی کہلائے اور اسی تسلسل میں بہت سے روشن ناموں کے ساتھ ایک بہت جلی نام سید محمد ہاشم کا ملتا ہے جو شجاعان روزگار کو پیچھے چھوڑتا ہوا سید عبدالمطلب تک پھر سید عبداللہ خاں تک پہنچتا ہے اور سادات بارہہ (باہرہ) کی اگلی تاریخ کا پیش خیمہ بنتا ہے۔

سادات کا غلبہ

فرخ سید کی بادشاہی بالکلیہ سیدوں کی رہین منت تھی اور اس نے انہیں تمام اختیارات دیدئے تھے مگر ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے اور یہاں تو تین بادشاہ تھے۔ دو سید اور ایک فرخ سیر لہذا اختلافات شروع ہوگئے اور بدگمانیوں نے دلوں میں جگہ بنالی۔ راجپوتوں کی سرکشی پر فرخ سیر نے سید حسین علی خاں کو متعین کیا تو اس نے انکی تادیب کرنے کے بجائے صلح کرلی اور سید عبداللہ کی طلبی پر دلی واپس آگیا۔

دکن میں مرہٹے سر اٹھارہے تھے جنکو نظام الملک نے دبالیا لیکن فرخ سیر نے سیدوں کی طاقت کم کرنے کیلئے نظام الملک کو دلی بلالیا اور حسین علی خاں کو دکن بھیج دیا۔ جہاں پہنچتے ہی حسین علی خاں کو اپنے ہی ایک امیر داؤد خاں کا سامنا کرنا پڑا۔ نظام الملک دکن سے یہ منصوبہ بناکر آیا تھا جسکی ہدایات اسے فرخ سیر نے دی تھیں

داؤد خاں لاکھ طاقتور سہی مگر حسین علی خاں کا مقابلہ نہ کرسکا اور حسین علی خاں کے بجائے لڑائی میں وہ مارا گیا۔ اب سیاسی صورت حال حسین علی خان پر بالکل واضح ہوچکی تھی۔ فرخ سیر اندر ہی اندر انکے دشمنوں کی تعداد بڑھانا چاہتا تھا جو یقیناً مسلم حکومت کے مخالف تھے لیکن خود مسلم حکومت بھی سادات کی گھات میں لگی ہوئی تھی لہذا مرہٹوں کیلئے حسین علی خاں نے ایک صلح کن پالیسی اختیار کی اور تلوار کے بجائے اخلاق سے انکی غارت گری پر قابو پانے کی کوشش میں لگ گیا۔

اس دوران سکھوں نے بغاوت کی اور گورداس پور کو مرکز بناکر سرہند اور پنجاب میں غارت گری شروع کردی۔ ان کو کچلنے کیلئے دلی سے ایک بڑا لشکر بھیجا گیا جس نے بندہ بیراگی اور بہت سے سکھوں کو گرفتار کیا۔ وہ سب دلی لاکر قتل کردئے گئے۔

سیدوں اور فرخ سیر کی کشیدگی اب دشمنی میں بدل گئی تھی جسکی اطلاع سید عبداللہ نے حسین علی کو دی اور فرخ سیر نے سید عبداللہ کو معزول کرکے اعتقاد خاں کو وزیراعظم بنالیا اور سید عبداللہ کی جان کے لالے پڑگئے مگر وہ کوئی ترنوالہ نہیں تھا جسکو آسانی سے ہڑپ کرلیا جاتا۔ وہ ہمہ وقت چوکنا رہنے لگا۔

اس اثناء میں سید حسین علی ایک لشکر لیکر دکن سے دلی آگیا جس میں مرہٹہ فوج بھی شامل تھی۔ فرخ سیر اس صورت حال سے گھبرا گیا۔ اس نے سیدوں سے صلح وصفائی کی گفتگو شروع کردی لیکن یہ ایک چال تھی جسکو عمائدین سلطنت بھی سمجھ رہے تھے ان میں سے کسی نے یہ خبر اڑادی کہ سید عبداللہ قتل کردیا گیا۔

اس خبر کے کان میں پڑتے ہی حسین علی خاں انتقام میں دیوانہ ہوگیا اس کے لشکر نے شاہی قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ مرہٹے اسی موقع کے انتظار میں تھے۔ انہوں نے لوٹ مار شروع کردی۔ فرخ سیر کا خسر راجہ اجیت سنگھ بھی [illegible] تھا۔ ۱۱۳۱ھ میں فرخ سیر کو گرفتار کرکے اندھا کردیا گیا اور زنداں میں ڈال دیا گیا۔

اس طرح سید حسین علی نے فرخ سیر سے انتقام تو لے لیا مگر اس سے مرہٹوں میں ایک جان پڑگئی اور لوٹ کے مال سے وہ تنظیم نو کے قابل ہوگئے اور دلی میں سیدوں کے خلاف ایک منافرت عام ہوگئی پھر انہوں نے ابوالبرکات ولد رفیع

الشان کو قید سے نکال کر تخت نشین کیا مگر جب فرخ سیر قید خانے میں مر گیا اور اسکی لاش ہمایوں کے مقبرے لے جائی گئی تو عام بغاوت کے آثار پیدا ہوگئے۔ اسپر ابوالبرکات کی خواہش کے مطابق اسکے بھائی رفیع الدولہ ابن رفیع الشان کو بادشاہ بنادیا گیا۔

رفیع الدولہ شاہجہاں ثانی

رفیع الدولہ دلی میں تخت پر بیٹھا تھا آگرہ میں راجہ اجیت سنگھ والی جودھپور نے بہادر شاہ کے دوسرے پوتے نیکو سیر کو بادشاہ بنادیا تھا۔ سیدوں کا لشکر اسکے مقابلے کو گیا تو راجہ اجیت سنگھ نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ نیکو سیر کو گرفتار کرکے قید میں ڈال دیا گیا۔ ادھر رفیع الدولہ تین ماہ حکومت کرکے مر گیا تو سیدوں نے بہادر شاہ کے تیسرے پوتے روشن اختر کو محمد شاہ کے لقب سے تخت نشین کردیا۔

روشن اختر محمد شاہ

محمد شاہ جہاں شاہ کا بیٹا تھا، نہایت خوبصورت اور تندرست نوجوان پندرہ سال کی عمر میں اس نے عنان حکومت سنبھالی مگر سارے اختیارات سیدوں کے ہاتھ میں رہے۔

نظام الملک سے سیدوں کی دشمنی فرخ سیر کے عہد سے تھی اور بیشتر امرائے سلطنت اسکی مٹھی میں تھے۔ وہ ہمیشہ سے سیدوں کے اقتدار سے جلتا تھا۔ فرخ سیر کے دور میں بھی اس نے کوشش کی تھی کہ بادشاہ کو انکی گرفت سے آزاد کرادے۔ اب پھر اس نے ویسا ہی منصوبہ محمد شاہ کیلئے بنایا۔ سیدوں نے اس کا توڑ یہ کیا کہ اسے مالوہ کا صوبہ دار بنا کر بھجوادیا۔ اس نے مالوہ پہنچتے ہی اپنی فوجی طاقت بڑھانا شروع کردی۔

اسکی اطلاع سیدوں کو ہوئی تو انہوں نے ایک طرف سے دکن کی فوج اپنے متبنیٰ بھتیجے عالم علی کی سرکردگی میں مالوہ بھجوائی دوسری طرف سے راجپوتانہ کا لشکر دلاور خاں کی ماتحتی میں روانہ کیا۔ نظام الملک نے پہلے تو دلاور خاں کو پسپا کیا پھر دکن کی سمت بڑھ کر عالم علی کو شکست دی۔

نظام الملک ایک لائق سپہ سالار تھا لیکن بہادر ہونے سے زائد سازشی ذہن رکھتا تھا۔ فتانت اور چالاکی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ اول دن سے سادات کے اقتدار کو پسند نہ کرتا اور مختلف مواقع پر انکو راستے سے ہٹانے کی کوشش کر چکا تھا اور صرف اسی پر موقوف نہیں، بہت سے امراء تعصب میں سیدوں کے دشمن تھے۔ نظام الملک مالوہ سے ان امراء کو ہدایات دیتا رہتا چنانچہ ایک جال دلی سے آگرہ تک سیدوں کے خلاف بچھ گیا۔

دلاور خاں اور عالم علی کے ہزیمت یاب ہونے کی خبریں جب آگرہ میں سید حسین علی کو ملیں تو اس نے سید عبداللہ کو دہلی روانہ کیا اور خود دکن کا عازم ہوا۔ نظام الملک کے آدمی گھات میں لگے ہوئے تھے حسین علی کی پالکی دورویہ کھڑے ہوئے آدمیوں کے بیچ سے گزری تو ایک شخص عرضی دینے کے بہانے پالکی کے قریب پہنچا اور خنجر نکال کر ایسا وار کیا کہ خنجر کی نوک سید حسین علی کے دل میں اتر گئی۔ سید عبداللہ کو راستے میں اسکی خبر ملی تو چھوٹے بھائی کی موت سے دنیا اسکی آنکھوں میں اندھیر ہوگئی پھر بھی ہوش وحواس کو مجتمع کرکے وہ دلی پہنچا اور لشکر کو منظم کرنے میں لگ گیا۔

اس سازش میں محمد شاہ کا پورا ہاتھ تھا۔ عوام کو پہلے ہی وہ شیعہ اقتدار کے خلاف ابھارا جا چکا تھا۔ سیدوں کے سپاہی بھی ٹوٹ کر محمد شاہ کی طرف چلے گئے اور ان سب نے سیدوں کے مکانات لوٹ لیے اور ان کے کارندے گرفتار کرلیے گئے جو لوگ قتل ہوئے تھے ان کی میتیں اجمیر کی طرف جانے لگیں تو کفن تک لوٹ لئے گئے اور میتوں کو اجمیر لے جاکر سڑکوں پر ڈال دیا گیا جو کسی نہ کسی طرح دفن کی گئیں۔

محمد شاہ نے ان خدمات کے عوض ان سب کو انعامات اور مناصب جلیلہ سے نوازا۔

نظام الملک نے سادات کے خلاف جو منصوبہ بنایا تھا وہ ہر طرح مکمل تھا۔ آگرہ میں انکی بیخ کنی کرنے کے بعد محمد شاہ نے دلی کی طرف پیش قدمی کی۔ سید عبداللہ نے اپنی فوجوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ سید کی فوج کے بعض امراء کو

پہلے ہی سے توڑ لیا گیا تھا۔ وہ عین موقع پر دھوکا دے گئے اور سید کے لشکر میں ایک بددلی پھیل گئی جس کا بدیہی نتیجہ شکست تھی۔ سید عبداللہ سخت زخمی ہو کر گرفتار کر لیا گیا اور قید میں اس کا کام تمام کر دیا گیا۔ اس طرح ۱۱۳۴ھ میں اس بادشاہ گر خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ نظام الملک کا کارنامہ تھا لہذا اسکو آصف جاہ کا لقب دے کر وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز کیا گیا۔

محمد شاہ ایک نااہل فرمانروا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا اس میں نظام الملک کی فراست اور سازش کی کارفرمائی تھی۔ اب اسکے پاس دکن، احمد آباد اور مالوہ کی صوبہ داری تھی اور وزارت کا منصب اعلی بھی لہذا وہ ایک طرح خود مختار سا ہو گیا۔

اس عرصے میں مرہٹوں میں کافی طاقت پیدا ہو گئی جس کا الزام متعصب مورخین سیدوں پر لگاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرہٹے سیدوں کی دوستی کی وجہ سے خاموش تھے۔ جب وہ راستے سے ہٹ گئے اور نظام الملک نے دکن کو بچانے کیلئے ان کا رخ شمالی ہند کی طرف کر دیا تو انہوں نے دلی کے مضافات تک تاخت شروع کر دی۔ محمد شاہ نے نظام الملک کو مدد کیلئے بلایا۔

"وہ بادشاہ کے بلانے پر مع اپنے لشکر کے دہلی پہنچ گیا اور وہاں سے مرہٹوں کے مقابلے کیلئے مالوہ گیا لیکن یا تو اسے مرہٹوں سے لڑنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی یا اس نے کسی سیاسی مصلحت اور سازش کی بنا پر لڑنا نہیں چاہا۔ غرض کہ وہ لڑے بغیر دہلی واپس آ گیا اور اپنے ہاتھ سے یہ عہدنامہ لکھ کر مرہٹوں کو دے آیا کہ سارا مالوہ مرہٹوں کو دیدیا جائے۔ نظام الملک خود اس عہدنامے کو لے کر بادشاہ کے دستخطوں کیلئے دہلی آیا۔ غرض کہ مرہٹے محمد شاہ کی حکومت میں ہندوستان کی سب سے بڑی طاقت بن گئے۔" (۷۳)

سیدوں پر مرہٹوں کی طاقت بڑھانے الزام لگانے والے گریبان میں منہ ڈالیں۔ سید حسین علی نے بلطائف الحیل مرہٹوں کے فتنے کو فرو کر دیا تو ملزم، نظام الملک مرہٹوں سے بھڑا کر سیدوں کو کمزور کرنا چاہتا تھا، وہ اپنے کو بچانے لے گئے تو متعصب مورخ نے ان پر الزام لگا دیا۔ پھر آج اسی نظام الملک نے انکو سند حکومت دیدی تھی۔

سیدوں کا رعب و دبدبہ مرہٹوں کو دبائے ہوئے تھا۔ وہ زندہ ہوتے تو مرہٹے فرمانروائی کا خواب بھی نہ دیکھ سکتے مگر وہ شیعہ تھے اس لئے ان کے زوال پر خوشیاں منائی گئیں۔ آج نظام الملک نے مغل سلطنت کے ایک حصے کا سودا مرہٹوں سے کر لیا تھا تو اسپر آنسو بہانا چاہیئے تھا اور اسکی مطلق العنانی کو برا کہنا چاہیئے تھا تو کوئی بولا نہیں۔

مغل سلطنت شیعوں کی ساختہ و پرداختہ تھی۔ عصبیت نے ہزار جتن کر ڈالے اور جب موقع ملا تو سر اترو لیے مگر شیعوں کے پاس تلوار بھی تھی اور قلم بھی ان سے کہاں پیچھا چھوٹنے والا تھا۔ وہ ہر دور میں مغل حکومت کے پشت پناہ رہے۔ آج نظام الملک سیدوں کا صفایا کر کے بہت خوش ہو رہا تھا لیکن سعادت خاں ایک گوشے سے نکلا اور برہان الملک کے لقب کے ساتھ بڑے امراء میں شامل ہو گیا۔ اسکو بھی نظام الملک نے اول دن سے حریف قرار دیا مگر وہ برہان تھا۔ جاہ و منصب اور نظم و نسق جسکی اعانت کے محتاج ہوتے ہیں۔

نادر شاہ کا حملہ

کابل اس زمانے میں ہندوستان کے زیر نگیں تھا۔ ایران کے بعض باغی افغان وہاں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ نادر شاہ نے محمد شاہ کو لکھا کہ انکو وہاں سے نکال دیا جائے مگر کوئی توجہ نہیں کی گئی بلکہ قاصد کو قتل کر دیا گیا۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ نظام الملک اور برہان الملک دونوں نے اسکو مرہٹوں کی سرکوبی کیلئے بلایا تھا مگر یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ بہرحال نادر شاہ کسی طوفان کی طرح چلا اور کابل و قندھار کو فتح کرتا ہوا پنجاب میں داخل ہو گیا۔

تفصیلات ایران کے حصے میں درج ہو چکی ہیں۔ نظام الملک نے اس موقع پر بھی وہی چالیں چلیں جو اس نے سادات بارہہ (باہرہ) کے خلاف آزمائی تھیں لیکن سید بہادری کے زعم میں چوٹ کھا گئے۔ برہان الملک ایسے دغابازوں کو سزا دینا بھی جانتا تھا۔

محمد شاہ نے نادر شاہ کے مقابلے کیلئے نظام الملک اور راجہ اجیت سنگھ سے مدد طلب کی مگر دونوں نے حیلہ کر کے ٹال دیا۔ برہان الملک امیر الامراء کے ساتھ

روانہ ہوا۔ کرنال کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ نادرشاہی لشکر نے [illegible] منٹوں میں مغل لشکر کو کاٹ ڈالا۔ بڑے بڑے سردار مارے گئے امیر الامراء [illegible] کیا۔ برہان الملک زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا مگر وہ ایرانی النسل تھا۔ جب نادر [illegible] سامنے پیش ہوا تو اس نے اسکو معاف کر دیا۔

پھر وہ واقعہ پیش آیا کہ نادر شاہ کو برہان الملک نے نذر پیش کرنے [illegible] آمادہ کر لیا مگر اسکے واپس ہونے سے قبل نظام الملک نے اس کارنامے کا سہرا [illegible] سر باندھ لیا۔ اس چالاکی پر برہان الملک کا اشتعال برمحل تھا۔ وہ نادر شاہ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہو گیا اور نادر شاہ دلی آگیا۔ دلی کے سپاہی موقع محل سے نادری فوجیوں پر حملے نہ کرتے اور کسی امیر نے یہ خبر نہ اڑائی ہوتی کہ محمد شاہ نے نادر شاہ کو بلا کر قتل کرا دیا تو دلی قتل عام سے بچ جاتی۔ پھر نادر شاہ کے منظر عام پر آنے کے بعد دلی والے اسپر پتھراؤ نہ کرتے تو لٹیرے وقت کا فاتح تلوار کو بے نیام نہ کرتا۔

وہ روشن الدولہ کی مسجد میں جا بیٹھا اور دلی میں قتل عام شروع ہو گیا۔ سات آٹھ سو ایرانی مارے گئے اور تقریباً ڈیڑھ لاکھ مغل سپاہی اور اہل دلی قتل ہوئے آخر یہ قتل عام برہان الملک نے بند کرایا۔

اس موقع پر متعصب مورخ تاریخی خیانت سے باز نہیں آتا۔ وہ لکھتا ہے کہ محمد شاہ خود نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا حالانکہ اس سے قبل وہ تحریر کر چکا ہے کہ نادر شاہ نے قلعہ لوٹنے کیلئے شاہی خواتین اور خود محمد شاہ کو ایک خیمے میں نظر بند کر دیا تھا۔

امن ہونے پر جامع مسجد میں نادر شاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا پھر برہان الملک کی وساطت سے نادر شاہ کے بیٹے نصراللہ مرزا سے محمد شاہ کی بیٹی کی شادی ہوئی۔ یہ رشتہ برہان الملک نے اس لئے کرایا تھا کہ نادر شاہ کی نیت ہندوستان کیلئے خراب نہ ہونے پائے۔ اسکے بعد ہی برہان الملک کا انتقال ہو گیا۔

نادر شاہ شاہجہاں کا تخت طاؤس اور بہت سے نوادرات لے کر ایران [illegible] ہو گیا اور ہندوستان کی حکومت محمد شاہ کیلئے چھوڑ گیا مگر اب اس میں کوئی دم خم [illegible] رہا تھا۔ نظام الملک سادات بارہہ سے چھٹکارا پا کر پھولا نہ سمایا تھا مگر آج [illegible] قوت

موجود ہوتی تو نادر شاہ مغل لشکر کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ نہ سکتا اور وہ نظام الملک کی طرح دور کے تماشائی بنے نہ رہتے۔

نادر شاہ کے بعد پورے ملک میں ایک انتشار کا دور دورہ تھا۔ گجرات و مالوہ کو مرہٹوں نے تباہ کر دیا تھا۔ بنگال و بہار میں بھی انہوں نے غارت گری شروع کی تھی مگر علی وردی خاں حاکم بنگال نے انہیں مار بھگایا تھا۔ روہیلے اپنے علاقے میں سرکشی کر رہے تھے۔ ایسے میں احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا۔

یہ افغان سردار نادر شاہ کا فوجی افسر تھا۔ دوسرے امراء کی طرح وہ بھی نادر شاہ کے خلاف سازش میں شریک تھا۔ نادر شاہ کے قتل کے بعد وہ اس کا خزانہ لے کر کابل آگیا اور غزنی و قندھار میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ پنجاب فتح کر کے وہ دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ دلی عہد سلطنت احمد شاہ نے اپنی فوج کے ساتھ مقابلہ کیا اور ۱۱۶۱ھ میں ایک سخت معرکے کے بعد ابدالی کو شکست دی۔

محمد شاہ ۱۱۶۱ھ میں تیس سال حکومت کر کے فوت ہو گیا اور احمد شاہ تخت نشین ہوا۔

احمد شاہ ابدالی

علی وردی خاں بہار و بنگال کا نیم خود مختار حکمراں بن چکا تھا۔ اودھ کا صوبہ برہان الملک کو ملا تھا۔ اسکے انتقال کے بعد صفدر جنگ فیض آباد کا فرمانروا تھا لیکن اس کا قیام دلی ہی میں رہتا تھا۔ دکن میں نظام الملک آصف جاہ کے مرنے پر اسکے بیٹوں میں تخت کیلئے خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ مرہٹوں کی شورش اپنی جگہ پر تھی جس میں روہیلہ سرداروں کی لوٹ مار کا اضافہ ہو گیا تھا۔

ان حالات میں احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہوا۔ دلی کی فوج ابدالی کا مقابلہ نہ کر سکتی لہذا صفدر جنگ نے مرہٹوں کی خدمات معاوضے پر حاصل کیں جسکی ادائی نظام الملک کے بیٹے امیر الامراء غازی الدین فیروز جنگ نے کی اور اسکے عوض دکن کے چھ صوبوں کی حکومت حاصل کی مگر احمد شاہ ابدالی سے جنگ کی نوبت نہیں آئی وہ ملتان اور لاہور کے صوبوں کی حکومت مل جانے پر پلٹ گیا۔

نظام الملک اور سعادت خاں برہان الملک میں جو عداوت تھی اس زمانے میں وہ موروثی بن گئی اور غازی الدین اور صفدر جنگ میں باقاعدہ لڑائی کی نوبت آ گئی۔ صفدر جنگ نے جاٹوں کو اپنی مدد کیلئے بلالیا۔ غازی الدین نے مرہٹوں کی مدد حاصل کی مگر جنگ کی نوبت نہیں آئی اور صفدر جنگ دلی سے چلا گیا۔

غازی الدین نے اسکے بعد جاٹوں کو سزا دینے کیلئے ان پر حملہ کیا مگر ناکام ہوا تو اس نے شاہی توپ خانہ طلب کیا اور افسر توپ خانہ خانخاناں وزیر نے انکار کیا تو وہ مرہٹہ سردار ملہار راؤ ہلکر کو بادشاہ پر چڑھا لایا اور مرہٹوں نے تمام شاہی سازوسامان لوٹ لیا۔ اسکے بعد غازی الدین نے علماء سے احمد شاہ کے خلاف فتوی لے کر اسے معزول کر دیا اور قید خانے میں نیل کی سلائیاں پھروا کر اسکو اندھا کر دیا

عالمگیر ثانی

یہ بادشاہ ۱۱۶۷ھ میں تخت نشین ہوا۔ غازی الدین نے وزارت عظمی کا عہدہ سنبھال لیا۔

احمد شاہ ابدالی نے پنجاب میں معین الملک کو اپنا قائمقام بنایا تھا۔ اسکے فوت ہونے پر اس کا داماد خواجہ موسیٰ صوبیدار تھا۔ غازی الدین اس پر چڑھ دوڑا معین الملک کی نا کتخدا بیٹی سے بجبر نکاح کیا اور پنجاب کی صوبیداری تیس لاکھ روپے لے کر ادینہ بیگ کو دیدی۔

احمد شاہ ابدالی یہ خبر سن کر تیسری مرتبہ ہندوستان آیا۔ غازی الدین نے تو اس سے معافی مانگ لی لیکن ابدالی نے ۱۱۷۰ھ میں دلی پر قبضہ کر لیا۔ ہر طرف لوٹ کا بازار گرم ہو گیا اور دلی کی حالت نادر شاہ کے حملے سے بھی بدتر ہو گئی۔

احمد شاہ نے غازی الدین کے بجائے نجیب اللہ کو وزیر اعظم بنا دیا اور خود واپس ہو گیا۔

اسکے بعد مرہٹوں نے دلی پر حملہ کیا۔ غازی الدین ان کے ساتھ تھا جو ان کو دلی کے بعد پنجاب پر چڑھا لے گیا۔ اس خبر پر ابدالی چوتھی بار ہندوستان آیا۔ انکی عالمگیر ثانی نے خط بھیج کر اسکو بلوایا تھا۔ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں سے اس کا

فیصلہ کن معرکہ ہوا جس میں لاکھوں مرہٹے قتل ہوئے۔ ۱۱۷۴ھ میں انکی طاقت کو پامال کر کے ابدالی واپس چلا گیا اور پھر کبھی ہندوستان نہیں آیا۔

اس دوران غازی الدین نے عالمگیر ثانی کو قتل کرا دیا تھا دلی کا تخت خالی تھا کوئی اسپر بیٹھنے والا نہ تھا۔

شاہزادہ علی گوہر ولی عہد سلطنت تھا جو غازی الدین کے ڈر سے بنگال بھاگ گیا تھا۔ وہ جب واپس آیا تو شاہ عالم کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

شاہ عالم

یورپ کی قومیں یوں تو اکبر اعظم کے عہد سے ہندوستان آنا شروع ہو گئی تھیں لیکن جہانگیر کے زمانے سے انکی آمدورفت کچھ بڑھی پھر بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ پہلے پرتگیزی پھر ہالینڈ والے یعنی ڈچ، اسکے بعد انگریز اور فرانسیسی یہ لوگ آپس میں بھی لڑتے رہے اور ہندوستان والوں سے بھی نبردآزمائی کرتے رہے۔ آخر میں فرانسیسی اور انگریز قابل ذکر رہ گئے جو دکن میں برسرپیکار رہے۔ انگریز غالب آئے جو ایک طرف بنگال میں ڈٹ گئے دوسری طرف شمالی ہند میں دخیل ہوئے۔

شاہ عالم کو انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس سے حکومت میں بعض اختیارات حاصل کر لیے۔

مغل بادشاہ اب ہر طاقتور کے ہاتھ کا کھلونا بن گیا تھا۔ انگریزوں کے بعد مرہٹوں کے قبضے میں آیا پھر روہیلے اسکو لے گئے اور غلام قادر روہیلہ نے اسکی آنکھیں نکلوالیں۔

اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے جو انگریزوں کے رحم و کرم پر رہے اور پھر ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر انگریزی عملداری میں شامل ہو گیا۔

دکنی ہندوستان

بہمنی سلطنت

اس سلطنت کا بانی حسن بہمنی تھا جو ایک غیر معروف آدمی تھا۔ اس کا اصل نام حسن تھا اور دلی میں کانگوی بہمن کا ملازم تھا جسکو وہ اپنا محسن سمجھتا تھا لہذا بادشاہ ہونے پر اس نے اپنے نام کے ساتھ بہمن کا نام منسلک کر لیا اور حسن بہمنی مشہور ہوا۔

حسن ایک حوصلہ مند آدمی تھا، سلطان محمد تغلق کی فوج میں شامل ہوا اور امیران سدہ کے ساتھ دکن پہنچا۔ محمد تغلق جب دلی واپس ہو گیا تو چھوٹی مہمات میں طالع آزمائی کرنے لگا۔ کسی درویش نے اسکو حکومت دکن کو بشارت دی تھی جو آہستہ آہستہ پوری ہو گئی اور ایک دن وہ گلبرگہ کا فرمانروا ہو گیا جس کا نام اس نے حسن آباد گلبرگہ رکھا۔

حسن حنفی المسلک تھا مگر اسکی اہلبیت دشمنی کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

گیارہ سال دو ماہ تک حکومت کرنے کے بعد ۷۵۹ھ میں وفات پا گیا اور اس کا بیٹا سلطان محمد شاہ تخت نشین ہوا۔

سلطان محمد شاہ

یہ بادشاہ باپ کے مقابلے میں زیادہ مذہبی اور سادات پرور تھا۔ اس نے اپنے ملک کو وسعت دی اور ترویج اسلام میں بڑی کدو کاوش کی۔ اسکی ماں ملکہ جہاں دنیا سے زائد دین کی طرف راغب تھی۔ وہ شوہر کی وفات کے ایک سال بعد مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہوئی۔ اسکی شان وشوکت اور داد و دہش کی مورخین نے بڑی مدح کی ہے۔

"مدینہ منورہ کے قیام میں اس نے چار ہزار سادات لڑکیوں اور لڑکوں کی شادیاں اپنے مصارف سے کرائیں۔ چاریار اور اولاد رسولؐ کے نام پر بڑی خیرات کی بقیع پہنچ کر قبر جناب فاطمہ زہرا کی زیارت اکثر کیا کرتی۔ ایک دن اس نے کسی سے دریافت کیا کہ حضرت سید الشہداء امام حسینؑ کی قبر کہاں ہے؟ اسکو بتایا گیا کہ کربلائے معلی میں۔ اس نے کہا کہ بی بی کی قبر یہاں اور اسکے بیٹے کی قبر کربلا میں؟ اس غریب کو کچھ معلوم نہ تھا۔ جب اسکو یزیدی ظلم وستم کی داستان سنائی گئی تو وہ روتے روتے نڈھال ہو گئی اور فوراً کربلا کی طرف چل پڑی۔

ایک رات اس کو خواب میں سیدہ کونین نظر آئیں۔ انہوں نے اسکو اپنے خوشنود ہونے کی بشارت دی۔ ملکہ جہاں خواب سے بیدار ہوئی تو محسوس ہوتا تھا کہ حسن آباد گلبرگہ کے بجائے سارے عالم کی حکومت مل گئی۔ اسی خواب میں سیدہ عالمیان نے یہ بھی کہا کہ تیرا بیٹا بے چینی سے تیرا منتظر ہے۔ ملکہ جہاں بی بی کے حکم پر جدہ کی سمت روانہ ہوئی اور ایک با اعتبار آدمی کو دولت کثیر کے ساتھ روانہ کیا کہ روضہ امیرالمومنین علی ابن ابی طالب اور دوسرے تمام مزارات پر نذر چڑھائے اور باقی رقوم سادات میں تقسیم کر دے۔" (۴۲)

سعادتمند بیٹے نے بڑی دھوم دھام سے ماں کا استقبال کیا۔ ماں نے تبرکات بیٹے کو دئے اور اہل بیت کی عقیدت میں دن گزارتی رہی۔ ۷۶۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ملکہ جہاں بڑی محب اہل بیت تھی مگر پتہ نہیں چلتا کہ وہ شیعہ ہوئی یا نہیں۔ اسکے اثر سے کتنے لوگوں نے حلقہ بگوش آل رسولؐ ہونے کا شرف حاصل کیا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ بہمنی سلطنت میں شیعوں کے ساتھ کوئی عصبیت برتی نہیں گئی۔

سلاطین بہمنی بلا کے تیغ زن دانشمند اور باہمت فرمانروا تھے اور یہ صفت سلطان محمد شاہ میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ اسکی عمر کا بڑا حصہ جنگ وجدل میں گزرا، ہندو حکمرانوں سے بڑے معرکے ہوئے۔ ان سب میں محمد شاہ سرخ رو رہا۔ ۷۷۶ھ میں فوت ہوا اور اس کا بیٹا مجاہد شاہ تخت پر بیٹھا۔

سلطان مجاہد شاہ

اپنے نام کی مناسبت سے شجاع تھا اور تیراندازی میں اسکو کمال حاصل تھا۔ شیر اس کا ایک تیر کھا کر گر جاتا تھا۔ بیجاپور کے محاذ پر اس نے شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ تن تنہا فوجوں کے پرے الٹ دئے۔ وہ اتنا بہادر تھا کہ غنیم کے دل توڑ کر خود ان میں دراتا تھا مگر زبان کا تیز تھا اور کسی کو خاطر میں نہ لاتا اس لئے خود اسکے امراء میں بعض اسکے دشمن تھے۔ انہیں میں سے داؤد خان نے سوتے میں اس کا کام تمام کر دیا جو سلطان مجاہد شاہ کا چچا ہوتا تھا۔

داؤد شاہ

ابن حسن بہمنی ۷۷۹ھ میں تخت نشین ہوا سلطان مجاہد شاہ کی بہن روح پرور آغا اسکو قاتل گردانتی تھی، اس نے ایک وفادار کے ذریعہ مسجد میں اسکو قتل کرا دیا

سلطان محمود شاہ

۷۸۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ وہ بہت علم دوست اور ادیب نواز تھا۔ اسکے عہد میں عراق و عجم اور ہندوستان کے کتنے ہی علماء اور شاعر دکن پہنچے۔ اس نے ہمیشہ بزم کو رزم پر ترجیح دی اور امور خیر میں لگا رہا۔ ۲۲ رجب ۷۹۹ھ کو اس نے وفات پائی اسکی سلطنت وسیع اور مدت سلطنت تقریباً ۱۸ سال تھی۔ سلطنت بہمنی نے اس زمانے میں بڑی شہرت حاصل کی۔

سلطان غیاث الدین بہمنی

سلطان محمود شاہ کا بیٹا تھا اور بہت بدکردار آدمی تھا۔ وہ اپنے ایک امیر تغلچیں کی بیٹی پر عاشق تھا۔ تغلچین نے دعوت کے بہانے اسکو اپنے گھر بلا کر قتل کر دیا

سلطان شمس الدین

ابن سلطان محمود شاہ پندرہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور امور سلطنت اپنے ترکی غلام تغلچین کے حوالے کر دئے جو بہت بدچلن اور ظالم تھا۔ تنگ آکر امراء نے بھرے دربار میں اس پر حملہ کیا۔ شمس الدین نے تہہ خانے میں جا کر پناہ لی پھر وہ مکہ معظمہ چلا گیا۔ تغلچین گرفتار ہو کر قتل کیا گیا۔

سلطان فیروز شاہ

پسر داؤد خاں اسکے بعد تخت پر بیٹھا۔ اس نے سلطنت بہمنیہ کے وقار کو بلند کر دیا۔ ایک دن اس نے علماء و فضلا کو بلا کر استفسار کیا کہ مرد چار عورتوں سے زائد عقد کرنا چاہے تو کیا کرے؟ بعض علماء نے رائے دی کہ اگر چار عورتیں ہیں تو ایک کو طلاق طلاق طلاق کہہ کر کسی اور کو بصد شوق عقد میں لے آئے؛ بعض نے دوسری تدابیر بتائیں مگر کسی کی بات سلطان کی سمجھ میں نہ آئی۔ آخر اس نے میر فضل اللہ سے پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے عہد سے خلافت اول تک متعہ رائج تھا۔ خلیفہ دوم نے اسکو بند کرایا۔ مذہب امامیہ کے لوگوں میں ابتک مباح ہے۔ اگر سلطان اسکو سامنے رکھ کر متعہ کرے تو کر سکتا ہے لیکن علمائے اہل سنت کے نزدیک جائز نہیں حالانکہ مسلم، بخاری اور مشکواۃ سے ثابت ہے کہ دور رسالت میں متعہ ہوتا تھا۔ فیروز شاہ نے طریقہ امامیہ پر عمل کیا اور آٹھ سو عورتوں کو اپنے متعہ میں لایا۔

حاجی محمد قندھاری کی روایت کے مطابق یہ بادشاہ بہت متشرع تھا۔ ربع پارہ کلام پاک روز لکھتا تھا، عبادت سے جو وقت بچتا اسکو رعایا کا حال سننے میں گزارتا تھا"۔ (۷۵)

یہ ہے صحیح تصویر کشی سلاطین بہمنی کے عقیدے کی۔ بظاہر وہ سنی تھے لیکن حد درجہ محب اہل بیت، جہاں چاہتے وہاں شیعہ بنجاتے ان کے متعلقین اور اہل دربار میں شیعہ بھی تھے اور سنی بھی۔ ان کے مابین کوئی تفریق نہ تھی۔

سلطان فیروز شاہ بڑا جری اور باہمت تھا۔ پوری زندگی چوبیس بار اس نے کافروں سے جنگ کی اور فتحیاب ہوا۔ اس کا دربار علماء و فضلا سے بھرا رہتا اور کسی طرح دیار غزنی سے کم نہ تھا۔ ہندو زرگر کی بیٹی پرتھال اسی کے عہد میں گزری ہے جو اپنی خوشی سے مسلمان ہوئی اور سلطان فیروز شاہ کی بیوی بنائی گئی۔ دکن میں پہلے پہل ایک ہندو راجہ کی بیٹی فیروز شاہ کے عقد میں آئی۔ اس میں بھی سراپا جمال پرتھال کی مساعی کو دخل تھا۔

سلطان نے اپنے بیٹے حسن کو ولی عہد بنایا تھا لیکن اس کا بھائی خانخاناں احمد

خاں بھی اسکے بعد بادشاہت کا امیدوار تھا۔ اس نے منت مانی کہ اگر تخت اسکو مل
گیا تو خانپور کا نام رسول آباد رکھے گا اور اسے سادات مکہ معظمہ و مدینہ منورہ اور نجف
اشرف و کربلا معلی کیلئے وقف کردے گا پھر احمد خان کا شاہی لشکر سے مقابلہ ہوا اور
اسکو فتح و ظفر حاصل ہوئی۔ ۸۲۵ھ میں سلطان فیروز شاہ داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔

سلطان احمد شاہ

سید محمد گیسو دراز کے حلقہ ارادت میں شامل تھا۔ وہ ایک دیندار اور خجستہ
اطوار فرمانروا تھا۔ علماء و مشائخ کی بڑی عزت کرتا تھا۔ شاہ نعمت اللہ ولی اسی کے دور
میں گزرے ہیں۔ انہوں نے بھی کرمان سے احمد شاہ کو دعائیں کہلوائی تھیں اور
خرقہ مرحمت کیا تھا اور احمد شاہ کی درخواست پر اپنے بیٹے نور اللہ کو دکن بھیجا تھا۔
احمد شاہ نے اسکے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کرنے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ ۸۳۴ھ میں
جب شاہ نعمت اللہ ولی جان بحق ہوئے تو ان کے بیٹے خلیل اللہ بھی دکن آئے تھے۔

سلطان احمد شاہ بڑا شجاع اور اقبال مند حکمراں تھا۔ اس نے بڑی بڑی
فتوحات کیں اور دائرہ سلطنت بہت وسیع کرلیا۔ ۸۳۸ھ میں اسکی وفات ہوئی۔

سلطان علاء الدین

احمد شاہ کا بیٹا تھا، شجاعت و تدبر میں اسلاف سے کم نہ تھا۔ اسکے خسر نصیر خاں
فاروقی نے احمد شاہ گجراتی کی مدد سے صوبہ برار پر قبضہ کی کوشش کی۔ ۸۴۷ھ
میں دیو رائے بیجاپور نے سلطنت بہمنیہ پر حملہ کیا اور کئی لڑائیوں کے بعد شکست
کھائی۔ اسکے بعد سلطان نے قلاع سواحل دریا کو فتح کرنے کا عزم کیا۔ خلف حسن
بصری اس کا نامور سردار تھا۔ اس نے سرکہ نامی ایک کافر کے علاقے کو فتح کیا۔ وہ مکر
کرکے مطیع ہوگیا پھر وہ اسکو قلعہ گندھانہ کی طرف لے گیا جس کا راجہ رائے سنگیسر
تھا۔ وہاں جانے کا ایک تنگ راستہ تھا۔ بعض دکنی امراء اور حبشی خلف حسن بصری
سے جلتے تھے۔ وہ بہانہ کرکے الگ ہوگئے اور خلف حسن بصری بہادرانہ آگے بڑھتا
چلا گیا۔

"سرکہ" اسکو پہاڑی دروں میں لے جاکر غائب ہوگیا۔ خلف حسن بصری
بیمار بھی تھا۔ ایک جگہ اقامت پذیر ہوا۔ ہوا بہت تیز تھی ایک طرف کی آواز دوسری

طرف نہ جاتی تھی۔ ایسے میں رائے سنگیسر ایک جمعیت کثیر کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑا
سرکہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ ان سب نے پانچ سو بنی حسن کو جن میں مدنی نجفی اور
کربلائی سید بھی شامل تھے، مع خلف حسن بصری کے قتل کرڈالا۔

باقی بچ بچاکر دکنیوں کے پاس پہنچے جنکی سازش سے یہ قتل عام ہوا تھا
دکنیوں نے چاہا کہ وہ منتشر ہوجائیں مگر وہ جاکنہ آگئے جو خلف حسن بصری کا مستقر
تھا۔ اسپر ان دکنیوں نے بادشاہ کو لکھا کہ یہ لوگ سرکہ اور رائے سنگیسر سے مل
کر بغاوت پر آمادہ ہیں۔

مشیر الملک اور عماد الملک غوری دکنیوں کی سازش میں شریک تھے۔ انہوں
نے خط پیش کرکے سلطان علاء الدین کو خوب بھرا اور اس نے انکی تادیب کا حکم
دیدیا۔ ابو القاسم فرشتہ کے الفاظ میں یہ لوگ عبید اللہ بن زیاد اور شمر ذی الجوشن کی
طرح آل رسولؐ سے عداوت رکھتے تھے۔ انہوں نے ان غریبوں کو اس طرح گھیرا کہ
ان کا کوئی عریضہ بھی سلطان تک نہ پہنچنے دیا پھر اماں دینے کی قسمیں کھاکر قلعہ میں
داخل ہوگئے اور سب کو کھانے پر بلاکر دغا کی۔ ایک ہزار سید، ایک ہزار مغل اور
پانچ چھ ہزار معصوم بچے شہید ہوئے۔ مقتولین میں ایک سال کے بچے سے سو برس
کے بوڑھے تک شامل تھے پھر ان سب کے گھر بار تک لوٹ لیے گئے اور عورتوں اور
لڑکیوں کی بے حرمتی کی گئی۔

یہ تھا دکن میں سیرت بنی امیہ کا اختتامیہ جس سے بہمنیوں کے روایتی اتحاد
بین المسلمین پر ضرب کاری لگی۔

قاسم بیگ صف شکن قراخان گرد اور احمد بیگ یکہ تاز اپنے ساتھیوں
سمیت سادات سے دور تھے، وہ بچ گئے اور انہیں جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو
انہوں نے عورتوں کو مردانہ پوشاک پہنائی اور ایک فوج کی صورت میں احمد آباد
بیدر کی طرف بڑھے اور مشیر الملک نے دو ہزار ان کے مقابلے پر بھیجے۔ داؤد خاں ان
کا سردار تھا جو میدان جنگ میں تیر سے مارا گیا اور لشکر تتر بتر ہوگیا۔

پھر قاسم بیگ صف شکن نے تمام ماجرا سلطان کی خدمت میں حاضر ہوکر
بیان کیا۔ سلطان کو بہت صدمہ ہوا۔ سادات کے جانوں کی تلافی تو وہ نہ کرسکتا

لیکن مالی نقصانات پورے کئے ،مشیرالملک اور عمادالملک کو گرفتار کرکے عبرتناک سزائیں دیں اوران کے عیال کو نان شبینہ کا محتاج کردیا۔قاسم بیگ وغیرہ کو عہدہ ہائے جلیلہ دئے گئے۔اسی زمانے میں سلطان نے شرابنوشی سے توبہ کی۔

۸۶۲ھ میں یہ منصف وعادل بادشاہ تیئس سال دس ماہ حکومت کرکے فوت ہوگیا۔

ہمایوں شاہ بہمنی

باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔سکندرخاں نے اس سے جنگ کی اور مارا گیا۔ پھر سلطنت بہمنیہ میں خانہ جنگی کی سی کیفیت شروع ہوگئی اور ہمایوں شاہ کے ہاتھوں اتنے مظالم ہوئے کہ وہ ظالم مشہور ہوگیا۔آخر ایک حبشی کنیز نے سوتے میں اسے قتل کردیا۔

نظام شاہ

ابن ہمایوں شاہ ۸۶۵ھ میں تخت نشین ہوا۔اسکی عمر ۸ سال تھی، ماں کی اتالیقی میں بادشاہ بنا۔رائے اڑلیسہ نے اسکو کسن دیکھ کر حملہ کیا مگر شکست کھائی پھر سلطان محمود خلجی سے معرکہ ہوا اس میں محمود غالب آیا مملکت بہمنی پر زوال آیا مگر بعض بہمنی سرداروں نے لشکر جمع کیا اور محمود کو شکست دی ادھر سے مطمئن ہوکر نظام شاہ نے رائے سنگیسر اور دوسرے راجاؤں کو سزائیں دیں۔۸۶۷ھ میں ایک رات اچانک اس کا انتقال ہوگیا۔

سلطان محمد شاہ

نظام شاہ کا چھوٹا بھائی نو برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔بہمنی امراء ایک دوسرے کے دشمن تھے۔وہ آپس میں لڑپڑے۔محمود خلجی نے بھی دکن پر حملہ کیا۔ محمد شاہ نے اسکو پسپا کیا پھر کئی ہندو راجاؤں سے معرکے ہوئے ان میں بھی وہ کامیاب رہا۔ان معرکوں میں نظام الملک حسن بحری نے بھی کارہائے نمایاں انجام دئے۔فتح اللہ عمادالملک لشکر برار کا افسر مقرر ہوا اور یوسف عادل خاں دولت آباد کا حاکم بنایا گیا۔۸۷۷ھ میں رائے نگوان سے جنگ ہوئی اور اس کا ملک سلطنت بہمنیہ میں شامل کرلیا گیا۔۸۸۲ھ میں اس نے اوڑیسہ فتح کیا۔اسکے حدود سلطنت میں کافی اضافہ ہوا۔۸۸۷ھ میں بڑی شان وشوکت سے بیس سال حکومت کرکے اس کا انتقال ہوگیا۔

سلطان محمود شاہ

بارہ برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا اسکے عہد میں امراء کی باہم دشمنی بڑھ گئی۔ مختلف صوبوں کے حاکموں میں خودمختاری کا رجحان پیدا ہوگیا۔یوسف عادل خان اور ملک احمد نظام الملک نے اپنے اپنے لشکروں میں اضافہ کرلیا پھر بھی سلطان محمود شاہ کے مقابلے پر آنے کی کسی نے ہمت نہیں کی اور تعلقات برقرار رکھے۔

سلطان محمود ایک باصلاحیت حکمراں تھا۔اس نے مختلف جنگوں میں فتوحات حاصل کیں لیکن صوبائی طاقتوں پر وہ قابو نہ پاسکا۔۹۲۴ھ میں سینتیس سال حکومت کرکے اس کا انتقال ہوگیا۔

احمد شاہ

باپ کی جگہ قلعہ احمدآباد بیدر میں بادشاہ ہوا لیکن امیر برید نے اسکو قلعہ میں محدود رکھا اور قطب الملک ہمدانی نے باغیانہ انداز اختیار کرلیا۔احمد شاہ نے اسمٰعیل عادل خاں سے شکایت کی مگر قبل اسکے کہ وہ کوئی مدد کرے احمد شاہ ۹۲۷ھ میں وفات پاگیا۔

علاء الدین شاہ

تخت نشین ہوتے ہی امیر برید سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیر کرنے لگا اور اسکے قتل کا منصوبہ بنایا مگر امیر برید کو عین وقت پر خبر ہوگئی اور اس نے علاء الدین کو گرفتار کرکے نظربند کردیا پھر اسکو ہلاک کرادیا۔

ولی اللہ شاہ

اسکو امیر برید نے برائے نام بادشاہ بنایا۔تین برس تک وہ حرم سرا میں قید رہا پھر قتل کرادیا گیا۔

کلیم اللہ شاہ

اپنے بھائی کے بعد تخت پر بٹھایا گیا وہ بھاگ کر پہلے بیجاپور گیا وہاں اسمٰعیل عادل شاہ کے ہاتھوں گرفتار ہوجانے کا خطرہ ہوا تو احمد نگر آگیا۔برہان نظام شاہ بحری نے عزت کے ساتھ ٹھہرایا۔وہاں اس کا انتقال ہوگیا اور اسکے ساتھ ہی سلطنت بہمنیہ کا چراغ گل ہوگیا اور اسکی جگہ دکن میں پانچ حکومتیں قائم ہوگئیں۔

عادل شاہیہ، نظام شاہیہ، عماد شاہیہ برید شاہیہ اور قطب شاہیہ۔

سلطنت عادل شاہیہ

یوسف شاہ آل عثمان کا شاہزادہ اور سلطان محمد کا چھوٹا بھائی تھا جب سلطان محمد اسکے قتل کا درپے ہوا تو ماں نے اسکے ہم شکل ایک غلام کو شاہزادہ بنا کر قتل کرادیا اور یوسف ایک تاجر عمادالدین محمود گرجستانی کے ساتھ ایران آگیا۔ تاجر شیعہ عقیدے کا تھا۔ اردبیل میں شاہ صفی کے مزار پر خمس کی رقوم دے کر وہ ہندوستان آیا پھر احمد آباد بیدر پہنچا۔

یوسف صورت میں واقعی یوسف جمال تھا۔ وہ نظام بہمنی کے ہاتھوں فروخت ہوا اور سلطان محمد شاہ کے عہد میں اس کا شمار امراء میں ہونے لگا۔ چونکہ وہ خود ترک تھا لہذا نظام الملک ترک سے اسکے تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ اسی کی سفارش سے یوسف کو عادل خاں خطاب ملا اور وہ اسکے ساتھ برار چلا گیا۔

نظام الملک نے جب قلعہ کھرکہ کا محاصرہ کیا اور سال بھر بعد اسکو فتح کر کے اندر داخل ہوا تو ایک راجپوت نے عقب سے وار کر کے اسکو قتل کر دیا۔ یوسف عادل خاں نے اس موقع پر بڑی شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ تھوڑے سے ہاتھیوں کو لے کر اتنے شدید حملے کیے کہ راجپوت بدحواس ہو کر بھاگنے لگے۔ یوسف عادل نے ایک بڑی تعداد کو گرفتار کر لیا اور تسلط حاصل کر کے مال غنیمت اور ہاتھی بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیے جس پر اسکے درجات بلند ہوئے اور حاکم بیجاپور کی حیثیت سے وہ امرائے عظیم میں گنا جانے لگا۔

سلطان محمود شاہ کے انتقال کے بعد ۸۹۶ھ میں اس نے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا اور جن قلعوں پر بہمنی امراء قابض تھے انکو بزور شمشیر واپس لیا۔ احمد آباد بیدر کے بہت سے امراء اسکی پناہ میں آگئے اور اس کا دائرہ سلطنت وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔

امیر قاسم برید اس سے بہت جلتا تھا۔ اسکی شان و شوکت پر حسد میں جل بھن کر کباب ہو گیا۔ اس نے رائے ہیم راج اور بہادر شاہ گیلانی کو اسکے خلاف ابھارا اور ہیم راج نے رائچور اور مدگل پر قبضہ کر لیا اور بہادر گیلانی قلعہ جام کھنڈی پر

متصرف ہو گیا۔ یوسف عادل نے مصلحت وقت سمجھ کر ہیم راج سے صلح کر لی اور بہادر گیلانی کو نظرانداز کر کے قاسم برید پر حملہ آور ہو گیا۔

قاسم برید ملک احمد نظام الملک بحری اور خواجہ جہاں سے مدد لے کر قلعہ بیدر سے نکلا۔ سلطان محمود شاہ بھی ساتھ تھا۔ نظام الملک بحری سے مقابلہ ہوا پھر صلح ہو گئی۔ یوسف عادل شاہ نے واپس ہو کر بہادر گیلانی سے بھی تعلقات استوار کر لیے اور دونوں طرف سے مطمئن ہو کر رائچور کا عازم ہوا اس عرصے میں اطلاع ملی کہ ہیمراج خود دریا عبور کر کے اس طرف کو بڑھ رہا ہے۔ یوسف عادل شاہ ائمہ معصومین کے نام لے کر آگے بڑھا۔

آٹھ ہزار سوار دواسپہ اور سہ اسپہ دو سو ہاتھی اسکے ساتھ تھے۔ بارہ روز تک فوجیں ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں۔ رجب ۸۹۸ھ میں صفیں آراستہ ہوئیں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو پانسو بہادر یوسف عادل شاہ کے شہید ہو گئے آخر یوسف عادل شاہ اپنے بھائی غضنفر آغا کو لے کر حملہ آور ہوا۔ ہیمراج کا لشکر اپنی فتح کو یقینی سمجھ کر لوٹ مار میں لگ گیا تھا۔ یوسف عادل شاہ کے سواروں نے اتنی زبردست یلغار کی کہ اس کے پرے الٹ گئے اور قلب فوج تہہ و بالا ہو گیا۔ غضب کا رن پڑا۔ ہمیراج کے لشکر میں بھگدڑ پڑ گئی، خود ہمیراج نے بھی میدان چھوڑ کر بیجانگر کا رخ کیا۔ اچانک ایک تیر آ کر لگا اور وہ راستے ہی میں فی النار ہو گیا۔

یوسف عادل شاہ نے رائچور اور مدگل کو مسخر کر کے بعض معتمدوں کے سپرد کیا اور خود بیجانگر کی طرف قدم زن ہوا اور اس پر اپنا پرچم لہرا کر بعض تحائف سلطان محمود شاہ کی خدمت میں بھی روانہ کیے پھر وہ اپنے مرکز بیجاپور کی طرف واپس ہو گیا اور تیمراج بیجانگر کا حکمراں بن گیا۔

اس اثناء میں بہادر گیلانی نے حجاج کے بعض جہاز لوٹ لیے اور سلطان محمود شاہ اس سے ناراض ہو گیا۔ اس نے یوسف عادل شاہ سے مدد طلب کی۔ شاہ یوسف بہادر گیلانی کا دشمن تھا ہی، اس نے فوراً پانچ ہزار سواروں کی کمک بھیج دی۔ بہادر گیلانی تنگواں کی طرف فرار ہو گیا۔ سلطان محمود شاہ نے قلعہ کھنڈی یوسف عادل شاہ کے سپہ سالار کے حوالے کر دیا۔ بہادر گیلانی ایک مقام

سے دوسرے مقام کی طرف بھاگتا رہا۔آخر شاہ نے اسکو جالیا اور وہ ایک معمولی جنگ کے بعد مارا گیا۔

اسکے بعد سلطان محمود شاہ یوسف عادل شاہ کی درخواست پر بیجاپور گیا جہاں اس کا بڑی گرم جوشی سے استقبال ہوا اور بیش قیمت نذرانے پیش ہوئے پھر سلطان محمود شاہ بیدر روانہ ہو گیا۔

۹۸۱ھ میں "دستور دینار" کو حسن اباد گلبرگہ کی خود مختار حکومت کی ہوس ہوئی۔نظام الملک بحری نے اس سے پشت پناہی کا وعدہ کرلیا اور اس نے سکہ و خطبہ اپنے نام کا جاری کر دیا۔اسپر سلطان محمود شاہ نے پھر یوسف عادل شاہ سے مدد مانگی یوسف عادل شاہ نے غضنفر آغا کو روانہ کر دیا۔

اسی دوران خبر ملی کہ ملک احمد نظام الملک بحری نے خواجہ جہاں دکنی کو مقدمہ لشکر کے طور پر بھیجا ہے اور عقب میں خود بھی آرہا ہے۔یہ سنتے ہی یوسف عادل شاہ خود بھی روانہ ہوا اور غضنفر اغا سے جاکر مل گیا۔

قاسم برید ترک کا مقابلہ "دستور دینار" سے ہوا اور "دستور دینار" شکست کھاکر گرفتار ہوا۔قاسم برید اسکو قتل کر دینا چاہتا تھا مگر یوسف عادل شاہ کی سفارش سے وہ چھوڑ دیا گیا اور گلبرگہ بھی اسکے لئے بحال کر دیا گیا۔

یوسف عادل شاہ اور نظام الملک بحری بھی اپنے اپنے لشکروں کو لے کر واپس ہو گئے۔

۹۰۲ھ میں شاہ محمود بہمنی نے اپنے بیٹے احمد کا رشتہ بی بی ستی دختر یوسف سے مانگا اور گلبرگہ کے پرگنے اسکو عطا کر دئے۔اسپر "دستور دینار" قاسم برید کی پناہ میں چلا گیا۔یوسف عادل شاہ نے قطب الملک ہمدانی کو ساتھ لیکر پیش قدمی کی مگر بحری "دستور دینار" کی مدد کو پہنچ گیا تھا اس لئے مصلحتاً ارادہ ملتوی کر دیا اور ملک احمد نظام الملک بحری سے صلح کرکے توسیع مملکت میں لگ گیا۔

دستور دینار نے ان حالات میں امیر برید کو لکھا کہ "سنت سنیہ پدر" پر عمل کرکے میری معاونت فرمائیے۔"امیر برید" نے تین ہزار سوار اسکی مدد کیلئے بھیج دیئے۔

خواجہ جہاں دکنی بھی استقرار مملکت کا خواہان تھا۔وہ بھی اپنی فوجیں لے کر دستور دینار سے جاملا۔

یوسف عادل شاہ نے بھی اپنے بھائی غضنفر آغا کو مقدمہ لشکر بناکر روانہ کیا غضنفر آغا سے دستور دینار کے ہراول کا مقابلہ ہوا اور اس نے شکست کھائی پھر خود دستور دینار سے غضنفر آغا کا تصادم ہوا۔بڑی ہولناک جنگ ہوئی۔دستور دینار مارا گیا مگر غضنفر آغا کی پیشانی پر بھی ایک تیر لگا تھا۔وہ فتح و ظفر کے پرچم اڑاتا ہوا یوسف عادل شاہ تک تو پہنچ گیا مگر سامنے پہنچتے ہی اس نے دم توڑ دیا۔

اس عظیم فتح کے بعد یوسف عادل شاہ نے خطبہ دوازدہ امام جاری کیا جو سرزمین ہند پر ائمہ برحق کا پہلا خطبہ تھا۔اسکے ساتھ ہی یوسف عادل شاہ نے تشیع کو رواج دینے پر توجہ کی مگر سنیوں کو علی الاعلان اپنے مسلک پر برقرار رہنے کا مجاز کیا

اسپر ملک احمد نظام الملک بحری اور امیر برید وغیرہ بہت برہم ہوئے اور ان سب کا متحدہ لشکر سلطان محمود بہمنی کی سرکردگی میں یوسف عادل شاہ کے ملک میں داخل ہو گیا۔یوسف شاہ نے اہل و عیال کو بیجاپور میں محفوظ کیا۔دریا خاں اور فخر الملک ترک کو گلبرگہ کی طرف روانہ کیا اور خود بحری مملکت کو تاراج کرنا شروع کر دیا۔نظام الملک نے اس کا تعاقب کیا مگر یوسف عادل شاہ غارت گری کرتا ہوا بڑھتا رہا پھر ولایت برار میں داخل ہو گیا۔

اس موقع پر فتح اللہ عماد الملک نے مشورہ دیا کہ خطبہ ائمہ اثنا عشر موقوف کرادیں تاکہ مذہب کے نام کی متحدہ جنگ بند ہو جائے۔یوسف عادل شاہ نے ایسا ہی کیا پھر عماد الملک نے نظام الملک بحری کو لکھا کہ امیر برید مذہب کے نام پر بیجاپور پر قبضہ کرنا چاہتا ہے جبکہ یوسف عادل شاہ نے رفض سے توبہ کر لی ہے۔نظام الملک اور قطب الملک اس مشورے پر رات ہی رات وہاں سے کوچ کر گئے۔امیر برید نے ان کے چلے جانے پر فتح اللہ عماالملک سے مدد مانگی۔اس نے امیر برید کو لیت و لعل میں رکھ کر یوسف عادل شاہ کو حالات سے مطلع کر دیا۔یوسف عادل شاہ فوراً اپنا لشکر لے کر عماد الملک سے آملا اور دونوں احمد آباد بیدر کی طرف بڑھنے لگے۔

شاہی لشکر مقابلے کی تاب کیا لاتا۔یوسف عادل شاہ نے اسکو پراگندہ کر دیا

اور بیجاپور واپس ہو گیا۔جہاں پہلے کی طرح پھر آئمہ برحق کا خطبہ جاری ہو گیا۔

۹۱۵ھ میں نصارائے بندر کو وہ قلعہ "ماتفق" پر حملہ آور ہوئے اور بے شمار مسلمانوں کو قتل کر ڈالا۔یوسف عادل شاہ خبر پاکر خود روانہ ہوا اور قلعہ کو وہ پر حملہ کر کے ان گنت عیسائی قتل کر دئے۔بمشکل تھوڑے سے لوگ کشتیوں پر بھاگ سکے۔

۹۱۶ھ میں بائیس سال دوماہ حکومت کر کے اس عظیم بادشاہ کا انتقال ہو گیا حسب وصیت اسکو مزار شیخ چندا کے پہلو میں دفن کیا گیا۔شیخ چندا کی اولاد دکن میں بکثرت ہے جن میں شیعہ بھی ہیں اور سنی بھی۔معلوم ہوتا ہے کہ شیخ چندا خود عقیدۃً شیعہ تھے لیکن ان کے حلقہ ارادت میں شیعہ و سنی دونوں شامل تھے۔وہی سلسلہ ابتک چلا آرہا ہے۔

یوسف عادل شاہ سلطنت عادل شاہیہ کا بانی اور معمار تھا مرد سخی و شجیع بلند اقبال، عادل و حکیم ماہر خط نستعلیق و علم موسیقی و عروض قدردان علم و فن بلند پایہ شاعر باکمال طنبورہ نواز، بیجاپور کو اس نے ماہرین علم و فن سے آباد کر دیا تھا۔

اسمعیل عادل شاہ

یہ بادشاہ ابھی پوری طرح بالغ نہ ہوا تھا کہ اسکو عنان سلطنت سنبھالنا پڑی دریا خاں، فخر الملک مرزا جہانگیر، حیدر بیگ اور کمال خاں امرائے کبار میں تھے، جن میں بزرگ تر ہونے کے باعث کمال خاں کی بڑی منزلت تھی۔اس نے کچھ دنوں بعد خطبہ آئمہ بند کرا کے خلفائے راشدین کا خطبہ رائج کرادیا اور شیعوں کے طور طریقے پر پابندی لگادی۔

امور سلطنت میں بھی مطلق العنانی کو دخل دیا۔ایک سال بعد فخر الملک اور دریا خان نے وفات پائی تو انکی جاگیریں اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیں، مرزا حیدر بیگ اور جہانگیر مرزا کی جائدادوں سے بھی بعض پرگنے نکال کر اپنے اعزاء و اقرباء کو دے دیئے۔اس طرح اپنی قوت میں اضافہ کر کے شاہی کا خواب دیکھنے لگا اور اسکے لئے امیر قاسم برید سے استعانت کا طلب گار ہوا دونوں کے مابین ایک منصوبہ بنا اور قاسم برید نے سلطان محمود شاہ کو محبوس کیا اور قلعہ گلبرگہ کی طرف چل پڑا۔کمال

خاں نے اسمٰعیل شاہ کو مع اسکی والدہ کے قلعہ ارک بیجاپور میں قید کر کے شولاپور کی طرف روانہ ہوا اور بہت سے قصبات پر قبضہ کر کے حکام عادل شاہی کو نکال دیا اور بیجاپور واپس آکر اسمٰعیل عادل کو شاہ قید خانے سے بلا کر رعایا کو دکھایا اور اسکے ساتھ مغل امراء کو معزول کر دیا۔

صفر ۹۲۹ھ میں وہ اپنی بادشاہت کا اعلان کرنیوالا تھا کہ بعض نجومیوں نے حکم لگایا کہ پندرہ دن اسپر سخت ہیں لہٰذا وہ قلعہ ارک کو محفوظ جان کر اس میں مقیم ہو گیا۔اس دوران اسمٰعیل کی ماں پونجی خاتون نے یوسف ترک کو کمال دکنی کے قتل پر مامور کیا اور اسکو ایک ضعیف خاتون کے ساتھ کمال خاں کی عیادت کو بھیج دیا جو درد سر کا بہانہ کر کے قلعہ ارک میں ٹھہرا ہوا تھا۔ضعیفہ نے کمال خاں کی عیادت کی اور حج پر جانے کی اجازت لی پھر یوسف ترک کو ساتھ لے جانے کی درخواست بھی کی۔اس نے یوسف ترک کو قریب بلاکر بیڑا پان کا اپنے ہاتھوں سے اسکو دیا۔یوسف نے موقع پاتے ہی خنجر اسکے سینے میں گھونپ دیا جو پیٹھ کے اس پار اتر گیا۔نتیجے میں ضعیفہ اور یوسف ترک کو اسی وقت مار دیا گیا۔

کمال خاں مرچکا تھا لیکن اسکے لوگوں نے لے جاکر اسکو تخت پر سہارا لگا کر بٹھا دیا اور اسمٰعیل عادل شاہ کو قتل کرنے کیلئے آدمی روانہ کر دئے پونجی خاتون نے اسکی بھنک پاتے ہی پہریداروں کو للکارا کہ تمہارے ہوتے ہوئے اسمٰعیل قتل کر دیا جائے! کیا ہو گیا ہے تمہاری حمیت کو! چنانچہ دوسو پچاس سپاہی اور سترہ حبشی سینہ سپر ہو گئے۔پونجی خاتون اور دلشاد آغا نے بھی مردانہ لباس پہنا اور تیر و کمان ہاتھ میں لے کر شاہزادے کے ساتھ محل کی پشت بام پر پہنچیں۔اس وقفے میں صفدر خاں اپنی جمعیت لے کر پہنچا تو اسپر تیروں کی بارش ہوئی۔شور و غل کی آواز پر مصطفیٰ آغا برج کے پچاس محافظوں کو لے کر آگیا۔اسکے پاس بندوقیں بھی تھیں اس نے فائر شروع کر دئے۔

صفدر خان نے بڑی توپیں طلب کر لیں۔مغل اس موقع پر مکر کر کے چھپ گئے۔صفدر خان میدان خالی پاکر آگے بڑھ آیا اور بندوقچیوں نے اسکو بھون ڈالا اور تیروں سے سیکڑوں آدمیوں کو چھلنی کر دیا۔جو بچ سکے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

اب یہ گروہ فاتحانہ کمال خاں اور صفدر خاں کے سر لیے ہوئے آگے بڑھا۔ اسکے
بعد غداروں کے حمایتی بھاگنے لگے۔ دوسرے دن سلطان اسمٰعیل عادل شاہ نے دربار
عام کیا۔ خوش کلیدی آقا، سکندر آقائے رومی، مصطفیٰ آقا، مقرب خاں، مظفر خاں
رودباری، خواجہ غیاث الدین کاشی اور محمد حسین طہرانی اور باوفا مغلوں اور حبشیوں
کو عہدے اور انعامات دے کر نوازا گیا۔

سلطان محمود شاہ بہمنی اور امیر برید اس خبر پر لشکر کش ہوئے۔ سلطان
اسمٰعیل عادل شاہ نے گھنٹوں کی جنگ میں پچیس ہزار سواروں کو شکست دیدی پھر
اپنے تمام علاقے واپس لیے

۹۳۰ھ میں امیر قاسم برید ترک نے برہان نظام شاہ بحری، سلطان قلی شاہ اور
علاء الدین عماد شاہ کی مدد سے ایک بڑا لشکر ترتیب دیا۔ اسمٰعیل عادل شاہ نے راستے
میں کوئی مدافعت نہ کی۔ جب وہ بیجاپور کے قریب پہنچ گئے تو بارہ ہزار منتخب
سواروں کو لیکر نکلا اور ان پر بلائے بے درماں کی طرح ٹوٹ پڑا۔ دشمن کے پاؤں
اکھڑ گئے۔ سلطان محمود شاہ اور اس کا بیٹا دونوں گرفتار ہوئے۔ اسمٰعیل عادل شاہ
نے انکو عزت و احترام سے رکھا پھر انکی خواہش پر اپنی بہن بی بی ستی کی رخصتی بھی
کردی۔

سلطان محمود شاہ بہمنی جب پانچ ہزار عادل شاہی سواروں کے ساتھ احمد آباد
بیدر پہنچا تو امیر برید اپنی جاگیر کی طرف چلا گیا پھر موقع پاکر واپس آگیا اور سلطان محمود
شاہ پہلے کی طرح پھر اس کا قیدی بن گیا۔

اس عرصے میں شاہ اسمٰعیل صفوی کے سفیر دکن کے ملکوں میں وارد ہوئے
ایک ایلچی بہمنی سلطنت کے پاس بھی پہنچا جسکو امیر برید نے دو سال تک واپس نہ
ہونے دیا پھر اسمٰعیل عادل شاہ کی مداخلت پر رخصت کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دکن کے سلاطین فوجی طاقتوں میں اضافہ کر رہے تھے مگر
ان میں سے کوئی یوسف عادل شاہ کے بیٹے کے ہمسر نہ تھا۔ اسمٰعیل عادل شاہ کی
فوج پچاس ہزار سوار اور تین لاکھ پیادوں پر مشتمل تھی لیکن اسکے دشمنوں کی تعداد
بھی اتنی ہی تھی۔ تیمراج نے گرد و نواح کے تمام راجاؤں کو اپنے پرچم تلے جمع کر لیا تھا

لہٰذا اسمٰعیل عادل شاہ سات ہزار سواران تاجپوش کے ہمراہ اسکی طرف روانہ ہوا۔
دریا بیچ میں حائل تھا۔ اسمٰعیل شاہ نے ہاتھی آگے بڑھا کر دریا میں ڈال دیا
اور اس پار پہنچ گیا۔ اس دوران لشکر غنیم نمودار ہوا۔ سلطان اسمٰعیل کی جمعیت
صرف دس ہزار تھی اور فوج کفار میں تیس ہزار سوار اور کم و بیش دو لاکھ پیادے تھے
مغلوں نے شاہ اسمٰعیل کے اشارے پر بھرپور ریلہ بولا اور پہلے ہی حملے میں سپہ سالار کو
موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن مقابلہ توپ اور بندوق سے پڑا تو کوئی ڈیڑھ ہزار
مسلمان درجہ شہادت پر فائز ہو گئے۔ باقیوں کی ہمت ہار گئی اور وہ مع گھوڑوں کے دریا
میں کود پڑے۔ اسمٰعیل عادل شاہ سات جوانان تاج پوش کے ساتھ دوسرے کنارے
پر پہنچ سکا اور اسد خاں لاری کے مشورے پر بیجاپور آگیا۔

پھر اس نے برہان نظام شاہ بحری سے تعلقات استوار کیے اور اپنی بہن کا عقد
اسکے ساتھ کر دیا لیکن اس کا الٹا اثر ہوا۔ برہان نظام شاہ نے مملکت میں اپنی بہن کا حق
طلب کیا اور دونوں میں نااتفاقی ہو گئی۔ علاؤالدین عماد شاہ والی برار اسکے ساتھ تھا
اور امیر برید کی کمک آنے ہی والی تھی۔ اس نے قلعہ شوالاپور کا محاصرہ کر لیا۔
اسمٰعیل عادل شاہ نے دس ہزار کامداروں کے ساتھ چالیس ہزار سواروں کا مقابلہ کیا

امیر برید کی کمک برہان نظام شاہ کو پہنچ چکی تھی۔ اس نے اکتالیسویں دن
فوجیں میدان میں پہنچا دیں۔ پہلے اسد خاں لاری نے علاء الدین عماد شاہ کی صفوں کو
درہم برہم کیا پھر ترسون بہادر نے امیر برید پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ برہان نظام
شاہ بحری کو خوش کلیدی آقا اور مصطفیٰ آقا نے گھیرے میں لے لیا۔ وہ بھی تاب
جنگ نہ لایا۔ چالیس ہاتھی اور توپخانہ اسمٰعیل عادل شاہ کے ہاتھ آیا۔

۹۳۳ھ میں برہان نظام شاہ بحری اور عماد شاہ میں جنگ ہوئی جس میں بحری
کامیاب رہا پھر پچھلی شکست کا بدلہ لینے کیلئے اس نے بیجاپور کا رخ کیا۔ اسمٰعیل
عادل نے پھر اسکو شکست دی اور خواجہ جہاں وغیرہ کو گرفتار کر لیا۔

۹۳۴ھ میں اسمٰعیل عادل شاہ نے اپنی چھوٹی بہن عماد شاہ والی برار کو بیاہ
دی۔ اس اثنا میں بہادر شاہ گجراتی سے برہان نظام شاہ کی جنگ ہوئی۔ اسمٰعیل
عادل شاہ نے پچھلی مناقشت کو بھول کر اسکی مدد کی اور اسکو کامیاب کرا لیا۔ امیر قا

برید نے اسکی فوج کے افسروں کو اسمٰعیل عادل شاہ کی مخالفت پر ابھارنے کی کوشش کی تو وہ بہت مشتعل ہوا اور دس ہزار سوار لے کر احمد آباد بیدر کی طرف چل پڑا۔ امیر قاسم برید قلعہ سے نکل گیا اور اپنے بیٹے علی برید کو نظم و نسق سونپ گیا۔

علی برید کے دو ماموں اپنے کو رستم زماں گردانتے تھے۔ انہوں نے میدان میں مبارز طلبی کی اور اسمٰعیل عادل شاہ کو مقابلے پر آنے کی دعوت دی وہ انکی للکار کو برداشت نہ کر سکا، گھوڑا اڑا کر سامنے آگیا اور چشم زدن میں دونوں کو ٹھکانے لگا دیا۔

اس درمیان ایک طرف سے قلی قطب شاہ کی فوج ظاہر ہوئی۔ اسد خاں لاری بڑھ کر اس سے مقابل ہوا اور اسکے پروں میں رخنے ڈال دئے پھر اسکے ایک بھرپور حملے میں دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ امیر قاسم برید نے عماد شاہ کو درمیان میں ڈال کر صلح کی درخواست کی۔ اس بہانے غافل کر کے وہ اسپر حملہ کرنا چاہتا تھا مگر الٹا اسد خاں لاری کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اس نے قلعہ احمد آباد بیدر اسمٰعیل عادل شاہ کے حوالے کر دیا۔

اسی زمانے میں تیمراج کا انتقال ہو گیا اور اسکے بیٹوں میں تخت و تاج کیلئے جھگڑا شروع ہو گیا۔ اسمٰعیل عادل شاہ نے وقت سے فائدہ اٹھا کر پہلے رائچور اور مدگل کے قلعے مسخر کیے پھر سترہ سال کے بعد مجلس شراب منعقد کی۔ تیمراج کے ہاتھوں ہزیمت یاب ہونے کے بعد سے اس نے شراب کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ اس بزم میں عمادالملک کے ساتھ امیر برید کو بھی شریک کیا گیا۔

پھر بیجاپور واپس پہنچ کر احمد اباد بیدر امیر برید کو واپس کر دیا مگر اس شرط پر کہ کلیان و قندھارا کے قلعے وہ بیجاپور کو دیدے گا مگر اس نے ان قلعوں کی چابیاں بھیجنے کے بجائے برہان نظام شاہ بحری سے مدد کی درخواست کر دی۔ اسمٰعیل عادل شاہ نے بہت کوشش کی کہ برہان بحری بیچ نہ آئے مگر وہ نہیں مانا اور اسمٰعیل عادل سو سوار مغل اور چالیس پیادے لے کر دریا عبور کر گیا۔ باقی لشکر بعد میں آیا جس میں بارہ ہزار سوار شامل تھے۔

برہان نظام الملک بحری ایک بڑا توپخانہ اور پچیس ہزار سوار لے کر آیا تھا۔

لشکر جب ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوئے تو تلواروں کے ٹکراؤ کے ساتھ سروں پر سر کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ گھمسان کا رن پڑا خورشید خان نظام شاہی قتل ہوا اور برہان نظام شاہ باحال پریشاں احمد نگر پہنچ سکا۔ اسکے بعد ان دونوں میں کبھی جنگ نہیں ہوئی بلکہ قلی قطب شاہ برہان نظام بحری اور اسمٰعیل عادل شاہ کے درمیان سرحدوں کا سمجھوتہ ہو گیا۔

۹۴۰ھ میں اسمٰعیل عادل شاہ، امیر قاسم برید کے اتحاد سے قلعہ نل کنڈہ کی طرف روانہ ہوا۔ قلعہ فتح ہونیوالا تھا کہ اسمٰعیل عادل شاہ بیمار ہو گیا اور قلعہ گلبرگہ کا عازم ہوا اور ۱۶ صفر ۹۴۱ھ میں خالق حقیقی سے جا ملا۔

اسمٰعیل عادل شاہ باہمت، شجاع، سخی اور سنجیدہ مزاج فرمانروا تھا۔

ملو عادل شاہ

بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے باپ کا جانشین بنایا گیا مگر وہ شراب و شباب میں غرق ہو گیا اور نظم سلطنت میں ابتری پیدا ہونے لگی لہذا امراء نے باہم صلح و مشورہ کر کے چھ ماہ بعد اسکو معزول کر دیا اور اسکے چھوٹے بھائی کو تخت پر بٹھا دیا۔

ابراہیم عادل شاہ

بشرے سے وہ یوسف عادل شاہ کا جانشین معلوم ہوتا تھا مگر اس کا اتالیق حنفی المسلک تھا جو شروع ہی سے اسکے ذہن میں امام ابو حنیفہ کی عظمت کے نقش بٹھاتا رہا تھا لہذا تخت پر بیٹھتے ہی اس نے سنی ہونے کا اعلان کر دیا اور شیعوں میں سے جو لوگ اسکی نظر میں کھٹکتے تھے انکو موقوف کر دیا۔

اس موقع سے رام راج والی بیجانگر نے فائدہ اٹھایا اور جن امیروں اور سپاہیوں کو اس نے برطرف کیا تھا، ان سب کو اپنے زمرہ ملازمت میں شامل کر لیا۔

اسد خاں لاری نے ابراہیم عادل شاہ کے حکم سے اسپر یورش کی اور کامیاب ہوا پھر مصلحت اندیشی کے تحت اس سے صلح کر لی۔ کچھ دنوں بعد ابراہیم عادل شاہ مذہبی اختلاف کی بنا پر اسد خاں لاری سے بدظن ہو گیا اور اسکی گرفتاری کیلئے یوسف شحنہ کو متعین کیا۔ وہ ایک بڑی فوج لیکر گیا لیکن اسد خاں کا مقابلہ کیا کرتا بری طرح شکست یاب ہوا۔ ابراہیم عادل شاہ نے اسکی ذمہ داری خود یوسف شحنہ پر ڈال

دی ۔ اسد خاں ابراہیم شاہ کی نیت سے واقف ہو گیا تھا ۔ اس نے اس معاملہ سے درگزر کیا لیکن ابراہیم شاہ کی طرف سے چوکنا رہنے لگا۔

برہان نظام شاہ نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور امیر قاسم برید کی مدد سے ۹۴۷ھ میں ایک بڑی فوج کے ساتھ احمد نگر سے روانہ ہوا اسد خاں لاری بھی اس سے آملا عماد شاہ والی برار نے اسد خاں سے ابراہیم شاہ کی صفائی کرادی اور ابراہیم نے قوی پشت ہو کر برہان شاہ کو شکست دیدی اور برہان نظام شاہ کو تاوان کے طور پر پانچ پرگنے دینا پڑے جسکو وہ بھول نہ سکا۔

اس نے کوشش کر کے والی بیجانگر رام راج اور جمشید قلی قطب شاہ کو ہموار کر کے مدد حاصل کی ۔ اس درمیان امیر قاسم برید فوت ہو چکا تھا اور علی برید اس کا جانشین ہوا تھا ۔ برہان نظام شاہ نے اسکو بھی اپنے اتحاد میں شامل کیا اور ان سب نے چار طرف سے مملکت بیجاپور پر یلغار کر دی ۔ ابراہیم عادل شاہ نے دباؤ پڑنے پر برہان نظام شاہ کے پرگنے اسکو واپس کر دئے اور دوسروں سے صلح کی بات چیت کرنے لگا

اسد خان لاری خود جمشید قلی خاں کی طرف متوجہ ہوا ۔ عین جنگ میں ایک تیر جمشید قلی کے چہرے پر لگا اور اسد خاں مظفر و منصور واپس ہو گیا۔

۹۵۱ ھ میں برہان نظام شاہ نے پھر گلبرگہ پر حملہ کیا اور شکست کھائی ۔ پھر دوبار ابراہیم عادل شاہ کی برہان نظام شاہ سے لڑائیاں ہوئیں اور ہر بار اس نے بری طرح شکست کھائی جس کا غصہ وہ مقربین پر اتارنے لگا اور ان کو بلا خطا قتل کرانے لگا ۔ پھر وہ اسد خاں لاری سے بدگمان ہوا ۔ دونوں میں گفت وشنید ہو رہی تھی کہ اسد خاں بیمار ہو کر مر گیا۔

پھر برہان نظام شاہ نے علی برید کے قلعہ کلیان پر لشکر کشی کی ۔ ابراہیم عادل شاہ مدد کیلئے آیا تو اسکو بری طرح شکست ہوئی ۔ اس نے میدان سے فرار ہو کر نظام شاہی ملک پر غارت گری کی ۔ ادھر برہان نظام شاہ نے قلعہ پرندہ فتح کر لیا۔

۹۵۹ ھ میں برہان نظام شاہ کی تحریک پر رام راج نے رائچو اور مدگل کے قلعے فتح کیے اور شوالاپور پر برہان نظام نے قبضہ کیا ۔ اسکے بعد برہان نظام شاہ کا انتقال ہو گیا اور

حسین نظام تخت نشین ہوا ۔ اس سے ابراہیم عادل شاہ کی صلح ہو گئی لیکن جلد ہی یہ دوستی دشمنی میں بدل گئی ۔ دونوں میں سخت جنگ ہوئی ایسی جنگ کہ دکن میں کم ہی ہوئی ہو گی ۔ اس میں ابراہیم عادل شاہ کو شکست ہوئی ۔ وہ اپنے وفادار سپہ سالار سیف عین الملک سے بدظن ہو گیا ۔ اسکو پکڑنے کیلئے اس نے دلاور خاں کو بھیجا جب وہ منہزم ہوا تو خود روانہ ہوا اور سیف عین الملک کے معرکے میں اس طرح شکست کھائی کہ بیجاپور پہنچ کر دم لیا۔

سیف عین الملک بیجاپور کے قریب پہنچا تو ابراہیم عادل شاہ نے رام راج سے مدد طلب کی ۔ سیف عین الملک نے بیجاپور کے لشکر پر شبخون مارا تو دھوکا کھایا ۔ وہ سب اسے انتظار میں تھے ۔ سیف عین الملک کے بکثرت آدمی قتل ہو گئے ۔ وہ بچ بچا کر نکل گیا اور گھومتا پھرتا نظام شاہی سرحد میں داخل ہو گیا۔

ابراہیم عادل شاہ مختلف امراض میں گرفتار تھا جب کسی طبیب کے علاج سے فائدہ نہ ہوتا تو اسکو قتل کرا دیتا ۔ دو برس تک ایسے ہی ظالمانہ افعال کا مرتکب ہوتا رہا ۔ ۹۶۵ھ میں اس نے وفات پائی ۔

ابو المظفر علی عادل شاہ

ابراہیم عادل شاہ چونکہ خود اتالیق کے اثر سے سنی ہوا تھا لہٰذا اسکو اندیشہ تھا کہ کہیں اسکے بیٹے کا اتالیق شیعہ نہ ہو لہٰذا ایک دن اس نے علی سے پوچھا کہ اس کا مذہب کیا ہے ؟ علی نے جواب دیا کہ فی الوقت مذہب سلطانی میرا مذہب ہے ، آگے کا حال میں نہیں جانتا۔ اس جواب پر اسے شبہ ہوا اور اس نے علی کے اتالیق خواجہ عنایت اللہ شیرازی کو قتل کرا دیا اور دوسرا اتالیق مقرر کیا ۔ ملا فتح اللہ شیرازی بھی تقیہ میں تھا اور ابراہیم عادل شاہ کے خوف سے سنی بنا ہوا تھا۔

عجیب تماشا ہے کہ کوئی شیعہ مصلحتاً سنی بن جائے تو کہا جاتا ہے کہ تقیہ کیا اور کوئی سنی اپنے کو اسمٰعیل عادل شاہ کا ہم مذہب بتائے اور ابراہیم کا اتالیق بنا دیا جائے تو اسکو تقیہ نہیں کہتے بلکہ مصلحت وقت کا نام دیا جاتا ہے ۔ خدارا تقیہ اور مصلحت کا فرق سمجھا دیجئے ۔

ابراہیم عادل شاہ اسکے بعد بھی مطمئن نہ ہوا اور علی کو آغاز شباب میں قلعہ

مرج میں بھیج دیا اور سکندر خاں قلعہ دار کو ہدایت کی کہ وہ شیعوں کی صحبت میں بیٹھنے نہ پائے مگر اتفاق سے وہ اور اس کا داماد کامل خاں دکنی دونوں شیعہ تھے۔ پھر جب ابراہیم عادل شاہ بیمار ہوا اور اسکو پتہ چل گیا کہ علی پکا محب اہل بیت ہے تو اس نے چاہا کہ شہزادہ طہماسپ کو ولی عہد بنادے مگر اسکو بتایا گیا کہ شیعیت میں وہ بڑے بھائی سے آگے ہے تو ابراہیم عادل شاہ مجبور ہو گیا۔

بات یہ ہے کہ یوسف عادل شاہ کا پورا خانوادہ آل رسول کا دیوانہ تھا۔ خود ابراہیم سنی ہو گیا تھا تو اسکے خوف سے کوئی زبان نہ کھولتا مگر محل سرا کے اندر اور باہر تمام متعلقین چھپ چھپا کر ایک ہی عقیدے کو مانتے تھے اور اسی ماحول میں شہزادوں کی پرورش ہوئی تھی اس لئے وہ قدیم ڈگر سے ہٹ نہ سکتے اور یہی حال شاہزادیوں کا بھی تھا۔

انجام کار علی عادل شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی اذاں میں علیاً ولی اللہ کا آوازہ بلند ہوا اور خطبہ آئمہ اثناعشر جاری کیا گیا۔

محمد قاسم فرشتہ نے اسکو صاحب مشرب، صوفی منش، خوش طبع صاف نظر، عاشقی کے ذوق سے باخبر لکھا ہے پھر تحریر کیا ہے کہ وہ اہل حیثیت سے صحبت رکھتا، ہمیشہ ماہرویان زہرجبین، سادہ عذاران سرآئین سے مجلس کو مزین کرتا تھا، خوش تدبیر و صلح پسند تھا چنانچہ رام راج کے پاس ایک سفارت بیجانگر بھیجی، دوسری سفارت احمد نگر روانہ کی مگر نظام شاہ بحری سفیروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش نہ آیا اور نہ جواباً اپنے ایلچی روانہ کیے اس لئے اسکی طرف سے علی عادل شاہ کے دل میں ایک رنجش پڑ گئی۔

رام راج سے اسکے تعلقات یگانگت اور اپنایت کے تھے حتی کہ رام راج کا بیٹا فوت ہوا تو اسکی تعزیت میں وہ خود بیجانگر گیا رام راج نے تواضع اور ضیافت میں کمی نہ کی مگر خود اسکو رخصت کرنے نہ آیا۔ اس سے علی عادل شاہ کے دل میں ایک تکدر پیدا ہو گیا۔

۹۶۶ھ میں اس نے حسین نظام سے شوالاپور اور کلیانی کے قلعوں کا مطالبہ کیا جن پر ابراہیم عادل شاہ کی کمزوری سے حسین نظام نے قبضہ کرلیا تھا۔

اس کے انکاری جواب پر علی عادل شاہ نے بڑی تہذیب سے استدعا کی کہ طاقت آزمائی سے جان و مال کا اتلاف ہوگا اسپر حسین نظام نے الفاظ ناشائستہ استعمال کیے اور طرفین لشکر کشی پر آمادہ ہوگئے۔

۹۶۷ھ میں بیجانگر کی مدد سے بیجاپور کی فوجیں آگے بڑھیں۔ پرندہ سے جنیر تک اور احمد نگر سے دولت آباد تک تمام آبادیاں تہہ و بالا ہو گئیں۔ کفار بیجانگر نے موقع سے فائدہ اٹھا کر مسجد اور صحف مقدس کی بیحرمتی کی۔ حسین نظام پٹن کی طرف ہٹ گیا پھر قلعہ کلیانی بیجاپور کے حوالے کرکے صلح کرلی۔

اسکے بعد حسین نظام نے اپنی بیٹی بی بی جمال قطب الملک کو بیاہ دی اور رام راج سے تعلقات ہموار کیے تاکہ اس سے بیجاپور کے خلاف فوجی مدد حاصل کرے علی عادل شاہ نے پھر رام راج سے استعانت چاہی اور وہاں کی فوجیں بیجاپور روانہ ہو گئیں۔

پچاس ہزار سوار اور دو لاکھ پیادے بیجانگر کے اور عادل شاہی لشکر احمد نگر کی طرف بڑھ گئے۔ حسین نظام بھی مقابلے پر آیا مگر عین موقع پر ابراہیم قطب شاہ، علی عادل شاہ سے جا ملا۔ حسین نظام کو تاب مقابلہ نہ تھی لہذا اس نے میدان چھوڑ دیا۔ اس بار بیجانگر کی فوجوں نے پہلے سے زیادہ غارتگری کی۔ اسکو محسوس کرکے علی عادل شاہ نے قلعہ شوالاپور کی تسخیر ملتوی کردی۔

راستے میں رام راج نے "نل پسر بادشاہ مندو" کا ٹوٹا پھوٹا قلعہ ازسرنو تعمیر کرایا اور بیجانگر کی طرف واپس ہو گیا۔

علی عادل شاہ نے دو جنگوں میں رام راج کی مدد سے حسین نظام پر فتح حاصل کرلی تھی لیکن رام راج اور اسکے لشکر کے طور طریقے نے اسکے دل میں ناسور ڈال دئے تھے۔ پہلی مرتبہ بھی اس نے رامراج سے اس شرط پر مدد حاصل کی تھی کہ اسکی فوجیں مفتوحہ علاقوں میں قتل و غارت نہیں کریں گے اور دوسری مرتبہ تو رام راج نے بذات خود پورا اطمینان دلایا تھا کہ اب پہلے کی طرح کسی مسجد یا عبادت گاہ کو نہ مسمار کیا جائے گا اور نہ بے حرمتی ہوگی لیکن ہوا اسکے برعکس کہ مسجدوں کو

اصطبل بنادیا گیا۔

پھر چلتے وقت رام راج نے علی عادل شاہ اور قطب الملک کے ملحقہ علاقوں پر بھی قبضہ کرلیا اور یہ دونوں سرتابی نہ کرسکے کیونکہ حسین نظام ان کا دشمن تھا اور دونوں مل کر بھی رام راج کا مقابلہ نہ کرسکتے۔

اور اسکے بعد تو رام راج کا یہ طریقہ تھا کہ مسلم ممالک کے سفیروں کو اپنی سواری کے ساتھ دوڑاتا تھا۔ ان حالات میں علی عادل شاہ کو پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے حسین نظام کے خلاف بیجانگر سے مدد کیوں حاصل کی؟

لیکن صورتحال علی عادل شاہ سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ بھی بہادر تھا اور اسکے امراء بھی بڑے جان نثار مگر رام راج کے ٹڈی سے وہ نبرد آزما نہ ہوسکتے اور حالات کو سمجھتے بوجھتے ہوئے اس سے ٹکرا جانا خودکشی کے مترادف تھا لہذا وہ سوچتا رہا اور دانش مند عمائدین سلطنت سے مشورے لیتا رہا آخر اس نے ابراہیم قطب شاہ سے رجوع کیا۔

وہ بھی علی عادل شاہ کی طرح رام راج کے خلاف بھرا بیٹھا تھا۔ اس نے مصطفیٰ خاں اردستانی کو فرائض سفارت انجام دینے پر متعین کیا۔ اسکی کوششیں بار آور ہوئیں اور علی عادل شاہ اور حسین نظام میں اتحاد کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ چاند بی بی بنت حسین نظام کا عقد علی عادل شاہ سے کیا گیا اور قلعہ شوالاپور جہیز میں دیا گیا۔ علی عادل شاہ کی بہن ہدیہ سلطانہ مرتضیٰ نظام سے بیاہ دی گئی۔ اس طرح تینوں بادشاہ باہم مضبوط رشتوں میں منسلک ہوگئے۔

اب علی عادل شاہ نے رام راج سے مطالبہ کیا کہ قلعہ رائچور اور مدگل پر اس نے جنگ کے بعد قبضہ کرلیا تھا لہذا انکو واگزار کردے جواب حسب توقع سخت اور اہانت آمیز ملا اور علی عادل شاہ نے فوجی تیاری شروع کردی۔

حسین نظام نے اس اتحاد میں علی برید کو بھی شامل کرلیا اور ۹۷۲ھ میں منصوبے کے مطابق چاروں لشکر نواح بیجاپور میں یکجا ہوگئے۔

جب یہ فوجیں بیجانگر کی طرف بڑھیں تو رام راج نے اسے بچوں کا کھیل قرار دیا اور اپنے چھوٹے بھائی تمراج کو بیس ہزار سوار پانچ سو ہاتھی اور ایک لاکھ پیادوں

کے ساتھ تعینات کردیا۔ پھر اپنے منجھلے بھائی تنگناوڑی کو بڑے جاہ و حشم سے روانہ کیا اور آخر میں مضافات کے سارے راجاؤں کے جھرمٹ میں دور سے جنگ کا نظارہ کرنے کیلئے آہستہ آہستہ بڑھا۔ وہ خوش تھا کہ تمام مسلمان ایک ساتھ خود اسکے چنگل میں آگئے۔

تمراج نے دریا کے کنارے پہنچتے ہی عبور کرنے کی ہر راہ سدود کردی اور جس مقام پر پانی پایاب تھا، وہاں دیواریں کھڑی کردیں اور ان میں توپیں نصب کردیں۔ مسلمانوں نے باہم مشورہ کرکے بعض مقامات پر دریا عبور کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن ان مقامات کے بجائے بعض دوسری جگہوں کی طرف ایک دستہ فوج روانہ کردیا۔ بیجانگر کے لشکری اس دستہ کی طرف متوجہ ہوگئے اور انکو روکنے کیلئے بڑھ گئے تو مسلمان فوجوں نے متعینہ گھاٹوں سے دریا پار کرلیا۔

اس طرح مسلم لشکروں کو ایک لمبی مسافت طے کرنا پڑی مگر انہوں نے تین روز کا فاصلہ ایک دن میں طے کیا اور رام راج سے دس میل کے فاصلے پر پہنچ کر ٹھہر گئے جہاں تمام فوجیں یکے بعد دیگرے یکجا ہوگئیں۔ دوسرے دن بارہ اماموں کے پرچموں تلے اللہ اکبر اور یا علی کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے اور صفوں کو اس طرح مرتب کیا گیا کہ میمنہ علی عادل شاہ کو میسرہ علی برید اور ابراہیم قطب شاہ کو دیا گیا، قلب میں حسین نظام، نظام شاہ بحری نے قیام کیا۔

آتشبازی کے ارابے زنجیروں سے استوار کیے گئے اور جنگی ہاتھی جابجا ایستادہ کیے گئے پھر ان علموں کو حرکت دی گئی جن پر اسمائے ختم المرسلین و آئمہ طاہرین لکھے ہوئے تھے۔

بیجانگر کا میمنہ تمراج کے سپرد تھا جو علی برید اور ابراہیم قطب شاہ کے مقابل تھا، میسرے پر تنگناوڑی علی عادل شاہ کے سامنے اور قلب میں خود رام راج دوہزار ہاتھی اور ایک ہزار ارابہ توپخانہ کے ساتھ۔

آفتاب جب نصف النہار پر پہنچا تو رام راج نے اپنے جواہر نگار سنگھاسن کو آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ بہی خواہوں نے گھوڑے پر سوار ہونے کی درخواست کی تو اس نے بڑے غرور سے کہا کہ بچوں کے کھیل میں گھوڑے کی ضرورت نہیں۔

یہی حال اسکے لشکریوں کا تھا۔ قلیل فوج کو تلوار کے گھاٹ اتار دینا اسکے نزدیک گھنٹوں کا کام تھا۔ جنگ کا آغاز بیجانگر کے پچاس ہزار تیر اندازوں نے کیا۔ اسکے ساتھ ہی بندوقیں دغیں، توپیں چھوٹیں۔ لشکر اسلام کی طرف سے اس کا جواب دیا گیا مگر اسی تناسب سے جو دونوں لشکروں کا تھا پھر فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں اور تلواریں چلنے لگیں۔ اہل اسلام کے مقتولین کی تعداد بڑھ گئی مگر ان کے شیرانہ حملوں میں کمی نہ آئی بلکہ شہداء کی لاشوں کو دیکھ کر اور جوش پیدا ہو گیا۔

بیجانگر کا پلڑا بھاری تھا۔ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ جائیں تاہم جنگ کا یہ انداز رام راج کے وہم و خیال سے دور تھا۔ وہ اہل اسلام کو کھیرے ککڑی کے طرح کاٹ ڈالنے کیلئے آیا تھا مگر اس نے دیکھا کہ ایک گرتا تھا تو آگے بڑھ کر دو حملہ آور ہو جاتے۔ یہ دیکھ کر وہ زر و جواہر بانٹنے لگا تاکہ لوگ میدان میں جا کر سروں کی بازیاں لگا دیں۔

عین اسی وقت تمراج اور تِگناوڑی نے بھرپور حملہ کیا جس سے میمنے اور میسرے کی اگلی صفیں درہم و برہم ہو گئیں۔ حسین نظام شاہ قلب لشکر میں تھا اس نے شدید ریلے کے باوجود اپنے پاؤں زمین پر جما دئے۔ سیکڑوں تیر داہنے بائیں اور سر پر سے گزر گئے مگر اس نے اپنے نشان لشکر کو بلند رکھا۔ عادل شاہی مقدمہ الجیش ٹوٹ چکا تھا اس کا سپہ سالار محمد کشور خاں زخمی تھا۔ وہ نظام شاہی علم کے قریب آگیا اور علی عادل شاہ میدان سے ہٹ کر بیجانگر کی فوج پر عقب سے حملہ آور ہو گیا۔

ایسے میں حسین نظام نے اپنی مخصوص توپ میدان ملک سر کرنے کا حکم دیا جس میں پیسے بھرے جاتے تھے۔ اس توپ کے چلتے ہی حسین نظام نے پوری طاقت سے رام راج کی فوج خاصہ پر یلغار کی جو اسکی تاب نہ لاسکی۔ رام راج اتنا گھبرا گیا کہ کرسی سے اتر کر پھر سنگھاسن پر آبیٹھا۔

اس درمیان حسین نظام کا فیل مست غلام علی چنگھاڑتا ہوا اس طرف کو بڑھا۔ اس نے رام راج کے گرداگرد کھڑے ہوئے سپاہیوں کو روند ڈالا۔ کہار اسکو اپنے قریب پا کر بھاگنے لگے اور سنگھاسن زمین پر آگیا۔

اس غضب کی جنگ مغلوبہ سرزمین دکن نے کاہے کو دیکھی ہوگی۔ ایک کو

دوسرے کی خبر نہ تھی۔ صحیح معنی میں یہ جنوبی ہند میں کفر و اسلام کی فیصلہ کن جنگ تھی۔ کسی نے رام راج کی طرف توجہ نہ کی۔ صرف ایک برہمن اسکے پاس رہ گیا تھا فیلبان نے ہاتھی کو سنگھاسن کے زر و جواہر کی خاطر اس طرف بڑھایا تو برہمن سمجھا کہ کچلنے کیلئے آرہا ہے۔ اس نے چلا کر کہا یہ رام راج ہے اسکو چھوڑ دے تجھے مالا مال کر دے گا۔

یہ سنتے ہی فیلبان نے سنگھاسن کے بجائے رام راج کو ہاتھی کی سونڈ سے اٹھوا لیا اور اسکو لے کر رومی خاں افسر توپخانہ کے پاس آگیا۔ اس نے فی الفور حسین نظام کے پاس پہنچا دیا اور حسین نظام شاہ نے بیک ضرب شمشیر اس کا سر تن سے جدا کر دیا اور سر کو نیزے پر بلند کر کے اعلان کرایا کہ رام راج قتل ہو گیا۔

لڑتے ہوئے سپاہیوں کی نظر اس سر پر پڑی تو ہمت پست ہو گئی۔ انہوں نے جانیں بچانے کیلئے بھاگنا شروع کر دیا۔

اسلام کے بہادروں نے انکے قتل میں کوتاہی نہ کی مگر کہاں تک مارتے میدان لاشوں سے پٹ گیا۔ مقتولوں کی تعداد ایک لاکھ سے تین لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔ مال و اسباب اور جواہرات جو وہ چھوڑ کر گئے انکا کوئی شمار نہ ہو سکتا۔

مسلم سلا طین نے اسی میدان میں سجدہ ہائے شکر ادا کیے۔ غنیمت کی تقسیم یوں قرار پائی کہ جو کچھ جسکے ہاتھ لگا، وہ اسی کا ہاتھی بادشاہوں کے۔(۷۶)

نواح بیجانگر کے تمام بت خانے مسمار کر دئے گئے بڑی بڑی عمارتیں توڑ ڈالی گئیں۔ تِگناوڑی کسی گوشے میں چھپ گیا تھا اس نے ایلچی بھیج کر حسین نظام کی منت و سماجت کی۔ اس نے بیجانگر کا اصل ملک اسکو واپس کر دیا۔ عادل شاہی اور قطب شاہی مملکتوں کے جو قلعے رام راج نے ضبط کیے تھے وہ انکو واپس ہو گئے۔

سلاطین جب اپنے اپنے مقامات پر واپس ہو چکے تو رام راج کا چھوٹا بیٹا علی عادل شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے تِگناوڑی پر زور ڈالا کہ اناکندی تمراج کو دیا جائے۔ تِگناوڑی کو مجال سرتابی نہ تھی۔ اس وقت سے رام راج کی سلطنت چھوٹے بڑے دو حصوں میں بٹ گئی اور نسلاً بعد نسل چلتی رہی۔

آگے چل کر خود انھیں کے بعض سرداروں نے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا اور

ایک طوائف الملوکی پیدا ہو گئی ۔ کچھ دنوں بعد علی عادل شاہ نے قلعہ بیکاپور اور چندر کوٹی اپنے ملک میں شامل کر لیے مگر وہ سنگناوڑی اور تمراج کے مقبوضات نہ تھے ۔

کچھ دنوں بعد حسین نظام بحری کا انتقال ہوا تو مرتضی نظام بحری اس کا جانشین ہوا ۔ علی عادل شاہ سے اسکی ان بن ہو گئی کیونکہ تمراج اور سنگناوڑی ایک دوسرے کے حریف بن گئے اور یہ دونوں ان کے پشت پناہ تھے مگر مخالفت نے طول نہیں کھینچا ۔

۹۷۴ ھ میں علی عادل شاہ اور مرتضی نظام نے مل کر برار پر لشکر کشی کی مگر موسم برسات آجانے کے سبب واپس ہو گئے ۔

۹۷۵ ھ میں علی عادل شاہ نے مملکت نظام شاہی کے بعض پرگنوں پر قبضہ کر لیا جنہیں ۹۸۰ ھ میں مرتضی نظام نے شدید جنگ کے بعد واپس لیا اور اسی سلسلے میں چند پرگنے عادل شاہ کے بھی لے لیے ۔ ان جنگوں میں عادل شاہ کی کافی فوج ضائع ہو گئی ۔

قلعہ اودنی رام راج کا مشہور قلعہ تھا جسکو سلاطین بہمنی فتح کرنا چاہتے تھے مگر فتح نہ کر سکے تھے ۔ اب اسپر بیجانگر کا ایک سردار قابض ہو گیا تھا اس نے سکہ بھی اپنے ہی نام کا جاری کیا تھا ۔ علی عادل شاہ نے اسپر فوج کشی کی اور آنکس خاں کو آٹھ ہزار سوار، بڑے توپخانے اور پیادوں کے ساتھ روانہ کیا ۔ اس نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا ۔ آخر طویل محاصرہ سے تنگ آکر قلعہ دار اماں کا طالب ہوا ۔ یہ ایک فتح عظیم تھی ۔

انہیں دنوں بعض امراء کی مساعی سے اسکے اور مرتضی نظام کے تعلقات بحال ہوئے اور دونوں نے مل کر تسخیر برار کا منصوبہ بنایا ۔ پھر علی عادل شاہ قلعہ تورگل فتح کیا جسپر رام راج کے ایک سپاہی نے قبضہ کر لیا تھا ۔ اسی سلسلے میں بعض ایسے قلعوں کو بھی مسخر کیا جن کی تسخیر میں مصطفی خاں سپہ سالار کو لوہے کے چنے چبانا پڑے ۔

مضافات کے رائے اور راجے خود بیجاپور آکر پٹکا اور شمشیر مرصع پاکر سرفراز ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ دورانیاں بہرہ دیوی اور جلوی بھی حاضر ہوئیں ۔ انہیں علی عادل شاہ نے عورتوں کا خلعت عطا کیا ۔ اس پر انہوں نے کہا کہ عورتیں بزور شمشیر

حکومت کر سکتی ہیں تو عورتوں کا لباس کیوں پہنیں ۔ علی عادل شاہ کو یہ جواب بہت پسند آیا ۔ اس نے انہیں بھی پٹکا، شمشیر مرصع، اسپ تازی اور مردانہ خلعت عنایت کیا ۔ اس وقت سے ان علاقوں پر عورتیں اسی پوشاک اور وضع قطع میں حکومت کرتی ہیں ۔

علی عادل شاہ کی تسخیری مہمات کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور بیجاپور کی مملکت وسیع سے وسیع تر ہوتی رہی ۔ مختلف مقامات پر شدید بغاوتیں ہوئیں جنہیں طاقت کے بل پر کچل دیا گیا ۔ اس طرح اندر اور باہر دشمنوں کی تعداد بڑھتی رہی ۔

علی عادل شاہ، چونکہ لاولد تھا لہذا ۹۸۸ ھ میں اس نے اپنے چھوٹے بھائی طہماسپ بن ابراہیم کو ولی عہد نامزد کر دیا تاکہ اسکے بعد تخت و تاج کیلئے کوئی تنازعہ نہ ہو ۔

فرشتہ نے لکھا ہے کہ علی عادل شاہ قوم لوط کی علت میں مبتلا تھا ۔ دو خواجہ سرا اصرار کر کے احمد اباد بیدر سے بلوائے گئے تھے جو اگرچہ نس کٹے تھے مگر اس فعل کو پسند نہ کرتے ۔ ان سے جب علی عادل شاہ نے خواہش کی تو انہوں نے رات پر ٹالا ۔ رات میں ایک خواجہ سرا اسکے ساتھ خالی حجرے میں گیا اور قرولی نکال کر اس کا کام تمام کر دیا ۔

یہ بیان خلاف عقل نہیں کیونکہ ترکستان سے افغانستان تک یہ بات عام تھی اور ہندوستان کے پٹھان علاقوں میں آجتک اس کا رواج ہے ۔ علی عادل شاہ کی رگوں میں بھی ترکی خون تھا مگر اسکے اسلاف کے بارے میں کبھی کچھ سنا نہیں گیا جبکہ پردہ نشینوں کو چھوڑ کر بعض تاریخی ہستیاں بھی اس میں ملوث پائی جاتی رہیں ۔ محمود دایاز کے ناموں کو تقدس کے نقاب ڈال کر صرف حسن پرستی تک محدود کر دیا جائے تو ہمایوں کیلئے اسی فرشتہ کا بیان ہے ۔

"اسی سال امیر الامراء علی قلی خاں سیستانی المخاطب بہ خان زماں امیر پنج ہزاری و حاکم صوبہ شرقی، سے ایک امر ناشائستہ سرزد ہوا، جس سے حضرت (اکبر اعظم) کبیدہ خاطر ہوئے ۔ بات یہ تھی کہ ایک لڑکا شاہم بیگ احدیوں میں ملازم تھا جو حسن صورت و سیرت اور تناسب اعضاء کے سبب ہمایوں کا منظور نظر ہوا تھا،

علی قلی خاں سیستانی اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ حقیقت زبان زدعام ہوئی تو اکبر اعظم نے شاہم بیگ کی طلبی کا حکم دیا جس میں تامل ہونے پر لشکر بھیجا گیا۔" (۷۷)

ہمارے نزدیک یہ بھی صرف حسن پرستی ہے مگر مبارک شاہ خلجی اور خسرو کا استرداد ممکن نہیں کیونکہ چور موقعہ واردات پر پکڑ لیا گیا تھا اسی طرح علی عادل شاہ کی صفائی بھی نہیں دی جا سکتی کیونکہ نس کٹا خواجہ سرا قتل کی وجہ یہ بتاتا تھا کہ وہ ایسے فعل پر تیار نہیں تھا۔ بادشاہ نے جب کہا تو اسکی مردانہ غیرت دامنگیر ہوئی اور جواباً اس نے خنجر گھونپ دیا۔

اس سلسلے میں بعض شبہات ضرور پیدا ہوتے ہیں کہ جب علی عادل شاہ نے اسکو بیدر سے بلوایا ہو تو کسی دشمن نے اسکو قتل پر تیار کر کے نہ بھیجا ہو وہ خنجر کو کپڑوں میں چھپائے شاہ کی خواب گاہ میں گیا اور موقع پاتے ہی اس نے وار کر دیا۔ پھر جو بیان اس نے دیا مورخ نے وہی قلم بند کر دیا۔

یہ قیاس اس لیئے بھی قابل تسلیم ہے کہ والی بیدر خواجہ سراؤں کو بھیجنا نہ چاہتا تھا۔ اس نے علی عادل کے زور ڈالنے پر مجبور ہو کر بھیجے تھے۔ واقعہ کی نوعیت خواجہ سرا کے عمل اور بیان سے سوچی سمجھی معلوم ہوتی ہے جسکو محمد قاسم ہندو راؤ فرشتہ نے قلم بند کیا۔

بات قابل غور اس لیئے بھی ہے کہ علی عادل شاہ حسن پرست تھا۔ خواجہ سرا بھی اچھی صورت کے رکھنا چاہتا ہو گا لہذا اس نے اسکو بیدر سے بلوالیا اور وہاں سے وہ بھیجا گیا تو اس مقصد کیلیئے آمادہ کر کے پھر ایک خواجہ سرا کا انکار، کچھ سمجھ میں نہیں آتا

پھر اگر علی عادل شاہ میں یہ مرض تھا تو مقربین کو معلوم ضرور ہو گا اور ان میں بعض بڑے مقدس اور گرانقدر نام شامل ہیں جیسے فتح اللہ شیرازی، شاہ ابو القاسم آنجو، مرتضی خان آنجو، میر شمس الدین محمد صدر جہاں اور بڑے بڑے علماء اور سادات کرام۔

بہر حال قتل اپنی جگہ پر اور وجہ قتل تاریخی پھر بھی فرشتہ نے اسکو خسرو شہید کے سے کتنے ہی لفظوں سے یاد کیا شاید اسکے غیر معمولی محاسن کی بنا پر۔ علی عادل شاہ نے اپنے بعد ایک وسیع سلطنت چھوڑی۔ یہ اسکے وقار کی بات تھی کہ دو بار اکبر اعظم کے سفیر اسکے دربار میں باریاب ہوئے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی

آغاز سلطنت میں کئی سرداروں نے بغاوت کی جسکو فرد کر دیا گیا پھر مرتضی نظام نے سرحدی علاقوں پر قبضے کی کوشش کی جسکو ناکام بنا دیا گیا۔ ان مرحلوں میں چاند بی بی بھی شامل رہی۔ اسی دوران کشور خاں نے سید مصطفی خاں سپہ سالار کو دھوکا دے کر قتل کر دیا۔ یہ بات چاند بی بی کو بہت ناگوار ہوئی۔ وہ سادات کو بہت عزیز رکھتی تھی۔ اسپر کشور خاں نے چاند بی بی پر الزام لگا دیا کہ وہ بیجاپور کی وفادار نہیں، یہاں کی خبریں اپنے بھائی مرتضی کو بھجواتی رہتی ہے

نو عمر ابراہیم عادل شاہ اسکی باتوں میں آگیا اور کشور خاں نے چاند سلطانہ کو خواجہ سراؤں اور حبشیوں کے جھرمٹ میں قلعہ ستارہ بھیج دیا۔

کشور خاں سلطنت بیجاپور پر قبضہ کرنے کا پورا منصوبہ بنا چکا تھا لیکن اسکی سازش کھل گئی اور اسکو احمد نگر کی طرف بھاگنا پڑا پھر وہ قطب شاہ کی طرف روانہ ہوا مگر راستے میں ایک اردستانی کے ہاتھوں سید مصطفی کے خون کی پاداش میں مارا گیا۔ اسکے بعد کئی امراء نے بغاوتیں کیں لیکن وفاداران سلطنت نے انکو دبا دیا۔

۸۸۹ھ میں ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بڑا بیٹا محمد قلی قطب شاہ تخت نشین ہوا اور مرتضی نظام کے تعاون سے اس نے پہلے قلعہ درک فتح کرنے کی کوشش کی پھر چالیس ہزار سوار لیکر بیجاپور کی بڑھا۔ قلعہ میں تین ہزار سوار اور حبشی غلاموں کے سوا کوئی فوج نہ تھی۔ مجبوراً حبشی امراء قلعہ بند ہو گئے۔

چاند سلطانہ موجود تھی۔ اس نے ابوالحسن اور شاہ طاہر کو میر حملہ مقرر کیا۔ اس عرصے میں حملہ آوروں نے قلعہ کی دیوار ایک جگہ سے توڑ دی لیکن چاند بی بی کی سرپرستی میں اہل قلعہ نے راتوں رات وہ دیوار مکمل کر لی اس اثنا میں یہ امید بھی پیدا ہو گئی کہ صوبائی امراء کمک لے کر پہنچ جائیں گے۔ محاصرین ہر ممکن کوشش کر چکے تھے مگر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی لہذا مایوس ہو کر نظام شاہی فوج احمد نگر کی طرف واپس ہو گئی اور قلی قطب شاہ بعض علاقے فتح کرتا ہوا تلنگانہ کی طرف چل پڑا مگر اسکی ساری مساعی رائگاں گئیں۔ ابراہیم عادل شاہ نے جلد ہی اپنے علاقے واپس لے لیے۔

اب اسکو بادشاہ کی کمزوری ہی کہنا چاہیئے کہ امراء کی منہ زوری اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ علی الاعلان ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے اور بادشاہ کو خاطر میں نہ لاتے ان میں دلاور خاں اپنے

ادچھے ہتھکنڈوں کے سبب کامیاب ہوا۔ اس نے اکثر امراء کو ٹھکانے لگادیا۔ شاہ ابوالحسن کو پہلے قید کیا پھر قید ہی میں مار ڈالا، چاند سلطانہ کو نظر بند کیا اور ابراہیم عادل شاہ کو مجبور محض بنادیا۔

اکتفا صرف اسی پر نہیں کی بلکہ خطبہ ائمہ موقوف کرا کے خطبہ چار یار جاری کر دیا۔

۹۹۲ھ میں مرتضیٰ نظام نے اپنے بیٹے میران شاہ حسین کا رشتہ ابراہیم عادل کی بہن خدیجہ سلطان سے مانگا شادی کے بعد چاند بی بی سلطان عروس کے ساتھ احمد نگر روانہ ہوئی۔ پھر ابراہیم عادل شاہ ثانی کا عقد قلی قطب شاہ کی بہن سے ہوا۔

چونکہ مرتضیٰ نظام شاہ نیم دیوانہ ہو چکا تھا لہٰذا اس نے میران حسین نظام کو قید میں ڈال دیا تھا۔

اسی سال میران حسین قتل کر دیا گیا اسمٰعیل نظام تخت نشین ہوا اور جمال خاں مہدوی نے حکومت پر حاوی ہو کر مسلک مہدویہ کو رواج دیا۔ اسپر ۹۹۷ھ میں ابراہیم عادل نے پھر احمد نگر کی طرف کوچ کیا۔ بلبل خاں حبشی مضافات کی بعض بغاوتیں فرد کرنے کیلئے بھیجا گیا تھا۔ ابراہیم عادل نے کچھ دنوں قلعہ شاہ درک میں اس کا انتظار کیا پھر آگے بڑھ گیا اور جمال خاں اسمٰعیل نظام کو ساتھ لے کر مقابلے پر آگیا۔ ابراہیم عادل شاہ نے اپنی کمزوری محسوس کر کے صلح کر لی۔ اس عرصے میں بلبل خاں اس سے آملا۔

دلاور خاں اور بلبل خاں میں بڑی چشمک تھی۔ کچھ دنوں بعد دلاور نے اسپر الزام تراشی کر کے قید کر دیا پھر آنکھوں سے اندھا کر دیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایک طرف سلطنت عادل شاہیہ میں دلاور خاں نے ابراہیم عادل شاہ کو شاہ شطرنج بنا رکھا تھا، دوسری طرف احمد نگر میں ہر طرف انتشار پھیلا ہوا تھا۔ حسین نظام کا پوتا بادشاہ تو بن گیا تھا مگر عملی طور پر جمال مہدوی کے ہاتھ کا کھلونا بنا ہوا تھا۔

احمد نگر کا انتزاع سلطنت دراصل حسین نظام کے مرنے کے بعد شروع ہو گیا تھا۔ مرتضیٰ نظام نے اپنے بھائی برہان شاہ کو قید کر دیا تھا مگر وہ موقع پاتے ہی فرار ہو گیا اور اکبر اعظم کی پناہ میں چلا گیا۔ وہاں سے ایکبار وہ دکن آیا مگر کامیابی نہ ہوئی تو ابراہیم عادل شاہ سے رجوع کیا۔ اس نے والی برار کو ہموار کیا۔

جمال خاں کو اسکی اطلاع ملی تو اس نے بھی مقابلے کیلئے کوچ کیا۔ اس درمیان آہنگ خاں حبشی جمال سے ٹوٹ کر ابراہیم عادل سے آملا۔ جمال خاں موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے میدان سے ہٹکر جنگل کی طرف چلا گیا۔ دلاور خاں اسکی کمزوری کو سمجھ کر بادشاہ کی اجازت کے بغیر اسکے سر پر پہنچ گیا۔ جمال خاں کوئی راستہ نہ دیکھ کر ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ سامنے آگیا۔

بہادر دونوں تھے۔ لڑائی بڑی تیزی سے شروع ہو گئی۔ اس موقع پر دلاور خاں کی غداری نے اس سے انتقام لیا۔ عادل شاہی امراء عین الملک انکس خاں اور عالم خاں وغیرہ کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا اور اسکو دشمنوں کے نرغے میں چھوڑ دیا۔ جمال خاں اسکو کمزور پا کر ٹوٹ پڑا مگر دلاور خاں کسی طرح بچ کر نکل گیا اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

ابراہیم عادل شاہ امرائے برکی کو آٹھ ہزار سواروں کے ساتھ جمال خاں کی رسد بند کرنے کیلئے متعین کر چکا تھا اور ایک جھیل کے کنارے ٹھہرا ہوا تھا دلاور خاں نے حسب سابق حکم لگا دیا کہ اگلے دن کوچ ہوگا۔ چونکہ امرائے خاصہ خیل دلاور خاں کے تابع تھے لہٰذا ابراہیم عادل شاہ خاموش رہا لیکن اس نے وفادار امیروں کو بلا کر بعض احکام دیدئے۔

۱۴ رجب ۸۹۸ھ کو ابراہیم عادل نے خاصے کے گھوڑے طلب کیے ان پر مع غلاموں کے سوار ہوا۔ راستے میں اس نے الیاس خاں کو مع سو سواروں کے ساتھ لیا پھر عین الملک اور آنکس خاں بھی آملے اور ابراہیم عادل شاہ تین ہزار کی جمعیت سے دلاور خاں کے سر پر جا پہنچا۔

دلاور خاں محو عشرت تھا پھر بھی اسکو خبر لگ گئی اور وہ پانچ ہزار سواروں اور بکثرت ہاتھیوں کے ساتھ مقابلے پر آگیا عین الملک نے اس سے کہلوایا کہ ہم بادشاہ کے ساتھ یہاں تک آگئے تھے تم لے جانا چاہو تو لے جاؤ۔ دلاور خاں اس فریب میں آگیا صرف پانچ سو سوار اور چند ہاتھی لے کر آگے بڑھ آیا۔

جیسے ہی وہ بادشاہ کے قریب پہنچا ادک خاں خاصہ خیل نے بجلی کی طرح

کو ند کر اسپر وار کیا۔ دلاور خاں نے گھوڑا پیچھے ہٹایا لیکن ادک خاں کے دوسرے وار پر تلوار کی چمک سے گھوڑا الف ہو گیا اور دلاور خاں زمین پر گر گیا۔

اسکی فوج بادشاہ کا غیظ و غضب دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی۔ دلاور خاں مع بیٹوں کے بھاگ کھڑا ہوا۔ شاہی سواروں نے تعاقب کیا مگر وہ نکل گیا اور اس نے احمد آباد بیدر پہنچ کر دم لیا۔

کہا جاتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ سنی تھا مگر اس نے شروع میں خطبہ ائمہ اثنا عشری باقی رکھا اور خطبہ چار یار موقوف نہیں کیا مگر اذان میں علیا ولی اللہ کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح شاید وہ دونوں کو خوش رکھنا چاہتا تھا اس لئے خود اسکا کوئی خاص مسلک نہ تھا۔

دلاور خاں حبشی بیجاپور سے بھاگ کر احمد نگر بیدر میں پناہ گزیں ہوا تو برہان نظام شاہ سریر آرائے حکومت تھا۔ جمال خاں قتل ہو چکا تھا اور اسمٰعیل بن برہان مقید۔ دلاور مقرب بارگاہ بن گیا۔ ابراہیم عادل شاہ نے اس سے دلاور کی واپسی کا مطالبہ کیا جواباً دلاور خاں ۱۰۰۰ھ میں برہان نظام کو بیجاپور پر چڑھالایا اور قصبہ بنگہ تک پہنچ گیا مگر ابراہیم عادل شاہ کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ ہوئی۔

اس عرصے میں اس نے دلاور خاں سے کہلوایا کہ اسکی قیمت جانے کے بعد معلوم ہوئی، وہ چاہے تو جاہ و منصب اسی طرح موجود ہے۔ دلاور یہ خبر پاتے ہی چل پڑا اور پہنچتے ہی اسکی آنکھوں میں نیل کی سلائی پھیر دی گئی۔ چھ برس بعد ستارہ کے قید خانے میں قید ہستی سے آزاد ہوا۔

اس سے فرصت پا کر ابراہیم عادل نے برہان نظام پر توجہ دی اور وہ بیجاپوری فوجوں سے شکست پر شکست کھاتا رہا۔ آخر اس نے صلح کی درخواست کی اور وہ قبول نہ ہوئی تو قلی قطب شاہ سے سفارش کرائی اور ابراہیم عادل شاہ نے بعض شرائط کے ساتھ منظور کیا۔

پھر ابراہیم عادل شاہ نے بعض دیگر فتوحات حاصل کیں۔ اسکے بعد ہی شاہزادہ اسمٰعیل بن طہماسپ کا فتنہ کھڑا ہو گیا جسکو دلاور خاں نے قلعہ نگوان میں قید کر دیا تھا۔ بادشاہ نے اسکو آزاد کر کے ایک قلعہ میں آرام و آسائش کے ساتھ رہنے

کا بندوبست کر دیا تھا۔ اسمٰعیل نے بعض امراء کو ملا کر برہان نظام شاہ سے سازش کی برہان نظام کی فوجیں حدود بیجاپور میں داخل ہو گئیں اور ایک افراتفری کا عالم پیدا ہو گیا۔

شاہزادہ اسمٰعیل کی فوج کئی حصوں میں منقسم تھی مگر اس نے بیجاپوری لشکر کے پہنچتے ہی پرے جما لیے۔ میمنے پر خود شاہزادہ عین الملک اور دوسرے امراء کے ساتھ تھا۔ اسکو سہیل خاں خواجہ سرا نے شکست دی۔ شاہزادہ چاہتا تھا کہ بھاگ کر برہان نظام شاہ سے ملحق ہو جائے مگر وہ گھوڑے سے گر گیا اور گرفتار ہو گیا۔ برہان نظام احمد نگر واپس ہو گیا۔

عین الملک شاہزادہ اسمٰعیل کے قضیے میں مارا گیا تھا۔ اس کا بیٹا عالی شان رام راج رائے تلنگانہ کے پاس پناہ گزیں ہوا تھا اور اس کا مقرب بن گیا تھا۔ اس زمانے میں رائے تلنگانہ نے اسکے مشورے سے برہان نظام شاہ سے ایک معاہدہ کیا۔ چنانچہ حسب قرار داد ۱۰۰۳ھ میں برہان نظام نے مرتضیٰ انجو کو بارہ ہزار سوار دے کر روانہ کر دیا مگر کسی جنگ کی نوبت نہ آئی تھی کہ برہان نظام کی علالت کی خبر پہنچی اور حبشیوں اور دکنیوں نے اس فوج کو ٹھکانے لگا کر جمال خاں کی طرح اقتدار سنبھال لینے کا منصوبہ بنا لیا۔

مرتضیٰ انجو بسرعت واپس ہو گیا۔ انہیں دنوں برہان نظام کا انتقال ہو گیا اور ابراہیم نظام شاہ باپ کا جانشین ہوا چونکہ اسکی ماں حبشن تھی اس لئے حبشی اور دکنی اسکے مطیع ہو گئے۔

ابراہیم عادل شاہ کو برہان نظام کی عہد شکنی سے تکدر تھا لہذا وہ بیجاپور سے پورے جاہ و حشم کے ساتھ روانہ ہوا۔ ابراہیم عادل شاہ کا خیال تھا کہ نو عمر بادشاہ کی طرف سے دست صلح بڑھایا جائے گا مگر ایسا نہ ہوا بلکہ امراء اور عمائدین اسکو میدان جنگ میں لے آئے اور شاہ بیجاپور نے تیس ہزار سوار دے کر حمید خاں اور شجاعت خاں کو انکی طرف بڑھنے کا حکم دیدیا۔

حرب نظام شاہی کا ایک مخصوص انداز تھا کہ لشکر کے گرد اگرد توپوں اور بندوقچیوں کا حصار بنایا جاتا تھا اور ارابے زنجیروں اور رسیوں سے مضبوط کر کے

جاتے تھے۔ ایسا ہی اس موقع پر بھی ہوا۔ حمید خاں نے اپنے طور پر صفیں ترتیب دیں۔ جنگ شروع ہوئی تو احمد نگر کی توپیں آگ اگلنے لگیں جس کا جواب آلات آتشبازی سے ملا۔ پھر فوجیں ایک دوسرے سے متصادم ہو گئیں۔ بڑی ہولناک جنگ ہوئی۔ عادل شاہی فوج کو شرمناک شکست ہوئی۔ فوج کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ باقی لوگ اسی ہاتھی چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

سہیل خاں اور عنبر خاں چند امراء کے ساتھ مصروف پیکار رہ گئے اس اثناء میں ابراہیم نظام شاہ خود بہادری کے زعم میں ان پر حملہ آور ہو گیا۔ ناگاہ ایک تیر اسکے سر پر آکر لگا جس سے وہ جان بر نہ ہو سکا۔ فتح شکست میں بدل گئی اور لشکری اسکی لاش لے کر راہی احمد نگر ہو گئے۔

ابراہیم عادل شاہ نے بیجاپور کی سمت مراجعت کی تو راستے میں ماہ ذی الحج تمام ہوا۔ اس نے نہر بیورہ عبور کر کے قیام کیا اور عزاداری سید الشہداء حضرت امام حسین میں مصروف ہوا اور لوازم عاشورہ محرم الحرام بجالا کر کوچ کیا۔ بیجاپور پہنچ کر وہ نظم سلطنت کی دیکھ بھال کرتا رہا اور محرم ۹۶۵ھ میں اس دنیا سے رخصت ہوا اور اسکی جگہ علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ جس نے مغلوں سے نبرد آزمائی کی اور تاحیات اسکو جاری رکھا۔

سلطنت نظام شاہی

نظام الملک بحری کا اصل نام تیما بہت ولد بھریو تھا جو برہمنان بیجانگر کی اولاد میں تھا۔ سلطان احمد شاہ بہمنی کے عہد میں وہ مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہوا اور مشرف بہ اسلام ہو کر غلامان شاہی میں داخل ہوا۔ احمد شاہ نے اسے اپنے بیٹے محمد شاہ کو عطا کر دیا اور وہ اسکے ساتھ رہنے لگا۔ مکتب میں بھی اسکے ساتھ بیٹھتا اس لئے فارسی بھی پڑھ گیا۔

محمد شاہ بچپن میں اچھی طرح بول نہ سکتا تھا لہذا تیما بہت عرف حسن اسکے مافی الضمیر کو ادا کر دیتا تھا۔ اس طرح پہلے بھریو پھر بحری مشہور ہو گیا اور جب وہ شکاری جانوروں کا داروغہ مقرر ہوا تو اسکی سطوت و شوکت بڑھ گئی پھر اسے نظام الملک کا خطاب ملا اور وزیر اعظم خواجہ جہاں کی عنایات سے تلنگ کا صوبہ دار بنا دیا گیا۔

اب اس کا شمار امرائے کبیر میں ہوتا تھا۔ خواجہ جہاں کے قتل پر وہ ملک نائب اور سر لشکری کے منصب سے سرفراز ہوا۔ محمد سلطان محمد شاہ کے انتقال پر اس کے بیٹے سلطان محمود کا وکیل سلطنت قرار پایا۔

نظام الملک بحری کے توسط سے اس کا بیٹا ملک احمد منصب دار بنایا گیا اور پرگنات دولت آباد کی جاگیر پر اس نے زور بازو سے قبضہ کیا پھر دیگر فتوحات میں مشغول تھا کہ ملک حسن نظام الملک کے قتل کی خبر کان میں پڑی اور وہ بسرعت جنیر پہنچ گیا۔ وہاں سے قصبہ بیر، سیوکا اور پٹن کو مسخر کیا جو اس کا کار عظیم تھا اس سے پورے علاقے پر اسکی ہیبت طاری ہو گئی۔

سلطان محمود کو اس کا غلبہ پسند نہ آیا۔ بہادر الزمان شیخ مودی عرب اسکے حکم پر احمد نظام الملک کی تادیب کیلئے روانہ ہوا۔ احمد نظام شاہ جمعیت کثیر اسکے ساتھ دیکھ کر لڑائی کو ٹالتا رہا۔ ظریف الملک افغان اس کا امیر الامراء تھا، وہ اجازت لیے بغیر شیخ مودی کی طرف بڑھ گیا اور یکے بعد دیگرے اسکی دو فوجوں کو پسپا کیا۔ اسکے ساتھ صرف تین ہزار سوار تھے مگر حوصلے بڑھ چکے تھے اس لئے خود شیخ مودی سے بھی جا ٹکرایا اور باحال خراب شکست یاب ہوا۔

احمد نظام شاہ جاکنہ میں مقیم تھا۔ یہ خبر پا کر وہ نصف شب میں آزمودہ کار سواروں کو لے کر نکلا اور مودی کی سپاہ پر اس غضب کا شب خون مارا کہ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں بکھرادیں۔ شیخ مودی اور دکنی وحبشی اکثر امراء کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اب سلطان محمود نے عظمت الملک دبیر کو اٹھارہ امرائے نامدار اور لشکر جرار کے ساتھ روانہ کیا۔ احمد نظام شاہ نے ان کے ساتھ بھی اپنے طور پر جنگ کی کبھی ایک سے لڑا کبھی دوسرے سے۔ اتنی بڑی فوج متحیر تھی کہ وہ کب اور کس مقام پر ہوتا ہے سلطان محمود بہمنی نے تاخیر ہونے پر عظمت الملک کے بجائے جہانگیر خاں کو متعین کیا جو مشاہیر دکن میں تھا۔

احمد نظام شاہ اپنے میں براہ راست مقابلے کی طاقت نہ پا کر کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ منتقل ہوتا۔ آخر سر گھاٹی جیور کو مسدود کر کے اس میں استقامت

اختیار کی۔ جہانگیر خاں ہتے لگا کر اسکے قریب پہنچ گیا مگر احمد نظام شاہ بہانے بہانے ایک ماہ گزار لے گیا۔ آخر ۳ رجب ۸۹۵ھ کو اعظم خاں کو ساتھ لے کر گھاٹی سے نکلا اور بڑی تیزی سے گھوڑے دوڑاتا ہوا جہانگیر خاں کے سر پر پہنچ گیا۔

بہمنی لشکر ابھی سو کر بیدا نہ ہوا تھا کہ اس بلائے ناگہانی سے دوچار ہوا۔ جہانگیر مع تمام امراء کے مارا گیا۔ احمد نظام شاہ نے قریب کے باغ کے چاروں طرف یادگار کے طور پر چہار دیواری کھنچوادی اور آگے چل کر اسپر بلند و بالا عمارت تعمیر کرائی جو سلاطین نظام شاہیہ کی عظمت کا نشان رہی۔ اور یہی وقت ہے جب صحیح معنی میں سلطنت نظام شاہی کا قیام عمل میں آیا۔

۸۹۹ھ میں احمد نظام شاہ تسخیر دولت آباد کے سلسلے میں محمد آباد بیدر گیا پھر دولت آباد اور جنیر کے درمیان ۹۰۱ھ میں ایک شہر آباد کیا جس کا نام احمد نگر رکھا پھر یہی شہر دارالسلطنت قرار پایا۔

۹۰۵ھ میں سلطان محمود گجراتی نے برہان پور پر حملہ کیا تو عادل خاں فاروقی نے احمد نظام شاہ سے مدد مانگی اور وہ پندرہ ہزار سوار لے کر برہانپور کا عازم ہوا۔ عمادالملک بھی لشکر برار لیکر پہلے ہی سے پہنچ چکا تھا۔

احمد نظام نے پانچ ہزار پیادے توپچی اور تیرانداز رات کی تاریکی میں گجراتی لشکر کے قریب پہنچا دئے۔ ایک گجراتی فیلبان کو پہلے ہی خرید اجاچکا تھا۔ اس نے دو تہائی رات گزرنے پر اپنا مست ہاتھی کھول دیا جو چنگھاڑتا چنگھاڑتا گجراتی لشکر کو پامال کرنے لگا۔

عین اسی وقت توپچیوں نے توپوں کے فائر کیے اور تیراندازوں نے تیروں کی باڑھ ماری۔ گجراتی فوج میں قیامت برپا ہو گئی۔ سلطان محمود گجراتی کو یقین ہو گیا کہ احمد نظام شاہ بحری نے شب خور مارا ہے۔ شور و غل کی آوازوں میں ایک دوسرے کی نہ سنتا۔ ایسے میں سلطان محمود گجراتی بدحواس ہو کر نکل بھاگا۔ امرائے لشکر جب لڑنے کیلئے تیار ہوئے اور سلطان کو اپنی جگہ پر نہ پایا تو انہوں نے بھی کوچ کر دیا۔

احمد نظام شاہ بھی بسرعت اس مقام سے چل کر دولت آباد آیا اور قلعہ کا

محاصرہ کر لیا مگر سلطان محمود گجراتی کے آنے کی خبر سن کر وہاں سے ٹل گیا اور اسکے وہاں سے جاتے ہی پھر دولت اباد پہنچ گیا۔ اسی زمانے میں ملک اشرف والی دولت آباد کا انتقال ہو گیا۔ احمد نظام شاہ بحری کو باسانی اسپر قبضہ مل گیا۔

وہ ایک معرکہ سلطان محمود گجراتی سے کرنا چاہتا تھا مگر عمر نے وفانہ کی اور ۹۱۴ھ میں ہفت سالہ برہان کو ولی عہد بنا کر داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ بہت ہوش مند، بہادر، رعایا پرور اور منصف مزاج حکمراں تھا، حنفی المسلک اور کسی حد تک پابند شریعت بھی تھا۔

برہان نظام شاہ بحری

سات سال کا بادشاہ اکابر امراء کے رحم و کرم پر تخت و تاج کا مالک ہوا۔ بعض امیروں نے دعویدار سلطنت کھڑے کئے مگر کسی کی پیش نہ گئی آخر وہ عمادالملک کو تسخیر احمد نگر کیلئے چڑھالائے۔ مکمل خاں سپہ سالار خواجہ جہاں دکنی کی مدد سے صغیر سن بادشاہ کو لے کر مقابلے کیلئے نکلا اور جنگ عظیم کے بعد عمادالملک کو شکست ہوئی۔

مکمل خاں نے برہان نظام شاہ کو ساتھ لیکر تعاقب کیا۔ حاکم برہان پور نے درمیان میں پڑکر صلح کرادی۔ ۹۲۴ھ میں مکمل خاں نے پرگنہ پاتری فتح کر لیا جسپر عمادالملک نے قبضہ کر لیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد مکمل خاں پیرانہ سالی کے باعث خانہ نشین ہوا اور اس کا بیٹا مناصب جلیل سے سرفراز کیا گیا۔

۹۲۸ھ میں شاہ طاہر احمد نگر پہنچے اور برہان نظام شاہ کے ہم جلیسوں میں شامل ہوئے۔

شاہ طاہر فاطمئین مصر کی نسل سے تھے۔ ۵۶۷ھ کے بعد صلاح الدین ایوبی نے جب سادات پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تو ان کے اسلاف نے ترک وطن شروع کیا۔ ایک سید قزوین کے قریب موضع خوند میں اقامت پزیر ہوا اور سلسلہ رشد وہدایت جاری کیا شاہ طاہر تک پہنچتے پہنچتے حلقہ ارادت بہت وسیع ہو گیا۔

محبان اہل بیت کیلئے یہ زمانہ بہت صبر آزما تھا۔ مشائخ اپنا اصل عقیدہ ظاہر کیے بغیر مرید بناتے تھے۔ اللہ جل جلالہ، علی مرتضی اور اہل بیت قدسی صفات ان کا

موضوع گفتگو رہتے ۔ کسی اور کے بارے میں اچھا یا برا وہ کہتے ہی نہ تھے ۔ صفی الدین
اردبیلی کی خانقاہ کا بھی یہی انداز کار تھا اور دوسرے سجادہ نشینوں کا بھی جن میں شاہ
طاہر اور ان کے اجداد بھی تھے ۔

۹۲۶ ھ میں شاہ طاہر میرزا شاہ حسین کے ذریعے صفوی دربار تک پہنچے اور
منصب تدریس کا شان پر متعین ہوئے ۔ جلد ہی ان کے گرد عقیدتمندوں کا ہجوم
ہونے لگا ۔ اس سے بعض مقامی رئیسوں کو حسد پیدا ہوا کہ لوگ انکی محفلوں کو
چھوڑ کر شاہ طاہر کی مجلس میں ادب سے جا بیٹھتے ہیں پھر شاہ طاہر اپنے نسب کو
فاطمئین مصر سے ملاتے تھے مگر تبلیغ آل رسول کے مسلک کی کرتے تھے کیونکہ یہی
مسلک مصر کے آخری خلیفہ کا تھا ۔

اس سے رئیسوں نے شاہ طاہر پر اتہام تراشی کی اور شاہ اسمٰعیل صفوی کو
لکھا کہ وہ عقائد باطلہ کی اشاعت کرتا ہے ۔ شاہ اسمٰعیل نے اسکی گرفتاری کا حکم
دیدیا جسکی اطلاع میرزا شاہ حسین نے شاہ طاہر کو دیدی اور وہ فرار ہوگئے ۔ ایک کشتی
میں اہل وعیال کے ساتھ عازم ہندوستان ہوئے اور کشتی نے انہیں بندر گوہ پہنچا
دیا جہاں سے وہ بیجاپور آئے مگر اسمٰعیل عادل شاہ نے ان پر توجہ نہ کی تو حج وزیارت
کو چلے گئے ۔ واپسی پر قلعہ پرندہ پہنچے جہاں کا حاکم مخدوم خواجہ جہاں دکنی تھا ۔ اس
نے انہیں برہان نظام شاہ کی خدمت میں باریاب کیا ۔

شاہ طاہر نے سب سے پہلے صحت عقائد پر توجہ دی اور دلائل وبراہین سے
مذہب مہدیت کا بطلان کیا پھر ۹۳۰ ھ میں برہان نظام شاہ اور اسمٰعیل عادل شاہ کی
ملاقات کرائی اور آپس میں رشتہ داری قائم کرائی جسکے نتیجے میں ۹۳۱ ھ میں ایک
جنگ ہوئی جس میں برہان نظام شاہ کو شکست ہوئی ۔

پھر امیر برید کو ساتھ لیکر برہان نظام نے ایلچپور فتح کیا ۔ عماد الملک برہانپور سے
سلطان محمد شاہ فاروقی کو مدد کیلئے لایا مگر دونوں منہزم ہوئے ۔ انہوں نے سلطان
بہادر شاہ گجرات کے پاس مدد کیلئے سفارت روانہ کی ۔ وہ خلجی سلطان پر فتح پاکر مغل
سلطنت کا ہمسر ہونے کا خواب دیکھ رہا تھا ۔ اس استدعا پر پھولا نہ سمایا اور پورے
دکن کو مسخر کرلینے کا خواب دیکھنے لگا اور ۹۳۵ ھ میں سلطان پور کے راستے سے دکن

میں وارد ہوگیا ۔

برہان نظام شاہ نے اسمٰعیل عادل شاہ سے اعانت حاصل کی اور اکاد کا
لڑائیوں میں عماد الملک اور سلطان محمد شاہ کو پسپا کیا مگر سلطان بہادر کا لشکر ایک
بحر ذخار کی طرح تھا ، اس کا مقابلہ وہ کیا کرتا لہذا میدان چھوڑ دیا اور دوبارہ اسمٰعیل
عادل شاہ سے مدد مانگی ، اس نے مزید پانچ ہزار سوار بھیج دئے لیکن گجراتی لشکر کے
سامنے اس مجموعی فوج کی حقیقت کیا تھی ۔ اگر بات صرف شجاعت کی ہوتی تو برہان
نظام اور علی برید کم نہ تھے مگر تعداد افواج توپخانے اور ہاتھیوں پر وہ غالب کیونکر
آتے لہذا صلح کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا ۔

اس مرحلے میں شاہ طاہر نے بہت مدد کی ۔ سفارت کے فرائض بڑی خوبی سے
انجام دئے ۔ برہان نظام شاہ کو لے جاکر سلطان بہادر سے ملوایا اور سلطان بہادر نے
برہان شاہ کو خطاب شاہی کے ساتھ چتر زرنگار اور پرچم عنایت کیا ۔

۹۳۸ ھ میں نظام برہان سے اسمٰعیل عادل شاہ کی جنگ ہوئی جس میں سپاہ
احمد نگر نے شکست کھائی ۔ ۹۳۹ ھ میں دونوں کے مابین صلح ہوگئی اور اسکے بعد ہی
اسمٰعیل عادل شاہ کا انتقال ہوگیا ۔

کچھ دنوں بعد برہان نظام کا سب سے چھوٹا بیٹا شہزادہ عبدالقادر تپ محرقہ
میں مبتلا ہوا اور اسکے بچنے کی کوئی امید نہ رہی اور بادشاہ بالکل مایوس ہوگیا تو شاہ
طاہر نے دبی زبان سے کہا ۔

اگر شاہزادے کا بخار ایک رات میں اتر جائے تو آپ وعدہ کریں کہ زر خطیر
آئمہ معصومین کے نام پر سادات میں تقسیم کریں گے ۔

" یہ آئمہ معصومین کون ہیں ؟ " برہان نظام نے پوچھا اور شاہ طاہر نے سرور
کائنات فاطمہ زہرا ، حضرت علی اور دوازدہ آئمہ کے حالات بے کم وکاست بیان
کردئے اور جب برہان نظام نے وعدہ کرلیا تو اسی تسلسل میں کہا ۔ صرف اتنا ہی نہیں
بلکہ اپنا اعتقاد بھی درست کریں گے اور آل رسول کے مسلک کی اشاعت پر توجہ
فرمائیں گے ۔ "

برہان نظام کو بچنے کی کوئی امید نہ تھی پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ اولاد رسول

اتنی بابرکت ہے تو وہ دوسروں کا دامن کیوں تھامے رہے اس نے ہر قسم کا وعدہ کرلیا پھر شاہ طاہر نے دعا پڑھ کر اسپر پھونکی اور ایک نظر اسپر ڈال کر چلے گئے ۔ برہان نظام شاہزادے کو ایک رات کا مہمان سمجھتا تھا اس لئے خود بھی اسکے قریب بیٹھے بیٹھے سو گیا تو خواب میں دیکھا کہ ۔

" ایک بزرگ نمودار ہوئے جنکے داہنے بائیں بارہ آدمی دکھائی دئے ۔ بزرگ کے چہرے کی جلالت سے برہان نظام مودبانہ کھڑا ہو گیا کہ ایک آواز کان میں پڑی ۔ جانتا ہے کہ یہ کون ہیں ؟ حضرت رسالت پناہ ہیں اور یہ بارہ نفوس انکی اولاد میں ہیں جو دوازدہ امام کہلاتے ہیں ۔ برہان نظام قدموں پر گرجانا چاہتا تھا کہ بزرگ نے فرمایا حق سبحانہ تعالی نے علی اور ان کے فرزندوں کی برکت سے تیرے بیٹے کو شفا دی ۔ تجھے چاہئے کہ میرے بیٹے طاہر کے کہنے پر عمل کرے ۔"

اسکے بعد وہ سب نظروں سے اوجھل ہوگئے اور برہان نظام شاہ کی آنکھ کھل گئی ۔

عبدالقادر تپ کی شدت میں لحاف اپنے اوپر ڈالنے نہ دیتا تھا مگر اس وقت برہان نظام شاہ نے دیکھا تو لحاف اسپر پڑا ہوا تھا ۔ اس نے پوچھا کہ لحاف کس نے ڈالا جواباً ہر ایک نے انکار کیا بلکہ دور بیٹھی ہوئی دایہ نے کہا ۔

" میں اسکی طرف دیکھ رہی تھی کہ لحاف خود بخود الٹ کر اسکے اوپر جا گرا "

اب برہان نظام اسکو اس حالت میں دیکھ کر بوکھلا سا گیا ۔ شکر کے الفاظ اسکے منہ سے نکلے پھر وہ کافی دیر تک خاموش رہا اور جب خوشی کا غلبہ کچھ کم ہوا تو اس نے طاہر شاہ کو بلانے کیلئے آدمی بھیجے ۔ انہوں نے انکو سجادہ عبادت پر پایا جو رات بھر دستار ہاتھوں پر رکھے محو دعا رہے تھے ۔ ایک آدمی کے بلا فوراً دوسرا پہنچا تو انہیں شک ہوا کہ شاید انکی دعا قبول نہیں ہوئی پھر بھی وہ شکر الہی کرتے ہوئے چل پڑے اور برہان شاہ ان کو دیکھتے ہی چیخ سا پڑا ۔

میں آئمہ اثنا عشر کا مذہب اختیار کرتا ہوں ۔

طاہر شاہ کو خدا کی رحمت پر یقین کلی تھا پھر بھی بشریت کے تقاضے سے ایک وغدغہ سا لگا ہوا تھا ۔ انہوں نے اسی وقت مصلی منگوا کر پہلے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی پھر برہان نظام شاہ سے تفصیل دریافت کرنے لگے ۔ اتنے میں شہزادہ اٹھ کر آہستہ

خود باہر آگیا طاہر شاہ نے اسکی پیشانی کا بوسہ لیا پھر برہان نظام سے پورا واقعہ سنا اور اسکو بتایا ۔

" آل محمدؐ کے دوستوں سے دوستی اور دشمنوں سے دشمنی رکھئے یہی ہمارا مذہب ہے "۔

پھر انہوں نے بادشاہ کو مشورہ دیا ۔

" عجلت نہ فرمائیں ۔ مسلمانوں کے ہر مسلک کے علماء کو طلب کیجئے، ہر نظریہ فکر کے دلائل و براہین سماعت فرمایئے پھر فیصلہ کیجئے ۔ اعجاز دل پر صداقت کا سکہ ضرور بٹھا دیتا ہے لیکن عقل سے بھی اس مسلک کو سمجھنا ضروری ہے جسکو آپ اختیار کرنے جا رہے ہیں ۔"

برہان نظام شاہ نے اسی پر عمل کیا ۔ ملا پیر محمد استاد، افضل خاں ثانیہ، ملا داؤد دہلوی اور دوسرے تمام علماء جو احمد نگر میں موجود تھے بلائے گئے ۔ سب نے ایک دوسرے سے مناظرہ کیا اور اپنے مذہب کو برحق قرار دیا ۔ تب برہان نظام نے طاہر شاہ سے کہا : "ان کے علاوہ کوئی اور مذہب ہے "

طاہر شاہ نے بتایا: " پانچواں مذہب شیعہ ہے جو آئمہ اثنا عشر کو مانتا ہے "

شیخ احمد نجفی کو پہلے سے بلا لیا گیا تھا ۔ اس نے مذاہب اربعہ سے مناظرہ کیا کوئی قائل ہوا یا نہیں لیکن اکثر مقامات پر لوگوں کی زبانیں بند ہو گئیں پھر شاہ طاہر نے کتب اہل سنت کے حوالوں سے بحث کی، واقعہ قرطاس اور مسئلہ فدک کے ساتھ حدیث توریث کا حوالہ دیا کہ رسول اکرمؐ نے ایک طرف بیٹی کو ہبہ نامہ لکھ کر دیدیا دوسری طرف حضرت ابو بکرؓ کے بیان کے مطابق ان سے یہ کہہ دیا کہ انبیاء اپنی میراث نہیں چھوڑتے لیکن نہ ماننے والے سے کوئی بات منوائی نہیں جا سکتی ۔ مجبوراً خود برہان نظام شاہ نے اپنا خواب بیان کیا اور عبدالقادر کے بارے میں بتایا کہ ایک عرصے کی تپ محرقہ ایک ساعت میں غائب ہو گئی ۔

اسپر اکثر علمائے مجلس، مقربان بارگاہ، غلامان ہندی و حبشی اور دیگر متعلقین اسی وقت دائرہ شیعیت میں داخل ہو گئے، خطبے سے اصحاب ثلاثہ کے نام نکال دئے گئے اور آئمہ اثنا عشر کے اسمائے مقدس سرور کائنات کے بعد بڑھا دئے گئے ۔

ملا پیر محمد نے باہر نکل کر برہان نظام کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور کوئی بارہ ہزار سواروں اور پیادوں نے قلعہ کو گھیر لیا۔ برہان نظام شاہ نے صورت حال سے آگاہ ہو کر قلعے کے دروازے بند کرا دئے اور فصیل پر توپیں چڑھوا دیں پھر برہان نظام شاہ چار سو سوار، ایک ہزار پیادے اور پانچ ہاتھی لیکر چتر سبز اور علم لیکر قلعہ سے برامد ہوا پھر ایک جماعت نے آگے بڑھ کر اعلان کیا۔

جو سرکار کا دولت خواہ ہو، وہ چتر ورایت کے سایے ہیں چلا آئے"

اسپر اکثر امراء اور افسران فوج ادھر سے ٹوٹ کر ادھر آگئے اور ملا پیر محمد ایک قلیل سپاہ کے ساتھ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ برہان نظام شاہ نے بعض افسروں کو بھیج کر اسکو گرفتار کرایا اور قتل کا حکم دیدیا مگر طاہر شاہ کی سفارش پر قید کرنے پر اکتفاء کی اور چار سال بعد رہا کر دیا۔(۷۸)

برہان نظام شاہ نے خواب دیکھنے کی جگہ پر ایک عمارت عالی تعمیر کرا دی جس میں حسین نظام نے مسجد کا اضافہ کیا۔

اسکے بعد برہان نظام شیعیت کے فروغ میں ہمہ تن مصروف ہو گیا لیکن کسی پر جبر نہیں کیا جسکے نتیجے میں لوگ خود اس عقیدے کو قبول کرتے رہے۔ اس میں شاہ طاہر اور دوسرے علماء کی تقریروں نے بھی اہم کردار ادا کیا کیونکہ لوگوں کو حقیقت کا علم ہی نہیں تھا جب معلوم ہوا تو ذہنی انقلاب آیا۔

آج بھی یہی کیفیت ہے کہ روشنی پر پردے ڈال دئے جاتے ہیں اور غلط باتیں منسوب کرکے جھوٹی روایات کا سہارا لیا جاتا ہے پھر تاکید یہ کی جاتی ہے کہ خبردار شیعوں کی مجلسوں میں نہ جانا، اس سے بغض صحابہ پیدا ہوتا ہے میں پوچھتا ہوں کہ کیا کیا ہے صحابہ نے جو ان سے بغض پیدا ہوگا؟ اگر کچھ نہیں کیا ہے تو ڈرنا کیا

ان حالات کی شہرت ہوئی تو سلطان محمود گجراتی، میران مبارک شاہ فاروقی،

ابراہیم عادل شاہ اور عمادالملک نے باہم ایک منصوبہ بنایا کہ احمد نگر فتح کرکے آپس میں تقسیم کر لیں۔ اس خبر پر برہان نظام شاہ نے سلطان گجرات اور برہان پور کو تحائف بھیج کر ہموار کر لیا اور اسی درمیان ابراہیم عادل شاہ نے جو شیعہ سپاہی اور ... انداز تعصب میں برطرف کیے تھے ان سب کو اپنے پرچم کے نیچے جمع کر لیا اور ابراہیم

عادل شاہ کے حملے سے قبل خود بیجاپور کی طرف چل پڑا۔

احمد نگر اور بیجاپور کی فوجوں میں ایک ہولناک جنگ ہوئی جس میں ابراہیم عادل شاہ ہزیمت یاب ہوا۔ سو ہاتھی اور کئی توپخانے برہان نظام شاہ کے ہاتھ آئے۔ پھر چار سال کی مدت میں کئی لڑائیاں ہوئیں اور ہر مرتبہ برہان نظام شاہ کامیاب ہوا

۹۳۹ھ میں ابراہیم عادل شاہ اور اسد خاں کے درمیان نااتفاقی ہو گئی جو بیجاپور کی طرف سے قلعہ نلکوان کا حاکم تھا تو برہان نظام شاہ امیر برید کے تعاون سے بیجاپور کی طرف بڑھا اور یہ مشہور کر دیا کہ اسد خاں نے ہم مذہب ہونے کی بنا پر قلعہ نلکوان حوالے کرنے کیلئے بلایا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ کو یقین ہو گیا، وہ مقابلے پر نہیں آیا

برہان نظام شاہ نے شوالاپور کے قریب پانچ پرگنوں پر قبضہ کیا پھر ولایت مرچ کلہرا، مان اور باس کو تاراج کیا۔ اس موقع پر اسد خان واقعی اس سے آملا کیونکہ اسپر جو تہمت لگائی گئی تھی اسکے سبب وہ عادل شاہ کے پاس نہ جاسکتا تھا۔ چھ ہزار سوار اسد خاں کے ساتھ تھے اس سے برہان نظام کی طاقت بڑھ گئی۔ ابراہیم عادل شاہ اسکے مقابلے کی تاب نہ لاسکتا لہذا احسن آباد گلبرگہ کی طرف چلا گیا اور برہان نظام نے اس کا تعاقب کیا۔

اس عرصے میں عمادالملک بیجاپور کی مدد کو آگیا تو اسد خاں بھی اس سے جاملا اور برہان نظام کمزور پڑ گیا۔ ابراہیم عادل شاہ مقابلے پر آیا تو وہ دولت آباد کی طرف ہٹ گیا اس درمیان امیر برید کا انتقال ہو گیا تو برہان نظام نے صلح کر لی۔

۹۵۰ھ کے بعد برہان نظام اور عادل شاہ میں جنگ ہوئی جس میں پہلے احمد نگر کو کامیابی ہوئی پھر اس نے شکست کھائی۔ چونکہ علی برید اپنے باپ کی روش کے خلاف بیجاپور سے جاملا تھا لہذا فرصت پاتے ہی برہان نظام شاہ نے علی برید کے قلعوں میں اوسہ کو مسخر کیا۔ اس اثناء میں علی برید نے مدد کیلئے ابراہیم عادل کو بلا لیا مگر برہان نظام نے دونوں کو شکست دی پھر یکے بعد دیگرے کئی قلعے فتح کر لیے اور قلعہ قندھارا کی طرف متوجہ ہوا۔ علی برید اور ابراہیم عادل نے ایکبار پھر مقابلہ کیا اور کافی گھوڑے ہاتھی چھوڑ کر میدان سے بھاگنا پڑا۔

۹۵۶ھ میں شاہ طاہر نے رحلت فرمائی۔ ایک متجر عالم حدیث دفقہ اور تفسیر

میں کامل، ریاضی اور دیگر علوم میں ماہر ایسے باکمال کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔

اسکے بعد برہان وابراہیم ایک بار پھر ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہوئے اور عید کے دن برہان نظام نے حملہ کرکے لشکر عادل شاہی تباہ کیا اور قلعہ کلیان و پرندہ فتح کیے پھر رام راج سے صلح کرکے قلعہ شوالاپور پر قبضہ کیا اور رام راج نے رائچور اور مدگل کو مسخر کرلیا۔

۹۶۰ھ میں برہان نظام نے بیجاپور کے بعض پرگنے فتح کیے، ۹۶۱ھ میں بیجانگر کی فوجوں کو ملاکر بیجاپور کا محاصرہ کیا۔عادل شاہ تاب مقابلہ نہ لاکر بنانہ کی طرف بھاگ گیا۔اسی دوران برہان نظام شاہ بحری اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔اسکی لاش امانتاً رکھوادی گئی پھر کربلائے معلیٰ لے جاکر دفن کی گئی۔

حسین نظام شاہ بحری

بھائیوں اور بعض امراء کی مخالفت کے باوجود وہ تیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور آہستہ آہستہ ہر خلفشار پر اس نے قابو پالیا۔اس کا سب سے بڑا مخالف ابراہیم عادل شاہ تھا۔وہ اپنے مقبوضات واپس لینے کی خاطر حملہ آور ہوا مگر حسین نظام کی تدبیر یا مقدر کی خوبی سے شکست کھائی۔پھر ابراہیم قطب شاہ سے اسکی سخت جنگ ہوئی۔گولکنڈہ کے سپہ سالار قبول خاں نے شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ بعض امرائے نظام شاہیہ مارے گئے اور انکی فوجوں کو فرار ہونا پڑا۔

آخر حسین نظام نے ابراہیم قطب شاہ سے صلح کرلی اور کچھ دنوں بعد اسکے تعاون سے قلعہ گلبرگہ پر ہلہ بولا۔

ابراہیم عادل شاہ کا انتقال ہوچکا تھا۔علی عادل شاہ کا عہد تھا۔گلبرگہ کا قلعہ حسین نظام کے حصار میں تھا۔فتح قریب تھی کہ قطب شاہ کچھ سوچ سمجھ کر ساتھ چھوڑ گیا تو حسین نظام بھی احمد نگر کی طرف پلٹ گیا۔

۹۶۶ھ میں حسین نظام نے عماد الملک کی بیٹی سے عقد کرکے اس سے رشتہ ہموار کیا۔۹۶۷ھ میں قلعہ کالند فتح کیا۔اس عرصے میں علی عادل شاہ رام راج راجے بیجانگر سے تعلقات استوار کرکے احمد نگر فتح کرنے کا عازم ہوگیا اور اسکے ساتھ ہی ابراہیم قطب شاہ کو بھی اس نے ملالیا۔جب یہ متحدہ لشکر جرار احمد نگر کے قریب

پہنچا تو وہ پٹن کی طرف چلاگیا تاکہ دریا عماد الملک، میران مبارک فاروقی اور علی برید سے مدد حاصل کرے۔اس مدت میں رام راج نے احمد نگر فتح کرکے اسکو تباہ و برباد کرڈلا۔حسین نظام سے کچھ اور نہ بنا تو بیجاپور کی سرحدوں کو پامال کرنا شروع کردیا۔

حسین نظام کیلئے اسکے علاوہ کوئی راستہ نہ رہ گیا تھا کہ رام راج سے صلح کی درخواست کرے۔اس نے تین شرطیں رکھیں: قلعہ کلیان اسکو دیا جائے، جہانگیر خاں کو قتل کیا جائے جس نے بیجانگر کے لشکر کو بہت نقصان پہنچایا تھا اور حسین نظام خود رام راج کی خدمت میں حاضر ہوکر اسکے ہاتھ سے پان کا بیڑا کھائے۔

برہان نظام کے بہادر بیٹے کے سامنے دو راستے تھے: ایک سلطنت احمد نگر سے دست برادری، دوسرا ایک یار وفادار کا خون! وہ مسلسل سوچتا رہا مگر خود اپنے ہاتھوں جہانگیر خاں کا قتل اتنا آسان تو نہ تھا تاہم اسکو منظور نہ کرنے کی صورت میں پوری سلطنت کی تباہی، لاکھوں مسلمانوں کا خون اور تمام مساجد کا انہدام جس کا اندازہ تسخیر احمد نگر میں ہوچکا تھا۔آخر ان تمام باتوں کو ایک طرف رکھ کر اس نے جہانگیر خاں کے سر سے ان کا توازن کیا تو جہانگیر خاں کے سر کا پلڑا بہت ہلکا معلوم ہوا اور اس نے رام راج کی شرطیں مان لیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ باوفا اور شجاع جہانگیر خاں حسین نظام کی بزدلی کی بھینٹ چڑھ گیا لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو حسین نظام کی بے چارگی اسی کی مقتضی تھی اور دور اندیشی کا مطالبہ بھی یہی تھا۔سلطنت احمد نگر کی بقاء سے کتنے ہی جہانگیر خاں پیدا ہوسکتے تھے۔سلطنت پر برہمن مسلط ہوجاتے تو مسلمانوں اور ان کے مذہب کا خدا حافظ تھا۔

حسین نظام قلعہ کلیان کی چابیاں اور جہانگیر خاں کا سر لے کر رام راج کی بارگاہ میں حاضر ہوگیا اور اسکے ہاتھ سے لیکر پان بھی کھالیا جو اسکے عقیدے میں نجس تھا لہذا اسی وقت طشت اور آفتابہ منگواکر کلی کی اور ہاتھ غوطہ کیا۔

رام راج کے تیوروں پر بل پڑگئے اور وہ کالے سانپ کی طرح پیچ و تاب کھانے لگا اور اس نے بھی طشت و آفتابہ منگواکر ہاتھ دھولیا گویا وہ بھی حسین نظام کو ناپاک سمجھتا ہے۔پھر اس نے قلعہ کلیان کی چابیان علی عادل شاہ کو بھجوادیں۔

حسین نظام نے زہر کا یہ گھونٹ پی تو لیا تھا لیکن ضمیر کی آواز پر بہت دنوں تک سو نہ سکا۔ اب اسکے سامنے دو مقصد تھے علی عادل شاہ سے انتقام لینا اور متکبر رام راج کو سزا دینا لیکن اسکی فوجی طاقت اتنی نہ تھی کہ بیک وقت ان دونوں سے نبرد آزما ہو سکتا اس لئے قلعہ کی درستی کے بعد اس نے سب سے پہلے لشکر پر توجہ کی۔

۹۷۰ھ میں اس نے اپنی بیٹی بی بی جمال کی شادی ابراہیم قطب شاہ سے کی اور اس سے ایک مضبوط رشتہ قائم کیا پھر قلعہ کلیان کو مسخر کیا اور علی عادل شاہ اور رام راج کی فوجوں سے سخت ٹکر لی مگر برسات کے سبب توپخانہ دلدل میں پھنس گیا اور حسین نظام اور ابراہیم قطب شاہ دونوں کو شکست ہوئی اور سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

فوجیں تعاقب میں تھیں مگر حسین نظام نماز ظہر کا وقت آنے پر گھوڑے سے اتر پڑا، سپاہیانہ لباس علیحدہ کیا اور نماز ادا کرکے پھر سوار ہو گیا۔ تعاقب میں آنے والے فوجی قریب آنے کی جرئت نہ کرسکے اور وہ گھوڑے پر روانہ ہو گیا۔

رام راج، علی عادل شاہ، برہان عمادالملک اور علی برید کی افواج بڑھتی ہی رہیں۔ مجبوراً حسین نظام پھر احمد نگر کو خدا پر چھوڑ کر جنیر کی طرف ہٹ گیا۔ اس مرتبہ رام راج کے لشکر نے پہلے سے زائد احمد نگر کو لوٹا اور اتنی بربادی کی کہ مسجدیں کھنڈر بن گئیں۔ حسین نظام نے جہانگیر خاں کا خون جن باتوں سے بچنے کیلئے دیا تھا وہی سب کچھ عمل میں آیا اور وہ نقصان مایہ اور شمات ہمسایہ دونوں میں بستلا ہوا۔ حسین نظام نے بھی اپنی قوت کے بقدر بیجاپوری علاقوں کو تاراج کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا لیکن اس سے اس غارت گری کا بدل تو نہ ہو سکتا جو علی عادل شاہ کی لائی ہوئی بلا رام راج کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوئی تھی۔

اس کا احساس خود علی عادل شاہ کو بھی تھا۔ آخر وہ اعمال ماضی کا کفارہ ادا کرنے پر تیار ہوا۔ حسین نظام کو اس سے نفرت تھی مگر بات آگئی تھی کفر و اسلام کی لہذا وہ رام راج کے خلاف اتحاد کرنے پر تیار ہو گیا اور اس نے تمام مسلم سلاطین کو ایک پرچم تلے جمع کر لیا۔

میدان تالی کوٹہ کی خوفناک جنگ دکن کی تاریخ میں کفر و اسلام کی سب

سے بڑی جنگ تھی جس کا عنوان حسین نظام نے جہانگیر خاں کے خون سے لکھا تھا لیکن اس کا کم سے کم نتیجہ یہ نکلا کہ اسکے بعد کئی صدیوں تک اس سرزمین پر اسلام کا پرچم لہراتا رہا۔

رام راج اور اسکی سلطنت نیست و نابود ہو گئی اور پھر اسکی اولاد مسلمانوں کے رحم و کرم پر زندہ رہی۔ وقتی طور پر مورخ نے حسین نظام کو مطعون کیا کہ اس نے رامراج کو خوش کرنے کیلئے خود اپنے سرفروش کا خون کر دیا لیکن اگر حسین نظام رام راج کی شرائط قبول نہ کرتا اور احمد نگر میں برہمن راج قائم ہو جاتا تو عادل شاہی حکومت کتنے دن زندہ رہتی جس کا ایک حصہ رامراج پہلے ہی ہڑپ کر چکا تھا اور گولکنڈہ بھی اپنے سرحدی علاقے کھو چکا تھا، انجام یہ ہونا تھا کہ بیجانگر کی سرحدیں پھیلتی جاتیں اور دکن کی پوری بساط پر بتخانے ہی بتخانے نظر آتے جن کا توڑ ڈالنا مغلوں کیلئے آسان نہ ہوتا اس لئے زائد سے زائد حسین نظام کے عمل کو خود غرضانہ دور اندیشی کا نام دیا جاسکتا ہے جس کا دوررس نتیجہ محاربہ تالی کوٹہ میں برآمد ہوا۔

اس جنگ میں یوں تو دکن کے تمام مسلم سلاطین شامل تھے لیکن ان کا ہیرو رام راج کے ہاتھوں کئی بار کا شکست خوردہ حسین نظام شاہ بحری تھا۔

جنگ سے فارغ ہو کر حسین نظام بڑے فخر و مباہات کے ساتھ احمد نگر واپس ہوا لیکن اسکی زندگی نے وفا نہ کی اور چند ہی روز بعد وہ ابدی آرام گاہ کی طرف سدھار گیا۔ شاید اس کا مقصد حیات پورا ہو چکا تھا اور اب دکن کو اسکی ضرورت نہ رہی تھی۔

مرتضیٰ نظام شاہ بحری

شہرہ آفاق حسین نظام کے بیٹے میں باپ کی سی صلاحیت نہ تھی۔ اسکی ماں خونزہ ہمایوں بھی شوہر کے بعد امور سلطنت میں دخیل ہو گئی تھی۔ اس نے علی عادل شاہ کے حملوں کا توڑ کیا اور دونوں میں صلح کرا دی پھر دونوں نے مل کر برار پر حملہ کیا کیونکہ اس نے رام راج کے مقابلے میں کوئی تعاون نہ کیا تھا۔ اس حملہ میں برار کو بہت نقصان پہنچا اور دونوں بادشاہ انتقام لے کر واپس ہو گئے۔

۹۷۵ھ میں علی عادل شاہ نے نظم مملکت کمزور پڑ جانے کے سبب کئی علاقے

فتح کرلیے ۔ مرتضیٰ نظام نے حقیقت سے مطلع ہو کر ماں کو بڑے احترام کے ساتھ نظر بند کر دیا ۔اس نے خود مرتضیٰ کو گرفتار کرلینے کا بندوبست کیا اور امرائے احمد نگر میں سخت کھینچا تانی ہونے لگی جسکے نتیجے میں سلطنت کمزور پڑ گئی ۔آخر مرتضیٰ نظام نے اپنی والدہ کو گرفتار کرا لیا۔

سلطنت کی اس بد نظمی سے عادل شاہی امیر کشور خان نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور ایک بڑے لشکر کے ساتھ حدود نظام شاہی داخل ہو گیا۔ مرتضیٰ نظام شاہ ۹۸۰ھ میں اسکی سرکوبی کیلئے روانہ ہوا تو وہ قلعہ دارور میں محصور ہو گیا جو ہر طرح مضبوط و مستحکم تھا۔ نظام شاہی لشکر کے قریب پہنچتے ہی اندر سے گولہ باری اور تیروں کی بوچھار ہونے لگی ۔امراء کی رائے تھی کہ پیچھے ہٹ کر توقف کیا جائے مگر مرتضیٰ نظام جوش غضب میں بڑھتا چلا گیا۔ کئی گولیاں اسکو مس کرتی ہوئی گزر گئیں مگر اس نے پرواہ نہ کی۔

آخر نظام شاہی لشکر بھی تیر اندازی کرتا ہوا بڑھا۔ شدید جنگ ہوئی ایک تیر کشور خاں کو جا کر لگا اور وہ موقع ہی پر گر گیا پھر اسکے ساتھ والوں کے حوصلے پست ہو گئے اور مرتضیٰ نظام قلعہ میں داخل ہو گیا۔

کشور خاں کے بعد دو عادل شاہی امیر عین الملک اور نور خاں دس بارہ ہزار سواروں کے ساتھ احمد نگر کی طرف بڑھے ۔انہیں گھیر کر زندہ پکڑ لیا گیا۔ نظام شاہ کے دل میں علی عادل شاہ سے کدورت پیدا ہو گئی مگر شاہ ابوالحسن نے سفارت کے فرائض انجام دے کر اسے دور کر دیا۔

انہیں دنوں ساحل پر قلعہ ریکندہ کے مغربی عیسائیوں نے مسلمانوں کو بہت پریشان کیا۔ مرتضیٰ نظام نے خود جا کر ان کا محاصرہ کیا یہ قلعہ جدید الات حرب سے مسلح تھا توپ کی ضربوں اور گولوں سے کافی مسلمان شہید ہو گئے نظام شاہ کے بعض غدار امیر چوری چھپے انہیں ضروریات کی چیزیں پہنچا دیتے تھے ۔

مسلمان جو فرنگیوں کی قید میں تھے ان میں سے دو مسلمان دیواریں پھاند کر نکل آئے ۔انہوں نے سارا حال مرتضیٰ نظام سے کہہ سنایا اور وہ طویل محاصرہ سے تنگ آ کر احمد نگر واپس ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے تمام امراء کو محبوس کیا اور چنگیز خاں

کو بلند مرتبہ بنایا۔

برار میں عماد الملک کے مرنے کے بعد برہان عماد الملک برائے نام بادشاہ تھا ۔سارے اختیارات تغال خاں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے ۔ مرتضیٰ نظام نے اسکو لکھا کہ برہان عماد الملک اب بڑا ہو گیا ہے شاہی اختیارات سے اسکے حق میں دست بردار ہو جائے مگر اس نے جواب سخت دیا تو مرتضیٰ نظام نے چنگیز خاں کو متعین کیا۔

تغال خاں اور اسکا بیٹا شمشیر الملک ایک لشکر گراں لیکر مقابلے پر آئے ۔ زبردست جنگ واقع ہوئی مگر چنگیز خاں بھوکے شیر کی طرح حملے پر حملے کرتا رہا۔ انجام کار دونوں باپ بیٹے شکست کھا کر بھاگے ۔ دو سو ستر منتخب ہاتھی چنگیز خاں کے ہاتھ آئے

تغال خاں فرار ہو کر کسی نہ کسی طرح برار جا پہنچا ۔ مرتضیٰ نظام نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا مگر اس کا فتح ہونا اسان نہ تھا لہذا چنگیز خاں نے مکر و حیلہ کر کے اسکو فتح کیا اور تغال خاں کو گرفتار کر کے قید کر دیا ۔ مرتضیٰ نظام نے اس مملکت کو اپنے امیروں میں بانٹ لیا اور بیدر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسکے بعد ہی محمد شاہ فاروقی نے برہان عماد الملک کو دریا عماد الملک کا خطاب دیکر تخت برار پر بٹھا دیا۔ امرائے نظام شاہی سے کئی جنگیں ہوئیں جن میں فاروقی کو شکست ہوئی لیکن دریا عماد الملک برار کے ایک حصے پر قابض رہا۔

"اسکے بعد مرتضیٰ نظام شاہ خبط یا خلل دماغ کے سبب سولہ سال تک گوشہ نشین رہا اور مہمات ملکی تمام کے تمام اراکین دولت انجام دیتے رہے ۔ ایک یا دو خدمتگاروں کے علاوہ کوئی اسکے پاس جا نہ سکتا۔ جب کوئی اہم مرحلہ درپیش ہوتا مرتضیٰ نظام اندر ہی سے اسکی ہدایات دیدیتا تھا۔" (۷۹)

مرتضیٰ نظام کے پورے عہد کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ایک جنون کی سی کیفیت شروع ہی سے پائی جاتی تھی، جو کچھ اسکے دماغ میں سما جاتا اسپر وہ کسی پاگل کی طرح عمل کرتا تھا، جیسا کہ کشور خاں کے معرکے میں اس نے کیا تھا کہ توپوں کی گولہ باری میں بڑھتا ہی چلا گیا تھا پھر شاہ میرزا نے مختلف طریقوں سے اسکے ذہن نشین کرایا کہ چنگیز خاں غدار ہے اور اسکو ہٹا کر سلطنت پر قبضہ کرنا

چاہتا ہے تو اس نے چنگیز خاں کو زہر دلوادیا۔

وہمی اور غیر متوازن دل و دماغ کا فرمانروا حد سے زائد انتہاء پسند بن گیا تھا جس سے اسکو نفرت ہوجاتی اسکی جان کے لالے پڑجاتے اور جسکو چاہتا تو ٹوٹ کر چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کا ایک خوبصورت غلام صاحب خاں تھا جو اسکو بہت عزیز تھا اس حدتک عزیز کہ لوگوں کو صاحب خاں سے اسکے گھناؤنے تعلقات کا شبہ ہوتا جسکو ناممکن نہیں کہا جاسکتا لیکن مرتضیٰ نظام ایک مذہبی بادشاہ تھا، سادات نواز اہل بیت کا دلدادہ اور شیعیت کے فروغ میں دیوانگی کی حدتک مہمک؟ اس سے ایسی توقع نہ ہوسکتی پھر بھی مرتضیٰ نظام کی عزلت گزینی میں اسکے پاس جانیوالوں میں ایک دو غلاموں کے علاوہ صرف صاحب خاں تھا جو بے دھڑک اندر جاسکتا تھا۔ اس لئے شبہات کو یکسر رد نہیں کیا جاسکتا۔

ایک روایت کی رو سے اسکی گوشہ نشینی جہانگیر خاں کو زہر دلوانے کے بعد شروع ہوئی اور حقیقت کا انکشاف ہونے پر وہ اتنا نادم تھا کہ خود اپنے کو اپنا چہرہ نہ دکھا سکتا لہذا چھپ کر بیٹھ گیا تھا پھر اس کا عادی ہو گیا۔

مرتضیٰ نظام کی گوشہ نشینی ملک کیلئے اس اعتبار سے مفید تھی کہ لوگ اس کا نشانہ ستم بننے سے محفوظ تھے لیکن اسکے بجائے دوسرے امراء عوام پر مظالم کے پہاڑ ڈھارہے تھے جن میں صاحب خاں پیش پیش تھا۔ وہ بادشاہ کے حکم کا غلط حوالہ دے کر اتنی سنگدلانہ اور بیرحمانہ حرکتیں کرتا کہ امراء تک بغاوت پر آمادہ ہوجاتے۔ احمد نگر خانہ جنگی کا اکھاڑہ بن گیا تھا جس کا اثر بیجاپور، احمد آباد بیدر اور گولکنڈہ پر بھی پڑا اور ہوس ملک گیری میں ایک دوسرے کے سرحدی علاقوں پر تاخت کرنے لگا سب سے زیادہ متاثر خود سلطنت احمد نگر ہوئی۔

مرتضیٰ نظام کو جب ان حالات سے مطلع کیا گیا تو اس نے اسکی گرفتاری یا قتل کا حکم دیدیا اور خداوند خاں نے اس کا کام تمام کردیا۔

۹۸۸ ھ میں علی عادل شاہ وفات پاگیا اور ابراہیم عادل شاہ ثانی اس کا جانشین ہوا۔ پھر کچھ عرصے بعد ابراہیم قطب شاہ جوار رحمت میں جابسا اور قلی قطب شاہ گولکنڈہ کا تاجدار ہوا۔

پھر مرتضیٰ نظام اور قلی قطب شاہ نے مل کر بیجاپور کے بعض قلعوں کو فتح کرنے کیلئے متحدہ حملہ کیا مگر ناکام ہوکر واپس ہوگئے۔

۹۹۲ ھ میں سپہ سالار لشکر نظام سے صلابت خاں کے لشکر کا مجادلہ ہوا پھر صلح ہوگئی اسکے بعد صلابت خاں نے مرتضیٰ نظام کا علاج کرانے کی تدابیر کیں۔ کچھ دنوں کے وقفے سے سید مرتضیٰ اور خداوند خاں احمد نگر پر حملہ آور ہوے۔ شاہزادہ میران مرتضیٰ اور صلابت خاں نے انکو شکست دی اور وہ دونوں مع شاہزادہ برہان اکبر اعظم کے پاس جاکر فریادی ہوئے۔ اس نے مرزا عزیز کو کلتاش کے ساتھ ان سب کو دکن کی مہم پر روانہ کیا۔ بعض سرداروں نے لشکر مغل کا مقابلہ کیا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

اسی دوران صلابت خاں نے مرتضیٰ نظام کے مزاج کی یکسوئی کی خاطر ایک خوبصورت گانے والی اسکے ساتھ لگادی تھی جو مرتضیٰ نظام پر چھا گئی اور دولت و جائداد سے نوازی گئی۔

شہزادہ میران بن مرتضیٰ کا عقد عادل شاہ کی بہن سے ہوچکا تھا۔ انہیں دنوں اسکی رخصتی عمل میں آئی مگر مرتضیٰ نظام نے بدگمان ہوکر اسکو قید کردیا۔ اسکی طبیعت اعتدال پر نہ آئی تھی، اکثر دیوانوں کی سی حرکتیں کر بیٹھتا۔ آخر بعض امراء نے میران حسین کو قید سے نکال کر اسکو تخت نشین کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مرتضیٰ نظام کی حالت روز بروز خراب ہوتی رہی۔ آخر وہ ۹۹۶ ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جاملا اور اسکی لاش کربلائے معلی بھیج دی گئی اسکے دور میں شیعیت کو بہت فروغ ہوا۔ سادات اور محبان آل رسولؐ کو وظائف ملتے رہے۔ مرتضیٰ نظام جیسا بھی ہو مگر عزائے امام حسینؑ پر اس نے اپنی توجہ مبذول رکھی جسکے لئے جائدادیں وقف تھیں۔

میران حسین بن مرتضیٰ نظام

میران حسین سولہ سال کی عمر میں باپ کے بعد تخت پر بیٹھا۔ وہ ظالم و اوباش تھا لہذا امراء نے برہان شاہ بن حسین نظام کے دو بیٹوں میں سے کسی ایک کو تخت نشین کرنیکا فیصلہ کرلیا اور بارہ سال کے اسمٰعیل کو بادشاہ بنادیا جس سے

بعض امراء نے اتفاق نہ کیا۔ ان میں جمال خاں پیش پیش تھا جو مہدوی مذہب رکھتا تھا وہ ایک بڑی جماعت لیکر چڑھ دوڑا۔ اسپر مرزاخاں نے میران حسین کو قتل کردیا اور سراس کا جمال خاں کے پاس بھیج دیا۔ اس نے مشتعل ہوکر قلعہ پر حملہ کردیا اور امراء جانیں بچا بچا کر بھاگ نکلے۔

جمال خاں قلعہ پر قابض ہوگیا۔ اس نے اسمٰعیل بن برہان نظام شاہ کو تخت نشین کردیا اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

اسمٰعیل بن برہان نظام شاہ

جمال خاں سید محمد جونپوری کا ماننے والا تھا۔ بہت سے حبشیوں کو اس نے اس مذہب میں داخل کیا تھا۔ ابراہیم عادل شاہ نے اپنے ایک افسر فوج دلاور خاں کو اسکی سرکوبی کیلئے تعینات کیا مگر وہ صلح کرکے پالکی زوجہ میران شاہ کی لیکر بیجاپور واپس ہوگیا۔

برہان شاہ بن حسین نظام ابتک اکبراعظم کے پاس مقیم تھا۔ جب اس کا بیٹا تخت احمد نگر پر بیٹھا تو اس نے اکبراعظم سے پھر مدد کی درخواست کی مگر مغل فوج کے دکن آنے سے تمام دکنی متحد ہوجاتے اس لئے اکبر نے راجہ علی خاں حاکم اسیر کو مدد کیلئے لکھا۔ برہان شاہ ایک فوج کے ساتھ برار میں داخل ہوا مگر جہانگیر خاں حبشی کے مقابلے میں منہزم ہوا پھر اس نے اپنی جاگیر ہنڈیہ سے برہان پور آکر راجہ علی خاں اور ابراہیم عادل شاہ کی اعانت سے فوج اکٹھا کی اور ان دونوں کی معیت میں آگے بڑھا۔

جمال نے سپہ سالار برار امجد الملک مہدوی کو بلاکر راجہ علی خاں اور برہان شاہ کے مقابلے پر روانہ کیا اور خود ابراہیم عادل شاہ کی طرف بڑھا اور اسکے مقدمہ لشکر دلاور خاں حبشی کو شکست دی۔ اس عرصے میں امرائے برار نے برہان شاہ کی اطاعت کرلی لہذا جمال خاں انکی طرف متوجہ ہوا مگر بیجاپوری لشکر نے اسکو گھیرے میں لے لیا اور اسکی رسد بند کردی۔

جمال خاں اور اسکا لشکر شدت تشنگی سے بیتاب تھا لہذا قریب کے دریا کی طرف بڑھا جہاں برہان شاہ اور راجہ علی خاں پہلے سے موجود تھے مجبوراً جمال نے

میدان کارزار گرم کیا۔ دکن میں مہدیوں کی موت وحیات کا سوال تھا لہذا ان کا پلہ بھاری پڑرہا تھا کہ اچانک بندوق کی ایک گولی جمال کے ماتھے پر آکر بیٹھ گئی اور وہ زمین پر گر گیا جسکے بعد فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بانیان فساد کو قتل کیا گیا اور اسمٰعیل شاہ کو گرفتار کرلیا گیا۔

برہان شاہ بن حسین نظام

برہان شاہ ۹۹۹ھ میں تخت نشین ہوا۔ مرتضی نظام کے وقت میں اس نے خروج کیا تھا اور مشہور کیا تھا کہ مرتضی نظام مرگیا۔ یہ خبر سنتے ہی مرتضیٰ نظام پس پردہ سے برآمد ہوا، ہاتھی پر سوار ہوکر بازار میں آیا اور خواجہ زین سمنانی کی دوکان کے قریب ہاتھی روک کر پوچھا۔

"کیا بیچتا ہے؟"

"کھانے پینے کی ہر قسم کی دوا ہے"۔ اس نے جواب دیا اور مرتضی نظام نے کہا

"دیوانگی کی دوا بھی ہے تیرے پاس؟"

"ہر طرح کے اجزائے جلاب موجود ہیں"۔ اس نے بتایا اور مرتضیٰ نظام نے گوش گزار کیا۔

"لیکن میں دیوانہ تو نہیں ہوں۔ مشائخ کی طرح اعتکاف میں رہ کر بادشاہت کرنا چاہتا ہوں تو میرے بھائی نے مجھ پر لشکر کشی کی ہے۔"

"وہ دیوانہ ہے جو آپ کو دیوانہ کہتا ہے۔" خواجہ زین نے جواب دیا اور مرتضی نظام نے ایک تھیلی اشرفیوں کی اسکی طرف پھینک کر ہاتھی آگے بڑھا دیا۔ دوسرے دن مرتضی نظام نے صلابت خاں کو متعین کیا جس نے برہان شاہ کو شکست دی۔ وہ بھاگ کر پہلے قطب الدین غزنوی کے پاس گجرات پھر اکبراعظم کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور اسکی بدولت تخت احمد نگر حاصل کرنے کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور اسمٰعیل شاہ کے بعد احمد نگر کا بادشاہ بنا۔

تخت نشین ہوتے ہی اس نے مذہب مہدوی کو غیر قانونی قرار دیا اور خطبہ اثنا عشر جاری کیا۔ بھاگے ہوئے تمام امراء دھیرے دھیرے حاضر ہوگئے اور نظم

سلطنت میں ایک استحکام پیدا ہو گیا۔

ابراہیم عادل شاہ احمد نگر کی بحالی برداشت نہ کر سکا اس نے مطالبہ کر دیا کہ تین سو ہاتھی جو دلاور خاں سے نظام شاہیوں نے چھینے تھے وہ واپس کیے جائیں۔ اسپر دونوں میں ایک طویل اور مسلسل جنگ ہوئی اور برہان شاہ شکست یاب ہوا۔ اسکے ڈیڑھ سو ہاتھی بیجاپور کو مل گئے پھر بعض عمائدین سلطنت نے درمیان میں پڑکر صلح کرادی۔

پھر برہان شاہ نے قلعہ ریکندہ پر لشکر کشی کرائی جس میں مرتضی نظام کو اپنے امراء کی غداری کے سبب کامیابی نہ ہو سکی تھی مگر برہان شاہ نے فرنگیوں کو سخت سزائیں دیں، کوئی سو فرنگی اور عیسائی قتل کیے پھر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ سالاران لشکر نے ایسے انتظامات کیے تھے کہ فرنگی قلعہ چھوڑ کر چلے جاتے مگر اسی عرصے میں برہان شاہ نے نفس امارہ کا شکار ہو کر بعض امراء کی خواتین پر دست ہوس دراز کیا اور وہ محاصرہ چھوڑ کر فوراً احمد نگر آ گئے جسکے نتیجے میں فرنگیوں نے خود مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ پھر برہان شاہ ابراہیم عادل شاہ سے الجھ گیا جس میں اسکی کافی فوج ضائع ہو گئی۔ شعبان ۱۰۰۳ھ میں وہ مر گیا اور اس کا بڑا بیٹا ابراہیم باپ کی جگہ تخت احمد نگر پر متمکن ہوا۔

ابراہیم شاہ بن برہان شاہ

برہان شاہ کا اتابک میاں منجو اس کا وکیل ہوا۔ اخلاص خاں نے اگرچہ بغاوت کی تھی لیکن ابراہیم شاہ نے اسے معاف کر دیا اور احمد نگر میں دو پارٹیاں ہو گئیں: ایک میاں منجو کی دوسری اخلاص خاں کی۔

اخلاص خاں کا گروہ بڑا سرکش اور بے ادب تھا۔ اس نے ابراہیم عادل شاہ کے سفیر سے بدتمیزی کی اور بیجاپور سے احمد نگر کا بگاڑ ہو گیا اور اخلاص خاں اپنا لشکر لیکر بیجاپور کی طرف چل پڑا۔

میاں منجو کی کوشش جب بادشاہ کو روکنے میں کارگر نہ ہوئی تو اس نے چپکے سے سپہ سالار افواج بیجاپور حمید خاں سے کہلوایا کہ اخلاص خاں نے بادشاہ کو بہکا دیا ہے، میں اسے سمجھا لوں گا لہذا حمید خاں اپنے لشکر کو پیچھے ہٹا لے گیا۔ اخلاص خاں

نے اسکو کمزوری پر محمول کیا اور آگے بڑھ کر حمید خاں کو جا لیا۔ مجبوراً حمید خاں کو جنگ کرنا پڑی۔

لڑائی شروع ہوتے ہی نظام شاہی میمنے نے عادل شاہی میسرے کو پسپا کر دیا اور نظام شاہی فوج لوٹ میں لگ گئی۔ بیوقوف ابراہیم شاہ تھوڑے سے سوار اور چند ہاتھیوں کو لے کر حملہ آور ہو گیا مگر قریب پہنچتے ہی ایک عادل شاہی سپاہی کے نیزے کا شکار ہو گیا۔

بیجاپور کے افسر سہیل خاں نے اسکو پالکی میں ڈال کر احمد نگر کی طرف روانہ کر دیا اور نظام شاہی لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔

میاں منجو نے سب سے پہلے احمد نگر پہنچ کر ابراہیم شاہ کے طفل شیر خوار شاہزادہ بہادر کو قلعہ جوند میں نظر بند کر دیا اور بارہ سال کے ایک لڑکے کو یہ کہہ کر تخت پر بٹھا دیا کہ یہ خاندان نظام شاہی سے ہے۔

احمد شاہ بن طاہر شاہ

چاند بی بی بہادر کو تخت نشین کرنا چاہتی تھی مگر امراء نے ایک سال سات ماہ کے بچے کو مناسب نہ سمجھا۔ احمد شاہ میاں منجو کی سرپرستی میں فرمانروائے احمد نگر بن گیا لیکن اس حقیقت کے انکشاف میں بھی دیر نہ لگی کہ وہ خاندان نظام سے نہیں ہے۔

اسپر میاں منجو اور اخلاص خاں سے سخت جنگ ہوئی اور حبشیوں نے ایک مجہول النسب بچے کو بادشاہ بنا لیا۔

اسی دوران شاہزادہ مراد کی فوجیں احمد نگر کے قریب پہنچ گئیں جسے اکبر اعظم نے تسخیر دکن کیلئے مامور کیا تھا۔

چاند بی بی

میاں منجو محرم ۱۰۰۴ھ میں حبشیوں کو شکست دے چکا تھا کہ عبدالرحیم خانخاناں اور راجہ علی خاں کے عساکر ذخار قدرے فاصلے سے خیمہ زن ہو گئے بیس ہزار مغل اور راجپوت، مسلح اور آہن پوش افغان اس جاہ و حشم سے اکر پہنچے تھے کہ پورے دکن کی طاقت مرعوب ہو جاتی مگر سوال تھا وطنیت کا۔ اس موقع پر دشمن

بھی میاں منجو کے شریک ہوگئے ۔چاند بی بی سلطانہ اس سے ناخوش تھی مگر بات تھی
احمد نگر کی اس لئے چاند بی بی کی حمیت وعظمت اسکی متحمل نہ ہوئی کہ وہ احمد نگر کو
بے یار و مددگار چھوڑ دے اس لئے جب میاں منجو احمد شاہ کو لیکر مدد حاصل کرنے
کیلئے احمد نگر سے باہر گیا تو اس نے عنان مدافعت اپنے ہاتھوں میں لے لی ۔

اسی دن بہادر شاہ ولد ابراہیم شاہ کو اپنے طور پر تخت نشین کیا گیا اور چاند بی
بی نے نام لے لے کر بہادروں کو بلوایا ۔ شمشیر خاں حبشی اور افضل خاں تفرشی کہ
یگانہ روزگار تھے ، سب چاند بی بی کے تابع فرمان ہوگئے ۔

۲۰ ربیع الثانی ۱۰۰۴ھ کو جب شاہزادہ مراد کے حکم پر مغل پہاڑیوں سے
اتراتر کر احمد نگر کے شمال میں نمودار ہوئے اور کالا چبوترہ کے میدان میں انہوں نے
صفیں آراستہ کیں تو چاند بی بی نے حصار کے اندر اپنے بہادروں کو مستعد پیکار
کر دیا پھر فصیلوں سے چند توپوں کے فائر کروائے جن سے مغلوں کے پروں میں رخنے
پیدا ہوئے ۔

دن تمام ہونے پر شاہزادہ مراد نے برہان نظام شاہ کی بنوائی ہوئی باغ ہشت
بہشت میں قیام کیا ۔ ۲۷ تاریخ کو ابوالفضل اور شہباز خاں نے شہزادہ مراد کے حکم
کے بغیر امراء وغرباء کی تاراج کا حکم دیا ۔ احمد نگر کے مکانات اور عمارتیں دیکھتے ہی
دیکھتے زمین بوس ہو گئیں ۔ شہباز خاں بہت متعصب سنی تھا ۔ وہ چاہتا تھا کہ لنگر
دروازہ امام کو بھی پامال کر دے اور سادات جو وہاں مقیم تھے انہیں تہہ تیغ
کر ڈالے مگر اسکی اطلاع شاہزادہ مراد اور خانخاناں کو ہو گئی انہوں نے سختی سے روک
دیا ، شہباز خاں کو ملامت کی اور سامان لوٹنے والوں کو سخت سزائیں دیں ۔

اتنا برا وقت تھا احمد نگر پر کہ نظام شاہی طاقت تین تفرقہ ہو گئی تھی ، بڑے
بڑے وفادار چلے گئے تھے ، میاں منجو عادل شاہ کی سرحد میں مقیم تھا آہنگ خاں
حبشی بھی حدود بیجاپور کے اندر کسی تائید غیبی کا منتظر تھا ۔ اخلاص خاں پوری
مغل طاقت سے ٹکرا جانے کا نعرہ لگاتا تھا وہ دولت آباد میں پڑا ہوا تھا ۔ اسکو کچھ غیرت
دامنگیر ہوئی تو دس ہزار سوار لے کر چلا مگر خانخاناں نے دولت خاں لودھی کو پانچ
چھ ہزار دے کر بھیج دیا اور وہ بری طرح شکست یاب ہوا ۔

تنہا چاند بی بی تھی اور قلعہ احمد نگر مگر دکن کی شیردل خاتون مٹھی بھر
سرفروشوں کے ساتھ مغلوں کے ٹڈی دل کے سامنے سینہ تانے کھڑی رہی ۔

چاند بی بی نے اس موقع پر آہنگ خاں حبشی کو یاد کیا ۔ وہ پانچ ہزار سواروں
کے ساتھ احمد نگر کے نزدیک پہنچا اور معلومات حاصل کر کے قلعہ کے مشرقی جانب
بڑھا ۔ اسی دن مراد نے وہ سمت خالی دیکھ کر فوجوں سے پر کرائی تھی ۔ آہنگ خاں
اس سے واقف نہ تھا مگر پہنچ ہی گیا تھا تو اس نے جوہر مردانگی دکھائے اور لڑتا بھڑتا
چار سو آدمیوں کے ساتھ قلعہ میں داخل ہو گیا ۔

شاہ علی ایک مرد ضعیف باقی لشکر کے ساتھ پلٹ گیا ۔ دولت خاں نے
تعاقب کر کے تقریباً نو سو آدمی قتل کر دئے ۔

چاند بی بی نے براہ راست تباہی کی داستان ابراہیم عادل شاہ کو تحریر کی ۔
اس نے بیس ہزار سوار دے کر سہیل خاں کو روانہ کیا ، منجو بھی انکے ساتھ ہو لیا ۔
پھر مہدی قلی سلطان گولکنڈہ کی طرف سے آکر اس مہم میں شامل ہوا ۔

شاہزادہ مراد کو اسکی خبر ہوئی تو اس نے کوشش کی کہ اس لشکر کے نزدیک
پہنچنے سے قبل قلعہ کو فتح کر لے ۔ اس نے ایک سرنگ کھدوانا شروع کر دی جو دیوار
کے نیچے تک جاتی تھی پھر چار سرنگیں اس نے اور کھدوائیں ، دیوار اور برجوں کی
جڑوں میں چھید کیے ۔ یہ نقبیں بارود سے بھری گئیں اور اندر توپیں بھی رکھ دی گئیں
اور سوراخ گارے اور چونے سے بند کر دئے گئے ۔ دوسرے دن بعد نماز جمعہ ان میں
آگ دے کر قلعہ کو اڑا دینے کا منصوبہ تھا کہ شاہزادہ مراد کے لشکر کا ایک شخص
خواجہ محمد خاں شیرازی جسکے اقارب برسوں سے احمد نگر میں رہتے تھے وہ شب کی
تاریکی میں حصار کے نیچے پہنچا اور اس نے اہل قلعہ کو مغل فوج کے ارادوں سے باخبر
کر دیا ۔

شہزادی چاند بی بی نے راتوں رات ایک سرنگ صاف کرا دی پھر صبح سے
دوپہر تک دوسری سرنگ کی بارود نکالی ۔ تین سرنگیں اب بھی رہ گئی تھیں کہ مغل
لشکر آپہنچا اور آتے ہی اس نے سرنگ میں آگ دیدی ۔ ایک سربفلک شعلہ بلند ہوا
اور اتنا زبردست دھماکا ہوا کہ زمین ہلنے لگی ۔ دیوار متزلزل ہو گئی ۔ دوسرنگیں چھوٹی

تھیں ۔ وہ بھی پھٹیں مگر ان کے اثرات ایسے نہ تھے ۔

احمد نگر کے جو لوگ تیسری سرنگ صاف کر رہے تھے دیوار گرنے سے وہ دب گئے ۔ مرتضیٰ خاں آہنگ خاں، شمشیر خاں اور افضل خاں وغیرہ بھاگ کر ایک طرف ہوگئے ۔ وہ اتنے سراسیمہ اور بدحواس تھے کہ کچھ ان کی سمجھ میں نہ آرہا تھا لیکن کیا دل گردہ تھا حسین نظام کی بیٹی کا کہ جیسے ہی اسکو اس ہولناک واقعہ کی اطلاع ہوئی وہ اسلحہ زیب تن کر کے پابرہنہ اٹھ کھڑی ہوئی ابی ہوئی تلوار اسکے ہاتھ میں تھی اور وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح حجاب چہرے پر ڈالے گھوڑا اڑاتی ہوئی منہدم دیوار کی طرف بڑھ رہی تھی ۔ اسکو دیکھ کر تمام امیر بھی گوشوں سے نکل آئے اور سلطانہ چاند بی بی نے ٹوٹی ہوئی دیوار کے برابر انسانوں کی دیوار کھڑی کر دی ۔

دکنی توپچیوں اور پیکان اندازوں نے بھی اس موقع پر جانوں کی بازیاں لگادیں ۔ چاند بی بی کی ہمت اور حوصلے نے ان کو زندگیوں سے بے نیاز کر دیا تھا ۔ وہ مغلوں کے حربوں کو بھی روکتے اور اتنی سرعت سے گولے برساتے کہ جو مغل دستے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے وہ گولوں اور تیروں کی ضرب سے بے جان ہو کر گرجاتے ۔ سہ پہر سے اندھیرا ہونے تک اکبر اعظم کے لشکری اس تعداد میں کام آئے کہ خندق پٹ گئی

بیجاپور اور احمد نگر نے ابتک دکن کی آب رو کو سجادہ زہد و تقویٰ پر دیکھا تھا اور ایام عزا میں سیاہ پوش پایا تھا لیکن آج وہ فاطمہ زہرا کی کنیز کے روپ میں علی کے کسی سرفروش کا کردار ادا کر رہی تھی ۔ چہرے پر اب بھی جناب مریم کی معصومیت تھی مگر بشرے سے حیدر کرار کا تہور اور عباس علمدار کا جلال آشکار تھا ۔

رات کا اندھیرا جب لشکر اور قلعہ کے درمیان حائل ہو گیا اور مغل ہزاروں جانیں گنوانے کے باوجود فتح کے قریب بھی نہ پہنچ سکے تو انہوں نے لڑائی موقوف کر دی اور فوجیں واپس ہونے لگیں مگر چاند بی بی اسی طرح کھڑی رہی ۔ اب اس نے محافظ احمد نگر کے بجائے معمار مملکت نظام کا کردار ادا کرنا شروع کیا ۔ معماران چابکدست کوئی پچاس گز ٹوٹی ہوئی دیوار بنانے میں مصروف ہوگئے ۔ اس کام کا آغاز جب چاند بی بی نے پہلی اینٹ اپنے ہاتھ میں لیکر کیا تو نہ کوئی امیر لشکر رہا اور نہ کوئی

مزدور ۔ معمار اینٹیں چنتے رہے اور پچاس گز کی چوڑائی میں انہیں مسلسل مصالحہ پہنچتا رہا ۔

صبح کو مغل امرا ۔ نے دیکھا تو پوری دیوار ایک سرے سے دوسرے سرے تک کئی گز بلند ہو چکی تھی ۔ اس میں پہلا جیسا استحکام تو نہ تھا مگر وہ اہل حصار کیلئے اتنی معاون ضرور ہو گئی تھی کہ اندر سے باہر والوں کو نشانہ بنایا جاسکتا ۔

یہ رات احمد نگر کیلئے بڑی بھیانک تھی مگر اتنی تاریخ ساز جس نے دکن کو ہمیشہ کیلئے سربلند کر دیا اور اس سرزمین کی ہمت و شجاعت ایک انسانی پیکر میں مرتکز ہو کر آج بھی دنیا کے بہادروں کیلئے ولولہ انگیز ہے ۔

اور اسکو چاند بی بی کا غیر فانی کردار ہی کہنا چاہیئے کہ بہادر مغل امراء بھی عش عش کرنے لگے اور اسکے بعد سے وہ ہمیشہ چاند بی بی کے بجائے چاند سلطانہ کے لقب سے یاد کی گئی ۔

دوسرے دن مغلوں کا حملہ کچھ شدید ہوتا لیکن سہیل خاں کے نزدیک پہنچ جانے کی اطلاع گشت کرنے لگی ۔

مغلوں کو رسد کی تنگی تھی، بیماریاں بھی پھیل رہی تھیں اور چاند بی بی نے بھی ان کے دانت کھٹے کر دئے تھے، انہوں نے سمجھ لیا کہ دکن کی تسخیر کچھ آسان نہیں لہذا انہوں نے سہیل خاں سے گفت و شنید شروع کر دی ۔ چاند بی بی دب کر صلح کرنے کی قائل نہ تھی مگر تقاضائے وقت کو اس نے محسوس کیا لہذا برار سے دست کش ہو گئی اور مغل چاند سلطانہ کی بہادری کی داستانیں بیان کرنے کیلئے آگرہ کی طرف واپس ہوگئے ۔

احمد شاہ کو ابراہیم عادل شاہ نے اپنے ملک میں جاگیر دیدی اور بہادر شاہ احمد نگر کا بادشاہ بنادیا گیا ۔

بہادر شاہ بن ابراہیم شاہ

محمد خاں میاں کو چاند بی بی نے پیشوا بنایا مگر اس نے وفاداری کے بجائے اپنی گرفت مضبوط کرنا شروع کر دی اور آہنگ خاں اور شمشیر خاں وغیرہ کو تدبیر سے گرفتار کر لیا ۔ دوسرے امراء یہ دیکھ کر ادھر ادھر چلے گئے ۔ چاند بی بی بیجاپور کی

ملکہ رہی تھی۔ اس نے ابراہیم عادل شاہ کو لکھا اور وہاں سے ۱۰۰۵ھ میں پھر سہیل خاں کو روانہ کیا گیا جس نے محمد خاں کو گرفتار کرلیا اور چاند بی بی نے آہنگ خاں کو وکیل سلطنت بنادیا۔

اس مدت میں مغلوں نے حدود برار سے تجاوز کر کے نظام شاہی مملکت کے سرحدی حصوں پر قبضہ کرلیا تھا لہذا ایکبار پھر بیجاپور سے سہیل خاں اور گولکنڈہ سے مہدی قلی سلطان مدد کیلئے آئے خانخاناں، شاہزادہ مراد وغیرہ سب برار میں مقیم تھے۔ ان کے لشکر بھی حرکت میں آگئے۔ ۸۔ جمادی الثانی ۱۰۰۵ھ کو ہنگامہ رزم و پیکار گرم ہوا۔

سہیل خاں کا مقابلہ راجہ علی خاں اور راجہ جگناتھ راجپوت سے ہوا۔ اس نے ان دونوں کو ہلاک کر کے انکی فوجوں کو شکست دی مگر امرائے نظام شاہی اور قطب شاہی نے افواج اکبری سے شکست کھائی۔ سہیل خاں مصروف کارزار رہا اور شام سے پہلے مغلوں کے یمین اور یسار پر اتنا زبردست حملہ کیا کہ فوجوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔

صادق محمد خاں شہزادہ مراد کو لے کر نکل جانا چاہتا تھا مگر خانخانان نے قدم میدان سے نہ ہٹایا۔ دکنی فوجیں اپنے کو فاتح سمجھ کر لوٹ مار میں لگ گئیں مگر سہیل خاں ایک جماعت قلیل کے ساتھ خانخانان کے مقابل فرد کش رہا۔ صبح ہوتے ہی دونوں کے درمیان بڑی ہولناک جنگ ہوئی اور سہیل خاں کو مغلوب ہو کر راہ فرار ناپنا پڑی۔

شہزادہ مراد کا کہنا تھا کہ اسی تسلسل میں احمد نگر فتح کرلیا جائے مگر خانخانان نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ اسکی شکایت شہزادہ مراد نے اکبر کو لکھی۔ اکبر نے خانخانان کو واپس بلالیا اور ابوالفضل کو سپہ سالار بنادیا۔

اس اثناء میں چاند بی بی اور آہنگ خاں میں شدید اختلافات ہوگئے۔ آہنگ خاں نے علاقہ بیر مغلوں سے چھین لیا۔ کچھ دنوں بعد دکن ہی میں شہزادہ مراد کا انتقال ہوگیا اور شہزادہ دانیال اسکی جگہ پر بھیجا گیا پھر خود اکبر اعظم عازم دکن ہوا۔ اس نے برہانپور میں قیام کر کے تسخیر آسیر کی مہم اپنے ذمے لی اور خانخاناں اور شہزادہ دانیال کو احمد نگر کی طرف روانہ کیا۔

آہنگ خاں پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ احمد نگر سے جاچکا تھا۔ مغلوں نے جب محاصرہ کر کے سرنگیں بنانا شروع کیں تو چاند بی بی نے امرا کو رائے دی کہ مغلوں سے مقابلہ کرنے میں کامیابی نہیں ہو سکتی اس لئے کسی قیمت پر بھی ان سے صلح کرلینا چاہیئے خواہ اس میں قلعہ احمدنگر دینا ہی کیوں نہ پڑے اسپر امراء اور عوام سب بگڑ گئے اور قلعے میں درآئے۔ بہادر شاہزادی ہزاروں کا مقابلہ تو کر نہ سکتی۔ لڑی اور لڑتی ہوئی ماری گئی اس طرح اہل دکن نے اپنا ایوان شجاعت خود بے چراغ کردیا۔

مغل سرنگیں مکمل کرچکے تھے۔ ان کا کوئی روکنے والا نہ رہا تھا۔ انہوں نے سرنگوں میں آگ دیدی۔ دیوار حصار گر گئی مغل قلعہ میں داخل ہوگئے۔ ان میں سے اکثر امراء کو چاند بی بی کے اس طرح قتل کیے جانے پر بڑا غم و غصہ تھا۔ یہ غصہ ظالم اور بزدل دکنیوں پر اترا۔ وہ تہہ تیغ ہوئے اور اپنی سزا کو پہنچے۔ بہادر شاہ اسیر ہو کر اکبر کے پاس برہانپور لے جایا گیا اور قلعہ گوالیار بھیجدیا گیا۔

مرتضی بن علی بن برہان شاہ

اس تباہی کے بعد امراء نے قلعہ پرندہ میں شاہزادہ مرتضیٰ کو تخت نشین کیا اس عرصے میں عنبر نامی حبشی نے ایک چھوٹی سی حکومت قائم کرلی۔ دوسری حکومت راجو دکنی نے بنائی پھر دونوں نے مصلحتاً مرتضی شاہ کی اطاعت کرلی مگر دونوں اپنی اپنی جگہ پر ایک دوسرے کو زیر کرنے کی فکر میں رہے۔

۱۰۱۰ھ میں عنبر نے مغلوں کے بعض علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ خانخانان اسکی شجاعت سے متاثر تھا۔ اس نے ایک علاقہ اسکو دیکر صلح کرلی۔

عنبر نے پہلے مرتضیٰ شاہ کو شکست دی پھر جنگ و جدل کے بعد قلعہ پرندہ فتح کیا۔ اس مدت میں راجو دکنی نے بھی مغلوں سے جنگ کر کے شکست کھائی۔ یہ دونوں سردار اسی طرح لڑتے رہے اور مغل آہستہ آہستہ دکن پر چھاتے چلے گئے۔

اب دکن میں مغلوں کے قدم جم چکے تھے لہذا اکبر اعظم کے ایماء پر شہزادہ دانیال کی شادی ابراہیم عادل شاہ کی بیٹی سے عمل میں آئی جس کا عقد اس سے پہلے ہو چکا تھا مگر دکن کی سرزمین دانیال کو بھی راس نہ آئی اور برہانپور پہنچ کر اس کا بھی انتقال ہوگیا۔

دکن میں مغلوں کی فتوحات سے بڑی ہلچل تھی لہذا جب عنبر نے راجو پر فتح پاکر طاقت حاصل کرلی تو اس نے سرزمین دکن کے نام پر مغلوں کے خلاف تمام بکھری طاقتوں کو اپنے پرچم کے نیچے جمع کرنا شروع کردیا اور وہ دکن کا واحد سہارا بنگیا۔

سلطنت برار

فتح اللہ کغار بیجانگر کی اولاد میں تھا، اسیر ہوکر احمد اباد بیدر لایا گیا تو مشرف بہ اسلام ہوا۔ خواجہ جہاں کاوان کی عنایت سے سپہ سالار برار مقرر ہوا اور عماد الملک کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۸۸۲ھ میں وہ بھی دوسروں کی طرح آزاد حکمراں بن گیا۔ اسکے مرنے پر علاء الدین عماد الملک تخت پر بیٹھا۔

عماد الملک نے دوسروں کی طرح اپنی شاہی کا اعلان کیا اور سلطان محمود کی حمایت میں کئی جنگوں میں شریک ہوا۔ عادل شاہی اور نظام شاہی لڑائیوں میں بھی اسکی شرکت پائی جاتی ہے۔ ۹۳۰ھ میں اس نے بادشاہ گجرات کو دکن آنے کی دعوت دی اور اس کا خطبہ اپنے ملک میں پڑھوانا پڑا۔

دریا عماد شاہ اسکے بعد بادشاہ ہوا۔ اس نے اتحاد و اتفاق سے اپنا زمانہ بسر کیا

برہان عماد اس کا جانشین ہوا جسکو ایک سردار تفال خاں نے قید کرلیا اور برار کا سکہ و خطبہ اپنے نام کا جاری کردیا۔ تفال خاں سے سلاطین دکن کے کئی معرکے ہوئے۔ آخر ابراہیم قطب شاہ کے سپہ سالار چنگیز خاں کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور برار احمد نگر کے تابع ہوگیا پھر مغلوں کے قبضے میں چلا گیا۔

حکومت بریدیہ

خواجہ شہاب الدین یزدی قاسم برید نام کے ترکی غلام کو دکن لایا تھا۔ اس نے اسکو سلطان محمد شاہ فاروقی کے ہاتھ فروخت کیا جو بالاخر اسکے امیروں میں شامل ہوا۔ سایاجی مرہٹہ کے مقابلے میں اسکو فتح حاصل ہوئی تو وہ مرہٹہ سردار کی بیٹی اپنے عقد میں لایا اور پائین اور جالنہ کے مابین اسکی جاگیر پر قابض ہوا۔ پھر مرہٹہ لڑکی کے عزیز و اقارب مسلمان ہوکر اسکی فوج کی قوت بن گئے۔

سلطان محمود بہمنی کی زوال پذیر سلطنت میں اسکی طاقت قابل ذکر ہو گئی

لیکن اس نے احمد آباد بیدر میں کوئی دخل اندازی نہیں کی اور قلعہ اودسہ میں اپنے نام کا سکہ و خطبہ جاری کیا۔

۹۱۰ھ میں اس کا انتقال ہوا تو امیر برید اس کا جانشین ہوا جو ایک عرصہ تک اسمٰعیل عادل شاہ کا سپہ سالار رہا آخر عمر میں برہان نظام شاہ کی مدد کیلئے گیا اور دولت آباد کے اطراف میں فوت ہوا۔ بڑا رحمدل حکمراں تھا۔ مدت حکومت چالیس سال رہی

علی برید اسکی جگہ تخت پر بیٹھا جس نے برہان نظام کی حمایت سے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اور سلطان محمود بہمنی کی وفات پر بیدر کو مرکز حکومت بنایا۔ برہان نظام نے شاہ طاہر کو اسکے جشن تاجپوشی میں بھیجا تھا جنکے ساتھ اس نے بدسلوکی کی لہذا برہان نظام نے چڑھائی کرکے اودسہ اودگیر اور قندھار اس سے چھین لیا

۹۸۷ھ میں مرتضی نظام کی طرف سے صاحب خاں نے قلعہ احمد آباد کا محاصرہ کیا تو اس نے علی عادل شاہ سے مدد مانگی۔ اس نے شرط یہ رکھی کہ فلاں فلاں دو خواجہ سرا اسکو بھیج دئے جائیں۔ علی برید انہیں بھیجنا نہ چاہتا تھا لیکن ضرورت نے مجبور کردیا اور ان میں سے ایک خواجہ سرا نے جاتے ہی علی عادل شاہ کی خواب گاہ میں داخل ہوکر خنجر کے وار کرکے علی عادل شاہ کو قتل کردیا۔ نوعیت واقعہ سے اس خیال کو پوری تقویت پہنچتی ہے کہ خواجہ سرا بیدر سے منصوبہ قتل لے کر گئے تھے

علی عادل شاہ کی طرف سے مدد پہنچتے ہی مرتضی نظام نے محاصرہ اٹھالیا۔ اسکے بعد علی برید ۴۵ سال حکومت کرکے انتقال کرگیا۔ اس کا بیٹا ابراہیم برید باپ کی جگہ تخت پر بیٹھا۔ سات سال بعد وہ بھی مرگیا۔ قاسم برید تین سال تک زندہ رہا۔

پھر چار برس کا بچہ علی برید تخت نشین کیا گیا۔ ۱۰۲۰ھ میں علی مرزا نام کا ایک شخص جو اسی خاندان کی فرد تھا علی برید کو محمد قلی قطب شاہ کی سلطنت کی طرف بھگا کر بادشاہ بن گیا جس سے مغلوں کو مقابلہ کرنا پڑا اور اس کا علاقہ مغلوں کے ہاتھوں تباہ ہوگیا پھر اسکے حصہ بخرے ہوگئے۔

سلطنت قطب شاہی

سلطان قلی ترکان بہار لو سے تھا اور ایک روایت کے مطابق وہ میرزا جہاں شاہ بادشاہ عراق کا نواسہ ہوتا تھا، ہمدان میں پیدا ہوا تھا اور سلطان محمد شاہ بہمنی کے عہد میں وارد دکن ہوا پھر سلطان بہمنی کے غلاموں میں شامل ہوا۔ اپنے علم، امانت و دیانت کے سبب خواتین حرم میں اسکا اعتبار قائم ہوا اور جاگیروں کے محصولات پر مامور ہوا۔

اس نے اجرت یومیہ پر لوگوں کو رکھ کر اس خدمت کو انجام دیا اور چوروں اور رہزنوں کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اسپر قطب الملک کا خطاب ملا اور گولکنڈہ کی جاگیر سے نوازا گیا۔ سلطنت بہمنی کے کمزور پڑنے پر اس نے بھی امارت میں عادل شاہی، نظام شاہی اور برید شاہی کی طرح شاہانہ شکوہ کا مظاہرہ کیا اور خطبہ ائمہ اثنا عشر جاری کیا اسکی مملکت اگرچہ زیادہ بڑی نہیں تھی مگر اس نے ترویج شیعیت اور فضائل اہل بیت کی اشاعت میں زیادہ کد و کاوش کی پھر بھی سلطان محمود بہمنی کی حیات تک احمد آباد بیدر کا احترام باقی رکھا اور سلطان کو نذرانے اور تحائف بھیجتا رہا۔

۹۰۴ھ میں ایک ترکی غلام نے حملہ کر کے اسکو قتل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں ولی عہد سلطنت جمشید قلی کی سازش تھی۔

جمشید قطب شاہ

بیٹا بالکل باپ کے نقش قدم پر تھا۔ اس نے سلطنت بیجاپور کے بعض سرحدی مقامات فتح کیے پھر اسد خاں لاری سپہ سالار بیجاپور سے اس کا مقابلہ ہوا۔ خود اسد خاں سے اسکی دو بدو لڑائی ہوئی جس میں وہ سخت زخمی ہوا۔ انجام کار اسکو شکست ہو گئی پھر حدود کے تعین کے ساتھ باہم صلح ہو گئی۔

یہ شکست جمشید قطب کو فراموش نہ ہو سکی وہ تپ دق میں مبتلا ہو گیا اور ۹۵۷ھ میں جاں بحق ہو گیا۔

سلطان ابراہیم قطب شاہ

ابراہیم سلطان قلی کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا بہت پابند شرع، مدبر اور ہوش مند مگر حد سے زائد مغرور المزاج تھا۔ ۹۶۵ھ میں اس نے حسین نظام سے اتحاد کر کے

علی عادل شاہ پر چڑھائی کی پھر غیر جانبدار بن کر چلا آیا۔ پھر جب علی عادل شاہ رام راج اور امیر برید حسین نظام کے خلاف متحد ہوئے تو رام راج نے اسکو بھی طلب کیا چونکہ وہ رام راج کا رہین منت تھا اس لئے انکار نہ کر سکا مگر عین فتح کے وقت چلا آیا کیونکہ وہ دوسروں کی خاطر جنگ و جدل کا قائل نہ تھا اور جنگ بھی کیسی؟ اسکے ہم مسلک کے خلاف۔

۹۷۱ھ میں وہ علی عادل شاہ کے خلاف حسین نظام کا شریک ہوا اور اسی سلسلے میں بی بی جمال دختر حسین نظام سے اس کا عقد ہوا۔

۹۷۲ھ میں رام راج کے خلاف حسین نظام اور علی عادل شاہ نے اتحاد کیا تو حمیت اسلامی میں وہ بھی مسلم اتحاد میں شامل ہوا۔

پھر اس نے مرتضی نظام اور عادل شاہ کے جھگڑے میں مرتضی نظام کا ساتھ دیا مگر عادل شاہ کو مصالحت کا خط لکھا جو عادل شاہ نے مرتضی نظام کے پاس بھیج دیا اور مرتضی نظام اور قطب شاہ میں ٹھن گئی جسکے بعض دوسرے وجوہ بھی تھے۔ دونوں میں جنگ ہوئی اور قطب شاہ کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اسکے بعد کئی لڑائیوں میں اس نے شرکت کی اور ۹۸۹ھ میں داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔

حلیم الرؤف محمد قلی قطب شاہ

ابراہیم قطب شاہ کے تین بیٹے تھے: محمد قلی، خدابندہ اور سلطان قلی۔ محمد قلی قطب شاہ باپ کے بعد تخت نشین ہوا۔ اس کی خصوصیات میں بادشاہت کی ایک اضافی حیثیت تھی۔ وہ ایک مجتہد عصر، متبحر عالم زاہد نیک نفس، دیوانہ آل رسول، ادیب باکمال، شاعر عدم المثال تھا، عربی اور فارسی پر پورا عبور رکھتا اور مقامی بولیوں سے بھی واقف تھا۔ فارسی کا اچھا شاعر تھا اور فی زمانہ یہ تحقیق بھی ہو گئی ہے کہ اردو کا بھی پہلا شاعر وہی تھا۔

محمد قلی شاہ کے یہ اوصاف آبائی تھے جس کا ابتدائی نقطہ سلطان قلی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ نقطہ بتدریج پھیلتا رہا اور پھیلتے پھیلتے ایک حرف جلی بن گیا جس کا نام محمد قلی عبادت گزار پڑا۔

یہ خاندان بلاشبہ حامل سیف و قلم تھا لیکن اس نے سیف سے زیادہ قلم کو

اہمیت دی ۔ بیجاپور اور احمد نگر کی سلطنتیں اپنی وسعت میں گولکنڈہ سے بڑھ گئیں ۔ ان کا مادی جاہ و جلال زبان زد عام مگر محمد قلی قطب شاہ کو جو علمی عظمت حاصل تھی سب مل کر بھی اس کا مقابلہ نہ کرسکتے ۔ یقیناً حسین نظام اور چاند سلطانہ کے نام صفحات تاریخ میں روشن ہیں مگر محمد قلی قطب شاہ کو وہ بزرگی حاصل ہے کہ سر آن بھی اسکے تصور کے سامنے خم ہوجاتے ہیں ۔ اس کی قلمی سطوت اور علمی جبروت اہل نظر سے خراج عقیدت لیے بغیر نہیں رہتا ۔

تخت نشین ہونے کے بعد قلی قطب شاہ نے شاہ میرزا اصفہانی کی بیٹی سے شادی کی اور خاندان نظام شاہیہ سے اپنے تعلقات استوار کیے ۔ محمد قلی قطب شاہ کو ملک گیری کی طرف کوئی رغبت نہ تھی بلکہ اپنے ملک کی تعمیر اور رعایا کے مسائل حل کرنے کی طرف اس کا رجحان تھا لیکن تخت و تاج کے تقاضوں کو بھی نظر انداز نہ کیا جاسکتا لہذا مرتضی نظام نے جب بیجاپور کی طرف رخ کیا تو وہ بھی روانہ ہوگیا اور سپہ سالار احمد نگر مرتضی سبزواری سے جاملا مگر قلعہ درک پر بیجاپور کے محاصرے نے طول کھینچا تو وہ اتلاف جان کو پیش نظر رکھ کر واپس ہوگیا اور اپنے سپہ سالار مصطفی خاں کو تسخیر گلبرگہ کیلئے روانہ کردیا ۔

مصطفی خاں اور دلاور خاں سپہ سالار بیجاپور میں سخت جنگ ہوئی اور مصطفی خاں منہزم ہوا جسکے بعد قلی قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ میں صلح ہوگئی اور چونکہ طبعاً قلی قطب شاہ کو جنگ و جدل پسند نہ تھی لہذا پھر کبھی لڑائی نہیں ہوئی ۔

۹۹۲ ھ میں خواجہ علی شیرازی کی تحریک پر قلی قطب شاہ کی بہن کی شادی ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ عمل میں آئی ۔

مشہور ہے کہ قلی قطب شاہ اٹھتی جوانی میں ایک طوائف بھاگ متی پر عاشق تھا اور وہ جس مقام پر رہتی تھی ، اسکی آب و ہوا ٹھیک نہ تھی لہذا اس نے گولکنڈہ سے آٹھ نو میل پر ایک شہر آباد کرادیا تھا جس کا نام بھاگ نگر رکھا تھا پھر حیدرآباد رکھ دیا اور اسی کو دارالسلطنت قرار دیا ۔

حیدر نام کی رعایت بظاہر حضرت علی کی ولا ہوسکتی ہے لیکن ایک اور وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ شاہ طہماسپ صفوی کا اصل نام حیدر میرزا تھا اس نسبت سے اس نے حیدرآباد تجویز کردیا ہو کیونکہ اسکی بیٹی کی نسبت شاہ عباس صفوی کے بیٹے سے طے ہوگئی تھی ۔

بہرحال محمد قلی قطب شاہ ایک اقبال مند حکمراں تھا ۔ میر محمد مومن استرآبادی کے سے عالم اس کے دربار کی زینت تھے ۔ دونوں بھائی خدا بندہ اور سبحان قلی اس کے وفادار رہے اور وہ بھی بھائیوں کو اپنی سلطنت سے زیادہ عزیز رکھتا تھا ۔

قلی قطب شاہ نے ابتک تحفے تحائف بھیج بھیج کر مغل شہنشاہ کو بہلائے رکھا تھا لیکن احمد نگر کے انجام کے بعد سے وہ اپنے کو بھی محفوظ نہ سمجھتا لہذا ہر وقت چوکنا رہتا اور فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کی ہر ممکن تدبیر کرتا رہتا تھا ۔ اس طرح اسکی زندگی گزر گئی ۔

محمد قلی قطب شاہ کے شاندار دور حکومت کے بعد محمد پھر عبداللہ قطب الملک تخت گولکنڈہ پر بیٹھا ۔ اس نے میر جملہ سلطان کو اپنا وزیر اعظم بنایا جو تدبر اور حسن انتظام میں اپنا جواب نہ رکھتا ۔ اس نے نظم حکومت کو انہیں خطوط پر استوار کیا جس پر محمد قلی قطب شاہ نے ڈالا تھا اور ہر لحاظ سے اسکو ایک شیعہ سلطنت بنادیا جسکی نظیر اگلے ادوار میں صرف لکھنؤ پیش کرسکا لیکن مغل فوجیں بار بار بیجاپور اور گولکنڈہ کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں اس لئے عبداللہ اور میر جملہ دونوں میں سے کسی کو سکون میسر نہ آسکا ۔

حالات کا تقاضا کیا تھا اور وہ کیا کرسکتے تھے ؟ اس کا فیصلہ آسان نہ تھا پھر بھی بیجاپور کی طرح گولکنڈہ بھی جانوں کی بازیاں لگائے بغیر اپنے کو مغلوں کے رحم و کرم پر ڈالنے کیلئے تیار نہ تھا ۔ (۸۰)

دکن کے آخری حصار

دکن میں اکبر کی مداخلت برہان شاہ کے اسکے پاس پناہ لینے سے شروع ہوئی جس میں پہلی بار کوئی کامیابی نہیں ہوئی پھر مراد کے حملے کو چاند بی بی نے پسپا کیا اور آخر کار برار اور احمد نگر پر مغلوں کا پرچم لہرانے لگا۔

اب بیدر، بیجاپور اور گولکنڈہ رہ گئے تھے جہاں اکبر اعظم کے سفیر پہنچتے رہے تھے تینوں سلطنتوں نے مظاہرہ دوستی کیا تھا لیکن مغل دکن پر پورا تسلط چاہتے تھے لہذا جہانگیر نے ۱۰۱۶ھ میں دکن کی مہم کا آغاز کیا اور ۸ ذی الحج ۱۰۱۷ھ کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ شہزادہ پرویز کو روانہ کیا۔ اب دکن میں صرف ایک طاقت رہ گئی تھی ملک عنبر کی جس نے سلطنت نظام شاہی کے مابقی علاقے پر احمد نگر کی مردہ حکومت میں جان ڈالی تھی اور اس کا مرکز اورنگ آباد کو بنایا تھا۔ جہانگیر کو صورت حال کا علم ہوا تو اس نے خانخاناں خاں جہاں اور راجہ مان سنگھ وغیرہ کو شاہزادے کی مدد کیلئے بھیجا لیکن یہ لشکر دکن کو فتح نہ کر سکا اور اسکو ملک عنبر سے صلح کرنا پڑی۔

دوسری بار مغل لشکر ۱۰۲۱ھ میں دکن پہنچا۔ اس عرصے میں ملک عنبر نے فرنگیوں سے ایک توپخانہ حاصل کر لیا تھا جو مغلوں کے توپخانے سے بہتر تھا لہذا ملک عنبر نے سخت مقابلے کے بعد مغلوں کو شکست دیدی۔

۱۰۲۴ھ میں جہانگیر نے پھر دکن پر فوج کشی کرائی۔ ملک عنبر نے فوج کے دو حصے کر دئے تھے۔ ایک حصہ نے جنگ میں شکست کھائی تو ملک عنبر نے دوسرے حصے کو لیکر اتنا زبردست حملہ کیا کہ مغل لشکر میں زلزلہ پیدا ہو گیا لیکن افسروں نے اپنے قدم مضبوطی سے جمائے رکھے اور سنبھل کر یلغار کی تو عنبر کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ دولت آباد کی طرف فرار ہو گیا۔

اب شاہزادہ خرم کو اودے پور سے دکن بھیجا گیا۔ اس نے سکندر عادل شاہ ملک عنبر اور والی گولکنڈہ کو صلح کے پیغامات بھجوائے جو قدرے تامل سے سب نے منظور کر لیے اور مغل سفیروں کو نذرانے پیش کیے۔

۱۰۲۹ھ میں شاہجہاں پھر دکن آیا۔ اس مدت میں ملک عنبر نے اپنے کو سنبھال لیا تھا۔ علی عادل شاہ نے مہابت خاں کے توسط سے اقتدار کی سند حاصل کر لی تو ملک عنبر اکیلا رہ گیا۔ ۱۰۳۳ھ میں اس نے قطب الملک سے دو سال کی رقوم وصول کیں جو وہ فوج کیلئے سالانہ دیا کرتا تھا پھر عادل شاہ کے عمال کو قتل کیا اور بیدر کو لوٹا۔ آخر میں بیجاپور پر چڑھائی کر دی۔ مہابت خاں نے برہانپور کا لشکر عادل شاہ کی مدد کیلئے بھجوا دیا تو عنبر نے محاصرہ اٹھا لیا لیکن مغلوں اور عادل شاہ نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ مجبوراً ملک عنبر نے پلٹ کر جنگ کی اور ایسی جنگ کہ مغلوں اور عادل شاہی لشکر دونوں کو مار بھگایا۔ ان کے بڑے بڑے سردار گرفتار ہو گئے عنبر نے بیجاپور ملکہ پور اور برہان پور تک کے علاقے تاراج کر ڈالے جس سے مغلوں کی ساکھ پر ضرب کاری لگی۔

بات یہ تھی کہ دکنی مغل اقتدار کو قبول کرنے پر تیار نہ تھے اس لئے ملک عنبر کو ہر قسم کی مدد مل رہی تھی۔ اسی عرصے میں شاہجہاں نے جہانگیر سے بغاوت کی تو ملک عنبر نے اس کا تعاون حاصل کر لیا۔ یاقوت غلام جب برہان پور فتح کرنے بڑھا تو شاہجہاں بھی اسکے ساتھ تھا لیکن جب شاہجہاں کو معافی مل گئی تو وہ علیحدہ ہو گیا مگر ملک عنبر اور یاقوت مغلوں کے سامنے سینے تانے کھڑے رہے۔

انہیں دنوں میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ نظام شاہ کے حبشی غلام کی محبوبہ پر خاں جہاں لودی مغل حاکم فریفتہ ہو گیا۔ محبوبہ نے پانچ لاکھ نقد اور دو تین لاکھ کے زیور لیکر بالا گھاٹ نظام شاہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اسکی جرأت اتنی بڑھ گئی تھی کہ جب عادل شاہ نے حملہ کیا تو اس نے فوج کی قیادت کر کے عادل شاہ کو شکست دیدی۔

شاہجہاں نے تخت نشین ہوتے ہی بالا گھاٹ کا مطالبہ کیا۔ نظام شاہ نے

اپنے پروردہ مرہٹہ سردار ساہوجی بھونسلہ کو بھیج کر خاندیش پر حملہ کرادیا تاکہ مغلوں کی توجہ ادھر مبذول ہوجائے اور قلعہ بیر کا مسئلہ التواء میں پڑجائے۔

دکنی مغلوں کے مقابلے میں ہر قیمت پر اپنی سرزمین کو بچانا چاہتے تھے لہذا نظام شاہ نے مرہٹوں کی سرپرستی کرکے انکو اپنی دفاعی قوت بنالیا تھا نظام شاہ کی ان ترکیبوں کو سمجھ کر شاہجہاں خود دکن کا عازم ہوا۔ اسکی ایک وجہ اور تھی کہ مغل سلطنت کا باغی خاں جہاں لودی بھی نظام شاہ سے مل گیا تھا اور اسکی قوت بڑھ گئی تھی

۱۰۳۹ھ میں برہانپور پہنچنے سے قبل شاہجہاں نے ارادت خاں، راجہ گج سنگھ اور شائستہ خاں کی سرکردگی میں فوجیں دکن روانہ کیں اور کوئی کامیابی ہوتے نہ دیکھ کر آصف خاں کو سپہ سالار بناکر بھیج دیا۔ ان فوجوں نے منصور گڑھ، دہارور مسخر کرلیا۔ دباؤ بڑھتے دیکھ کر عادل شاہ ثانی والی بیجاپور نے صلح کی بات چیت شروع کردی جس سے مغلوں کی پیش قدمی کچھ رک گئی۔ یہی عادل شاہ کا منشاء تھا۔ اسکے بعد جب دکنیوں سے افواج شاہی کا مقابلہ ہوا تو انہیں شکست ہوئی اور دکنیوں نے اپنے مفتوحہ علاقے واپس لے لیے۔

ملک عنبر کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا فتح خاں جانشین ہوا۔ اس عرصے میں مرتضیٰ نظام شاہ کی جگہ اس کا بیٹا برہان لے چکا تھا۔ اس نے شروع ہی سے مغلوں کے خلاف زبردست مہم چلا رکھی تھی لہذا مغل امراء کی سازش سے فتح خاں نے اسکو گرفتار کرلیا اور شاہجہاں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے گلاگھونٹ کر مار ڈالا تاکہ ہر ایک کو طبعی موت کا یقین ہوجائے۔ پھر فتح خاں نے احمد نگر کے کئی باوفا امراء کو بھی ٹھکانے لگادیا اور برہان کے دس سالہ بیٹے حسین کو تخت پر بٹھادیا۔

اس طرف سے فراغت پاکر شاہجہاں نے آصف خاں کو بیجاپور پر حملہ کرنے کا حکم دیا تاکہ سابقہ بدعہدیوں کی سزا دے سکے۔ ۱۰۴۱ھ میں فتح خاں کا بیٹا عبدالرسول شاہجہاں کی خدمت میں حاضر ہوا اور آٹھ لاکھ نذرانہ پیش کیا جس سے خوش ہوکر شاہجہاں نے نئے نظام کا مفتوحہ علاقہ واپس کردیا۔

لیکن بیجاپور کا قضیہ اسی طرح چلتا رہا۔ آصف خاں نے بھالکی اور سلطانپور

وغیرہ فتح کرلیے تھے۔ عادل شاہ نے مصلحتاً چالیس لاکھ نذرانے اور اطاعت کی پیش کش کردی مگر نہ روپیہ بھیجا اور نہ اطاعت کی۔ اس فریب سے یہ فائدہ ہوا کہ شاہی لشکر میں رسد کی کمی ہونے لگی۔ مجبور ہوکر آصف خاں نے بیجاپور کے علاقوں پر تاخت شروع کردی۔ آخر ذی الحجہ ۱۰۴۱ھ میں شاہجہاں دکن کو مہابت خاں پر چھوڑ کر آگرہ واپس ہوگیا۔

مرہٹہ سردار شاہ جی بھونسلہ ہنوز احمد نگر سے وابستہ تھا لیکن اب وہ حدود سے تجاوز کرتا جارہا تھا لہذا نئے نظام حسین شاہ نے اسکی جاگیر ضبط کرکے فتح شاہ کو دیدی جس سے وہ ناراض ہوکر عادل شاہ کے پاس بیجاپور چلا گیا اور وہاں سے ایک لشکر لے کر مغلوں کے مقابلے پر آگیا جو دولت آباد کی طرف بڑھ رہے تھے۔

فتح خاں یقیناً مغلوں سے ملا ہوا تھا لیکن دولت آباد کی تسخیر کا مطلب یہ تھا کہ پورا دکن مغل سلطنت میں شامل ہوگیا اس لئے وہ عادل شاہ کے اکسانے پر دولت آباد پہنچ گیا۔

مغل لشکر جب شاہ جی بھونسلہ کو شکست دینے کے بعد آگے بڑھیں اور دولت آباد کے سامنے پہنچا تو ان پر قلعہ سے شدید گولہ باری ہوئی۔ مہابت خاں خود دولت آباد کے محاذ پر تھا اس نے لشکر کا اک حصہ عادل شاہ اور بھونسلہ کو روکنے کیلئے متعین کردیا جو دولت آباد کو بچانے کیلئے قریب پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے مغلوں کا زور کم کرنے کیلئے ایسا انتظام کیا کہ انہیں رسد پہنچنے نہ پائے۔

مغلوں نے دکنی فوج میں سازش کا جال بچھا رکھا تھا۔ وہ فتح خاں کے ایک سردار محلدار خاں کو توڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ مہابت خاں نے اسکو بھونسلہ پر لگادیا اور محلدار خاں نے پہاڑی علاقے میں جاکر اسکے اہل و عیال کو گرفتار کرلیا۔ ڈیڑھ لاکھ روپیہ، چار سو گھوڑے اور چار سو ہاتھی اسکے ہاتھ لگے۔

محلدار خاں کے مغلوں کی طرف ہوجانے سے فتح خاں کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اس نے پھر مغلوں سے صلح کرلی اور ۹ ذی الحجہ ۱۰۴۳ھ کو قلعہ مغلوں کے حوالے کردیا۔ احمد نگر کے کم سن بادشاہ حسین کو گرفتار کرلیا گیا اور قلعہ گوالیار میں نظر بند کردیا گیا۔

اب مہابت خاں نے ظفر نگر کا رخ کیا۔ درمیان میں کئی بار بیجاپور کے لشکر سے مقابلہ ہوا مگر مہابت خاں انکو پسپا کرتا ہوا بڑھتا رہا اور ظفر نگر کو حصار میں لے لیا۔ آخر اسکو فتح کر لیا۔

راجہ بھارت کو قطب شاہ کی طرف بھیجا گیا تھا۔ قطب شاہی فوجوں نے کئی مرتبہ اس سے ٹکر لی مگر شکست کھائی۔ آخر تلنگانہ میں قلعہ ویکلور پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس طرح مہابت خاں کی کوششیں دکن میں بڑی حد تک بار آور ہوئیں۔

۱۰۴۵ھ میں شاہجہاں نے والی گولکنڈہ کو اطاعت کا پیغام بھیجا اور اپنے ملک میں شاہ ایران کا خطبہ موقوف کرنے کا حکم دیا۔ قطب الملک نے اسکی تعمیل کی اور شاہجہاں کا اطاعت گزار بن گیا۔

اسی طرح کا ایک فرمان عادل شاہ کے نام بھی بھیجا گیا۔ اس نے بظاہر تو اطاعت کا وعدہ کر لیا مگر درپردہ بغاوت پر آمادہ رہا اسکی اطلاع شاہجہاں کو ملی تو اس نے لشکر کشی کا حکم دیدیا۔ شاہ جی بھونسلہ نے اس درمیان نظام شاہی خاندان کے ایک لڑکے کو تاجدار بنالیا۔ مغل لشکر جب خاں دوراں، خان زماں، شائستہ خاں اور علی وردی خاں کی ماتحتی میں دکن پہنچا تو شاہ جی بیجاپور کے سپہ سالار اندولہ خاں کو لیکر مقابلے پر آگیا۔

مغلوں نے اپنی فوج کو کئی حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ علی وردی خاں کی سرکردگی میں احمد نگر کی سمت بڑھا۔ اس نے قلعہ دہرپ، سنجرانی اور احمد نگر کے دیگر علاقے فتح کیے۔ شائستہ خاں نے جینر پر حملہ کیا۔ بھونسلہ کے بیٹے کو شکست دے کر اسکے مقبوضات لے لیے۔

خاں دوران نے بیجاپور کے علاقے تباہ کر ڈالے۔ قصبوں اور شہروں کو اجاڑتا وہ نواح بیجاپور میں پہنچا، گلبرگہ کے قریب ہیراپور کو برباد کر دیا اور قلعہ سردھوان کو مسخر کر لیا جو بیجاپور کا دروازہ تھا۔ مجبوراً عادل شاہ اطاعت پر آمادہ ہو گیا۔ شاہجہاں نے بعض شرائط پر اسکے ملک کا کچھ حصہ اور احمد نگر کے وہ مقبوضات جو بھونسلہ کے تصرف میں تھے اسکے لئے چھوڑ دئے اور پابندی عاید کی کہ نظام شاہی خاندان کی کوئی فرد باقی نہ رہنے اور مرہٹہ سردار شاہ جی اگر نوکری نہ کرے تو عادل

شاہی حدود میں رہنے نہ پائے۔

شاہ جی بھونسلہ اس طرح اطاعت کرنے والا نہ تھا۔ اس نے مغلوں اور عادل شاہی لشکروں سے کئی بار مقابلہ کیا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتا رہا مگر تابہ کے آخر اس نے عادل شاہ کی نوکری کر لی اور کٹ پتلی نظام شاہ کو اعظم خاں کے حوالے کر دیا۔ اس طرح احمد نگر کے چپے چپے پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔

اورنگزیب اور دکن

اسی سن میں شاہجہاں نے اورنگزیب کو دکن کا وائسرائے بنا کر بھیج دیا۔ دکن کے موجودہ مغل مقبوضات میں دولت آباد احمد نگر اور اسکے مفصلات، بالا گھاٹ میں تلنگانہ، خاندیش میں آسیر اور برہانپور برار شہر الچپور اور قلعہ کاربل شامل تھے اورنگزیب نے قلعہ اودگیر، اڑیسہ اور جنیر وغیرہ فتح کیے۔ ۱۰۴۶ھ میں وہ دکن سے واپس ہوا تو آخری نظام شاہ اور اسکے رشتہ داروں کو ساتھ لیا جو قلعہ گوالیار بھیج دئے گئے

اسی سال اسکی شادی ہوئی پھر دکن واپس ہو کر اس نے بگلانہ کے آٹھوں قلعوں پر قبضہ کیا اور راجہ بگلانہ کو سلطانپور کی جاگیر دیدی۔

اب دکن کی صورت حال یہ تھی کہ نظام شاہی، برار اور بیدر کی حکومتیں ختم ہو چکی تھیں۔ گولکنڈہ اور بیجاپور باقیات الصالحات کی طرح باقی تھیں ان کو دکن کے مریض نیم جان سے تعبیر کیا جاسکتا لیکن احمد نگر نے برش شمشیر کے جو جوہر دکھائے تھے ان کے پیش نظر دکن کے نیم مردہ شیروں کو بھی شیر ہی سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مغلوں کے ٹڈی دل لشکروں کے سامنے عبداللہ قطب شاہ یا علی عادل شاہ ثانی کی حقیقت کیا تھی پھر بھی اورنگزیب نے گولکنڈہ پر حملہ کرنے کے بجائے پہلے اسکی طاقت کمزور کرنے کی تدابیر اختیار کیں۔

میر جملہ سلطان کو گولکنڈہ میں کلی اختیارات اور بڑا اعزاز حاصل تھا مگر جب اسکو مغل حکومت میں اعلیٰ عہدے کی پیش کش کی گئی تو اسکی وفا کے قدم ڈگمگا گئے حقیقت یہ ہے کہ گولکنڈہ اور دہلی کی حکومتوں کا کوئی توازن اور تقابل ہی نہ تھا۔ اکتفا صرف اسی پر نہیں کی گئی بلکہ عبداللہ قطب شاہ کو شاہجہاں کی طرف سے فرمان

بھیج دیا گیا کہ میر جملہ اور اسکے بیٹے محمد امین کو فلاں فلاں منصب دیدئے گئے لہذا انہیں گولکنڈہ کی ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔

عبداللہ قطب شاہ لاکھ کمزور سہی لیکن ابھی تک دکن کا بادشاہ تھا۔ اپنی بے عزتی برداشت نہ کرسکا۔ اس نے ان دونوں کو بھیجنے کے بجائے قید کر دیا۔ اسے اورنگزیب کا بیٹا سلطان محمد ایک بڑا لشکر لیکر گولکنڈہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ قطب شاہ کو حیدرآباد کے مرکزی شہر میں اسکی اطلاع ملی ناطاقت بادشاہ میں مغلوں سے براہ راست ٹکر لینے کا یارانہ تھا۔ اس نے میر جملہ اور محمد امین کو رہا کر دیا اور حیدرآباد سے آکر گولکنڈہ کے مضبوط قلعے میں پناہ گزیں ہو گیا۔

سلطان محمد نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا، لیکن گولکنڈہ کا قلعہ فتح کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ ادھر قطب شاہ نے بھی سوچا کہ صدقہ دینے سے بلا رد ہو سکتی ہے لہذا اس نے ایک کڑور روپیہ تاوان جنگ بھی ادا کر دیا۔

۱۰۶۶ھ میں میر جملہ کو قلمدان وزارت پانچ لاکھ روپیہ اور شش ہزاری منصب اور معظم خاں کا خطاب عطا کیا گیا اور سعد اللہ خاں کے انتقال پر یہ عہدہ مستقل ہو گیا۔ اسکے بیٹے محمد امین کو خانی کا خطاب اور دوہزاری منصب دیا گیا۔

۱۰۶۶ھ میں علی عادل شاہ ثانی کا انتقال ہوا تو امرائے بیجاپور نے اسی خاندان کے ایک لڑکے سکندر کو تخت نشین کر دیا۔

مغلوں نے اسکو سنہرا موقع قرار دیا اور سکندر کو مجہول النسب مشہور کر کے بیجاپور پر حملہ بول دیا۔ میر جملہ خود دکنی تھا۔ وہ ایک لشکر جرار لے کر دہلی سے دکن پہنچا اور نگزیب نے خاں جہاں کو اورنگ آباد میں چھوڑا اور خود چاندور سے آگے بڑھ کر بیدر کا محاصرہ کرلیا اسکے بعد گلبرگہ فتح کیا۔ اس دوران شاہ جی کے بیٹے سیواجی نے مغل لشکر پر چھاپہ مارا جو احمد نگر کے خاکستر پر مرہٹہ راج کے خواب دیکھ رہا تھا۔

مغل لشکر نے ایک ایک کر کے بیجاپور کے بہت سے قلع فتح کرلیے۔ سکندر عادل شاہ نے ایک کروڑ پچاس لاکھ روپے بطور تاوان جنگ ادا کرنے کا وعدہ کرلیا مگر اسکے مفتوحہ قلعے واپس نہیں ہوئے۔

شاہجہاں کی بیماری اور دکن سے اورنگزیب کی واپسی کے بعد مرہٹوں کو

میدان صاف ملا۔ کل وہ دکنی درباروں میں معمولی نوکریاں کرتے تھے پھر انہیں فوجی دستوں کی صورت میں منظم ہونے کا موقع ملا جن کا کام سلاطین دکن کے اشاروں پر لوٹ مار کرنا تھا۔ اب پانچ میں سے تین بادشاہ ختم ہوچکے تھے۔ صرف بیجاپور اور گولکنڈہ باقی تھے جن میں بیجاپور کو ماضی کے مقابلے میں دیکھا جاتا تو گویا وہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا، گولکنڈہ اندر کی طرف ایک دائرے میں سمٹ کر کچھ کچھ توانا تھا۔ مرہٹوں کو سیواجی نے منظم کیا تو وہ اس طرح ابھرے کہ جہاں موقع ملا وہاں لوٹ مار کر کے دولت اکٹھا کی پھر پونا کے قریب ایک قلعہ لے کر اسکو اپنا مستقر بنالیا اور آہستہ آہستہ ایک مملکت کا طور ڈال دیا۔

کل کے آقا آج انکی نظر میں حقیر تھے۔ بیجاپور کے بعض علاقے تو انہوں نے لے ہی لیے تھے اسکے ساتھ مغلوں کے علاقوں کو بھی معاف نہیں کیا اور جلد ہی وہ دن آگیا کہ سیواجی نے راجہ ہونے کا اعلان کر دیا جسکے پاس بری فوج بھی تھی اور بحری بیڑا بھی۔

مغلوں نے ابتداً مسلم فرمانرواؤں کو ختم کرنے کیلئے مرہٹوں کی پیٹھ ٹھونکی تھی اور ان سے اپنی فتوحات میں مدد لی تھی۔ اب انہوں نے بڑے بڑے دھوکے دئے تھے شدید سے شدید تر نقصانات پہنچائے تھے۔ پھر بھی اورنگزیب چار پانچ سال بعد جب دکن کے بچے کھچے باقیات کو ختم کرنے کے درپے ہوا تو اس نے ۱۰۷۶ھ میں سیواجی اور نیتاجی سے صلح کرلی اور دکن کے مریضان ناتواں کو تلوار کا لوہا چٹانے کیلئے مرہٹوں کی تلواریں مستعار لے لیں۔

جنوبی ہند کا چپہ چپہ مرہٹوں کا جانا بوجھا تھا۔ انکے اجداد اسی سرزمین پر کبھی احمد نگر، کبھی بیجاپور کے وفادار سپاہیوں کی حیثیت لڑتے رہے تھے اب مغلوں کے لئے اسی سرزمین کو مسخر کرنے جا رہے تھے لہذا نیتاجی کو معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اس نے قلعہ پھل تن فتح کیا پھر بڑھتا چلا گیا۔ بیجاپور کے پاس صرف تھوڑا سا علاقہ رہ گیا تھا جو اسلاف کے نام ونشان کے طور پر باقی تھا اور تھوڑے سے سرفروش تھے۔ انہوں نے قدم قدم پر فداکاریاں دکھائیں مگر ہر مورچے پر شکست کھائی اور ان کا بہادر اور وفادار سردار یاقوت حبشی مارا گیا۔

راجہ جے سنگھ کو اورنگزیب نے حکم دیا تھا کہ بیجاپور کو ختم کیے بغیر واپس نہ ہو۔ وہ اسکے قریب پہنچ گیا تھا لیکن گولکنڈہ کی فوج سکندر عادل شاہ کی مدد کیلئے آگئی تو حملوں کی رفتار سست پڑگئی پھر موسم کی خرابی کے باعث حملہ آوروں کو واپس ہونا پڑا۔

اورنگزیب نے شیعہ دشمنی میں سانپوں کو دودھ پلاکر بھیجا تھا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ دونوں کو اپنا انجام معلوم تھا لیکن ان کا عقیدہ تھا کہ عزت کی موت وہ ہے جو آخری سانس تک مدافعت کرکے حاصل ہو اس لئے انہیں تلوار ٹکڑے ٹکڑے ہوجانے تک لڑنا تھا، وہ لڑتے رہے تھے اور آئندہ بھی آخری سانس تک لڑتے رہنے کا عزم تھا۔

ادھر اورنگزیب کا فیصلہ تھا کہ ان بدعتیوں سے دکن کو پاک کرکے رہے گا حالانکہ بدعتی اسکے گرد اگرد بڑھتے ہی جارہے تھے: شائستہ خاں، علی وردی خاں اور مہابت خاں وغیرہ تو پہلے ہی سے تھے جن میں اس نے میر جملہ اور محمد امین کا اضافہ کرالیا تھا۔ شاہجہاں سے اس نے گولکنڈہ میں فرمان بھجوایا تھا: تبرا بند کیا جائے اور خطبہ امامیہ کے بجائے خطبہ چاریار جاری کیا جائے۔ اسکے سفیر کی موجودگی میں اسپر عملدرآمد کرلیا گیا تھا اسکے بعد وہ سب کچھ ہونے لگا تھا جو ہوتا آیا تھا۔

ظلم کی یہ نوعیت بھی انصاف طلب ہے کہ خطبہ امامیہ ایک فرقے کا عقیدہ ہے، اسکو ترک کرکے وہ خطبہ چاریار پڑھے، جس کا کسی کے عقیدے سے کوئی تعلق نہیں اور جو ہمیشہ سرکاری ہدایت کے رواج میں داخل رہا مگر اورنگزیب کو عصبیت نے اندھا کردیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ راجپوت اکبر اعظم کے وقت سے سلطنت مغلیہ کے وفادار تھے اب مغل دشمن بن گئے تھے اور مرہٹے جو مستقل دشمن تھے وہ اسکی پناہ میں آگئے تھے۔

آخر ۱۰۹۲ھ میں خود اورنگزیب دکن کی طرف روانہ ہوا۔ سیواجی اپنے بعد ایک بڑی طاقت اور ایک مضبوط حکومت چھوڑ گیا تھا مگر اورنگزیب کو اس سے زائد گولکنڈہ اور بیجاپور سے ضد تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ان میں کوئی دم خم نہیں ہے۔ اگر وہ ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے بجائے مغل سلطنت کے زیر سایہ انہیں زندہ رہنے

دیتا اور مرہٹوں کا استیصال ان کے ذریعے کراتا تو انکو کامیابی ہوجاتی کیونکہ دکن کی سرزمین ان سے مانوس تھی۔ ہندو مسلمان سب ان کے علم کے نیچے بسر کرتے چلے آئے تھے۔

لیکن عصبیت میں پہلے اس نے گولکنڈہ پر توجہ کی کیونکہ وہ بیجاپور کی مدد کیلئے آجاتا تھا۔

گولکنڈہ کی فوجوں نے کئی محاذوں پر مغلوں کا سخت مقابلہ کیا لیکن کہاں گولکنڈہ کا قلیل لشکر اور کہاں مغلوں کے ٹڈی دل انہیں مسلسل شکست ہوتی رہی آخر والی گولکنڈہ نے گرانقدر رقوم کے وعدے اور بیش قیمت تحائف پر صلح کرلی۔

اسکے بعد اورنگزیب نے بیجاپور کا رخ کیا مگر اہل دکن نے مغلوں کو چاروں طرف سے گھیر کر رسد بند کردی پھر مزید مدد پہنچ جانے پر مغلوں نے کئی لڑائیوں میں بیجاپوریوں کو پسپا کیا۔ اسپر تنگی اور اورنگزیب کو شہزادہ معظم پر شبہ ہوا کہ وہ اہل دکن سے مل گیا ہے اس نے اسکو نظر بند کردیا مگر کچھ دنوں بعد چھوڑ دیا۔

سکندر عادل شاہ نے زندگی کی آخری لڑائی لڑی تھی۔ اسکے تمام بڑے بڑے سردار مارے جاچکے تھے۔ اب مغلوں سے ایک ٹکر بھی لینا خودکشی کے مرادف تھا لہذا اس نے قلعہ کی چابیاں اورنگزیب کو بھجوادیں پھر خود بھی حاضر ہوگیا۔

اورنگزیب نے اسکو عادل خان کا خطاب دیا اور ایک لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کردیا۔ بعض امراء کو بھی خلعت اور منصب دئے۔ اس طرح یوسف عادل شاہ کا لہرایا ہوا پرچم سو برس کے بعد ہمیشہ کیلئے سرنگوں ہوگیا۔

اب گولکنڈہ دکن کا آخری حصار تھا مگر بقول مفتی شوکت علی فہمی "اورنگزیب کو قطب شاہی حکمرانوں سے دلی نفرت تھی" لہذا بیجاپور سے فارغ ہوتے ہی اس نے فوجوں کا رخ اس سمت میں موڑ دیا۔

عبداللہ قطب شاہ کے بعد ابوالحسن تانا شاہ گولکنڈہ کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا جو بزم کی جان اور رزم کی آبرو تھا، اچھا شہسوار اور بہادر تھا، سخی متواضع عدل پرور اور رعیت نواز بھی۔ اسکی نفاست مزاج کی داستانیں آجتک زبان زد ہیں۔ اسکو زمانے کے حالات نے سب کچھ بتادیا تھا اور انجام بھی اس سے ڈھکا چھپا

نہ تھا پھر بھی اس نے مغلوں کو دانتوں چنے چبوادئے اور اب اورنگزیب نے پوری قوت سے یلغار کی تھی تو اس نے اور اسکے سالاروں نے موت اور زندگی کی لڑائیاں بھی لڑکر دیکھ لیں۔

آخر ابوالحسن قلعہ گولکنڈہ میں محصور ہو گیا۔ اس کا سپہ سالار تھوڑے سے جیالے سورماؤں کو لیکر نکل گیا جو برسوں تک مغلوں پر چھاپے مارتا رہا پھر سراغ نہیں ملتا کہ وہ لڑتے لڑتے مرگیا یا اس نے اطاعت کر لی۔

قلعہ گولکنڈہ کا فتح کرنا اتنا آسان نہ تھا ابوالحسن ایک عرصے تک مدافعت کرتا رہا پھر اسکی طرف سے صلح کیلئے ہر ممکن پیش کش ہوئی مگر اورنگزیب نہیں مانا تو اس نے سوچا کہ جب بچ سکنے کی کوئی امید نہیں تو اپنے وفاداروں کو کٹوانے سے کیا فائدہ لہذا اس نے تمام ممتاز افراد کو جمع کیا اور اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ قلعہ میں جو کچھ ہے وہ ان سب کا ہے جو کوئی نکل سکے اور جو کچھ لے جاسکے وہ لے جائے اور جو محفوظ کر سکے وہ محفوظ کرلے۔ پھر اس نے قلعے کے دروازے کھلوادئے اور مغل فوج اندر داخل ہو گئی۔

قطب شاہی سپاہی ہتھیار ڈال چکے تھے۔ اورنگزیب کے امراء جب اسکو پوچھتے ہوئے پہنچے تو وہ دسترخوان پر بیٹھا ہوا تھا۔ انواع واقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ تاناشاہ انکو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے بڑے احترام سے انہیں کھانیکی دعوت دی۔

اسکے بشرے پر وہ اطمینان وسکون تھا کہ گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اسپر مغل سردار روح اللہ خاں نے بڑے استعجاب سے کہا۔

"آپ تو اس طرح بیٹھے ہیں جیسے آپ کو شکست کے بجائے فتح حاصل ہوئی ہو"

ابوالحسن نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

"تشویش کس بات ہو جس نے بادشاہت دی تھی اس نے چھین لی۔ میں راضی برضا ہوں۔ اسکی مشیت ہے کہ ایک فقیر سے دختر سلطان کی شادی کرادی اور اسکو تخت پر بٹھادیا۔"

اس نے روح اللہ خاں کی طرف دیکھا اور بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"مطمئن ہوں کہ میں نے تخت وتاج کو بچانے میں کوتاہی نہیں کی۔ اب وہی اسکو باقی رکھنا نہیں چاہتا اور مجھے دوبارہ فقیری کی زندگی دینا چاہتا ہے تو میں انکار کیوں کروں اور اسکی مرضی کے سامنے سر کیوں نہ جھکاؤں"

پھر اس نے ہاتھ روح اللہ خاں کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسکو دسترخوان پر بٹھالیا اور دوسرے امیروں کو بھی کھانے میں شریک کیا۔

کھانا ختم ہونے پر وہ اٹھا، گھوڑے پر سوار ہو کر شہزادہ اعظم کے خیمے میں آیا کیونکہ معظم قید میں تھا۔ اعظم کے گلے میں اس نے موتیوں کی مالا ڈالی اور قلعہ کی چابیاں پیش کیں۔ اعظم اسکو اورنگزیب کے سامنے لایا اور اورنگزیب نے قلعہ دولت آباد میں اسکے آرام وآسائش کا بندوبست کردیا۔

اس موقع پر یہ روایت بھی فراموش نہیں کی جاسکتی جو زباں زد ہے کہ اورنگزیب نے اس سے پوچھا۔

"تمہیں کس طرح کی موت دی جائے"؟

"میرے لئے تلوار وخنجر کی ضرورت نہیں ہے کوئی گندی عورت میرے قریب سے گزار دی جائے" تاناشاہ نے جواب دیا اور ایک گھوسن کو اسکے قریب لے آیا گیا۔ ابوالحسن کے دماغ کی رگیں پھٹ گئیں اور اسکی روح اسی وقت پرواز کر گئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہ ہوا انجام دکن کی اس عظیم سلطنت کا جس نے ہندوستان میں عزاداری کی وہ روایات پیش کیں جو ملک کے شمال جنوب، مشرق ومغرب ہر طرف پائی جاتی ہیں۔(۸۱)

میسور

حیدر علی

اورنگزیب نے بادی النظر میں دکن کو مکمل طور پر مسخر کرلیا تھا لیکن صحیح معنیٰ میں بدامنی اسکے بعد ہی شروع ہوئی ۔ مرہٹہ ریاست سیواجی کے مرنے کے بعد کمزور پڑی تھی تو اسکے حصے بخرے ہوگئے مگر دوسری طرف مغل سلطنت بھی کمزور پڑ گئی تھی اور ہر صوبہ مطلق العنان ہوگیا تھا جسکے نتیجے میں دکن پر کبھی مسلمان بھاری پڑے اور کبھی ہندو اور چھوٹی بڑی ہندو مسلم ریاستیں وجود میں آتی رہیں ۔

ویسے بیجانگر (وجیانگرم) کے خاکستر پر بہت سی چھوٹی ہندو ریاستیں وجود میں آگئی تھیں جو آخر وقت تک باقی رہیں جن میں بعض کا رقبہ چند دیہات پر مشتمل تھا اور بعض کچھ بڑی تھیں جیسے تنجاور، مدورا اور میسور ۔ یہ سب خانہ جنگی کا شکار تھیں ۔

میسور کا راجہ چک دیو رایا اورنگزیب کا حلقہ اطاعت گلے میں ڈال چکا تھا پھر بھی ایک طاقتور حکمراں تھا ۔ ۱۷۰۴ء میں اس کا انتقال ہونے پر وزیر رانی کنتی پورا کو برسراقتدار لائے پھر ڈڈگر کرشاراج، اسکے بعد چامراج تخت پر بیٹھا مگر ان میں سے کوئی اتنا باصلاحیت نہ تھا کہ نظم حکومت پر حاوی ہو سکتا ۔ آخر میں کرشاراج ثانی نے راج گدی سنبھالی ۔

انتزاع سلطنت مغلیہ پر پورے ملک کی طرح دکن بھی طوائف الملوکی کا شکار تھا اور میسور کی حالت تو بہت خراب تھی ۔ راجہ اور وزیر آپس میں لڑ جاتے اور ایک دوسرے پر گولہ باری کرنے لگتا ۔ مرہٹوں اور مسلم امراء کے حملے اسپر مستزاد تھے ۔ ایسے میں میسور کی فوج سے ایک سپاہی ابھر کر سامنے آیا جس کا نام حیدر علی تھا جس نے غیر ملکیوں کی دشمنی میں عالمگیر شہرت حاصل کی ۔

حیدر علی کا تعلق نوائط قبائل سے تھا جو ابتداً مرہٹواڑی اور کوکن کے ساحل پر آباد ہوئے تھے پھر سلطنت بہمنی کے زمانے میں دکن پہنچنا شروع ہوئے ۔ جب بہمنی سلطنت پانچ حصوں میں بٹ گئی تو وہ بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ وغیرہ میں ملازمتیں کرنے لگے اور بعض اچھے عہدوں پر بھی فائز ہوئے ۔ یہ حکومتیں ختم ہوئیں تو انہوں نے پھر ترک وطن کیا ۔ بلاری، اننت پور، میسور، پائیں گھاٹ اور جنوبی ارکاٹ میں مسلمانوں کی جو آبادیاں پائی جاتی ہیں وہ مسلم تارکین وطن کی ہیں ۔ انہیں میں نوائط بھی شامل تھے جنکی ایک تعداد میسور کی فوج میں تھی ۔ اس تعداد میں سے ایک جیالے سپاہی حیدر علی نے اقتدار حاصل کیا ۔ نوائط نصر بن کنانہ کی نسل سے تھے اور کوفے سے نو میل کے فاصلے پر وائط میں آباد تھے لہذا بنو وائط کہہ کر پکارے گئے اور ہندوستان میں کثرت استعمال سے نوائط ہوگئے ۔ حیدر علی اسی قبیلے سے تھا ۔

کرشاراج، میسور کا راجہ تھا لیکن سارے اختیارات نندراج وزیر کے ہاتھ میں تھے ۔ میسوری فوج جب نواب ناصر جنگ کی مدد کو ارکاٹ گئی تو حیدر علی بھی اس میں شامل تھا اور جب محمد علی والاجاہ کی طلبی پر ترچناپلی بھیجی گئی تب بھی حیدر علی اسکے ساتھ تھا ۔ ان معرکوں میں اس نے کارہائے نمایاں انجام دئے اور وہ ایک دستہ فوج کا افسر یعنی نائک بنادیا گیا ۔ پھر ڈنڈی گل کا فوجدار مقرر ہوا ۔

پچھلی جنگوں میں مرہٹوں نے تاوان جنگ کے عوض میسور کا تمام علاقہ اپنے پاس رہن رکھ لیا تھا ۔ اب وہ قبضے کیلئے آئے تو راجہ نے کچھ رقم دے کر ٹالنے کی کوشش کی مگر مرہٹے راضی نہ ہوئے تو ڈنڈی گل سے حیدر نائک کو بلوایا گیا ۔

اس عرصے میں حیدر علی کی شہرت ہو چکی تھی ۔ مرہٹے اس سے خائف ہوئے اور جو کچھ ملا لیکر چلے گئے ۔ پھر حیدر علی نے رانیوں کی درخواست پر وزیر اور راجہ کی کشیدگی دور کرائی اور وہ افواج میسور کا سپہ سالار بنادیا گیا لیکن اسکی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر جلد ہی راجہ نے اسکے خلاف سازش کی اور چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے مرہٹوں کو بلالیا ۔ حیدر علی بروقت باخبر ہوگیا اور سرنگاپٹم سے بھاگ کر بنگلور

آکر پناہ گزیں ہوا۔

حیدر علی نے پوری نیک نیتی سے میسور راج کی خدمت کی تھی جس کا یہ صلہ ملا تو اس کا باغی نہ ہونا ممکن نہیں تھا جو سرمایہ بھی اسکے پاس تھا اس نے اس سے کچھ سپاہی بھرتی کیے اور انکو تربیت دے کر لڑنے کے قابل بنالیا۔

اس اثنا میں راجہ کی فوج اور مرہٹوں نے بنگلور کو آکر گھیر لیا۔ حیدر علی کے پاس تھوڑے سے سپاہی تھے۔ وہ ان فوجوں کے مقابل آیا تو اپنے سپاہیوں کو سمیٹ کر پہلے ایک حصہ پر حملہ آور ہوا پھر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ دوسرے پر ٹوٹ پڑا۔ اس طرح اس نے ایک کے سنبھلنے سے قبل دوسرے کو کاٹنا شروع کر دیا۔ اسکے سپاہی بھی طریق جنگ میں اسکے قدم بقدم تھے۔ تھوڑی دیر کی جنگ میں اس نے سب کو مار بھگایا اور مال غنیمت مل جانے کے بعد تو بنگلور اسکی فوج کی چھاؤنی بن گیا۔ ۱۷۶۱ء میں اس نے سرنگا پٹم پر بھی قبضہ کرلیا اور راجہ کی سابقہ عنایات کے پیش نظر تین لاکھ کی قدیم جاگیر اسکے لئے چھوڑ دی۔

پھر نواب بسالت جنگ کے توسط سے مغل شہنشاہ نے اسکو میسور کی صوبہ داری کی سند بھی دیدی۔

حیدر علی کے اقتدار کی جنگ دراصل ۱۷۶۱ء سے شروع ہوئی پہلے اس نے پالیگاروں کو مطیع کیا پھر بدنور کو فتح کیا جہاں اسکو ایک خزانہ مل گیا جس سے اس نے اپنی طاقت میں اضافہ کیا اسکے بعد نائروں کو شکست دی اور پورے ملیبار کو تسخیر کرلیا۔ ۱۷۶۵ء میں مرہٹوں نے اس پر چڑھائی کی اور مسلسل لڑائیوں میں حیدر علی کی طاقت زائل ہونے لگی تو اس نے سات لاکھ نقد دے کر پچاس لاکھ مزید دینے کا وعدہ کرکے ان سے صلح کرلی۔

اب نواب حیدر علی ابھرتے ہوئے سورج کی طرح پورے ہندوستان میں مشہور ہو چکا تھا لہذا محمد علی والاجاہ نظام الملک اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسکے خلاف ایک باہم اتحاد کیا اور انکی مشترکہ فوجیں میسور کی طرف بڑھنے لگیں۔ ایک مرہٹہ سردار بھی ان کے ساتھ تھا۔

حیدر علی صرف بہادر ہی نہ تھا، مدبر اور سیاستداں بھی تھا۔ اس نے اپنے مایہ

ناز بیٹے ٹیپو سلطان کو بھیج کر مدراس کا محاصرہ کرلیا جس سے انگریزوں کی پیش قدمی رک گئی مگر فرنگی شاطر اس سے زائد چالاک تھے۔ انہوں نے ایک جعلی خط حیدر علی کی طرف سے ٹیپو کو بھجوادیا جس میں محاصرہ اٹھا کر چلے آنے کی ہدایت تھی۔ ٹیپو نے باپ کے حکم کی تعمیل کی۔

حیدر علی پر جب حقیقت حال منکشف ہوئی تو اس نے خود پوری طاقت کے ساتھ مدراس کو حصار میں لے لیا اور انگریزوں کو بے دست و پا بنادیا۔ مجبوراً انہوں نے صلح کی درخواست کی اور لکھ کر دیدیا کہ حیدر علی جب ان سے مدد مانگے گا تو وہ اپنی فوج بھیجیں گے۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی سال ۱۷۷۰ء میں مرہٹوں نے میسور پر ہلہ بول دیا۔ حیدر علی نے حسب معاہدہ انگریزوں سے مدد مانگی مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا مغل سلطنت کے اس دور میں مرہٹے جس طرف کا رخ کرتے تو اس تعداد میں کہ زمین ان کے قدموں سے پامال ہو جاتی۔ یہ جنگ چار سال تک جاری رہی۔ مرہٹوں کو ہر طرف سے مدد مل رہی تھی اور حیدر علی تن تنہا ان کے مقابلے پر ایستادہ تھا۔ آخر موتی تالاب کی لڑائی میں اسکو مکمل شکست ہوئی۔ سرنگا پٹم میں دم لے کر حیدر علی نے از سر نو تیاری کی اور آئے دن مرہٹی لشکر پر شبخون مارنے لگا جس سے مرہٹے بھی عاجز آگئے لیکن لڑائی حیدر علی کی سرزمین پر ہو رہی تھی اور اسکی فوجی طاقت بھی کمزور پڑ چکی تھی اس لئے اس نے ۳۶ لاکھ تاوان جنگ دے کر صلح کرلی۔

اس کمی کو حیدر علی نے کورگ اور کڑپہ فتح کرکے پورا کیا۔ اس دوران یورپ میں فرانس اور انگلستان کی ہفت سالہ جنگ چھڑ گئی۔ فرانسیسی حیدر علی کی پناہ میں تھے انکی کوٹھی ماہی ملیبار میں واقع تھی جس پر انگریزوں نے حملہ کردیا تو حیدر علی نے ۱۷۷۸ء میں کرناٹک پر چڑھائی کر دی۔ انگریز مورخین نے اس جنگ میں حیدر علی کے طوفانی حملوں کا اعتراف کیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک رات حیدر علی نے سیکڑوں بیلوں کے سینگوں میں فتیلے باندھے، سارے بیلوں کو رسوں سے آپس میں ہمرشتہ کیا، رات کی تاریکی میں انگریزی کیمپ کے قریب ان فتیلوں کو روشن کردیا اور انکو کیمپ کی طرف ہنکا دیا۔

بیل بھڑک بھڑک کر بھاگے۔ انگریزوں نے یہ سمجھا کہ حیدر علی نے شب خوں مارا ہے۔ وہ بیلوں پر گولیاں چلاتے ہوئے دوڑ پڑے۔

اس وقفے میں حیدر علی نے عقب سے حملہ کر دیا اور کاٹ کر رکھ گیا۔

یہ جنگ جاری تھی کہ ۱۷۸۲ء میں ارکاٹ کے قریب نواب حیدر علی کا انتقال ہو گیا۔ وہ اپنے پیچھے شجاعت کی ہزاروں داستانیں چھوڑ گیا۔ نوائط کی اکثریت شیعہ تھی اور حیدر علی بھی نسلی طور پر آئمہ اثنا عشر کا ماننے والا تھا۔ اسکو زندگی بھر اطمینان سے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا مگر محرم میں مجلسیں منعقد کرتا تھا اور ماتم حسین میں سیاہ پوش ہو جاتا تھا۔

ملک گیری کیلئے کوئی جنگ جہاد کی تعریف میں نہیں آتی لیکن حیدر علی کی جنگ میں وطنیت کا ایک پہلو مضمر تھا۔ اس نے غیر ملکیوں کو ملک سے نکالنے کیلئے تلوار اٹھائی تھی لہذا میدان جنگ میں اسکی موت شہادت کے قریب ضرور پہنچ جاتی ہے۔

ٹیپو سلطان، ضیغم ہندوستان

ٹیپو نے محاذ جنگ پر ایک ہاتھ میں گھوڑے کی لگام دوسرے میں عنان سلطنت سنبھالی۔ حیدر علی کا بیٹا اسد اللہ کا پیرو تھا۔ وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح انگریزوں پر گھن گرج کے ساتھ برستا رہا۔ دو سال میں اس نے انکی حالت تباہ کر دی اور انہیں اپنی شرائط پر صلح کرنے کیلئے مجبور کر دیا۔

حیدر علی نے جن مخاصمانہ حالات میں استقرار سلطنت کیا تھا ٹیپو سلطان کو ان سے بھی برے حالات کا سامنا تھا۔ مرہٹے پہلے دن سے دشمن ہو رہے تھے اور ہم عصر مسلمان امیر جل بھن کر کباب ہوئے جا رہے تھے۔ ان میں نظام الملک پیش پیش تھا وہ انگریزوں پر سلطان کی فتح سے مارے جلن کے مرہٹوں سے مل گیا اور میسور کے خلاف ایک معاہدہ کر لیا۔

ٹیپو سلطان کا مقصد باہمی جنگ و جدل کے بجائے یہ تھا کہ غیر ملکیوں کو ہندوستان سے نکال دے اس نے نظام الملک سے رشتہ داری قائم کرنے کی پیش کش کی تا کہ دو مسلمان حکمراں آپس میں نہ لڑیں لیکن نظام نے یہ کہہ کر انکار کر دیا

کہ وہ ایک نائک کے خاندان سے سمدھیانہ قائم نہیں کر سکتا۔

اب شیر دل سلطان مجبور تھا وہ بھی میدان میں آگیا۔ چار سال تک جنگ ہوتی رہی۔ ٹیپو کی رگوں میں حیدر علی کا خون تھا اور اسکی گرمی شباب پر تھی۔ اس نے ہر محاذ پر دشمن کو شکست دی اور سلطنت خداداد میسور کی حدیں پونا اور حیدر آباد سے جا کر مل گئیں۔ دنیا دشمن تھی لیکن سلطان ٹیپو اس دور میں ہندوستان کی آبرو بن گیا اور اسکی سفارت نپولین بونا پارٹ تک پہنچ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ٹیپو کو انگریزوں سے جتنی نفرت تھی انگریز اس سے اسی قدر خائف تھے۔ وہ موقع کے منتظر تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ مرہٹوں اور نظام کی جنگ میں سلطنت خداداد کی طاقت کمزور پڑ چکی ہے تو انہوں بغیر کسی اطلاع کے میسور پر حملہ کر دیا مگر ٹیپو اتنا نرم نوالہ نہیں تھا جسکو باسانی حلق سے اتار لیا جاتا۔ دو برس کی لڑائی میں ٹیپو نے انگریزی طاقت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔

اس صورت حال میں لارڈ کانوالس کو یقین ہو گیا کہ ٹیپو سلطان سے وہ اپنی قوت پر جیت نہیں سکتا لہذا ایک طرف اس نے میسور میں سازش کا جال بچھایا دوسری طرف مقامی طاقتوں سے اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی اس میں اسے فوری طور پر کامیابی ہو گئی اور مرہٹے اور نظام اسکے اتحاد میں شامل ہو گئے۔

سازش میں ہر مقام پر انگریزوں کو ایسے مہرے مل گئے جنکو استعمال کر کے وہ شہنشاہ شجاعت کو مات دے سکتے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ٹیپو میں بہادری تو تھی مگر حیدر علی کی سی سوجھ بوجھ نہ تھی۔ سلطان ٹیپو کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہے۔ جن لوگوں پر اس نے حد سے زائد احسانات کیے تھے، جو اسکے ہاتھ پاؤں تھے، وہی دھوکا دے گئے تو وہ کیا کرتا۔ کشن رائے کی غداری سے بنگلور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا گنجام مہدی خاں نائط کی حکمرانی سے نکل گیا۔ گھر کے بھیدیوں نے لنکا ڈھا دی تو سلطان کو دکھ تو بہت ہوا مگر اس نے ہوش و حواس برقرار رکھے۔

بارش کا موسم شروع ہو چکا تھا اور سلطان تازہ ولولوں کے ساتھ مد مقابل تھا لہذا انگریز واپس ہو گئے۔ اس اثناء میں مرہٹوں کی کمک پہنچ گئی اور انگریزوں نے

پھر سرنگا پٹم کا محاصر کرلیا۔

اپنوں کے فریب اور امراء کی غداری سے سلطان دل شکستہ ہوچکا تھا۔ آخر اس نے ۱۷۹۲ء میں نصف سلطنت دے کر انگریزوں سے صلح کرلی۔ وہ بھی ٹوٹ چکا تھا اور اسکی سلطنت بھی بٹ چکی تھی لیکن شیر کا دل اور لوہے کا کلیجہ تھا حیدر علی کے بیٹے کا کہ نئے حوصلے اور تازہ امنگوں کے ساتھ فوجی تنظیم اور ملکی تعمیر میں لگ گیا اور چھ سات برس بعد انگڑائی لے کر اٹھا تو دنیا کو محسوس ہوا کہ جنگل کا شیر خواب سے بیدار ہوا ہے۔ اب اسکے پاس بحری بیڑا بھی تھا اور اتنی مضبوط فوج جو وقت پڑنے پر سیسہ پلائی دیوار بن سکتی تھی۔

لیکن کتنے بے ضمیر تھے اہل ہندوستان کہ جو طاقت سفید فام قوموں کو مادر وطن سے نکالنے کیلئے فراہم کی گئی تھی اسکو دیکھ کر وہ جلتے تھے۔ ٹیپو نے سلطان ترکی اور والی افغانستان دونوں سے خط و کتابت کی تھی اور ان کو مدد دینے پر آمادہ کرلیا تھا۔

اس مدت میں انگریزوں نے صرف یہ کام کیا تھا کہ اپنے تجارتی ذہن کے تحت سلطنت خداداد کے عہدہ داروں کو خریدتے رہے تھے اور ایسے سبز باغ دکھائے تھے کہ اگر انہوں نے ٹیپو کو ختم کرادیا تو انکی دنیا جنت بن جائے گی۔

ان میں سے بیشتر سلطنت کے ذمہ دار عہدوں پر فائز تھے اور سلطان کی طرف سے انہیں گرانقدر عطیات بھی ملتے رہتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انگریزوں سے وہ اس سے زائد کس چیز کی توقع کر رہے تھے کہ اپنے ملک کی کشتی ڈبونے پر تیار ہوگئے۔

امراء میں میر صادق، میر معین الدین، بدرالزماں نائطہ، میر غلام علی لنگڑا، میر قمرالدین اور پورنیا، دوسرے درجے کے لوگ ان کے علاوہ تھے۔ پورنیا کو میسور میں ہندوراج کا خواب دکھایا گیا تھا اور قمرالدین کو ریاست گرم کنڈہ کے تخت کی امید دلائی گئی تھی۔ یہ سب انگریزوں کے تابع فرمان بن گئے اور ان کے حکم کے منتظر ہوگئے اور آخر انہیں ایک دن تعین وقت کے ساتھ ایک منصوبہ مل گیا۔

غدار پورنیا وزیر مالیات تھا۔ اس نے وہ دن فوج کو تنخواہ تقسیم کرنے کا مقرر کردیا اور انگریزی فوج جب سرنگا پٹم کی طرف بڑھی تو بیشتر فوجی تنخواہ لینے

کیلئے گئے ہوئے تھے۔

میر قمرالدین فوج کا سپہ سالار تھا اس نے انگریزوں کی پیش قدمی میں کوئی مزاحمت نہیں کی۔ شہزادہ فتح حیدر نے بڑھ کر روکنے کا ارادہ کیا تو قمرالدین نے اسکو منع کردیا شاہزادہ یہ سمجھا کہ سپہ سالار کا کوئی جنگی منصوبہ ہوگا جسکے تحت روکا جا رہا ہے۔ وہ خاموش ہوگیا اور انگریز فوجیوں نے سرنگا پٹم کے گرد ایک حصار بنالیا۔

۴ مئی ۱۷۹۹ء کی دوپہر کو سلطان ٹیپو دسترخوان پر بیٹھا ہوا تھا کہ اسکو اس واقعہ کی اطلاع ملی۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور طاوس نامی گھوڑے پر سوار ہوگیا۔

اس موقع پر فرانسیسی مشیروں نے کہا کہ اسکے پاس ابھی بہت سے قلعے ہیں وہ نکل چلے اور کسی قلعہ میں پناہ لے کر تیاری کرے مگر سلطان کو یا تو ہر ایک کے بک جانے کا علم نہ تھا یا اسکی شجاعت نے پیٹھ دکھانا عار سمجھا ہو۔ وہ گھوڑا بڑھا کر باہر آگیا اور شمال میں فصیل کی طرف بڑھتی ہوئی انگریزی فوج کو اس نے روک لیا۔

جنوبی فصیل پورنیا کی غداری سے انگریزوں کے قبضے میں آچکی تھی۔ سلطان شمالی فصیل پر پہنچا تو نمکحرام میر صادق نے اسکی اطلاع انگریزوں کو کردی۔

سلطان کے ساتھ صرف اسکے ذاتی محافظ تھے ان وفاداروں نے جانیں دیدیں مگر انگریزوں کو دوپہر سے سہ پہر تک بڑھنے نہ دیا حالانکہ ادھر سلطان کی موجودگی کی اطلاع پاکر انگریزوں نے دباؤ بڑھا دیا تھا مگر ان کا مقابلہ شیروں سے تھا جو مرنا جانتے تھے پسپائی کو ننگ سمجھتے تھے۔

اس وقفے میں سلطان نے دیکھا کہ انگریز جنوب میں اندرونی فصیل پر آگئے ہیں۔ وہ تیزی سے واپس ہوا۔ اس کا ارادہ تھا کہ محل میں پہنچ کر بارودی سرنگوں میں آگ لگادے جو اس نے اسی دن کیلئے بچھوا رکھی تھیں لیکن غداری اپنی آخری بلندیوں کو پہنچ چکی تھی۔ میر صادق نے ڈڈی دروازے کو پہلے سے بند کرادیا تھا جو سلطان کی آمد رفت کا راستہ تھا۔ سلطان اس راہ کو مسدود پاکر اندرونی دروازے کی طرف بڑھا اسکو انگریزوں نے تین طرف سے گھیر رکھا تھا۔

مسلسل جنگ کے باعث سلطان کو بہت پیاس لگی تھی۔ اس نے غلام سے پانی طلب کیا۔ اس کم بخت نے دینے سے انکار کردیا اور کہا "اپنے کو انگریزوں کے

حوالے کر دیجئے۔"

عقل انسانی تحیر میں پڑجاتی ہے کہ سرنگا پٹم میں کتنے نمکحرام تھے۔ چھوٹے سے بڑے تک سب ملک و قوم کے دشمن اور سلطان کے خون کے پیاسے جبکہ سلطان کی سیرت کا جائزہ لیا جائے تو حد درجہ نیک نفس، اقربا پرور اور حقوق آشنا۔ اس نے ہر ایک کو اسکی حیثیت سے زائد نوازا تھا۔ صورت حال کو سمجھ کر شاید اس کا کلیجہ پھٹ گیا ہو کہ اس دنیا میں رہنے سے کیا فائدہ جس میں اتنے تنگ انسانیت بستے ہوں۔ اس نے غلام پر ایک نظر ڈالی اور اسکی زبان سے نکلا۔

"شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے"

پھر باحمیت اور غیرت دار سلطان موت یا زندگی کی جنگ کرنے لگا بچے کھچے ساتھیوں میں ایک ایک کر کے گرتا رہا۔ سلطان کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا لیکن اسکی بندوق اس وقت تک چلی جب تک اسکے ایک ہاتھ میں ذرا سی سکت بھی باقی رہی پھر وہ اس دنیا سے اپنا رشتہ توڑ گیا جس میں اب وہ رہنا بھی نہ چاہتا تھا۔

۴ مئی ۱۷۹۹ء کا سورج جب مغرب میں ڈوبا تو ڈوبتے ڈوبتے اس نے اپنی کرنوں سے افق ہندوستان پر ایک نام لکھا۔

سلطان فتح علی ٹیپو شہید :

یہ نام آج بھی جبین حریت پر درخشاں ہے اور جب تک یہ نام باقی ہے اس وقت تک چند غلیظ آدمیوں کے نام بھی لیے جاتے رہیں گے جو انسانیت کے دامن پر ایک بدنما داغ ہیں۔

مشرق کی سرزمین نے مغرب کے سفید فام انسانوں کو انکی شقاوت اور بیرحمی کے سبب کبھی پسند نہیں کیا۔ بالخصوص ہندوستان میں تو ان کا وجود ہمیشہ ایک بوجھ قرار دیا گیا مگر کھل کر جس شخص کے ان خلاف پہلا نعرہ لگایا وہ حیدر علی تھا اور پھر اس کا عظیم بیٹا جسکی آواز بازگشت آج بھی فضائے بسیط میں گونجتی ہے۔

"ہندوستان صرف ہندوستان والوں کا ہے"۔

ٹیپو ایک شیعہ باپ کا بیٹا اور شیعہ اسلاف کی اولاد میں تھا مگر عملی زندگی میں وہ پہلے انسان پھر شیعہ تھا اور شیعیت کے زاویہ نگاہ سے اس کا یہ انداز غلط نہ تھا۔

کیونکہ اسلام صرف انسان کو انسان بنانے ہی کیلئے آیا تھا البتہ شیعی نقطہ نظر سے اس نے عزاداری میں بعض ترمیمات کی کوشش کی تھی جو پسند نہیں کی گئیں اور اسی پر ایک حلقے نے کہہ دیا کہ وہ سنی تھا۔

فکر کا یہ انداز بھی عجیب ہے کہ مشہور و معروف دشمن اہل بیت محمود احمد عباسی تو یہ کہتاہے ہیں کہ تمام مغل سلاطین شیعہ نہیں تو نیم شیعہ تھے حالانکہ ان میں سے شیعہ کش بھی تھے اور وضعدار سنی بھی اور ٹیپو جو پشت در پشت شیعہ تھا اسکو سنی کہہ دیا گیا اور اسکی اگلی نسلیں ساری کی ساری شیعہ رہیں۔

میرے ایک بزرگ کلکتہ میں سلطان ٹیپو کے پوتے جانی صاحب کے مکان پر مجلس عزا میں شریک ہوئے تھے ان کا کہنا تھا کہ جانی صاحب کا سا محب اہل بیت انہوں نے کم ہی دیکھا ہے۔

سنی سازی ہی کرنا ہے تو تاریخ کو مسخ کرنے کے بجائے صداقت کو ذہنوں میں بسا کر کی جائے مگر عمل اسکے خلاف ہوتا ہے۔ شیعوں کے پاس بیٹھنے کو منع کیا جاتا ہے انکا لٹریچر نہ پڑھنے کی ہدایت کی جاتی ہے حالانکہ جو برحق ہوتا ہے وہ کسی کا سامنا کرنے سے نہیں ڈرتا۔ ایک گروہ سامنا کرنے پر تو تیار ہوتا ہے مگر اکثریت کے زعم کے ساتھ اور قوت بازو کے بل پر اس سے سر تو کٹ سکتے ہیں دل جھک نہیں سکتے۔

یہ بات ہم مسلسل کہتے آئے ہیں مگر کوئی توجہ نہیں کی جاتی بلکہ جواب میں خوش اخلاقی کی بجائے تلوار بے نیام کر لی جاتی ہے۔ خدا رحم کرے اس ذہنیت پر!
(۸۲)

بنگال

علی وردی خاں

بنگال میں شیعہ کس زمانے میں اور کس مقام پر پہلے پہل پہنچے، اس کا کوئی تعین نہیں کیا جاسکتا۔ قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ بحری راستوں سے تاجروں کے ساتھ کچھ لوگ ساحلی مقامات پر وارد ہوئے۔ ان علاقوں کے بیشتر مغل صوبہ دار شیعہ رہے تھے لہذا انکی فوجوں کے ساتھ کوئی تعداد بہار سے بنگال پہنچی لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ شائستہ خاں کی گورنری میں جب میر مراد حاکم جہانگیر آباد (ڈھاکہ) نے حسینی دالان تعمیر کرایا تو شیعہ وہاں موجود تھے جنہوں نے دلی سے آئی ہوئی ضریح کو حسینی دالان میں رکھا پھر مجلس کی اور عاشور کا جلوس نکالا۔

اس سلسلے میں نواب مرشد قلی خاں کا نام خاصی اہمیت رکھتا ہے جو مقصود آباد کا ساکن اور قوم کا برہمن تھا۔ حلقہ بگوش اسلام ہو کر وہ اس علاقے کا حاکم ہوا اور اس کا نام مرشد قلی رکھا گیا۔ نام کا انداز بتایا ہے کہ اسکو کسی ایرانی نے مسلمان بنایا تھا۔ مرشد قلی حاکم مقصود آباد اپنی کارگزاری کے باعث نواب مرشد قلی خاں بن گیا پھر اس نے مقصود آباد کے ملحق ایک بستی بسائی اور آہستہ آہستہ پورے شہر کا نام مرشد آباد ہو گیا۔ (۸۳)

علی وردی خاں ۱۷۴۰ء میں جب بنگال کا صوبہ دار ہوا تو مرشد آباد کو آباد ہوئے پندرہ سال گزر چکے تھے اور وہاں شیعوں کی خاصی آبادی پائی جاتی تھی لہذا اسکو عزاداری کے فروغ میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ مجلسیں پہلے سے ہوتی تھیں، تعزیے رکھے جاتے تھے، علی وردی خاں کی توجہ سے اس میں اضافہ ہوا اور شیعوں کی تعداد بھی روز بروز بڑھتی رہی جس میں خود علی وردی خاں کے بکثرت اہل خاندان شامل تھے۔

علی وردی خاں نے بڑے دبدبے کے ساتھ حکومت کی کہنے کو وہ ناطاقت مغل بادشاہ کا صوبہ دار تھا مگر عملی طور پر آزاد حکمراں تھا۔ ۶ اپریل ۱۷۵۶ء کو اسکا انتقال ہوا تو سراج الدولہ اس کا جانشین ہوا۔

سراج الدولہ

علی وردی خاں کے کوئی اولاد نہ تھی لہذا اس نے اپنے نواسے مرزا محمد کو گود لے لیا تھا اسکو سراج الدولہ کے خطاب سے سرفراز کیا۔ سراج الدولہ ۱۱۴۵ھ میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۱۶۱ھ میں جب اسکے باپ در بھنگہ کے پٹھانوں کے ہاتھوں مارے گئے تو علی وردی خاں نے اسکو بہار کا ناظم بنادیا۔ آٹھ سال بعد علی وردی خاں کے انتقال پر وہ بنگال کا فرمانروا ہوا۔

اس کا چچا صولت جنگ فوجدار پورنیہ علی وردی خاں کے بعد خود حکومت بنگال کا امیدوار تھا لہذا سب سے پہلے سراج الدولہ کو اسکی طرف توجہ کرنا پڑی۔ علی وردی خاں کو شاید خاندانی دشمنی پیدا ہونے کا احساس تھا۔ اسی لئے اس نے مرتے وقت سراج الدولہ کا ہاتھ میر جعفر اور ہندو اکابرین کے ہاتھ میں دیا تھا۔ ان میں سے چند تو اسکے وفادار رہے اور باقی خفیہ خفیہ اسکے خلاف سازشوں میں شریک ہوگئے۔ سراج الدولہ کی رگوں میں بہادروں کا خون تھا۔ وہ شجاع بھی تھا اور مدبر بھی لیکن حد درجہ اعتماد اور نسلی روابط کے سبب غداروں کو پہچان نہ سکا لہذا جب اسکو انگریزوں کی معاندانہ کارروائیوں کی اطلاع ملی تو پورنیہ کے بجائے فورٹ ولیم کی طرف چل پڑا۔

علی وردی نے اپنے عہد میں انگریزوں کو بنگال سے نکال دیا تھا اور وہ فورٹ ولیم میں سمٹ کر رہ گئے تھے پھر آہستہ آہستہ پھیلنے لگے اسپر سراج الدولہ نے تمام مغربی تاجروں کو کوئی تعمیر یا قلعہ بندی نہ کرنے کا حکم دیا۔ فرانسیسیوں نے تو مان لیا مگر انگریز نہیں مانے۔

اسکے علاوہ کرشن داس مہاجن ۵۳ لاکھ روپیہ کا غبن کر کے ڈھاکہ سے بھاگا تھا۔ وہ بھی انگریزوں کی پناہ میں تھا۔ سراج الدولہ نے اسکی واپسی کا مطالبہ بھی کیا

اور انگریزوں کی طرف سے انکار ہونے پر اس نے ورلبھ رام اور حکم بیگ کی سرکردگی میں اپنی فوج روانہ کردی جس نے قاسم بازار فیکٹری کا محاصرہ کرلیا اور ہگلی کی رسد روک دی۔

مئی ۱۷۵۶ء میں فیکٹری انچارج نے سراج الدولہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مطالبات تسلیم کرلیے اسپر سراج الدولہ نے تمام انگریز قیدیوں کو عزت کے ساتھ رہا کردیا لیکن فوجی افسر ڈریک نے اسکی پرواہ نہیں کی اور دو فوجی دستے ساگر سکھ اور قلعہ تھانہ کی طرف روانہ کردئے جو شکست کھا کر پسپا ہوئے۔

پھر سراج الدولہ نے تیس ہزار کے لشکر سے فورٹ ولیم کا محاصرہ کرلیا۔ انگریزوں نے ۲۰ جون ۱۷۵۶ء کو ہتھیار ڈال دئے اور فورٹ ولیم سراج الدولہ کے قبضے میں آگیا۔ حالات معمول پر آچکے تھے کہ بعض انگریزوں نے شراب سے مدہوش ہو کر محافظوں کو گالیاں دیں اور ان پر حملہ بھی کیا۔ وہ گرفتار کرکے ۱۸ فٹ لمبے اور ۱۵ فٹ چوڑے کمرے میں بند کردئے گئے جس میں دو کھڑکیاں تھیں۔

قیدیوں میں چند زخمی بھی تھے جنکے مہلک زخم آئے تھے اور درد کی شدت کو کم کرنے ہی کیلئے انہوں نے کثرت سے شراب پی لی تھی وہ اس میں مرگئے۔

مشرقی حکمرانوں کو بدنام کرنا انگریزوں کا پرانا سیاسی حربہ تھا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں وہ یہی کرتے آئے تھے۔ کرناٹک میں بھی انہوں نے یہی کیا تھا اس واقعہ سے بھی بلیک ہول کی کہانی گڑھ لی اور ڈیڑھ سو سال تک بے گناہ سراج الدولہ کو بدنام کرتے رہے حالانکہ بعض انگریز مورخوں نے خود اسکی تردید کی ہے۔

لیکن وہ سراج الدولہ کو ظالم مشہور کرتے یا بیداد گر، اس سے خود ان کے مظالم پر پردہ تو نہیں پڑسکتا جو خود انہوں نے آگے چل کر بنگال پر ڈھائے۔

کلکتہ کے بعد سراج الدولہ نے پورنیہ کا راج محل فتح کیا اور دہلی سے حکومت کی سند حاصل کی۔ اس عرصے میں کرنل کلائیو اور امیرالبحر واٹسن مدارس سے بنگال آگئے۔ انہوں نے بعض چھوٹے مقامات پر قبضہ کرکے سراج الدولہ کے عامل کلکتہ سے سازش کرکے کلکتہ لے لیا اور سراج الدولہ کو نامہ و پیام سے بہلانے لگے۔

احمد شاہ ابدالی ہندوستان پہنچ چکا تھا۔ سراج الدولہ کو اسکے حملہ کا خدشہ

لگا ہوا تھا لہذا تقاضائے وقت کے مطابق سراج الدولہ نے انگریزوں سے فروری ۱۷۵۷ء کو ایک معاہدہ کرلیا اور بنگال کے انگریزی مقبوضات انہیں واپس کردئے۔

میر جعفر، درلبھ رام، جگت سیٹھ اور دوسرے بہت سے لوگ اندر ہی اندر انگریزوں کی طرف ٹوٹ چکے تھے۔ سراج الدولہ اپنی طاقت کو کمزور پارہا تھا اسکو احساس تھا کہ خود اسکے وفادار غدار بن چکے ہیں مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ کون کون سرفہرست ہیں۔

یورپ میں فرانس وانگلستان کی جنگ ہفت سالہ چھڑ چکی تھی اور انگریزوں نے ہندوستان میں فرانسیسی مقبوضات پر تصرف حاصل کرلیا تھا۔ علی وردی کا جانشین اندر اور باہر دونوں طرف کے دشمنوں میں گھر گیا تھا۔ اس نے بہت چاہا کہ انگریزوں کے جائز و ناجائز مطالبات پورے کرکے انہیں بہلادے میں رکھے اور برے وقت کو ٹال لے جائے مگر انگریز میر جعفر کو حکومت بنگال کا خواب دکھا کر اپنی غلامی میں لے چکے تھے۔ سراج الدولہ اس سے سوتے میں بھی ایسی توقع نہ کرسکتا کیونکہ اسکے لئے وہ علی وردی خاں کے بجائے تھا اور اسکی فوج کے بڑے حصے کا افسر اعلیٰ تھا

ممکن تھا کہ میر جعفر کو کسی وقت ضمیر کی آواز سنائی دیتی لیکن اس کا بیٹا میرن صاحب حکومت کیلئے دیوانہ ہو رہا تھا اس نے باپ کو وفاداری کی طرف دیکھنے بھی نہ دیا اور خود انگریزوں کو پل پل کی خبر پہنچاتا رہا۔

جنگ پلاسی

۱۳ جون ۱۷۵۷ء کو کلائیو جدید اسلحہ سے لیس لشکر اور توپخانہ لیکر شمال کی طرف بڑھا۔ نواب سراج الدولہ کو اسکی خبر ملی تو پچاس ہزار پیادے اٹھارہ ہزار سوار اور پچاس توپوں کے ساتھ وہ بھی دریائے بھاگیرتی کے کنارے پہنچ کر خیمہ زن ہوگیا جس سے تھوڑے فاصلے پر پلاسی کی آبادی تھی۔

انگریزی فوج مقابلے پر آکر ٹھہری اور لڑائی شروع ہوئی تو سراج الدولہ نے انگریزوں کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی لیکن بائیں بازو کی فوج نے حرکت نہ کی جو میر جعفر کے ماتحت تھی۔ سراج الدولہ خود قلب لشکر میں تھا جسکے آگے توپخانہ

تھا۔ افسر توپخانہ میرمدن نے حق وفا ادا کیا مگر انگریزی توپخانہ اس سے بہت اچھا تھا پھر بھی لڑائی شام تک جاری رہی۔ اس اثناء میں میرمدن گولی لگنے سے جاں بحق ہوگیا۔ یہی ایک افسر تھا جو بہادروں کی طرح لڑا تھا۔ اسکی موت سے سراج الدولہ کا دل ٹوٹ گیا۔

اندھیرا ہونے پر صورت حال سراج الدولہ کے سامنے آچکی تھی۔ اسکی فوج غدار افسروں سے بھری ہوئی تھی۔ چند افسر ابھی باقی تھے جن پر وہ اعتماد کرسکتا لیکن اس سے انگریزوں کے سخت لشکر کا مقابلہ تو نہ ہوسکتا اور اسکو انگریزوں سے اتنی نفرت تھی کہ انکے ہاتھوں گرفتار ہونے کی ذلت برداشت کرنے پر تیار نہ تھا لہذا اس نے میدان چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور تھوڑے سے سرفروشوں کو لے کر روانہ ہوگیا۔

شاید میرجعفر کی نظر اسکی نقل و حرکت پر لگی ہوئی تھی اس نے اپنے داماد میر قاسم کو مع میرداؤد کے تعاقب میں روانہ کردیا۔ یہ سب سراج الدولہ کے نانہالی اہل خاندان سے تھے۔ اس نے راج محل جاکر پناہ لی تو یہ لوگ بھی جا پہنچے اور سوتے میں اسکو گرفتار کرلیا۔

بنگال کا حکمراں ایک قیدی کی حیثیت سے خود اپنے ہی مرکز حکومت مرشد آباد لایا گیا۔ اسکو قید کرنے والے انگریز نہ تھے بلکہ خود اسکے اپنے تھے اور وہ لوگ تھے، علی وردی خاں نے اسکو جنکی وفاداری کے حوالے کیا تھا۔

انگریزوں نے ہر طرح جواں سال فرمانروا کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے اور وطن فروش مورخین نے جی بھر کر اسکے کردار کو مسخ کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ نہ بزدل تھا اور نہ اس میں عاقبت اندیشی کی کمی تھی البتہ اس نے ایک غلطی کی کہ اپنے وابستگان پر اعتماد کیا اور آج وہی لوگ اسکے خون کے پیاسے تھے۔

وہ ایک بند کمرے میں مقید کیا گیا تھا۔ ایک رات میرجعفر کا بیٹا میرن شمشیر بکف اسکے کمرے میں داخل ہوا۔ سراج الدولہ مصلے پر تھا جیسے ہی اس نے نماز ختم کی میرن نے عقب سے اسکی گردن پر تلوار ماری۔ سراج الدولہ منہ کے بل گر گیا تو میرن پے در پے تلواروں کے وار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ علی وردی خاں کا نواسہ اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔

ہندوستان کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں واقع ہوئی۔ اس نے سو برس پہلے ۱۷۵۷ء میں غیر ملکی اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا اور مشرقی خودداری پر اپنے خون سے مہر لگادی تھی جو میرجعفر کے ماتھے کا کلنک بن گئی۔ اسکی بنگال کے تخت پر بیٹھنے کی آرزو تو پوری ضرور ہوئی مگر "خر کلائیو" کی حیثیت سے پھر میرجعفر اسی نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ (۸۴)

بنگال کی فرمانروائی

کلائیو ذاتی طور پر فتح پلاسی کے بعد بنگال میں اہل ہند کی حکومت کا قائل نہ تھا لیکن دوسرے انگریز افسر اکرام ایسے اقدام کے حق میں نہ تھے لہذا اس نے میرجعفر کو نواب کا خطاب دے کر تخت پر بٹھادیا لیکن اس پر اتنے مطالبات عاید کردئے جن سے جلد ہی میرجعفر عاجز آگیا پھر اس نے کلائیو کو ذاتی طور پر بہت کچھ دیا تھا مگر کمپنی کیلئے اپنے وعدے پورے نہ کرسکا۔ اس سے اختلافات پیدا ہونے لگے اور کلائیو کے بنگال سے جانے کے بعد سے اختلافات زیادہ بڑھ گئے۔

ادھر مغل بادشاہ سراج الدولہ کے قتل اور میرجعفر کی تخت نشینی سے خوش نہیں تھا۔ اسکے اشارے پر مرہٹوں نے بنگال پر حملے شروع کردئے اور خود اندرون ملک بھی بغاوتیں ہونے لگیں کیونکہ علی وردی خاں نے اہل بنگال کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔ وہ سراج الدولہ کے دردناک انجام سے مشتعل تھے۔ نواب کے ملازمین اور کمپنی کے افسروں میں بھی ٹکراؤ ہونے لگا۔ ان حالات میں انگریزوں کو نواب جعفر علی سے بدگمانی بھی پیدا ہوگئی اور وہ اسکو اپنے مفاد کیلئے ناکارہ قرار دینے لگے۔

آخر انگریزوں نے اپنے دوسرے مہرے میرقاسم کو آزمانے کا فیصلہ کیا جو میر جعفر کا داماد بھی تھا اور حکومت بنگال میں وزارت کے عہدے پر بھی فائز تھا۔ میرجعفر نے جو سلوک سراج الدولہ کے ساتھ کیا تھا میرقاسم وہ اپنے خسر کے ساتھ کرنا چاہتا تھا لیکن نوابی کا منصب حاصل کرنا اس کا بھی نصب العین تھا۔

انگریزوں نے کچھ زائد مراعات پر مرشدآباد میں میرقاسم سے ایک معاہدہ کیا اور میرجعفر کو معزول کردیا مگر آپس کی رقابت بنگال کے حکمراں خاندان کا مقدر

بن چکی تھی لہذا میر قاسم کے تخت پر بیٹھتے ہی اسکے خلاف سازشیں ہونے لگیں لیکن وہ اپنے پیش رووں کے مقابلے میں بہادر بھی تھا اور مدبر بھی ۔ اس نے دشمنوں کو دوست بنانے کی سعی کی اور کمپنی کو بھی راضی رکھنے میں کوشاں رہا مگر اسکو کامیابی نہیں ہوئی اور اسکے دل میں انگریزوں کی طرف سے شبہات پیدا ہو گئے ۔

اسی زمانے میں پٹنہ کی فوجوں کیلئے اسلحہ سے بھری ہوئی دو کشتیاں مونگیر سے گزریں ، میر قاسم نے اسکو اپنے خلاف جنگی تیاریوں پر محمول قرار دیا اور کشتیاں رکوالیں ۔ انگریزوں کی طرف سے ان کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ اسلحہ وہ دینے کو تیار ہے لیکن اس سے قبل پٹنہ سے فوجیں ہٹالی جائیں ۔ انگریزوں نے اسکو اپنے خلاف بغاوت تصور کیا ۔

میر قاسم انگریزوں کیلئے ایک معاندانہ جذبہ رکھتا تھا مگر ان سے لڑنے کے قابل نہ تھا لہذا اس نے دونوں کشتیاں واپس کر دیں لیکن اس سے بات کچھ بنی نہیں ۔ صلح سے مایوس ہو کر مجبوراً میر قاسم کو میدان میں آنا پڑا اور اسکی فوجوں نے پٹنہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا ۔ یہ گویا اسکی طرف سے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ تھا

میر قاسم نے انگریزوں سے کھلے میدان میں ایک مقابلہ کیا جس میں اسکو شکست ہوئی ۔ آخر اس نے فرار ہو کر پٹنہ میں پناہ لی ۔ انگریزوں نے پٹنہ پر چڑھائی کی تو اسکی قید میں جتنے انگریز اور انگریزوں کے ہندو دوست تھے سبکو اس نے موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ صرف ایک انگریز ڈاکٹر کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ میر قاسم کی نظر میں ڈاکٹر زائد اور انگریز کم تھا ۔

انگریز فوجیں قلعہ پٹنہ کو گھیرے ہوئے تھیں میر قاسم نے مدافعت کی اور جب اس میں کامیابی کا امکان نظر نہ آیا تو اپنے جرمن مشیر شمرو کو لے کر اودھ کا عازم ہو گیا ۔

جنگ بکسر

جنگ پلاسی کے بعد ہندوستان میں انگریزی حکومت کا سنگ بنیاد پڑ چکا تھا ۔ دکن کا ایک حصہ پہلے ہی ان کے اقتدار میں آ چکا تھا ۔ بنگال میں کہنے کو نواب علی

وردی خاں کے شاہی خاندان کی حکومت تھی لیکن در حقیقت سکہ اور حکم انگریزوں کا چلتا تھا ۔ دکن میں حیدر علی ۱۷۶۱ء میں سلطنت خداداد میسور کی بنیادیں مستحکم کر چکا تھا لیکن ابھی وہ اتنا مضبوط نہ تھا کہ میر قاسم اسکی پناہ میں جانے کا خیال بھی کر سکتا پھر فاصلہ بھی اتنا لمبا تھا کہ وہاں تک انگریز اسکو پہنچنے نہ دیتے ۔

ان حالات میں اودھ کی واحد حکومت تھی جس میں میر قاسم انگریز کی دسترس سے دور رہ سکتا اس لئے وہ امداد کا طالب ہو کر اودھ کی حدود میں داخل ہو گیا

فیض آباد میں حکومت اودھ کی تیسری نسل تھی ۔ سعادت خاں برہان الملک نادر شاہ کے قیام دہلی ہی میں انتقال کر چکے تھے ۔ صفدر جنگ عمر کا بڑا حصہ مغل شہنشاہ کی خدمت میں گزار چکے تھے ۔ شجاع الدولہ نے پہلی بار اپنی طاقت کو اودھ میں سمیٹ کر قابل ذکر بنایا تھا اور ابتک اپنے کو دلی کا وزیرالممالک نواب اودھ کہتا تھا ۔

شجاع الدولہ صرف نام ہی کا شجاع نہ تھا بلکہ معنوی اعتبار سے بھی صفدر جنگ کا جانشین کہے جانے کا اہل تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ ایکبار دریا عبور کرتے وقت گھڑیال نے ایک ٹانگ منہ میں دبا کر اسکو کھینچ لیا ۔ شجاع الدولہ اسکی قوت سے کھنچ کر اسکے منہ میں چلا گیا مگر اس نے حواس برقرار رکھے اور خنجر نکال کر گھڑیال کا منہ چاک کر ڈالا اور بچ کر نکل آیا ۔ اس وقت سے اسکی ایک ٹانگ لنگ کرنے لگی تھی ۔ اس کے سفیر ہندوستان کے ہر حصے میں اور باہر کابل تک پھیلے ہوئے تھے ۔ سراج الدولہ کے انجام کا حال بھی اسکو معلوم تھا اور انگریزوں کی طاقت بھی اس سے ڈھکی چھپی نہ تھی پھر بھی ملک میں غیر ملکی تسلط کی کھٹک اسکے دل میں ہوتی رہتی مگر وہ تنہا کچھ نہ کر سکتا تھا ۔ میر قاسم جب اودھ پہنچا تو وہ ایک سوچ میں پڑ گیا تاہم اس نے بنگال کے فرمانروا کا خیر مقدم کیا اور اسکے ساتھ مرہٹوں اور شاہ عالم سے رابطہ قائم کیا ۔

اس کا منشا یہ تھا کہ ہندوستان کی بچی کھچی قوت سمیٹ کر انگلستان کے سفید فام تاجروں سے ایک فیصلہ کن جنگ کر لی جائے ۔ اسی طرح انگریز خود اس سے لڑنا نہ چاہتے تھے کیونکہ ہندوستان کے فرمانرواؤں میں صرف اسی میں کچھ دم خم باقی تھا اس لئے وہ ایسے غیر یقینی حالات میں اسکو چھیڑنا نہ چاہتے لہذا انہوں نے دوستانہ انداز

میں اس سے میر قاسم اور شمرو کی واپسی کا مطالبہ کیا ۔ شجاع الدولہ نے جواب دیا کہ اسکی حمیت و شرافت پناہ میں آئے کمزوروں کو قاتلوں کے حوالے کر دینے کی اجازت نہیں دیتی ۔

اس جواب کے رد عمل سے بھی وہ واقف تھا لہذا اسکے بعد ہی اپنا لشکر لے کر پٹنہ کی سمت روانہ ہو گیا جہاں ایک ہلکی سی جھڑپ میں اس نے پسپائی اختیار کی اور بکسر پہنچ کر مادھوراؤ مرہٹہ کا انتظار کرنے لگا ۔ انگریز اس سے زیادہ چالاک تھے ۔ وہ اپنی پوری طاقت اور سب سے بڑا توپخانہ لے کر مقابلے پر آگئے ۔ اس اثناء میں کلائیو انگلستان سے واپس آگیا تھا ۔

شاہ عالم شجاع الدولہ کے ساتھ تھا ، بدلے ہوئے حالات میں بھی وہ ہندوستان کی آبرو تھا اور اسی لئے شجاع الدولہ اسکو لے کر انگریزوں سے لڑنا چاہتا تھا تاکہ اسکی جنگ وطنیت کی جنگ قرار پائے ۔ انگریز پہلے ہی سے اس نکتے کو سمجھے ہوئے تھے اور ابتک لڑائی شروع نہ کرنے میں انکی یہی مصلحت تھی کہ پہلے شاہ عالم کو توڑ لے تب شجاع الدولہ سے نبرد آزما ہوں ۔ آخر انہیں خفیہ خط وکتابت سے اس میں کامیابی ہو گئی اور ایک رات شاہ عالم شجاع الدولہ کے کیمپ سے بلا کچھ کہے سنے انگریزی کیمپ میں پہنچ گیا اسکے بعد ہی انگریزوں نے مقابلے کیلئے مورچے بنالیے ۔

شجاع الدولہ نے شاہ عالم اور مرہٹوں پر بھروسہ کیا تھا مرہٹے ابتک پہنچے نہ تھے اور شاہ عالم اس طرح ساتھ چھوڑ گیا تھا ۔ اودھ کے بہادر فرمانروا کو معلوم تھا کہ نہ اسکی فوج کے ہتھیار انگریزی ہتھیاروں کے برابر ہیں اور توپخانہ تو انگریزی توپخانے سے ٹکر ہی نہیں لے سکتا پھر بھی وہ پیٹھ تو دکھا نہ سکتا لہذا اس نے مقابلے پر صفیں آراستہ کرلیں ۔

مقابلہ غیر متناسب تھا ۔ دن بھر کی ہولناک جنگ میں شجاع الدولہ کا بہت نقصان ہوا ۔ اسکو یقین ہو گیا کہ اگلی جنگ میں اسکی فوج کا صفایا ہو جائے گا لہذا اس نے میر قاسم سے کہہ دیا کہ وہ جس طرف چاہے چلا جائے ۔ انگریزوں سے مزید جنگ اودھ کی فوجوں کی طاقت سے باہر ہے اسکے بعد اسنے انگریزوں سے صلح کی بات چیت شروع کر دی اور پچاس ہزار تاوان جنگ اور الہ آباد اور کڑہ کے دو ضلع

انگریزوں کو دے کر جان چھڑالی ۔ فیض آباد واپس پہنچ کر بھی وہ اس شکست کو نہیں بھولا اور اس نے شب و روز محنت کر کے بڑی مضبوط فوج تیار کرلی لیکن پھر انگریزوں سے کسی میدان داری کی نوبت نہیں آئی ۔

اکتوبر ۱۷۶۴ء میں جنگ بکسر کے بعد مرہٹوں نے انگریزوں سے جنگ کی اور شکست کھائی اور انگریزوں نے بنگال پر مکمل قبضہ کرلیا اس دوران میر جعفر کا انتقال ہو گیا تھا اور اسکے نابالغ بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا گیا تھا کچھ دن بعد انگریزوں نے اس کا پچاس لاکھ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور خود بنگال کے حکمراں ہو گئے (۸۵)

اب مرشد آباد کی حیثیت بدل چکی تھی ۔ شیعہ حکمرانوں کی اولاد انگریزوں کے وظائف پر زندہ تھی مگر تعزیہ داری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ۔ محرم میں برسوں تک ماضی کی شان و شوکت باقی رہی پھر اس میں قدرے تبدیلی آئی ۔ محل کے احاطے کا امام باڑہ جو ۱۸۴۷ء میں تعمیر ہوا تھا اب بھی موجود ہے میر جعفر نے ایک بارہ دری بنوائی تھی اسکے آثار بھی پائے جاتے ہیں ۔ ان کے علاوہ دوسرے کئی مشہور امام باڑے بھی ہیں جو محرم میں کربلا کے شہیدوں کی یاد تازہ کرتے ہیں ۔

حکومت بنگال کی عملداری مغل دور سے بہار اور اڑیسہ پر مشتمل تھی اور ان علاقوں میں اکثر شیعہ عمال بھی متعین ہوتے رہے تھے اسکے علاوہ مختلف اوقات میں سادات کی بعض بستیاں بھی جابجا آباد ہو گئی تھیں ۔ خود عظیم آباد میں کئی مقتدر خاندان رہتے تھے ۔ علی وردی خاں کے زمانے میں ان سب کو پشت پناہی حاصل ہوئی اور بعض صاحبان سیف نے چھوٹے بڑے علاقوں میں جاگیریں بھی حاصل کیں جسکے نتیجے میں پہلے شیعیت بہار میں متعارف ہوئی پھر وہ پھیلنے لگی ۔

محرم اور تعزیہ داری جس طرح پورے ہندوستان میں تعلیمات اہل بیت کے تعارف کا ذریعہ رہی تھی اسی طرح بہار میں بھی اسکو فروغ حاصل ہوا اور ایک دن وہ بھی آگیا جب اسکے کئی مقامات مرشد آباد سے ٹکر لینے لگے ۔

بہار میں اشاعت تشیع بہت کچھ مقامی علماء کی رہین منت ہے ۔ انہوں نے خود اپنی علمیت اور سیرتوں سے عوام کو متاثر کیا اور تبلیغ کی گرانقدر خدمات انجام دیں

سلطنت اودھ

یدھ بمعنی جنگ ، اودھ بمعنی وعدہ، یدھ سے ایودھیا بنا اور چونکہ رام چندرجی نے ۱۴ سال بعد اس سرزمین پر آنے کا وعدہ کیا تھا لہذا اس کا نام اودھ پڑا اور ایودھیا اس کا مرکز قرار پایا۔

پانچویں صدی ہجری میں جب سید سالار مسعود غازی سلطان محمود سے نظریاتی اختلاف کے سبب علیحدہ ہوئے اور ایک لشکر جرار کے ساتھ داخل ہندوستان ہوئے تو بہت سے ممتاز سادات اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ ان کے ہمراہ تھے ۔ ان میں سے سید نجم الدین نے بنارس پر حملہ کیا اور جنگ میں شہید ہوئے بنارس کے قریب ان کا مزار ہے جو فاطماں کہلاتا ہے ۔

ان کے بیٹے اپنے قبیل سے مفتوحہ علاقے میں واپس آئے اور عیش نام کی ایک بستی آباد کی جو جائس کہی جاتی ہے ۔

سید سالار نے موجودہ لکھنؤ کے علاقے پر قبضہ کیا تھا ان کے ایک ہندی نژاد سردار لکھنا نے اس مقام پر ایک قلعہ بنوایا تھا جو لکھنا کی مناسبت سے لکھنؤ ہو گیا۔ وجہ تسمیہ کی بعض دوسری روایات بھی ہیں ۔

اس مقام کی آبادی بڑھتی رہی اور علماء و فقہاء وہاں آباد ہوتے رہے ۔ مسلمان بادشاہ اسکو علاقائی مرکز بناتے رہے اور وہاں صوبہ دار متعین ہوتے رہے ۔ مغلوں کے درمیانی دور میں یہاں شیخوں کے ایک قبیلے نے قبضہ کر لیا تھا جو کہنے کو مغلوں کے باجگزار تھے مگر حقیقتاً خودسر اور آزاد تھے ۔ محمد شاہ کے عہد میں آگرہ کے صوبہ دار سعادت خاں کو حسن خدمات کے صلے میں اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا اور سادات بارہہ اور نادر شاہ کے سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دینے پر برہان الملک کے خطاب سے نوازا گیا۔

سعادت خاں نے شیوخ کو زیر کر کے اس حکومت کی داغ بیل ڈالی جس نے اطراف و اکناف میں شیعیت کے چراغ روشن کر دئے مگر اس نے اپنا مرکز حکومت اجودھیا رکھا ۔ پھر اسکے قریب پھوس کے بنگلوں سے ایک شہر آباد کیا جس کا نام بنگلہ

پڑا ۔ اسی بنگلہ کو اسکے جانشیں صفدر جنگ نے آباد کر کے اس کا نام فیض آباد رکھا۔ ۱۱۵۳ھ میں نادر شاہ کے قیام ہی میں برہان الملک کا دلی میں انتقال ہو گیا۔

مرزا مقیم ابو المنصور صفدر جنگ

ابو المنصور برہان الملک کا داماد تھا ۔ اس نے فیض آباد کو مرکز حکومت بنایا لیکن اس کا قیام زیادہ تر دلی ہی میں رہتا تھا ۔ ۱۱۵۵ھ میں علی وردی کے ہمراہ مرہٹوں کے مقابلے پر متعین کیا گیا اور اس نے مرہٹوں کو پسپا کیا ۔ انعام کے طور پر چنار، رہتاس اور الہ آباد کا صوبہ عطا کیا گیا اور صفدر جنگ کا خطاب دیا گیا۔

صفدر جنگ کا عسکری شکوہ اور سطوت و جبروت اس دور میں ضرب المثل تھا ۔ ۱۱۶۱ھ میں اس نے احمد شاہ ابدالی کو شکست دی اور دلی میں وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوا۔

۱۱۶۷ھ میں بادشاہ سے اختلافات ہو گئے جسکے پس پردہ نظام الملک کا ہاتھ تھا اور صفدر جنگ دلی سے مستقلاً اپنے مرکز حکومت میں آگیا ۔ کہا جاتا ہے کہ دلی میں کسی نے اسکو دیر اثر زہر دیا تھا جسکے نتیجے میں فیض آباد پہنچنے کے کچھ ہی دنوں بعد اس کا انتقال ہو گیا ۔ لاش حسب وصیت دلی لے جا کر دفن کی گئی اور سنگ سرخ کا مقبرہ بنوا دیا گیا۔

جلال الدین حیدر: شجاع الدولہ

صفدر جنگ کے بعد اس کا شہرہ آفاق بیٹا ۱۱۶۷ھ میں تخت نشین ہوا جو بائیس سال کی عمر میں واقعی شیر کا بچہ معلوم ہوتا تھا ۔ بہادر ایسا کہ بیک ضرب شمشیر بھینسے کی گردن اڑا دیتا ، گوسفند کا کلہ ہاتھوں سے چیر ڈالتا ، چڑھتے دریا میں تیر جاتا تھا ۔ ایک بار گھاگھرا میں مگرمچھ نے حملہ کر دیا تو شجاع الدولہ نے خنجر سے اس کا کلہ چیر ڈالا اور اسکو کھینچ کر کنارے لے آیا، انگلیوں میں اتنی طاقت تھی کہ چٹکی سے روپے کو مسل ڈالتا، پیکان انداز اس بلا کا کہ تیر چلاتا تو شیر کی پیشانی چھید کر اندر اتر جاتا تھا۔

جنگ بکسر میں جب شجاع الدولہ کو انگریزوں سے شکست ہوئی تو دل شکستہ واپس ہوا مگر اس دن سے ملک کی ساری آمدنی فوجی تیاری کیلئے وقف کر دی ۔

توپوں اور بندوقوں کے بڑے بڑے کارخانے قائم کرائے جسکے نگراں فرانسیسی شمرو اور موشرلاک تھے۔ انہوں نے انگریزی توپوں سے بہتر توپیں تیار کرائیں۔ شجاع الدولہ خود بھی ان کارخانوں کی دیکھ بھال کرتا۔ صبح سے کئی گھنٹے تک فوج کو پریڈ کراتا اور نشانہ بازی کی مشقیں دیکھتا تھا۔ اس طرح اس نے ایک لاکھ تیس ہزار کا لشکر تیار کیا تھا۔

اسی فوج کے بل پر اس نے روہیل کھنڈ، بندیل کھنڈ اور اٹاوہ فتح کیا۔ الہ باد انگریزوں کے قبضے سے نکال لیا اور پٹنے سے ہاڑتک حکومت کی حدیں بڑھالیں۔ ہردوار، میان دوآبہ کا علاقہ اور الہ آباد سے جہانگیر نگر تک، شاہجہاں پور سے رہتاس تک مملکت میں توسیع کرلی جو اس دور کی سب سے بڑی اور زرخیز حکومت تھی۔

اسکے مخبروں کا سلسلہ پونا اور کابل تک پھیلا ہوا تھا۔ افغانستان کی خبر اسکو ساتویں دن مل جاتی تھی۔

علاقوں کا نظم ونسق مثالی تھا۔ خود شجاع الدولہ شیعہ مذہب رکھتا تھا مگر سنیوں کے مذہبی رسوم میں برابر شریک ہوتا اور سنی شیعوں سے بڑھ چڑھ کر عزاداری میں حصہ لیتے تھے۔

محرم میں سبیلیں اور تعزیے شیعہ سنی سب رکھتے تھے۔ شربت اور شیرینی چڑھائی جاتی تھی۔ تعزیوں کے جلوس میں طبل، تاشا، جھانجھ، نقارہ، روشن چوکی، بجتی تھی سپٹے اور بانے کے مظاہرے بھی ہوتے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد یا حسین کے نعرے بلند کیے جاتے۔ بعض تعزیوں کے آگے سوزخوانی بھی ہوتی تھی۔

شجاع الدولہ سیاہ پوش، سروپا برہنہ خود ہاتھ میں علم لے کر چلتا جس میں تلوار اور مشک لٹکی ہوتی اور سینہ زنی کے ساتھ خود بھی نوحہ پڑھتا تھا۔ عاشور کا یہ جلوس اودھ سے مختص کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ اس سے قبل دلی میں عہد عالمگیر میں اس سے ملتا جلتا جلوس نکلتا تھا اور اس سے پہلے گولکنڈہ میں اور قیاس غالب ہے کہ جس طرح سلاطین شرقیہ نے جونپور میں امام باڑہ بنانے کی نظیر قائم کی تھی، اسی طرح وہ جلوس بھی ضرور نکالا ہوگا جو پہلے پہل سلطان معزالدولہ نے چوتھی صدی کے وسط میں بغداد کی سڑکوں پر نکالا تھا پھر بھی شجاع الدولہ کے مظاہرہ عقیدت میں

ایک انفرادیت تھی۔ مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی کی جنگ محرم میں ہوئی تھی تو اس نے میدان جنگ میں سیاہ لباس میں علم لیکر فوج میں گشت کیا تھا۔

۱۱۸۷ھ میں وہ اٹاوہ فتح کرکے واپس ہوا تو محرم شروع ہوگیا تھا۔ شجاع الدولہ علی گڑھ کے قریب موضع جلالی میں تھم گیا اور وہاں کپڑے کا امام باڑہ بنوا کر آداب تعزیہ داری بجالایا۔

اس شغف وانہماک کا نتیجہ یہ نکلا کہ اودھ میں تعزیہ داری عام ہونے لگی اور مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کردیا۔

مجموعی طور پر اسکی خصوصیات میں سپہ گری، شاعری، خطاطی، موسیقی، تہذیب وشائستگی، نفاست مزاج شامل تھیں اور حب اہل بیت اور تعزیہ داری ان پر مستزاد تھی۔ عتبات عالیات میں بھی اس نے نذرانے پیش کیے۔

۱۱۸۸ھ میں بیالیس سال حکومت کرکے اس کا انتقال ہوا تو ہر گھر ماتم کدہ بن گیا، نہ صرف لکھنؤ بلکہ ملک کے طول وعرض میں اس کا غم منایا گیا۔ کوئی ہر دل عزیز بادشاہ مرتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کا عالیشان مزار فیض آباد میں واقع ہے

وزیر الممالک مرزا یحییٰ آصف الدولہ

شجاع الدولہ کا بیٹا ۱۱۸۸ھ میں مسند آرائے حکومت ہوا۔ اس نے اپنا مرکز حکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کردیا۔

بلاشبہ آصف الدولہ کا پیشہ آبائی سپہ گری تھا، شمشیر زنی اور پیکان اندازی گھٹی میں پڑی تھی مگر وہ رزم سے زائد بزم کا آدمی تھا اور اسکو اودھ کے خاندان شاہی کا حاتم کہا جاتا تھا۔

روہیلکھنڈ کی جنگ میں آصف الدولہ نے شجاع الدولہ کے ساتھ جو ہر شجاعت دکھائے تھے اور ثابت کیا تھا کہ اسکی رگوں میں صفدر جنگ کا خون ہے۔ علی محمد خاں نواب رام پور شجاع الدولہ کا ساختہ وپرداختہ تھا۔ اسکو جب اسکے بھائی غلام محمد خاں نے قتل کردیا اور خود نواب بن گیا تو آصف الدولہ کو تلوار اٹھانا پڑی غلام محمد خاں سرسٹھ ہزار روہیلوں کو مقابلے پر لے آیا مگر شجاع الدولہ کی تربیت یافتہ فوج انکو خاطر میں کیا لاتی۔ انہوں نے بری طرح شکست کھائی اور آصف

الدولہ فاتحانہ انداز میں داخل رام پور ہوا۔

رام پور روہیلوں کیلئے تھا۔ آصف الدولہ نے احمد علی خاں کو باپ کی مسند پر بٹھایا۔ اہل رام پور کو انعام واکرام سے نوازا اور لکھنؤ کی طرف مراجعت کی۔ یہ شاید آصف الدولہ کی نیت کی برکت تھی کہ آگے چل کر نوابین رام پور حلقہ بگوش اہل بیت ہوگئے۔ انہوں نے تعزیہ داری کو بھی فروغ دیا اور عتبات عالیہ کی خدمت بھی کی۔

آصف الدولہ کا خدم و حشم اس وقت کے تمام ہندوستانی حکمرانوں کے مقابلے پر رکھا جائے تو لکھنؤ کا پلڑا بھاری پڑتا ہے لیکن آصف جاہ نظام الملک اور سلطان ٹیپو کے نام لیے جائیں تو دو انگریزوں کے دوست اور ایک انگریزوں کا دشمن ہے اور انگریزوں کے دوستوں کو تولا جائے تو آصف الدولہ کے کردار میں کوئی کجی پائی نہیں جائے گی۔ شجاع الدولہ نے وقت کے دھارے کا رخ دیکھ کر ہندوستانی حکمرانوں کے باہمی اتحاد کا جائزہ لیا تھا اسکے بغیر انگریزوں کو شکست نہ دی جاسکتی تو اتحاد ممکن نہ تھا لہٰذا شجاع الدولہ نے اپنی بقاء کی خاطر انگریزوں سے دوستی کر لی تھی یہ دوستی آگے چلکر انگریزوں کی بالادستی میں بدل گئی لیکن اس کا کم سے کم نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ آصف الدولہ کو ایک جنگ کے سوا کوئی جنگ کرنا نہیں پڑی۔

انگریزوں کا دوسرا دوست آصف جاہ نظام الملک تھا۔ اسکے مقابلے میں آصف الدولہ کو پرکھا جائے تو اودھ کے فرمانروا نے مادر وطن سے غداری تو نہیں کی اور کسی شیر دل ٹیپو کا خون اپنی گردن پر نہیں لیا البتہ سلطان ٹیپو سے آصف الدولہ کا تقابل نہ ہوسکتا کیونکہ ان دو کرداروں نے رزم و بزم کو آپس میں بانٹ رکھا تھا۔ ٹیپو وہ منارہ عظمت تھا ہندوستان کی وطنیت جسکو ہمیشہ سلام کرتی رہے گی۔ اسی کے ساتھ آصف الدولہ نے انسانیت اور دردمندی کے وہ چراغ روشن کیے تھے جو آج تک کہاوت بنے ہوئے ہیں۔ جسکو نہ دے مولیٰ اسکو دے آصف الدولہ!

اودھ کے حکمرانوں نے رعایا کے ساتھ باپ جیسا سلوک روا رکھا۔ ہندو، مسلم، سنی شیعہ کا کبھی کوئی امتیاز نہیں برتا۔ عزاداری کے فروغ میں اعجاز و کرامت کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کی روش کو کچھ نہ کچھ دخل ضرور ہے۔

یہ آصف الدولہ کی علم پروری اور سخاوت و فیاضی تھی کہ اجڑتی ہوئی دلی کے باکمال لکھنؤ میں اکٹھا ہوگئے اور مغل سطوت و شوکت جمنا کے ساحل کو چھوڑ کر گومتی کے کنارے آبسی۔

آصف الدولہ کو اودھ کا گل سرسبد کہنا بے محل نہ ہوگا۔ ایک ذات میں شجاعت و شرافت، تہذیب و تمدن، جدت و ندرت، فلسفہ اور ایمان سب قدرت نے جمع کر دیا تھا جسکے آمیزے سے لکھنوی کلچر کا خمیر تیار ہوا جو اپنی آب و تاب حلاوت و نفاست میں جواب نہ رکھتا لیکن بعد میں مبالغہ اور غلو پیدا ہوا تو اس کی شکل کہیں کہیں سے بدل گئی مگر تلاش کیا جائے تو اودھ کی اصل تہذیب کے نمونے اب بھی پائے جاتے ہیں۔

آصف الدولہ کا طرہ امتیاز انسانیت اور دینداری تھی۔ اودھ کا خزانہ عوام اور عزا کیلئے کبھی بند نہیں ہوا۔ ایک بار سخت قحط پڑا تو حکومت نے غلہ باہر سے منگوانے کا انتظام کیا اور لنگر خانے کھلوائے لیکن شرفاء تہی دست اور فاقہ زدہ ہونے کے باوجود دست سوال پھیلا نہ سکتے لہٰذا آصف الدولہ نے امام باڑے کی تعمیر شروع کرادی۔ دن کی تعمیر میں مشاق معمار کام کرتے رات میں باہر کی دیواریں بنائی جاتیں۔ رات میں کام پر آنے والوں کیلئے مرد یا عورت کی قید نہ تھی۔ برقعہ پوش عورتیں اور بھیس بدلے ہوئے مرد آتے اور اپنے اپنے نام لکھوادیتے۔ کام کرتے یا نہ کرتے مگر دو تہائی رات گزرنے پر انہیں مزدوری مل جاتی اور وہ چلے جاتے۔

آصف الدولہ کا معمول تھا کہ صبح کو فوج کی پریڈ دیکھ کر امام باڑے جاتے اور رات کی بنی ہوئی دیوار میں کوئی نہ کوئی خامی نکال کر تڑوادیتے اس طرح قحط کا زمانہ گزار دیا۔ خزانہ خالی ہوگیا مگر عام لوگوں کا پیٹ بھرتا رہا اور امام باڑے کا ایک حصہ بھی مکمل ہوگیا۔

یہ امام باڑہ عجوبہ روزگار تو نہ بن سکا لیکن ہندوستان کی نادر عمارتوں میں ضرور ہے۔ بیچ کا ہال ۳۲۰ فٹ لمبا اور ۶۰ فٹ چوڑا ہے جس میں کوئی ستون نہیں ہے یہی اسکی صنعت کا فن ہے۔ چاروں طرف صحنچیاں بنی ہوئی ہیں۔ آگے کا دالان بھی اسی طرح کا ہے۔ ایک انگریز سیاح کا بیان ہے:

"اس عمارت میں کثرت سے جھاڑ لٹک رہے ہیں جنکی روپہلی ڈالوں ، پھل دار ترشی ہوئی قلموں کی چمک دمک ،آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے جو جھاڑ بہت وزنی اور لٹکانے کے قابل نہیں ہیں ، وہ فرش پر رکھے ہیں ۔ان کا نچلا حصہ گھیردار ہے اور اوپر کی جانب گاؤدم ۔بیچ میں سنہرے اور روپہلے تعزیے آٹھ آٹھ دس دس فٹ اونچے رکھے ہیں ۔ان کے علاوہ نوابان اودھ کے زربفتی پٹکے،جن پرآیات قرآنی کڑھے ہوئے ہیں لٹک رہے ہیں ۔بڑے بڑے نقرئی اور طلائی علم ڈھالیں تلواریں بھالے مرصع جن پر آیات قرآنی اور اسمائے الٰہی لکھے ہیں نصب ہیں۔مشہور سپہ سالاروں کے عمامے بھی رکھے ہیں اور بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے ہیں ۔"

آصف الدولہ کو خداترسی کے کاموں کے ساتھ ساتھ عزائے امام سے بڑی دلچسپی تھی ۔

"تعزیہ داری بڑی عقیدت سے کرتے تھے ۔ محرم میں پیادہ گشت کرتے اور شہر کے تعزیوں پر نذر چڑھاتے ۔دوسرے امراء اور اہل شہر بھی محرم میں تعزیوں کی زیارت کو نکلا کرتے اور نذریں چڑھاتے تھے ۔اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ کوئی گلی کوچہ ایسا نہ تھا جس میں تعزیہ نہ رکھا جاتا ہو اور کوئی فرقہ ایسا نہ تھا جو تعزیہ نہ رکھتا ہو ۔ دولت مند ہندوؤں نے عالیشان امام باڑے بنوائے جنمیں مہاراجہ جھاؤلال ، راجہ ٹکیت رائے راجہ بلاس رائے ، راجہ مہرا اور مہاراجہ میوہ رام کے امام باڑے مشہور تھے ۔ میوہ رام کے امام باڑے کا خرچ تین لاکھ سالانہ تھا ۔"(۸۶)

شیعہ امراء کے امام باڑے اسپر مستزاد تھے جن میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا پھر کربلائے معلی کی ہوبہو نقلیں بننا شروع ہوئیں جو اپنے بانیوں کے ناموں سے منسوب ہوئیں ۔

ہزبر جنگ نواب آصف الدولہ کا زمانہ لکھنؤ کے زریں عہد کا آغاز تھا اور عزاداری کے اس دور کا افتتاح تھا جو آگے چل کر ضرب المثل بنا ۔

آصف الدولہ نے کربلائے معلی سے نجف اشرف تک نہر بنوانا شروع کی تھی جو غازی الدین حیدر کے زمانے میں مکمل ہوئی جس کا نام نہر آصفی ہے ۔۱۲۱۱ھ میں اس عظیم فرمانروا کا انتقال ہوگیا۔

سعادت علی خاں یمین السلطنت

یہ تاجدار نواب آصف الدولہ کا سوتیلا بھائی تھا ہوش مند ، مدبر اور شجاع لیکن انگریزوں کی گرفت لکھنؤ پر مضبوط ہوتی جارہی تھی لہذا انگریزوں کی مدد سے بادشاہ ہوا ۔

انتظامات سلطنت میں اس نے بہت سی اصلاحات کیں ، دیوانی اور فوجداری عدالتوں کا مضبوط نظام قائم کیا، غیرآباد زمینیں آباد کیں اور انگریزوں کے دباؤ سے فوج کی بڑی تعداد کم کر کے صرف چھتیس ہزار کردی ۔ سعادت علی خاں مزاجاً اس مداخلت کا مطلب سمجھتا تھا مگر سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو کا انجام اسکے سامنے تھا ۔وہ جانتا تھا کہ لکھنؤ کی فوج لاکھ منظم ہی مگر تنہا انگریزوں سے چاردن بھی لڑ نہیں سکتی اور کسی دیسی حکمراں سے مدد ملنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا اور جب جنگ کا سوال تھا ہی نہیں تو فوج کتنی ہی ہوتی، کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔

اس طرح آصف الدولہ کے بعد اودھ کی سلطنت انگریزوں کے رحم و کرم پر رہ گئی تھی تو سعادت علی خاں اپنے فیصلے سے اس کا خاتمہ کیوں کراتا لہذا اس نے دور اندیشی اور ضبط و تحمل سے کام لیا اور ہندوستان کے سفید فام آقاؤں کی مکمل بالادستی قبول کرلی ۔

۱۲۱۲ھ میں سعادت علی خاں نے عنان حکومت ہاتھ میں لی اور بہت سی اصلاحات کے بعد پہلے پہل لکھنؤ میں محکمہ اخبارات قائم کیا۔

سعادت علی خاں نے انگریزوں کے ساتھ بڑا وقت گزارا تھا اور یہ شروع ہی سے انگلستان کے تاجروں کی پالیسی رہی تھی کہ وہ ہندی شہزادوں کو اپنے پاس رکھ کر ذہنوں کو بدلنے کی کوشش کرتے تھے ۔ سعادت علی خاں میں حریت مزاج کے علاوہ انہوں نے بہت سی تبدیلیاں پیدا کردی تھیں جو لکھنؤ کے تعمیری دور میں نمایاں ہوئیں۔ممکن ہے سعادت علی خاں نے اچھی باتوں کی طرح انہیں اپنایا ہو۔

لکھنؤ کی خوبصورتی بہت کچھ سعادت علی خاں کی رہین منت ہے اور لکھنؤ کی ادبی اور علمی خدمات اس دور کو کبھی فراموش نہیں کرسکتیں ۔ مولانا عبدالحلیم شرر کو لکھنا پڑا کہ انکی ذاتی قابلیت اہل کمال کی قدردانی پر مجبور کرتی تھی ۔

ادباء وشعراء کی تو کوئی گنتی نہ تھی اور یہ سب وظیفہ خوار تھے۔ نوازش ہائے گرانقدر اسکے علاوہ تھیں۔ یہی صورت علمائے کرام کی بھی تھی۔ فرنگی محل لکھنؤ کاکوری، سندیلہ، ملیح آباد، امیٹھی، بہرائچ، نصیرآباد، غازی پور، سنبھل، فرخ آباد اور دور دور تک ہر بڑے مقام پر حنفی المسلک علماء کو ماہانہ تنخواہیں ملتیں۔ شیعہ علماء کی قدر دانی بھی اسی طرح کی جاتی اور ہر مذہبی مسئلے میں شیعہ و سنی علما سے مشورہ لیا جاتا

اسی کے ساتھ تعزیہ داری میں فرمانروا کا شغف اپنی جگہ پر تھا۔ اسکی اشاعت پر بھی سعادت علی خاں نے خاص توجہ کی اور کہا جاتا ہے کہ ایام عزا کی وسعت اسی دور کی بات ہے لیکن اس سے قبل دکن میں چہلم کا جلوس نکلنے کے تاریخی شواہد ہیں اور دلی میں بھی یہ جلوس نکلتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ دوسرے مقامات پر بارہ روز کے بعد سلسلہ عزا منقطع ہوجاتا ہو اور پھر ۲۰ صفر کو جلوس نکلتا ہو اور سعادت علی خاں نے ۱۳ محرم سے ۱۹ صفر تک کا دورانیہ بھی ایام عزا میں مسلسل کردیا ہو۔

اوودھ کے کسی حکمراں نے دین میں کبھی جبر نہیں کیا بلکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے ہر تہوار میں خود بھی شرکت کی، بالخصوص اتحاد ملی کی خاطر مودت اہل بیت کیلئے کبھی دباؤ نہیں ڈالا حالانکہ نبی کریم کا ارشاد گرامی تھا کہ لا اسئلکم اجراً الا المودۃ فی القربہ جسکو ہر مسلمان مانتا ہے لیکن شجاع الدولہ سے لے کر سعادت علی خاں تک کسی نے سنیوں کو مجالس میں شرکت پر مجبور نہیں کیا۔ وہ خود خوشی سے آتے اور جلوس میں تعزیے بھی انہیں کے زیادہ ہوتے۔

اسکے برعکس سلطان محمود غزنوی سے عہد عالمگیر تک شیعوں کی حالت زار دیکھی جائے تو عقیدے کا اظہار گردن زدنی تھا۔ اکبر کے دور میں ابوالفضل کے والد پر "رافضی" ہونے فتویٰ لگایا گیا تھا تو ابوالفضل نے جواب دیا تھا کہ وہ ہر مکتبہ فقہ کے عالم ہیں، فقہ امامیہ کو بھی جانتے ہیں مگر جاننے اور عمل پیرا ہونے میں فرق ہے دوسری مثال بدنصیب شہزادی زیب النساء کی ہے۔ وہ اپنے محل میں عزاداری کرتی تھی تو اورنگزیب نے خود اسکو زہر دیدیا یا دلوادیا۔

اسکے مقابلے پر لکھنؤ میں نہ صرف سنیوں کا اعزاز و احترام کیا جاتا تھا بلکہ معاش کیلئے مشاہرے بھی دئے جاتے تھے البتہ حکمراں شیعہ تھے اور مراسم عزا میں

دلچسپی لیتے تھے لہذا یہ بھی بعض حلقوں کو گوارا نہیں ہوا اور دہلی سے تحفہ اثنا عشریہ شائع کردی گئی جو اس زمانے میں شیعہ سنی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کیلئے پہلا پتھر تھا جسکے بعد قلمی مناظرہ شروع ہوگیا۔

دہلی میں حکیم مرزا محمد کامل اور حکیم شریف خاں نے تردیدی جواب لکھا۔ حضرت غفراں آب نے تین کتابیں اور سلطان العلما نے ایک کتاب لکھی پھر جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہوگیا اور بڑا تحقیقی مواد منظر عام پر آگیا لیکن اس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلا کہ شیعوں اور سنیوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہوگئی۔ آپس کا شادی بیاہ ترک ہوگیا اور آہستہ آہستہ درمیانی دوری بڑھتی رہی۔

علمائے فرنگی محل مبارکباد کے مستحق ہیں کہ جوابات میں بعض باتیں ان کے عقیدے کے خلاف جاتی تھیں پھر بھی انہوں نے بڑی رواداری کا ثبوت دیا اور اپنی طرف سے منافرت بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔

سنیوں کی طرف سے یہ سلسلہ ابتک جاری ہے اور غیر ملکی سرمائے سے ایسی ایسی کتابیں چھپ رہی ہیں جن میں آئمہ معصومین پر کیچڑ اچھالی جاتی ہے مگر شیعوں کی طرف سے خاموشی ہے۔ اسکے بہت سے اسباب ہیں۔ سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ شیعوں میں مطالعہ کا ذوق کم ہوگیا ہے۔ وہ کتاب خرید کر پڑھتے ہی نہیں ہیں تو چھاپنے کا حاصل کیا۔ غنیمت ہے کہ مجالس سیدالشہداؑ سے انہیں کچھ مل جاتا ہے جس سے وہ بالکل تہی دامن نہیں رہتے۔

اس چپقلش کے باوجود عزاداری پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ سنی اسی طرح تعزیہ رکھتے رہے، لکھنؤ کی رونقیں بڑھتی رہیں اور ان میں ایک طرح کی رواداری پیدا ہوگئی جو سعادت علی خاں کا امتیاز ہے۔

سعادت علی خاں کے شاہانہ طمطراق اور رعب ودبدبہ نے لکھنؤ کی شوکت و شکوہ کو بڑھا دیا تھا لہذا کسی حاسد نے زہر دیدیا۔ قیاس غالب یہ ہے کہ شاطران فرنگ جلد جلد حکمراں بدلنا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنے لئے زیادہ مراعات حاصل کرسکیں اس لئے انہوں نے اپنے معمول کے مطابق کچھ لوگوں کو خریدا اور لائق فرمانروا کو راستے سے ہٹا دیا۔ ۱۲۲۷ھ میں یہ بیدار مغز فرمانروا اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔

شاہ زمن غازی الدین حیدر

اب اودھ کی سلطنت مختلف نوعیتوں سے انگریزوں کی سرپرستی میں تھی۔ حکمراں
داخلی اور خارجی طور پر بندھتے چلے جارہے تھے۔ سعادت علی خاں کے انتقال پر گورنر
جنرل لارڈ ہیسٹنگز خود لکھنؤ آیا۔ سعادت علی خاں سے اسکے پہلے کے تعلقات تھے۔
۱۲۲۹ھ میں اس نے سعادت علی خاں کے بڑے بیٹے غازی الدین حیدر کو تخت نشین
کیا اور اسکے ایماء پر اودھ کے چھٹے فرمانروا نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور اپنا علیحدہ
سکہ جاری کیا۔

غازی الدین حیدر ایک خوش نصیب بادشاہ تھا جسکو اودھ کے خزانے میں
سترہ کرور روپیہ، نواب بہو بیگم کا ایک کروڑ اندوختہ اور بے شمار جواہرات ہاتھ آئے
جس سے اس نے بادشاہت کا افتتاح کیا۔

وارن ہیسٹنگز کے خود لکھنؤ آنے کا سبب بادی النظر میں اظہار ہمدردی تھا
لیکن دراصل وہ جائزہ لینے آیا تھا اودھ کی دولت کا اور مغل بادشاہت کے وقار پر ایک
ضرب کاری لگانے کیلئے اور یہ دونوں مقصد پورے کرکے وہ چلا گیا۔

ہندوستان کی حکومت کی مالک ایک عرصے سے ایسٹ انڈیا کمپنی تھی لیکن
اس نے مغل بادشاہ کو برائے نام باقی رکھا تھا کیونکہ اہل ہندوستانکو "مغل بادشاہ"
کے لفظ سے ایک ذہنی وابستگی تھی حالانکہ وہ بادشاہ ہونے کے بجائے صرف کمپنی کا
وظیفہ خوار تھا اور اسکی حکومت لال قلعہ کی چہار دیواری تک محدود تھی۔ انگریزوں
نے اس ترکیب سے باور کرایا کہ اصل بادشاہ وہ ہیں بلکہ بادشاہ گر ہیں جسکو چاہیں
بادشاہ بنادیں لہذا انہوں نے ایک بادشاہ بنادیا جسکے پاس ملک بھی تھا اور تھوڑی
بہت طاقت بھی تھی۔ کہنے کو ایک بڑے ملک کا فرمانروا لیکن درحقیقت انگریزوں کا
دست نگر۔

اودھ کے اعلان بادشاہت سے عام ذہنوں پر اثر ضرور پڑا ہوگا مگر جاننے والے
جانتے تھے کہ بادشاہ نہ ظل الٰہی ہوتا ہے اور نہ ایشور کا اوتار، بلکہ بادشاہ وہ ہوتا ہے
جسکے بازوؤں میں طاقت دماغ میں تنظیمی صلاحیت اور تلوار میں کاٹ ہو۔ تمام دنیا
میں تخت و تاج اسی طرح حاصل کیا گیا نام اس کا خلافت رکھا گیا یا بادشاہت لیکن
تھا وہ سب کچھ کسی قوم یا کسی گروہ کی اجتماعی طاقت اور انفرادی صلاحیت کا حاصل

غازی الدین حیدر کو انگریزوں نے اپنی سیاست کیلئے بادشاہ بن جانے پر
آمادہ کیا تھا تو اسکو کیا عذر ہو سکتا۔ ابھی کل برائے نام مغل بادشاہ نے وزیرالممالک
بنایا تھا تب بھی اسلاف نے قبول کرلیا تھا حالانکہ وزیرالممالک کی طاقت و حکومت
خود بادشاہ سے زائد تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اودھ کا کوئی حکمران عقل و خرد سے خالی نہ تھا لیکن
انگریزوں کے سامنے اپنی ناطاقتی کو جانتا تھا اس لئے اندھے جوش میں کسی ایسی غلطی
کا ارتکاب کرنا نہ چاہتا جس سے بادشاہ کے بجائے فقیر بن جاتا۔ اس کا خیال ہر ایک
نے رکھا کہ اسکی رہی سہی جو طاقت ہے وہ برقرار رہے اور کوئی وقت پڑنے پر وہ
بالکل بے دست و پا ثابت نہ ہو لہذا غازی الدین حیدر نے اصلاحات کی طرف متوجہ
ہونے سے قبل فوج پر توجہ کی اور اسکو کیل کانٹے سے درست رکھا۔

غازی الدین حیدر نے امور سلطنت کا آغاز سادات اور علماء کے وظائف کے
اجراء سے کیا، پھر بے سہارا کنواری لڑکیوں کی شادیوں کیلئے ایک محکمہ قائم کیا۔
مقامی تعمیرات شروع کرنے سے قبل نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ پر توجہ کی اور
وہاں ایسے اقدامات کیے جن سے اس کا نام آجتک روشن ہے عالیشان عمارتوں کے
ساتھ لکھنؤ میں ایک نہر کھدوائی جو اب بھی اسکے نام سے منسوب ہے۔

برما کی لڑائی میں اس نے انگریزوں کو ایک کروڑ اور نیپال کی لڑائی میں
ایک کروڑ روپیہ دیا اور اسکے عوض کھیری گڑھ اور ترائی کے علاقے واپس لیے جو
کبھی اودھ کے عملداری میں شامل تھے۔

لکھنؤ میں پہلا چھاپہ خانہ اسی نے قائم کیا۔ اشاعت کی سہولت مل جانے کے

سبب تصنیف و تالیف کی رفتار بڑھ گئی ۔ وہ اہل علم اور شرفاء کا بھی قدر داں تھا ۔
احمد شاہ ابدالی کے وزیر شاہ ولی خاں کا بیٹا منصور علی خاں فکر معاش میں لکھنؤ آیا تو
غازی الدین حیدر نے اسکی عزت بھی کی اور اتنا وظیفہ مقرر کر دیا کہ وہ باوقار طریقہ پر
زندگی بسر کر سکتا ۔

اودھ کے تاجداروں نے ہر شعبہ حیات میں جدت طرازیاں کی تھیں اور
ایرانی کھانوں میں ترمیم و اضافہ سے کچھ کا کچھ بنا دیا تھا ۔ غازی الدین حیدر نے بھی
روٹیوں میں جدتیں کیں اور نان نعمت قسم کی چیزیں تیار کرائیں جو فی زمانہ کوئی
باورچی شاید پکا بھی نہ سکے ۔ شعراء نوازی اور ادب پروری میں بھی اس کا دور پیچھے نہ تھا
غزنی میں عہد محمودی میں ایک ہزار مدرسے تھے غازی الدین حیدر کے دور میں ان کا
شمار تو نہیں کیا گیا لیکن شہر کی وسعت اور ہر گلی میں کئی مدارس سے تخمینہ کیا جا سکتا
ہے کہ انکی تعداد کیا ہوگی اسی طرح علماء اور باکمالوں کا بھی کوئی شمار نہ تھا ۔

اپنے پیش روؤں کی طرح عزائے امام میں اسکو بھی خاص شغف تھا تعزیہ
داری کی اشاعت میں بہت دلچسپی لیتا تھا ۔ حضرت علی کی نقل روضہ پوری دل جمعی
سے تعمیر کرائی ۔ امام حسین کی نقل روضہ سبز بلور سے بنواکر لندن سے منگوائی اور
اس کا جلوس پورے شاہانہ وقار کے ساتھ نکلوایا ۔ جب تک وہ زندہ رہا اس جلوس
میں سر و پا برہنہ شروع سے آخر تک شریک رہتا اور منزل پر پہنچا کر واپس ہوتا ۔

۱۲۴۲ھ میں اس نے وفات پائی اور اپنے ہی بنوائے ہوئے روضہ شاہ نجف
میں سپرد خاک کیا گیا ۔

نصیر الدین حیدر سلیمان جاہ

غازی الدین حیدر کا اکلوتا بیٹا ۱۲۴۳ھ میں تخت نشین ہوا: اچھا شہسوار،
فنون حرب میں ماہر مگر نفاست مزاج سب پر حاوی تھی ۔ شاہانہ سطوت و شوکت نے
اسکے دور کو حقیقتاً عہد زریں بنا دیا تھا ۔ خود بھی حسین تھا اور ہر چیز میں حسن کا
خواہاں رہتا ۔ اسی لئے اسکے دور میں لکھنؤ کے دن روز عید اور راتیں شب برات ہوتی
تھیں ۔ وہ حقیقتاً سلیمان جاہ تھا ۔

اسکی پرورش انگریزی طرز پر ہوئی تھیں لہذا مشرقی شان و شکوہ پر انگریزیت

کی چھاپ لگ گئی تھی ۔ کئی انگریز ہم جلیس بھی تھے ایک معلم، ایک حفاظتی دستے کا
کپتان، ایک بال تراشنے والا ۔ دو سیاح اتفاق سے آگئے تھے وہ بھی مقرب بن گئے تھے
ان میں سے ایک نے لائف آف این ایسٹرن کنگ میں لکھا ہے ۔

"بیس برس قبل لکھنؤ گیا تھا اس وقت نصیر الدین حیدر فرمان روا تھے میں
نے کلکتہ میں لکھنؤ کی عجیب داستانیں سنی تھیں ۔ باشندے قدرتی طور پر بہادر اور جنگجو
ہیں ۔ گلی کوچوں میں مہیب صورت لوگ ڈھال تلوار بندوق اور پستول سے مسلح
نظر آتے ہیں ۔ یہاں میں نے جو کچھ دیکھا وہ میرے وہم و گمان سے بھی زائد تھا ۔ پہلے
تو مجھے ایوان شاہی دیکھ کر حیرت ہوئی کیونکہ یہ گنجینہ محلات و قصور تھا جس کا
سلسلہ گومتی کے کنارے کنارے دور تک چلا گیا تھا ۔

دوسری طرف وسیع رمنہ تھا جس میں شاہی توشہ خانہ تھا ۔ اس میں اسقدر
کثیر اور مختلف اقسام کے جانور تھے جن کا اندازہ کرنا مشکل تھا ۔ صدہا ہاتھی گینڈے
تیندوے، چیتل، پاڑھے، ہرن، ایرانی بلیاں، چینی کتے، کچھ کھلے بندوں کچھ بند ۔"

اسکی تصدیق دوسرے انگریز مصنفین نے بھی کی ہے ۔ بشپ ہیبر نے عام
لوگوں کی سپاہیانہ زندگی کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

"باشندگان لکھنؤ میں اسلحہ کا مذاق بچپنے سے پیدا کر دیا جاتا ہے ۔ تیر اور برچھے
یہاں لڑکوں کے معمولی کھلونے ہیں ۔ جس طرح انگریز دائیاں بچوں کے ہاتھوں میں
کھلونے دیتی ہیں اسی طرح یہاں چھوٹے چھوٹے تیغے اور کاٹ کی تلواریں کھیلنے کو دی
جاتی ہیں ۔ اس شہر کے گلی کوچے میری نظروں کو بالکل الوکھے معلوم ہوئے ۔ گویا
عالم رویا میں میرا گزر ایسے ملک میں ہوا ہو جہاں خواص و عوام پہلوان پیدا ہوتے
ہیں جنکے چہروں سے جنگجوئی ٹپکتی ہے ۔ جیسا کہ میں نے لڑکپن میں قصہ کہانی کی
کتابوں میں پڑھا تھا ۔" (۸۷)

بعض مصنفین نے اودھ کی فوج کا تذکرہ بھی کیا ہے اور اسکو ایشیا اور
یورپ کے اسلحہ سے لیس بتایا ہے ۔

اس سپاہیانہ ماحول میں بادشاہ کا پرستان بھی اپنی جگہ پر ہے جو مسجد کے زیر
سایہ خرابات کے مرادف ہے لیکن اودھ کا ہر حکمران حدود شرع سے کبھی باہر نہیں

نکلا لہذا نصیر الدین حیدر سے حرام کاری کی نسبت بھی نہیں دی جا سکتی جس کا اندازہ اسکے مذہبی شغف سے لگایا جا سکتا ہے ۔اس پرستان کے ساتھ ایک زنانہ پلٹن بھی تھی ایک سیاح لکھتا ہے ۔

" حرم شاہی کے نوادر میں جو چیز یورپ کو عجیب معلوم ہوگی وہ وہاں کی زنانہ فوج ہے میں نے خود ان مرد نما سپاہیوں کو زنانی ڈیوڑھی پر طلایہ کرتے دیکھا ہے ۔ عرصے تک ان کے عورت ہونے کی خبر ہی نہیں ہوئی ۔ میں انکو پستہ قد مرد سمجھتا رہا جو اپنے لانبے بالوں کا جوڑا سر پر رکھ کر پگڑی سے چھپا لیتی تھیں ۔

وردی وہی تھی جو مردوں کی ہوتی ، مردوں ہی کی طرح ہتھیار بند بھی ہوتیں ہاتھ میں سنگیں چڑھی ہوئی بندوق ، کمر میں پیٹی ، شانے پر کارتوسوں کا پرتلہ ، بقیہ وہی وضع جو احاطہ بنگال کے فوج کی ہوتی ہے ۔"

یہ وہ دور تھا جب زنانی پولیس یا زنانہ فوج کا تصور شاید یورپ والوں کے ذہنوں میں بھی نہ آیا تھا ۔ نصیر الدین حیدر کو حرم کی حفاظت کیلئے عورت کو مسلح کرنے کا خیال ممکن ہے اس لئے آیا ہو کہ وہ خواجہ سراؤں پر اعتماد نہ کرتا ہو ۔

اس کا دماغ جدت طرازیوں میں بہت تیز تھا ۔ اس نے ہر شعبے میں کوئی نہ کوئی ندرت پیدا کی البتہ اس نے عیسائی ننوں کی طرز پر جو اچھوتیاں بنائی تھیں وہ فقہی زاویہ نگاہ سے کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا ۔ علماء نے اسکے خلاف احتجاج کیا مگر بادشاہ کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی تھی ۔ بچپن ہی سے اسکے مزاج میں ضد تھی اس نے کسی کی نہیں سنی ۔ یہ اچھوتیاں حضرت حجتؑ سے منسوب ہوتی تھیں ۔ انکو کوئی چھو بھی نہ سکتا لیکن نصیر الدین حیدر کے بعد وہ ختم ہو گئیں ۔

نصیر الدین حیدر نے رفاہ عام کے بہت سے کام کیے ۔ گومتی پر لوہے کا پل بنوایا ، انگریزی اور یونانی دواخانے غرباء کیلئے کھلوائے اور محتاج خانہ تعمیر کرایا ۔ یہ سب کچھ ان رقوم کے علاوہ تھا جو روزانہ حاجت مندوں کو تقسیم کی جاتی تھیں ۔ بیس پچیس لاکھ کی لاگت سے ایک رصد خانہ بھی بنوایا تھا ۔

عیش و عشرت کے ان مناظر میں بھی ایک بانکپن تھا ۔ بادشاہ اس ماحول سے نکلتا تو شیر افگن بننے کی کوشش کرتا ۔ شکار کا اہتمام بھی بڑے پیمانے پر کیا جاتا ۔

پھر قیام لکھنؤ میں ہاتھیوں ، گینڈوں اور دوسرے جانوروں کی لڑائیاں بھی صرف تفریح نہ تھیں ، ان میں شجاعت اور جنگ آزمائی کے مظاہرے بھی کیے جاتے ۔

ان حقائق کے باوجود نصیر الدین حیدر ایک مومن حق پرست تھا ۔ عزاداری میں اس کا شغف دیکھ کر محسوس ہوتا کہ وہ پیدا ہی غم حسین کیلئے ہوا ہے ۔ ۲۹ ذی الحج سے وہ سیہ پوش ہوتا تو پورا ماحول غم انگیز ہو جاتا ۔

تعزیہ داری پچھلے ادوار میں جس طرح ہوتی تھی نصیر الدین حیدر نے اس میں اضافہ کیا ۔ بہت سے نئے امام باڑے اور کربلائیں بنائی گئیں ۔ نصیر الدین حیدر نے زنانے محل کے قریب بارگاہ دوازدہ امام تعمیر کرائی ۔ چھتر منزل کے قریب امام باڑہ اور پار کی کربلا تعمیر کرائی ۔

بادشاہ کا معمول تھا کہ محرم میں کوئی نکی اور مالی کا انجام نہ دیتا اپنے کو صرف حسین اور غم حسین کیلئے وقف رکھتا ۔

لکھنویوں تو محرم کی پہلی تاریخ سے عزاخانہ معلوم ہوتا لیکن پانچویں سے علم ماتمی دستوں کے ساتھ درگاہ حضرت عباسؑ پہنچنے لگتے پھر المناک گہما گہمی میں اضافہ ہوتا رہتا ۔ ساتویں کو حضرت قاسم کی مہندی نکلتی جسکے مختلف جلوس گوشے گوشے میں نظر آتے آٹھویں ، نویں اور دسویں محرم کو ہائے ہائے حسین کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہوتیں ۔ دسویں محرم قیامت خیز مناظر پیش کرتی ۔ شاہی جلوس میں تو پورا شکوہ شاہانہ دکھائی دیتا ۔ کیا سواری نکلتی ہوگی کسی بادشاہ کی جس طرح بلور کا تعزیہ کربلا پہنچایا جاتا ۔ مسلمان اور ہندو امراء کے تعزیوں کا شکوہ بھی کچھ کم نہ ہوتا ۔

اور تعزیوں کا مشترک جلوس تو عوامی جذبات کا عکاس ہوتا اور فضا سے غیر شعوری طور پر ایک آواز آتے محسوس ہوتی ۔ کاش یہ مجمع روز عاشور کربلا میں موجود ہوتا !

بزرگوں کی طرح اس نے عتبات عالیات میں نذرانے پیش کیے ۔ شعر و ادب کی سرپرستی کی ۔ ڈرامے کی ابتداء اسی کے زمانے میں ہوئی اور مختلف اصناف ادب اور موسیقی کی ترقی ہوئی ۔

بحیثیت مجموعی نصیر الدین حیدر ایک اولوالعزم بادشاہ تھا ۔ عیش و عشرت کا

راستہ اسکو بہت دکھایا گیا مگر اس نے اپنا سپاہیانہ انداز نہ چھوڑا لہذا اسکو زہر دیدیا گیا۔ ظن غالب ہے کہ اس میں سفید فام دوستوں کا ہاتھ ہوگا۔

۱۲۵۳ھ میں اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

ابو الفتح محمد علی شاہ

انگریزوں نے جنگ بکسر میں شجاع الدولہ کو شکست دیدی تھی لیکن اودھ کے سورما نے جلد ہی ایک لاکھ تیس ہزار فوج اور ایک بڑا توپخانہ تیار کر لیا تھا مگر سیاسی صورت حال کے پیش نظر اس نے انگریزوں سے ٹکر نہیں لی۔ یہی صورت حال آصف الدولہ کے وقت تک برقرار رہی مگر اسکے بعد سے انگریز پوری طرح اودھ میں دخیل ہوگئے اور جب انہوں نے سعادت علی خاں کو تخت نشین کرایا تو فوج کی تعداد صرف چھتیس ہزار کرادی کہ وہ خود مدد کیلئے موجود ہیں تو بلاوجہ بڑی فوج کے مصارف کیوں برداشت کیے جائیں۔

انگریزوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے کام کے آدمی کو تخت نشین کراتے رہیں گے تو فوج کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جائے گی مگر ان کا یہ مقصد پورا نہ ہوسکا۔ ایک کے بعد دوسرا نیا تاجدار جب بھی آیا تو انگریزوں کا عمل دخل تو یقیناً بڑھ گیا مگر کمزور فوج کی آرزو پوری نہ ہوسکی۔ شاطران فرنگ نے سعادت علی خاں اور نصیر الدین حیدر کو زہر دلوا کر راستے سے ہٹایا تھا مگر ابتک انکی مقصد براری نہ ہوئی تھی لہذا اس بار انہوں نے ایک بوڑھے آدمی کو تخت پر بٹھایا۔

چونکہ نصیر الدین حیدر کے کوئی اولاد نہ تھی لہذا سعادت علی خاں کا تیسرا بیٹا ابو الفتح محمد علی شاہ ۱۲۵۳ھ میں تاج و تخت کا مالک ہوا۔ ترسٹھ سال کا تاجدار بظاہر ناکارہ تھا لیکن صفدر جنگ کا جانشین امور سلطنت میں ماہر ثابت ہوا۔ پہلے دن سے اس نے رعایا کی فلاح و بہبود پر توجہ دی اور شان و شکوہ سے زیادہ رفاہی کاموں کی طرف متوجہ رہا۔

اس فرمانروا کا رجحان مذہبیت کی طرف زیادہ تھا۔ اسکے دور میں شیعہ علماء کا اقتدار کچھ بڑھ گیا لیکن علمائے فرنگی محل کی عزت و توقیر اپنی جگہ پر رہی۔ سب سے پہلے اس نے ایک بڑی جامع مسجد کی بنیاد رکھی جو اسکے مرنے کے بعد مکمل ہوئی۔

حسین آباد کا موجودہ امام باڑا محمد علی شاہ کی یادگار ہے۔ اسکے دونوں پہلوؤں پر چار سو مکانات تعمیر کرائے جو شریف منزل اور رئیس منزل کے نام سے موسوم ہیں پھر بمبئی میں حجاج اور زائرین کیلئے ایک سرائے بنائی اور پچاس لاکھ روپیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس جمع کرادئے تاکہ اسکے منافع سے سرائے کے اخراجات پورے ہوتے رہیں۔

یہ محمد علی شاہ کا حسن انتظام تھا کہ کمپنی کے پاس بادشاہان اودھ کی جتنی رقوم تھیں ان سب کا حساب کیا اور کچھ رقم اس میں شامل کرکے وقف حسین آباد قائم کیا جو ہندوستان کا سب سے بڑا وقف ہے اور ابتک اسکے منافع سے چلتا ہے۔

عتبات عالیات کیلئے بھی محمد علی شاہ نے بہت کچھ کیا جسکی الگ الگ تفصیلات قلم بند ہوچکی ہیں۔

عزاداری کی طرف محمد علی شاہ کا خاص التفات تھا۔ دوسرے بادشاہوں نے اگرچہ کوئی کمی نہ کی تھی مگر محمد علی شاہ کی بات ہی کچھ اور تھی۔ بادشاہ کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی زیادہ توجہ کی۔ منشی لطف علی نے ایک مومی ضریح بنائی جس کا کام انتہائی نازک تھا اور ہزاروں شمعوں کے جلنے سے بھی اسپر گرمی کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ یہ ضریح محمد علی شاہ کے امام باڑے کی زینت بنی۔

یہ ضریح ابتک ایک ہی خاندان کی صنعت ہے جو ہر سال بارہ فٹ اونچی ضریح تیار کرتا ہے۔

حسین آباد کا امام باڑہ اپنی صنعت کے اعتبار سے شیشے کے کام کا اچھا نمونہ ہے۔ عیش باغ کی موتی جھیل اور عزاخانہ بھی اس اہل ایمان بادشاہ کی یادگار ہے۔

رومی دروازے کی طرح ایک دروازہ بھی محمد علی شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ مختصر سی مدت حکومت میں ایک بادشاہ کیا کچھ کر گیا کہ عزائے حسین سے متعلق اسکی تعمیرات مختلف جہتوں سے محرم میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

۱۲۵۸ھ میں چھ سال حکومت کرکے محمد علی شاہ کا انتقال ہوگیا۔

امجد علی شاہ ثریا جاہ

محمد علی شاہ کا یہ بیٹا ۴۵ برس کی عمر میں فرمانروائے اودھ ہوا۔ متقی، پرہیز گار، زاہد شب زندہ دار اور علماء کا حد درجہ معتقد۔ اس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مطابق شراب پر پابندی لگادی، تاڑ کے درخت کٹوادینے کا حکم صادر کیا۔

محکمہ قضاۃ میں شیعہ مجتہد مقرر کیے۔ علمائے فرنگی محل پہلے ہی سے موجود تھے۔ فاضل برہمن ہندوؤں کیلئے مقرر کیے گئے۔ زکواۃ کا ایک محکمہ الگ سے قائم ہوا اور تقسیم زکواۃ کیلئے مستحقین کی قید رکھی گئی۔

اسی طرح قتل وقصاص کے سلسلے میں بھی محتاط اقدامات کیے گئے اور حکومت شرعیہ کی داغ بیل ڈالی گئی۔

ہیجڑوں اور زنانوں کو شہر سے نکال دیا گیا اور طوائفوں کو تائب ہوکر کسی کے عقد میں داخل ہوجانے کی ہدایت کی گئی۔ عتبات عالیات کیلئے بھی امجد علی شاہ نے گرانقدر نذرانے بھجوائے جنکی تفاصل موقع محل سے درج کی گئی ہیں۔

تصنیف و تالیف کے شعبے میں بہت کام ہوا۔ ان گنت مایہ ناز کتابیں شائع ہوئیں۔ تذکرہ بہار بے خزاں اور خوش معرکہ زیبا اسی عہد کی تصانیف ہیں۔ شاہان اودھ کے مکمل حالات پر مشتمل ایک کتاب بھی لکھی جارہی تھی مگر ریزیڈنٹ نے کچھ ایسی ترکیبیں کیں کہ اس کا سارا مواد تلف ہوگیا۔ یہ کتاب شائع ہوجاتی تو انگریزوں کیلئے شاہان اودھ پر کیچڑ اچھلوانے کا موقع نہ رہتا۔

شہر کی رونق اور تعمیرات میں اضافے کیلئے بھی امجد علی شاہ نے خصوصی التفات کیا۔ نئے لکھنؤ میں حضرت گنج آباد کرایا۔ لکھنو سے کانپور تک پختہ سڑک بنوائی۔ غازی الدین حیدر نے لندن سے لوہے کا ایک پل بنوایا تھا امجد علی شاہ نے اسکو مکمل کرایا۔

امین الدولہ نے اسی عہد میں امین آباد آباد کیا، منصف الدولہ نے کربلائے معلیٰ کی نقل روضہ لکھنؤ میں تعمیر کرائی جو دیانت الدولہ کی کربلا کہلاتی ہے۔ پھر شرف الدولہ نے روضہ کاظمین تعمیر کرایا۔

کشمیر کے راجہ نے اسی زمانے میں مسلمانوں پر بڑے مظالم ڈھائے تھے۔ وہ ترک وطن کرکے آئے تو امجد علی شاہ نے کشمیری محلہ ان سے آباد کیا اور چند

خاندانوں کو مقبرہ جناب عالیہ میں رہنے کی جگہ دی گئی جو ابتک وہاں مقیم ہیں۔

شعروشاعری میں بہت ترقی ہوئی اور انیس و دبیر نے مرثیے پر مہرِ دوام ثبت کردی۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے۔

" زبان و شاعری کے کمالات کے ساتھ لکھنؤ نے علم و فضل میں بھی ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ ترقی کی۔ اگر سچ پوچھیے تو علوم کے اعتبار سے لکھنؤ ہندوستان کا بغداد و قرطبہ اور اقصائے مشرق کا نیشاپور تھا" (۸۸)

امجد علی شاہ نے بھی اپنے پیش رووں کی طرح بعض اختراعات کیں لیکن ترویج اسلام اور فروغ شیعیت میں اس کا زیادہ حصہ ہے۔ ۱۲۶۳ھ میں امجد علی شاہ کا انتقال ہوگیا۔

سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اختر

امجد علی شاہ کا بیٹا اور سعادت خاں برہان الملک کا آخری وارث ۱۲۶۳ھ میں تخت نشین ہوا۔ چہرے پر اسلاف کا تہور، آنکھوں میں آب گومتی کی چمک، ناک نقشے میں ہندوستان کا تناسب، رنگ روپ میں ایرانیت غالب بحثیت مجموعی مردانہ شباب و جمال کا وہ پیکر، جسکو دیکھ کر ایک مہوش فرنگ دیکھتی ہی رہ گئی تھی اور اسکے دل کے کسی گوشے میں یہ آرزو پیدا ہوئی تھی کہ کاش یہ آہو نژاد شیر اس کے حصے میں ہوتا۔

واجد علی شاہ نے زمام حکومت سنبھالتے نظم و نسق پر توجہ کی اور جہاں جہاں کچھ کمی پائی اسکی درستی کی، غریبوں کی مدد اور مظلوموں کی فریادرسی کو اپنا شعار بنایا

وہ ایک بادشاہ تھا اور سجی سجائی بساط سلطنت اسکو ملی تھی پھر خود اتنا خوبصورت تھا کہ نسائیت کی حیا امیز نگاہیں اسکے چہرے کا طواف کرتی تھیں لہذا عین وعشرت کی طرف مائل نہ ہونا ناممکن تھا پھر بھی دامن اہل بیت اسکے ہاتھوں میں تھا اس لئے قدم کبھی دائرہ شریعت سے باہر نکلنے نہیں پایا۔

واجد علی شاہ کی راتیں یقیناً رنگینیوں میں گزرتی تھیں مگر اس طرح نہیں جیسے اوباش اپنی راتوں کو کالا کرتے ہیں بلکہ اسکے برعکس تاجدار لکھنؤ کی راتوں میں

حسن کی پاکیزگی شباب کی کیف آگیں انگڑائیوں میں جذب ہو کر ایک مستانہ فضا پیدا کرتی تھیں اس فضا میں وہ ایک رند خردمند کی طرح بہکنے کی اداکاری کرتا مگر رات گزرتے ہی اذاں کی آواز کان میں پڑتی تو سجادہ عبادت پر جا کھڑا ہوتا۔

اسکی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی۔ روزے چھوٹے ضرور مگر ان کا شرعی کفارہ اس نے ادا کیا۔ جو عورت اسکے حرم میں داخل ہوئی وہ منکوحہ یا ممتوعہ۔ بادشاہوں پر ڈورے ڈالنے والی خوبصورت عورتیں ہر زمانے میں پائی جاتی رہی ہیں مگر واجد علی شاہ پر عورتیں عاشق ہوتی تھیں، خود وہ اسی کی طرف التفات کرتا جو اسکی نظروں میں جگہ بناتی ورنہ بیشتر لڑکیوں کو عنایات خسروانہ سے نوازنے پر اکتفا کرتا۔

نصیر الدین حیدر کا پرستان اب بھی پایا جاتا تھا مگر جان عالم نے اس میں اتنے اضافے کیے کہ واقعی پرستان بنا دیا۔ ایک بہت بڑے ہال میں چالیس گز لمبا اور بیس گز چوڑا سنگ مرمر کا حوض تعمیر کرایا۔ اسکے چاروں طرف تخت بچھوائے۔ جھاڑ، فانوس، کنول، مردنگ سے آراستہ کرایا، پھولوں کے گل دستے جابجا ترتیب سے سجوائے، بیچ کے تخت پر ایک زرنگار مسہری بچھوائی اور پورے ہال کو اتنا منظر آفریں بنا دیا کہ انسان عالم خیال میں پہنچ جائے۔

پریوں کا انتخاب اس نے خود کیا تھا جو سیکڑوں کی تعداد میں تھیں۔ اندر پری رشک پری، یاسمین پری، سلیمان پری، بلقیس پری، ماہ رخ پری وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب فنون رقص و سرود کی ماہر ہوتیں ان کے دونوں بازووں پر جڑاؤ پر لگے ہوتے اور واجد علی شاہ خود راجہ اندر بنتا۔ اسی پرستان میں اردو کے پہلے ڈرامے اندر سبھا کی تخلیق ہوئی۔

- شہنشاہ جہانگیر ساون گزارنے کیلئے کشمیر جاتا تھا واجد علی شاہ ہر سال باغ ارم بنواتا اور اس میں برسات کا لطف لیتا۔

ایسی ہی وہ تفریحات تھیں جن پر عیاشی کا رنگ چڑھا کر اہل قلم کے ہاتھوں ایک پاکباز فرمانروا کو بدنام کر دیا گیا ہے تاکہ حکومت کی ضبطی کا جواز پیدا ہو سکے۔

برطانیہ کے سفید فام تاجروں کے انداز تجارت کا جائزہ لیا جائے تو وہ ہندوستان میں خرید و فروخت دونوں کرتے تھے۔ فروخت میں یورپ کی مصنوعات

تھیں جنکے اچھے پیسے ہندوستان میں مل جاتے تھے، خرید میں ہندوستان کے غلام تھے جنکی قیمت ادا کر کے وہ انگلستان نہ لے جاتے بلکہ ہندوستان ہی میں چھوڑ دیتے تھے۔

یہ غلام افریقہ کی سیاہ چمڑی کے غلاموں کی طرح نہ ہوتے اور نہ انکی پشت پر غلامی کا ٹھپہ لگایا جاتا بلکہ صرف حلقہ بگوش بنا کر مقامی فرمانرواؤں کے درباروں میں جگہ بنانے کیلئے آزاد کر دیا جاتا اور ایک صورت یہ بھی تھی کہ جنکی جگہ درباروں میں موجود تھی انہیں خفیہ طریقہ پر خرید لیا جاتا۔ کہنے کو تو وہ اس فرمانروا کے وفادار ہوتے مگر عملاً حق نمک انگریزوں کا ادا کرتے۔ ایسے غلام پہلے دن سے بنائے جاتے رہے تھے اور ہندوستان میں انگریزوں کی کامیابی کا بنیادی راز یہی غلام تھے۔ دوسرے نمبر پر ان کے آلات حرب آتے تھے۔

ہندوستان کی طوائف الملوکی کو دیکھ کر جب پرتگالی، ڈچ، فرانسیسی اور انگریز سب نے حکومت کے خواب دیکھنا شروع کیے تو جنگی آلات میں انگریزوں کو یورپ کی دوسری قوموں پر کوئی فوقیت حاصل نہ تھی البتہ سازش اور رشوت میں کوئی ان کا مقابلہ نہ کر سکا اور وہ سب پر بازی لے گئے۔

سترھویں اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کی تاریخوں کے ورق الٹ کر دیکھے جائیں تو ہر محاذ پر انگریزوں کی کامیابی کا انحصار انہیں زر خرید غلاموں پر رہا ہے خواہ سرنگا پٹم میں ضیغم ہندوستان کی جنگ ہو یا سندھ میں میروں کی لڑائی، ان آلات کار کی نفی کر دی جائے تو یورپ کے عیار جنگ ہار چکے تھے لیکن گھر کو آگ خود گھر کے چراغوں سے لگ گئی تو انگلستان کے ڈاکوؤں نے آگ بجھانے کے بجائے سب کچھ لوٹ لیا حتی کہ عزت و حرمت بھی محفوظ نہیں رہی۔

سندھ، میسور، بنگال اور اودھ ہندوستان کی بچی کھچی آبرو تھے جو انگریزوں کیلئے خطرہ بنے ہوئے تھے بغیر انکی تسخیر کے وہ کہہ نہ سکتے کہ ہندوستان ہمارا ہے۔ اسی لئے جب انہوں نے لکھنؤ پر یونین جیک ہرایا تو لکھنؤ کا املا لکھا LUCK-NOW اور ہمیں فخر ہے کہ یہ چاروں حکومتیں شیعہ تھیں۔ بالفاظ دیگر ہم نے حریت وطن کیلئے غیر ملکی غاصبوں کا آخر دم تک مقابلہ کیا جو ہمارا طرہ امتیاز رہا ہے۔

بہر حال انگریز نے اپنے اس کامیاب حربے کو اودھ میں آخری بار آزمارہے تھے

اور سازش کا جال انہوں نے آصف الدولہ کے بعد سے بچھانا شروع کر دیا تھا ۔ سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور اب سلطانعالم واجد علی شاہ ۔ پانچ بادشاہوں کے دور میں وہ اندازہ کرتے رہے کہ اگر اودھ پر ہاتھ صاف کیاجائے تو اسکے اثرات مابعد کیا ہوں گے ؟ لیکن ہندو و مسلمان ، سنی و شیعہ سب میں فرمانرواؤں کا قبول عام دیکھ کر انہیں بغاوت عام کے خطرات محسوس ہوئے لہذا وہ انتظار مزید کرتے رہے ۔

واجد علی شاہ ایک عالم و فاضل، زاہد و عابد رحمدل اور منکر مزاج بادشاہ تھا پری جمالوں کے جمگھٹ اور شعر و ادب کی محفلوں سے اسکو خاص دلچسپی تھی لیکن انگریزوں نے یہ بھی دیکھا کہ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر وہ کسی جرنیل کی وردی میں فوجی پریڈ بھی لیتا ہے حکومت کے کاموں کیلئے بھی وقت نکالتا ہے اس لئے ایک طرف تو انہوں نے رائے عامہ خراب کرنے کی کوشش کی دوسری طرف غلاموں کو خریدنے کیلئے مہروں کی تھیلیوں کا سائز کچھ بڑا کر دیا۔

نیک نفس بادشاہ کو اپنے معتمدین پر بھروسا تھا اور انگریزوں کی طرف سے اسے ایسا کوئی اندیشہ بھی نہ تھا کیونکہ وہ انکی مرضی کے خلاف چلتا ہی کب تھا، جو وہ اسکے درپے آزار ہوتے ۔ بادشاہ کے معمولات میں جمالیاتی یا ادبی محفلیں ، سماجی خدمتیں اور عزائے امام حسین، تین چار چیزیں شامل تھیں جن میں کبھی کبھی انگریز بھی شرکت کرتے ۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ عزاداری میں غلو کی حد تک بڑھ گیا تھا اور اس نے ایام عزا کو اربعین سے آٹھ ربیع الاول تک وسعت دیدی تھی تو یہ طریقہ امجد علی شاہ کے وقت سے چلاآرہا تھا ۔ہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ تاجدار غم اہل بیت کو جزوایمان قرار دیتا تھا اور عشرہ محرم میں بجز مجلس و ماتم کوئی کام کرتا ہی نہ تھا اور اسکے بعد بھی خاص خاص تاریخوں میں اپنے کو ایسے ہی مشاغل کیلئے وقف رکھتا ۔ اسکے دور میں تعزیہ داری بھی دوسری باتوں کی طرح اپنے عروج پر پہنچ گئی ۔

واجد علی شاہ کو اودھ کے بادشاہوں میں تہذیب و تمدن کی ترقی اور علم و ادب کی اشاعت میں خصوصی فوقیت حاصل ہے ۔ جتنی کتابیں اس زمانے میں چھپیں اسکی نظیر ادوار ماسبق میں نہیں ملتی ۔ علم و فن کے جتنے باکمال اس نے لکھنؤ

میں جمع کیے تھے وہ ہندوستان کے کسی ایک شہر میں پائے نہیں جاتے ۔ شہریت اور شہر کی رونق کی مثال تو مشرق کیا، شاید مغرب میں بھی تلاش سے نہ ملے گی۔

لکھنؤ کی آبادی ساڑھے سات لاکھ تھی ۔ عمارتوں میں اکبر اعظم کے عہد کا اکبری دروازہ ، ایک فرانسیسی تاجر کا تعمیر کردہ فرنگی محل ، شیوخ کا مچھی بھون ، اورنگزیب کی مسجد شاہ پیر محمد منصور جنگ کا قلعہ جلال آباد، آصف الدولہ کے ایرانی طرز کے چار سو باغ، امام باڑہ آصفی ، باؤلی، شیش محل، دولت خانہ ۔

سعادت علی خاں کی کوٹھیاں ، باغات ، حضرت عباس کی درگاہ کربلائے تالکٹورہ ، ریزیڈنسی کی عمارت یعنی بیلی گارڈ، غازی الدین حیدر کا شاہ نجف سعادت علی کا مقبرہ اور نہر، نصیر الدین حیدر کی کربلا، چھتر منزل خیرات خانہ ، شفاخانے ، رصدگاہ، موتی محل اور ملکہ زمانی کا امام باڑہ ۔

محمد علی شاہ کا حسین آباد، شریف منزل، رئیس منزل ، ملکہ جہاں کی کربلا ۔

امجد علی شاہ کا سبطین آباد اور لوہے کا پل، واجد علی شاہ کے صدہا باغ، قیصر باغ، چاند والی بارہ دری اور قصر البکا۔

یہ تھیں لکھنؤ کی وہ عمارتیں جو عام دنوں میں اودھ کی سطوت شاہی کا آئینہ ہوتیں اور ایام عزا میں بقعہ نور ہونے کے باوجود ایک سوگوارانہ جلال کا مظہر بن جاتیں ۔ایسا محسوس ہوتا کہ انسان تو انسان صامت و جامد پتھر بھی کربلا اور اسیران کربلا کی داستانیں بیان کررہے ہیں ۔

انہیں کو دیکھ کر بعض فرانسیسی اور انگریزی سیاحوں نے لکھا کہ انہوں نے اتنا خوبصورت شہر روئے زمین پر نہیں دیکھا اور اسی بنیاد پر لکھنؤ کو عروس البلاد کہا جاتا تھا۔

واجد علی شاہ کا یہ دارالسلطنت اپنے شہریوں کے فضل و کمال کے سبب بھی یگانہ روزگار تھا اور خود واجد علی شاہ رعایا میں محبوب تھا اور قبول عام کے باعث شاہان عالم میں ایک بلند مقام رکھتا تھا۔

ہنومان گڑھی کا واقعہ اور مولوی امیر علی کی شہادت، البتہ واجد علی شاہ کے عہد حکومت پر ایک بدنما داغ ہے لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں انگریزوں

کے سیاسی ہتھکنڈوں کو دخل تھا۔ کئی ذمہ دار عہدہ داران کے پروردہ تھے۔ انہوں نے ریزیڈنٹ کی ہدایت پر صحیح نوعیت معاملہ بادشاہ کے سامنے رکھی ہی نہیں اور بالا بالا احکام صادر کردئے جس سے نیک طینت اور خداترس فرمانروا کی بدنامی ہوئی اور ایک طبقہ غلط فہمی کا شکار ہوگیا۔ یہی انگریزوں کا منشاء تھا پھر بھی واجد علی شاہ کا ذاتی کردار اتنا بے داغ تھا کہ دوست تو دوست دشمن بھی اسکی تعریف کیے بغیر نہ رہے۔

نجم الغنی مولف تاریخ اودھ نے شاہان اودھ کو مطعون کرانے کیلئے کتنے ہی واقعات مسخ کیے ہیں لیکن واجد علی شاہ کیلئے لکھا ہے۔

"یہ بادشاہ اسقدر رحمدل اور رقیق القلب تھا کہ باوجود اسقدر سلطنت اور زور و زر کے اس نے سن شباب میں کسی پر طیش اور بیرحمی نہیں کی بلکہ گالی تک زبان پر نہیں آئی، نہ کسی موافق و مخالف کو ظلم سے ستایا۔"

"اپنی ذات سے عادل تھا موافق یا مخالف، اپنے یا بیگانے کی عدل میں رعایت نہیں کی۔"

"باوجود اس سلطنت، جاہ و حشمت اور شباب کے اس بادشاہ میں غرور و نخوت، جس سے ہزاروں میں کوئی امیر خالی نہیں، نام کو نہ تھا۔"

سکینہ بنت الحسین کے مولف مولانا عبدالحلیم شرر رقم طراز ہیں۔

"دس سالہ حکومت کرنے کا انجام یہ تھا کہ ساری رعایا خوش تھی۔ ہر مذہب و ملت والے مطمئن تھے، اطراف مملکت کے تمام ہندو مسلمان جان نثار کرنے کو تیار تھے۔"

عبدالحلیم شرر کا ایک بیان بحوالہ گذشتہ لکھنؤ ص ۷۱ قابل ملاحظہ ہے۔

"بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے مگر مزاج میں مطلق تعصب نہ تھا۔ ان کا پرانا مقولہ تھا کہ میری دو آنکھیں ہیں۔ ایک شیعہ ایک سنی۔ ایک بار دو شخصوں میں مذہبی اختلاف پر مارپیٹ ہوگئی۔ بادشاہ نے دونوں کی معزولی کا حکم دیا بلکہ اپنے وہاں ممنوع الملازمت کردیا۔

بے تعصبی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہوگا کہ سارا انتظامی کاروبار سنیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وزیر اعظم منتظم الدولہ بہادر سنی تھے، منشی السلطان جو ایک

زمانے میں سب سے مقرب سارے جانورخانے کل اہل قلم اور کئی محکموں کے افسر اعلیٰ تھے سنی تھے بخشی امانت الدولہ بہادر، جنکے ہاتھ سے کل ملازموں حتیٰ کہ محلوں اور شاہزادوں تک کو تنخواہ ملتی تھی، سنی تھے، عطاردالدولہ اور داروغہ معتبر علی خاں جو آخر میں سب سے بڑے عہدہ دار ہوئے کل کاروبار کے مالک تھے دونوں سنی تھے۔

اس سے بڑھ کے کیا ہوگا کہ امام باڑہ سبطین آباد، محل کے خاص امام باڑے، بیت البکا کا انتظام، مجلسوں اور مذہبی تقریبوں کے بجالانے کا انصرام بھی سنیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں کبھی کسی نے محسوس ہی نہیں کیا کہ کون سنی ہے اور کون شیعہ ہے"۔

عصبیت سے بالاتر رہنا صرف واجد علی شاہ تک محدود نہ تھا اودھ کے کسی بادشاہ نے ہندو مسلمان، سنی شیعہ میں کبھی کوئی تفریق نہیں کی اور ساری رعایا کو ایک نظر سے دیکھا۔ اس قبول عام میں واجد علی شاہ کو خصوصیت حاصل تھی۔ لکھنؤ کی تہذیبی اور تمدنی جلوہ نمائی میں یوں تو سارے حکمرانوں نے حصہ لیا مگر واجد علی شاہ نے ہر شعبہ حیات میں جو نفاست پیدا کی اس سے گولکنڈہ کے ابوالحسن تاناشاہ کی روح پھڑک اٹھی ہوگی۔

اور اردو ادب تو اس طباع اور فاضل بادشاہ کے احسانات کو فراموش کر ہی نہیں سکتا۔

ان حقائق کے باوجود انگریزوں نے سلطنت اودھ کے خاتمے کا فیصلہ کرلیا پھر بھی عواقب سے خائف تھے جیسا کہ کوہ نور لاہور نے اپنی ۲۹ جنوری ۱۸۵۶ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔

ملک اودھ کی ضبطی کے کاغذات مرتب ہوچکے ہیں لیکن گورنر جنرل کو فساد کا اندیشہ ہے اور بڑا خطرہ یہ ہے کہ انگریزی فوج کے سپاہی اودھ کے رہنے والے ہیں۔

انگریزوں نے اس سے قبل کئی بار ایسا ارادہ کیا تھا مگر ہر مرتبہ بادشاہ کی عوامی مقبولیت دیکھ کر وہ ڈر گئے تھے۔ انکی اندر سے باہر تک سازش کا جال بچھ چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ علی نقی خان کے [illegible] بعض مجاہدین [illegible]

احتیاط کے طور پر ہندوستان سے لندن تک آپس میں مشورے ہوتے رہے ۔ آخر خطرات کے کھلاڑیوں نے ضبطی اودھ کا فرمان صادر کر دیا۔

حکومت اودھ کے دست و بازو انگریزی احکام کی تعمیل کیلئے تیار تھے۔ کانپور کی انگریز فوج گنگا کے پل کی طرف بڑھی تو اودھ کی توپوں نے اپنے دہانے سیدھے کر دئے مگر ان کو بتایا گیا کہ خود بادشاہ کی یہی مرضی ہے ۔

اس موقع پر گرد و نواح کے تعلقہ داروں اور زمینداروں کی بے چینی کو تاریخ فراموش نہیں کر سکتی ۔ انہوں نے تیزی کے ساتھ اپنے آدمی لکھنؤ کی طرف دوڑائے اور بادشاہ سے اجازت طلب کی کہ وہ انگریزوں کو روک سکتے ہیں، لکھنؤ سے مقابلے کیلئے فوج روانہ کی جائے ۔

خود واجد علی شاہ کو بھی خبر مل چکی تھی ۔ دل شکستہ بادشاہ کو انگریزوں کی جارحیت سے زائد اپنوں کی غداری کا غم تھا ۔ لکھنؤ کے مسلح عوام اور فوج میں اتنا دم خم تھا کہ وہ کسی مدت تک انگریزوں کو روکے رہتے ۔ جوش کا تقاضا تو یہی تھا جو زمینداروں اور تعلقہ داروں نے کہلوایا تھا ۔ اودھ کا تاجدار تھوڑی دیر کیلئے اپنی فوج کا کماندار بن گیا اور خیال ہی خیال میں اپنے سرداران لشکر کو ٹٹولنے لگا ۔ ہر طرف سرفروش ہی سرفروش نظر آئے ۔ اسکو یقین ہو گیا کہ ایک ایک آدمی مر جائے گا مگر پیٹھ نہ دکھائے گا ۔ پھر ایک سوال پیدا ہوا ۔

"کیا انگریزوں کو مکمل شکست دی جا سکتی ہے ؟"

اس کا جواب اثبات میں ملنا مشکل تھا پھر بھی واجد علی شاہ نے فرض کر لیا کہ اسکے جاں نثار نئے آلات سے مسلح انگریزی لشکر کو کانپور تک پسپا کر لے جائیں گے اور پھر آگے بڑھنے نہ دیں گے مگر جب انگریز ہندوستان کے دوسرے حصوں سے اپنی طاقت سمیٹ لائیں گے اور اودھ کی زخم خوردہ طاقت ان سے مقابل ہو گی تو کیا عہدہ برآ ہو سکے گی ؟

واجد علی شاہ میں یقیناً سلطان فتح علی ٹیپو کی سی شجاعت نہ تھی مگر صفدر جنگ کا پوتا موت سے ڈر نہ سکتا پھر بھی دور اندیشی دامنگیر ہوئی اور جب اسکو اپنے آخری سوال کا جواب "ہاں" میں نہ مل سکا تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ۔

"جب ایسے تمام وفادار کنوا دینے کے بعد بھی انگریزوں کو اس ملک سے نکالا نہیں جا سکتا تو کیوں انہیں خاک و خون میں لتھاڑا جائے" ۔

جذبات عقل پر حاوی ہو رہے تھے ۔ بادشاہت اور اسکے سارے لوازمات کو چھوڑ دینا کچھ آسان نہ تھا مگر واجد علی شاہ نے تصور میں میدان کو اپنے سرفروشوں کی لاشوں سے پٹا ہوا دیکھا اور اسکے بعد بھی فتح کے امکانات نہیں پائے تو راضی برضائے الٰہی ہو کر کہلوا دیا ۔

"انگریز ہماری حد میں آ ہی چکے ہیں تو آنے دو انہیں" ۔

پھر انگریز بلا کسی خون خرابے کے لکھنؤ میں داخل ہو گئے ۔ انہوں نے پہلے حکومت کے اسلحہ پر قبضہ کیا پھر سپاہیوں سے ہتھیار رکھوائے اور اودھ کے آخری تاجدار کی خدمت میں حاضر ہو گئے، فوجی سلام کر کے حکمنامہ انکے ہاتھ میں دیا جان عالم واجد علی شاہ اختر اسکے لئے تیار تھے ۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اپنا ہی ایک شعر ان کی زبان پر آ گیا ۔

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن، ہم تو سفر کرتے ہیں

انگریزوں نے بادشاہ کو نا اہل ثابت کرنے کیلئے کتابیں لکھوائیں، مذمت کیلئے کئی اخبار جاری کرائے لیکن اودھ کے محبوب فرمانروا کی گرفتاری اور ملک کی ضبطی سے ہر طرف انگریزوں کے خلاف منافرت کا طوفان امڈ پڑا ۔ واجد علی شاہ نے جذبات کو قابو میں رکھ کر جس خون کو بہنے سے بچا لیا تھا وہ بہہ کر رہا اور پورا شمالی ہندوستان مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر اسکی لپیٹ میں آ گیا ۔

ہندو مسلمان، سنی شیعہ ہزارہا جاں نثار اپنے اپنے سپاہیوں کے ساتھ نکل پڑے اور انگریزوں پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا لیکن تنظیم و اتحاد اہل ہندوستان میں ہوتا تو سفید غیر ملکی شروع ہی سے ٹھہر نہ پاتے ویسا ہی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی ہوا ۔ انگریز جرنیلوں نے نام بنام انکی بہادری کی داد دی ہے یقیناً حریت پسندوں کو بیشتر محاذوں پر شکست ہی ہوئی تھی مگر شکست تو ہونا ہی تھی کیونکہ وہ ٹکڑیوں میں بٹ بٹ کر لڑ رہے تھے اور جذبہ حریت میں جانیں دے رہے تھے ۔

خون بہا اور اس سے ہزار گنا خون بہا، جتنا اودھ کے آخری بادشاہ نے بچایا
تھا لیکن کہنے کو تو رہ گیا کہ وفاداروں نے جانوں کے ساتھ اپنی جائدادیں بھی اودھ
کے فرمانروا پر قربان کر دیں۔

واجد علی شاہ کو بھی اپنے متعلقین سے بڑی محبت تھی۔ بعض لوگ ان کے
عالم اسیری میں کلکتہ گئے اور مٹیا برج جاکر جان عالم سے ملے تو انہوں نے بیان کیا کہ
بادشاہ اس طرح ٹوٹ کر ہم آغوش ہوتے تھے جیسے کوئی بچھڑا ہوا بہت پیارا عزیز مل
گیا ہو۔ جانے والے کو اس حالت میں بھی کوئی گرانقدر تحفہ دئے بغیر انہوں نے
واپس نہ ہونے دیا۔

ان کے بعد لکھنو اس طرح سونا ہو گیا تھا جیسے کسی سہاگن کی مانگ اجڑ گئی
ہو، فرق نہیں آیا تو عزائے امام حسین میں۔ محرم کا چاند نظر آتے ہی ہندو مسلمان
سب اسی طرح سوگوار نظر آتے بلکہ رقت انگیز مناظر میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔

کلکتہ میں بھی واجد علی شاہ نے تعزیہ داری میں کوئی کمی نہیں کی سب کچھ اسی
طرح انجام دیتے رہے جسکی روایت لکھنؤ میں قائم کی تھی بلکہ عزا کی حد تک تو خود
انگریزوں نے وہاں ایسے عناصر جمع کر دئے تھے جن سے مجلسوں اور جلوسوں کو بڑا
فروغ ہوا۔

میران سندھ، علی وردی خاں کا بچا کھچا خاندان، سلطان ٹیپو کے وارث اور
اودھ کے باقیات الصالحات، ان سب نے مل جل کر مٹیا برج، ہگلی اور بعض
دوسرے علاقوں میں عزا خانے قائم کر دئے اور کربلا کے شہیدوں کا پیغام اجنبی
لوگوں تک پہنچانے لگے۔

بنگال کی حد تک ہگلی وقف نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا جو حاجی محمد حسن
شیرازی نے قائم کیا تھا: اسکی پیدائش انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں بمقام
ہگلی ہوئی تھی۔ انگریزوں کے دور میں اس نے بڑی دولت پیدا کی اور بنگال کے
مختلف حصوں میں جائدادیں خرید کیں چونکہ لاولد تھا لہذا تمام جائداد اہل اسلام کے
رفاہی کاموں کیلئے وقف کر دی ہگلی میں ایک عالیشان امام باڑہ اور ایک کالج قائم کیا
اور غریب بچوں کیلئے تعلیمی وظائف کا التزام کیا۔ شیر بنگال مولوی فضل الحق نے اسی

وقف کے وظیفے سے تعلیم حاصل کی تھی۔

اس عظیم محب اہل بیت نے جیسور میں بھی ایک امام باڑہ بنوایا تھا اور
عزاداری میں اپنے شغف کی ایک نظیر قائم کی تھی جو اب بھی اسی وقف سے ہوتی ہے
شیعہ کو سنی بنا دینے کی مہم میں ہگلی وقف کے بھی سنی وقف ہونے کا دعوی کیا گیا تھا
مرحوم مولوی سید علی نے زندگی بھر مقدمے لڑ کر جھوٹوں کو جھوٹا ثابت کیا۔ حد ہے
احسان فراموشی کی! ایسے ہی کئی وقف ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی پائے
جاتے ہیں، جن میں حسین آباد لکھنؤ اور محمود آباد کے وقف بھی ہیں جنکی آمدنیاں
صرف عزائے سید شہدا پر صرف ہوتی ہیں۔ (۸۹)

ہمارے عقائد

ہماری تاریخ

مختصر تاریخ آل محمدؐ ایک تحقیقی دستاویز

تاریخ شیعیان علی کا دردناک افتتاحیہ

قیمت

ایک سوستر روپے

منارہ ہائے ہدایت

تولیت کعبہ

صوفیائے کرام

فقہائے امامیہ

مشاہد سادات

صراط مستقیم

تولیت کعبہ

نقطہ آغاز

تولیت کا خیال ذہن میں پیدا ہوتے ہی ایک نام معاً ذہن میں آجاتا ہے اور وہ نام ہے حضرت ابو طالب کا، جن کا کردار دور جاہلیت سے شروع ہوتا ہے۔آپ بیک وقت پیغمبر اسلام اور کعبہ، دونوں کے متولی نظر آتے ہیں اور یہ اسی استحقاق تولیت کی بات تھی جو خلاق عالم نے کعبے کو ابو طالب کے بیٹے کا مولد قرار دیا جو ایک طرح پر مشیت کا اعلان تھا کہ کعبے کی تولیت ابو طالب کی نسل کا موروثی منصب ہوگی

آنحضرت کی زندگی تک یہ منصب برقرار رہا۔ علیؑ نے بیت داور کو اصنام سے پاک کیا، سورہ برأت کی تلاوت کا فرض ادا کیا اور اس کی حفاظت کے لئے اپنی تلوار کو بے نیام رکھا۔ پھر انقلاب وقت نے دوسرے دعویدار پیدا کر دیئے اور ورثائے ابو سفیان اسلام اور حرمت کعبہ دونوں کو دمشق اٹھالے گئے۔

دمشق سے یہ شرف بغداد منتقل ہوا۔ کعبہ مکے میں تھا اور اس کے محافظ ہفتوں کی مسافت پر بغداد میں اقامت گزیں تھے...... کتنی ستم ظریفی ہے کہ اسلام مدینے کا، محور اسلام مکے میں اور اس کی نگرانی بغداد سے کی جارہی تھی جبکہ بانی اسلام کی نسلی، مستند اور برحق وراثت مدینے میں موجود تھی مگر اس کو جائز استحقاق کے جرم میں گردن زدنی قرار دیا جارہا تھا کیونکہ ان ورثاء نے قلم کے بجائے تلوار کا استعمال ناجائز قرار دیا تھا...... اور حصول دنیا کے لئے جیت تلوار کی ہوئی تھی۔

عباسی خلافت میں جب تک دم خم رہا ، وہ کعبے کی متولی بھی رہی ، مسلمانوں کی محافظ اور اسلام کی نام نہاد سربراہ بھی...... اس نے یہ اعزازات برقرار رکھنے کے لئے شیعہ آئمہ کو محبوس بھی کیا، زہر بھی دلوایا اور تہہ تیغ بھی کرتی رہی ، علیؑ کے شیعوں پر اتنے مظالم کئے کہ دور دور تک کوئی اہل بیت کا نام لیوا باقی نہ رہا لیکن ان حالات میں بھی شیعہ علماء کی زبان اور نوک قلم چلتی رہی اور حضرت حجت کی غیبت کے بعد اس کے اثرات رونما ہونا شروع ہوگئے ۔

سرور کائناتؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ہم میں سے کوئی حصول اقتدار کے لئے تلوار نہ اٹھائے گا ۔ سارے آئمہ کرام اسی کی ہدایت کرتے رہے لیکن اسلام کی تبلیغ اور آل رسول کی حرمت کا اظہار تو علماؒ کے فرائض میں داخل تھا وہ اپنا کام کرتے رہے پھر اہل سیف پر اپنا تحفظ بھی لازم ہوگیا اور اس کے لئے ظالموں کی تلواریں کند کر دینا یا توڑ ڈالنا ضروری تھا لہذا مردان جنگ آزما سروں سے کفن باندھ باندھ کر سر میدان آگئے پھر بنی بویہ نے ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھ دی ۔

تاریخ میں پہلی بار شیعوں کی ایک مضبوط حکومت قائم ہوئی تھی جس کا سلطان خلافت بغداد کا متولی بھی تھا اور عباسی خلیفہ کے ساتھ تولیت کعبہ میں جس کا نام بھی لیا جاتا تھا اس اقتدار کا دورانیہ یوں تو دو سو برس رہا مگر ڈیڑھ سو برس تک تو اپاہج خلافت اس کے رحم و کرم پر زندہ رہی ۔

بغداد میں شیعوں کی یکجائی بہت پہلے شروع ہو چکی تھی مگر محلہ کرخ میں اپنے طور پر زندہ رہنے کا حق اسی زمانے میں حاصل ہوا جو سنی اکثریت کو کیونکر گوارا ہو سکتا...... شیعہ ان کے نزدیک ایسے تو نہ تھے کہ وہ ایک جماعت بن کر قابل ذکر قرار پائیں لہذا اکثریت کا زعم روایتی جارحیت کی شکل میں امنڈ پڑا اور شدید فرقہ وارانہ فساد وقوع میں آگیا ۔

حکومت شیعہ تھی وہ جانبداری سے کام لیتی تو بغداد کو اجاڑ دیتی لیکن عماد الدولہ نے اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو انصاف اور رواداری کا درس دیا تھا لہذا طاقت نے ثالثی کا کردار ادا کیا اور طرفین کی باہم منافرت کو کم کر دیا گیا ۔

دو سو برس میں کئی بار ایسا ہوا اور طرفین کو برابر کا نقصان اٹھانا پڑا ۔ شیعہ پہلے کی طرح کچلے نہیں گئے ۔ یہی دوران کے لئے عافیت کا تھا ۔

غزنوی اور سلجوقی

بویہی سلطنت جب خاندانی منافشات کا شکار ہوئی اور سبکتگین نے سامانی حکومت کے خاکستر پر غزنی کا ایوان سلطنت تعمیر کر لیا تو بویہین کے ملحق علاقوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگا اور اس کے بیٹے سلطان محمود نے تو ایران کی سرحد تک فتح و ظفر کے پرچم لہرا دیئے ۔ اس کے بعد مدینہ و بغداد کے خطبات میں خلیفہ کے ساتھ سلطان محمود کا نام بھی لیا جانے لگا ۔ گویا وہ کعبے کا متولی تھا ۔

پھر غزنویوں کی جگہ طغرل بیگ نے لی جو ایک متعصب سنی تھا ۔ فتوحات کے سیلاب میں اس نے شیعوں کو اس طرح غرقاب کیا کہ بعض علاقوں میں تو شیعوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہا ۔ یہ گویا ان کے لئے مصیبتوں کے دوسرے دور کی نشاۃ ثانیہ تھی ۔

پھر سلجوقی حکومت مضبوط ہوتی رہی اور شیعوں پر ستم رانی کے انداز بدل بدل کر آزمائے جاتے رہے ۔

بغداد کا محلہ کرخ اپنی اجتماعی آبادی کے لمحہ اولین سے نگاہوں میں کھٹکتا رہا تھا ۔ بویہی دور میں بھی فسادات ہوئے مگر ایک غیر جانبدار حکومت کے سبب اس میں شدت نہیں آنے پائی مگر اب تو شیعہ بے یار و مددگار ہوگئے تھے لہذا کرخ پر مظالم کے پہاڑ ڈھائے جانے لگے ۔

۴۰۱ھ ، ۴۰۶ھ ، ۴۰۸ھ ، ۴۴۳ھ ۴۴۴ھ اور اس کے بعد آئے دن کبھی دن دہاڑے ، کبھی رات میں چھپ کر ۔ مکانوں کو آگ لگانا ، مسجدوں کو مسمار کرنا ، کتب خانے جلانا ، جو سامنے پڑ جائے اس کو تہہ تیغ کر دینا ، نہ صرف معمول بن گیا بلکہ داخلی ثواب سمجھا جانے لگا ۔

۴۴۸ھ میں ابو عبداللہ الجلاب ، باب الطاق کے قریب قتل کیے گئے اور انہیں کی دوکان میں لاش کو سولی پر لٹکا دیا گیا ۔ ان پر اہل بیت کی فضیلت بیان کرنے کا الزام تھا ۔

اس سے قبل ۴۴۱ھ میں شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی پر حملہ ہو چکا تھا، ان کا گھر، نادر زمانہ کتب، وہ منبر جس پر بیٹھ کر وہ درس دیا کرتے تھے، سب کچھ راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ شیخ الطائفہ بچ کر نکل گئے اور نجف میں جا کر پناہ گزیں ہو گئے جہاں ان کا مدرسہ شیعوں کی سب سے بڑی علمی درس گاہ رہی ہے۔

یہ سب کچھ شیعوں پر سلجوقی حکومت کی سرپرستی میں ہوا۔ ان کو روکنے والا کون تھا۔ بنی مزید میں کچھ دم خم تھا تو وہ سلاجقہ کی طاقت سے متصادم تو نہ ہو سکتے .... اور سلجوقی سلطنت جب عالم نزع میں پہنچی اور خلافت عباسیہ میں وقتی طور پر قدرے توانائی پیدا ہوئی تو خلیفہ مستنجد نے واقعہ کربلا کی یاد تازہ کر دی۔

بنی اسد کی آبادیاں نہر فرات کے کنارے پھیلی ہوئی تھیں۔ برش شمشیر کی روایات ان کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے سلجوقیوں کی ظاہری رواداری سے متاثر ہو کر ان کا ساتھ دیا تھا لیکن عہد شکنی کرنے پر یہ بھی دکھایا تھا کہ ان کے ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں ہیں بلکہ انگلیاں قبضہ شمشیر پکڑنے کی عادی ہیں۔ مستنجد کو ان شجاعان روزگار سے سخت عداوت تھی۔ اس نے لشکر خلافت میں جان پیدا ہوتے ہی اس کو بنی اسد کے استیصال پر متعین کر دیا۔

تاریخ کا یہ المیہ اکثر مورخین کے قلم کو حرکت نہ دے سکا لیکن بعض نے لکھ ہی دیا کہ بنی اسد نے پہاڑوں میں پناہ لے کر اس بہادری کا مظاہرہ کیا جس کی نظیر بمشکل تلاش سے ملتی ہے۔ آخر ان پر پانی بند کر دیا گیا جو یزیدیوں کا کارگر حربہ رہا تھا۔ بنی اسد کے اجداد کربلا کی جنگ کے عینی شاہد رہے تھے۔ وہ شدت تشنگی میں ٹولیاں بنا بنا کر گھاٹیوں سے نکلے اور میدان میں لاشوں کے انبار لگا کر شہید ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ مختلف جنگوں کے درمیان بیس ہزار بنی اسد کام آئے۔ بغداد سے تازہ دم فوجیں پہنچتی نہ رہتیں تو سفاک مستنجد کو پتہ چل جاتا کہ فرزندان شمشیر سے بھڑنے کا انجام کیا ہوتا ہے لیکن اب شیعوں کی کوئی چھوٹی سی طاقت بھی باقی نہ تھی جو ان کی آواز پر آواز ہی لگا سکتی، جو کچھ تھے، خود ہی تھے لہذا مرد بہادروں کی موت مر گئے اور خواتین و اطفال پورا علاقہ خالی کر گئے، کون کدھر گیا؟ اس کچھ سراغ نہیں ملتا لیکن ان وادیوں میں آج بھی ضرب المثل ہے کہ سیف الدولہ صدقہ، دبیس ابن صدقہ کے نام لیوا انہیں کی طرح شجاع اور بہادر تھے

زنگی اور ایوبی

عماد الدین زنگی سلجوقیوں کی بساط فرمانروائی پر بیٹھا تو اس کا مقابلہ کسی شیعہ سے نہیں ہوا کیونکہ شیعہ جو بھی باقی تھے، وہ کوفہ و بصرہ میں اور وہاں بھی ان کی اجتماعی طاقت ایسی نہ تھی جو کسی بڑی حکومت سے ٹکر لے سکتی لہذا زنگی نے چھوٹے چھوٹے سنی حکمرانوں کے علاقے ہڑپ کر کے جلد ہی ایک بڑی حکومت بنا لی اور خلافت عباسیہ کو بھی اپنے تابع کر لیا۔

بویہی سلطنت کے کمزور ہونے پر خلافت عباسیہ کا اقتدار بھی مجروح ہوا تھا۔ محمود غزنوی سے کچھ سہارا ملا تھا مگر وہ کسی طویل مدت کے لئے نہ تھا۔ اس عرصے میں مصر کی فاطمی خلافت نے حرمین کو زیر نگیں کر لیا تھا اور وہ کعبے کے متولی بن گئے تھے پھر ان کی جگہ سلجوقیوں نے لی اور اب عماد الدین زنگی سلجوقیوں کا جانشین تھا لہذا اس نے عباسی خلیفہ کے اشتراک سے کعبے کی تولیت حاصل کر لی۔

زنگی کوئی شیعہ پرست نہ تھا، کھرا سنی تھا۔ شیعوں سے اس کو کوئی محبت بھی نہ تھی لیکن اس نے کوئی کھلا ظلم نہیں کیا۔

نور الدین زنگی کے دور تک بعض واقعات ضرور ملتے ہیں مگر اس نے شیعوں کو بے پناہی اور بے چارگی کا احساس نہیں دلایا البتہ صلاح الدین ایوبی نے، جب مصر میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تو شیعوں پر جور و ستم کا ایک باب کھل گیا۔

عیسائیوں کے خلاف صلاح الدین کے جنگی اقدامات مسلم قوم کے لئے باعث امتنان ہیں۔ صلیبی سیلاب کے مقابل اس طرح لوہے کی دیوار بن جانا اس کی شجاعانہ عظمت کی دلیل ہے مگر اس کو شیعوں سے نہ جانے کیوں اتنی منافرت تھی۔ مصر میں اس نے جو کچھ کیا، اس کی ایک تاویل ہو سکتی ہے کہ فاطمین کا اثر کم کرنے کے لئے جور و ستم کو روا رکھا لیکن عراق و شام میں تو ایسے کسی استدلال کی گنجائش نہیں یہاں تو شیعوں سے بغاوت کا خطرہ بھی لاحق نہ ہو سکتا..... خلیفہ ناصر لدین اللہ کی طرف سے اہل بیت کی حمایت کا اظہار ہوا تھا تو آخر عمر میں صلاح الدین ان کے خلاف ہو گیا تھا۔

حکومت میں عہدے نہ دینا فرمانروا کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے جس پر اس کو اعتماد نہ ہو، اس کو وہ کوئی ذمہ داری سونپے یا نہ سونپے مگر عہد ایوبی میں کوئی مظلوم شیعہ فریاد لے کر گیا تو مستوجب عتاب ہوا، بے گناہی کو شیعوں کا عین گناہ قرار دیا جاتا رہا۔ یہ صورت حال ایوبیوں کی دو نسلوں تک بروئے کار رہی پھر ترکان عثمانی کا عہد آگیا جنہوں نے اپنے پیش رووں کو بھی مات کر دیا...... ایوبی بھی اپنے عروج تک کعبے کے متولی تھے۔

تحیر خیز یہ حقیقت ہے کہ صلیبی جہاد میں کئی شیعہ جرنیل اور متعدد افسران فوج نے ایوبی لشکر کے ساتھ حق جہاد ادا کیا تھا جنکے بارے میں صلاح الدین جانتا تھا اور انکی خدمات کا معترف تھا پھر بھی اسکی شیعہ دشمنی کم نہیں ہوئی۔

ترکان عثمانی

ترکوں کی حکومت کا آغاز بھی اسی طرح ہوا جس طرح دوسری حکومتیں قائم ہوئی تھیں۔ انہوں نے بھی قبیلے کی یک جہتی اور تلوار کی تیزی سے اپنے وجود کو منوایا اور ایک چھوٹے سے مرکز پر ٹھہر کر اس طرح پھیلے کہ عظیم سلطنت ترکیہ کے بانی بن گئے۔

ترکان عثمانی کے قبیلے کا نام اوغوز تھا جو مشرق سے مغرب کو ہجرت کرتے رہے۔ جو شاخ انقرہ کے نواح میں آکر آباد ہوئی اس کا سردار ارطغرل بیگ تھا جو عثمان خان کا دادا تھا۔ اس قبیلے کو سلجوقی سلطان علاء الدین سے جاگیر ملی تھی جو مشرقی اناطولیہ میں تھی۔

یہ علاقہ سلجوقی اور عیسائی جنگوں کا آماجگاہ تھا اور اس سے تھوڑے سے فاصلے پر تاتاری حکومت کی سرحد شروع ہوتی تھی لہذا ارطغرل کو عیسائی اور تاتاریوں دونوں سے جنگ کرنا پڑی.......... قبیلے اور علاقے کی باگ ڈور جب عثمان خان کے ہاتھ آئی تو زمانہ بڑا پر آشوب تھا۔ ہر طرف لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم تھا

صلح پسند مسلمانوں نے اپنی حفاظت اور باہمی اتحاد کے لئے ایک تحریک چلائی تھی جس کا نام اخی تحریک تھا۔ عثمان خان بھی اس میں شریک ہو گیا پھر ایک

باقاعدہ فوج بنائی اور رومی عیسائیوں نے جو مسلم علاقے لے لئے تھے ان کو واپس لیا۔۔۔۔ ۱۳۲۶ء میں وہ ایک بڑے علاقے کا مالک تھا۔ جس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ بروصہ کا محاصرہ تھا کہ عثمان خان کا انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد اورخان نے باپ کی جگہ لی اور فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ یورپ کی سرحد تک ابھرتی ہوئی اس سلطنت نے ہاتھ پاؤں نکالے تو مشرق و مغرب میں پھیلتی چلی گئی۔ اورخان کے بعد سلطان مراد تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں ایشیا و یورپ دونوں براعظموں میں عثمانی مقبوضات کا اضافہ ہوا پھر بایزید یلدرم اس کا جانشین ہوا جو اپنے پیش رووں سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ۱۴۰۲ء / ۸۱۴ھ میں امیر تیمور قہر الٰہی کی طرح اس سلطنت پر ٹوٹ پڑا اور یلدرم اس کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔

بایزید کے بعد سلطان محمد تخت نشین ہوا۔ اس نے عثمانی حکومت میں چار چاند لگا دیئے پھر مراد ثانی نے عنان حکومت سنبھالی اور تیس سال بعد محمد ثانی قسطنطنیہ کا فرمانروا ہوا جسکو چند ناکامیاں ہوئیں پھر بھی اس نے اہل یورپ کے دانت کھٹے کر دیئے۔ ۱۴۸۱ء میں بایزید ثانی کا دور شروع ہوا۔ ۱۵۱۲ء میں سلیم اول تخت پر بیٹھا۔ اس نے مصر اور بعض دوسرے علاقے مسخر کئے۔ اس کے عہد حکومت میں ایران کی صفوی حکومت مضبوط ہو چکی تھی۔

۱۵۲۰ء / ۹۲۷ھ میں سلیمان ذیشان ترکی کا حکمراں ہوا۔ ۱۵۶۶ء میں اس کے انتقال پر اس عظیم سلطنت کا انحطاط شروع ہوا اور کمزور سے کمزور تر سلاطین آتے جاتے رہے۔ بغاوتیں اور خانہ جنگی آئے دن کا کھیل ہو گیا۔ حتیٰ کہ ترکی یورپ کا مریض نیم جاں مشہور ہو گیا۔ سلیم ثانی، مراد ثالث اور محمد ثالث، سب نامراد حکمراں گزرے مراد رابع آخری جنگجو سلطان تھا، وہ بھی ترکی کو سنبھال نہ سکا۔

۱۶۴۰ء / ۱۰۵۰ھ میں وزراء کی حکومت بنی۔ وہ بھی ناکام رہی۔ نت نئی آزمائشوں میں ترکی اندر کی طرف سمٹتا رہا اور روس کی حدیں پھیلتی رہیں.... غنیمت ہوا کہ ترکی کا انجام دوسری سلطنتوں کی طرح نہیں ہوا اور خدا نے کمال اتاترک کو پیدا کر دیا جس نے ڈوبتی ناؤ کو شکستہ حالت میں ساحل سے ہمکنار کر دیا۔ (۹۰)

چودھویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی کو اس سلطنت کے اٹھان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک بڑی طاقت بن گئی اور اس نے زوال پذیر ایوبی سلطنت کی جگہ لے لی پھر تولیت کعبہ بھی اس کی تحویل میں آ گئی۔

اس سلطنت کی حدود چونکہ مسلمانوں کے معروف علاقوں سے دور تھیں اس لئے منگولیا کے طوفان کا اس پر زیادہ اثر نہیں پڑا پھر ہلاکو خان کے ورثاء کی سلطنت جب انحطاط پذیر ہوئی اور امیر تیمور سمرقند سے نکل کر عراق و ایران پر حملہ آور ہوا تو ترکوں کی حکومت شباب پر تھی۔ انہوں نے طاقت کے زعم میں سخت مزاج مغل کو للکار دیا۔ بایزید یلدرم کی شکست اور گرفتاری ترکوں پر ایک ضرب شدید تھی مگر وہ اس کو جھیل گئے اور یلدرم کے جانشینوں نے حکومت کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھال لیا۔

کہا جاتا ہے کہ محی الدین ابن عربی اور مولانا روم کی تعلیمات کا ترکوں پر بڑا اثر تھا اور اسی کی بنیادوں پر اخی تحریک چلائی گئی تھی جس کی بدولت عثمان خان استقرار حکومت میں کامیاب ہو گیا۔ ترکوں میں اخوت تھی، بھائی چارہ تھا لیکن جب ان کا سابقہ شیعوں سے پڑا تو انہوں نے بڑی عصبیت کا مظاہرہ کیا اور بعض فرمانرواؤں نے تو اتنے مظالم ڈھائے کہ انسانیت کانپ اٹھے۔

شروع کے عظیم فرمانرواؤں سے صفوی اور قاچاری بادشاہوں کے معرکے ہوئے تو اس کو ملک گیری کی ہوس پر محمول کیا جا سکتا ہے مگر عوامی سطح پر انہوں نے جو ستم توڑے، ان کو بربریت کے سوا کچھ کہا نہیں جا سکتا اور بغداد تو تختہ مشق ہی بنا رہا۔ قسطنطنیہ کے فرمانروا جب اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے تو کرخ کی گلیاں انہوں نے سادات اور شیعوں کے خون سے رنگ دیں پھر جب صفویوں نے اس کو چھین لیا تو وہ اپنے مقتول اور زخمی چھوڑ کر چلے گئے۔

یہ عمل کئی بار دہرایا گیا اور ترکوں نے ہر مرتبہ وہی سب کچھ کیا جو اس سے قبل ہوتا رہا تھا۔ پھر جب ایک عہدنامے کی رو سے بغداد پر ترکوں کا قبضہ مسلم ہو گیا تو شیعہ ان حالات میں آ گئے گویا وہ تقیہ میں زندہ ہوں۔

"مظالم کی فہرست بڑی طویل ہے۔ بڑے بڑے جید عالم ان کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ کعبے کے متولیوں نے اپنے مقبوضات میں متوکل کا دور تازہ کر دیا۔ مدینے میں بھی سادات و شیعوں کا قتل کیا گیا۔ سلطان سلیم ثانی نے عراق سے عجم تک پھیلے ہوئے شیعوں کی مردم شماری کرائی پھر ان کو قتل کرا دیا۔ ان کی تعداد چالیس ہزار بتائی جاتی ہے۔" (۹۱)

شہید ثانی شیخ زین العابدین ترکی عالم تھے۔ انہیں حج کے دوران مکے سے گرفتار کرایا گیا۔ سلطان سلیمان پاشا نے چالیس روز ایک مکان میں محبوس رکھا پھر قسطنطنیہ میں قتل کرا دیا۔ لاش تین روز تک پڑی رہی پھر دریا میں پھینک دی گئی۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اہل بیت کا نام لیتے تھے۔

ایسے ان گنت واقعات ہیں جن کو امیہ اور بنی عباس کے جانشینوں کا کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔

ترکوں سے تولیت کعبہ سعودیوں کو ملی جو آج تک باقی ہے۔

محمد ابن سعود

۱۱۳۹ھ / ۱۷۳۶ء سے ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۵ء تک۔ سلطنت نجد کا بانی محمد بن سعود قبیلہ حنیفہ سے تھا جس قبیلہ سے مسیلمہ کذاب گزرا ہے جو درعیہ میں بڑا شیخ مانا جاتا تھا، اس کے دور میں ایک شخص محمد ابن عبدالوہاب ۱۱۱۱ھ میں بمقام عنیہ میں پیدا ہوا اور ۱۲۰۶ھ میں مر گیا۔ اس نے اپنے نزدیک مذہب اسلام میں اصلاح یا تجدید کی اور بنی تمیم میں اپنے عقائد پھیلانے لگا۔ اس پر شہر کا حاکم مزاحم ہوا اور محمد بن عبدالوہاب درعیہ کے شیخ محمد بن سعود کے پاس چلا آیا اس نے اس کی حمایت کی اور اس کے جدید مذہب کو اپنے علاقے میں رائج کیا، جو محمد بن عبدالوہاب کے نام پر وہابی کہلاتا ہے۔ پھر رئیس درعیہ نے محمد بن عبدالوہاب سے رشتہ داری قائم کر لی اور وہابی تحریک پھیلانے میں بڑی جدوجہد کی۔ نتیجے میں لوگوں سے جنگ کی نوبت آ گئی۔ الحسا کے مشہور قبیلہ بنی خالد اور نجران کے قبیلہ مکرمی نے اس کا سدباب کیا لیکن وہ بھی اس سیلاب کو نہ روک سکے۔ شرفائے مکہ نے ایک جدید فرقہ قرار دے کر اس کو حج سے روک دیا اور شریف مکہ نے اس کی اطلاع قسطنطنیہ بھیج دی۔ اب محمد بن

سعود شیخ قبیلہ کے بجائے حکمران بن چکا تھا۔اس نے ۱۱۰۸ھ / ۱۷۶۵ء میں تیس برس حکومت کر کے انتقال کیا۔

عبد العزیز بن محمد بن سعود

۱۱۷۹ھ سے ۱۲۱۸ھ تک۔اس کی حکومت کے پہلے دس سال ہمسایہ قبائل بنی خالد بنی مکرمی اور بنی منتفق سے لڑنے میں گزرے۔۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۵ء میں عبدالعزیز نے الحسا اور قطیف پر قبضہ کر کے خلیج فارس کے ساحل پر اقتدار قائم کر لیا بصرہ و بغداد کے ترکی حکمرانوں اور ان کے اتحادی بنی منتفق نے ان کے خلاف ہر کوشش کر ڈالی مگر ناکام رہے۔۱۷۹۹ء / ۱۲۱۲ھ میں پاشائے بغداد اور عبدالعزیز میں چھ سال کی عارضی صلح ہو گئی۔۱۱۸۶ھ / ۱۷۷۳ء میں سرور شریف مکہ نے ان کو ایک خاص محصول کی ادائیگی پر زیارت مقدسہ کی اجازت دیدی لیکن اس کے جانشین غالب نے ۱۲۰۳ھ / ۱۷۸۹ء سے اس اجازت کو منسوخ کر دیا اس پر وہابیوں نے ۱۷۹۰ء / ۱۲۰۴ھ، ۱۷۹۵ء / ۱۲۰۸ھ اور ۱۷۹۸ء / ۱۲۱۲ھ میں حجاز پر حملے شروع کر دیئے۔آخر مجبور ہو کر ۱۷۹۸ء میں شریف غالب نے صلح کر لی اور وہابیوں کو حج کی عام اجازت دیدی۔عبدالعزیز نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ شریف کے علاقے پر تاخت نہ کرے گا۔

۱۸ ذلحجہ ۱۲۱۶ / ۱۸۰۱ء کو عبدالعزیز نے اپنے بیٹے سعود کے ماتحت فوج روانہ کی اور کربلا کو فتح کر لیا اور حکم دیا کہ کافر اور مشرک شیعوں کو مارا جائے اور قتل عام کیا جائے۔اس طرح سات ہزار کربلائی مارے گئے۔ان مقتولوں میں مولٰنا فخر الدین عبدالصمد ہمدانی صاحب بحر المعارف بھی ہیں۔وہابیوں نے روضہ سیدالشہدا کا کچھ احترام نہ کیا۔مقدس مقامات کی بے حرمتی کی،جو نقد و جنس خزانہ درگاہ میں جمع تھا وہ سب لے لیا۔

۱۲۱۴ھ / ۱۸۰۰ء اور ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱ء میں سعود بن عبدالعزیز حج کے لئے آیا تو اشیرٔ تہامہ اور بنی حرب کے قبائل جو اب تک شریف غالب کے ماتحت تھے، سب سعود سے آملے اور ایک مرتبہ پھر شعلہ جنگ بھڑک اٹھا۔۲۵ شوال ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۸۰۳ء کو وہابیوں نے طائف پر قبضہ کر لیا ہزارہا آدمی قتل کیئے اور ۸ محرم

۱۲۱۸ھ مطابق ۳۰ اپریل ۱۸۰۳ء کو سعود فاتحانہ مکہ معظمہ میں داخل ہو گیا۔۱۴ روز وہاں قیام کیا، مسلمانوں کو اپنے طریقہ کی ہدایت کی اور سلطان روم کو فتح مکہ کا حال لکھ بھیجا، اپنا ایک ہدایت نامہ بھی روانہ کیا پھر جدہ کا محاصرہ کر لیا۔

شریف غالب وہاں موجود تھا وہ جواب دیتا رہا اتنے میں سعود کو خبر پہنچی کہ (۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء میں) عبدالعزیز ایک شیعہ عبدالقادر جیلانی کے ہاتھ سے مارا گیا لہٰذا وہ جدہ کا محاصرہ اٹھا کر درعیہ چلا گیا اور اپنے باپ کی جگہ نجد کا سلطان ہو گیا۔

شریف غالب میدان خالی پا کر مع فوج کے آگیا اور از سر نو اس پر قبضہ کر کے جو وہابی موجود تھے ان کو نکال دیا تاہم ان کے لئے مزید مراعات منظور کر لیں۔ طائف بدستور وہابیوں کے قبضہ میں رہا جہاں عثمان مضایقی ان کی طرف سے منتظم تھا۔۱۸۰۰ء / ۱۲۱۴ھ سے وہابیوں نے خلیج فارس کے ساحل پر اقتدار جمانا شروع کیا اور چند ہی سال میں بحرین پر بھی قابض ہو گئے پھر راس الخیمہ کے قبائل بنو جواسم بھی ان کے شریک ہو گئے۔

سعود بن عبد العزیز

۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء سے ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء تک بغداد اور عمان پر خفیف حملوں کے بعد سعود نے طے کیا کہ شریف مکہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے چنانچہ ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں اس نے مدینہ منورہ پھر ذی الحج میں مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا۔بقیہ حکومت بچانے کے لئے شریف غالب نے اطاعت قبول کر لی۔

اس دوران وہابی تحریک تمام حجاز میں پھیلتی رہی۔حاجیوں کے کارواں جو ترکی سے آتے تھے روک دیئے گئے، خطبہ سے ترکی سلطان کا نام نکال دیا گیا، سعود نے ایک خط لکھ کر مطالبہ کیا کہ نہ صرف والی دمشق بلکہ خود سلطان بھی وہابی تحریک کو قبول کر لے۔والی دمشق نے جواب صاف دیا تو سعود نے جولائی ۱۸۱۰ء ۱۲۲۸ھ میں حوران پر حملہ کیا اس کے بعد سعود نے خلیج فارس پر حملہ بول دیا۔اس طرح انگریزوں کو ۱۸۰۹ء میں ان کے خلاف بیڑا روانہ کرنا پڑا۔جس نے ۱۳ نومبر ۱۸۰۹ء کو راس الخیمہ پر قبضہ کر کے سعود کے بیڑے کو برباد کر دیا۔

سلطان روم خود نصاریٰ سے جنگ میں مصروف تھا اس لئے وہابیوں نے

اس قدر زور پکڑا کہ ترکی سلطان کو خود اپنی سلطنت جاتے رہنے کا خطرہ پیدا ہو گیا لہذا اس نے محمد علی پاشا کو حکم دیا کہ مصری فوج لے کر سعود کی سرکوبی کر دے۔ محمد علی نے اپنے بیٹے طوسون پاشا کی سرکردگی میں فوج روانہ کر دی جس نے نومبر ۱۸۱۱ء میں ینبع البحر اور ینبع البر فتح کر لیا لیکن مدینہ کی طرف پیش قدمی کرتے وقت صفرا اور حدیدہ کے مقام پر سعود کے بیٹوں عبداللہ اور فیصل نے عربوں کی مدد سے ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء میں ایسی شکست دی کہ بہت کم لوگ بچ کر گرتے پڑتے مصر کو واپس ہو سکے۔ بہت مال واسباب وہابیوں کے ہاتھ آیا۔ ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء میں محمد علی خود جدہ آیا اور اس کی فوج تمام مقبوضات وہابیہ کو فتح کرتی ہوئی صفرا اور حدیدہ تک پہنچ گئی اور ماہ رمضان میں حسن تدبیر سے بلا مقابلہ فتح کر لیا۔ سپہ سالار لشکر وہابیہ کو ایک لاکھ ریال رشوت دی اور دوسرے افسروں کو اٹھارہ اٹھارہ ہزار ریال نقد کے علاوہ ان کے وظیفے بھی مقرر کر دیئے۔ یہ سارا کام شریف غالب کی پیروی اور کوشش سے انجام پایا، جو بظاہر وہابیوں کا دوست تھا مگر درپردہ دشمن۔

ذیقعد ۱۲۲۷ھ میں لشکر سلطانی مدینہ میں داخل ہوا اور اوائل محرم ۱۲۲۸ھ میں دریا کے راستے جدہ جا پہنچا۔ شریف غالب چھپ کر فوج وہابیہ سے نکل کر سلطانی لشکر میں آ گیا، مکہ اور جدہ میں سلطانی فوج کے داخل ہوتے ہی عثمان مضایقی طائف سے فرار ہوا لیکن گرفتار کر کے قسطنطنیہ بھیج دیا گیا، جہاں وہ قتل کر دیا گیا پھر محمد علی پاشا نے تمام وہابیوں کو چن چن کر قتل کرا دیا۔ اسی اثنا میں ۸ جمادی الاول ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۷ اپریل ۱۸۱۴ء کو سلطان سعود ۶۸ سال کی عمر میں انتقال کر گیا اور اس کا بیٹا عبداللہ اس کا جانشین ہوا۔

عبداللہ بن سعود

۲۷ اپریل ۱۸۱۴ء سے ۹ ستمبر ۱۸۱۸ء تک۔ ۱۵ جنوری ۱۸۱۵ء کو محمد علی پاشا نے تربہ فتح کر لیا، پھر اشیر کی طرف بڑھا اور قنفذہ ہوتا ہوا مکہ آ گیا۔ مارچ میں طوسون پاشا حناکیہ کی سمت سے نجد میں داخل ہوا اور الراس کے قلعہ بند شہر پر قبضہ کر لیا جہاں عبداللہ بن سعود سے دوچار ہوا۔ وسط ۱۸۱۶ء تک دونوں میں صلح کی طویل گفتگو ہوتی رہی مگر صلح نہ ہو سکی۔

ستمبر ۱۸۱۶ء میں ابراہیم پاشا بن محمد علی نے مصری فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی، ۱۸ مہینے کی خوفناک خونی جنگوں کے بعد وہ درعیہ کے دروازوں تک پہنچ گیا اور اس کا محاصرہ کر لیا جو اپریل ۱۸۱۸ء سے ستمبر تک قائم رہا۔ آخر ۹ ستمبر کو شہر فتح ہو گیا اور سلطان عبداللہ نے تین دن تک قصر الدرعیہ میں محصور رہ کر ہتھیار ڈال دیئے۔ ابراہیم پاشا نے عبداللہ اور محمد بن عبدالوہاب کے خاندانوں کو قاہرہ بھیج دیا پھر محمد علی نے قاہرہ سے سلطان عبداللہ اور اس کے رفقاء کو قسطنطنیہ روانہ کیا جہاں ۱۷ دسمبر ۱۸۱۸ء کو ان سب کو قتل کر دیا گیا۔

مشاری بن سعود

۱۲۳۴ھ / ۱۸۱۹ء سے ۱۲۳۵ھ / ۱۸۲۰ء تک طوسون پاشا نے ۱۸۱۹ء میں نجد چھوڑا تو عبداللہ مقتول کے بھائی مشاری نے درعیہ میں پھر حکومت قائم کر لی۔ محمد علی نے اس کے استیصال کے لئے حسین بے کو روانہ کیا جس نے اسے گرفتار کر کے قاہرہ روانہ کر دیا لیکن وہ راستہ ہی میں مر گیا۔

ترکی بن عبداللہ بن سعود

۱۲۳۵ھ / ۱۸۲۰ء سے ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء تک۔ وہ مصری حملوں کے وقت سدیر بھاگ گیا تھا۔ مشاری بن سعود کے بعد اس نے ریاض میں اپنی خود مختاری کا اعلان کیا لیکن مصریوں نے شکست دے کر نکال دیا۔ ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۲ء میں اس نے ریاض کے کمزور مصری دستے پر اچانک حملہ کر دیا پھر حجاز کے والیوں سے لڑنے کے بعد محمد علی کو سالانہ رقم دینے پر راضی ہو گیا، مگر ۱۸۲۰ء میں اس نے پھر علاقہ الحسا کو جس پر ۱۸۱۳ء سے ترک قابض تھے فتح کر لیا اور بحرین پر قبضہ کر لیا۔ جس کے بعد وہابیوں کا دارالحکومت درعیہ کے بجائے ریاض قرار پایا لیکن ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء میں مشاری بن عبدالرحمن بن مشاری بن حسن بن مشاری بن سعود نے ترکی کو قتل کر کے خود تخت پر قبضہ کر لیا۔

مشاری بن عبدالرحمن

۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء صرف چالیس روز حکومت کرنے پایا تھا کہ فیصل بن ترکی بن عبداللہ نے اسے بمقام ہفوف قتل کر دیا اور سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

فیصل بن ترکی (باراول)

۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء میں برسراقتدار آیا۔ ۱۸۳۷ء میں فرمانروائے سوم سعود کے بیٹے خالد نے مصری فوج کی مدد سے بغاوت کی اور فیصل کو ریاض میں شکست دی اس کے بعد دوسری لڑائی میں مصری فوج کے سپہ سالار خورشید پاشا نے بھی فیصل کو دیلم میں پسپا کیا، گرفتار کر کے مصر بھیج دیا جہاں وہ قید کر دیا گیا مگر ۱۸۴۱ء میں رہا کر دیا گیا۔

خالد بن سعود

۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء سے ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء تک ۔ ۱۸۴۰ء میں مصری فوج کی واپسی کے بعد عبداللہ بن شینان بن ابراہیم بن شینان بن سعود نے دسمبر ۱۸۴۱ء / ۱۲۵۷ھ میں اسے ریاض سے نکال دیا۔ اس نے جدہ میں جاکر سکونت اختیار کی اور وہیں ۱۸۶۱ء میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

عبداللہ بن شینان

۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۲ء سے ۱۲۵۹ھ / ۱۲۴۳ء تک بمشکل سال بھر حکومت کر سکا تھا کہ فرمانروائے ہشتم فیصل بن ترکی نے جو ۱۸۴۱ء میں رہا ہو چکا تھا ریاض فتح کر کے اسے قید کر لیا اور وہ قید ہی میں مر گیا۔

فیصل بن ترکی (باردوم)

۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء سے دسمبر ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء تک مدبرانہ عاقلانہ اور مصلحانہ کوششوں سے حکومت کرتا رہا۔ اس کے عہد میں جبل شمر کے قبیلہ ابن رشید نے جو اس کا دوست تھا بغاوت کی، ۱۳ رجب ۱۲۸۲ھ مطابق دسمبر ۱۸۶۵ء کو وہ ہیضہ سے مر گیا

عبداللہ بن فیصل بن ترکی (باراول)

دسمبر ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ تا ۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۱ء میں اس کے بھائی سعود بن فیصل نے تخت سے اتار کر خود قبضہ کر لیا اور اس کو جلاوطن کر دیا۔

سعود بن فیصل بن ترکی (باراول)

دسمبر ۱۸۷۱ء سے ۱۸۷۴ء تک ۔ اس کے ابتدائی عہد حکومت میں جلاوطن

عبداللہ کی درخواست پر ترکوں نے الحسا اور قطیف پر قبضہ کر لیا اور باوجود سعود کی مسلسل کوششوں کے دونوں مقامات انہی کے قبضہ میں رہے یہاں تک کہ سعود نے انتقال کیا۔

عبداللہ بن فیصل بن ترکی (باردوم)

۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء سے ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء تک ۔ سعود کی وفات کے بعد اس نے پھر تخت حاصل کر لیا اور اپنے بھائی محمد اور سعود کے بیٹوں کی مخالفت کے باوجود اس پر قابض رہا۔ ۱۸۸۳ء میں اس کو ابن رشید والی حائل کی جنگ میں شرکت کرنا پڑی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سعود کے بیٹوں نے اسے ۱۸۸۴ء میں جلاوطن کر دیا۔

محمد بن سعود بن فیصل

۱۸۸۵ء ۔ اس کا عہد حکومت بہت ہی مختصر اور غیر اہم ہے اس کے بعد اس کا چچا عبدالرحمن بن فیصل تخت نشین ہوا۔

عبدالرحمن بن فیصل

۱۸۸۶ء ۔ اس کو محمد ابن رشید والی حائل نے تخت سے اتار دیا اور اس کی جگہ عبداللہ بن فیصل بن ترکی کو نجد کی حکومت دیدی۔

عبداللہ بن فیصل (بارسوم)

۱۸۸۷ء سے ۱۸۸۸ء تک ۔ عبدالرحمن کی سعی کے باوجود ریاض حائل کا محکوم رہا۔ ۱۸۹۱ء میں محمد بن رشید والی حائل نے ریاض فتح کر لیا اور وہاں کا تخت فیصل کے تیسرے بیٹے محمد کو دے دیا۔

محمد بن فیصل

محمد بن فیصل کی وفات کے بعد ریاض پر محمد ابن رشید والی حائل کے عمال حکومت کرتے رہے۔

عبدالعزیز السعود بن عبدالرحمن بن فیصل

عبدالعزیز نے کویت کے شیخ مبارک کی مدد سے مارچ ۱۹۰۲ء میں ریاض پر قبضہ کر لیا اور ابن رشید کے حملوں کو کامیابی سے روکتا رہا۔ اس پر ابن رشید نے ترکوں کی مدد حاصل کی لیکن چونکہ خود حائل میں بدامنی پھیل گئی تھی اس لئے وہ کچھ

نہ کر سکا۔ آخر سلطان عبدالعزیز نے عوام کی مدد سے ایک مرتبہ پھر ریاض کی خود مختار حکومت قائم کر لی۔

۱۹۱۳ء میں اس نے الحسا اور اس کا مشہور شہر حفوف ترکوں سے فتح کر لیا اور الحسا کو سلطنت نجد میں شامل کر لیا۔ ۱۹۲۳ء میں اس نے عبداللہ بن متعب الرشید امیر جبل شمر حائل کو اپنا باج گزار بنا لیا۔ ۱۹۲۴ء کے آخر میں اس نے طائف اور مکہ شریف حسین کو شکست دے کر فتح کر لیا۔ پھر دسمبر ۱۹۲۵ء میں مدینہ بھی فتح کر لیا۔

۱۹۲۴ء سے شریف حسین تخت حجاز اپنے بیٹے علی کو دے کر فیصل کے پاس عراق چلا گیا، فتح مکہ کے بعد علی نے اپنی سکونت و حکومت جدہ میں قائم کی، دسمبر ۱۹۲۵ء میں ابن سعود نے جدہ بھی فتح کر لیا اور علی بھی فیصل کے پاس بغداد چلا گیا۔

کعبے کے نجدی متولین کی شروعات اور ارتقاء پر نظر ڈالی جائے تو محمد بن عبدالوہاب کا ذہن اور محمد بن سعود کی امارت کو اساسی حیثیت حاصل ہوگی پھر صرف محمد بن سعود کی شیخوخیت کا عمل دخل دکھائی دے گا۔ اس کے بعد جس تیزی سے ان کے نظریے نے ہاتھ پاؤں پھیلائے اور جس سرعت سے استقرار حکومت کیا، اس کے لئے صرف ورعیہ کی محدود آمدنی کافی نہ ہو سکتی لہذا ماننا پڑے گا کہ نفاذ تحریک اور توسیع مملکت کے لئے رقوم کہیں نہ کہیں سے آتی تھیں۔

اور اس دور کی بساط سیاست پر صرف شاطران فرنگ کا سکہ چلتا تھا۔ ہندوستان کی حکومت انگریزوں نے مسلمانوں سے لی تھی۔ عراق و ایران اور ترکی میں مسلم آبادیاں اور مسلم حکومتیں تھیں۔ انگریزوں کا ٹکراؤ جب بھی ہوا تھا تو مسلمانوں سے اور جب ہو سکتا تو صرف مسلمانوں سے اور مسلمانوں کی سب سے بڑی طاقت ان کا جذبہ ایمانی تھا۔ جس میں کچھ دراڑیں تو پڑی ہی ہوئی تھیں، کوئی بڑا شگاف اور ڈال دیا جاتا تو اجتماعی طاقت مجروح ہو جاتی اور یہ قوم ٹکڑوں میں بٹ جاتی تو وہ جس ٹکڑے کو چاہتے، اس کو پاش پاش کر دیتے اس لئے انگریزوں نے سعودی آلہ کار اتنا توانا بنانے کی کوشش کی کہ اسلام اور مسلمان دونوں اس کی ضرب سے تلملا اٹھیں۔

یہ فراست کامیاب ہو کر رہی۔ وہابی مسلک ترمیمی اسلام کی شکل میں سامنے آیا تو قدامت اس کی تاب نہ لا سکی، رسالت اور آثار رسالت سب اس سے متاثر ہوئے پھر سعودی پشت پناہی کے لئے انگریز منظر عام پر بھی آگئے اور ۲۶ دسمبر ۱۹۱۴ء کو انہوں نے ابن سعود سے ایک معاہدہ کر لیا جس کی رو سے برطانیہ نے اس کی حکومت تسلیم کی، بیرونی جارحیت کی صورت میں تحفظ کی ذمہ داری لی اور سیاسی اعتبار سے سعودی حکومت کو اپنا پابند بنا لیا........ پھر اس میں امریکہ کی دخل اندازی بھی شروع ہو گئی۔

مسلمانوں میں تفرقہ سازی اور نفاق پروری کے لئے ابن سعود کی جو بھی اہمیت ہو لیکن آمدنی کے لحاظ سے اس کا انحصار حج کے موسم پر تھا اور حاجیوں پر عاید کئے ہوئے ٹیکس پر پوری قوم زندہ تھی لیکن ۱۹۴۵ء میں تیل کی دریافت کے بعد سے سارا ملک دولت مندوں کی صف میں جا کھڑا ہوا جس کے بعد سعودی مسلک کی اشاعت میں بجلی کی سی تیزی پیدا ہو گئی۔

اسلامی اعتبار سے وہابی نظریات کا جائزہ علمائے کرام کا کام ہے ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ حنفی، شافعی اور مالکی مکاتیب فقہ ہزار گیارہ سو سال تک اسلام کی جن تعلیمات پر عمل کرتے رہے، کیا وہ غلط تھیں۔ اس طویل مدت میں کتنے بڑے بڑے عالم، مجتہد، صاحبان نظر پیدا ہوئے، انہیں اتنا بھی علم نہیں تھا کہ وہ ان باتوں کو سمجھ سکتے جو صحرائے نجد میں ہوش سنبھالنے والے محمد بن عبدالوہاب نے سمجھ لیں .... وہابی مسلک کی رو سے تمام صوفیاء، فقہاء اور علماء اور ان کے متبعین سب مشرک قرار پاتے ہیں۔

کربلا کی تاراجی

جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے انہوں نے شہروں سے اٹھنے والی ایسی آوازوں کو صدا بصحرا قرار دیا تو خود صحرا سے جو آواز اٹھی، اس پر کیا کان لگاتے۔ ان کا ایک جادہ مستقیم ہے۔ اس پر وہ چلے آرہے ہیں اور چلتے رہیں گے۔ ان کے لئے ایسا کوئی اجتہاد قابل اعتنا۔ کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کون اہل بیت کا

دوست ہے اور کون دشمن ؟ اس زاویہ نگاہ سے نجد کے سعودی پچھلے متولین کعبہ سے بازی لے گئے اور انہوں نے تو شیعوں پر اس قدر ظلم و ستم توڑے کہ چنگیز کی بربریت کو پیچھے چھوڑ دیا۔

۱۲۱۶ھ میں سعود بن عبدالعزیز نے نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کو تباہ کر دیا۔ جو بیس ہزار کا لشکر لے کر وہ عراق پہنچا، اور کربلا کو حصار میں لے لیا اور قتل عام شروع کر دیا۔ عوام، پہرے دار اور زائرین درندہ صفت نجدیوں کے سامنے مدافعت کے قابل بھی نہ تھے وہ بیدریغ قتل ہونے لگے۔ مورخین نے ان کی تعداد سات ہزار سے زائد بتائی ہے۔

پھر اس لشکر نے روضہ حسینی کو مسمار کرنا شروع کیا اور خزانے پر قبضہ کر لیا۔ لوٹ میں زرد جواہر کے علاوہ ایک بہت بڑا موتی بھی تھا۔ بیس طلائی تلواریں، قیمتی جڑاؤ پتھر، سونے چاندی کے ظروف، فیروزے، ہیرے اور بیش قیمت ساز و سامان سب پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ چار کشمیری شالیں، دو ہزار چاندی کی تلواریں، بے شمار بندوقیں اور دوسرے اسلحہ فروش اور دوسرا اسباب ان وحشیوں کے ہاتھ لگا جن کو لے کر وہ واپس ہو گئے....... اس کا انتقام فتح علی قاچار نے مسقط اور نجد میں لیا۔

اس کے بعد یہ ویران اور اجاڑ روضہ مہینوں میں آباد ہو سکا۔ سبط رسولؐ کے مزار کی رونق تو بتدریج دوبارہ واپس آ گئی اور عقیدتمندوں نے اس کو پہلے سے زیادہ مزین کر دیا مگر تاریخ میں ان صحرائیوں کے نام کا ایک سیاہ باب تحریر ہو گیا جو آج بھی اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایکبار پھر انہوں نے نجد و کربلا پر غارتگری کی کوشش کی تھی مگر حفاظت کا معقول انتظام دیکھ کر ان کی ہمت نہیں پڑی۔

انہدام مدینہ

تاراجی کا یہ سلسلہ صرف ان مشاہد تک محدود نہیں رہا، راہ چلتے جو بھی زیارت گاہ انہیں نظر آئی، اس کو مسمار کر دیا مگر دوسرے ہی برس عبدالعزیز ابن السعود موت کے گھاٹ اتار دیا گیا: کربلا کی یلغار میں سعود بن عبدالعزیز نے ایک

افغانی ملا کے بیٹوں کو قتل کرا دیا تھا، اس نے اپنے بیٹوں کے اہتمام میں ۱۲۱۸ھ میں عبدالعزیز کو قتل کر دیا۔ اس میں بغداد کے ترکی حکمراں کی سازش بھی شامل تھی .... بعض مورخین نے اس کا نام عبدالقادر جیلانی لکھا ہے۔

غارت گری کے اس تسلسل میں حکومتوں کی تبدیلی کے بعد مدینہ بھی بری طرح تاراج کیا گیا اور سادات اور شیعوں کا نام و نشان تو پوری مملکت سے مٹا دیا گیا۔ منہدم ہونے والے مقبروں اور مساجد کی تعداد چھ درجن سے زائد ہے۔ مقدس مقامات کی بربادی کی ابتدا خود حضورؐ کے روضہ مقدس سے کی گئی۔ جس کے بعد خانہ حضرت علیؑ، مولد جناب فاطمہ زہراؑ، بیت خدیجہؓ بنت خویلد، مکان حضرت حمزہؓ، خانہ ارقم، قبرستان جنت معلیٰ، قبور شہدائے بدر کو کھدوا کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔

جنت المعلیٰ مکے کا مشہور و معروف قبرستان تھا جس میں قاسم فرزند محمدؐ (آنحضرت کے صاحبزادے)، جناب عبدالمطلب، حضرت ابو طالب، جناب خدیجہ الکبریٰ اور ان گنت علماء، فقہا اور محدثین کی قبریں بنی ہوئی تھیں۔

پھر مدینہ طیبہ میں جنت البقیع پر توجہ کی گئی اور اس کو تو اس طرح برباد کیا گیا کہ کسی قبر کا سراغ ہی نہیں ملتا۔

اس قبرستان میں بڑے بڑے بزرگان دین کے مزارات واقع تھے۔ خود حضورؐ کا معمول تھا کہ وہاں تشریف لے جاتے اور مرنے والوں کے لئے دعائے مغفرت فرماتے۔ آپؐ کی اکلوتی بیٹی جناب فاطمہؓ بھی اس میں دفن تھیں، حضرت امام حسنؑ، حضرت امام زین العابدینؑ، امام محمد باقر، امام جعفر صادقؑ کی دائمی آرام گاہیں یہاں بنی ہوئی تھیں۔

۸ شوال ۱۳۴۴ھ کو سعودیوں نے انہیں اس طرح برباد کیا کہ جابجا چند پتھر نظر آتے ہیں، کسی قبر کو شناخت نہیں کیا جا سکتا۔

یہ وہ عمائدین اسلام تھے جن کی عظمت کو خانہ کعبہ جانتا ہے اور جن کے نام خانہ کعبہ کی حرمت کے ضامن ہیں۔ ان کے مشاہد کا انہدام ان لوگوں نے کیا ہے جو خادم حرمین شریفین کہلاتے ہیں اور جو دور حاضر میں کعبے کے متولی ہیں۔

(چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی)۔

کہنے کو تو یہ ایک ترمیمی عقیدے کی بات ہے لیکن حقیقتاً سابقین کی عظمت پر بھرپور ضرب ہے اور کھلا اعلان ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد گیارہ سو برس تک ایک متنفس بھی ایسا نہیں گزرا جو شرع اسلام سے واقف ہوتا اور سمجھ سکتا کہ یہ تمام امور بدعت ہیں۔

اور ہمارے نزدیک تو یہ صرف اہل بیت سے دشمنی کا ایک بہانہ ہے۔ دین رسولؐ کے نام لیوا یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ رسول اور ان کی اولاد کا نشان تک باقی رہے۔

ابن سعود ان مظالم کی چھاؤں میں تخت سلطنت سے معزول ہو گیا اور شاہ فیصل نے اس کی جگہ لے لی، پھر شاہ خالد نے عنان حکومت سنبھالی اور اب شاہ فہد کا طوطی بول رہا ہے لیکن خدا ظالم کی رسی دراز کرتا ہے، اس کو معاف نہیں کرتا۔ آل رسولؐ اور محبان علیؑ کے دشمن اس سے قبل بھی گزرتے رہے ہیں اور آخر ان کا انجام کیا ہوا؟ لیکن رسولؐ اور ان کی اولاد کا پرچم آج بھی سربلند ہے اور تا قیامت سربلند رہے گا! (۹۲)

صوفیائے کرام اور شیعیت

تصوف اور شیعیت ایک بحث طلب موضوع ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ صوفیوں کے چار بڑے سلسلوں میں تین حضرت علیؑ تک جاتے ہیں اور سرور کائناتؐ کی ذات اقدس پر مختتم ہوتے ہیں، ایک حضرت ابو بکرؓ کے توسط سے حضورؐ تک پہنچتا ہے۔

تصوف خود شناسی اور خدا شناسی کا نام بھی ہے اور خود فراموشی میں منزل حق تک پہنچنے کا راستہ بھی۔ اسلام میں تصوف کی کتنی گنجائش ہے؟ یہ علماء و فقہاء کے طے کرنے کی بات ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خدمت اسلام کی جن مہمات کو مسلم تلواریں اور علماء کی طلاقت لسانی سر نہ کر سکی، ان کو صوفیائے کرام کے انسانیت گیر اخلاق نے سر کر لیا۔ سجادہ تصوف کی وسعت کائنات کی پہنائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ سکے یا نہ سمیٹ سکے لیکن خانوادہ رسالت کی محبت کے جلوے اس میں ضرور نظر آتے ہیں اور مولائے انس و جان علی ابن ابی طالب سے ایک ربط بے پایاں دکھائی دیتا ہے۔ بساط تصوف کو مختصر لفظوں میں بیان کیا جائے تو محسوس ہو گا کہ:

"حضرت علی کرم اللہ وجہہ، جن پر شجر ولایت کی انتہاء ہو گئی، اسی شجر سے درخت طوبیٰ کی طرح بہت سی شاخیں نکل کر تمام عالم کو اپنے نور سے چمکا رہی ہیں اور تمام دنیا حضرت علیؑ کے نور جمال ولایت سے روشن ہو رہی ہے۔ خصوصاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد امجاد اور عالی نژاد نواسوں نے ان کمالات

سے وراثت حقیقی اور نسبت ذاتی کے سبب پوری طرح فیض حاصل کیا اور اپنی
ذاتی عصمت کی وجہ سے باطنی حکومت کا جھنڈا بلند کرتے ہوئے ظاہری حکومت کو
دوسروں کے سپرد کر دیا۔"

علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس حقیقت نگاری کے بعد چند فارسی اشعار
میں اظہار عقیدت کرتے ہیں:

" مملکت دین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب وہی حضرات ہیں ،
حکومت ایمان کے حکام وہی حضرات ہیں۔

حضرح نوح کی کشتی ہو یا حضرت موسیٰ کا سمندر، سب میں اللہ کے مقصود و
مراد یہی حضرات ہیں۔

نور ولایت خاندان نبوت سے کبھی جدا نہیں ہوتا اور نہ آسمان ولایت ان
قطبوں کے بغیر کسی اور چیز پر قائم رہ سکتا ہے۔ اہل بیت میں آنحضورؐ کا نور جلوہ نما
ہے جس طرح چاند میں آفتاب کا نور ہوتا ہے۔

ازل سے ابد تک اس کا ظہور ہے کیونکہ یہ نور نور جاودانی ہے۔" (۹۳)

سنی فقہ میں تصوف کے بارے میں دو نظریے ہیں ایک تو وہ ہے جو محدث
دہلوی نے پیش کیا ہے ، دوسرا اس کی نقیض کرتا ہے پھر بھی اکثریت تصوف کی
قائل ہے لیکن تصوف اگر ظاہر و باطن ، تزکیہ نفس اور واجبات و محرمات کی پابندی
کا وہ معتدل نظام ہو جس میں ترک دنیا، ترک لذات، ترک معاشرت، ترک ذات
یعنی چلہ کشی ، گوشہ نشینی اور خواہ مخواہ کی خبر پوشی کو کوئی اہمیت نہ دی گئی ہو اس
کی بنیاد تقویٰ پر رکھی ہو اور اس کا معیار حقوق اللہ اور حقوق عباد کی ادائی ہو تو مذہب
شیعہ اس کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔

ان حدود میں "تصوف صفائے باطن کا نام ہے ، پاکباز ، متقی ، شریعت کا
عامل ، عقائد صحیحہ کا حامل ، جس کی دعا میں اثر، جس کی نگاہ میں تاثیر ہو ، جو اللہ تعالیٰ
سے قربت حاصل کرنے کے لئے شرعی اعمال اور فقہی عبادات کا پابند ہو اور صوفی
کہا جائے تو شیعوں کا کوئی فقیہہ اسے برا نہیں کہتا۔" (۹۴)

بالفاظ دیگر طریقت اگر دائرہ شریعت سے باہر نہ نکلے تو اسلامی بھی ہے اور
علوی بھی ۔ ہماری تاریخ میں صرف انہیں صوفیائے کرام کی جگہ ہے جنہوں نے
فقیروں کا بھیس بدل کر صرف تماشائے اہل کرم نہیں دیکھا اور اللہ کے کھوکھلے
نعرے نہیں لگائے بلکہ بہلول دانا کے لب و لہجہ میں نعرہ ہائے حق بھی بلند کئے۔

اشاعت اسلام کے افق ماضی پر یوں تو دنیا کے ہر حصے میں مقدس صوفیاء
کے چہرے درخشاں و تابندہ دکھائی دیتے ہیں لیکن کچھ چہرے ایسے بھی ہیں جن کی
پیشانیوں کی ضو فضائے بسیط میں محمد وآل محمد کے نام لکھتی چلی جاتی ہے ۔ ماحول
اسلامی ہو یا غیر اسلامی ہو، انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں، وہ ایک مصلح انسانیت
بن کر کبھی راجپوتانہ کے ریگستان میں، کبھی برف پوش پہاڑیوں کے دامن میں وارد
ہوتے ہیں ، بالکل اسی طرح جس طرح حضورؐ بت پرست عربوں میں شمع توحید
جلانے کے لئے آئے تھے ، کوئی نہیں جانتا کہ یہ رحمت بدوش انسان کس مشرب
کے ماننے والے ہیں ۔ ان میں سے کوئی بھی اچانک اپنے نظریہ عقیدت کا اظہار
نہیں کرتا بلکہ پہلے مقامی زبان میں گفتگو کر کے لوگوں سے بے تکلف ہوتا ہے ،
آہستہ آہستہ ان میں احساس انسانیت پیدا کرتا ہے پھر محمد وآل محمد سے آشنا کراتا
ہے آخر میں فاران کی چوٹی سے نشر ہونے والا پیغام گوش گزار کرتا ہے۔

یہ ہیں صحیح معنی میں تصوف کے غیر فانی کردار، جنہیں ہندوستان کے ریگزار
میں خواجہ معین الدین اجمیری کا نام دیا گیا، سندھ میں لعل شہباز قلندر کہا گیا اور
کشمیر میں سید علی ہمدانی۔

یہ صوفی اپنے مسلک کے لحاظ سے نہ سنی تھے اور نہ شیعہ بلکہ نور وحدانیت
اور جمال اسداللہیت کے رمز آشنا تھے ، ان صوفیاء کو اگر تقسیم کیا جائے تو وہ دو
گروہوں میں بانٹے جا سکتے ہیں: ایک وہ جو سلسلہ خلافت کے قائل تھے لیکن علی اور
آل رسول کی عظمت کے سامنے کسی کو گردانتے نہ تھے ، دوسرے وہ جو عقیدہ تشیع پر
ایقان رکھتے مگر دونوں میں سے کوئی غیر مسلموں کے سامنے ان اندرونی مسائل کو نہ
رکھتا ۔ انہیں تو توحید و رسالت اور رسالت کے ذیل میں اجزائے رسالت کو پیش
کرنا تھا اور خود مسلمانوں کے مابین بھی ان متنازعہ مسائل کو رکھ کر جادہ تصوف

کو اختلافی بنانا نہیں تھا لہذا وہ عموماً صرف اپنے مسلک کی بات کرتے اور محمدؐ اور آل محمدؐ کی سیرتوں سے تجاوز نہ کرتے۔

تصوف کی شیعیت میں کوئی گنجائش نہیں پھر بھی صوفیوں میں ایک تعداد شیعوں کی بھی پائی جاتی ہے جنہوں نے اپنے حلقۂ ارادت اور سجادہ تصوف کو صرف خانۂ فاطمہ کی تجلیوں سے منور کیا اور اپنی تبلیغ میں چہاردہ معصومین کے علاوہ کسی کے نام نہیں لئے۔

ایسے صوفیاء کے لئے بڑی مشکلات تھیں۔ حکومتیں سنیوں کی تھیں وہ اگر اہل بیت کا نام لیتے تو نہ صرف زبان کاٹی جاتی بلکہ گردن بھی اتار لی جاتی لہذا انہوں نے اپنے مسلک کو غیر متنازعہ بنائے رکھا اور خدا شناسی اور خود شناسی پر اکتفاء کرتے رہے پھر اس تعلیم کی اصلی درس گاہ کا نام لیا۔

صوفیائے کرام کی اکثریت نے عالم اسلام اور سرزمین کفر، ہر ماحول میں ذات باری کے تعارف کے ذیل میں اولاد رسولؐ کے نام روشن کئے، کس کا کیا عقیدہ تھا؟ اس کا سراغ لگانا مشکل ہے کیونکہ ہر ایک کا طریقہ کار الگ الگ تھا، وہ بظاہر دنیا کے جھمیلوں سے کٹ کر بنی نوع انسان کو انسانیت کا درس دیتے تھے اور ذہنوں کو قبولیت اسلام کے لئے تیار کرتے تھے البتہ بعض صوفیوں کا مسلک کچھ واضح ہو گیا ہے تو ان کے بارے میں کچھ کہا جا سکتا ہے۔

شیعہ عقیدے کے صوفیاء کا انداز تبلیغ بھی یکساں نہ تھا ان کی ایک نظیر میں تو بہلول دانا کو پیش کیا جا سکتا ہے جن کا زمانہ کافی طویل تھا، انہوں نے سات عباسی خلفاء کا دور دیکھا اور امام جعفر صادقؑ سے لے کر امام حسن عسکریؑ تک کی زیارت کی۔ انہیں عارف آل محمدؐ ہونے کا شرف حاصل تھا۔ بڑے اہل علم اور دانائے راز تھے۔ ہمہ وقت ایک بیخودی کے عالم میں نظر آتے مگر جہاں موقع ملتا، حقوق اہل بیت کا نعرہ بلند کر دیتے۔ لوگ توجہ سے سنتے ضرور لیکن جس کو اپنے سروپا کا ہوش نہ ہو، حکومت اس کی گرفت کیا کرتی۔

ارباب تصوف کی اس قسم میں جو اپنے عقیدے کا اظہار نہ کرتے، ایک جلی نام صفی الدین اردبیلی کا ہے جو ہلاکو کے نویں جانشین سلطان ابو سعید کے

درباری عالم بھی تھے اور جن کا حلقۂ ارادت کافی وسیع تھا۔ خانقاہی حلقے کے اس عظیم درویش نے مریدوں کی ایک فوج تیار کر لی تھی جن کا وظیفہ علی علی تھا: اٹھتے بیٹھتے علی، سوتے جاگتے علی۔ صفی الدین کے یہ مرید یقیناً مسلمان تھے مگر بجز اللہ، محمد و آل محمد انہیں کسی اور سے یا اقتدار سے کوئی سروکار نہ تھا اور نہ صفی الدین کے کسی جانشین نے اس کا اظہار کیا۔

عقیدے کا اظہار تو شاہ اسمٰعیل صفوی نے اس وقت کیا جب اس کی حکومت مضبوط ہو گئی اور وہ اپنے کو بادشاہ کہنے کے قابل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ لوگ جو صرف علیؑ کو جانتے تھے، انہیں علیؑ کو امام برحق مان لینے میں کیا تکلف ہو سکتا

شیعہ درویشوں کی آخری قسم لعل شہباز قلندر اور شاہ عبداللطیف بھٹائی وغیرہ کی تھی جنہوں نے خلافت کے خلاف تو کچھ نہیں کہا مگر اپنے مریدوں کو اس راستے پر ڈالتے رہے جس میں دشمنان آل محمد سے نفرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

آخری قسم میں وہ صوفیاء ہیں جن کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا مگر ان کا نعرہ یہی رہا کہ بے حب اہل بیت عبادت حرام است۔ اس قسم میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں نام ہیں اور ان میں خواجہ معین الدین اجمیری سرفہرست ہیں۔

شام ہو یا لبنان، عراق ہو یا افغانستان، ایران ہو یا ترکستان، جزائر شرق الہند ہوں یا ملائشیا، کشمیر ہو یا ہندوستان، پھر برصغیر ہندوستان کا کوئی حصہ بنگال، پنجاب، راجپوتانہ، شمالی ہند یا دکن، جدھر نظر اٹھتی ہے، خانقاہیں ہی خانقاہیں دکھائی دیتی ہیں اور مکران سے سندھ تک تو مقابر صوفیائے عظیم کی وہ کثرت ہے کہ ان کے حلقہ ہائے ارادت کا تصور کیا جائے تو شہر کے شہر بس جائیں۔

ان میں کون سنی تھا اور کون شیعہ؟ اس کی نہ تحقیق ہو سکتی ہے اور نہ کوئی تحقیقی ثبوت ملتا ہے کیونکہ دشمن اہل بیت تو کوئی تھا ہی نہیں البتہ ایک معیار یہ بنایا جا سکتا ہے کہ عزادار امام مظلوم کون تھا؟ تو تذکرے جو ملتے ہیں، ان میں عزاداری کا کوئی ذکر نہیں ہے، سمعی معلومات کے تحت پاکستان میں امام بری، لعل شہباز، شاہ عبداللطیف بھٹائی، عبداللہ شاہ غازی اور بعض دیگر صوفیاء کے اسمائے جمیل قابل ذکر قرار پائیں گے جن میں ملتان اور دوسرے مقامات کے صوفیوں کو

شامل کر لیا جائے تو تعداد سیکڑوں تک پہنچے گی۔

اور ہندوستان میں تو ہزاروں کی گنتی ہوگی جن میں خواجہ اجمیری، سید سالار مسعود غازی، حاجی وارث علی شاہ، سید اشرف جہانگیر سمنانی، صرف نام لکھے جائیں تو پوری کتاب درکار ہوگی، ان سب نے علی اور ولائے آل رسولؐ کے چراغ روشن کئے اور بجا طور پر ان کے تذکروں کے لئے ہزاروں صفحات درکار ہوں گے جس کی سعادت کوئی اہل قلم حاصل کرے گا۔

اسلام کے ان دیوانگان خردمند نے شیعیت کی کوئی خدمت کی ہو یا نہ کی ہو لیکن حضور سرور کائنات کی عترت کی برگزیدگی کو کبھی فراموش نہیں کیا ہمارے نزدیک یہی شیعیت کی روح ہے لہذا ہمارے سران کی عظمتوں کے سامنے خم ہیں اور ہم ان کے تصور کو بھی موجب شرف سمجھتے ہیں۔

فقہائے امامیہ

کہنے کو حضورؐ سرور کائنات فقہ کے بانی اور جمیع آئمہ معصومینؑ اس کے معمار ہو سکتے ہیں لیکن در حقیقت ہمارے امام معمار نہیں بلکہ مفسر و محافظ ہیں، معمار تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں اس کی اشاعت کی اور اس پر عمل کر کے دکھایا، اس کا سلسلہ دور رسالت سے شروع ہو چکا تھا۔

"تاریخ مسلمات میں ہے کہ علی ابن ابی طالب سب سے پہلے اعلان اسلام کرنے والے، سب سے پہلے مرتب و مفسر قرآن، سب سے پہلے جامع و مرتب احادیث نبویہ ہیں۔" (۹۵)

آپ کا مدونہ ایک صحیفہ تھا جس میں احکام قصاص، تشریح بدعات، کسی بدعتی کو پناہ دینا یا ایجاد بدعت اور مسلمانوں سے غداری وغیرہ سے متعلق اقوال درج تھے۔ یہ صحیفہ دوسری صدی ہجری تک پایا جاتا تھا۔

اسی زمانے میں بعض صحابہ نے بھی احادیث جمع کیں، جن میں ابو رافع کی کتاب سنن و احکام قضایا، حضرت سلمان فارسی کی کتاب سلمان، حضرت ابو ذر غفاری کی کتاب ابو ذر شامل ہیں۔ صحیفہ جابر بن عبداللہ، رسالہ سمرہ بن جندب ان کے علاوہ تھے۔ جامع احادیث میں سعد بن عبادہ، عبداللہ ابن عمر، عبداللہ بن عمرو عاص، ابو ہریرہ دوسی کے نام بھی لئے جاتے ہیں۔ عبداللہ ابن عباس کا نمایاں نام بھی اسی تعریف میں آتا ہے۔

ابو رافع اہل بیت کے فداکاروں میں تھے۔ آپ کے دونوں بیٹے علی اور

عبیداللہ ، امیرالمومنینؑ کے خازن بیت المال اور میر منشی تھے ۔ علی بن رافع نے ترتیب ابواب کے ساتھ وضو اور صلوۃ سے متعلق احادیث جمع کیں ۔

اصبغ ابن نباتہ مجاشعی امیرالمومنین کے مخصوصین میں تھے ۔ بعض فرامین علویہ آپ ہی سے منقول ہوئے ہیں ۔

سلیم ابن قیس ہلالی نے اپنی معروف کتاب میں حضرت علیؑ، سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد اور عمار یاسر وغیرہ سے احادیث کو سن کر جمع کیا ۔

حضرت میثم تمار نے امیرالمومنینؑ کے حوالے سے احادیث کو قلم بند کیا ۔ آپ کی کتاب بڑی بلند پایہ تھی ۔

محمد بن قیس بجلی نے حضرت علیؑ سے مرویہ احادیث اور خود حضرت علیؑ کے اقوال اپنی کتاب میں لکھے تھے ۔

امیرالمومنینؑ کی بیان کردہ حدیثوں کو ابن مرہ اور عبیداللہ بن حر جعفی نے جمع کیا ۔ ربیعہ بن سمیع کی کتاب زکواۃ الانعام سے متعلق تھی ۔

جابر ابن یزید جعفی ، ابان بن تغلب ، زرارہ بن اعین ، ابو حمزہ شمالی ، زید نرسی سلسلہ حدیث کے جلی نام ہیں جو اپنے اپنے ادوار میں مقربین بارگاہ امامت بھی رہے اور صاحبان کتب بھی ۔ ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جن کو معصومین نے سند اعتبار دی لیکن راویوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو احادیث کی غلط نسبت آئمہ سے دیدیتے تھے جیسے مغیرہ ابن سعید اور ابو الخطاب ۔

اس طرح مجامیع کی تعداد چھ ہزار چھ تھی لیکن آنحضرتؐ کے بعد سے آج تک شیعان علیؑ کا وجود ایک لحظہ کے لئے بھی برداشت نہیں کیا گیا ۔ آئمہ علیہم السلام پر جو کچھ گزری وہ تو گزری ہی ، عام شیعوں کو بھی بیدریغ قتل کیا جاتا رہا ۔ ان کے گھروں کو بار بار جلایا گیا ۔ علمی ذخائر کو برباد کر دیا گیا ۔ بغداد میں شیعہ محلوں کی آتش زنی کے شعلے آج بھی اوراق تاریخ میں نظر آتے ہیں ۔ تلعکبری شیخ مفیدؒ، سید مرتضی اور شیخ طائفہ کے کتب خانوں کی آگ جاہلانہ تعصب پر نوحہ کناں ہے تاہم ہمارے جامعین احادیث کو جب کبھی زمانے نے تھوڑی سی مہلت دی تو انہوں

نے طول و عرض میں منتشر کتب کو یکجا کیا اور بمشکل چار سو کتابیں حاصل ہو سکیں جو "اصول اربعماہ" کہلاتی ہیں ۔ ان میں سے چوبیس اب بھی موجود ہیں ۔

تدوین احادیث میں امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی علمی فیض رسانی کو بھی بڑا دخل ہے ۔ بالخصوص امام جعفر صادقؑ نے تو اپنوں اور بیگانوں سب پر باب علوم کو وا کر دیا تھا ۔ آپ کے تلمذہ کی تعداد چار ہزار بتائی جاتی ہے جن میں بسند علامہ سلیمان ندوی ، امام ابو حنیفہ ، امام مالک ، سفیان بن عینیہ ، سفیان ثوری ، شعبہ ، ابو عاصم ، یحییٰ انصاری بھی شامل تھے ۔

شمع امامت کی ضیاء پاشی فقہ و حدیث تک محدود نہ تھی بلکہ ہر شعبہ علم کی تدریس کی جاتی تھی : فلسفہ ، فلکیات ، طبیعیات ، کیمیا وغیرہ کے تشنگان علوم بھی آتے اور جابر ابن حیان کی طرح امام کیمیا بن جاتے ۔

عظمت درس گاہ کے لئے اتنا کہنا کافی ہوگا کہ طالب علم کسی مسلک کا کیوں نہ ہوتا مگر صادق آل محمد کے حلقہ درس میں شامل ہونے کے بعد اپنے کو جعفری کہنے میں فخر محسوس کرتا اور ایک بار کوئی جعفری مشہور ہو گیا تو اس کی نسل نے اس نسبت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا حتیٰ کہ دنیا اسکو نسل سیدہ کونین سے گردانے لگی ۔

امام موسی کاظمؑ عمر کے بیشتر حصے میں گرفتار زنداں رہے اور اسی زمانے میں شیعوں کے اندر بعض اختلافات بھی پیدا ہو گئے پھر امام رضا بغداد و سامرہ منتقل ہو گئے اور یہ منتقلی حضرت حجتؑ کے دور تک طول پکڑ گئی ۔ اس دوران شیعہ ایک مد و جزر کی کیفیت سے دوچار رہے تاہم اب وہ پردہ گمنامی میں نہ تھے بلکہ ایک نمایاں گروہ کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے اور اسی مناسبت سے آئمہ علیہم السلام کا فیض جاری تھا ۔

یہی وہ زمانہ ہے جب شیعوں کو اپنے علمی ذخیرے محفوظ کرنے کا موقع ملا اور ابو جعفر برقی ، ابو جعفر کلینی ، ابو جعفر صدوق اور ابو جعفر طوسی نے اپنے اپنے مجموعہ ہائے احادیث مرتب فرمائے اور ان سے "اصول" کی تدوین ہوئی ۔

ابو جعفر برقی

ابو جعفر احمد بن محمد برقی کے جد اعلیٰ جناب زید شہید کے سرفروشوں میں تھے اور دوسرے بزرگ خاصان اہل بیت میں شمار ہوتے، سب کے سب ادیب و فقیہ اور صاحبان تصانیف تھے۔ خود ابو جعفر محدث، قلم کار، تاریخ و جغرافیہ کے ماہر اور شاعر تھے۔ "المحاسن" آپ کی شہرہ آفاق تالیف ہے جو نوے ابواب میں ہزاروں صفحات پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ بعض دوسری تالیفات اور تصنیفات بھی بتائی جاتی ہیں جیسے کتاب الرجال۔

آپ نے ۲۷۴ھ میں بمقام قم انتقال فرمایا اور علم و فضل اپنی وراثت میں چھوڑ گئے۔

اسی سلسلے میں ایک نام علم الدین ابو محمد فضل بن شاذان نیشا پوری متوفی ۲۶۰ھ کا بھی آتا ہے، جنہوں نے اساسی طور پر حدیثیں جمع کیں۔

محمد بن یعقوب کلینی

شیخ ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی ثقۃ الاسلام علاقہ رے میں کلین نامی قصبے کے باشندے تھے۔ ایک عرصے تک بغداد میں رہے۔ بڑے بڑے کتب خانوں اور اکابر علماء سے استفادہ کیا اور بیس سال کی محنت سے احادیث کا وہ مجموعہ تیار کیا جو رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ "کافی" ہزاروں کتابوں اور لاکھوں روایتوں کا نچوڑ ہے۔ آپ نے اپنی کتاب میں سولہ ہزار نو سو احادیث جمع کی ہیں جن میں چھ ہزار چار سو بانوے حدیثیں ہر لحاظ سے مستند ہیں، باقی کو ضعیف یا تحقیق طلب کہا جا سکتا ہے صحیح اور قوی احادیث سے اصول و فروع کی مکمل رہنمائی ہوتی ہے۔

بلاشبہ " تمام شیعی جوامع حدیث میں کافی کا درجہ سب سے مقدم مانا گیا ہے لیکن اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ اس کی ہر ہر حدیث صحیح السند اور قطعی الورود ہے۔ ہم حدیث کی کسی کتاب کو قرآن مجید کی طرح معصوم اور جرح و تعدیل کے میزان اعتبار سے بلند نہیں سمجھتے۔" (۹۶)

شیخ کلینی کے شاگردوں میں ابوالحسین احمد، محمد بن ابراہیم، صفوانی وغیرہ مشاہیر عصر میں سے تھے۔ ۳۲۹ھ میں وفات پائی اور بغداد کے باب کوفہ میں دفن ہوئے

شیخ صدوق

شیعہ جامعین حدیث میں تیسرا اہم نام شیخ ابو جعفر صدوق کا ہے۔ آپ کا خاندان بابویہ صدیوں تک علمی وجاہت کی ضمانت رہا۔

آپ کے والد ابوالحسن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ قم کے وجیہ ممتاز شہری اور مشہور و بااثر عالم تھے۔ تجارت ذریعہ معاش تھا۔ راست بازی کا جوہر اتنا نمایاں ہوا کہ لوگ صدوق (بہت بڑا سچا) کہنے لگے۔ علم و عمل، فقہ و حدیث میں اتنی مہارت اور عظمت پائی کہ لوگ فتووں کو حدیث کا درجہ دینے لگے۔ شاید آپ ہمیشہ الفاظ حدیث ہی میں جواب دیتے ہوں گے۔ قم کی دینی ریاست کے باوجود تجارت کے سلسلے میں بغداد وغیرہ میں آمد و رفت رہتی تھی اور ان مقامات پر بھی تبلیغ دین اور نشر علوم میں حصہ لیتے تھے۔ کئی اہم کتابوں کے مولف اور مصنف ہیں۔" ۳۲۹ھ جس سال بہت ستارے ٹوٹے اور محمد سمری و کلینی نے انتقال فرمایا، اسی سال علی بن حسین بابویہ نے دنیا سے رحلت فرمائی۔" (۹۷)

شیخ ابو جعفر محمد صدوق کی ولادت ۳۰۵ھ میں ہوئی، آپ نے ستر استادوں کے سامنے زانوائے ادب تہہ کیا۔ ندرت فکر سے آنحضرتؐ کی احادیث کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا اور اس کا نام "المسلسلات" رکھا۔ حدیثیں بیان کرتے وقت آپ تاریخ، دن اور مقام بتا دیا کرتے تھے جو انتہائے تحقیق اور تجربہ پر دلالت کرتا ہے۔ حلقہ تدریس واسط، قزوین، بصرہ، کوفہ، نیشا پور اور مدائن تک پھیلا ہوا تھا۔ آپ کی معرکہ آرا تصنیف من لا یحضرہ الفقیہ ہے لیکن وہ بھی وضعی حدیثوں سے پاک نہیں۔

آپ کے حلقہ تلامذہ میں شیخ مفید ابو محمد ہارون، حسین بن عبیداللہ، علی بن احمد، ابو العباس احمد بن علی بہت نامور ہوئے ہیں۔ ۳۸۱ھ میں بمقام رے انتقال فرمایا۔

رجال و احوال علماء سمیت ان کی تالیفات کی تعداد تین سو بتائی جاتی ہے جن میں من لا یحضرہ الفقیہ بھی شامل ہے۔ تفسیر قرآن ان کے علاوہ ہے۔

شیخ مفید

محمد بن محمد بن نعمان بغدادی، شیخ صدوق کے ارشد تلمذہ میں تھے۔ آپ ۱۱ ذی قعد ۳۲۶ھ کو واسط میں پیدا ہوئے۔ ابتدائے عمر سے بہت ذہین، نکتہ رس اور حاضر جواب تھے، مسلسل مطالعے نے آپ کے جوہر قابل کو ابھار دیا اور شیخ صدوق کے فیض نے اس پر اتنی جلا کی کہ افق احادیث وفقہ کا درخشندہ ستارہ بن گئے۔

عملی زندگی میں آئمہ معصومین کی تاسی میں کوشاں رہتے، رات بہت تھوڑی دیر سوتے پھر عبادت یا مطالعے میں مصروف ہو جاتے۔

آپ کی عمر کا بڑا حصہ بغداد میں گزرا، محلہ کرخ کی مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں ایک مسجد میں مدرسہ اور کتب خانہ قائم کیا تھا اور ہمہ تن علوم اہل بیت کی اشاعت اپنا شعار بنا لیا تھا۔ ان کا کتب خانہ کئی بار لوٹا گیا مگر اپنے بانی کی برکت نیت سے پھر بھی باقی رہا۔

آپ کی تصانیف کی تعداد دوڈھائی سو بتائی جاتی ہے۔ ۴۱۳ھ میں انتقال فرمایا

سید مرتضیٰ

سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کے والد ماجد سید شریف حسین بن موسیٰ حقیقتاً نقیب الطالبین تھے اور والدہ گرامی فاطمہ بنت حسین عابدی ہر لحاظ سے مومنہ تھیں۔ رجب ۳۵۵ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، آپ کے چھوٹے بھائی سید رضی مولف نہج البلاغہ چند سال بعد پیدا ہوئے۔

فاطمہ بنت حسین کو بڑی تمنا تھی کہ ان کے بیٹے علوم دین میں یکتائے زمانہ ہوں۔ غالباً انہوں نے سیدہ عالمیان سے دعا کی ہوگی، چنانچہ مشہور ہے کہ ایک رات شیخ مفید نے خواب دیکھا کہ جناب معصومہ دو بچوں کو لائی ہیں اور فرما رہی ہیں کہ ان دونوں کو فقہ پڑھا دو۔ صبح کو شیخ نماز سے فارغ ہوئے تھے کہ ایک برقعہ پوش معظمہ دروازہ مسجد پر نمودار ہوئیں جن کے ساتھ دو بچے تھے، انہوں نے شیخ سے درخواست کی کہ انہیں اپنے حلقہ تلامذہ میں داخل کر لیں۔

شیخ نے اس کو سیدہ کونین کا حکم قرار دیا اور ہاتھ پھیلا کر دونوں بچوں کو

خوش آمدید کہا۔ یہ بچے سید مرتضیٰ اور سید رضی تھے۔

شیخ کی تربیت اور دونوں بھائیوں کی صلاحیت کہ وہ علم و تقویٰ کے آفتاب بن گئے اور آج تک سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، السید الشریف، ذوالمجدین، ذوالثمانین کے القاب سے یاد کئے جاتے ہیں اور سید رضی کو یہ شرف حاصل ہے کہ مدون خطبات و مکتوبات امیرالمومنین کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

سید مرتضیٰ کا مدرسہ علم و فقہ کا گہوارہ تھا اور کتب خانے میں اسی ہزار کتابیں موجود تھیں۔ دونوں بھائی درس و تدریس کو بھی عبادت قرار دیتے اور مستحق طلباء کی مدد بھی کرتے تھے۔

۲۵ ربیع الاول ۴۳۶ھ کو سید مرتضیٰ نے وفات پائی۔ سید رضی کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ کاظمین میں شیخ مفید اور سید رضی کی قبروں کے نزدیک سید مرتضیٰ کی ابدی آرامگاہ بنی ہوئی ہے۔

ابو جعفر محمد طوسی

شیخ ابو جعفر محمد طوسی، شیخ الطائفہ کتب اربعہ میں دو کتابوں کے مولف ہیں فردوسی کی سرزمین طوس آپ کا وطن تھا۔ اسی مقام پر ۳۸۵ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ کے والد حسن بن علی اپنے عہد کے شیخ المحدثین تھے، لہذا بچپن سے عنفوان شباب تک کا زمانہ گھریلو تعلیم و تربیت میں گزرا پھر بغداد پہنچے جہاں محلہ کرخ میں مسجد نقطویہ نحوی میں اصول کافی کا درس ہوتا تھا۔ شیخ مفید کا مدرسہ اور سید مرتضیٰ کا جامعہ اتنی بڑی درس گاہیں تھیں کہ جیسے علوم کے دریا بہتے ہوں۔ ان کو دیکھ کر شیخ طوسی کے قدموں میں ایک زنجیر سی پڑ گئی اور ۴۰۸ھ سے آپ نے بغداد کی سکونت اختیار کر لی۔

یوں تو شیخ طوسی نے کتنے ہی بزرگوں سے استفادہ کیا لیکن شیخ مفید اور سید مرتضیٰ سے بڑا فیض حاصل کیا۔ حصول علم کی لگن اور ذہانت نے جلد ہی اتنی صلاحیت پیدا کر دی کہ شیخ مفید کی ایک کتاب کی شرح کرتے ہوئے "تہذیب الاحکام" لکھنا شروع کر دی۔ ۴۳۶ھ میں جب سید مرتضیٰ نے وفات پائی تو آپ مسند مفید و سید کے وارث قرار پائے۔

تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ درس و تدریس بھی شیخ طوسی کا محبوب مشغلہ تھا مگر شیعوں کا قسمتی مدوجزر انہیں بھی متاثر کئے بغیر نہ رہا۔ بنی بویہ کا زوال شروع ہوتے ہی محلہ کرخ پر آفت آگئی۔ چوتھی صدی ہجری کی تیسری دہائی میں مدارس، مساجد اور کتب خانے جلا دیئے گئے۔ پھر قادر باللہ کے دور میں ۳۹۲ھ میں تینتیس مسجدیں اور تین سو دوکانیں نذر آتش کی گئیں اور بیس ہزار آدمی مارے گئے

رجب ۳۹۸ھ میں شیخ طوسی کو ذاتی طور پر نقصان پہنچایا گیا۔ ان کی بے عزتی کی گئی......... اس کے بعد سب سے بڑا ستم یہ ہوا کہ سلطان محمود نے مجد الدولہ کا وہ کتب خانہ پھونک دیا جس میں شیعہ اور معتزلہ عقائد کا بیش قیمت ذخیرہ تھا۔

پھر غزنوی اور سلجوقی تسلط نے شیعوں کو بنی امیہ کا زمانہ یاد دلا دیا۔ انسانی جانوں اور رہنے کے مکانات سب پر غارت گری کی گئی۔

شیخ طوسی کی درس گاہ اور ان کا سارا سامان جلا دیا گیا، شیعہ خوف و ہراس کے عالم میں ترک سکونت کرنے لگے ایسے میں ۴۴۸ھ میں شیخ بھی تنگ آکر نجف اشرف منتقل ہو گئے۔

باب مدینۃ العلم کی سرزمین علم و عمل کی سرزمین تھی۔ شیخ طوسی نے وہاں نئے سرے سے تدریس و تصنیف کی زندگی کا آغاز کیا اور ایک حلقہ درس قائم کیا جو آج تک باقی ہے۔ فی الحال حکومت عراق کے ظلم کے سبب یہ مدرسہ بند ہے

۲۲ رجب ۴۶۰ھ کو پچھتر سال کی عمر میں آپ نے انتقال فرمایا اور اپنے سکونتی مکان میں دفن ہوئے۔

ایک بیٹا ابو علی حسن اور دو بیٹیاں آپ نے یادگار چھوڑیں۔ بیٹیوں کی اولاد میں رضی الدین علی بن طاؤس اور محمد بن ادریس نامور علماء میں شمار ہوتے ہیں۔

تلامذہ کی تعداد تین سو بتائی جاتی ہے جن میں ابو الصلاح تقی الدین حلبی، قاضی ابن سراج طرابلسی، شیخ سلیمان بن حسن، ابو ابراہیم اسمعیل بن محمد، ابو اسحق بن محمد قمی، حافظ شہید شیخ ابو علی محمد اور آدم بن یونسفی بہت معروف ہیں۔

"شیخ طوسی کا محور تحقیق شش پہل تھا: قرآن و تفسیر، حدیث و فقہ، رجال و کلام، ہر موضوع پر انہوں نے کتابیں لکھیں جن کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ کتاب

تہذیب اور کتاب استبصار آپ کی مہتم بالشان تصانیف ہیں۔ یوں تو ہر کتاب محقق طوسی کی فاضلانہ بصیرت کی شہادت دیتی ہے مگر موخر الذکر دونوں کتابیں احادیث سے متعلق ہیں اور کافی اور من لایحضر کی شمولیت میں ہماری کتب اربعہ کو مکمل کرتی ہیں۔" (۹۸)

شیعان علی کی احادیث کا یہ ذخیرہ بظاہر بہت کافی معلوم ہوتا ہے لیکن وہ لٹے لٹائے اور جلے جلائے سرمایے کا باقی الصالحات ہے اور اس کو سمجھنے کے لئے امام جعفر صادقؑ کا یہ ارشاد پیش نظر رکھنا ضروری ہو گا۔ آپ نے فرمایا:

"مغیرہ بن سعید نے میرے پدر عالی مرتبت کے اصحاب کی کتابوں میں کچھ ایسی حدیثیں خفیہ طور پر بڑھادی ہیں جو انہوں نے بیان نہیں کی تھیں لہذا خدا سے ڈرو اور ہم سے منسوب کی ہوئی احادیث کو قبول نہ کرو جو حکم خدا اور سنت رسولؐ کے خلاف ہوں۔"

خود حضورؐ نے پہلے ہی اس کی پیشن گوئی فرمادی تھی:

"میرے بعد غلط روایت کرنے والوں کی کثرت ہو گی جو بھی مجھ سے کوئی غلط حدیث منسوب کرے گا وہ اپنی جگہ جہنم میں بنائے گا۔" (۹۹)

ہمارے جامعین احادیث محقق طوسی اور شیخ صدوق دونوں نے کوشش کی کہ غیر معتبر حدیثوں کا انتخاب نہ کریں لیکن زمانے کی دست برد سے بچا کھچا اثاثہ تھا ہی تھوڑا لہذا وہ وضعی احادیث سے دامن بچا نہ سکے اور انہیں خود اپنی منتخبہ حدیثوں میں سے ایک تعداد کی تردید کرنا پڑی۔ اس طرح ہزاروں احادیث میں سے مستند حدیثیں ایک تہائی سے زائد نہیں رہتیں جن پر ہمارے ایمان کی عمارت کھڑی ہوئی ہے اور یہی وہ اثاثہ روایات ہے جس پر نہ حنبلیت کے جھکوڑے اثر کر سکے اور نہ وہابیت کے طوفان۔

تحقیق طلب احادیث پر بعد کے علماء نے کام کیا جو ہر دور میں ظلمت شکن رہے اور جن کے نام آج بھی بقائے عقیدہ کی ضمانت ہیں۔

شیخ ابو الفتح محمد بن علی صاحب کنزالفوائد ۴۴۹ھ میں اور بعض دوسرے اکابر اس سے قبل گزر چکے تھے، شیخ طوسی کے بعد چھٹی صدی ہجری سے گیارھویں صدی

ہجری تک باب مدینۃ العلم کی سرزمین، کربلا، کاظمین، حلہ اور دوسرے مقامات پر علوم اہل بیت کی شمعیں روشن ہوتی رہیں اور اکابر علماء کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی اور اس کے بعد چودہویں صدی ہجری تک ایک نظر ڈالی جائے تو علماء کی گنتی لاکھوں میں ہو گی۔ ان میں وہ مشاہیر بھی ہیں جن کی عظمت کے سامنے اپنے تو اپنے غیروں کے سر بھی جھک جاتے ہیں۔

ابو الفتوح رازی حسین بن علی متوفی ۵۵۹ھ صاحب تفسیر روض الجنان اور امین الدین ابو علی فضل بن حسن طبرسی متوفی ۵۴۸ھ مولف تفسیر مجمع البیان اسی عہد کے عالم ہیں۔

نصیر الدین طوسی

ان میں ایک روشن نام شیخ الاسلام نصیر الدین ابو جعفر محمد بن محمد کا ہے جو ساتویں صدی ہجری کی دوسری دہائی میں بمقام طوس پیدا ہوئے۔ آپ ہیئت داں اور منجم بھی تھے۔ اسمعیلی خلیفہ ناصر لدین عبدالرحیم کی ملازمت میں تھے۔ خلیفہ نے کسی بات پر ناراض ہو کر قلعہ الموت میں نظر بند کر دیا۔ ۶۵۴ھ میں ہلاکو خان کے حملے کے وقت آپ اسی قلعے میں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حسن بن صباح کے جانشین شیخ رکن الدین خورشید کو گرفتار کرنے میں تاتاریوں کو آپ سے مدد ملی تھی لہذا ہلاکو خان نے خوش ہو کر آپ کو وزارت کے عہدے پر فائز کر دیا۔

لیکن حقیقتاً ہلاکو کا قاعدہ تھا کہ جس مقام کو وہ تاراج کرتا، وہاں کے علماء کو یرغمال بنا کر ساتھ رکھتا۔ نصیر الدین طوسی بھی اسی تعریف میں تھے جن کے جوہر قابل سے ہلاکو متاثر ہو گیا اور اس نے آپ کی قدر افزائی کی۔

"اور یہ محقق طوسی کی عالمانہ بصیرت تھی جس نے تاتاریوں کی نظر میں اہل بیت کا وقار بلند کر دیا اور مشاہد مقدسہ ان کے ہاتھوں برباد ہونے سے بچ گئے پھر تاتاری آل رسول کے حلقہ بگوش ہونا شروع ہو گئے اور انہوں نے شیعوں کو اپنے اقتدار میں شامل کر لیا۔" (۱۰۰)

شیخ الاسلام نصیر الدین طوسی متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن میں اصول عقائد پر آپ کی دو کتابیں بہت اہم ہیں۔

علامہ حلی

ابو القاسم جعفر بن حسن بن یحییٰ بن سعید المعروف بہ علامہ حلی کا زمانہ بھی تقریباً وہی ہے۔ آپ ۶۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور ربیع الثانی ۶۷۶ھ میں بمقام حلہ انتقال فرمایا۔

آپ ساری عمر جہاد بالقلم اور جہاد باللسان کرتے رہے۔ فقہ میں شرائع الاسلام اور مختصر النافع، اصول دین میں المعارج آپ کی بلند پایہ تصانیف ہیں اور تاتاریوں کو حلقہ بگوش اسلام بنانا آپ کا بے مثال کارنامہ ہے۔

اس تسلسل میں بعض جلیل القدر علماء کے اسمائے گرامی ناقابل فراموش ہیں: شیخ الاجل محمد بن شیخ الطائفہ متوفی ۴۹۴ھ، الشیخ ابو جعفر محمد بن ابی القاسم آملی متوفی ۴۴۰ھ، ابو المکارم حمزہ بن علی الحلبی متوفی ۵۸۵ھ، ابو جعفر محمد بن علی الحلبی متوفی ۵۸۸ھ، شیخ ابن ادریس محمد بن احمد حلی متوفی ۵۹۸ھ، شیخ اجل ابو الفضل شاذان قمی متوفی ۶۱۸ھ، شیخ الفقہاء ابو ابراہیم محمد بن جعفر ہبۃ اللہ متوفی ۶۴۵ھ، شیخ الفقیہ جعفر بن محمد متوفی ۶۵۰ھ، صاحب الکرامات السید رضی الدین بن طاؤس متوفی ۶۶۴ھ۔

آیۃ اللہ المطلق شیخ جمال الدین علامہ حلی متوفی ۷۲۶ھ بھی انہیں میں شامل ہیں۔ انہوں نے تبلیغ دین کی گراں قدر خدمات انجام دیں اور غیر مسلم تاتاریوں کو شیعہ بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

نصیر الدین کاشانی علی بن محمد متوفی ۷۵۵ھ، فخر المحققین، محی الدین محمد بن حسن متوفی ۷۷۱ھ، تاج الدین السید المویدالجلیل عالم نسابہ محمد بن قاسم نجفی متوفی ۷۷۶ھ بساط شیعیت کی چند اہم شخصیات ہیں۔

شہید اول

افقہ الفقہاء، الشہید اول المحروق محمد بن جمال الدین صاحب "لمعہ فی الفقہ" ایک روشن نام ہے جن کا زہد و تقویٰ مختلف العقائد لوگوں میں بھی مسلم تھا۔ ان کے ایک ہم جماعت ابن جماعہ، قاضی دمشق نے انہیں قید میں ڈلوا دیا۔ پھر ۹ جمادی

الاول ۷۸۶ھ کو حاکم شام کے حکم سے پھانسی دیدی گئی اور لاش کو نذر آتش کر دیا گیا

زین الدین، شیخ فقیہ ابو الحسن حائری متوفیٰ ۸۲۰ھ، فاضل مقداد ابو عبداللہ المقداد نجفی صاحب، کنز العرفان متوفی ۸۲۶ھ جمال المساکین الشیخ الزاہد احمد بن محمد متوفی ۸۲۶ھ، شیخ شمس الدین محمد شامی متوفی ۸۴۱ھ کے اسمائے گرامی کے بعد ایک زندہ جاوید نام ثقتہ الاسلام نورالدین علی بن عالی، المحقق کرکی متوفی ۹۳۷ھ کا ہے

شہید ثانی

شہید ثانی، شیخ جلیل زین الدین علی بن محمد، صاحب شرح لمعہ، ترکی میں ۹۱۱ھ میں پیدا ہوئے۔ عام زندگی میں فضائل اہل بیت بیان کرتے رہے جس سے لوگ متاثر ہوتے۔ اس کی شکایت مکہ سے سلطان سلیمان پاشا تک پہنچی اور سلطان کے حکم سے مکے ہی میں چالیس روز تک قید رکھے گئے پھر قسطنطنیہ بھیج دیئے گئے جہاں ۹۶۶ھ میں شارع عام پر قتل کیے گئے۔ لاش تین روز پڑی رہی پھر سمندر میں پھینک دی گئی۔

محمد احمد بن محمد اردبیلی مدفون نجف اشرف ۹۹۳ھ، عالم جلیل محمد علی بن محمد شارح اصول کافی متوفی ۱۰۰۰ھ، مولانا جمال الدین حسن بن علی، فرزند شہید ثانی متوفی ۱۰۱۱ھ، چند نامور علماء ہیں۔

شہید ثالث

ہندوستان میں شیعہ علماء کب سے پہنچنا شروع ہوئے؟ یہ شیعوں کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے لیکن سب سے پہلے جس نام نے شہرت دوام حاصل کی وہ قاضی نور اللہ شستری کا ہے۔ آپ ۹۵۶ھ میں بمقام شوستر پیدا ہوئے۔ ۹۹۵ھ میں بعہد اکبری وارد ہندوستان ہوئے حکیم ابو الفتح گیلانی کے ذریعے دربار تک پہنچے اور لاہور کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔

جہانگیر کے زمانے میں آگرہ آکر مقیم ہو گئے۔ اسی زمانے میں بعض حاسد علماء نے باہم سازش کر کے آپ کے ایک رسالے الحقائق الحق میں کچھ اضافے کیے جو جہانگیر کے مرشد سلیم چشتی کے لئے ہتک آمیز تھے۔ یہ رسالہ خاموشی سے جہانگیر کے

سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس نے غیظ و غضب میں آکر چالیس علماء سے قتل کے فتاوے لئے۔ قاضی شستری نے اس تحریر سے اپنی لاعلمی ظاہر کی مگر اسے قبول نہیں کیا گیا۔

صابر و شاکر ہو کر جب حضرت نور اللہ شستری دو رکعت نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو آخری سجدے سے سر اٹھاتے ہی جلاد نے علماء کی موجودگی میں آپ کی زبان گدی سے کھینچ لی، پھر پگھلا ہوا سیسہ زبردستی پلا دیا گیا، عالم بے ہوشی میں خار دار درے لگوائے گئے اور آخر میں سر قلم کر دیا گیا۔ ۱۸ جمادی آخر ۱۰۱۹ھ یوم جمعہ کو مذاہب اربعہ کا یہ عالم "شہید ثالث" کے درجے پر فائز ہو گیا۔

قاضی نور اللہ کی بے گناہی زبان زد عام تھی مگر عصبیت اور محلاتی سازشیں اپنا کام کر گئیں۔

کہا جاتا ہے کہ ملکہ نور جہاں نے ان تمام علماء کو ایک دعوت میں یکجا کر کے اور مرغن کھانے کھلانے کے بعد تہہ تیغ کرا دیا تھا مگر یہ چربیائے ہوئے دنبے تہجد گزار سید کے خون کا بدل تو نہ ہو سکتے۔

ایشیا کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ان علماء میں ایک نام محسن فیض کاشانی کا ہے جو ایک جلیل القدر عالم اور فیض کاشانی کے بیٹے تھے، ۱۰۰۷ھ میں بمقام کاشان پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علوم آل محمد حاصل کرنے کے لئے شیراز پہنچے۔ شیخ ماجد، ملا صدرا، شیخ بہائی، محمد طاہر قمی، شیخ محمد مازندرانی، شیخ سلیمان شیرازی سے فیض حاصل کیا، جو ہر قابل دیکھ کر ملا صدرا نے داماد بنا لیا۔ آپ محدث فلسفی، متصوف تھے، ۱۰۹۲ھ میں انتقال فرمایا۔

ایک بیٹے محمد کو یادگار چھوڑا جو علم الہدیٰ کے نام سے مشہور ہیں، تلامذہ کی ایک طولانی فہرست ہے، تصانیف تقریباً دو سو ہوں گی جن میں صافی، اصفی اور کتاب الوافی کو خصوصیت حاصل ہے۔

محمد بن حسین شیخ الاسلام شیخ بہائی متوفی ۱۰۴۱ھ ایک نامور عالم گزرے ہیں جن کا دور محسن فیض سے پہلے کا تھا۔ ان کے بعد کتنے ہی برگزیدہ علماء کے نام آتے ہیں جن میں ایک نام شیخ حر عاملی کا ہے۔ آپ کا پورا نام شیخ حسن بن علی تھا اور

سلسلہ نسب حضرت حر بن یزید الریاحی سے جا کر مل جاتا تھا۔ جبل عامل کا قریہ مشغر خاندانی وطن تھا۔ اسی مقام پر ۸ رجب ۱۰۳۳ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔

خاندان کے علماء سے آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر طوس آئے مگر علمی ماحول نے واپس نہ جانے دیا۔

سادہ مزاج عبادت گزار، حق گو، فقیہہ و محدث، خطیب و ادیب تھے۔ ۲۱ رمضان ۱۱۰۴ھ کو وفات پائی۔ آپ کی بیشتر تصانیف تحقیقی اور وقیع ہیں۔ تفصیل وسائل الشیعہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔

یہی زمانہ علامہ مجلسی کا بھی ہے جن کے دور کو ثقتہ الاسلام کلینی کے عہد کی نشاۃ ثانیہ کہا جاسکتا ہے بلکہ علامہ کلینی نے دین کی جو عمارت کھڑی کی تھی، اس کو استحکام مزید اسی دور میں ملا۔

مقصود علی مجلسی ایک تاجر پیشہ بزرگ تھے جن کا خاندان جبل عامل سے ہجرت کر کے اصفہان میں آباد ہو گیا تھا۔ انہوں نے محمد تقی اور محمد صادق دو بیٹے چھوڑے۔ ان دونوں نے علامہ عبداللہ شستری سے علوم دین حاصل کئے۔

علامہ مجلسی

علامہ محمد تقی مجلسی (۱۰۰۳ھ تا ۱۰۷۰ھ) میں حدیث و فقہ کے متبحر عالم تھے۔ ان کے گھر میں ۱۰۳۷ھ میں محمد باقر مجلسی کی ولادت ہوئی۔ آپ نے عالمانہ ماحول میں آنکھ کھولی۔ دو بڑے بھائی ملا عزیز اللہ متوفی ۱۰۷۴ھ اور ملا عبداللہ بھی تھے اور بہنیں بھی عالمہ اور فاضلہ تھیں لہذا سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے علم و عمل کا سابقہ رہتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے محمد باقر مجلسی طب و منطق فلسفہ و ریاضی، حدیث و فقہ، لغت و ادب، قرآن و تفسیر میں باکمال ہو گئے۔

آپ کو استاد جو ملے وہ بھی یگانہ عہد: حسن علی بن عبداللہ، سید محمد حیدر طباطبائی، میر محمد مومن اور علامہ محسن فیض۔ ماحول نے صلاحیت پر جلا کی تو تصنیف و تالیف میں لگ گئے، حکومت کی طرف سے قدر افزائی نے حوصلوں کو بڑھا دیا اور ایک ہزار سال میں تمام علماء نے جتنا کام کیا تھا، فرد واحد نے اتنا کام تہتر سال کی عمر میں کر دکھایا۔ بحار الانوار آپ کی شہرہ آفاق تصنیف ہے، مراۃ العقول فی

شرح الکافی میں آپ نے مستند اور ضعیف احادیث پر رائے زنی کی ہے۔ ۱۱۱۱ھ میں انتقال فرمایا۔

آپ کے حلقہ درس میں شامل ہونے والے یوں تو سیکڑوں ہیں چند معروف ناموں میں علامہ سید نعمت اللہ جزائری، مرزا عبداللہ آفندی، ملا عبداللہ اردبیلی، ملا محمد فاضل، ملا محمد بن حسن اصفہانی اور ملا محمد حسین بن یحیی نوری ہیں۔

علامہ مجلسی تلامذہ کی طرح کثیر الاولاد بھی تھے۔ چار بیٹوں اور تین بیٹیوں کی نسل مشہور ہوئی۔

مولانا محمد صالح شارح اصول کافی متوفی ۱۰۸۰ھ، مربی الفقہاء و المحدثین حسین بن محمد متوفی ۱۰۹۸ھ علامہ مجلسی سے پہلے کے عالم تھے۔ بعد کے لوگوں میں فاضل ہندی شیخ جلیل محمد بن حسن صاحب کشف اللثام متوفی ۱۱۳۷ھ، علامہ مازندرانی، شارح دعاء الصباح متوفی ۱۱۷۳ھ، محقق بہبہانی متوفی ۱۲۰۸ھ، آیۃ اللہ و صاحب الکرامات سید محمد مہدی متوفی ۱۲۱۲ھ قابل ذکر ہیں۔

اسی سلسلے میں شیخ عبداللہ بن نور اللہ بحرانی بھی آتے ہیں۔ علامہ محمد رضا بن عبداللطیف بھی جنہوں نے الشفافی حدیث آل المصطفیٰ لکھی، شیخ اکبر جعفر بن شیخ خضر نجفی مصنف کشف الغطاء متوفی ۱۲۲۸ھ بھی اور فقیہہ جلیل مرزا قمی ابو القاسم بن محمد مصنف قوانین الاصول متوفی ۱۲۳۱ھ بھی۔

بعض علمائے اکابر

اکابر علماء کے کچھ مزید اسمائے گرامی مرتضیٰ حسین فاضل نے "مطلع انوار" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

میرزا اسمعیل ہمدانی دسویں صدی ہجری، میر باقر داماد متوفی ۱۰۴۱ھ، امیر حسن طالقانی بارھویں صدی ہجری، شیخ ابراہیم گیلانی مرشد خاندان صفویہ، سید ابراہیم بن محمد باقر صاحب ضوابط الاصول متوفیٰ ۱۱۶۴ا، الحاج ابوتراب بارھویں صدی ہجری، ابو طالب ابن تراب بارھویں صدی ہجری، بہاء الدین گیلانی اور باقر بن محمد حائری بارھویں صدی ہجری، میر تقی مشہدی و قاضی جعفر بارھویں صدی ہجری حبیب اللہ مرزا جان متوفی ۹۹۴ھ، حسن عراقی وارد سندھ دسویں صدی ہجری، حسن

بن عبدالرزاق و مہدی بن ابوالقاسم شہرستانی و نورالدہر گیلانی و نصیرالدین
بیضاوی و حاجی نصیر شیرازی گیارھویں و بارھویں صدی ہجری، شیخ مہدی کاتب،
سید مہدی ابن ہدایت اللہ اصفہانی۔

اس سلسلے میں بعض جلی نام اور بھی ہیں:۔

شیخ یونس سید العلماء میر محمد ابراہیم قزوینی محمد اسمعیل شیرازی و محمد امین
شیرازی و محمد تقی مشہدی و محمد حسین مازندرانی و محمد حسین نبیرہ محمد باقر واخوند
مسیحا فسائی و محمد علی قائنی و محمد قاسم بن خیراللہ حسنی و حسینی و شیخ الاسلام محمد مسیح
گیارھویں و بارھویں صدی ہجری، عبداللہ تستری متوفی ۱۰۲۱ھ، میرزا محمد بن ابو
تراب حسینی متوفیٰ ۱۱۰۰ھ، حسینی گلستانہ متوفی ۱۱۰۰ھ، شیخ علی بن محمد تامی و عنایت
اللہ گیلانی و سید قاسم نجفی و قرام الدین محمد قزوینی و کمال الدین فسوی و محمد گیلانی
سراب و شیخ محمد بحرینی و محمد بن صالح قزوینی کاشف الاسرار و حسین خونساری و امیر
زین العابدین انصاری و رضی الدین بن آقا حسین خونساری و شرف الدین علی
دست غیب و عبدالرزاق نجفی و عبدالکریم اردکانی گیارھویں و بارھویں صدی ہجری
فضل اللہ مازندرانی، محمد صادق اردستانی متوفی ۱۱۳۴ھ، شمس الدین بن فاضل
مجتہد، محمد سعید گیلانی، عاملی جبعی، ملا محمد صالح مازندرانی متوفی ۱۰۹۸ھ، شیخ صالح بن
عبدالکریم بحرانی متوفی ۱۰۹۸ھ، سید عباس بن علی مکی مولف نزہتہ المجالس متوفی ۱۱۸۰ھ
میر تقی مشہدی۔

بعض عظیم علماء کے نام نامی کتابوں کی ورق گردانی سے اور دستیاب
ہوئے ہیں جنہوں نے علوم اہل بیت کے چراغ روشن کیے:۔

قطب الدین محمود رازی متوفیٰ ۷۶۹ھ، کمال الدین حسین طبیب متوفی
۹۷۴ھ، محمد بن حسن طوسی قمی، عبداللہ تستری، حسن بن الفضل متوفی ۵۶۸ھ، شیخ
حسین عاملی متوفی ۹۸۴ھ، سید شریف جرجانی متوفی ۸۱۶ھ، سید تقی الدین، افضل
قائنی وغیرہ۔

علاوہ اوحد شیخ احمد جزائری متوفی ۱۱۵۰ھ، آقا جمال الدین خونساری ۱۱۵۵ھ،
شیخ اسمعیل، حاجی محمد طاہر محدث، سید محمد طاہر خاتون آبادی، میرزا محمد طاہر بن

مرتضیٰ طباطبائی وغیرہ کے تسلسل میں دہلی کے شیخ اسلام محمد حسن نبیرہ شہید ثانی
متوفی ۱۱۹۳ھ کا مقدس نام آتا ہے۔

علمائے عظام کے اس بے ترتیب سلسلے کو چھوڑ کر اگر ماضی کے افق پر ہر
شہر کو دیکھا جائے تو شیعوں کے بسنے اور اجڑنے کے ساتھ ساتھ علماء کا عروج و زوال
بھی نظر آئے گا اور وقت کی مساعدت اور نامساعدت سے ان کے مجاہدانہ کارناموں
کا احاطہ بھی ہو سکے گا لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ صفحات تاریخ پر نظر ڈالی
جائے تو واقعات کے اتار چڑھاؤ میں چمکتی ہوئی تلواروں اور سیاسی تدبر کے سوا کچھ
دکھائی نہیں دیتا۔ پھر علماء کا کام تو جنگ و جدل سے بچ کر تمدن پر اپنے گہرے
نقوش قدم بنانا ہی ہوتا ہے اس لئے ہم صرف ان کی موجودگی اور نقل و حرکت کا
اندازہ ہی کر سکتے ہیں۔

اس زاویہ نگاہ سے مکہ، مدینہ یا پورے حجاز کو دیکھا جائے تو خود اولاد رسول
ہی ترک وطن کرنے پر مجبور ہو گئی تھی، شیعوں کی سرپرستی کون کرتا لہذا شیعہ
شہروں کے بجائے قبائل ہی میں پائے جاتے رہے اور بہت کم لوگوں کو ظالم
حکومتوں نے مکہ یا مدینہ میں بسنے دیا البتہ یمن میں شیعہ آبادیاں پہلے بھی پائی جاتی
تھیں اور آج بھی موجود ہیں اور شیعہ علماء بھی۔

عراق میں کوفہ شیعوں کا سب سے بڑا شہر تھا مگر وہ کئی بار شیعوں سے خالی
کرایا گیا پھر آباد ہوا، بحالت موجودہ کوفہ اور مضافات کوفہ میں ہر طرف شیعہ ہی
شیعہ ہیں اور اسی تناسب سے علماء دینی رہنمائی کے لئے سکونت پذیر ہیں۔

بغداد وہ مقام ہے جس کے گلی کوچوں میں سادات کا خون بہایا گیا، شاہی
محلات کی دیواروں میں اولاد رسول چنی گئی، قید خانوں میں ان کی لاشوں کے انبار
لگائے گئے پھر بھی وہاں بہت سے دینی مدرسے ہیں جن میں مدرسہ مرجانیہ کو ایک
امتیاز حاصل ہے۔ علماء بھی ایک بڑی تعداد میں اقامت پذیر ہیں جن کا تعلق کاظمین
کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف سے ہے۔

حلہ شیعان علی کی ایک منفرد آبادی ہے جس کو سیف الدولہ صدقہ بن
منصور مزیدی نے آباد کیا تھا۔ اس مردم خیز شہر نے بڑے بڑے عالموں کو پیدا کیا

جن کے نام مذہب اہل بیت کی سطوت کا نشان ہیں ۔ ابن ادریس ، علمائے آل طاؤس ، آل سعید ، مجد الدین محمد بن طاؤس ، شیخینی ابن عرندس ، ابن القیم ، سید مہدی ، سید حیدر وغیرہ وغیرہ ۔

کربلا کا نام ہی بقائے دین کی ضمانت ہے ۔ شیخ یوسف البحرانی صاحب حدائق ، محمد باقر بہبہانی شارح المفاتیح ، خاندان مرزا محمد ، میر علی طباطبائی صاحب ریاض سید محمد مجاہد ، علامہ کبیر ، بحرالعلوم طباطبائی وغیرہ وغیرہ جن کی گنتی دشوار ہے

نجف اشرف کا عظیم نام دیدہ دل کو روشن کر دیتا ہے ۔ شیخ الطائفہ کے سجادہ علوم کی وسعت یہاں سے ہند ، ایران ، افغانستان اور افریقہ تک پھیل چکی ہے ۔ علماء کے اسمائے گرامی کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔

اس کے ذیل میں ایک اہم ترین نام کاظمین کا ہے ۔ شیخ اسد اللہ التستری صاحب مقائیس ، سید محسن الاعرجی صاحب محصول ، شیخ محمد حسن آل یاسین ، شدید الورع ابراہیم بن محمد ، شیخ جابر ، عبدالحسین کاظمی ۔

سامرا سلسلہ امامت کا آخری مرکز ہے ۔ جہاں سید مرزا حسن شیرازی نے علوم کے چراغ روشن کئے جو آج تک اپنی روشنی پھیلا رہے ہیں ۔

بصرہ اہل تشیع کا قدیم مستقر رہا ہے لیکن تاریخ نے ہمیشہ اس کو کوفہ کی سطح پر پایا ہے اور اسی مناسبت سے ہر دور میں شیعہ اور علماء دونوں پائے گئے ۔

شام اور شیعہ بظاہر دو متضاد لفظ ہیں لیکن حضرت ابوذر غفاری نے وہاں اہل بیت کے لئے زمین ہموار کی تھی پھر اسیران کربلا نے اپنی مظلومیت کے جھنڈے گاڑ دیئے ، صداقت اندر ہی اندر رنگ دکھاتی رہی اور دمشق سے نکل کر حلب وبعلبک اور دوسرے مقامات پر اثر انداز ہوتی رہی ۔ حلب میں بنی زہرہ اور آل حمدان سے سیکڑوں علماء گزرے ہیں جنہوں نے شیعیت کی اشاعت کے لئے عمریں وقف کر دیں اور مخالفین سے بڑے بڑے مناظر کئے ۔

جبل عامل حضرت ابوذر غفاری اور علماء کی سرزمین ہے جس کی عظمت کے لئے شہید اول اور شہید ثانی کے نام کافی ہیں ۔ شیخ حسن بن شہید ثانی اور بہت سے

اکابر علماء یہاں کی خاک سے پیدا ہوئے ۔ شیخ ابراہیم یحییٰ ، شیخ علی خاتونی ، سید ابوالحسن بن سید حیدر ، شیخ حسن سلیمان ، شیخ محمد حر ، الاسعد علی بک وغیرہ کے نام علمی سربلندی کی ضمانت ہیں ۔

بعلبک بھی اسی طرح کا مردم خیز خطہ ہے ۔ وہاں کے امراء بھی اہل علم ہوئے ہیں جن میں ایک جلی نام امیر موسیٰ حرفوشی کا ہے ۔ امیر محمد اور ابن معصوم وغیرہ بھی اسی سلسلے کے عالم ہیں ...... شیعیت کے پھیلتے ہوئے دامن میں بحرین کے علماء کے اسمائے گرامی زندہ رہیں گے ۔

مراقش و مصر میں شیعہ علماء نے جو کارنامے انجام دیئے وہ عراق و عجم کے علماء سے کم نہیں ہیں ۔

نام گنوانے ہی پر اکتفا کی جائے تو بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں جید علماء کی گنتی ہزاروں سے تجاوز کر جاتی ہے جو عراق و ایران اور ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے ۔

ان میں سے برصغیر کے ممتاز علماء و فقہاء کی ایک فہرست مرتضیٰ حسین فاضل نے "مطلع انوار" میں شامل کی ہے ، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان و قلم کے ان مجاہدوں نے بڑے شہروں سے نکل کر دوسرے مقامات پر بھی اہل بیت کو متعارف کرایا اور تاریکی میں پڑے ہوئے نام نہاد مسلمانوں کو روشنی دکھائی :۔

ملا علی کھمبات متوفی ۹۵۰ھ ، ملا شاہ محمد طاہر احمد نگر متوفی ۹۵۲ھ ، ملا فتح اللہ شیرازی گجرات متوفی ۹۹۷ھ ، ملا احمد ٹھٹھوی بن نصر اللہ فاروقی صاحب تاریخ الفی وغیرہ لاہور مدفون بمقام مکلی سندھ ۹۹۶ھ ، حکیم ابوالفتح گیلانی صاحب ، شرح اخلاق ناصری وغیرہ حسن ابدال متوفی ۹۹۷ھ ، ابوالفضل و فیضی پیشوائے اعظم محمد مومن حیدرآباد دکن متوفی ۱۰۲۱ھ ملا سید شریف بن شہید ثالث آگرہ متوفی ۱۰۲۰ھ ، ملا سید علاء الدولہ بن شہید ثالث آگرہ متوفی ۱۰۵۰ھ ، ملا محمد سید شریف بن شہید ثالث آگرہ متوفی ۱۰۵۰ھ ، ملا محمد شفیع یزدی گوالیار متوفی ۱۰۸۱ھ ، ملا نظام الدین محمد مدنی حیدرآباد متوفی ۱۰۸۶ھ ، ملا شمس الدین محمد بن علی حیدرآباد ، ملا شیخ جعفر بن کمال الدین بحرینی حیدرآباد متوفی ۱۰۸۸ھ ، ملا شیخ احمد بن صالح بحرینی حیدرآباد جنہیں

اورنگ زیب نے جلاوطن کیا، متوفی بمقام شیراز ۱۱۲۴ھ، ملا سید علی خان حیدرآباد و لاہور متوفی بمقام شیراز ۱۱۸۰ھ، ملا محمد سعید مازندرانی دہلی لاہور مونگیر متوفی ۱۱۱۶ھ، ملا محمد رفیع مشہدی دہلی متوفی ۱۱۲۳ھ، ملا اسد اللہ بن ملک برخوردار مکلی سندھ متوفی ۱۱۴۲ھ، شیخ محمد علی حزین بنارس متوفی ۱۱۸۰ھ، ملا محمد عسکری جونپور ۱۱۹۰ھ، سید قمرالدین اورنگ آباد متوفی ۱۱۹۵ھ، ملا محمد علی بادشاہ فیض آباد متوفی ۱۱۹۵ھ کے اسمائے گرامی لوح تاریخ پر ثبت ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگیاں صرف اسی مقصد کے لئے وقف کر دی تھیں کہ نامساعد حالات میں بھی اعلائے کلمۃ الحق کرتے رہیں۔

احمد بن حسین خوانی صاحب شرائع الاسلام اورنگ آباد متوفی ۱۰۹۵ھ، احمد الشیخ مہذب الدین صاحب الرسالہ الاعتقادیہ بصرہ اور حیدرآباد متوفی ۱۰۸۵ھ، احمد بن محمد شیخ مکی نبیرہ شہید اول دکن اور مکہ معظمہ متوفی ۱۱۱۰ھ، سید ابوالمعالی بن شہید ثالث بنگال متوفی ۱۰۴۶ھ، ملا ابراہیم لاہور متوفی ۱۰۶۰ھ، نواب ابراہیم خان صاحب بیاض ابراہیمی گوجرنوالہ متوفی ۱۱۲۱ھ، ابوالحسن تاناشاہ حواشی تفسیر کشاف دولت آباد متوفی ۱۱۱۱ھ وغیرہ کے نام تبلیغ شیعیت کے لئے یادگار ہیں جن میں ایک نام امین الدین خاں حسین صاحب رشحات الفنون مکلی سندھ متوفی ۱۱۲۷ھ بھی شامل ہے۔

ان اسمائے گرامی میں مندرجہ ذیل نام شامل کیے جائیں تب بھی فہرست مکمل نہ ہوگی۔

احمد ربیعی شیخ احسائی گجرات و دکن متوفی ۱۱۳۷ھ، احمد الجزائری صاحب شرح ارشاد، حیدرآباد متوفی ۱۱۰۴ھ ملا احمد الاعراج صاحب حل غائیۃ البیان متوفی ۱۳۰۱ھ، سید باقر حسین مترجم مقتل ابی مخنف جونپور متوفی ۱۳۲۰ھ، اولاد حسین امروہوی صاحب نیرنگ زمانہ متوفی ۱۳۳۸ھ، اولاد حیدر فوق بلگرامی صاحب اسوۃ الرسول متوفی ۱۳۳۸ھ۔

تیرھویں صدی کے مبلغین اسلام کے نام مختلف مقامات پر آتے رہے ہیں چند نام ان مقدس بزرگوں کے اور درج کئے جاتے ہیں:۔

احمد بہبہانی حاشیہ صمدیہ بنام محمودیہ وغیرہ اودھ اور حیدرآباد متوفی ۱۲۳۵ھ

شیخ احمد یمنی صاحب نفحۃ الیمن بھوپال بمبئی بنارس پونا متوفی ۱۲۵۶ھ، احمد حسین زنگی پوری حاشیہ شمس بازغہ متوفی ۱۲۷۲ھ، راجہ امداد علی خان صاحب منہج السداد کنتور متوفی ۱۲۹۲ھ، سید امداد علی صاحب بحرالمصائب کیرانہ ضلع مظفر نگر متوفی ۱۲۹۰ھ، مرزا ابو طالب اصفہانی و لکھنوی کلکتہ متوفی ۱۲۲۰ھ، ابو علی امروہوی صاحب ہادی المخالفین باندہ متوفی ۱۲۷۲ھ، مرزا باقر علی دہلوی صاحب فضائل مرتضوی میرٹھ متوفی ۱۲۹۰ھ، ملا محمد جواد ۱۲۷۴ھ، مولانا حشمت علی خیراللہ پور متوفی ۱۲۵۴ھ اعجاز حسین کنتوری لکھنؤ متوفی ۱۲۸۶ھ، ابولقاسم تستری حیدرآباد متوفی ۱۲۲۳ھ، اولاد حسین شکوہ آبادی صاحب انوار الربوبیہ لکھنؤ متوفی ۱۲۶۲ھ، سید احمد علی صاحب تحفۃ المعجزات محمد آباد ضلع اعظم گڑھ متوفی ۱۲۹۵ھ۔

برصغیر میں چودھویں صدی ہجری میں بعض صاحبان تصانیف ہیں، ان کے مقدس نام کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔

شیخ امداد علی صاحب متاع الآخرہ لکھنؤ متوفی ۱۳۱۴ھ، شیخ احمد دیو بندی صاحب اسرار الہدی دیو بند متوفی ۱۳۱۵ھ، شیخ احمد علی برستی صاحب اختلاف البخاری برست ضلع کرنال متوفی ۱۳۱۶ھ، ارشاد حسین جونپوری حاشیہ بر تحفہ جوادیہ لکھنؤ متوفی ۱۳۳۱ھ، سید آغا خلف زین العابدین مولف الحقیقۃ الخلافہ الہ آباد متوفی ۱۳۲۱ھ، آفتاب حسین دہلوی استاد مولانا مقبول احمد لاہور متوفی ۱۳۲۱ھ، حاجی آل محمد امروہہ متوفی ۱۳۲۵ھ، ابوالحسن (ابو صاحب) مصنف بحث نبوت متوفی کربلائے معلی ۱۳۱۳ھ، ابوالقاسم حائری مفسر قرآن مجید لاہور متوفی ۱۳۲۴ھ، باقر مہدی لکھنوی صاحب مجموعہ خطوط عربیہ متوفی ۱۳۳۸ھ، احمد علی وفاخانی تفسیر قرآن مجید انگریزی مدراس متوفی ۱۹۷۰ء، شیخ بادشاہ حسین تفسیر قرآن مجید انگریزی بسواں ضلع سیتاپور متوفی ۱۳۵۶ھ، علامہ سید علی حائری لاہور متوفی ۱۳۶۳ھ، ابوالحسن (میرن صاحب) مخزن طہارت حیدرآباد متوفی ۱۳۴۰ھ، ابوالحسن کشمیری صاحب اسعاف المامول لکھنؤ متوفی ۱۳۴۲ھ، ابوالحسن (منن صاحب) مولف التجزی فی الاجتہاد لکھنؤ متوفی ۱۳۵۵ھ، ابوالحسن بن سید مقبول حسین گوپال پور بہار ۱۳۹۴ھ، ابن حسن جائسی مولف الرائے السدید فی مسائل الاجتہاد لکھنؤ متوفی ۱۳۶۴ھ، سید احمد کبیر

مبلغ عزا لاہور ۱۳۶۰ھ، احمد حسین خان نوشیعہ مولف تاریخ احمدی پریانواں رائے بریلی متوفی ۱۳۶۸ھ، امجد حسین صاحب نجف جریدۃ المعارف آلہ آباد متوفی ۱۳۵۰ھ، امداد امام اثر صاحب مصباح الظلم پٹنہ متوفی ۱۳۵۳ھ، امداد حسین کاظمی مترجم قرآن مجید گجرات پنجاب متوفی ۱۳۹۵ھ، مرزا احمد علی دستور العمل اسلام لاہور متوفی ۱۳۹۰ھ، ابرار حسین پاروی خطیب متوفی حیدرآباد ۱۳۷۵ھ، علامہ ابن حسن جارچوی مصنف فلسفہ آل محمد کراچی ۱۳۹۳ھ، مرزا مہدی آغا پویا متولدیز د مترجم قرآن مجید انگریزی متوفی کراچی ۱۳۹۳ھ، اظہر حسین زیدی مولف خطیب آل محمد، مولانا سعادت حسین خان تاریخ مصائب الشیعہ متوفی لکھنؤ۔

اولاد رسولؐ کے یہ ترجمان اگرچہ ایک مخصوص خطہ ارض سے تعلق نہیں رکھتے لیکن حقیقتاً اس سلسلے کی ایک کڑی تھے، علمائے سلف نے جس کو مدینہ، نجف، کربلا، کاظمین اور قم سے مربوط کر دیا تھا، لہذا کسی کو کسی جگہ تک محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جس کو جہاں موقع ملا، اس نے وہاں خیبر شکن کا نعرہ اور عباس کا علم بلند کر دیا۔ حضرت حجت کے بعد سے آج تک ان گنت عارفان حقیقت گزر چکے ہیں۔ ان میں سے ایک تعداد وہ بھی ہے جس کو کوئی نہیں جانتا۔ جن کے نام سینہ بسینہ روایتوں سے یا معتقدین کی قلم کاری کے طفیل ہم تک پہنچے ہیں، ان میں نعمت اللہ جزائری متوفیٰ ۱۱۱۲ھ میر محمد صالح خاتون آبادی، محمد بن علی یوسف بحرانی، سید ہاشم بن سلیمان متوفیٰ ۱۱۰۷ھ، بھی شامل ہیں اور ان کے بعد وہ نام ہیں جن کی عظمتوں کے سامنے آج بھی ہماری گردنیں خم ہو جاتی ہیں۔

علامہ طبرسی اور دیگر علماء

حسین بن محمد تقی طبرسی ۸ شوال ۱۲۵۴ھ کو نور، طبرستان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے کسمپرسی کے عالم میں علامہ محمد علی محلاتی کے سامنے زانوائے تلمذ تہہ کیا۔ ۱۲۷۸ھ میں عراق کے ساکن ہو گئے، کربلا میں شیخ العراقین عبدالحسین طہرانی سے، نجف میں شیخ مرتضیٰ انصاری سے فیض حاصل کیا، ۲۰ جمادی الآخر ۱۳۲۰ھ کو نجف میں انتقال فرمایا۔

مستدرک الوسائل، مستدرک بحار، النجم الثاقب اور میزان آپ کی معرکۃ الآرا تصانیف ہیں۔ مجلسی ثانی کہے جاتے ہیں۔

سید عبداللہ شبر ۱۱۸۸ھ میں بمقام نجف پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے پدر محترم سید محمد رضا عابدی سے حاصل کی پھر سید محسن اعرجی اور شیخ کبیر سے استفادہ کیا ۱۲۴۲ھ میں کاظمین میں وفات پائی۔

جامع المعارف آپ کی شہرہ آفاق تصنیف ہے جو دو سو اکہتر احادیث کی شرح پر مشتمل ہے۔

شیخ عباس قمی متوفی ۱۳ ذی الحج ۱۳۵۹ھ، سفینۃ البحار کے مصنف ہیں۔ آپ نے چھوٹی بڑی ڈیڑھ سو کتابیں تحریر فرمائیں جن سے علوم اہل بیت کی صراحت و وضاحت ہوتی ہے۔

شیخ ابو علی حائری صاحب منتہی المقال، شیخ الحدیث آقا عبداللہ مامقانی، آیۃ اللہ سید حسن الصدر، ہمارے سجادہ علم کے روشن چراغ ہیں۔

غفران مآب

حضرت غفران مآب سید دلدار علی صاحب عماد الاسلام متوفی لکھنؤ ۱۲۳۵ھ، سید مہدی خلف غفران مآب متوفی ۱۲۳۰ھ احمد بن مولانا مہدی متوفی ۱۲۴۴ھ، سید المفسرین سید علی خلف غفران مآب صاحب تفسیر توضیح المجید اردو متوفی ۱۲۵۹ھ، مفتی سید محمد قلی کنتوری صاحب تشئید المطاعن و تقلیب المکائد متوفی ۱۲۶۰ھ، فقیہ کبیر شیخ محمد حسن نجفی مصنف جواہر الکلام، سید العلماء سید حسین خلف غفران مآب متوفی ۱۲۷۳ھ، عمدۃ العلماء سید محمد ہادی بن سید مہدی متوفی ۱۲۷۵ھ، سید مرتضی بن سلطان العلماء متوفی ۱۲۷۷ھ، الرئیس العظیم مرتضی بن امین مصنف الرسائل و المکاتب متوفی ۱۲۸۱ھ، ملک العلماء بندہ حسن بن سلطان العلماء مترجم قرآن مطابق تفسیر آئمہ، ان سب نے سرزمین اودھ کو فضائل آل محمد سے آشنا کیا اور علوم اہل بیت کی وہ شمعیں جلائیں جن کی روشنی میں علماء کا کارواں ہدایت آگے بڑھتا رہا اور بھولے بھٹکے مسافروں کو کربلا و نجف کا راستہ دکھاتا رہا۔

علمائے مابعد

ان کے علاوہ تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری میں علمائے حق کی ایک بڑی تعداد مسلک اہل بیت کی اشاعت میں ہمہ تن مصروف نظرآتی ہے جن میں سے بعض کے نام ملاحظہ کیلئے پیش ہیں:۔

شیخ ابراہیم رشتی ، ابوتراب قزوینی ، اسمعیل خاتون آبادی ، امین الدین اودے گیر، بہاء الدین بن محسن عاملی ، جعفر الاعسم ، شیخ جعفر شستری ، حسن آل یسین ، سید حسن بجنوردی ، سید حسن شہرستانی ، مرزا حسین خلیل ، سید حیدر ، شیخ خلیل اللہ طالقانی ، ملا رضا شیخ رضا المقفر، ملاشاہ محمد اصطہباناتی ، عبد علی بن حسین ، عبدالکریم اردکانی ، مرزا عبداللہ شیرازی ، عبدالوہاب مازندرانی ، سید عبدالمہادی ، علاء الدین محمد گلستانہ ، شیخ علی چوقانی ، شیخ علی گناآبادی ، شیخ علی آل کاشف الغطاء ، علی بن مرزا خلیل طہرانی ، شیخ علی رضا قزوینی ، لطف اللہ خوئی ، لطف اللہ شیرازی ، لطف اللہ مارندرانی ، سید محمد ترک ، سید محمد فیروزآبادی ، محمد بن رضی ، محمد اسمعیل یزدی ، محمد حسین مازندرانی ، محمد حسین بن علی ہمدانی ، محمد حسین بن ہاشم کاظمی ، محمد شریف کربلائی ، محمد علی طہرانی ، محمد مہدی نجفی ، سید محمود جبوتی ، مرزا محمد ہاشم نجف ، محمد یوسف استرآبادی ، نوح بن قاسم جعفری ، مرزا نصیراللہ مشہد ، ملا محمد اکبر ترشیزی ، محمد باقر صوفی ، محمد باقر طباطبائی ، محمد تقی بن محمد باقر ، شیخ محمد جعفر نجفی ، سلطان العلماء سید محمد رضوان مآب خلق غفراں مآب متوفی ۱۲۸۴ھ ، ممتاز العلماء سید محمد تقی بن سید حسین متوفی ۱۲۸۹ھ

جن علماء کے سنین وفات معلوم ہوسکے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

آغا بزرگ محسن طہرانی متوفی ۱۳۸۹ھ ، ابراہیم کلباشی متوفی ۱۲۶۲ھ ، ابوتراب خولنساری متوفی ۱۳۴۶ھ ، ابوالقاسم طباطبائی متوفی ۱۳۰۸ھ ، شیخ احمد احسائی متوفی ۱۲۲۳ھ ، سید احمد نجفی متوفی ۱۳۵۶ھ ، اسداللہ بن سید محمد باقر اصفہانی متوفی ۱۲۹۰ھ ، سید اسمعیل صدر متوفی ۱۳۳۸ھ ، جمال الدین گلپائگانی متوفی ۱۳۷۷ھ ، سید جواد تبریزی متوفی ۱۳۸۷ھ ، حسن بن جعفر متوفی ۱۲۶۲ھ ، سید حسین حمامی نجف متوفی

۱۳۷۹ھ ، مرزا حسین نجف ۱۳۲۶ھ ، مرزا حیرت متوفی ۱۳۱۷ھ ، مرزا خلیل متوفی ۱۳۲۶ھ ملا وربندی متوفی ۱۲۸۵ھ ، شیخ زین العابدین مازندرانی متوفی ۱۳۰۹ھ ، ملا محمد تقی برغانی متوفی ۱۲۶۳ھ ، ابونصر رضی الدین طبرسی ، شیخ عباس آل کاشف الغطا متوفی ۱۳۲۳ھ ، شیخ عباس قمی متوفی ۱۳۵۹ھ ، عبدالباقی بن ملا صالح مازندرانی ، عبدالحسین شرف الدین متوفی ۱۳۷۷ھ ، عبدالحسین رشتی متوفی ۱۳۷۳ھ۔

علمائے کرام کے چند مزید نام جن کے سنین وفات تحریر ہیں:۔

عبدالکریم زنجانی متوفی ۱۳۸۸ھ ، سید علی آل بحرالعلوم متوفی ۱۲۹۸ھ ، سید علی صاحب ریاض المسائل متوفی ۱۲۳۱ھ ، مرزا علی ابن المجدد حسن الشیرازی متوفی ۱۳۵۵ھ ، محمد باقر موسوی متوفی ۱۳۳۰ھ ، محمد باقر اصفہانی ۱۲۹۰ھ ، مرزا محمد تقی شیرازی متوفی ۱۳۳۸ھ ، شیخ محمد جواد بلاغی متوفی ۱۳۵۲ھ ، شیخ محمد جواد لبنان متوفی ۱۴۰۰ھ ، محمد حسین مازندرانی متوفی ۱۳۰۷ھ ، محمد حسین شہرستانی متوفی ۱۳۱۱ھ ، محمد حسین بن محمد خلیل شیرازی متوفی ۱۳۳۹ھ ، شیخ محمد رضا آل یسین متوفی ۱۳۷۱ھ ، محمد صادق بحرالعلوم متوفی ۱۳۹۹ھ ، شیخ محمد طہ نجف متوفی ۱۳۲۳ھ ، محمد علی سکاکی ، محمد علی شہرستانی متوفی ۱۲۷۹ھ ، شیخ موسیٰ بن جعفر متوفی ۱۲۴۱ھ ، آقائے نائنی محمد حسین مرزا متوفی ۱۳۵۵ھ۔

علی نقی بن حسن طباطبائی متوفی ۱۲۸۹ھ ، شیخ الشریعت فتح اللہ اصفہانی متوفی ۱۳۳۹ھ ، سید کاظم رشتی متوفی ۱۲۵۹ھ ، محسن الامین العاملی متوفی ۱۳۷۱ھ ، محسن بن خضر متوفی ۱۲۷۰ھ ، محسن بن عیسیٰ النجفی ، شیخ محمد حسن جواہر الکلام متوفی ۱۲۶۶ھ ، محسن حسین یزدی متوفی ۱۳۰۵ ، محمد حسین بن عبدالرحیم حائری متوفی ۱۳۶۲ھ ، شیخ مرتضیٰ انصاری متوفی ۱۲۸۱ھ ، سید مصطفیٰ کاشانی ، شیخ آل کاشف الغطاء ، سید مہدی شہرستانی متوفی ۱۲۱۶ھ ،

علامہ کبیر سید محمد قزوینی متوفی ۱۳۰۶ھ ، محمد بن محمد باقر نجفی متوفی ۱۳۰۶ھ ، شیخ الفقیہہ محمد حسن بن المولیٰ عبداللہ مامقانی متوفی ۱۲۲۳ھ ، الزاہد الورع المجدد میرزا محمد حسن شیرازی متوفی ۱۳۱۲ھ ، آیتہ اللہ الشیخ میرزا حسین میرزا خلیل متوفی ۱۳۲۲ھ ، استاذ العلماء شیخ خراسانی محمد کاظم متوفی ۱۳۲۹ھ۔

یہ تمام اکابر ملت اسی عہد میں عراق وایران میں تحفظ شیعیت کرتے رہے۔
ان علماء کا ہندوستان سے ایک مضبوط رابطہ تھا۔لکھنؤ کے بیشتر علماء نجف و کربلا سے علوم کے خزانے لے کر آتے اور ہمالہ سے راس کماری تک پھیلے ہوئے مسلمانوں میں لٹاتے رہتے۔

علمائے لکھنؤ

ان میں فردوس مآب سید حامد حسین متوفی ۱۳۰۶ھ۔۔۔ صاحب عبقات الانوار بھی ہیں۔آپ کی عظیم تالیف رجال، حدیث ودرایت کا شاہکار ہے۔

اسی دور کا ایک روشن نام سید محمد عباس کا بھی ہے جو بہت سے نامور شاگرد چھوڑ کر ۱۳۰۶ھ میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔

شمس العلماء سید محمد ابراہیم بن سید محمد تقی متوفی ۱۳۰۷ھ، زبدۃ العلماء سید علی نقی بن سید حسین متوفی ۱۳۰۹ھ، سید ابو صاحب متوفی ۱۳۱۳، ملاذ العلماء سید ابوالحسن عرف بچھن خلف اکبر سید بندہ حسن متوفی ۱۳۰۸ھ، تاج العلماء سید علی محمد بن سلطان الخطاء متوفی ۱۳۱۲، عماد العلماء سید مصطفیٰ میر آغا بن عمدۃ العلماء متوفی ۱۳۲۳، سید محمد حسین خلف اکبر سید بندہ حسن متوفی ۱۳۲۵، سید ابوالقاسم قمی فقیہہ و مفسر متوفی ۱۳۲۴ھ، سید محمد تقی بن سید محمد ابراہیم متوفی ۱۳۴۰ھ۔

افقہ الفقہاء سید محمد باقر متوفی ۱۳۴۶ھ، قدوۃ العلماء سید آقا حسن متوفی ۱۳۴۸ھ بھی اسی بساط پر تبلیغی سرگرمیوں کے فعال عالم ہیں جن کا سلسلہ عہد حاضر تک پہنچ جاتا ہے۔

یوسف الملتہ سید یوسف حسین نجفی امروہوی متوفی ۱۳۵۵ھ، سید محمد ہادی متوفی ۱۳۵۷ھ، ظہور الملتہ سید ظہور الحسن متوفی ۱۳۵۹ھ، نجم الملتہ سید نجم الحسن متوفی ۱۳۶۰ھ، سید سبط نبی نوگانواں سادات متوفی ۱۳۵۸ھ، مفتی محمد علی متوفی ۱۳۶۱ھ، افقہ زمان سید سبط حسین جونپور متوفی ۱۳۷۲ھ، عمدۃ العلماء سید کلب حسین متوفی ۱۳۸۳ھ۔سید حسین بن سید محمد ہادی متوفی ۱۳۸۵ھ، مفتی احمد علی متوفی ۱۳۸۹ھ، مولانا سید علی واعظ مولانا سلطان علی واعظ مولانا اکبر مہدی سلیم جرولی، مولانا آغا مہدی، مفتی نصیر الاجتہادی، مولانا مصطفیٰ جوہر، علامہ رشید ترابی کراچی، سعید الملت محمد سعید لکھنوی، بشیر انصاری، نجم الحسن کراروی، حافظ

کفایت حسین، کتنے ہی عالم ہیں جنہوں نے زندگیاں مقصد حسینی کے لئے وقف کر دیں اور بے شمار اہل علم ہیں جو ان سب کے نقوش قدم پر چل رہے ہیں۔

ناصر الملتہ سید ناصر حسین، علامہ سید علی نقی اور ڈاکٹر مجتبیٰ حسین اس دور کے وہ عالم تھے جنہوں نے بڑے گہرے نقوش قدم چھوڑے ہیں۔

نجف، کربلا، کاظمین، قم اور دوسرے مقدس مقامات پر تبلیغ و تدریس اپنے اپنے انداز پر جاری ہے۔ہمارے علماء ہمہ تن علوم آل محمد کی اشاعت میں مستغرق ہیں۔جو شخصیتیں مقاصد حیات پورے کرکے جا چکی ہیں ان کے نام ماضی قریب کے افق پر درخشاں ہیں جن میں آیتہ اللہ شیخ جواد بلاغی، شیخ الشریعت علامہ اصفہانی متوفی ۱۳۳۹ھ، شیخ عبداللہ بن شیخ محمد حسن مامقانی متوفی ۱۳۹۱ھ، آیتہ اللہ عباللہ بن شیخ محمد حسن مامقانی متوفی ۱۳۵۱ھ علامہ مرزا حسین نائنی متوفی ۱۳۵۵ھ، مجتہد اعظم سید حسین بروجردی متوفی ۱۳۸۰ھ، مجتہد اکبر سید ابوالحسن اصفہانی متوفی ۱۳۶۵ھ، شیخ ضیاء الدین عراقی مجدد اصول فقہ متوفی ۱۳۶۶ھ اپنے اپنے عہد کے روشن مینار تھے اور فی زمانہ آقائے شریعت مدار اور اقائے ابوالقاسم خوئی علوم اہل بیت کا علامیہ ہیں۔

آیتہ اللہ آقائے محسن الحکیم طباطبائی متوفی ۱۳۹۱ھ آقائے باقر الصدر شہید اور آیتہ اللہ روح اللہ خمینی بانی انقلاب ایران اس سلسلے کی آخری کڑیاں ہیں جن کی بعد رشد وہدایت کی بساط پر نامور علماء کے نئے چہرے ابھرتے جا رہے ہیں۔

ان علماء نے کن کن حالات میں جہاد باللسان اور مجاہدہ بالقلم کیا، ان کی تفاصیل ایک مکمل موضوع ہے لیکن ایک حقیقت مسلم ہے کہ ان میں سے اکثریت عالم با عمل تھی۔ان کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اہل بیت کے حلقہ بگوش ایسے ہیں تو خود اہلبیت کرام کیا ہوں گے!

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیہ اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں شان اسد الہیٰ

یقیناً وہ ایک بوریہ نشین کے نائب تھے لیکن تاج وتخت ان کی نگاہوں میں ہیچ فرمانروائی بے قیمت تھی وہ اپنے مقتدیان دین کی تابی میں لوگوں کو بزور شمشیر

سرنگوں کرنے کے بجائے ذہنی انقلاب سے دلوں کو مسخر کرتے اور حقیقت کی روشنی دکھا کر آنکھوں پر پڑے ہوئے باطل کے پردے ہٹا دیتے تھے۔

شیعہ زمان و مکان کے فصل سے اکثر و بیشتر ایمان کی آزمائشوں میں مبتلا رہے لیکن ہمارے علماء نے ان ادوار ابتلاء میں بھی ہانی بن عروہ، حجر بن عدی اور میثم تمار کو یاد رکھا اور ان کی زبانوں نے اعلائے کلمۃ الحق میں لکنت نہیں کی۔ نتیجے میں جو ان سے ملتا وہ اپنے مقام پر جا کر سوچتا: کتنے غلط رنگ میں دکھائی گئی تھی اسلام کی تصویر ہمیں، حقیقت کیا ہے اور بتایا کیا گیا تھا۔ انجام کار خود بخود ایک تطہیر قلب کا عمل واقع ہو جاتا اور حر ابن یزید الریاحی کی طرح کوئی نہ کوئی لشکر شام سے نکل کر فوج حسینی میں شامل ہو جاتا۔

یہی سب کچھ دیکھ کر عوام کو منع کیا گیا کہ خبردار مجلسوں میں نہ جانا۔ اس سے بغض صحابہ پیدا ہوتا ہے۔

یہ ممانعت فہم سے بالاتر ہے اور ان کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو نام نہاد اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ مجلسوں میں جانے سے شاید یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ وہاں حقائق ایمان بیان کئے جاتے ہیں مبینہ کرداروں پر چڑھا ہوا ملمع اتر جاتا ہے اور اصل تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔

کیا ستم ظریفی ہے کہ اسلام انسانوں کو انسان بنانے کے لئے آیا تھا اور یہاں اسلام کو انسانوں سے چھپایا جاتا ہے، پیغام جن کے نام تھا انہیں کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے..... اس کے برعکس صحیح اسلام کے پیرو ہر ایک کی بات سننے کے لئے آزاد ہیں۔ ان پر ایسی کوئی پابندی عاید نہیں کی جاتی کہ کسی مکتبہ فکر کے عالم کی تقریر نہ سنیں بلکہ روکنے کے بجائے ترغیب دی جاتی ہے کہ سنیں ضرور تاکہ ان کو جھوٹ سچ کا اندازہ ہو سکے۔

بات صرف مجالس کی نہیں ہے بلکہ قصیدہ خوانی کی محفلوں اور ماتم کے اجتماعات سے بچنے کی تاکید بھی کی جاتی ہے۔ نام نہاد خلفائے بنی امیہ و بنی عباس نے اگر مدح اہل بیت کرنے والوں کی زبانیں قطع کرائیں تو اس کے اسباب تھے لیکن یہ ادوار گزر جانے کے بعد علماء کی حق گوئی اور شعراء کی مدح سرائی سے کسی کی

حکومت پر ضرب تو نہیں پڑتی پھر کیوں اولاد رسول کا بیان سننے پر قدغن لگائی جاتی ہے شاید صرف اس لئے کہ کعبے کے بت شکن کا نام لینے سے تاریخ کا صنم کدہ مسمار نہ ہو جائے اور صدیوں سے مسلسل تراشے ہوئے بت اچانک منہ کے بل گر نہ جائیں۔

وضعی اسلام کے اجارہ دار اگر یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہماری باتوں پر کان نہ دھریں گے تو وہ نہ دھریں مگر دوسروں کو کیوں روکتے ہیں کہ وہ بھی حقیقت سے ناآشنا رہیں......... بغض صحابہ پیدا ہونے کا خدشہ کس لئے لاحق ہے۔ صحابہ کو تو ہم بھی مانتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ بڑی سے بڑی غلطی کو طرفداری میں خطائے اجتہادی قرار دے دیتے ہیں ہم صادق و امین مکہ کے غلام جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ کہہ دیتے ہیں۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ جس نے غلط روی اختیار کی، اس کو غلط کہیں۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ میزان صفین کے دونوں پلڑے برابر۔ خلیفہ وقت بھی برحق اور خلیفہ پر حملہ کرنے والا بھی حق پر۔ خلیفہ پر تبرا کرنے والا بھی صراط مستقیم پر اور خود خلیفہ لائق تبرا ہونے کے باوجود قیامت تک کے لئے خلیفہ! دونوں میں سے کوئی برا نہیں۔

آپ یقیناً جانتے ہیں کہ ہر آدمی اس ہٹ دھرمی کو ماننے پر تیار نہ ہو گا اسی لئے منع کرتے ہیں کہ جہاں ایسی باتیں ہوتی ہوں وہاں نہ جایا کریں۔

ہمارے علماء اور فصحاء انہیں حقائق کو سامنے رکھ کر فیصلہ مخالف پر چھوڑ دیتے تھے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جب رسولؐ کی نیابت کے لئے شوریٰ کی شرط رکھی گئی تھی تو پھر حضرت ابوبکر کے بعد حضرت عمر کی نامزدگی کیسی اور جب باغ فدک مال مسلمین قرار پایا تھا تو حضرت عثمان نے اپنے بیٹے اور داماد کو کیوں دے دیا پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بنی فاطمہ کو واپس کر دیا اور بعد کے سلاطین نے دوبارہ کیوں ضبط کر لیا....... آخر فیصلہ کون سا صحیح تھا؟

اسی طرح کے کتنے ہی مسائل ہیں جن سے واقفیت کے بعد لوگ ان کے حل تلاش کرتے رہتے اور لاجواب ہو کر صراط مستقیم پر آجاتے۔ یہ کارنامہ ہے ہمارے علماء، فقہاء، فصحاء اور شعراء کا کہ تلواروں کی چھاؤں میں بھی وہ آل محمد کی صداقت کو سربلند کرتے رہے۔ کس نے کس کو سیدہ کونین کی عظمت سے

روشناس کرایا، کس نے کس کو علیؑ کا حلقہ بگوش بنایا؟ یہ حقائق صدیوں کی گرد میں چھپے ہوئے ہیں لیکن تاریخ نے یہ ضرور دیکھا کہ جن علاقوں میں لپنے کو علی کا دوست کہنا گردن زدنی تھا وہاں جب اہل بیت کا نعرہ بلند کیا گیا تو بھیانک ماحول کے سناٹے میں چاروں طرف سے لبیک لبیک کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور ہر قسم کا ظلم و ستم برداشت کرنے کے باوجود آج بھی ہماری تعداد ساری دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کا بیس سے پچیس فیصد تک ہے۔

اس میں علماء کرام کی مساعی کے ساتھ ساتھ دوسرے عوامل کی کارفرمائی ضرور ہے لیکن اساسی طور پر اس کو علماء کی جدوجہد اور معجز بیانی کا نتیجہ ہی قرار دیا جائے گا۔

اکابر کے ناموں کی یہ فہرست سورج سے اس کی شعاع لے لینے کے مترادف ہے۔ تفصیلی کارناموں کے لئے ہزاروں صفحات درکار ہیں کیونکہ انہوں نے نہ صرف حقوق آل محمد ادا کئے بلکہ بنی نوع انسان کی وہ خدمتیں بھی انجام دیں جن کے لئے خلاق عالم نے حضرت آدم کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا تھا۔

اسی کے ساتھ ساتھ ان عظیم المرتبت علماء نے مختلف شعبہ ہائے علوم و فنون پر لپنے دائمی نقوش ثبت کئے ہیں۔ آیتہ اللہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء نے سرسری طور پر گروہ تابعین پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے اور بعض نام گنوائے ہیں جو ایک طرح کا خلاصہ تحریر ہے۔

" احنف بن قیس، سوید بن غفلہ، عطیہ عوفی، حکم بن عتیبہ، سالم ابن ابوالجعد، علی ابن جعد، حسن ابن صالح، سعید ابن جبیر، اصبغ ابن نباتہ، سلیمان ابن مہران، اعمش اور یحییٰ ابن یعمیر عدوانی وغیرہ۔"

" ان کے بعد تبع تابعین کی وہ سربرآوردہ شخصیتیں ہیں جنہوں نے علوم اسلامی کی تاسیس کی، جیسے ابو الاسود دؤلی واضع علم نحو، خلیل ابن احمد موجد فرہنگ و عروض، ابو مسلم معاذ ابن مسلم الہراء موسس علم صرف، جنکی شیعیت کا اعتراف سیوطی نے بھی کیا ہے (المزہر جلد ۳) "

" یعقوب ابن اسحٰق عربی ادب کے پیشواء، نیز مفسرین کی جماعت میں امت کے عظیم دانشور جناب عبداللہ ابن عباس کا اسم گرامی ہے اور ان کا تشیع مہر نیم روز سے زیادہ روشن ہے، ان کے بعد جابر ابن عبداللہ انصاری، ابی بن کعب، سعید ابن جبیر، سعید ابن المسیب اور علوم قرآن کے جامع اولین محمد ابن عمر واقدی کے نام آتے ہیں۔ ابن ندیم وغیرہ نے ان کے شیعہ ہونے کا اقبال کیا ہے۔ الرغیب واقدی کی تفسیر ہے۔"

علم حدیث کی بنیادیں رکھنے والوں میں سرکار رسالت کے آزاد کردہ غلام اور کتاب الاحکام و السنن والقضایا کے مصنف ابو رافع ہیں۔ یہ امیر المومنین علیہ السلام سے خصوصی ربط رکھتے تھے و نیز حضرت کے دور حکومت میں مرکزی خزانہ عامرہ کے معتمد تھے۔ ان کے فرزند بھی اس سلسلے کے دو نمایاں افراد ہیں... علی ابن ابو رافع امیر المومنین علیہ السلام کے سیکریٹری تھے۔ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے لپنے باپ کے بعد فقہ میں تصنیف کا کام کیا اور ان کے بھائی عبداللہ ابن رافع نے تاریخ و وقائع نگاری کی طرح ڈالی۔

جن حضرات نے علم کلام کی عمارت کھڑی کی، ان میں ابو ہاشم بن محمد بن حنفیہ کو اولیت حاصل ہے۔ اس موضوع پر ان کی متعدد جلیل القدر کتابوں کا نشان ملتا ہے پھر عیسیٰ ابن روضہ تابعی کے کارنامے سامنے آتے ہیں۔ واضح رہے کہ مذکورہ اعاظم واصل ابن عطاء اور ابو حنیفہ سے بھی پہلے گزرے ہیں۔ اس ضمن میں سیوطی کا یہ خیال درست نہیں کہ موخر الذکر علم کلام کے اولین مصنف تھے۔

بعد ازاں مشہور شیعی اکابر کا دور آتا ہے جن میں قیس ابن الماصر، محمد ابن علی احول معروف و مومن طاق، ہشام ابن حکم اور ال نوبخت شامل ہیں۔ یہ گرامی قدر خاندان سو سال سے زیادہ عرصے تک مذہب و ملت کی خدمات انجام دیتا رہا۔ ان کے مصنفات میں "نص الیاقوت" وغیرہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ نیز ہشام، احول اور الماصر کے تلامذہ، ابو جعفر سکاک بغدادی، ابو مالک ضحاک حضرمی، ہشام ابن سالم، یونس ابن یعقوب وغیرہ ہم کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں

یہ وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے دہریوں سے تبادلہ فکر و نظر کر کے انہیں زبردست ذہنی شکستیں دیں اور توحید و امامت جیسے عنادین کے لئے ناقابل تردید ثبوت مہیا فرمائے۔

وہ لوگ جنہوں نے حضور ختمی مرتبت کی زندگی، معجزات، غزوات اور حسن کردار کے نمونوں کو جمع کرنے کی سعی فرمائی، ان میں:۔

"عالم اسلامی کی پہلی شخصیت ابان ابن عثمان الاحمر تابعی (متوفی ۱۴۰ھ) یہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد تھے۔ان کے بعد ہشام ابن محمد، محمد ابن سائب کلبی، محمد ابن اسحق مطلبی اور ابو مخنف ازدی کے شاہکار سامنے آتے ہیں بعد کے تمام لکھنے والے اس فن میں ان کے محتاج رہے۔

مورخین کی فہرست پر نگاہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کل بلند پایہ قلم کار شیعہ تھے

مثلاً کتاب المحاسن کے مولف احمد ابن محمد ابن خالد برقی، نصر ابن مزاحم منقری، ابراہیم ابن محمد ابن سعد ثقفی، عبدالعزیز جلودی بصری امامی، احمد ابن یعقوب جن کی تاریخ الیعقوبی یورپ میں شائع ہو چکی ہے۔ محمد بن زکریا، ابو عبداللہ الحاکم، مروج الذہب کے مصنف المسعودی، آداب السلطانیہ کے مولف محمد ابن علی ابن طباطبا اور ان جیسے سیکڑوں افاضل ہیں جن کے شمار کا موقع نہیں۔"

شعر و ادب کے مشاہیر کا سلسلہ حضور کی نعت خوانی کے سلسلے میں حضرت ابو طالب سے چلتا ہے جو متفقہ طور پر پہلے قصیدہ گو مانے جاتے ہیں اور پہلے مسلمان جو شیعہ علی نہ سہی مگر شیعان علی کے مرشد اعلیٰ ہیں:۔

"میری دانست میں محمد کا دین یقینی طور پر تمام ادیان عالم میں سب سے اچھا دین ہے"۔

لیکن ذکر ہے حضرت علیؑ کے شیعوں کا تو اس میں ان گنت نام ہیں:۔

"نابغہ جعدی (جنگ صفین کے سورما) عروہ ابن زید الخیل (جنگ صفین کے شمشیر زن) لبید ابن ربیع عامری ابو طفیل عامر ابن واثلہ، ابو الاسود دؤلی اور بانت سعاد کے مصنف کعب ابن زہیر وغیرہ۔

فرزدق، کمیت، کثیر عزہ، سید حمیری، قیس ابن ذریح وغیرہ

دعبل خزاعی، ابو نواس، ابو تمام، بحتری، دیک الجن، عبدالسلام، ابو الشیص حسین ابن ضحاک ابن رومی، منصور تمری، اشجع سلمی محمد ابن وہب اور صریع الغوانی وغیرہ جن میں مروان ابن ابی حفصہ اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد شامل ہیں

ابن ہانی اندلسی، ابن التعاویذی، صاحب مجون حسین ابن الحجاج، مہیار دیلمی اور امیر الشعراء ابو فراس حمدانی جن کی بابت کہا گیا ہے کہ شعر کی ابتداء بادشاہ سے ہوئی اور خاتمہ بھی بادشاہ پر ہوا۔

کشاجم، ناشی صغیر، ناشی کبیر، ابو بکر خوارزمی، بدیع ہمدانی، طغرائی، شمس الخلافہ، جعفر، عمارہ یمنی و داعی، زاہی، ابن بسام بغدادی، سبط ابن تعاویذی سلامی اور نامی۔ یتیمتہ الدہر ثعالبی کی چار جلدوں کے بیشتر اساتذہ فن شیعہ ہی ہیں۔

چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں کہا جاتا تھا کہ شاید شیعوں کے علاوہ کوئی ادیب یا شاعر ہوتا ہی نہیں ہے۔ متنبی اور ابو العلاء کے بارے میں بھی ایک خیال تھا کہ وہ شیعہ ہیں کیونکہ ان کے بعض اشعار سے ان کا جھکاؤ اہلبیت کی طرف محسوس ہوتا ہے۔ کوئی ادیب یا شاعر شیعہ نہ ہوتا تو اس کے لئے بھی ایک کہاوت تھی کہ اپنے کلام سے تو وہ بالکل شیعہ لگتا ہے........ ان شعراء میں قریشی، علوی اور اموی سب شامل تھے لیکن شاذ ہی کوئی غیر شیعہ ہوتا تھا۔

فضل ابن عباس، ابو ذہیل جمحی، وہب ابن ربیعہ وغیرہ جن میں آگے چل کر بعض گرانقدر ناموں کا اضافہ ہوا مثلاً شریف رضی و مرتضیٰ، شریف ابو الحسن علی حمانی وغیرہ۔ اسی سلسلے کا ایک گرانقدر نام شریف ابن شجری کا ہے۔

بنی امیہ کے شیعہ شعراء میں یوں تو بہت سے نام ہیں لیکن عبدالرحمن ابن حکم، خالد ابن سعید ابن عاص اور مروان ابن محمد سروجی بہت بلند پایہ ہیں۔ مروان نے کہا ہے:۔

"ہاں، میں اموی نژاد ہوں لیکن حاشا، مجھے بنو امیہ سے کوئی سروکار نہیں"

ایک طویل فہرست ہے ناموں کی جن میں نجدیات و عراقیات کے شہرت یافتہ مصنف ابیوردی بھی شامل ہیں۔

تسلسل بیان میں "جب بڑے بڑے فرمانرواؤں، عظیم سیاستدانوں اور مدبر و وزراء کی تاریخ سامنے آتی ہے تو یہاں بھی شیعہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ فاطمی اور بویہی حکمرانوں کے علاوہ آل حمدان، بنی مزید، بنی دبیس، عمران ابن شاہین، مقلد ابن مسیب عقیلی اور قرداش ابن مسیب جیسے سلاطین شیعہ ہی تھے۔ وجیہہ الدولہ ذوالقرنین تغلبی اور مغرب وافریقہ کے فرمانروا تمیم ابن معز کی شیعیت بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ اس فہرست میں مزید اور بہت سے نام آسکتے ہیں۔

اور وزراء کی صف میں تو سب شیعہ ہی شیعہ دکھائی دیتے ہیں۔ اسحٰق کاتب، غالباً یہ پہلے شخص ہیں، جن کے لئے رسمی طور پر وزیر کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ ابو سلمہ خلال کوفی، یہ پہلے عباسی خلیفہ کے پہلے وزیر تھے۔ سفاح نے ان کی انتظامی قابلیت کے پیش نظر سلطنت کے جملہ امور حوالے کر دیئے تھے۔ ابو سلمہ نے وزیر آل محمد کے لقب سے شہرت پائی لیکن پھر آل محمد کی دوستی ہی کے باعث سفاح کے سفاک ہاتھوں سے شہید ہوئے۔ ابو عبداللہ یعقوب ابن داؤد، مہدی عباسی کے وزیر تھے۔ خلیفہ نے پورا نظم ونسق ان کو سونپ دیا تھا۔"

"آخر میں انہیں بھی زنداں کی صورت دیکھنا پڑی، آل نوبخت اور بنی سہل تو وزارت کے گھرانے ہی کہلاتے ہیں، فضل ابن سہل، حسن ابن سہل مامون رشید کے وزراء تھے۔ اسی طرح بنوالفرات میں سے حسن ابن علی دور مقتدر میں تین مرتبہ وزارت کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ابوالفضل جعفر، ابوالفتح علی ابن محمد رکن الدولہ کے وزیر تھے۔ طاہر خزاعی کی اولاد کو مامون نے وزارت سپرد کی۔

مہلبی، ابودلف عجلی، صاحب ابن عباد اور عظیم سیاستداں ابوالقاسم وزیر مغربی، ابو عبداللہ حسین ابن زکریا جو شیعی کے لقب سے شہرت رکھتے ہیں، ان کے سوا ابراہیم صولی، طلائع ابن زریک، مصر کے سپہ سالار افضل اور ان کے فرزند، ابو الحسن جعفر ابن محمد، ابن فطیر، ابوالمعالی ہبتہ اللہ وزیر مستنصر اور موید الدین محمد ابن عبدالکریم قمی پہلے ناصر کے پھر طاہر کے وزیر ہوئے۔ اس کے بعد مستنصر نے وزارت پیش کی۔ حسن بن سلیمان برامکہ کے عہد میں چیف سیکریٹری تھے۔ یہ بھی شیعی کے لقب سے مشہور ہوئے۔

نیز مصنف الاوراق صولی، یحییٰ، ابن سلامہ حصفکی اور صاحب فہرست ابن ندیم کی تحریر کے مطابق ابو جعفر احمد ابن یوسف اور ان کے بھائی ابو محمد ابن قاسم کے اہل بیت کی شان میں کہے ہوئے قصائد و مراثی آپ اپنی نظیر ہیں....... اور ملاحظہ ہو صولی کی الاوراق۔ یہ مامون کے زمانے میں معتمد عمومی تھے بلکہ اس کے بعد کے دور میں بھی یہ عہدہ ان کے پاس رہا۔ اسی طرح ابراہیم یوسف اور ان کے فرزند، نیز عربی زبان کے ناقد اور معجم کے مصنف ابو عبداللہ محمد ابن عمران مرزبانی کا نام بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ سمعانی نے ان کے تشیع کا ذکر کیا ہے وعلی ھذا القیاس، سیکڑوں ہستیاں ہیں جن کی انتظامی قابلیت، سیاسی بصیرت اور قومی خدمت کا ریکارڈ پیش کرنے کے لئے دفتر درکار ہیں۔

ہمارے والد علام نے شیعوں کے مختلف طبقوں کے حالات جمع کرنے کی کوشش فرمائی تھی چنانچہ دس جلدوں میں علماء، حکماء، سلاطین، وزراء، ہیئت داں اور اطباء وغیرہ جیسے تیس طبقوں پر حروف تہجی کے مطابق روشنی ڈالی ہے۔ اس مجموعہ کا نام ہے "الحصون الشیعہ فی طبقات الشیعہ، مگر حق یہ کہ یہ ضخیم تالیف بھی جامع نہیں۔" (۱۰۱)

شیعیت کے یہ معمار بادی النظر میں مختلف شعبہ ہائے حیات میں منقسم تھے لیکن حقیقتاً بہت سی باتیں ان میں مشترک تھیں اور علم دین میں تو سب کو دستگاہ حاصل تھی۔ ایک عالم طبیب بھی ہوتا، فلسفی بھی، فلکیات میں دخل رکھتا اور شعر وادب کا ذوق بھی۔ اسی طرح ایک شاعر یا ادیب خواہ سیاسیات سے مس نہ رکھتا ہو مگر فقہ اور علوم آل محمد سے ناواقف نہ ہوتا۔ یعنیہ ایک سیاستداں، چاہے مکمل فقیہ نہ ہو لیکن شرع اسلامی اور بعض دوسرے علوم کا ماہر ضرور ہوتا۔

اور صرف انہیں مشاہیر پر موقوف نہیں ہر شیعہ علی ایک اچھا تیغ زن اور کسی حد تک عالم باعمل ضرور ہوتا اور یہ امتیاز اس دور کا ہی نہیں ہے، ایک صدی قبل تک شیعہ بچے کی تربیت آغوش مادر سے شروع ہوتی تو گوشہ قبر تک جاری رہتی اور کوئی شیعہ تقیہ میں ہو یا کھلے عام شیعہ ہو، پہچانا انہیں اوصاف سے جاتا تھا کہ اس کا علم شش جہت ہوتا ہر آدمی عالم تو نہ ہو سکتا مگر اس کی معلومات اتنی ضرور ہوتیں

کہ کسی دوسرے فرقے کے عالم کا منہ بند کر دیتا اسی لئے شروع ہی سے غیر شیعہ اپنے بچوں اور جوانوں کو ہدایت کرتے کہ شیعوں کے پاس بیٹھا نہ کریں۔

ہمارے علماء کو ابتداء ہی سے ان حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ تقیہ کے عالم میں بھی وہ ذہنوں کو منقلب کرتے رہتے اور تھوڑی بہت آزادی ملتی تو دل الٹ رکھ کر دیتے۔ ہر ایک کا طریقۂ کار الگ الگ تھا لیکن انہوں نے اپنا مقصد زندگی ہی یہ بنا رکھا تھا کہ غاصبوں کو بے نقاب کرتے رہیں۔

حضرت عمار یاسر، حضرت ابو ذر غفاری اور حضرت سلمان فارسی جو مسالک عمل بنا گئے تھے، وہ ان پر عمل پیرا رہے۔ شاعروں نے مدح اہل بیت سے لوگوں کو متاثر کیا۔ علماء نے اپنے خطبات اور بحث و مباحثہ سے۔ کچھ کام سیاست دانوں نے بھی کیا۔ وہ چور دروازے سے ظالموں میں داخل ہوتے اور اپنے کو ان کا معتمد علیہ بناتے پھر پیروان علیؑ کی جتنی حفاظت کر سکتے، کرتے رہتے اور غیر جانبدارانہ لب و لہجہ میں اہل بیت کی فضیلت بیان کرتے رہتے۔

اس لائحہ عمل کا آغاز حضرت معاویہ کے عہد میں حضرت عقیل اور بعض دوسرے اصحاب سے ہوتا ہے پھر ابو الہاشم بن محمد حنفیہ نے اس فریضہ کو انجام دیا تسلسل میں یوں تو بہت سے اسمائے گرامی آتے ہیں مگر تقریباً ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی محب علیؑ پایا ضرور گیا اور بنی عباس کے دور میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ گئی جن کے سہارے اولاد فاطمہؑ میں سے بے شمار لوگ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور کتنے ہی افراد کی جانیں محفوظ ہو گئیں۔

تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو سامانی، سلجوقی، غزنوی اور ایوبی دور میں چھپے ہوئے شیعوں کی نشاندھی ہوتی ہے جنہوں نے شیعیت کے ارتقاء میں خواہ کوئی کار نمایاں انجام نہ دیا ہو لیکن افراد کا تحفظ ضرور کیا اور انہیں افراد کے دم سے اگلی نسلیں پروان چڑھیں۔

شیعیت کا ارتقاء بلا شک و شبہ علمائے اولوالعزم کے تبحر علمی کا رہین منت ہے جنہوں نے ایک طرف عظمت آل محمدؑ کے پرچم لہرائے، دوسری طرف احادیث و

روایات کا وہ ذخیرہ یکجا کر گئے جن کے سہارے ہم آج مغروضہ کرداروں کو بے نقاب کر سکتے ہیں۔

چھوٹے بڑے عالموں کی فہرست بنانا ممکن ہو تو تعداد لاکھوں میں ہو گی کیونکہ صرف جید اور باکمال اہل علم کے نام ہزاروں میں ہیں جن میں سے صرف تھوڑے سے لوگوں کے اسمائے گرامی قلم بند کئے گئے ہیں۔ کس عالم نے کس کس طرح جہاد بالقلم اور مساعی باللسان کیں، ان کی کچھ تفاصیل اکابر نے علیحدہ علیحدہ کتب میں تحریر کی ہیں۔

اس کتاب میں تو صرف ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے تاکہ شیعیت کی توسیع میں ہمارے علماء کی خدمات کا ایک اندازہ ہو جائے اور دوسرے عوامل میں علماء کی افادیت کا تعین ہو سکے۔

مشاہد سادات

اس کا نقطہ آغاز حضرت سرور کائنات کا مزار اقدس ہے جو بحمداللہ ابتک پورے ہادیانہ جلال کے ساتھ موجود ہے ۔شاید سعودی عرب امتہ مسلمہ کے غیظ و غضب سے ڈرتا ہے ورنہ پورے نجد کی قبوراطہر کی طرح اسکو بھی زمین کے برابر کرچکتا یااسکے قدیم وجدید آقاؤں کی سیاسی مصلحت اسکی اجازت نہ دیتی ہو اور وہ مانع ہوتے رہے ہوں کہ کہیں مذاہب عالم کی طرف سے کوئی سوال نہ اٹھ جائے ۔

اس مشہدرشد وہدایت کے بعد جنت البقیع کی منزلت ہے جو سیدہ نساء العالمین کی ابدی آرام گاہ ہے اور جس میں حضرت امام حسینؑ ، حضرت امام زین العابدین ، حضرت امام محمد باقر، حضرت جعفر صادق ، حضرت ابراہیم بن محمد مصطفیٰ حضرت عبداللہ بن جعفر طیار ، حضرت عقیل ابن ابی طالب کے مزارات بھی واقع ہیں ۔ حضرت علیؑ کی والدہ گرامی جناب فاطمہ بنت اسد کا مدفن بھی اسی میں بنا ہوا تھا لیکن اب وہ سب مٹادئے گئے ہیں ۔دور سے سطح زمین نظر آتی ہے ، قریب کوئی جا نہیں سکتا، جانے کی اجازت ہوتی ، توشاید کوئی صاحب ایمان خاک کی خوشبو سونگھ کر بتادیتا کہ یہ بنت رسول کا مشہد مبارک ہے

نجف اشرف

ان مقدس مزاروں کے معجزات وکرامات چونکہ فضائل آل رسول کا القان دلوں میں پیدا کرتے ہیں اس لئے وہ تاریخ کا اہم حصہ ہیں ۔ سادات کی اصطلاحی تعریف اولاد سیدہ کونینؑ : ان کے جداعلی محمد مصطفی ہیں لیکن وہ سب امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب کی نسل سے ہیں لہذا فخر مخلوقات بعد سرور کائنات کو سرنامہ قرار دیا جاتا ہے ۔

مقام وقوع کے اعتبار سے یہ جگہ کبھی دریا کے نشیبی ساحل میں تھی اور یہاں کشتیاں لنگر انداز ہوتی تھیں ۔ انتہائے خشک ہونے پر اس مقام کو "نے جف" کا نام ملا ۔

قدیم ماخذ میں نجف کو بانقیا، طور، ربوہ، غری، ظہرالکوفہ، جودی اور لسان بھی لکھا گیا ہے ۔ مشہد علی اس کا صفاتی نام ہے ۔

۲۱ رمضان ۴۰ھ / ٦٦١ء کو حضرت علیؑ ظہرالکوفہ ، غری میں سپرد لحد کیے گئے ۔ ملک کی سیاسی صورت حال کی بنا پر حضرت علیؑ کی قبر مخفی رکھی گئی کہا جاتا ہے کہ وصیت کے مطابق ایک جیسی چالیس قبریں بنائی گئی تھیں ۔ بنوامیہ کا دور ختم ہوتے ہی مزار پر لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی ۔ امام جعفر صادقؑ نے بتاکید لوگوں کو زیارت کی ترغیب دی پھر آپ کوفے آئے تو اپنے جد بزرگوار کی قبر پر خود بھی حاضر ہوئے ۔ اسی دور میں پہلے عباسی خلیفہ سفاح کے چچا داؤد بن علی عباسی (۱۳۳ھ / ۷۵۰ء) نے قبر پر ایک قیمتی لکڑی کا صندوق رکھوایا ۔ اس کے بعد سے قبور نجف و کربلا پر صندوق رکھے جاتے ہیں ۔

تعمیر مزار

مشہور ہے کہ ایک دن ہارون رشید شکار کھیلنے کیلئے اس علاقے میں آیا تو اس نے کچھ غیبی نشانات دیکھے جو قبر کی صحیح جگہ کا اشاریہ تھے لہذا اس نے وہاں پر پختہ مزار بنوادیا ۔

ہارون الرشید نے قبر کے گرد ایک خوب صورت سفید چاردیواری اور سرخ پتھر کا ایک گنبد بنوایا تھا جس پر سبز رنگ کا خول چڑھوایا تھا ۔ یہ خول مدت تک خزانہ مزار میں محفوظ رہا ۔ شاید یہ تلافی انہدام مزار حسینؑ کی ہو یا وہ کسی غیبی تہدید سے مجبور ہو گیا ہو ۔ بنوعباس کے خلفا میں واثق باللہ (۲۳۲ھ / ۸۴۷ء) بھی نجف آیا تھا جس کا ثبوت قصیدہ اسحاق بن ابراہیم موصلی کے وہ اشعار ہیں جو تاریخ الکوفہ میں موجود ہیں ۔ اسکے بعد منتصر نے قدرے توجہ کی ، مقتفی نے کئی مرتبہ مزار پر حاضری دی ۔ مستنصر باللہ نے ۶۳۳ھ / ۱۲۲۶ء کے بعد ضریح کی تعمیر کی اور مزار کی شان و

شوکت میں اضافہ کیا اس نے اس موقع پر عوام کو انعام واکرام سے بھی نوازا۔

بنوعباس کے علاوہ بہت سے ارباب اقتدار نے بھی وقتاً فوقتاً عمارت کی تعمیر، توسیع وتزئین اور وقف وآبادکاری میں حسب حیثیت حصہ لیا جس سے نجف کی آبادی بتدریج بڑھنے لگی، علما اور طلبہ، کوفہ و بغداد سے آکر جمع ہونے لگے۔ اس سلسلے میں پہل سادات نے کی۔ ۲۴۹ھ میں جب یحییٰ بن عمر حسینی نے کوفے میں خروج کیا تو عراق کے حسینی سادات کچھ ابھر کر سامنے آئے۔ ۲۵۰ھ / ۸۶۴ء میں مستعین نے انہیں شہید کروادیا، مگر ان کے فرزند عمر نے عزت واقتدار حاصل کیا اور مشہد علوی کی تجدید واصلاح کرائی۔

تیسری صدی ہجری کے وسط میں طبرستان کے علوی حکمرانوں میں زیدیوں کے داعی محمد بن زید (۲۷۰ھ / ۸۸۴ء) نے ایران سے قیمتی پتھر بھیج کر کربلا اور مشہد علوی کی تعمیر وتزئین کی، مزار پر ایک بڑا اور شاندار احاطہ بنوایا جس میں کئی محرابیں تھیں تاکہ زائرین حرم دھوپ اور بارش سے محفوظ رہ سکیں۔ حسن بن یحییٰ اور محمد بن زید نے سادات واشراف کے لیے ہدایا بھیجے اور املاک وقف کیں۔

۲۶۰ھ / ۸۷۴ء میں موصل کے ایک امیر عبداللہ بن حمدان نے قوت و اقتدار حاصل کیا تو نجف کی آبادی کے ساتھ مزار علوی کی تزئین اور آرائش پر توجہ دی۔ اس نے حجرے کیلئے چاندی اور شیشے کے قیمتی آلات، فرش فروش ہدیہ کیا۔

۳۶۹ھ / ۹۸۰ء میں عمران بن شاہین نے صحت یابی کے بعد ایک مسجد بنوائی اور اہل نجف کو داد دہش سے نوازا اور مزار کو قیمتی سامان سے آراستہ کیا۔ جرم نجف میں اب بھی "ایوان عمران" کے نشان محفوظ ہیں۔

چوتھی صدی ہجری کے وسط میں بنوبویہ نے سیاسی قوت حاصل کی اور بغداد کی حکومت میں سیاہ وسفید کے مالک بن گئے تو انہوں نے مشاہد پر خاص توجہ کی۔ شہنشاہ عضدالدولہ نے حضرت علی کے روضے کو ازسرنو تعمیر کرایا: عمارت، صحن اور مسجد کے تمام حصوں کی ازسرنو تزئین کرائی، دیواروں کو لکڑی کے کام سے مزین کرایا، چھتوں میں اعلیٰ درجے کی قندیلیں لگوائیں، قبر پر نئی نفیس لکڑی کا صندوق رکھوایا جس پر چاندی کے نقش بنے ہوئے تھے۔ ایوان میں قیمتی پردے ڈلوائے،

قالین وشمع دان رکھوائے، خوشبو کا اہتمام کیا، شہر کے گرد حصار کھنچوایا اندر زائرین وعلما کے لئے مکانات بنوائے اور ان کے ساتھ بڑے بڑے وقف قائم کیے۔

عضدالدولہ کے بعد اس کی اولاد اور اخلاف نے نجف کی توسیع وترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کے ساتھ حمدانی بھی پوری طرح اس شہر کی زیب وزین اور ظاہری ومعنوی رونق بڑھانے میں کوشاں رہے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت علی کی بھی چالیس قبریں بنائی گئی تھیں اور ان میں سے کسی ایک میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا تھا تاکہ بنی امیہ صحیح قبر کو تلاش کرکے لاش کی بے حرمتی نہ کرسکیں۔ ہارون رشید کے سے دشمن اہل بیت کو قبر کا نشان ملنا سمجھ میں نہیں آتا البتہ عضدالدولہ کے بارے میں بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اسکو کسی غیبی رہبری پر اصل قبر مل گئی جسکو اس نے ۴۰۰ھ میں بنوانے کی سعادت حاصل کی ، ابو محمد حسن بن سہلان وزیر سلطان الدولہ بویہی نے نجف کی شہرپناہ دوبارہ تعمیر کرائی۔

بنی بویہ کھلم کھلا شیعہ تھے لہذا ان کے دور میں شیعوں کو اپنے مذہبی مراسم کے بجالانے اور علانیہ جلسہ کرنے اور جلوس نکالنے کے مواقع ملے۔ ۳۵۳ھ / ۹۶۴ء سے بغداد کے شیعہ غدیر، محرم، رمضان کے مراسم ادا کرنے کے لئے جلوس لے کر نجف و کربلا پہنچتے تھے۔ زائروں کا دستور تھا کہ قافلے کی صورت مضافات سے بغداد آتے اور وہاں سے سفید علم لے کر نجف جاتے تھے۔

۴۴۸ھ / ۱۰۵۶ء میں جب بغداد کے محلہ کرخ میں فرقہ وارانہ فساد ہوا اور علماء واکابر کے گھر اور مدرسے جلائے گئے، کتب خانے تباہ ہوگئے تو بغداد کے بہت سے لوگ نجف ہجرت کر گئے۔ مہاجرین میں شیخ ابوجعفر محمد بن حسن طوسی بھی تھے۔ شیخ طوسی نے نجف پہنچ کر مدرسے کی تاسیس جدید کی، جس کے بعد نجف علوم دین کا شہر بن گیا اور شیخ طوسی کے مدرسے کی بین الاقوامی حیثیت ہوگئی۔

۴۷۹ھ / ۱۰۸۶ء میں ملک شاہ سلجوقی نجف آیا تو اس نے ازراہ عقیدت مزار حضرت علی کی خدمت کی۔ شہریوں کو مال ودولت سے نوازا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا سنجر بھی جب نجف آیا تو اس نے بھی امرائے سابق کی طرح مزار علوی میں ہدیے اور

نذرانے پیش کیے ۔مزید برآں اس نے نجف کے شہریوں کو پانی کی قلت سے بچانے کیلئے نہر یا متبادل انتظام کرنے کا حکم دیا لیکن چونکہ کوفے سے نجف کی بلندی تقریباً پینتیس میٹر تھی اس لئے منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا اور مدتوں اہل نجف پانی کی تکلیف سے دوچار رہے ۔

۶۷۶ھ / ۱۲۷۷ء میں عطا ملک جوینی نے فرات سے نہر نکال کر اقلیدسی اصول پر دور دراز کا چکر دے کر نجف تک پانی پہنچایا ۔نہر شہر کے نیچے سے گزرتی تھی شہر کے لوگ کنویں کھود کر پانی حاصل کرلیتے تھے ۔اسے "قنات" کہتے ہیں ۔اس نہر کے نگران تاج الدین تھے لہذا نہر کا نام "تاجیہ" پڑا ۔دوبارہ شاہ اسماعیل نے اسکو صاف کروایا ۔

سلطان سلیمان قانونی کے بعد ترکوں نے پھر "قناتی" کے نظام کو درست کرایا ۔الحیدریہ کی نہر سلطان عبدالحمید ثانی نے بنوائی ۔ ۱۹۱۲ء میں فرات کا پانی لوہے کے پائپ کے ذریعے لایا گیا ۔آج کل قنات کا نظام ٹیوب ویل سے بدل گیا ہے ۔

چھٹی صدی کے خاتمے کے قریب جب ناصرلدین اللہ عباسی نجف آیا تو مزار اور شہر بارونق تھا ۔مدارس و مساجد آباد تھیں ۔خلیفہ نے مزار پر ایک ضریح نذر کی شہریوں کو تحائف وہدایا عطا کیے ۔اسی زمانے میں عبدالکریم بن احمد بن طاؤس حسینی (۶۹۳ھ / ۱۲۹۴ء) نے نجف پر کتاب لکھی جس کا نام "فرحۃ الغری بصرحتہ الغری" ہے ۔اس کتاب کا خلاصہ مع اضافہ جمال الدین ابو منصور حسن بن مطہر حلبی (۷۲۶ھ / ۱۳۲۵ء) نے "الدلائل البرہانیہ فی تصحیح الحضرۃ الغرویہ" کے نام سے کیا ہے

۷۲۸ھ / ۱۳۲۷ء میں جب ابن بطوطہ قادسیہ سے نجف پہنچا تو اس نے نجف کی وسعت ، آبادی ، بازار ، مساجد ، مدارس ، رسوم وآداب کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور سب کو ضابطہ تحریر میں لایا ۔

خلیق احمد نظامی نے محمد شاہ تغلق (۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء) کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے بغدن نامی امیر کے ہاتھ ایک کڑور تنکے عراق کے مقامات مقدسہ میں تقسیم کرنیکے لیے بھیجے تھے ۔(سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ، ص ۲۸)

نجف کی تاریخ کا اہم دور صفوی بادشاہوں سے شروع ہوتا ہے ۔ان میں سے شاہ اسماعیل اول نے ۹۱۴ھ / ۱۵۰۸ء میں نجف کو از سرنو تعمیر کرایا ، صدیوں پرانے صندوق کو بدل کر نیا صندوق رکھا ، بہت بڑا وقف قائم کیا ، علما اور عوام کی امداد کی ، نہر نجف کو جاری کیا ۔۹۵۸ھ / ۱۵۵۰ء میں شاہ عباس اول نے ، ۱۰۳۲ھ / ۱۶۲۳ء میں مرزا تقی وزیر شاہ نے ، ۱۰۴۲ھ / ۱۶۳۳ء میں شاہ صفی اول نے ، مزار اور شہر کو چار چاند لگا یے ۔۱۰۴۷ھ / ۱۶۳۷ء میں عثمانی بادشاہ سلطان مراد نے غیر معمولی دریادلی سے نجف وآستان علوی کی مرمت کرائی

نادر شاہ ۱۱۵۶ھ / ۱۷۴۳ء میں زیارت کیلئے نجف آیا تو اس نے گراں بہا تاج سونے کی بھاری زنجیر ، جواہر نگار مجمر ، اگرداں اور شمع دان نذر کیا ، ایوان وعمارات پر طلاکاری ، کاشی کار کام کرایا ۔قبر انور پر اب تک لکڑی کا صندوق تھا اس نے فولاد کی طلاکار ضریح نصب کی ، گنبد پر سونے کا ملمع کرایا ، شہرپناہ کو از سرنو بنوایا ، شہر کی آب رسانی کے لئے حکم دیا کہ جہاں جہاں مٹی اور ریت کا دباؤ زیادہ ہو وہاں تانبے اور سیسے سے نالیاں بنادی جائیں ۔

۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء میں فتح علی شاہ قاچار نے پانچ سال میں بیرونی خندق ، شہر پناہ اور مضبوط برجوں اور دروازوں سے نجف کو قلعہ بند کردیا ۔ ۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۰ء میں ناصر الدین شاہ قاچار زیارت کو آیا تو اس نے بھی حرم اور شہر میں ضروری اضافے کیے ، تزئین وآرائش کرائی اور ہر چیز کو باقاعدہ رکھنے کی ہدایت کی ، ایک تاج بھی نذر کیا جس کے ہیرے پر سورۃ الملک کندہ تھی ۔ فولادی صندوق پر چاندی کا صندوق رکھوایا ۔سلطان محمد جعفر فرزند کا وہ قیمتی چوبی صندوق مزار پر اب بھی موجود ہے جس کی تاریخ نذر ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۸ء ہے

برصغیر اور نجف

نجف کی تعمیر وترقی میں برصغیر کے ارباب ہمت کا بھی حصہ ہے ۔عراق و ایران سے ہندوستان کے سیاسی و مذہبی روابط ہمیشہ استوار رہے ۔مسلمانوں کے ابتدائی عہد سے لے کر انگریزوں کے آخری دور تک یہاں کی حکومتیں مقامات مقدسہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتی رہی ہیں ۔ہر زمانے میں نجف کے علما

سادات اور شعراء درباروں میں آتے رہے یہاں کے سلاطین نے بھی جب کوئی سفارت بغداد بھیجی تو عتبات عالیات کے لیے تحف وہدایا ضرور ارسال کیے۔

دکن کے سلطان نظام شاہ اور محمد شاہ بہمنی کی والدہ نے زر کثیر سے مستحقین کربلا و نجف کی مدد کی، حرم کے لیے نذرانے ارسال کیے۔ ۹۵۶ھ / ۱۵۴۹ء میں ملا شاہ طاہر اور ۹۱۴ھ / ۱۵۰۸ء میں احمد نظام شاہ، ۹۶۱ھ / ۱۵۵۳ء میں برہان نظام شاہ اور ۹۹۹ھ / ۱۵۸۸ء میں مرتضیٰ نظام شاہ فوت ہوئے اور ان کی لاشیں دفن کرنے کے لیے کربلا لائی گئیں تو نجف و کربلا کے لیے شاہی اوقاف قائم ہوئے۔ نظام شاہی سلاطین کے ساتھ قطب شاہی خاندان کے فرمانروا بھی پیچھے نہ تھے۔ انہوں نے مشاہد کی گرانقدر خدمات کیں۔

نجف و کربلا کی تاریخ میں نوابان اودھ کا خراج عقیدت آج تک یادگار ہے نواب آصف الدولہ نے سات لاکھ روپے عراق ارسال کیے جن سے نجف و کربلا میں بڑی بڑی تعمیرات مکمل ہوئیں، ایک نہر بنائی جو نہر آصفی کہلاتی ہے۔ آصف الدولہ کے دور میں غفران مآب نجف گئے اور وہاں سے سند اجتہاد لے کر لکھنؤ آئے جن کی سعی سے کچھ دن بعد لکھنؤ نجف ہند سمجھا جانے لگا۔

اودھ کے پانچویں فرمانروا غازی الدین حیدر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک کروڑ روپے اس شرط پر دیے کہ پانچ لاکھ روپے سالانہ میں سے ڈھائی لاکھ روپے نجف و کربلا کے عالم بزرگ کو بھیجے جائیں، مبارک محل کی تنخواہ دس ہزار روپے مقرر کی تھی، مبارک محل اور باقی دوسروں نے وصیت کے ذریعے اپنے بعد وہ روپے بھی نجف و کربلا کے لیے مخصوص کر دیا۔ یہ معاہدہ محرم ۱۲۴۱ھ / ۱۷ اگست ۱۸۲۵ء کو مکمل ہوا تھا۔ مدت تک تین لاکھ روپے سالانہ "خریدہ اودھ" کے نام سے عراق جاتے رہے اور مدارس و طلبائے نجف پر خرچ ہوتے رہے۔

محمد علی شاہ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء نے ڈیڑھ لاکھ روپے بھیجے جن سے عام تجدید و تعمیر نجف و کربلا ہوئی۔ پندرہ ہزار روپے امجد علی شاہ نے روانہ کیے کہ نجف میں نہر کو درست کیا جائے۔ ۱۲۶۳ھ میں یہ کام انجام کو پہنچا۔ نواب ملکہ جہاں اہلیہ محمد علی شاہ اودھ (۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۰ء) زیارت کے لیے گئیں تو وہاں بہت بڑی سرا بنوائی،

مکان خریدے اور وقف کیے۔ نجف میں انہوں نے اپنے شوہر کا تاج اور شمشیر نذر کی

نوابان مرشد آباد و حیدر آباد و رام پور، فیض آباد و محمود آباد، خیرپور و لاہور کے اوقاف و خدمات کی فہرست طویل ہے۔ اس طرح ہندوستانی مسلمانوں کے لیے یہ افتخار کچھ کم نہیں ہے کہ نجف اشرف کا سب سے بڑا درس مسجد اردو میں ہوتا ہے، جو سید محمد خان ہندی نے ۱۳۰۴ھ میں تعمیر کی۔ قزلباش نواب کا مدرسہ اپنی کاشی کاری خوبصورتی اور فیض رسانی کی وجہ سے لاہور کی خدمت کا نشان امتیاز ہے۔

نجف بارہ سو برس سے اسلامی، بالخصوص شیعی، دانش گاہ بنا ہوا ہے۔ موجودہ حکومت سے پہلے اسی فیصد آبادی علما و طلبہ کی تھی۔ گلیوں، بازاروں میں عمامہ و عباپوش، بغل میں کتابیں دبائے گروہ در گروہ نظر آتے تھے۔ فقہ و اصول میں بارہ بارہ ہزار طلبہ شرکت کرتے تھے۔

مزار مبارک حضرت علی

مزار علوی شہر نجف کی عالیشان عمارت ہے۔ اس کا گنبد اپنی ہیئت کے لحاظ سے بہت خوبصورت و متناسب ہے۔ بھاری گنبد اور اونچے کلس پر سونے کا کام دن رات چمکتا، دور سے نظر آتا ہے۔ طلائی میناروں اور گنبد کی خوشنمائی ہی نجف کا مادی حسن ہے۔ حرم کی چار دیواری میں باب قبلہ، باب طوسی، باب الساعۃ جیسے دروازوں سے صحن میں داخلہ ہوتا ہے۔ وسیع صحن کے درمیان مزار کی سنگیں عمارت خوبصورتی اور فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ برآمدہ اونچا نفیس پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ اس کے دونوں طرف دو مینار ہیں۔ میناروں کے اوسط میں بلند و طلائی دروازہ ہے، جس کے محراب اور طاق در طاق پر، ڈاٹ چڑھے ہوئے سونے سے رات کو دن اور دن کو سورج کی پاسبانی کا گمان ہوتا ہے۔ ایوان میں داخل ہونے کی لئے طلائی دروازہ ہے۔ بالائی گنبد کے حدود میں "ید اللہ فوق ایدیھم" اور میناروں کی طلاکاری پر "اللہ اکبر، اللہ اکبر ۱۱۵۶ھ" درج ہے۔ اسی تاریخ کے ساتھ محمد علی اصفہانی نے سورۂ فتح لکھی ہے۔ در و دیوار پر کاشی کا کام بیحد نفیس ہے۔ خوش نویسوں کے لکھے ہوئے اشعار، آیات اور کتابت اس پر مستزاد ہیں۔ ضریح کا ایوان مربع ہے۔ بڑے ہال

میں مجوف گنبد کا اندرونی حصہ اور چھت گوشے اور ان میں ہندسی محرابیں، قوسین اور فنی نزاکتیں، ان کے اندر باریک و لاجواب شیشہ کاری اور روشنی، وسط میں چاندی سونے کی نفیس ضریح ہے جس پر چاندی کی جالی ہے۔

موجودہ ضریح ۱۳ رجب ۱۳۶۱ھ / ۱۹۴۲ء کو ملا طاہر سیف الدین نے نصب کی تھی۔ ضریح کے اندر صندوق، اس کے اوپر دو قدیم قرآن مجید کے قلمی نسخے رکھے ہوئے ہیں جن میں ایک بخط حضرت علی اور دوسرا بخط امام حسن ہے۔ ضریح کے اوپر مخمل کی چادر ہے، اس پر چھت میں لٹکے ہوئے جھاڑ فانوس، سونے کی بھاری قندیلیں اور جواہرات کے ہدیے، زمین پر اعلیٰ درجے کے پتھروں کا فرش اور بے حد قیمتی قالین ہیں۔ پہلوؤں میں رواق ہیں جن میں داخلے کے چار دروازے ہیں: باب طلا، باب طوسی کے مقابلے میں باب فضہ، باب راد ہے۔ چوتھا دروازہ بھی چاندی کا ہے۔ رواق کے شمالی رخ پر منبر ہے جس پر منبت کاری کی گئی ہے۔ مغربی رواق میں بڑا سا کمرہ یا توشہ خانہ ہے۔

مدارس: نجف دراصل شہر علم ہے۔ اس میں کم و بیش بیس مدرسے ہیں۔ نجف و کربلا، قم اور مشہد میں مدرسہ اس عمارت کو کہتے ہیں جس میں طلبا رہتے ہیں اور پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ یہ مدرسے بڑی خوبصورت دو منزلہ اور سہ منزلہ عمارتوں پر مشتمل ہیں۔ ایک ایک مدرسے میں دو دو سو، بلکہ اس سے زیادہ طلبہ رہتے ہیں۔ ہر مدرسے میں بڑے بڑے تہ خانے ہیں جو گرمی کے موسم میں ٹھنڈے رہتے ہیں۔ سب سے بڑا مدرسہ "مدرسہ کاظم یزدی" ہے۔ "مدرسہ اخوند" کے نام سے تین مدرسے، دو مدرسے حسین خلیلی کے نام سے، مدرسہ ہندی تعمیر نواب فتح علی خان قزلباس، بڑا مدرسہ جسے جامعتہ النجف کہتے ہیں، بہت مشہور ہیں۔ نجف کا یہ مدرسہ جدید وسیع و عریض انگریزی طرز کا ہے، اسی طرح مدرسہ خوئی بھی ہے۔ ان مدرسوں میں متعدد ممالک سے آئے ہوئے طلبہ رہتے ہیں، مگر ۱۳۸۰ھ کے انقلاب کے بعد نجف علما و طلبہ سے خالی ہو چکا ہے۔

نجف میں درس مساجد میں ہوتا ہے، گھروں پر اور مدرسوں میں نجی سبق پڑھائے جاتے ہیں۔ درس خارج کے لیے مسجدیں استعمال ہوتی ہیں۔ جس کا طریقہ

یہ ہے کہ سو سے ہزار طلبہ تک مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔ استاد منبر پر بیٹھ کر لیکچر دیتا ہے۔ پھر سوال و جواب اور بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔ اصول فقہ اور فقہی استدلال کے کم از کم دو الگ الگ بڑے درس ہوتے ہیں۔ فارغ التحصیل طلبہ استاد کی تقریر لکھتے جاتے ہیں۔ یہی درس اجتہاد کی صلاحیت ابھارتے ہیں اور اسی سے فارغ ہو کر طلبہ مجتہد بنتے ہیں۔ اس قسم کی تدریس اور مدارس کی وجہ سے نجف کا نام حوزہ علمیہ رکھا گیا ہے۔

نجف میں شیعہ مذہب کے نامور عالم و مدرس ہمیشہ سے رہتے چلے آرہے ہیں عموماً "مرجع اکبر" اسی شہر میں رہتے ہیں۔ گزشتہ دنوں آیت اللہ سید محسن الحکیم مرجع اکبر تھے۔ ۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۹ء میں ان کی رحلت کے بعد مرجع اکبر دو قرار پائے۔ آیت اللہ سید ابو القاسم الخوئی جو اب بھی نجف میں ہیں دوسرے آیت اللہ سید باقر الصدر تھے جو شہید کر دیے گئے۔ حال ہی میں حضرت خوئی بھی رحلت فرما گئے۔

کتاب خانے: نجف کا شمار دنیا کے قدیم ترین مراکز درس میں ہوتا ہے۔ یہاں کے علما، ہزار سال سے علوم اسلامی کی خدمت انجام دے رہے ہیں، اس لیے ہر گھر میں کتابیں اور ہر گلی میں کتاب خانے ہیں۔ آج کل بڑے اور مشہور کتاب خانوں میں شیخ عبد الحسین الامینی کا کتاب خانہ، امیر المومنین اور سید محسن الحکیم کا مکتبہ الحکیم بہت اہم ہیں۔

نجف جدید شہری ضروریات سے آراستہ ہے۔ تجارت، صنعت و حرفت، جدید مدارس، ہسپتال، تفریح گاہیں، آثار قدیمہ سب کچھ موجود ہے، عرب ادیب و خطیب، مصنف و ناشر بکثرت ہیں۔ شہر کی چار دیواری توڑ دی گئی ہے اور شہر ہر طرف پھیل چکا ہے۔ قدیم وضع کے مکان کم ہوتے جارہے ہیں، پرانی بستیاں اور محلے کھد چکے ہیں، چوڑی سڑکیں اور کشادہ بازار بن گئے ہیں اور باب مدینتہ العلم کا مشہد مقدس دور حاضر کا خوبصورت شہر بنتا جارہا ہے لیکن روضہ کی جلالت آج بھی ترجمان ہے اس حقیقت کی کہ ختم المرسلین کا نائب اول بعد شہادت بھی اسلام و ایمان کی شعاعیں بکھیر رہا ہے۔ (۴۲)

ے آگے چل کر دو کے بجائے چار مراجع ہو گئے تھے جن میں حضرت آیت اللہ خمینی بھی تھے۔

کربلائے معلیٰ

تدفین شہداء کو اگر نقطہ آغاز قرار دیا جائے تو کربلائے معلی کی تاریخ ۱۲ محرم ۶۱ھ سے شروع ہوتی ہے جسکے کچھ دنوں بعد بنی اسد نے گنج شہیداں کے قریب ایک خام مسجد بنالی تھی تاکہ نماز پڑھنے کے بہانے وہ وہاں جمع ہوتے رہیں اور قبر امام مظلوم کی زیارت بھی کرتے رہیں پھر قبر پر ایک سائبان بھی ڈال دیا۔

پھر جناب مختار ثقفی کے عہد میں ابراہیم بن مالک اشتر نے پہلے پہل ایک تعمیر کرائی اور قریب ہی کچھ لوگوں کو آباد بھی کردیا جنکی تاراجی مروان اور عبدالملک اور پھر منصور دوانیقی نے کرائی اور کہا جاتا ہے کہ اس عمارت کو بھی مسمار کرادیا جو مختار ثقفی کے مختصر عہد میں بنائی گئی تھی لیکن یا تو عمارت پوری طرح منہدم نہیں ہوئی یا پھر اسکی مرمت عقیدتمندوں نے کرلی ہو کیونکہ ہارون رشید کے دور میں عمارت بھی تھی اور قبر سید الشہداء کے قریب ایک بیری کا درخت بھی لگا ہوا تھا۔ ہارون رشید نے انہدام مزار کے ساتھ اس درخت کو بھی کٹوادیا تاکہ نہ نشان قبر رہے اور نہ کوئی ایسی علامت جو قبر کی نشاندہی کرسکے۔

ہارون کے بعد امین و مامون کا عہد آیا تو ۱۹۳ھ میں مزار مطہر پر دوسری بار ایک قابل ذکر عمارت کھڑی کی گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسکی تعمیر مامون نے کرائی تھی لیکن ہارون رشید کے انتقال کے بعد اگر سن تعمیر واقعی ۱۹۳ھ ہے تو اسکو مامون نے نہیں بنوایا کیونکہ آل رسولؐ کی ظاہری تالیف قلب کی سیاست کا آغاز اس نے ۱۹۹ھ کے بعد کیا۔ پانچ چھ سال امین و مامون کے جھگڑے میں گزر گئے۔ حالات بالکل غیر یقینی تھے۔ کوئی کہہ نہ سکتا کہ کامیابی کا سہرا کس کے سر بندھے گا؟ یہ تو طاہر بن حسین کی تلوار تھی اور اسکی مدبرانہ صلاحیت کہ میدان مامون کے ہاتھ رہا لہذا گمان غالب یہ ہوتا ہے کہ ہارون رشید کا ظالمانہ دور ختم ہوتے ہی کسی چھپے ہوئے شیعہ امیر نے سوچنا شروع کردیا ہو کہ امام مظلوم کی قبر سونی پڑی ہے اور وہ نرم بستر پر آرام کررہا ہے لہذا اس نے اپنے معتمدین کو بھیج کر تعمیر شروع کرادی ہو۔
اس خیال کو تقویت اس لئے پہنچتی ہے کہ چند سال تک سادات کشی کی

پالیسی نرم پڑگئی تھی۔ عباسیوں کی خانہ جنگی میں کسے اتنا یارا تھا کہ اس طرف توجہ کرتا۔ ممکن ہے خود طاہر بن حسین نے یہ شرف حاصل کیا ہو اور جب مامون کا استقرار خلافت ہوا تو روضہ مقدس بنا بنایا موجود تھا جسکو مامون نے منہدم نہیں کرایا کیونکہ اب وہ سادات کیلئے تلوار کا استعمال خطرناک سمجھتا تھا اس نے امیر معاویہ کے اسلحہ خانے سے زہر کی بوتلیں مستعار لے لی تھیں اور انہیں کے استعمال کو اس نے تقاضائے وقت قرار دے لیا تھا۔

یہ تعمیر ۲۳۲ھ تک باقی رہی بلکہ اسکے زیب و زین میں اضافہ ہوتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ بعض عباسی بھی حلقہ عقیدت میں شامل ہوتے رہے تھے، منتیں مانی جاتی تھیں، مرادیں برآتی تھیں، نذر و نیاز کا سلسلہ جاری تھا کہ خونخوار متوکل عباسیوں کا تاجدار بن گیا اور سادات کی گردنیں اتروانے کے ساتھ قبر بارگاہ امامؑ ڈھانے کا عزم بھی کرلیا گیا۔

روایات متواترہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چار مرتبہ اس نے انہدام مزار مقدس کی کوشش کی۔ پہلی بار ۲۳۲ھ میں جب ایک مغنیہ زیارت کو چلی گئی تھی اور دربار سے غیر حاضر تھی پھر ۲۳۶ھ اور ۲۳۷ھ میں اور آخری بار ۲۴۷ھ میں مگر ہر مرتبہ اسکو ناکامی ہوئی۔ بیلوں نے مزار کے قریب پہنچتے ہی ہر ممکن تشدد کے باوجود آگے بڑھنے سے انکار کردیا اور فوج نے خود اس کام کو کرنا چاہا تو عقیدت مند سامنے آگئے۔ عباسی اپنی کمانوں سے جو تیر چھوڑتے وہ اس طرح پلٹ کر آتے کہ خود ان کے سینے چھد جاتے۔ اس طرح ایک بڑی تعداد کیفر کردار کو پہنچ گئی اور اسکو مایوس ہوکر واپس ہونا پڑا۔

اور اسکے بعد ہی متوکل کو اسکے بیٹے منتصر کے اشارے پر ترک غلاموں نے ہلاک کردیا کیونکہ اب وہ علی اور اولاد علی کے ساتھ فاطمہ زہراؑ کی شان میں بھی گستاخانہ الفاظ استعمال کرتا تھا جسکو منتصر نے سن لیا تھا اور بار بار روکنے کے باوجود وہ نہ مانا تو منتصر نے اسکو موت کے گھاٹ اتروادیا۔
منتصر نے تخت نشین ہوتے ہی فوج کی وہ چوکیاں ہٹوادیں جو زائرین کو روکنے کیلئے متوکل نے متعین کی تھیں اور ۲۴۷ھ میں روضہ اطہر کی تعمیر بھی کروائی

جو تلافی مافات تھی مگر ابھی متوکل کے حاشیہ بردار زندہ تھے۔ انہیں منتصر کا یہ عمل نہ بھایا۔ انہوں نے اتنی کمزور تعمیر کی کہ ۹۔۱۰ ذی الحج ۲۷۳ھ کو اسکی چھت دفعتاً گر پڑی۔ مخصوصی کے ایام تھے۔ اس سانحے سے ان گنت زائرین دب کر شہید ہوگئے۔

دس سال بعد ۲۸۳ھ میں محمد بن زیدوالی طبرستان نے چوتھی بار روضہ مقدس کی تعمیر کرائی۔

"بلاد عجم سے بہت سامان انہوں نے اندونوں روضوں کی مضبوط عمارت بنانے کیلئے بھیجے۔ حائر مقدس پر بلند قبہ بنوایا جس میں دو دروازے تھے۔ پھر حائر کے گرداگرد چہار دیواری کھڑی کی اور بہت سے مکانات بنوائے اور امکان بھر کربلا کے رہنے والوں اور مجاوروں کے ساتھ دادودہش کی۔" (۴۳)

۳۶۹ھ میں ایک ڈاکو ضبہ بن اسدی نے حرم کا خزانہ اور تمام ساز و سامان لوٹ لیا جسکو سلطان عضدالدولہ نے سخت سزا دی اور پھر روضہ حسینی کی پانچویں تعمیر بنی بویہ کے عظیم حکمراں شہنشاہ عضدالدولہ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

یوں تو تمام بویہی سلاطین حد درجہ راسخ العقیدہ شیعہ تھے مگر معزالدولہ اور عضدالدولہ کو ان سب میں ایک امتیاز حاصل تھا۔ وہ ہر سال نجف و کربلا کی زیارت کو جاتا اور اہل کربلا کیلئے خزانے کے منہ کھول دیتا۔

روضہ سیدالشہداء کی تعمیر کیلئے اس نے غیر معمولی التزام کیا، قبے کو از سر نو بنوایا اسکے رواقوں کو اراستہ و پیراستہ کرا کے مرصع کر دیا، ضریح اقدس کی خوبصورتی بڑھانے پر خاص توجہ کی اور اسکی تزئین پر بے شمار دولت صرف کی، حائر کے ارد گرد مکانات اور بازار بنوائے، شہر کے چاروں طرف بلند و بالا شہر پناہ تعمیر کرائی اور اسکو کسی قلعہ کی طرح محفوظ کر دیا، دور دراز سے نہر کاٹ کر کربلا پہنچوائی اور پانی کی فراہمی کے ساتھ روشنی کا بھی انتظام کیا۔

۳۷۱ھ میں جب وہ کربلا آیا تو درہموں سے بھرا ہوا پورا صندوق سادات میں تقسیم کر دیا، عوام اور مجاوروں کو دس ہزار درہم دئے اور نگراں روضہ کو ایک ہزار ایک لاکھ پاؤنڈ ستو اور خرمے اور پانچ سو کپڑے تقسیم کیے پھر نجف اشرف میں اس سے زائد عطیات دئے۔

اسی زمانے میں عمران بن شاہین نے سرزمین حائر پر مسجد اور رواق تعمیر کیا جو آج بھی رواق عمران کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک موقع پر منت مانی تھی جو پوری ہوئی اور اس نے نجف کربلا اور کاظمین میں مسجدیں بنوا دیں۔ نجف کی مسجد حرم مقدس کے رواق سے ملی ہوئی تھی جسکو شاہ عباس صفوی نے اپنی تعمیرات کے سلسلے میں رواق سے الگ کر دیا۔ مسجد عمران کے دو دروازے تھے: ایک باب طوسی کے پاس دوسرا صحن میں مگر اس کا نشان اب مٹ گیا ہے

بویہی سلاطین نے نجف اشرف اور کربلائے معلی کیلئے بڑی جائدادیں وقت کی تھیں۔ تاریخ کربلائے معلی کے مولف نے تاریخ عراق کے انگریز مولف لونگریک کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب ترکان عثمانی کا عراق پر قبضہ ہوا تو:۔

"سلطان مراد چہارم نے مفتی یحییٰ کو حکم دیا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی کا قبہ پھر سے تعمیر کیا جائے۔ اسکے لئے بے شمار اوقاف وقف کیے گئے۔ ان کا اکثر حصہ شیعوں کی جائدادوں پر مشتمل تھا۔"

خان پاشا کبیر نزد کربلا اور بازار نجف کا تکیۂ خالد ایسی ہی جائدادیں ہیں ورنہ کربلا اور نجف سے شیخ عبدالقادر جیلانی اور خالد بن ولید کا کیا کام۔

"ماہ ربیع الاول ۴۰۷ھ میں مشہد حسینی اور تمام رواق جل گئے۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ خدام نے دو بہت بڑی شمعیں روشن کی تھیں، یہ دونوں آدھی رات کو گر پڑیں جس سے سب کچھ جل اٹھا اور ہر طرف آگ پھیل گئی۔"

بلند و بالا گنبد اور رواق بھی اس آگ سے بچ نہ سکے، صرف حرم کا تھوڑا سا حصہ اور باہر کی شہر پناہ کی دیواریں بچ سکیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ایران و عراق میں شیعی اقتدار دم توڑ رہا تھا مگر شیعوں کے بچے کھچے شمشیرزن نزدیک و دور پائے جاتے تھے اور بغداد سے بویہی اثرات پوری طرح ختم نہیں ہوئے تھے۔ غزنوی سلطنت مضبوطی سے اپنے پاؤں جما چکی تھی اور خلافت بغداد سے اس کا رابطہ تھا۔ عباسی خلافت کوئی تین سو سال تک شیعوں کے رحم و کرم پر زندہ رہی تھی اب اسکو غزنوی سلطان کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی تو

دل میں دبی ہوئی چنگاریاں پھوٹ نکلی تھیں لیکن روضہ سید الشہداء کی جلالت دیکھ کر اس کا یارانہ تھا کہ انہدام مزار کا کوئی کھلا ہوا منصوبہ بنایا جاسکتا لہذا بعض دشمنان اہل بیت نے سازش کر کے یہ راستہ اختیار کیا اور مزار مقدس کو شدید نقصان پہنچا دیا۔ اس میں خلیفہ کی سازش کا شبہ اس لئے ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں آتش زنی کے واقعات دوسرے شیعی علاقوں میں بھی ہوئے لیکن بات چھپی نہیں رہتی۔ ہر طرف ایک ہلچل پڑ گئی۔ قادر باللہ صورت حال سے گھبرا گیا اور اس نے ابن سہلان کو وزیر اعظم مقرر کر دیا جس سے امید تھی کہ وہ حالات پر قابو پالے گا۔ یہ توقع پوری ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے روضہ اطہر پر توجہ دی۔ تباہ شدہ حصے کی مرمت کرائی اور اسکو پہلے کی طرح دیدہ زیب بنا دیا پھر حائر حسینی کی چہار دیواری نئے سرے سے تعمیر کرائی جو کربلا کی چھٹی تعمیر تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ۴۰۰ھ میں وہ سخت بیمار ہوا تھا تو اس نے نجف اشرف میں منت مانی تھی کہ وہ صحت یاب ہو گیا تو روضے کے چاروں طرف دیوار اٹھوا دے گا۔ یہ منت بھی اس نے پوری کی۔

اس طرح عقید تمندوں کے قلوب کی تالیف ہو گئی مگر اب شیعہ پھر ماضی کے حالات دوچار ہو رہے تھے۔ سلجوقیوں کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ دنیا بھول چکی تھی کہ کبھی بویہی سلاطین بغداد میں خلیفہ گر رہے تھے۔ اب شیعہ پھر دہشت گردی اور بے چارگی کا شکار تھے لہذا خلیفہ مسترشد کی نیت کربلا کی شان و شوکت دیکھ کر خراب ہو گئی اور ۵۲۶ھ میں اس نے اپنی فوج کے ساتھ چھاپہ مارا۔ حائر مقدس کے خزانے زر و جواہر اور بیش قیمت سامان سے بھرے ہوئے تھے۔ ان سب پر اس نے قبضہ کر لیا اور بغداد اٹھوا لے گیا۔ پھر اس کا ایک حصہ اس نے اپنے لشکر میں تقسیم کر دیا کہ قبر کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ شیعہ اسکے احسان مند ہیں کہ اس نے مزار اقدس کے ساتھ کوئی بے ادبی نہیں کی۔

ابن سہلان نے روضہ مطہر میں جو تعمیرات کی تھیں وہ بہت مضبوط تھیں۔ ۵۷۵ھ میں جب ناصرلدین اللہ تخت خلافت پر بیٹھا تو وہ اسی زار حالت میں تھیں مگر ناصر بڑا محب اہل بیت تھا۔ اس نے کھل کر اپنی شیعیت کا اعلان تو نہ کیا تھا لیکن

عباسیوں کے فلسفۂ خلافت کا دل سے قائل نہ تھا اتفاق سے زمانہ بھی اسکو ایسا ملا تھا کہ وہ اپنے بازوؤں پر اعتماد کر سکتا۔

سلجوقی سلطنت آخری ہچکیاں لے کر دم توڑ چکی تھی۔ ایوبی سرزمین حصوں بخروں میں بٹ چکی تھی البتہ علاء الدین محمد خوارزم شاہ میں کچھ دم خم تھا تو وہ خلافت بغداد پر قبضہ جمانے کی فکر میں تھا لہذا ناصرلدین اللہ نے فوجی طور پر بھی اپنے کو مضبوط کر لیا تھا اور اپنی حدود سلطنت میں ایک ہوشمند فرمانروا کی طرح امن بھی قائم رکھا تھا۔

آل رسولؑ کی عظمت کا وہ اس حد تک احترام کرتا تھا کہ کاظمین کو اس نے جائے امن قرار دے رکھا تھا۔ کوئی مجرم بھی وہاں پناہ لے لیتا تو خلیفہ اس کا مواخذہ خود امام عالی مقام پر چھوڑ دیتا۔ اس نے تمام عتبات عالیہ کی تزئین پر توجہ دی۔ سامرہ میں جالی دار سرداب بنوایا اور جالیوں پر آیات کندہ کرائیں۔

زائرین کی تعداد پچھلے ادوار میں گھٹ گئی تھی مگر ناصرلدین اللہ نے اتنی سہولتیں فراہم کیں کہ وہ سیکڑوں کے بجائے ہزاروں میں کربلا و نجف پہنچنے لگے۔ ابن سہلان کا بنایا روضہ اگرچہ مضبوط تھا لیکن ناصر کی ہدایت پر اسکے وزیر محی الدین محمد مقدادی نے دیواروں پر ساکھو کی لکڑی چڑھوا دی۔ روضے کے حسن و جمال میں اضافہ کیا اور حریر و دیبا کے نئے پردوں سے آراستہ کیا۔ اس طرح ناصرلدین اللہ مشاہد کے معماروں میں شامل ہو گیا۔

ابن بطوطہ نے ۷۲۷ھ میں روضہ مقدس کو دیکھا تھا۔ اس نے لکھا۔

" پھر ہم نے شہر کربلا کی طرف سفر کیا جہاں امام حسینؑ کا مزار مبارک ہے۔ یہ چھوٹا سا شہر ہے جسکے چاروں طرف کھجور کے باغ ہیں۔ فرات کا پانی انہیں سیراب کرتا ہے۔ کربلا میں ایک بہت بڑا مدرسہ ہے اور ایک پاکیزہ جگہ، جہاں آنے جانے والوں کی ضیافت کی جاتی ہے۔ روضے کے دروازے پر حاجیوں اور خدام کا ہجوم رہتا ہے۔ ضریح پر سونے اور چاندی کی قندیلیں آویزاں ہیں اور دروازوں پر ریشمی پردے ہیں "۔ (۱۰۴)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن سہلان کی تعمیر اور خلیفہ ناصرلدین اللہ کی

آرائش ابھی باقی تھی، حالانکہ اس مدت میں چنگیزی تلواروں نے عراق و ایران کی سرزمین کو خون سے لالہ زار کر دیا تھا، مسلم سلاطین کی جگہ ہلاکو خاں کی اولاد نے لے لی تھی مگر مشاہد مقدسہ سیاسی انقلابات اور آشوب زمانہ میں بالکل محفوظ رہے تھے بلکہ غازاخان اور خدا بند خان نے تو مشاہد کی گرانقدر خدمات انجام دی تھیں۔ اسکے بعد آٹھویں صدی ہجری کے اواخر میں سلاطین جلائر کا دور آگیا جن کا پایہ تخت ہلاکو خاں کے وقت سے تبریز چلا آرہا تھا۔

تاتاریوں کے بارے میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان میں سے جس کسی نے جو بھی عقیدہ اختیار کیا ہو لیکن وہ سب محب اہل بیت تھے اور ہلاکو خاں کی اولاد تو غازان خاں کے بعد سے علی الاعلان شیعہ ہو گئی تھی۔ جلائر انہیں کی ایک شاخ تھے۔ انہوں نے خاندان ہلاکو کے کمزور پڑنے کے بعد عراق و خراسان کی حکومت حاصل کی تھی۔ اس خاندان کا بانی شیخ حسن تھا۔ اسکے انتقال پر سلطان اویس جلائری تخت نشین ہوا۔

سلطان اویس نے اپنے غلام مرجان کو بغداد کا حاکم بنایا تھا جو باغی ہو گیا اور جب اویس اسکی سرکوبی کیلئے تبریز سے روانہ ہوا تو مرجان نے کربلا جاکر روضہ اقدس میں پناہ لے لی اور اسی دوران وہ منارہ تعمیر کرایا جو ماذنہ عبد کے نام سے مشہور ہے پھر اس نے اپنی ساری دولت اور جائداد سب امام کیلئے وقف کر دی۔

سلطان اویس جلائری جب بغداد فتح کر کے کربلا پہنچا اور اسکو یہ حقیقت معلوم ہوئی تو اس نے مرجان کو بتصدق امام علیہ السلام معاف کر دیا اور پچھلے تمام اعزازات بھی بحال کر دئے لیکن اسکے ساتھ ہی یہ احساس پیدا ہوا کہ جو کام خود اسکو کرنا چاہئے تھا وہ اسکے غلام نے انجام دیا۔

اسکے فوراً بعد اس نے حائر مقدس کو نئے سرے سے بنانے کا حکم دیدیا۔ یہ کام جاری رہا اور اسکے بیٹوں شاہ حسین اور شاہ احمد نے اسکو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ کربلائے معلی کی آٹھویں تعمیر تھی۔

۷۹۵ھ میں بعض گروہوں نے کربلا والوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ امیر تیمور نے انکی سرکوبی کی اور سارا مال و متاع واپس کرایا۔ ۷۹۶ھ میں وہ کربلائے

معلی کی زیارت کو آیا تو اس نے مزار مقدس کے گرد ایک گنبد نما حلقہ بنوا دیا۔

اہل بیت کرام کے یہ عقیدت مند یقیناً دنیا و آخرت میں سرخرو رہیں گے لیکن کسی دور میں دشمنوں کی بھی کمی نہیں رہی۔ نویں صدی ہجری کے اوائل میں غالیوں کا ایک گروہ پیدا ہوا جن میں کچھ شیعہ بھی تھے۔ انہوں نے جنوبی عراق میں ایک حکومت قائم کر لی۔ فلاح بن محمد آل مشعشع ان کا بانی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ حضرت علیؑ کی روح اسکے اندر حلول کر گئی ہے۔ محمد بن فلاح اس کا بیٹا تھا اور علی بن محمد پوتا۔ یہ ایسے دعووں میں ایک دوسرے پر سبقت کر گئے۔ کوئی مہدی ہونے کا مدعی ہوا اور کوئی الوہیت تک پہنچ گیا۔

ان کے ہاتھوں مشاہد مقدسہ کو بڑے نقصانات ہوئے۔ انہوں نے اس پتھر کو جلا دیا جو قبہ امیرالمومنین کو گھیرے میں لیے تھا۔ فلاح ۸۵۴ھ میں اور محمد بن فلاح ۸۶۶ھ میں مر گیا تو علی بن محمد جانشین ہوا جو اپنے کو مولیٰ علی کہتا تھا اور باپ دادا کی طرح نہایت شقی القلب تھا: علی خدا ہیں اور خدا کو موت نہیں آتی۔ وہ پوری قہر سامانی سے اٹھا تو ان حاجیوں کو مار ڈالا جو زیارت نجف کیلئے آئے تھے اور نجف و کربلا دونوں کو لوٹ لیا۔ آخر صفویوں نے ان کی سرکوبی کی اور راہ راست دکھائی۔

ان کے ہاتھوں جو تاراجی ہوئی وہ یقیناً حد سے زائد اور افسوسناک تھی مگر شیعہ سلاطین نے اسکی تلافی کر دی۔ ان میں سلطان حسین، شاہان قراقویونیہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قرایوسف، اسکندر و جہاں شاہ ابن قرایوسف نے تو روضہ حسینی کی عظمت و رونق بڑھانے میں اپنی حکومت کے خزانے لٹا دئے اور مشاہد کی گہما گہمی دوبالا کر دی۔

اس طرح تخریب کے دوش بدوش تعمیر بھی چلتی رہی لیکن نویں صدی ہجری کے بعد ساڑھے تین سو چار سو برس تک تعمیر ہی تعمیر ہوئی۔

سلطان اویس جلائری نے روضہ مقدس کی جو تعمیر کرائی تھی وہ بڑی حد تک مکمل تھی پھر بھی شاہ اسمعیل نے صفویہ حکومت کے قیام کے بعد نجف و کربلا دونوں کی مرمت کرنے کی سعادت حاصل کی اور آبادی کیلئے خاصے انتظامات عمل میں لایا

ایک نہر بنوائی جو نہر شاہ کہلاتی ہے ۔ امام موسی کاظمؑ کی ضریح کے گرد ایک عالی شان عمارت تعمیر کرائی ۔ تحائف وہدایا، جو اس نے مشاہد کی نذر کیے وہ بہت بیش قیمت تھے ۔ روضہ اقدس سید الشہداء پر زربفت کے غلاف چڑھوائے ۔ سونے کی قندیلیں لٹکوائیں ۔ دیواروں پر نقش ونگار بنوائے اور فرش کو آراستہ کیا ۔

مجاوروں کو اس نے جو نذرانے دئے وہ بھی گرانقدر تھے ۔ زائرین اور غرباء میں درہم ودینار تقسیم کیے ۔

وہ جب اپنے دارالحکومت میں واپس ہوا تو تمام ملک سے نجاروں اور کاریگروں کو یکجا کرکے مشہدوں کیلئے نئے نقشی صندوق بنوائے اور پرانے صندوقوں کو ہٹواکر مزاروں پر نئے صندوق نصب کرائے ۔ اس نے اپنے ملک کی تعمیر کے ساتھ ساتھ خانوادہ رسالت کے ان علامیوں کے فراموش نہ کیا لیکن عراق پر اسکی حکومت زیادہ دن برقرار نہ رہ سکی اور بقول مسٹر لونگریک مولف فور سنچریز:

"ترکی کا شاہ سلیم متضاد صفات کا حامل تھا ۔ نئی شیعی حکومت کا جاہ وجلال عظمت وشوکت اسکو حد سے زیادہ شاق گزرتی تھی ۔ اس نے سنی مذہب کی حمایت میں اعلان جنگ کردیا اور اپنی حکومت کے ابتدائی مہینوں میں شیعوں کا بری طرح قتل عام کیا، جہاں بھی انہیں پایا ہلاک کردیا ۔" (۴۵)

مذہب کے نام پر اس نے عراق حملہ کردیا ۔ فریقین کے مابین کئی جنگیں ہوئیں ۔ ترکی افواج کو خود عراق کے اندر سے بھی مسلسل مدد مل رہی تھی جسکے نتیجے میں عراق پر ترکی کا قبضہ ہوگیا لیکن سلطان سلیمان قانونی نے جب ۹۴۱ھ میں عراق کا اقتدار اپنے ہاتھوں میں لیا تو حالات کے تقاضے سے اس نے سلطان سلیم کی پالیسی پر عمل نہیں کیا ۔ اسکی نظر میں مشتعل شیعوں کے جذبات بھی تھے اور ان عظیم ہستیوں کا دبدبہ بھی جنکے نام پر لوگ گردنیں کٹوادینا مقصد حیات سمجھتے تھے لہذا اس نے جہانبانی میں عصبیت کے خانے کو خالی چھوڑ دیا ۔

"سلطان سلیمان عثمانی ۱۸ جمادی الاول ۹۴۱ھ کو بغداد میں داخل ہوا تو اس نے روضہ امام موسی کاظمؑ اور امام محمد تقیؑ کے روضوں کی زیارت کی پھر امیرالمومنین اور امام حسینؑ کے روضوں کی زیارت کا قصد کیا ۔ ان دونوں

اماموں کی روحوں سے مدد کی درخواست کی اور جب نجف کی زیارت کو چلا تو قبہ مبارک پر نظر پڑتے ہی چار فرسخ پہلے ہی گھوڑے سے اتر کر پاپیادہ ہوگیا ۔ بعض ساتھیوں نے جب اس کا سبب دریافت کیا تو کہا: قبہ پر نظر پڑتے ہی میرے جسم میں تھرتھری پیدا ہوگئی، گھوڑے پر بیٹھنے کی طاقت ہی باقی نہیں رہی ۔ کسی نے کہا ابھی نجف بہت دور ہے، آپ پیدل نہیں جا پائیں گے ۔ سلطان سلیمان نے کہا، میں قرآن مجید سے تفاول کرتا ہوں جب میں نے مصحف کھولا تو یہ آیت نکلی: فاخلع نعلیک انک بالواد المقدس طوی ۔ سلطان کچھ دور گھوڑے پر چلتا اور کچھ دور ننگے پیر ۔ اسی حالت میں پورا راستہ طے کرکے روضہ نجف میں داخل ہوا ۔" (۴۶)

یہ بیان سلطان سلیمان کی عقیدت کا مظہر ہے جسکی تردید ایک فاضل کام ہوگا کیونکہ اہل تسنن میں ہر زمانے میں ایک گروہ ایسا پایا جاتا رہا ہے جو آل رسول کی عظمت کا قائل تھا اور سنی عقیدے کے صوفیاء کا تو اصل مسلک ہی یہی تھا ۔

سلطان سلیمان قانونی نے کاظمین کی مسجد کو مکمل کیا جو شاہ اسمعیل صفوی نے بنانا شروع کی تھی ۔ پھر تمام مشاہد کیلئے جائدادیں بھی وقف کیں ۔ اسکے ساتھ ہی سنی وقف بھی بنائے مگر سو برس بعد سلطان مراد نے تمام شیعہ اوقاف کو سنی وقفوں میں شامل کردیا بلکہ شیعوں کے جو دوسرے وقف تھے وہ بھی سنی اوقاف کا حصہ بنا دئے ۔

سلطان سلیمان نہ صرف شیعوں کی طرح زیارات کو جایا کرتا تھا بلکہ کربلائے معلی کی اصلاحات میں اس نے بعض بیش بہا خدمات بھی انجام دیں ۔ دریا کا پانی چڑھنے سے کبھی کبھی شہر میں پانی بھر جاتا تھا اس نے کنارے کنارے بند بنوادئے جو آج بھی روف سلیمانی کہلاتے ہیں، نہر حسینیہ کی درستی کرائی اور روضہ اقدس کیلئے نذرانے بھی پیش کیے ۔

مشاہد کے سلسلے میں شاہان صفویہ کا مذہبی شغف تاریخ فراموش نہیں کرسکتی ۔ اسمعیل صفوی کے بعد شاہ طہماسپ نے اپنے پندرہ سالہ دور میں کئی مرتبہ حائر حسینی پر توجہ کی ..... حائر میں منارہ عبد کی مرمت کرائی بلکہ تقریباً تعمیر نو کی ،

روضہ مطہر کے اندرونی حصوں کو ٹھیک کرا کے انکی ارائش کی، حرم مبارک کی مسجد میں اضافہ کرایا، صحن حسینی میں شمال کی جانب وسعت دی۔

اسی طرح قبل و بعد کا ہر بادشاہ کچھ نہ کچھ کرتا رہا۔ ۱۰۳۲ھ میں شاہ عباس اعظم نے دوبارہ بغداد فتح کرلیا تو اس نے زیارت کا شرف حاصل کیا۔ اسکے جذبہ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ایک بار وہ امراء و وزراء کو لے کر اصفہان سے خراسان تک پیادہ گیا اور مشہد مقدس کی زیارت بجالایا۔

شاہ عباس ایران کی آبرو تھا۔ اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ امور مملکت سے بہت کم وقت ملتا پھر بھی تا حیات دامے درمے سخنے اور قدمے وہ عتبات عالیہ کی خدمات کی عزت حاصل کرتا رہا۔

نادر شاہ کو بعض مورخین نے خونی اور لٹیرا لکھا ہے۔ اس تعریف میں اسکے کئی پیش رو بھی آتے ہیں۔ جیسے صاحبقراں امیر تیمور، سلطان محمود غزنوی۔ محمود کو تو بانس پر اس لئے چڑھایا گیا کہ وہ سخت شیعہ دشمن تھا۔ یقیناً نادر شاہ میں ایسی کوئی عصبیت نہ تھی۔ کاش وہ ایسا ہوتا تو احمد شاہ ابدالی سازش کرکے اسکو قتل نہ کراسکتا۔ دوسرا امتیاز محمود کو یہ حاصل تھا کہ اس نے فقہ حنفی پر ایک کتاب لکھی تھی مگر خزانے کو بھرتا رہا تھا اور مرتے وقت اسکو دیکھ کر ڈاڑھیں مار مار کر روتا تھا۔ اسکے مقابلے پر نادر شاہ کو دیکھا جائے تو جو دولت وہ ہندوستان سے لایا تھا اس کا بڑا حصہ اس نے نجف اور مشہد امام رضا کی نذر کردیا تھا۔ اسکی بیوی دختر سلطان حسین صفوی نے ایک عالیشان مسجد بنوائی تھی جسپر زر کثیر صرف کیا تھا۔ کربلائے معلی پر بھی اس نے خاصی توجہ کی اور وہاں بھی اپنی دولت کا ایک حصہ صرف کیا۔

سلاطین قاچار کا عہد بھی دینی سعادت میں شاہان ماسبق سے پیچھے نہیں رہا۔ قبہ مبارک پر ابتک کاشانی نقش و نگار بنے ہوئے تھے، سلطان آغا محمد خاں، پہلے قاچاری فرمانروا نے ۱۲۰۷ھ میں اسکو سونے سے مزین کیا اور مناروں پر بھی سونے کے پتر چڑھوائے مگر وہ پتر شاید کچھ پتلے تھے اس لئے کالے پڑنے لگے۔ آغا محمد خاں کے بعد فتح علی شاہ تخت بیٹھا اور اسکو خبر ہوئی تو اس نے وہ پترا کھڑوا کر انکی جگہ سونے کی موٹی اینٹیں جڑوادیں۔ اسی طرح کاظمین کے دونوں قبوں کو بھی سونے سے

منڈھوادیا۔ اسکے بعد ہی نجد سے وہابیت کا طوفان اٹھا اور اس نے کربلا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

مسلمانوں کو حدیث و سنت پر عمل کرتے ساڑھے دس یا گیارہ صدیاں بیت چکیں، شیعوں کے آئمہ اثنا عشر، اہل السنت والجماعت میں امام ابو حنیفہ امام مالک، امام شافعی امام احمد بن حنبل، امام غزالی امام فخرالدین رازی، صوفیائے کرام میں داتا گنج بخش، خواہ اجمیری، لعل شہباز قلندر اور ان پر مستزاد غوث جیلانی اور بڑے بڑے برگزیدہ بزرگ ترویج اسلام میں زندگیاں گزار کر جاچکے تو نجد میں محمد بن عبدالوہاب پیدا ہوئے اور انہوں نے نعرہ لگایا

محمد بن عبداللہ صل اللہ علیہ والہ وسلم ہمارے ہی جیسے انسان تھے ہماری ہی طرح پیدا ہوئے اور ہماری طرح مرگئے، نہ پیدائش سے پہلے ہمیں کوئی نفع و نقصان پہنچا سکتے تھے اور نہ مرنے کے بعد۔ عبد کا براہ راست تعلق معبود سے ہے۔ ہر واسطہ بدعت ہے۔ انسان کے مرتے ہی اس کا نامہ اعمال بند ہوجاتا ہے۔ تلاوت کلام پاک یا خیر و خیرات سے اسکو کوئی ثواب نہیں پہنچتا۔ نذر و نیاز بدعت، نشان قبر باقی رکھنا بدعت وغیرہ وغیرہ۔

یعنی کھلے لفظوں میں اعلان کیا کہ ابتک اکابر امت نے جو تعلیمات دی تھیں وہ غلط تھیں، ابتک مسلمان جو کچھ کرتے رہے تھے وہ اصل اسلام کے خلاف تھا۔ یہ تین ساڑھے تین سو سال پہلے کا فلسفہ ہے جس کا آوازہ دولت کی ریل پیل کے ساتھ ہندوپاک میں گونج رہا ہے۔

نجد میں اکابر کی قبروں کا انہدام ان کے دائرہ اقتدار میں تھا لہذا اسکو انہوں نے کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ نجف اشرف اور کربلائے معلی کی تاراجی کے منصوبے بنانے لگے اور ۱۲۱۶ھ کے آخر میں ایک دن نجد کا لشکر عازم کربلا ہوگیا۔ مسٹر لونگریک لکھتا ہے۔

"ماہ نیساں کی ۲ تاریخ کی شام ہوتے ہوتے خبر پھیل گئی کہ وہابی کربلا کے قریب آپہنچے ہیں جبکہ شہر کے باشندے نجف میں زیارت بجالارہے تھے۔ کربلا میں جو لوگ رہ گئے تھے انہوں نے جلدی سے شہر کے دروازے بند کرلیے مگر وہابی جو کئی ہزار

سواروں کی تعداد میں تھے وہاں آکر اتر پڑے۔

انہوں نے اپنی طاقت کو تین حصوں میں تقسیم کرلیا اور شہر پناہ کی دیوار میں ایک جگہ سوراخ کرلیا۔ اسکے اندر سے داخل ہو کر انہوں نے شہر کے دروازے کھول دئے اور سب کے سب اندر داخل ہوگئے۔ کربلا کے باشندوں پر ایک دہشت طاری تھی۔ وہ بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ تندخو وہابی سیدھے ضریح مقدس کے پاس پہنچے اور اسکو منہدم کرنا شروع کردیا۔ ہر چیز توڑ پھوڑ ڈالی..... بڑے بڑے آئینے چکنا چور کردئے اور حرم میں جتنی قیمتی اور نفیس اشیا تھیں، بادشاہان عرب اور شاہان فارس کے نذر کئے ہوئے تحفے اور ہدایا تھے، سب ہی لوٹ گئے۔ اسی طرح دیواروں میں جو قیمتی پتھر تھے چھت میں جو سونا تھا شمع دان قالین بیش قیمت جھاڑ فانوس مرصع دروازے غرض کہ اس قسم کی جتنی بھی چیزیں تھیں توڑ تاڑ کر باہر ڈھیر کردی گئیں۔ (۴۷)

عراق پھر ترکوں کے قبضے میں آچکا تھا۔ ترکی فوج جب تک بغداد سے آئے وہ اپنا کام کرکے چلتے بنے۔

کربلا جائے امن تھا۔ مسلح محافظ حرم کے اندر داخل بھی نہ ہوسکتے پھر بھی نہتے شہریوں نے مدافعت کی۔ کوئی پچاس آدمی وہاں قتل ہوئے اور پانچ سو آدمی باہر صحن میں مارے گئے۔ پھر وہابی شہر میں داخل ہوئے۔ ایک ایک گھر کو انہوں نے لوٹ لیا۔ جو سامنے پڑا اسکو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ ایسے مقتولین میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ اس قتل عام میں ایک افغانی ملا کے بیٹے بھی قتل ہوئے تھے۔ اس ملا نے نجد جا کر شاہ عبدالعزیز کو قتل کردیا۔

بعض مورخین نے اس لشکر کی تعداد بیس ہزار لکھی ہے اور ان اشیاء کی تفصیل بھی دی ہے جو وہابی لے گئے تھے اور جنکی قیمت بے حساب تھی۔ ۱۰ محرم ۶۱ھ کے بعد یزید کے جانشینوں کی کربلا پر یہ سب سے بڑی یلغار تھی جس سے امام حسینؑ کا روضہ بالکل ویران ہوگیا لیکن جلد ہی کربلا سے بھاگے ہوئے لوگ واپس آگئے۔ انہوں نے جس حد تک ممکن ہوسکا روضۂ حسینی کی مرمت کی اور آہستہ آہستہ اسکی رونق بڑھنے لگی۔

کہا جاتا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ہندوستان کا کوئی بادشاہ کربلائے معلی کی زیارت کو آیا تھا۔ وہ اس حالت کو دیکھ کر بے چین ہوگیا۔ اس نے خوبصورت بازار تعمیر کرائے، خانماں برباد لوگوں کیلئے مکانات بنوائے، شہر کے چاروں طرف ایک بہت مضبوط شہر پناہ تعمیر کرائی جس میں حسب ضرورت برج اور دیدبان بنوائے، برجوں میں آلات دفاع نصب کرائے تاکہ پھر کوئی وہابی قریب پہنچنے کی جرئت نہ کرسکے۔

ہندوستان میں اس وقت اودھ کے علاوہ کہیں بادشاہت نہ تھی اور شاہان اودھ نے پہلے دن سے مشاہد مقدسہ میں دلچسپی لی تھی۔ عزاداری سے انکا شغف اور ولائے اہلبیت کسی ثبوت کی محتاج نہیں۔ اٹھارویں صدی عیسوی سے قبل نواب آصف الدولہ نے نہر آصفی بنوائی تھی، جسکی مرمت محمد علی شاہ اودھ نے کرائی اور اسکو آب رسانی کے قابل بنایا۔

اودھ میں سعادت علی خاں غازی الدین حیدر، نصیرالدین حیدر اور محمد علی شاہ کے ادوار یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔

محمد علی شاہ نے حضرت حر کا روضہ بنوایا اور امجد علی شاہ نے آقائے محمد حسین نجفی (جواہر الکلام) کے ذریعہ کربلا کی خدمت کے بعد حضرت عباس کا روضہ مطلا کرایا پھر کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کے مزارات تعمیر کرائے، نجف میں نہر حسینی نکلوائی اور مسجد کوفہ کا مینار تعمیر کرایا۔

کربلا کے قتل وغارت سے پورے عالم اسلام میں تہلکہ پڑگیا تھا۔ سلطان فتح علی شاہ کو بھی خبر مل چکی تھی اس نے تھوڑے وقفے سے اس غارت گری کا بدلہ لیا....

ایسے میں شیخ جعفر آل کاشف الغطا نے شیعی حلقوں کا دورہ کیا اور ہر طرف سے عطیات کے انبار لگ گئے۔

۱۲۳۲ھ میں سلطان فتح علی شاہ کے بیٹے مرزا محمد علی گورنر کرمان شاہ نے حائر مقدس کی مرمت کرائی اور حرم مطہر کی تزئین میں زر کثیر صرف کیا۔ پھر فتح علی شاہ کی ملکہ نے دونوں مناروں پر سونا منڈھوایا۔ آگے چل کر ناصرالدین قاچار نے قبہ کو مطلا کرایا اور صحن کے مغربی حصہ کو وسیع کرایا پھر ۱۲۷۶ھ میں ناصرالدین قاچار نے

شیخ عبدالحسین طہرانی کو رقم خطیر کے ساتھ کربلائے معلی روانہ کیا۔ انہوں نے قبہ حسینیہ پر پھر سے سونا چڑھوایا۔ ایوانات پر کاشی کے نقش و نگار بنوائے۔ فرش کی درستی کر کے قبر امام کے سرہانے صحن کو وسعت دی اور صندوق چونکہ وہابیوں نے جلا ڈالا تھا لہذا اسکی جگہ نیا صندوق نصب کرا دیا۔ ناصر الدین قاچار نے کاظمین اور سامرا میں بھی بہت سی اصلاحات کیں۔

اسکے بعد پورے مشرق وسطی میں مذہبیت کم ہونے لگی۔ عتبات عالیہ میں زائرین کو تعداد بھی گھٹنے لگی نصف صدی تک کوئی اصلاح یا مرمت نہ ہو سکی۔ ایسے میں ۱۳۵۴ھ میں تیسرا اور مشہور منارہ جو سلطان اویس جلائری کے غلام مرجان نے تعمیر کرایا تھا، حکومت عراق کے حکم سے بلا سبب منہدم کرا دیا گیا۔

یہ منارہ چھ سو برس سے روضہ سیدالشہداء کی رونق بنا ہوا تھا۔ اسکے انہدام کی بجز اسکے کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس سے جو اوقاف وابستہ ہیں انہیں سنی اوقاف میں شامل کر دیا جائے۔ یہی ہوا مگر شیعہ احتجاج کے علاوہ کر ہی کیا سکتے تھے۔

اسکے ایک سال بعد بوہری پیشوا سیدنا ملا طاہر سیف الدین کربلا کی زیارت کو آئے تو آپ نے اصلاحات و تعمیر پر بڑی دولت خرچ کی اور شیعوں کی تالیف قلب اور اجر آخرت کیلئے مغربی منارہ کو اپنے صرف سے تعمیر کرا دیا جو پہلے سے زائد پر شکوہ ہے

پھر ۱۳۵۸ھ میں آپ نے ضریح مقدس پر چاندی کی نئی جالی نصب کرائی جو ہندوستانی صنعت کا بہترین نمونہ ہے۔

۱۳۶۰ھ میں آپ نے دونوں مناروں پر نیچے سے اوپر تک سونا منڈھوایا اور ان گرانقدر خدمات کی یاد تازہ کر دی جو داعی صغیر محمد بن الحسن الحسنی شاہ طبرستان نے ۲۸۳ھ میں انجام دی تھیں۔

کربلا نجف کے بعد دوسرا علمی مرکز تھا جس کا تذکرہ انگریز مورخین نے کیا ہے اور مختلف ممالک کے سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں جسکی تفاصیل درج کی ہیں مگر اب مدرسہ زینبیہ، مسجد ناصر الدین، مدرسہ صدر اعظم نوری، جامع راس الحسین، جامع سردار حسن خاں، مدرسہ سردار حسن خان کے صرف نام لیے جا سکتے ہیں کچھ مسجدیں باقی ہیں جن میں طلباء کو درس دئے جاتے ہیں۔

روضہ ابی الفضل العباس

تدفین شہداء کا شرف یقیناً بنی اسد کو حاصل ہے لہذا حضرت عباس کو بھی انہیں لوگوں نے دفن کیا۔ اسکے بعد اس شرف کیلئے کسی کا نام نہیں آتا لیکن ایک روایت تذکروں میں پائی جاتی ہے کہ ابراہیم بن مالک اشتر جب تعمیر مشہد حسین کیلئے کربلا آئے تو وہ حضرت عباسؑ کی قبر پر جا کر کھڑے ہوئے۔ بچپن کے ساتھی تھے آپس میں بے تکلف بھی رہے تھے۔ انہوں نے سلام کے بعد حضرت عباسؑ کو مخاطب کر کے کہا

"عباسؑ! حسین تو امام تھے۔ تم تو امام نہیں تھے کاٹ کر رکھ دیتے ان بزدلوں کو۔"

ایک لمحے کیلئے سناٹا سا طاری ہو گیا پھر حضرت عباسؑ کی آواز سنائی دی۔

"کیا کرتا ابراہیم! آقا نے لڑنے کی اجازت ہی نہیں دی۔ پانی لانے کا حکم دیا تھا وہ لایا تو مگر خیام تک پہنچا نہ سکا!"

مالک اشتر کا بیٹا بڑا بہادر تھا مگر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اسکے بعد اس سوال کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ حضرت ابوالفضل کا روضہ پہلے کس نے بنوایا؟

پھر کسی مومن کے جذبہ عقیدت کا تصور کیا جائے تو کربلا کے ساتھ نمایاں طور پر جو نام ذہن میں ابھرتے ہیں ان میں امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ سرفہرست ہیں اس لئے پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ جس نے روضہ امامؑ کی تعمیر کی وہ حضرت عباسؑ کے مزار کو نظر انداز نہ کر سکا ہوگا اسکے دل میں سیدہ کونین کی رضا کا احساس ضرور پیدا ہوا ہوگا جو حضرت عباسؑ کی زیارت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی لہذا مزار اقدس حسینی کے بیشتر معمار روضہ حضرت عباس کے بھی معمار ہیں۔

حائر مقدس کے شمال مشرق میں تین سو میٹر کے فاصلے پر سپہ سالار لشکر کربلا کا روضہ واقع ہے جو ساحل فرات سے زیادہ دور نہیں اور اپنے مقام وقوع کے لحاظ سے آج بھی نوعیت جنگ کی پوری داستان بیان کرتا ہے۔

روضۂ اقدس کی عظیم عمارت سنگ رخام کی بنی ہوئی ہے ۔ قبر مطہر پر چاندی کی جالی لگی ہے ۔ چاروں طرف حرم حسینی کی طرح بڑے بڑے رواق ہیں جو صاحب مزار کی جلالت کو آشکار کرتے ہیں ۔

عالی شان گنبد کے کاشانی نقش ونگار اپنے فن کا شاہکار ہیں ۔ قبے کے آگے دو نہایت خوبصورت اور سربلند منارے ہیں ان پر بھی کاشانی نقوش بنے ہوئے ہیں اور چوٹی سونے سے منڈھی ہوئی ہے ۔ مناروں کے مقابل باب قبلہ پر ایک بڑا برج بنا ہوا ہے جس کا گھڑیال بجتا ہے تو پورا شہر گونج اٹھتا ہے ۔ صحن چاروں طرف بلند دیواروں سے گھرا ہوا ہے جو اگرچہ بہت وسیع نہیں ہے مگر کشادہ اور خوبصورت معلوم ہوتا ہے ۔

گنبد کے نیچے جو ضریح ہے وہ نقرئی ہے لیکن اندر قدیم فولادی ضریح رکھی ہوئی ہے ۔ ضریح کے اوپر ڈھال تلوار اور ایک مشکیزہ رکھا ہوا ہے جو آپ کے منصب کا ترجمان ہے ۔

حضرت عباسؑ کی صداقت وجلالت زباں زد عام ہے ۔ آپ مجیب الدعوات مشہور ہیں، کوئی آپ کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا ۔

کاظمین شریفین

تعمیر بغداد سے فراغت پاکر منصور دوانیقی نے دریائے دجلہ کے دوسرے کنارے چھ میل کے فاصلے سے ایک قبرستان بنوایا تھا جس کا نام باب التین رکھا تھا جو آگے چل کر قبرستان قریش کے نام سے موسوم ہو گیا ۔ امام موسی کاظمؑ اور امام محمد تقیؑ جب اس قبرستان میں مدفون ہوئے تو وہ کاظمین کے نام سے مشہور ہو گیا ۔

دور بنی عباس کے عروج تک انکی قبروں پر کوئی سائبان تک نہ تھا ۔ بنی بویہ کے استقرار حکومت پر سب سے پہلے معزالدولہ نے اسپر توجہ کی اور روضے کی تعمیر کرائی پھر جلال الدولہ نے اس میں اضافے کیے ۔ ۴۴۳ھ کے شیعہ سنی فساد میں سنیوں کا سرغنہ مارا گیا اور سنی اسکو دفن کرنے کیلئے اس قبرستان میں لائے تو انہوں نے اشتعال میں تمام قیمتی سامان لوٹ لیا اور روضہ مقدس کو آگ لگادی جس سے لکڑی کا گنبد جل گیا ۔ ۴۷۹ھ میں ملک شاہ سلجوقی نے مرمت کراکے پھر مزین کر دیا

۶۲۲ھ میں الظاہر بامراللہ کے عہد میں گنبد پھر جلایا گیا ۔ گنبد کی نئی تعمیر اس نے شروع اور اسکے جانشین مستنصر باللہ نے مکمل کی ۔ ہلاکو خان کے بغداد پر حملے میں کاظمین کو بھی نقصان پہنچا مگر روضہ اسی حالت میں رہا ۔ عقیدتمندوں نے معمولی مرمت کرادی ۔ ۹۲۶ھ میں شاہ اسمعیل صفوی نے اپنے جداعلی کی خدمت کی سعادت حاصل کی اور روضے کو شایان شان بنادیا ۔ اس کا تاریخی پتھر آج تک موجود ہے ۱۲۵۵ھ میں محمد شاہ قاچار نے اسکو زروجواہر سے مرصع کیا اور ایک عالی شان بارگاہ بنادیا ۔

روضے کی چہار دیواری حجروں سمیت کاشانی کام سے مزین ہے ۔ صحن کے سات دروازے ہیں : درقبلہ ، درصافی ، درصاحب العصر ، درقریش ، درمسجد ، درفرہادیہ اور باب المراد ۔ صحن پکا، وسیع اور شاندار ہے ۔ وسط صحن میں روضہ مبارک واقع ہے جسپر پہلو بہ پہلو دو گنبد اور چار منارے ہیں جن پر سونے کے پتر جڑے ہوئے ہیں ۔ عمارت کے نیچے کا حصہ زمین سے ایک گز تک سنگ مرمر کا ہے ۔ اسکے اوپر کاشی کی گلکاری اور آئینہ بندی ہے ۔ اندر کے دروازے چوکھٹ بازو ٹھوس چاندی کے ہیں اور پٹوں پر سونے کے پتر جڑے ہوئے ہیں ۔ ایوان بلند اور طلائی ہے ۔ زیر قبہ نقرئی اور طلائی قندیلیں لٹکائی گئی ہیں اور زرنگار شامیانے کے نیچے فولادی ضریحیں نصب ہیں جنکے نقرئی جال پر چادریں پڑی رہتی ہیں ۔

مقدس ضریحوں کے شمال سنگ سفید کی عالی شان مسجد ہے ۔ نجف وکربلا کی طرح یہاں بھی خزانہ اور توشہ خانہ ہے ۔ دریائے دجلہ کے پل کے اس پار اس خونی دیوار کے آثار پائے جاتے ہیں جس میں بے گناہ سادات زندہ چنوائے جاتے تھے ۔ (۴۸)

سامرا

وہ شہر جس میں خانوادہ رسالت کی سطوت آخر دفن بھی ہے اور نظروں سے پوشیدہ بھی یہاں امام علی نقی اور امام حسن عسکری کے مزارات بھی ہیں اور وہ غار بھی واقع ہے جس میں حضرت حجت نے غیبت اختیار فرمائی تھی ۔

روضہ بادی النظر میں زیادہ پرشکوہ نہیں ہے لیکن جن ذوات مقدسہ سے اسکی وابستگی ہے انکی جلالت سے قریب پہنچتے ہی سر عقیدت سے جھکنے لگتے ہیں ۔ رواق روضہ میں جناب حکیمہ خاتون بنت امام علی نقی اور جناب نرجس خاتون والدہ ماجدہ حضرت حجتؑ کے مزارہے ہوئے ہیں جن پر نظر پڑتے ہی تاریخ ماضی کی ایک ایک بات سامنے آجاتی ہے ۔

مزار مقدس کی چہار دیواری بادشاہ اودھ کی بنوائی ہوئی ہے ۔ گنبد کے کلس پر سونا بھی محمد علی شاہ نے چڑھوایا تھا اور ایک مسافر خانہ بھی بنوایا تھا ۔

دمشق

اس شہر کی قدامت ادوار ماقبل تاریخ میں دور دور تک بڑھتی چلی جاتی ہے اور ان حدوں سے جا کر مل جاتی ہے جب حضرت آدم کو زمین پر آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا ۔ شہر سے دو میل کے فاصلے سے سلیوا نامی پہاڑی پر حضرت ذوالکفیل اور حضرت آدمؑ کے بیٹوں قابیل و ہابیل کی قبریں بنی ہیں اور اسی پہاڑی کے وسط میں ایک کمرے کے اندر حضرت محمد حنفیہ ابن علیؑ کا مزار مبارک ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ محمد حنفیہ بھی کبھی قبر جناب زینب اور مزار سکینہ بنت الحسین کی زیارت کیلئے آئے تھے ۔

کمرے کے ایک کونے میں وہ سوراخ بنا ہوا ہے جس سے اصحاب کہف کا غار نظر آتا ہے ۔ باہر اصحاب کہف کے کتے کی قبر ہے ۔

پہاڑی پر زیتون کا وہ درخت بھی ہے جو حضرت موسیٰ کے عصا سے درخت بن گیا تھا ۔ وہ خشک ہو جاتا ہے تو اسی جگہ دوسرا درخت پیدا ہو جاتا ہے ۔

شہر سے باہر ایک بڑا قبرستان واقع ہے جسکے مقبرے ہماری تاریخ کا حصہ ہیں : سکینہ بنت الحسینؑ ، ام کلثوم بنت امیرالمومنینؑ ، فاطمہ صغریٰ بنت الحسین ، عبداللہ ابن جعفر ، موذن رسالتمآب حضرت بلال ، حضرت ام سلمہ ، حضرت ام حبیبہ ، عبداللہ ابن ام مکتوم ، عبداللہ بن سید سجادؑ عبداللہ بن امام جعفر صادقؑ ، حجر بن عدی ، مکد بن اسوالکندی ، ابی بن کعب ۔

ان مزارات میں بہت سے تحقیق طلب ہیں مگر ان سے یہ انکشاف ضرور ہوتا

ہے کہ زندان شام میں بہت سے بچے مرگئے اور ہو سکتا ہے کہ بعض خواتین بھی دمشق کی خاک کا پیوند ہو گئیں اور وطن واپس نہ ہو سکیں ۔

زندان شام کھنڈر کی صورت میں باقی ہے ۔ اس میں رقیہ بنت الحسین کا مزار موجود ہے جسکو ہماری تاریخ میں سکینہ بنت الحسین سمجھا گیا ہے ۔ سکینہ کی قبر عام قبرستان میں بنی ہوئی ہے ۔ ناموں کی تبدیلی کی صحت اگر کی بھی جائے تو اس سے کوئی افادی پہلو پیدا نہیں ہوتا ۔

بازار دمشق کا وہ پھاٹک بھی ابتک موجود ہے جس سے گزر کر اسیران اہل بیت دربار میں لائے گئے تھے ۔

امویوں کی عالیشان مسجد بھی باقی ہے اور اسکے ایک گوشے میں وہ منبر بھی ہے جس پر بیٹھ کر امام زین العابدینؑ نے خطبہ دیا تھا ۔ کربلا کے اسیر دو چبوتروں پر لاکر کھڑے کیئے گئے تھے ۔ یہ چبوترے بھی پائے جاتے ہیں ۔

دمشق سے دس میل پر جناب زینب کا روضہ اقدس ہے جو قریۂ زینبیہ کہلاتا ہے ۔ آپ کی وفات کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے لیکن اغلب یہی ہے کہ آپ نے دمشق میں وفات پائی اور اس باغ میں دفن ہوئیں جو حضرت عقیل کی ملکیت تھا سرآغا خاں کی والدہ نے آپ کے مزار پراز راہ عقیدت ایک عمارت تعمیر کرائی ۔ قبر پر بیش قیمت ضریح نصب کی اور زائرین کے قیام کیلئے حجرے بھی بنوادئے ۔ بعض حجرے دوسرے حضرات نے بھی بنوائے پھر حبیب بنک کے مالک " حبیب " نے چاندی کی ایک ضریح چڑھائی اور ایک امام باڑہ بھی تعمیر کرایا ۔

مدینہ اور مصر میں بھی جناب زینب کی قبریں بتائی جاتی ہیں ۔ اصل قبر کہیں بھی ہو ہر جگہ وہ مقصد حسینی کو پورا کرتی ہے اور ہر مقام پر تاریخ کربلا کا علامیہ بنتی ہے اور ایک اسی قبر پر موقوف نہیں ، کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے دمشق تک جابجا اطفال آل رسول کی قبور ایک داستان مظلومیت بیان کرتی ہیں اور ان سے جو معجزے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ عظمت اہل بیت کا سکہ دلوں پر بٹھادیتے ہیں ۔

کربلا کے اردگرد نزدیک و دور بنے ہوئے شہداء کے مزار بھی اسی تعریف میں ہیں ۔ کتاب کی تنگ دامانی جنکی تفصیل لکھنے کی اجازت نہیں دیتی ۔

مشہد مقدس

ایران کی روایتی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مشہد مقدس کے موجودہ جائے وقوع پر جمشید نے سانئہ نام کا ایک شہر آباد کیا تھا جسکے دو حصے تھے: طائران اور نوقان، نوقان نام کا ایک محلہ اب بھی پایا جاتا ہے۔

ایک دوسری روایت سکندر ذوالقرنین کے بارے میں ہے کہ جب وہ سرزمین طوس میں وارد ہوا تو اس نے خواب دیکھا کہ ایک نور زمین سے آسمان تک ساطع ہے اور ایک آواز اسکے کان میں آرہی ہے کہ:۔

"اس مقام پر پیغمبر آخرالزمان کا آٹھواں وصی دفن ہوگا!"

اس خواب کو اس نے حکم غیبی قرار دیا اور گرداگرد ایک چہار دیواری کھنچوادی پھر نور طلوع ہونے کی جگہ پر ایک قبر کھدوادی اور اس پر ایک تختی لگوادی۔

"مرقد وصی ہشتم ختم المرسلین!"

پھر وہیں پر ایک شہر آباد کیا جس کا نام "سناباذ" رکھا۔ اس روایت کو صرف عقیدے کی روشنی ہی میں مانا جاسکتا ہے مگر تاریخ کی آنکھ نے سناباذ کو ایک گاؤں کی حیثیت سے موجود پایا۔

عباسی خلیفہ ہارون رشید جب رافع بن لیث کی بغاوت فرد کرنے کیلئے خراسان پہنچا تو سناباذ کے دیہاتی محل میں قیام پذیر ہوا۔ وہاں وہ بیمار ہوگیا اور ۱۹۳ھ میں اسی بیماری میں انتقال کرگیا۔

اس واقعہ کے دس سال بعد ۲۰۳ھ میں مامون اعظم مرد جانے کیلئے اسی راستے سے گزرا اور وہ بھی اسی محل میں ٹھہرا۔ اسکے ساتھ امام علی رضا بن موسیٰ کاظم بھی تھے جنکو مامون نے ولی عہد سلطنت بنایا تھا یعنی مامون کے بعد ہونیوالا بادشاہ۔

آئمۂ اثنا عشر کے ماننے والوں کے وہ آٹھویں امام تھے۔ وہ بھی مامون کے ساتھ مرو جارہے تھے مگر مامون نے انہیں زہر آلود کر کے انگور کھلادئے اور وہ اسی مقام پر رحلت فرماگئے۔

سناباذ نوقان کو تمام شیعہ دنیا میں عزت و تکریم کا جو مقام حاصل ہے، وہ

عباسی خلیفہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس مقدس امام کے روضے کی وجہ سے ہے اور وقت گزرنے پر اسی روضے کی وجہ سے یہ جگہ ایک معمولی گاؤں سے بڑھ کر بہت بڑے شہر کی شکل اختیار کرگئی پھر اسے "المشہد" کے نام سے پکارا جانے لگا، جس کا نام "ضریح خانقاہ" ہے یعنی ایسے شہید کا مدفن جو آنحضرتؐ کے اہل بیت میں سے ہو۔

مشہد اول دن سے جہانگیری اور جہانبانی کی زد پر رہا اور ایران و عراق میں طاقتوں کے اتار چڑھاؤ کا اس پر اثر پڑتا رہا۔ سبکتگین نے خراسان کو فتح کیا تو روضۂ اقدس کو مسمار کردیا۔ ایک عرصے تک وہ اسی عالم میں پڑا رہا پھر ایک رات محمود نے امیرالمومنینؑ کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے فرمایا، "محمود! کب تک یہ حالت باقی رہے گی؟" محمود حضرت علیؑ کا اشارہ سمجھ گیا اور اس نے اسکے بعد ہی سبکتگین کے عمل کی تلافی کردی اور مزار اقدس کو نئے سرے سے بنوادیا۔

اسکے بعد غوریوں کے خراسان پر حملے میں قلعہ کے ساتھ حرم اقدس کی عمارت کو بھی نقصان پہنچا چونتیس برس کے بعد سلجوقی عہد میں ابو طاہر قمی نے قبہ مبارک کو ٹھیک کرایا۔

پھر ایشیا جب چنگیز خاں کے زرد طوفان سے تباہ ہوا تو چنگیز کے چھوٹے بیٹے تولی خاں نے شہر کی غارت گری کے ساتھ ساتھ قبہ اقدس کو بھی برباد کردیا۔

ایک صدی تک قبر مطہر بلا قبہ کے رہی۔ آخرالجایتو خاں عرف خدا بندہ نے روضہ انور کی نئے سرے سے تعمیر کرائی پھر خدا بندہ کے بیٹے ابو سعید نے درودیوار پر کاشی کا کام بنوایا۔ قبر اطہر پر نقرئی قندیلیں آویزاں کیں، دروازوں پر سونے کے تاروں سے بنے ہوئے ریشمی پردے ڈلوادئے۔ موجودہ قبہ خدا بندہ ہی کا تعمیر کردہ ہے

۷۹۱ھ / ۱۳۸۸ء میں طوس پر تیمور کے بیٹے میران شاہ نے ضرب کاری لگائی کیونکہ یہاں کا مغل حکمران باغی ہوگیا تھا اور اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا تھا لہذا میران شاہ کو اس کے باپ نے اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ کئی ماہ کے محاصرے کے بعد طوس کو تاراج کردیا گیا۔ شہر کھنڈروں کا ڈھیر بن کر رہ گیا۔ دس ہزار باشندے تہ تیغ کردئے گئے۔

جو لوگ اس بربادی اور قتل عام سے بچ سکے انہوں نے روضہ امام میں آکر پناہ لی - اس وقت سے طوس بالکل ویران ہوگیا اور مشہد اس علاقہ کا صدر مقام بن گیا

ایران کے دوسرے بڑے شہروں کی طرح اس شہر نے بھی اپنی چار دیواری کے اندر بغاوتوں اور معرکوں کے ہولناک مناظر دیکھے ۔ غزنوی سلطان مسعود کے زمانے میں یہاں کے گورنر نے ۱۰۳۷ء میں حضرت امام رضا کے روضہ اقدس کی حفاظت کے لیے دفاعی مورچے بنوائے ۔ ۱۱۲۱ء میں شہر کے اردگرد ایک فصیل بنوادی گئی ، جس سے کچھ مدت تک حملوں سے بچنے کا انتظام ہوگیا تاہم ۱۱۶۱ء میں غوری شہر کو فتح کرنے میں کامیاب ہوگئے لیکن انہوں نے مقدس حدود کے اندر غارتگری کرنے سے احتراز کیا ۔ ۱۲۹۶ء میں مغلوں کا ایک ٹڈی دل سلطان غازان کے زمانہ میں یہاں آیا تھا ۔ اس شہر کے بڑے محسنوں اور مقبرہ امام کے عقیدت مندوں میں پہلا تیموری بادشاہ شاہرخ (۸۰۹ھ / ۱۴۰۶ء تا ۸۵۰ھ / ۱۴۴۶ء) اور اس کی نیک سیرت بیوی ہے ۔

ایران میں صفوی خاندان کے عروج کے ساتھ مشہد کے لیے بھی ایک نئے دور آغاز ہوا ۔ اس خاندان کے سب سے پہلے بادشاہ اسمعیل اول (۹۰۷ھ / ۱۵۰۱ء تا ۹۳۰ھ / ۱۵۲۳ء) ہی نے شیعہ مذہب کو سرکاری قرار دے دیا ۔ اس کے منصوبوں میں مقدس شہروں ، بالخصوص مشہد اور قم کی حفاظت شامل تھی اور اس حکمت عملی پر اس کے جانشین بھی کاربند رہے ۔

انہوں نے مزار مقدس کی تعمیر میں خاص سرگرمی کا اظہار کیا ۔ اس لحاظ سے طہماسپ اول جو اسمعیل اول کا جانشین تھا (۹۳۰ء / ۱۵۲۴ء تا ۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء) اور شاہ عباس اول (۹۹۵ھ / ۱۵۸۶ء تا ۱۰۳۷/ ۱۶۲۷ء) کو ایک امتیاز حاصل ہے ۔

سولہویں صدی میں ازبکوں کے متواتر حملوں سے شہر کو بے اندازہ نقصان پہنچا اور ۱۵۸۹ء مشہد کے لیے تباہ کن ثابت ہوا ۔ شیبانی عبدالمومن نے چار ماہ کے محاصرے کے بعد اہل شہر کو اطاعت قبول کرلینے پر مجبور کردیا ۔ شہر کے بازاروں میں خون کی ندیاں بہ نکلیں اور اندھا دھند لوٹ مار نے مقدس رقبہ کے دروازوں تک

کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔ شاہ عباس اول ۱۵۸۵ء میں جب قزوین میں تخت پر متمکن ہوا تو وہ بھی ۱۵۹۸ء تک شہر کو ازبکوں سے واپس نہ لے سکا ۔

طہماسپ ثانی کے عہد حکومت میں یعنی ۱۷۲۲ء میں ابدالی قبیلہ کے افاغنہ نے خراسان پر حملہ کیا اور مشہد پر قبضہ کرلیا ۔ اس قبضے میں بھی شہر اور شہریوں کی تباہی ہوئی اور روضے کو بھی نقصان پہنچا ۔

۱۷۲۶ء میں دو ماہ کے محاصرے کے بعد نادر شاہ کے اسے دوبارہ حاصل کیا ۔ اس نے اپنے لیے یہاں ایک مقبرہ تعمیر کرلیا اور روضے کی رونق بڑھانے پر توجہ کی ۔

نادر شاہ کے انتقال کے بعد مدعیان تاج و تخت کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی ، جس میں ایرانی سلطنت کا اتحاد و اتفاق پارہ پارہ ہوگیا ۔ نادر شاہ کی حکومت کا سارا مشرقی حصہ ، بالخصوص خراسان احمد شاہ درانی کے قبضہ میں چلاگیا ۔ کریم خان زند نے خراسان حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی پھر احمد شاہ اور اس کے جانشین تیمور شاہ نے خراسان کا علاقہ باج گزار امیر کی حیثیت سے نادر شاہ کے پوتے کے سپرد کردیا اور اس طرح خراسان دونوں سلطنتوں کے درمیان ایک حد فاصل بن گیا تاہم اصلی حکمران ہونے کی حیثیت سے ان دونوں بادشاہوں یعنی احمد شاہ اور تیمور شاہ نے مشہد میں اپنے نام کے سکے جاری رکھے ۔

نابینا شاہرخ کا عہد حکومت متواتر مگر مختصر وقفوں کو چھوڑکر ، کوئی نصف صدی تک قائم رہا اور اس عرصے میں کوئی اہم واقعہ وقوع پذیر نہیں ہوا البتہ تیمور شاہ کی وفات (۱۲۰۷ھ / ۱۷۹۲ء) کے بعد آغا محمد خان بانی خاندان قاچار شاہرخ کی مملکت پر قابض ہوگیا ۔ اس نے ۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۵ء میں شاہرخ کو سزائے موت دی اور اس طرح ایران سے خراسان کی علیحدگی کا زمانہ ختم ہوگیا ۔ شاہرخ کا بیٹا نادر مرزا ہرات کی طرف فرار ہوگیا تھا اس نے مشہد میں واپس آکر پھر عنان حکومت سنبھال لی ۔ قاچاری فوج نے اس کا محاصرہ کیا لیکن کامیابی نہ ہوئی ۔ آخر ۱۸۰۳ء میں فتح علی شاہ نے کئی ماہ کے محاصرے کے بعد اسے دوبارہ فتح کرلیا ۔

۱۸۲۵ء سے خراسان کا علاقہ ترکمانوں کے ٹڈی دل کی یلغاروں اور قبائلی سرداروں کی باہمی اور متواتر ناچاقی کی وجہ سے سخت مصیبت میں مبتلا رہا ۔ پھر علاقہ کا

انتظام قائم کرنے کے لئے شہزادہ عباس مرزا قاچار فوج کے ساتھ خراسان میں داخل ہوا اور اس نے مشہد کو اپنا صدر مقام بنالیا اور ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء میں فوت ہو گیا۔

انیسویں صدی کا اہم سیاسی واقعہ یہ ہے کہ حسن خان سالار خراسان کے گورنر نے جو شاہ محمد عباس کا عمزاد بھائی تھا، بغاوت کی اور دو سال تک (۱۸۴۷ء تا ۱۸۴۹ء) شاہی افواج کا مقابلہ کرتا رہا۔ ناصرالدین قاچار کی تخت نشینی کے موقع پر (۱۸۴۸ء) خراسان حقیقی معنوں میں بالکل خود مختار تھا۔ آخر جب مشہد کے باشندے قحط سالی سے تنگ آکر سالار سے بگڑ گئے تو حسام الدولہ کی افواج شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔

۱۹۱۱ء میں ایک شخص یوسف خان ہراتی نے مشہد میں محمد علی شاہ کے لقب سے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور کچھ عرصہ کیلئے اس نے رجعت پسندوں کے ایک گروہ کی مدد سے خراسان میں انتشار پیدا کر دیا۔ اس سے روسیوں کو مداخلت کا بہانہ مل گیا اور ۲۹ مارچ ۱۹۱۳ء کو انہوں نے ایران کے سیادتی حقوق کی خلاف ورزی کرکے مشہد پر گولہ باری کی۔ کئی بے گناہ شہری اور زوار قتل ہوئے۔ ایران کے اس قومی اور مقدس مقام پر گولہ باری سے ساری اسلامی دنیا کو صدمہ ہوا۔ اس کے بعد ایرانیوں نے یوسف خان کو گرفتار کرکے اسے قتل کر دیا۔

بحالت موجودہ مشہد مشرقی ایران کا مرکز اور خراسان کے صوبے کا پائے تخت ہے۔ اٹھارہویں صدی میں جس وقت سے افغانوں نے اس کے مشرقی حصے پر قبضہ کیا، یہ صوبہ اپنی پہلی وسعت کے لحاظ سے آدھا بھی نہیں رہا۔

قرون وسطیٰ میں طوس کے بعد نیشاپور پورے صوبے کا مرکزی شہر تھا۔ اسکی جگہ مشہد نے لی مگر نادری حکومت کے زوال کے بعد کوئی شہزادہ گورنری کے عہدے پر فائز ہوتا رہا پھر یہ منصب روضۂ امام کے متولی کو ملتا رہا۔

مشہد ایک شہر

ایران کے دوسرے شہروں کی طرح مشہد بھی کئی دیواروں کے حلقوں سے گھرا ہوا ہے جس سے اس کی شکل میں ایک دلفریبی پیدا ہو گئی ہے۔ دفاعی صورتوں کو مضبوط کرنے کے لیے جو مورچے تھے، یعنی ایک چھوٹی سی خندق اور اس کے ارد

گرد فصیل اور باہر کی طرف گردا گرد ایک چوڑی کھائی، یہ ساری تعمیر اب کھنڈر ہو چکی ہے اور بعض جگہ تو بالکل ہی ناپید ہے۔

قلعہ شہر کے جنوب مغربی حصے میں واقع ہے اور براہ راست دفاعی مورچوں کے سلسلے سے منسلک ہے۔ اس کی شکل مستطیل کی سی ہے جس کے کونوں پر چار بڑے بڑے برج ہیں اور کچھ چھوٹے چھوٹے برج بھی۔ محل شاہی جس کی تعمیر عباس مرزا نے شروع کی تھی لیکن جو ۱۸۷۶ء میں مکمل ہوا، اپنے وسیع باغات کے ساتھ خاص قلعہ سے وابستہ ہے جو اب خستہ ہو چکا ہے۔ یہ قلعہ اب گورنر کی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ سرکاری عمارتوں کے سارے علاقے کو ایک کھلا میدان شہر سے علیحدہ کرتا ہے، جو توپ میدان کہلاتا ہے اور فوجی قواعد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

شہر کی دیواروں میں چھ دروازے ہیں۔

شہر چھ بڑے اور دس چھوٹے محلوں میں منقسم ہے۔ بڑے محلوں کے نام دروازوں کے نام پر لکھے ہوئے ہیں۔

سب سے بڑا بازار جو شہر کو تقریباً دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہے، "خیابان" کے نام سے مشہور ہے۔ اسے شاہ عباس اول نے بنوایا تھا۔ یہ بازار ایک عمدہ سیرگاہ ہے اور سب سے بڑی شارع عام ہے، جہاں ہر وقت خاص کر دوپہر کو بڑی چہل پہل اور رونق رہتی ہے۔

نہر خیابان، جو نو فٹ چوڑی اور پانچ فٹ گہری ہے، اس بازار کے بیچ میں سے گزرتی ہے۔

حرم تک پہنچ کر بڑا بازار دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے: بالا خیابان شمال مغرب کی طرف اور پائین خیابان جنوب مشرق کی جانب جن میں سے پہلا دوسرے کی نسبت تقریباً تین گنا ہے۔ امام الرضا کے مقبرہ کے مقدس رقبہ کو بست کہتے ہیں اس کے علاوہ حرم شریف یا حرم مقدس یا حرم رضاوی کے نام بھی اس کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات اسے محض "امام" کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں جیسا کہ ایران اور عراق میں یہ اصطلاح ایسی عمارت یا ایسے قطعہ زمین کے لیے بھی

استعمال ہوتی ہے جو کسی امام کے حوالے سے مقدس ہو۔

بست کی شکل مستطیل ہے، جس کا رقبہ ۹۰۰ فٹ × ۷۰۰ فٹ ہے اور یہ پائیں خیابان کے نصف میں واقع ہے۔ اس کے صحن مساجد، خانقاہیں، مدرسے، سرائیں، بازار اور سکونتی مکان وغیرہ بطور خود ایک علیحدہ شہر ہیں جس کے گرداگرد ایک دیوار بنی ہوئی ہے جو عملی طور پر اسے باقی شہر سے الگ کر دیتی ہے۔ خیابان سے حرم میں داخل ہونے کے دو راستے ہیں جن کے دروازے شمال اور جنوب میں واقع ہیں لیکن ان میں زنجیریں لگادی گئی ہیں، تاکہ کوئی گاڑی یا سواری کا جانور ان میں داخل نہ ہوسکے، کیونکہ بست کی زمین پاک ہے اور اس میں صرف پیادہ پا ہی چلنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی جانور اتفاقیہ طور پر یہاں آجائے تو وہ امام کے ادارہ انتظام کی ملک ہو جاتا ہے۔ بست کو جائے پناہ ہونے کا درجہ بھی حاصل ہے۔ اگر مقروض یہاں آکر پناہ لے لیں تو وہ قرض خواہ سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ مجرموں کو متولی باشی کے حکم سے ہی حکام کے حوالے کیا جاتا ہے، ایسا عموماً تین دن کے بعد ہوتا ہے۔ بست کے سارے رقبے کا انتظام بست سے متعلق پولیس کرتی ہے۔ چوروں کے لیے یہاں ایک خاص قید خانہ بھی ہے۔ غیر مسلمین کیلئے بست میں داخلہ ممنوع ہے۔ پہلے اس پابندی میں زیادہ سختی نہ تھی مگر اب پورا عملدرآمد کیا جاتا ہے۔

روضہ اقدس کے تزئین کار۔

مشہد کی تاریخ کے سلسلے میں کئی نام درج کیے جاچکے ہیں جن میں سلطان محمود نے خواب میں امیرالمومنین کی تہدید پر تعمیر کرائی، سلطان سنجر کا بیٹا بارگاہ امامؑ میں دعا قبول ہونے سے صحت یاب ہوا تو اس نے منت اتاری اور روضے کی مرمت کرائی

الجاستو خدابندہ اور تیموری شاہزادے شاہرخ نے ثواب حاصل کرنے کیلئے توجہ کی اور شاہرخ کی بیوی گوہرشاد نے فرط عقیدت میں آنکھیں بچھادیں۔ مزار اقدس کے جنوب کی مسجد دارالسیادہ اس کے ملحقہ دالان اور دارالحفاظ اسی ملکہ کے بنوائے ہوئے ہیں۔

تیمور کے پوتے سلطان حسین بایقرا (۱۴۶۹ تا ۱۵۰۶ء) کے وزیر شیر علی نے

صحن کہنہ کے جنوب میں عمارات بنوائیں، جن میں دلفریب اور شاندار ڈیوڑھی بھی شامل ہے۔ صفویوں کے اقتدار کے زمانے میں مشہد کیلئے پھر ایک درخشان عہد کا آغاز ہوا۔ اس خاندان کے حکمرانوں نے روضہ امام علی الرضا کی زیبائش اور ترقی کے لئے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی کوشش کی جسے انہوں نے اپنی سلطنت کا مذہبی مرکز بنالیا۔

اس سلسلے میں طہماسپ اول، عباس اول، عباس ثانی اور سلیمان اول خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ طہماسپ اول (۱۵۲۴ء تا ۱۵۷۶ء) نے صحن کہنہ کے شمالی حصے میں ایک مینار تعمیر کرایا جس پر سونا منڈھوایا اور روضہ کے گنبد پر خالص سونے کی چادریں چڑھوائیں اور اس کے اوپر ایک سنہرا کلس بھی لگوایا۔ ازبک ۱۵۸۹ء میں یہ قیمتی اور زیبائشی سامان اپنے حملے میں لوٹ کرلے گئے۔

عباس اعظم اول نے دوسرے صفوی بادشاہوں کے مقابلے میں (۱۵۸۷ء تا ۱۶۲۷ء) مشہد کی سب سے زیادہ خدمت کی۔ عباس ثانی (۱۶۴۱ء تا ۱۶۶۶ء) نے اپنی توجہ صحن کہنہ کی مزید آرایش و زیبائش پر مبذول رکھی۔ اسکے بعد اس سلسلے میں سلیمان اول کا نام آتا ہے۔

غیر ممالک کے بادشاہوں نے بھی روضہ امامؑ کے لیے گراں بہا عطیات دیے۔ شہنشاہ اکبر فرماں روائے ہند ۱۵۹۵ء میں مشہد مقدس کی زیارت کے لیے گیا اور ۱۶۱۲ء میں قطب شاہ فرمانروائے دکن بھی زیارت سے مشرف ہوا۔

نادر شاہ (۱۷۳۶ء تا ۱۷۴۷ء) نے بھی اٹھارہویں صدی میں بڑی خدمت کی۔ اس نے، اس بیشمار دولت کا گراں قدر حصہ، جو وہ ہندوستان کی مہم سے لایا تھا، اس عظیم للاتبت زیارت گاہ کی زیبائش و آرایش پر خرچ کردیا: صحن کہنہ کے جنوبی نصف حصے میں جو سلطان حسین بایقر کے زمانے کی عمارت تھی دوبارہ اسکی تجدید و تزئین کرائی، آستانہ عالیہ (ڈیوڑھی) کی زیبائش پر گراں بہا دولت صرف کی، اس پر سونے کی چادر چڑھوائی چنانچہ اس کو اب تک "نادری طلائی دروازہ" کہتے ہیں۔ ۱۷۳۰ء میں اپنی تخت نشینی سے پہلے نادر شاہ نے صحن کے بالائی حصے میں ایک مینار تعمیر کرایا جس پر سونا منڈھوایا جو صحن کہنہ کی شمالی جانب طہماسپ اول کے تعمیر

کردہ مینار کا جواب تھا۔

انیسویں صدی کے قاچار حکمرانوں، مثلاً فتح علی (۱۷۹۷ء تا ۱۸۳۴ء) نے بھی بڑی عقیدتمندی کے ساتھ پیشروؤں کی تقلید کی اور حضرت امام کے روضے پر مسلسل توجہ دیتے رہے۔

اس کے بعد، باوجود اسکے کہ متعدد بار غارت گری ہو چکی ہے، مشہد مقدس میں اب بھی بے شمار دولت موجود ہے۔

بعض قدیم آثار کو چھوڑ کر پوری عمارت اتنی اچھی حالت میں ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کی تعمیر معلوم ہوتی ہے۔ حرم کی تمام موجودات بھی ایسی ہی ہیں مقبرے کا گنبد اپنے ملحقات کے ساتھ رقبہ حرم کے وسط سے بلند ہوتا ہے۔ اس کی شمالی اور مشرقی حدود میں دو وسیع مستطیل صحن ہیں یعنی صحن کہنہ اور صحن نو، جنوب میں گوہر شاد کی وسیع مسجد کی عمارتیں اس کے ساتھ مل جاتی ہیں۔

حرم کی ساخت

بست میں داخل ہونے کا مقبول راستہ بالا خیابان کا دروازہ ہے اس میں ایک زنجیر لٹکی رہتی ہے۔ اسکے بعد سڑک ہے جو کوئی ۲۵۰ گز تک بازار سے گزرتی ہے اس میں دورویہ دوکانیں ہیں۔ یہ سڑک ایک عظیم دروازے پر جاکر ختم ہو جاتی ہے، جہاں سے صحن کہنہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کا شمالی حصہ شاہ عباس اول کے وقت کا بنا ہوا ہے اور جنوبی غالباً پندرہویں صدی کے آخری نصف میں (عہد سلطان حسین بایقرا) لیکن نادر شاہ نے اس کی مکمل مرمت کرادی تھی۔ چار بڑے بڑے برج جن میں ستونوں والے مسقف ایوان ہیں اس صحن میں کھلتے ہیں۔ ان میں سے سادہ ترین برج وہ ہیں جو مغرب اور مشرق کی جانب واقع ہیں اور جنہیں عباس اول نے تعمیر کیا تھا۔ پہلے برج میں اب گھنٹہ گھر ہے اور دوسرے کے چبوترے پر نقارہ رکھ دیا گیا ہے جہاں ہر صبح وشام نوبت نوازی ہوتی ہے۔ مشرقی دروازے کے راستے عقیدت مند بست کے مشرقی مدخل پر پہنچ جاتے ہیں جو پائیں خیابان کے بیچ سے ہو کر گزرتا ہے۔ فن تعمیر کے لحاظ سے زیادہ موثر شمالی دروازہ ہے جسے عباس ثانی

نے تعمیر کرایا تھا اور خاص کر صحن کا جنوبی دروازہ یعنی نادر کا طلائی دروازہ جو نادر شاہ کے زمانے کا نمونہ فن ہے اور حرم کی سب سے دلکش عمارت ہے۔

ان دونوں دروازوں کے پاس ایک ایک مینار سو سو فٹ بلند ہے۔ ان کا اوپر کا حصہ سونے کی چادروں سے مطلا کر دیا گیا ہے۔ شمالی دروازہ طہماسپ اول نے بنوایا تھا اور جنوبی دروازہ نادر شاہ نے۔ نادر شاہ نے صحن کے وسط میں "چاہ نادر" کی مشہور مثمن عمارت بھی تعمیر کرائی تھی۔ اسے سقاخانہ نادری کہتے ہیں اس کے اوپر گلٹ کی چھتری ہے۔ یہ عمارت، سنگ مرمر کی ایک عظیم الجثہ سل میں سے جو نادر شاہ صرف کثیر کر کے ہرات سے لایا تھا، تراشی گئی تھی۔

صحن کی دیواروں میں حجروں کی دو قطاریں بنی ہوئی ہیں۔ نیچے والی قطار میں مدرسے، کاریگروں اور خدام مسجد کے سکونتی مکانات ہیں۔ حضرت کے اعلیٰ عہدے دار اوپر کی منزل میں رہتے ہیں۔ تمام صحن کے فرش پر، جس کی لمبائی سو فٹ کے قریب ہے اور چوڑائی تقریباً ۷۰ فٹ ہے، مشہد کے سیاہ پتھر کی فرش بندی کی گئی ہے جو کسی حد تک مقبروں کے پتھروں سے مشابہ ہے۔

نادر شاہ کے طلائی دروازے سے جنوب کی جانب روضہ اقدس کے احاطے کی طرف راستہ جاتا ہے جو ایوانوں اور کمروں سے گھرا ہوا ہے۔ اصل میں اس احاطے کے تمام رقبے میں سے اسی مرکزی حصے کو حرم مبارک کہنا چاہیئے۔ چونکہ یہ اصطلاح بست کے تمام رقبے کے لیے استعمال ہوتی ہے لہذا اس کے لیے الروضۃ المطہرہ اور آستانہ کے نام استعمال ہوتے ہیں۔ طلائی دروازے میں سے گذر کر دارالسیادہ میں پہنچتے ہیں جو گوہر شاد نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ اس حرم میں بہترین ایوان ہے۔ زائر حجرہ مرقد کی زیارت دارالسیادہ کے ایک چاندی کے جنگلے میں سے کر سکتا ہے۔ جنوب مشرق کی جانب مڑ کر ایک چھوٹے سے کمرے کو جس کی زیبائش سادہ طریق سے ہوئی ہے آراستہ کیا گیا ہے۔ اسے دارالحفاظ کہتے ہیں۔

دارالحفاظ سے ملحق شمال کی جانب مقبرہ امام کا گنبد ہے۔ تربتی حجرے کا اندرونی حصہ تقریباً مربع شکل کا ہے، یعنی ۳۰ فٹ × ۲۷ فٹ۔ اس میں کوئی دریچہ نہیں ہے۔ اس لیے اس کو طلائی چراغوں اور شمعدانوں کی ہلکی روشنی سے روشن

رکھا جاتا ہے۔اس کو بڑی شان وشوکت سے آراستہ کیا گیا ہے۔مزار اقدس شمالی مشرقی کونہ میں ہے جس کے گرد تین نہایت خوبصورت جنگلے بنے ہوئے ہیں جن میں سے ایک ۱۷۴۷ء کا ہے اور جس کے متعلق روایت ہے کہ نادر شاہ کے مقبرے سے جواب تباہ ہو چکا ہے یہاں منتقل کیا گیا تھا۔عباس اول نے مزار کے تعویز پر سونا منڈھوا دیا تھا۔اس کے زیرین حصے کے آگے نکلے ہوئے چبوترے میں فتح علی شاہ نے خالص سونے کا ایک مصنوعی دروازہ بنوا کر لگایا تھا جس میں جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔

دیوار کے طاقچوں میں شیشے کے دروازوں کے پیچھے منت کے نذرانے رکھے رہتے ہیں (مثلاً جڑاؤ اسلحہ، زیادہ تر حکمرانوں کے عطیات وغیرہ)۔دیوار پر دو کتبے لگے ہوئے ہیں۔ان کتبوں کے ذریعے عمارت کی تاریخ تعمیر معلوم ہو جاتی ہے۔اس کا گنبد جو ۶۵ فٹ بلند ہے اور سفید تانبے کی چادروں سے منڈھا ہوا ہے، عباس اول نے ۱۶۰۷ء میں تعمیر کرایا تھا۔۱۶۷۵ء میں سلیمان اول نے بیرونی کتبوں کی شہادت کے مطابق اسے صیقل کرایا۔چونکہ حضرت امامؑ کے مزار کا سلسلہ روایات کہیں منقطع نہیں ہوا اس لیے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ گنبد اپنے صحیح محل وقوع پر ہی تعمیر ہوا ہے۔

ہارون کے مزار کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔غالباً یہ قبر مقبرہ کے وسط میں تھی اور حضرت امام کی قبر، جو بعد میں فوت ہوئے، اسی جگہ ایک گوشہ میں بنائی گئی لہذا ہارون کی قبر لاوارث بن گئی۔

حرم خاص کے دوسرے کمروں اور الگ تھلگ عمارتوں میں صرف اس گنبد ہی کا ذکر کیا جائے گا جو اللہ وردی خان کے نام سے منسوب ہے۔یہ گنبد شمال مشرق کی جانب واقع ہے۔اس کا نام اس کے بانی اللہ وردی خان کے نام سے مشہور ہے جو عباس اول کا مشہور جرنیل تھا۔

مقدس حجرے سے اگر شرقی دروازے کی راہ سے باہر نکلیں تو دو اور ملحقہ کمروں میں سے ہوتے ہوئے ہم ناصر الدین کے طلائی دروازے تک پہنچ جاتے ہیں جو صحن نو میں کھلتا ہے۔اس کے شمال میں پائین خیابان ہے۔فتح علی شاہ نے اس

دربار کی تعمیر ۱۸۱۸ء میں شروع کی تھی اس کے دو جانشینوں نے اس کام کو جاری رکھا اور اس کی تکمیل ۱۸۵۵ء میں ہوئی۔

اگر کوئی دارالسیادہ سے جنوب کی جانب مڑ جائے تو وہ ایک نہایت ہی خوش نما اور دلفریب مسجد کے احاطے میں پہنچ جاتا ہے جو ملکہ گوہر شاد نے تعمیر کرائی تھی۔صحن کہنہ کی طرح اس کا صحن بھی ایک بے قاعدہ چوکور شکل کا ہے، جو شمالاً جنوباً تقریباً سو گز لمبا ہے اور ۹۰ گز چوڑا ہے۔اس صحن کی چاروں دیواروں میں سے ہر دیوار کے وسط میں ایک ایک محرابدار ایوان ہے اور ان ایوانوں کو چھوڑ کر دیواروں کے باقی ماندہ حصے میں سکونتی حجرے بنے ہوئے ہیں۔ایوانوں میں سب سے عمدہ ایوان مقصورہ ہے جو جنوبی دیوار کے ساتھ واقع ہے۔

اس ایوان میں نماز ہوتی ہے اور اس میں لکڑی کا ایک منبر رکھا ہوا ہے۔مدخل کے دالان پر ایک نیلا گنبد ہے جس کے دونوں پہلوؤں پر دو بلند مینار ہیں جن پر نیلے شیشے کی ٹائلیں جڑی ہوئی ہیں۔صحن کے وسط میں مسجد پیرزن ہے جو مربع شکل کا غیر مسقف ہے اس کے گرد لکڑی کا ایک کٹہرا لگا ہوا ہے جس کے چاروں طرف پتھر کی گہری نالی میں پانی بہتا رہتا ہے۔

حرم مقدس کے پاس شہر کے مصروف ترین بازار واقع ہیں۔مدارس اور حمام بھی اسی تسلسل میں بنے ہوئے ہیں۔تمام عمارتیں سکونتی مکانوں کی طرح سب کی سب حضرت امامؑ سے متعلق ہیں اور ان مجتہدین کے قبضے میں ہیں جو نظم و نسق کے ذمے دار ہیں۔بست کی تمام جائداد بھی ان سے منسوب ہے۔ان کے علاوہ حضرت امام کی ملکیت میں ایران کے تمام صوبوں میں اراضی، عمارتیں، نہریں بالخصوص مشہد کے قرب وجوار یا اس سے کچھ فاصلے تک موجود ہیں۔

اس کثیر آمدنی پر مستزاد ہیں وہ نذرانے جو زائرین کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں لیکن اخراجات بھی غیر معمولی ہیں۔حکام خدام اور دیگر ملازمین کی تنخواہیں مجتہدین کرام کے وظائف، لنگر خانوں کے مصارف اور زائرین کا طعام جو تین روز تک مہمان رکھے جاتے ہیں۔

مدارس کا خرچ بھی بہت زائد ہے۔ معلمین کی تنخواہوں کے علاوہ غریب طلباء کے وظیفے اور باہر سے آنیوالے مستحق متعلمین کا تمام صرف بھی برداشت کیا جاتا ہے
نمایاں مدرسوں کی تعداد بیس بتائی جاتی ہے جن میں سے بعض بہت قدیم ہیں جن میں سے ایک ۸۲۳ھ / ۱۴۲۰ء میں تیموری سلطان شاہرخ نے تعمیر کرایا تھا۔ سلیمان اول نے اس کی تجدید و مرمت کرائی۔ اسی حکمران کے عہد میں پریزاد مدرسہ قائم ہوا جسے سلیمان نے مکمل طور سے دوبارہ تعمیر کرایا۔ عباس ثانی کے عہد میں دو مدرسے خیرات خان (۱۰۵۸ھ / ۱۶۴۸ء) اور مرزا جعفر نے (۱۰۵۹ھ / ۱۶۴۹ء) جاری کیے

مجموعی طور پر پرانے مدرسوں کی تعداد زائد سے زائد نو ہے۔ قاچاریوں کے دور میں ایک تو فتح علی شاہ کے عہد میں دو ناصر الدین کے عہد میں قائم ہوئے، دو اور مدرسے بھی جو بالکل کھنڈر ہو چکے تھے از سر نو بحال ہوئے۔

فن تعمیر کی خوبصورتی کے لحاظ سے سب سے عمدہ مدرسہ مرزا جعفر کا ہے جو ۱۰۵۹ھ / ۱۶۴۹ء میں تعمیر ہوا اور مرزا جعفر نے اس کے لیے ایک بہت بڑی رقم وقف کر دی کیونکہ وہ ہندوستان سے بے شمار دولت کما کر لایا تھا۔ اس مدرسے کی عمارت مشہد میں تیسرے درجے کی شاندار عمارت شمار ہوتی ہے جس میں مسقف ایوان طاقچہ دار صحن اور گران بہا نقش و نگار بنے ہیں جو ایران کے مذہبی فن تعمیر کی بہترین مثال ہے۔ صرف مدرسہ مرزا جعفری پر موقوف نہیں اس قسم کے دوسرے مدرسے بھی پائے جاتے ہیں جن کے لئے بڑے بڑے اوقاف موجود ہیں مثلاً پائین پا جن کے بانی وہ ایرانی تھے، جنہوں نے ہندوستان جا کر بے شمار دولت پیدا کی تھی۔ ان مدرسوں میں طالب علم رہتے بھی ہیں اور ان کے گزر اوقات کی کفالت اوقاف کی آمدنی سے ہوتی ہے۔ جو طالب علم مشہد میں نو سال کا نصاب تعلیم ختم کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے خواہاں ہوتے ہیں وہ مشہد علی یعنی نجف اشرف چلے جاتے ہیں اور وہاں کے اساتذہ کے درس میں شریک ہو جاتے ہیں۔

مشہد میں ایک یونیورسٹی بھی قائم ہو چکی ہے (۱۹۵۶ء) جہاں دیگر مضامین کے علاوہ اردو کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

بعض مدرسوں سے متعلق کتب خانے بھی ہوتے ہیں۔ نظام حرم کے پاس

بھی ایک بہت بڑا کتب خانہ ہے جو پندرہویں صدی کے پہلے نصف میں سلطان شاہرخ نے قائم کیا تھا۔ کتابوں کے جو ذخیرے اس کے اور اس کے جانشینوں کے عہد میں جمع ہوتے رہے وہ زیادہ تر اس وقت ضائع ہو گئے جب عبدالمومن خان کے ازبکوں نے مشہد کو تاراج کیا۔ مخطوطات کی پوری پوری پڑتال کی جائے تو مفید نتائج برآمد ہونے کی امید ہے۔

مشہد میں مساجد کی کثرت خاص طور پر قابل ذکر ہے جو حرم مقدس، قبرستانوں، مقبروں مدارس یا دوسری مذہبی عمارتوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔

بے محل نہ ہوگا کہ اگر اس مصلی کا بھی ذکر کر دیا جائے جو شہر سے باہر پائیں خیاباں کے دروازے سے آدھ میل کے فاصلے سے ہرات کی سڑک پر واقع ہے یہ کوئی تیس فٹ اونچا ایوان ہے جو ایک عظیم القامت محراب میں کھلتا ہے اور تقریباً ساٹھ فٹ بلند ہے۔

مشہد کی آبادی مختلف ادوار میں گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔ نادر شاہ کے عہد میں آبادی سب سے زائد تھی کیونکہ وہ اکثر اپنا دربار یہیں لگایا کرتا تھا اور ہر لحاظ سے اس شہر کی رونق اور خوشحالی کے اضافہ میں کوشاں رہتا تھا۔ اس زمانے میں مشہد کی آبادی ساٹھ ہزار نفوس سے کم نہ ہوگی لیکن نصف صدی کے پرآشوب زمانے میں جو نادر شاہ کے عہد کے بعد شروع ہوا یہ شہر زوال پذیر ہو گیا، فی زمانہ مشہد کی آبادی ایک لاکھ بتائی جاتی ہے اور ایران میں آبادی کے لحاظ سے یہ تیسرے نمبر کا شہر ہے۔

یہاں بہت سے غیر ملکی ترکمان، افغان، اور ہندوستانی آباد ہیں اور تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ سب شیعہ ہیں۔ عیسائیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جو صرف چند آرمینی سوداگروں، انگریزی اور روسی سفارت خانوں کے متعلقین میں ہیں یہ سفارت خانے ۱۸۸۹ء میں قائم ہوئے تھے۔

اس شہر کے بعض لوگ اپنی بسر اوقات کے لیے زائرین کی خدمت بھی کرتے ہیں اور ان کے طعام و قیام کا انتظام بھی کرتے ہیں اور کچھ مقامی صنعت و حرفت اور تجارت وغیرہ کے کام میں لگے رہتے ہیں۔ صنعت گر، ماہرین فن انجینئر اور ڈاکٹر بھی بکثرت پائے جاتے ہیں مگر ملک میں تعلیم کا تناسب کم ہے جو بتدریج بڑھتا جا رہا ہے۔ (۱۰۹)

حضرت عبدالعظیم

عراق و ایران کی زیارت گاہوں میں ایک مقدس نام شاہزادہ عبدالعظیم کا بھی لیا جاتا ہے۔ ایران جانیوالا ہر زائر مشہد کے بعد شاہزادے کے مزار پر ضرور جاتا ہے اور عقیدے کے مطابق وہاں اسکی دعا پوری ہوتی ہے۔

حضرت عبدالعظیم امام حسنؑ کی نسل میں پانچویں پشت میں تھے۔ ابو القاسم سید عبدالکریم المعروف بہ عبدالعظیم بن عبداللہ بن علی بن حسن بن زید بن حسنؑ ۱۷۳ھ میں بمقام مدینہ آپ کی ولادت ہوئی اور ۱۵ شوال ۲۵۲ھ کو شہر "رے" میں وفات پائی۔

زندگی کے ۷۹ سال پورے کے پورے آپ نے گردش زمانہ میں بسر کیے۔ سادات پر زمین تنگ اور آسمان دور تھا۔ ہارون رشید نے حضرت امام موسی کاظمؑ کو زندان میں ڈال دیا تھا پھر بھی امامؑ سے آپ نے کبھی کبھی فیض حاصل کیا۔ ۱۸۳ھ میں امامؑ کی شہادت کے وقت آپ کی عمر دس سال تھی پھر آپ نے امام رضا سے بھی استفادہ کیا۔ مامون رشید کا دور آل رسول کیلئے اتنا صبر آزما نہ تھا لہذا آپ مدینے میں مقیم رہے۔

امام رضاؑ کی شہادت کے بعد مامون چند روز سے زائد مطمئن نہ رہا اور اسکو امام محمد تقی کو بزور مدینے سے بلوا کر اپنی بیٹی ام الفضل کو آپ کے عقد میں دیدیا مگر مامون کی زہریلی سیاست کو پورا خاندان رسالت سمجھ چکا تھا اس لئے امام محمد تقی جلد ہی مدینے آگئے اور حضرت عبدالعظیم انکی قربت سے بھی مستفیض ہوئے

پھر معتصم کے آغاز خلافت سے جب دور منصور کی نشاۃ ثانیہ شروع ہوئی تو شہزادہ عبدالعظیم مدینے میں تھے۔ دو سال نہ گزرے ہوں گے کہ معتصم نے امام محمد تقیؑ کو بجبر بلوالیا پھر آپ کو زہر دلوا دیا۔

جب متوکل سریرآرائے خلافت ہوا تو اس نے بغداد کے بجائے سامرا کو دارالخلافت قرار دیا اور امام علی نقیؑ کو اسی طرح طلب کیا جس طرح امام تقیؑ گئے تھے

یعنی بظاہر احترام سے مگر درپردہ مجبور کر کے۔ امام علی نقیؑ پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے ایک جماعت تشکیل دی ہے جو نبی عباس پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

درحقیقت یہ الزام تھا۔ متوکل کو خود بخود ایک اندیشہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس طرح اس نے امامؑ کو بلوا کر اپنی نگرانی میں رکھا اور سادات پر ظلم ڈھانے کا ایک بہانہ بھی تراش لیا۔ اس مفروضہ جرم میں جن لوگوں کو نشانہ ستم بنایا گیا وہ سب فقیہہ شب زندہ دار اور زاہد و متقی تھے۔ باری عبدالعظیم کی بھی آنیوالی تھی مگر کسی محب اہل بیت نے اطلاع دیدی اور آپ بھیس بدل کر مدینے سے نکل کھڑے ہوئے

راستہ بھی آپ نے بڑی احتیاط سے طے کیا کیونکہ عباسی کارندے بو سونگھ کر فاطمہؑ کی اولاد کو گرفتار کر لیتے تھے۔ اس طرح آپ "رے" میں وارد ہوئے

متوکل کو اسکے مخبروں نے خبر دی تھی کہ عبدالعظیم کو امام علی نقیؑ کا بہت تقرب حاصل ہے اس نے آپ کے قتل کا حکم صادر کر دیا تھا۔ آپ کو اس کا علم تھا لہذا "رے" میں بڑی احتیاط سے داخل ہوئے۔

اس شہر کا انتخاب آپ نے کیوں کیا؟ اسکی کوئی خاص وجہ کسی تذکرے میں نہیں ملتی۔ بادی النظر میں اس کا سبب یہی ہوگا کہ اسکو آپ نے دوسرے شہروں کے مقابلے میں محفوظ سمجھا ہوگا؛ تاہم ایک امتیاز اس شہر کو ضرور حاصل تھا کہ یزید ابن معاویہ کے خلاف پہلے پہل اسی شہر سے علم بغاوت بلند ہوا تھا اس لئے ممکن ہے کہ حضرت عبدالعظیم نے اسکو تبلیغ اہل بیت کیلئے منتخب کیا ہو۔

آل رسولؑ کے ترک وطن کا سلسلہ یوں تو معاویہؓ بن ابی سفیان کے دور سے شروع ہوا تھا پھر اس نے شدت اختیار کر لی۔ درمیانی ادوار میں کچھ کمی آگئی۔ منصور دوانیقی کے عہد میں پھر رفتار ہجرت تیز ہو گئی تھی اور متوکل کے زمانے میں شدائد انتہا پر پہنچ گئے لہذا آل فاطمہ زہراؑ بالخصوص سادات حسنی ایک بڑی تعداد میں آوارہ وطن ہوئے جن میں حضرت عبدالعظیم بھی تھے۔

متوکل انہدام روضۂ سید الشہداء میں کد و کاوش کر چکا تھا۔ محبان علیؑ کے خون کی ارزانی تھی۔ ایسے میں حضرت عبدالعظیم ہر طرف سے چوکنا پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے پہلے کئی مقامات پر ٹھہرے پھر "رے" پہنچے۔

انجانی جگہ پر زیادہ پوچھ گچھ بھی مناسب نہ تھی۔ چلتے چلتے محلہ ساربانان میں وارد ہوئے۔ وہاں کوئے بردگاں میں اندازے سے ایک مومن کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے سرداب میں آپ کے رہنے کا بندوبست کر دیا۔ آپ بیشتر وقت نماز و مناجات میں گزارتے۔ کسی وقت ایک اجنبی کی حیثیت سے باہر نکلتے اور سامنے بنی ہوئی ایک قبر کے پاس جاکر ٹھہر جاتے جسکے بارے میں آپ نے بتایا کہ امام موسیٰ کاظمؑ کے صاحبزادے کی ہے۔ آپ کے اس قیام کو زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ آہستہ آہستہ شہر کے صاحبان ایمان کو آپ کے آنے کا حال معلوم ہو گیا اور وہ آپ تک پہنچنے لگے۔

اسی دوران ایک مرد مومن نے آنحضرتؐ کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میرے خاندان کی ایک فرد مقیم محلہ ساربانان اس دنیا سے سفر کرنیوالی ہے۔ اسکو عبدالجبار کے باغ میں سیب کے درخت کے پاس دفن کر دینا۔

وہ مالک باغ کے پہنچا تو اس نے بتایا کہ میں نے بھی اسی طرح کا خواب دیکھا ہے اور اس باغ کو شیعوں کی تدفین کیلئے وقف کرتا ہوں، خود مجھے بھی اسی میں دفن کیا جائے۔

شہزادہ عبدالعظیم "رے" میں کوئی بڑی تبلیغی خدمت انجام نہ دے سکے پھر بھی ان کے وجود سے مقامی شیعوں میں ایک ارتباط باہم پیدا ہو گیا اور ایمان میں ایک جلا آگئی۔

اس واقعے کے کچھ ہی دنوں بعد حضرت عبدالعظیم اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، بعض روایات کے مطابق انکی قبر بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ "رے" کے بعض مومنین کے توسط سے سامرہ میں امام علی نقیؑ سے ان رابطہ تھا اور امامؑ ان کیلئے کلمات عظیم استعمال فرماتے تھے ۔۔۔۔ ملا باقر مازندرانی کا خیال تھا کہ عمال حکومت کو ان کے قیام کی اطلاع ہو گئی تھی اور کسی مخبر کے ذریعہ انہیں زہر دلوا دیا گیا

حضرت عبدالعظیم میں خانوادہ رسالت کے مقدس افراد کے تمام محاسن موجود تھے: امانت دار، متدین، متقی، زاہد اور راوی احادیث، تہجد گزار تھے، قران فہمی میں بڑا درک رکھتے، مسائل فقہی پر انہیں پورا عبور تھا، بالخصوص توحید و عدل

پروردگار پر ایسی روشنی ڈالتے کہ مادہ پرست بھی دنگ رہ جاتے

آپ کی فضیلت کیلئے یہ کچھ کم نہ تھا کہ آپ نے چار اماموں سے فیض حاصل کیا تھا اور عظمت کی دلیل یہ ہے کہ حضور سرور کائنات نے آپ کے مدفن کیلئے دو مومنوں کو خواب میں ہدایات دی تھیں اور بارگاہ الہی میں آپ کی منزلت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ کا مزار زیارت گاہ عوام و خواص ہے اور وہاں حاجتمندوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

ہماری نظر میں ان کا شمار ان لوگوں میں ہے جو مرنے کے بعد بھی اہل بیت کی عظمت و صداقت کا علامیہ بنے ہوئے ہیں۔ (۱۰)

حسین ٹیکری

عراق و ایران میں مشاہد مقدسہ کی معجزہ نمائی کسی بیان کی محتاج نہیں لیکن ہندوستان میں نقول روضہ نے بھی یہی کردار ادا کیا ہے۔ یہ نقول پکی اینٹوں کی بنی ہوئی ہوں، کربلا یا روضہ عباسؑ کہلاتی ہوں یا امام باڑہ اور عاشور خانہ، ان سے وقتاً فوقتاً ایسے اعجاز ظہور پزیر ہوتے رہتے ہیں جنھوں نے منزلت اہل بیت دلوں میں مرتسم کر دی ہے۔

اور عمومی سطح پر تعزیہ بھی امام حسینؑ کی نسبت کا مظہر بنتا رہا ہے۔ یہ تعزیہ مختلف مقامات پر مختلف اشیاء سے مختلف شکلوں میں بنایا گیا لیکن وہ روضہ امامؑ کی نقل ہی تصور کیا گیا کیونکہ روضے کی ساخت شروع میں کچھ تھی پھر اس میں ترامیم ہوتی رہیں اور بحالت موجودہ گنبد اور میناروں کی شکل میں ہمارے سامنے ہے لہذا کوئی جس طرح کا تعزیہ بھی بنائے، وہ اپنی نسبت سے یکساں طور پر اہم ہوتا ہے اور اسکو بارگاہ سیدہ کونین سے شرف قبولیت عطا کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے صوبہ مدھ پردیش کے شہر جاورہ میں تیس فیٹ اونچا کاٹھ کا تعزیہ بنایا گیا تھا جو ٹھوس لکڑی کے سبب اتنا وزنی تھا کہ دوسو ادمی اسکو مل کر اٹھاتے تھے۔ محرم کا چاند نمودار ہونے پر تعزیہ مزین کر کے چوک پر سجا دیا جاتا جہاں خلقت اسکی زیارت کرتی پھر معمول کے مطابق اس کا گشت ہوتا۔

جاورہ ایک ہندو ریاست تھی بیشتر آبادی ہنود کی تھی کچھ مسلمان بھی بستے تھے جن میں شیعہ برائے نام تھے لیکن مسلمانوں کو امامؑ سے بڑی عقیدت تھی اور وہ خلوص کے ساتھ محرم مناتے تھے ۔ ۱۳۰۲ھ میں دسہرے کا تہوار محرم میں پڑا اور آٹھ محرم کو رام لیلا جلوس نکلا تو اس میں کہاوت کے اعتبار سے باون گز کا راون بھی شامل تھا ۔ جاورہ میں جو راون بنایا گیا تھا وہ حقیقتاً باون گز کا تو نہ تھا مگر بہت لمبا اور چوڑا تھا ۔ جلوس اسی شاہراہ پر گزرا جس پر تعزیہ رکھا ہوا تھا ۔

ایسے مواقع پر اکثر ہندو مسلم فساد ہوتا تھا لیکن جاورہ میں ہندو غلبے کے سبب بے چارے مسلمان خاموش رہے اور انہوں نے جلوس کے گزر جانے کا راستہ دیدیا ۔ راون جب تعزیے کے قریب پہنچا تو تعزیہ راون کی اونچائی کے سامنے بہت حقیر نظر آنے لگا اور ہندو ایک تفاخر سے مسلمانوں کی طرف دیکھنے لگے ۔ احساس کمتری میں مبتلا مسلمان سر جھکا کر رہ گئے مگر دوسرے ہی لمحے دنیا نے دیکھ لیا کہ امام کے ماننے والے اتنے سربلند تھے کہ ہندو ان سے آنکھیں چار کرنا تو درکنار خود تعزیے کے سامنے سرنگوں تھے ۔

راون جیسے ہی تعزیے کے مقابل پہنچا تعزیے نے اپنے مقام سے حرکت کی اور آہستہ آہستہ اتنا بلند ہو گیا کہ اس کا نچلا حصہ راون کے سر کے اوپر تھا پھر اسی طرح دھیرے دھیرے تعزیہ اپنے مقام پر آکر قائم ہو گیا ۔

شہید کربلا کے اس معجزے نے ہر دیکھنے والے کو سراپا حیرت بنا دیا اور جب سب اس کیفیت سے باہر نکلے تو حسین حسین کی آوازیں آسمان پر دستک دینے لگیں ۔ ۔ ۔ ۔ ان آوازوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی آوازیں بھی شامل تھیں ۔ اسکے بعد مسلمانوں نے اپنے تمام تعزیے قریب کے دریا میں لے جاکر ٹھنڈے کردئے اور خود اسی چوک میں آکر بیٹھ گئے ۔

اس دریا کے کنارے موضع رودھانہ میں جاروب کش بستے تھے ۔ وہ علی الصباح اپنے اپنے کاموں پر جانے کیلئے گھروں سے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ جو تعزیے مسلمانوں نے ٹھنڈے کیے تھے وہ سارے کے سارے قریب کی پہاڑی پر رکھے ہوئے ہیں ۔ انہیں اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا اور آنکھوں کو مل کر دوبارہ دیکھا تو

تعزیوں کو جگمگاتے پایا ۔ وہ سب شہر کی سمت دوڑ پڑے اور لوگوں سے یہ واقعہ کہہ سنایا خلقت خبر پاتے ہی چل پڑی اور پہاڑی پر جاکر دیکھا تو کوئی تعزیہ تو موجود نہ تھا مگر مٹی سے اتنی مہک نکل رہی تھی کہ دور دور تک فضا معطر تھی ۔

اسکے بعد جاورہ اور مضافات جاورہ شہدائے کربلا کی عقیدت میں اتنے سرشار ہوئے کہ بلا امتیاز مسلک وملت ہر ایک نے حسب استطاعت اتنی رقوم جمع کردیں کہ ٹیلے پر امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کے روضے تعمیر ہوگئے اور یہ جگہ حسینؑ ٹیکری کے نام سے موسوم ہوگئی ۔

زائرین کے آنے کا سلسلہ اول دن سے جاری ہو گیا تھا اور معجزوں کا تسلسل بھی قائم تھا لہذا جلد ہی اطراف واکناف ہندوستان میں شہرت ہو گئی اور افریقہ تک سے لوگ حسین ٹیکری پہنچنے لگے ۔

بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی میں اللہ دینا لاڈک نام کا سیٹھ زیارت کیلئے آیا تو اسکی مراد برآئی اس نے امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ کے روضے کربلا کے اصل روضوں کی مطابقت اور مناسبت سے بنوادے اور زائرین کیلئے کوارٹر بھی تعمیر کروائے ۔ روضہ امامؑ کے احاطے میں سیٹھ کی قبر بھی بنی ہوئی ہے ۔

زائرین اس کثرت سے پہنچتے ہیں کہ کبھی قیام کیلئے پچاس کوارٹر کافی نہیں ہوتے ، مایوس سے مایوس مریض وہاں پہنچ کر صحت یاب ہوجاتا ہے ۔ روضہ امام حسینؑ کے لوبان کی راکھ اور حضرت عباسؑ کے روضے میں بنے ہوئے کنویں کا پانی ہر مرض کا علاج بن جاتا ہے اور روضوں کا طواف جسموں میں توانائی پیدا کردیتا ہے

مجاور سب کے سب سنی ہیں اور اہل بیت کے عقیدت مند مقامی طور پر صرف اکا دکا شیعہ پائے جاتے ہیں البتہ ایام محرم میں کچھ شیعہ نظر آجاتے ہیں زائرین کی کوئی نہ کوئی تعداد تو روز ہی موجود رہتی ہے اور مجلسوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے ۔

جاورہ کا محرم یوں تو کوئی خصوصیت نہیں رکھتا لیکن ہندو عورتیں اور مرد اس تعداد میں دیہات سے آجاتے ہیں کہ حسین ٹیکری سے جاورہ تک آدمی ہی آدمی نظر آتا ہے ۔ اس کا سبب شاید یہی ہے کہ جو دامن پھیلا کر آتا ہے وہ دامن بھر کر واپس جاتا ہے اور دامن اسی دولت سے بھر جاتا ہے جو مانگنے والا چاہتا ہے ۔

ایسی ہی ایک زیارت گاہ شمالی ہندوستان کے ضلع بجنور میں "جوگی پورہ" کے نام سے بھی ہے جو نجف ہند کہلاتی ہے۔ وہاں کے معجزات بھی زباں زد عام ہیں اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر بنے ہوئے بعض روضے بھی اسی تعریف میں آتے ہیں جنکے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ (۱۱۲)

بیبیاں پاک دامناں

"لاہور کی تاریخوں اور تذکروں میں جو روایت درج ہے وہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی آمد سے بتیس سال پہلے کا ایک واقعہ ہے جو تاریخی اعتبار سے ۶۸۱ء کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے"۔ (۱۱۱)

۶۸۱ء کا مطلب ہے ۶۲ھ کا اوائل وسط یا آخر جب قدیم لاہور کے قریبی جنگل کے ایک ٹیلے پر کچھ پردیسی عورتوں اور مردوں کا وردو ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ دریائے راوی کے کنارے کنارے دور تک جنگل کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ لاہور کی حیثیت ایک نمایاں بستی کی تھی جسپر ایک ہندو راجہ مہابرن حکمراں تھا۔ بستی میں ایک بڑا مندر تھا جس میں رواج کے مطابق پتھر کی مورتیاں نصب تھیں جنکی پوجا کی جاتی تھی۔

اس مندر میں ایک اضافی چیز یہ تھی کہ اسکے آگے آگ بھی روشن رہتی تھی۔ شاید اس علاقے کے آریے ایران اور وسط ایشیا سے اگنی پوجا کا عقیدہ ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس طرح یہ مندر بت پرستی اور اگنی پوجا کا مشترک مرکز بن گیا تھا

اور آبادی کے تمام اونچی ذات کے لوگ اسی مخلوط عقیدے کے قائل تھے۔ ایک دن اچانک تمام مورتیاں منہ کے بل گر پڑیں اور آگ بالکل ٹھنڈی پڑ گئی۔

راجہ اطلاع پاتے ہی دوڑ پڑا اور جب یہ یقین ہو گیا کہ سب کچھ بغیر کسی تحریک کے عمل میں آیا ہے، آگ پر کسی نے پانی نہیں ڈالا۔ پروہت موجود تھا۔ اسکی آنکھوں کے سامنے یہ واقعہ ہوا تھا۔ وہم پرست راجہ بڑی فکر میں پڑ گیا کیونکہ اتنی اشبھ بات دیوتاؤں کے ناراض ہونے کی دلیل تھی۔ راجہ نے پنڈتوں، منتریوں اور نجومیوں کو بلایا مگر وہ اپنے فن اور علم سے اسکی کوئی وجہ معلوم نہ کر سکے۔ اسی دوران یہ خبر ملی کہ قریب کے جنگلی ٹیلے پر چند مرد اور کچھ عورتیں آکر ٹھہری ہیں جو غیر ملکی معلوم ہوتی ہیں۔ راجہ مہابرن کو خیال ہوا کہ ممکن ہے اس واقعہ کا ان سے کچھ تعلق ہو لہذا اس نے انکی گرفتاری کیلئے سپاہی روانہ کر دئے۔

سات عورتیں اور چار مرد مجموعی طور پر گیارہ نفر تھے۔ عورتوں نے سپاہیوں کے پہنچتے ہی چہروں پر نقابیں ڈال لی تھیں۔ مرد سپاہیوں کو دیکھتے ہی شمشیر بکف اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سپاہی ان کے چہروں کی جلالت دیکھ دم بخود رہ گئے۔ ان کی ہمتیں جواب دے گئیں آخر دو سپاہی واپس ہوئے اور راج کمار کو بلا کر لے گئے۔

راجکمار بکرما سہائے بھی انہیں دیکھتے ہی مرعوب ہو گیا پھر بھی اس نے راجہ کے حکم کا اعلان کیا اور ان میں سے قدرے سن رسیدہ بی بی نے خود اسی کی زبان میں جواب دیا۔

"ہم خدائے واحد کے بندے ہیں اور پیغمبرؐ عرب کی اولاد میں ہیں۔ ہمارے سردار کو جو رسول کا نواسہ تھا کربلا میں قتل کر دیا گیا ہم قید سے چھوٹ کر مدینے پہنچے تو مگر ہمیں وہاں بھی رہنے نہیں دیا گیا۔ مجبوراً ہم نے پردیس اختیار کیا۔ ہماری طرف سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی پھر بھی تم پسند نہیں کرتے تو ہم کہیں اور چلے جائیں گے۔"

عرب کی خاتون سنسکرت میں گفتگو کر رہی تھی تو محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہی اسکی مادری زبان ہو۔ راجکمار تصویر حیرت بن گیا اور مزید تفصیل پوچھنے پر خاتون نے بتایا۔

"میں مسلم شہید کی بیوہ رقیہ بنت علی ہوں، علم بردار لشکر کربلا ابو الفضل العباس کی بہن۔"

دوسری پانچ بیبیوں کا تعارف کراتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

"عقیل ابن ابی طالب کی بیٹیاں ہیں اور میری نندیں"۔

پھر چھٹی خاتون کی طرف انگلی اٹھا کر بولیں۔

"ان کا نام حلیمہ ہے۔ کہنے کو کنیز ہیں مگر رتبے میں ہمارے برابر۔ میں نے بہت کہا مگر اس عالم میں انہوں نے ساتھ نہیں چھوڑا۔"

پھر انہوں نے چاروں مردوں کے نام بتائے۔

"ابو الفتح، ابو الفضل، ابو المکارم اور عبداللہ، یہ سب ہمارے ہم قبیلہ ہیں اور محافظ کے طور پر ہمارے ساتھ آئے ہیں۔"

راجکمار بہت متاثر ہو چکا تھا پھر بھی وہ نرم لہجے میں بولا۔

"راجہ کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ آپ کو دربار میں تو چلنا ہی پڑے گا"

اس جواب پر خاتون کو جلال آگیا۔ انہوں نے قہر کی ایک نگاہ راجکمار پر ڈالی تو وہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگا پھر زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

راجکمار کی یہ حالت دیکھ کر سپاہیوں نے ان کے گرد گھیرا بنالیا اور آہستہ آہستہ گھیرے کو تنگ کرنے لگے۔ خدام اپنی ہوئی تلواریں لیے مدافعت پر آمادہ تھے مگر خاتون نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھا کر ایک عجیب نگاہ سے آسمان کی طرف دیکھا۔ فضا میں ایک بے چینی اور ہلچل پیدا ہوئی۔ معاً زمین اسی مقام پر شق ہوئی۔ بیبیاں مع خدام کے اس میں سما گئیں اور زمین پھر برابر ہو گئی۔

سپاہیوں نے دہشت زدہ ہو کر بے ہوش راجکمار کو پانی کے چھینٹے دئے اور ہوش میں آنے پر سارا ماجرا اس سے کہہ سنایا۔ راجکمار پاک بیبیوں سے اتنا متاثر ہوا تھا اور کرامات نے کچھ ایسی عقیدت پیدا کر دی تھی کہ وہ پھر اس مقام سے ہلا نہیں۔ مجاور بن کر بیٹھ گیا۔ اسلام کے اصول تو اسکو معلوم نہیں تھے مگر توحید الہی کا قائل ہو گیا اور پیغمبر عرب کا حلقہ بگوش بن گیا۔ پھر عالم خیال میں پاک بیبیوں سے

مخاطب ہو کر اس نے سوالات کیے اور ایک بی بی کی آواز نے اسکو سب کچھ بتا دیا۔ یہ راجکمار پاک بیبیوں کے مزار کا پہلا مجاور تھا۔

راجکمار کے ساتھ بعض سپاہی بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ ان سب نے اس مقام پر ایک چبوترہ سا بنالیا اور اسکے گرد بیٹھ کر مصروف عبادت ہو گئے بی بی کی آواز انکی ہادی تھی جس نے انہیں سورتیں یاد کرائیں اور طریقہ عبادت تعلیم کیے

راجہ نے بہت کوشش کہ انہیں پرانی راہ پر واپس لائے لیکن ان سب کی دنیا بدل چکی تھی اور وہ جس جگہ پہنچ چکے تھے وہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں تھی۔ خود راجہ بھی بیبیوں کی کرامات سے متاثر تھا۔ وہ خود مسلمان تو نہیں ہوا مگر اس نے راجکمار کو اسکے حال پر چھوڑ دیا اور کچھ زمین بھی اسکے لئے وقف کر دی۔ اس طرح کفرستان میں اسلام کی پہلی شمع روشن ہوئی اور اس روشنی میں مجاوروں کی تعداد بڑھتی رہی۔

روایتی تاریخ میں ایک واقعہ اور بیان کیا جاتا ہے کہ جب پاک بیبیوں کا واقعہ مشہور ہوا تو جاٹوں کا ایک سردار بالو اپنی خوبصورت اور اپاہج بیٹی کو لے کر اس مقام پر آیا اور راجکمار سے اپنی بیٹی کی صحت کیلئے دعا کرنے کی استدعا کی پھر اجازت لی کہ یہ لڑکی یہاں پڑی رہے تو بیبیوں کی برکت سے شاید صحت یاب ہو جائے۔

راجکمار کا نام اب محمد جمال تھا۔ اس نے بی بی پاک دامن کے مزار پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تو آواز آئی۔

"اس لڑکی کو مسلمان کر کے اس سے نکاح کر لو۔"

راجکمار کیلئے اس لڑکی سے عقد کرنا غور طلب تھا جسکے دونوں ہاتھ مفلوج تھے مگر بی بی کا حکم تھا اس لئے اس نے بالو جاٹ کی اجازت سے اسکو مسلمان کیا اور اپنے عقد میں لے لیا۔

مزار کے گرداگرد اس نے رہنے کا انتظام کر لیا تھا۔ رات وہ اپنی جگہ پر سویا اور صبح کو بیدار ہوا تو لڑکی کو ہر طرح تندرست پایا اور اسکے چہرے پر نگاہ ڈالی تو وہ کسی

اپسرا کی طرح دمک رہا تھا راجکمار اسکو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ خود لڑکی کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیونکر اچھی ہو گئی۔ شاید اس مزار کی مٹی کا اثر تھا جو مزار کے گرد چکر لگاتے وقت اسکے جسم میں لگ گئی تھی۔

بالو جاٹ نے جب بیٹی میں یہ انقلاب دیکھا تو اسی وقت پورے قبیلے کے ساتھ مسلمان ہو گیا اور اسکے بعد "بیبیاں پاک داماناں" کے عقید تمندوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ لوگ بھی جو تھے تو بت پرست مگر پاک بیبیوں کی کرامت پر جن کا اعتقاد تھا۔ اس طرح مسلمانوں کے ورود ہندستان سے قبل وقت کے فصل سے راجکمار کا نام بابا خاکی مشہور ہو گیا اور پاک دامن بیبیوں کے نام بھی بدل گئے۔ جناب رقیہ کو بی بی حاج کہا جانے لگا۔ یہ نام غالباً کرامت حاجت روائی کی سبب پڑا ہوگا۔ حضرت عقیل کی بیٹیوں کے نام بی بی تاج بی بی حور بی بی نور بی بی گوہر بی بی شہباز زباں زد ہو گئے۔

ڈاکٹر مسعود رضا خاکی کی تحقیق کے مطابق کتابوں میں ان کے اسمائے مقدس ام ہانی ام لقمان اسماء، رملہ اور زینب پائے جاتے ہیں۔

کچی مٹی کا چبوترہ صدیوں تک مرکز عقیدت بنا رہا اور بابا خاکی کی اولاد کو مجاوری کا شرف حاصل رہا۔ غزنوی عہد میں ایاز نے اپنے قیام لاہور میں ایک خانقاہ کی تعمیر کرادی تھی۔ شاید وہ بھی بیبیاں پاک داماناں کے تقدس کا قائل تھا کیونکہ مشہور تھا کہ وہاں مانگی ہوئی دعا پوری ضرور ہوتی ہے۔

شہنشاہ اکبر کے زمانے میں خانقاہ کو نئے سرے سے تعمیر کرایا گیا جو ابتک باقی ہے اور زیارت گاہ عوام و خواص ہے۔

"یہ بھی کہا جاتا ہے کہ داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری جب لاہور آئے تو بی بی پاک دامن کے روضہ پر حاضر ہوئے اور وہاں چلہ کشی کی۔ وہ مقام جہاں داتا صاحب نے چلہ کھینچا تھا اب بھی موجود ہے۔

داتا صاحب کو اس روضہ اقدس سے کیسی عقیدت تھی اور وہ بی بی پاک دامن کا کتنا احترام کرتے تھے اس کا اندازہ اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ بی بی دامن کے مزار سے چالیس قدم کے فاصلے تک داتا صاحب گھٹنوں کے بل چل کر

مزار تک آتے تھے اور اسی طرح واپس جاتے تھے۔" (۱۱۲)

تاریخی تحقیق کے نام پر اہل قلم اہل بیت کے واقعات کو جس طرح مسخ کرتے رہے ہیں اسکی ایک نظیر بی بی پاک دامن کے سلسلے میں بھی ملتی ہے۔ خاندان رسالت سے ان کا تعلق مشکوک کرنے کیلئے بعض کہانیوں کو تاریخ کا نام دیا گیا ہے اس لئے حقیقت کو واشگاف کرنے کیلئے حالات مابعد کربلا پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

۱۱ محرم ۶۱ھ کو جب اسیران کربلا کا قافلہ روانہ ہوا تو وہ مردوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھا۔ ان کی تعداد بعض نے چوراسی لکھی ہے بعض نے کچھ زائد۔ ان ۸۴ میں گیارہ بچے اور ایک امام زین العابدینؑ، بیس عورتیں اور باون بچیاں شامل تھیں۔ بچیوں میں بعض بڑی اور بعض بہت چھوٹی تھیں۔ تعداد اور تصریحات میں تذکرہ نگاروں کا اختلاف ہے۔

ان میں رقیہ بنت علی زوجہ جناب مسلم بھی شامل تھیں اور ایک نام ام ہانی کا بھی ملتا ہے لہذا یہ مسلم ہے کہ وہ قید ہو کر دمشق پہنچیں اور قافلے کے بچے کھچے لوگوں کے ساتھ رہا ہو کر مدینہ واپس ہوئیں۔

ایک بدیہی حقیقت یہ بھی ہے کہ شہدائے بنی ہاشم میں اولیت کا شرف اولاد حضرت عقیل کو حاصل ہے اور تعداد میں بھی وہ زائد تھے۔ خود جناب مسلم اور ان کے دو بچے جو کوفے میں شہید ہوئے ان کو جوڑ لیا جائے تو وہ بنی ہاشم کے کل شہداء کا کم و بیش نصف ٹھہریں گے۔

رہائی کے بعد مدینہ پہنچنے والے قافلے میں کتنے بچے واپس ہو سکے، اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا البتہ کربلا سے کوفہ جانیوالی شاہراہ پر دو رویہ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بنی ہوئی قبریں اسکی شہادت ضرور دیتی ہیں کہ یہ بچے تیز دوڑتے ہوئے اونٹوں کی پیٹھوں پر سے گر پڑے تھے جنکو صحرائیوں نے دفن کر دیا۔ بعض قبریں کوفہ و دمشق کے طویل راستے پر بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہیں وہ بھی اس بلا نصیب قافلے کے بچوں ہی کی ہوں گی۔ ان بچوں میں آل عقیل کے بچے کس تعداد میں تھے؟ کوئی کیونکر بتائے،

قافلہ جب مدینے پہنچا تو اہل قافلہ میں سے کسی کا پہچاننا آسان نہ تھا۔ کھال ہڈیوں سے چپک گئی تھی۔ بعض عورتیں چل تو سکتی تھیں مگر اس طرح جیسے مردہ کسی اعجاز سے حرکت کر رہا ہو۔ ان میں زینب کبریٰ بھی تھیں، ام کلثوم علیا بھی اور رقیہ عظمیٰ بھی۔

مدینے کا کیا عالم تھا؟ اسکی تصویر کشی الفاظ میں ممکن نہیں مگر تاریخ کی آنکھ نے دیکھا کہ مرد ڈاڑھیں مار مار کر رو رہے تھے اور عورتیں کھلے سر اور ننگے پاؤں محلہ بنی ہاشم کی طرف دوڑتی چلی جا رہی تھیں۔ پھر تلاطم میں کچھ کمی آ گئی لیکن جانے والے روز جاتے رہے اور روداد کربلا اور مصائب کوفہ و شام شب و روز بیان ہوتے رہے۔ گویا داغ بیل پڑ رہی تھی واقعہ عزا کی۔

اہل مدینہ نے بعد رحلت رسولؐ سیدہ کونین سے کہلوایا تھا کہ ان کے بین سے لوگوں کے معمولات زندگی پر اثر پڑتا ہے اس لئے دن کو رو لیا کریں یا رات کو! یہ تھی ابتداء رونے پر پابندی لگنے کی مگر اسکی تہہ میں جو بات تھی وہ کہی نہیں گئی کہ فاطمہ زہرا کی آواز سن کر سننے والوں کے دل ہل جاتے ہیں اور وہ سوچنے لگتے ہیں کہ ایک بیٹی جس کا باپ کے غم میں یہ عالم ہے اسکو کس طرح محرومیوں کا نشانہ بنا دیا گیا؟ ذہنی انقلاب کو روکنے کی خاطر بلند آواز سے گریہ کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور شہزادی نے اسکے بعد سے روضہ رسولؐ پر جا کر بین کرنا شروع کر دئے۔

آج اسی مدینے میں عامل بنی امیہ نے زینب و ام کلثوم سے کہلوایا تھا کہ واقعات کربلا اور سرگزشت دمشق کا بیان بند کر دیں ورنہ مدینہ چھوڑ کر کہیں چلی جائیں۔

دکھیاری زینب پر اس تہدید کا اثر کیا ہوتا۔ اسکے پاس یہی تو ایک شغل رہ گیا تھا اسکو وہ کیونکر چھوڑ دیتی اس نے سنی ان سنی کر دی مگر چالیس روز بعد جب ام کلثوم کا انتقال ہو گیا تو کربلا سے حسینؑ نے آواز دی۔ زینب ادھر چل پڑیں پھر سکینہ نے دمشق سے پکارا۔ پھوپھی میں اکیلی ہوں؟ زینب اس طرف روانہ ہو گئیں۔ وہاں سے حسینؑ کی مظلومیت کا پرچم سربلند کرنے کیلئے مصر گئیں۔

پھر مدینہ واپس آئیں تو ام سلمہ اور ام البنین صدموں کی تاب نہ لا کر خالق

حقیقی سے جا ملی تھیں۔ زینب پھر واپس ہو گئیں۔ کربلا گئیں وہاں سے دمشق پہنچیں سکینہ کی قبر کو دونوں ہاتھوں میں لے کر اسکی خاک پر منہ رکھ دیا اور سکینہ کا نام لیتے لیتے سو گئیں اور پھر کبھی نہیں اٹھیں۔

رقیہ بنت علی بھی مدینہ واپس آئی تھیں۔ ان کا عالم بھی زینب و ام کلثوم سے کچھ مختلف نہ تھا۔ رہ ہی کون گیا تھا جسکے لئے انہیں زندہ رہنے کا حوصلہ ہوتا۔ ان کا بھی وہی کام تھا جو زینب و ام کلثوم کا تھا۔ بنی امیہ کی پابندی ان کیلئے بھی وہی تھی جو دوسری بہنوں کے لئے۔

جب ام کلثوم کی وفات کے بعد زینب نے مدینہ چھوڑ دیا تو رقیہ اور بنی ہاشم کی دیگر خواتین جو دمشق سے پلٹ کر آئی تھیں ان سب نے اس منصب کو جاری رکھا جو کربلا کے شہیدان کے سپرد کر گئے تھے۔ دلدوز حالات اور جگر خراش واقعات کو وہ بنی ہاشم کی فصاحت و بلاغت میں بیان کرتی رہیں، مدینے میں برپا ہونیوالی قیامت کو انہوں نے اسی طرح جاری رکھا۔

اس طرف بنی امیہ خون ناحق کی پردہ پوشی چاہتے تھے کیونکہ عرب سے عراق و ایران تک کا ہر چھوٹا بڑا فاطمہ کی اولاد کے قتل پر مشتعل تھا۔ اسیران کربلا کو شام و کوفہ میں جو کچھ کرنا تھا اور کر چکے تھے۔ اب مدینے میں نواحی قبائل کے وفود کربلا کی آواز بازگشت سن سن کر آ رہے تھے۔ باہر سید سجاد آپ بیتی بیان کرتے اندر یہ نیم جان خواتین درد بھری داستانیں سناتیں اور نتیجے میں یزید پر لعنت کا سلسلہ شروع ہو جاتا جو آج تک جاری ہے۔

پہلے بنی امیہ نے مقتولین کے سروں کو نیزوں پر چڑھایا تھا، اب خون شہیداں رنگ لایا تھا تو سارا الزام سپاہ کوفہ و شام کے سرداروں پر ڈال دیا گیا اور یزید کو مطعون کرنیوالوں کیلئے گرفتاری کا حکم ہو گیا۔ سید سجاد امام وقت تھے وہ اعلائے کلمۃ الحق میں کسی جابرانہ روش سے مرعوب کیا ہوتے مگر عورتوں نے سوچا کہ زبان بند رکھنا ان کیلئے ممکن نہیں ہے تو کیوں نہ زینب کبریٰ کی تاسی کریں اور ظالموں کی زد سے ہٹ کر دنیا کو مقاصد شہادت سے آشنا کریں۔

سادات کی نقل مکانی کا سلسلہ معاویہ کے وقت سے شروع ہو چکا تھا اور

بعض خاندان سیستان و مکران چلے گئے تھے کچھ مراقش و مصر کی طرف۔ سیستان میں شنسب بن حریق کی حکومت تھی جو خود کوفہ آکر حضرت علی ابن ابی طالب کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ اسکی حکومت غور سے موجودہ بلوچستان تک تھی۔ ان حالات میں ہو سکتا ہے کہ جناب رقیہ اور بنات عقیل نے باقی زندگی صرف نظریہ کربلا کی اشاعت کیلئے وقف کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ قرائن و قیاسات کا یہ تاریخی استنباط دستاویزی ثبوت کا محتاج ہے مگر حالات کی روشنی میں صدفی صد صحیح معلوم ہوتا ہے۔

حضرت مسلم کی ایک بچی اور دو بیٹوں کا کربلا میں موجود ہونا ثابت ہے۔ عبداللہ و محمد جو اگرچہ بہت کم سن تھے مگر بنی ہاشم کی جنگ کا آغاز غالباً انہیں بچوں سے ہوا اور وہ یکے بعد دیگرے درجات شہادت پر فائز ہوگئے۔ بچی کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ قید سے واپس ہو سکی یا نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جناب مسلم کی دوسری بیوی کے بطن سے ہو اور حضرت عقیل کی اولاد تو بیشتر قتل ہو چکی تھی بہت کم لوگ باقی تھے لہذا جناب رقیہ اور خاندان عقیل کی دوسری خواتین کیلئے نسلی کشش برائے نام رہ گئی تھی اسپر ظالم بنی امیہ کا دباؤ۔ قرین عقل ہے کہ جناب رقیہ بنت علی نے سوچا ہو کہ ورثاء کے بعد خود انہیں بھی شرکت جہاد کرنا چاہئے اور ان کیلئے یہی جہاد تھا کہ حق و باطل کی نوعیت جنگ کو کسی دوسرے رنگ میں پیش نہ ہونے دیں اس لئے علی کی تیسری بیٹی نے اس سمت کا رخ کیا جدھر جناب زینب کے پہنچ سکنے کا امکان نہ تھا۔

یقیناً وہ نکلی ہوں گی شنسب بن حریق کے علاقے کیلئے لیکن بنی امیہ کے خوف سے راستہ بدل بدل کر آگے بڑھیں تو داہنی طرف جانے کے بجائے بائیں جانب چلی گئیں اور سیستان کے بجائے ہندوستان میں داخل ہو گئیں۔

قرائن اور امکانات کی روشنی میں علیؑ کی بیٹی کا پنجاب پہنچ جانا بالکل سامنے کی بات ہے اور جناب زینب کی طرح حضرت رقیہ کا مدینے سے چلنا بعید القیاس نہیں پھر انجانے راستوں پر پہلے کے بجائے دوسرے راستے پر چل پڑنا بھی بشریت ہے۔ اس لئے بیبیان پاک داماں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ جناب رقیہ اور بنات

حضرت عقیل ہی تھیں جنہوں نے جیتے جی بھی کارنمایاں انجام دئے اور مرنے کے بعد اہل بیت کی عظمت کے چراغ روشن کر رہی ہیں لیکن شیعہ محققین کو اس سے اتفاق نہیں

مشاہد سادات کا دامن اتنا وسیع ہے کہ پورے ایشیا پر بسیط ہے بلکہ یورپ کے بعض مقامات پر بھی اس کا پرتو پڑتا نظر آتا ہے۔

عرب، عراق، ایران، شام، لبنان، فلسطین، برصغیر ہندوستان و سندھ کے جس حصے میں دیکھا جائے کسی نہ کسی گوشے میں پرچم اہل بیت لہراتا نظر آئے گا۔ مختلف جگہوں پر اسکے مختلف نام ہیں مگر کام سب کا ایک ہے: آل رسول کی سربلندی انکی صداقت و عظمت کا مظاہرہ! کوئی قبر خراسان کے کسی گوشے میں ہو پنجاب کی کسی پہاڑی پر مکران کے کوہستان میں یا سندھ کے ریگزار میں اس کا نام صفی الدین اردبیلی ہو امام بری ہو، بابا کوہی ہو یا لعل شہباز قلندر وہ سب مشاہد سادات کے اجزاء ہیں اور ان کے بیان کیلئے ہزاروں صفحات ناکافی ہوں گے لہذا صرف عنوان کی خانہ پری پر اکتفاء کی جاتی ہے۔

بعض جلی نام یقیناً قابل ذکر تھے مگر بڑی مجبوری کے ساتھ ان کی ارواح مقدسہ سے معذرت کر لی گئی۔ توفیقات الہی نے ساتھ دیا تو بارگاہ اہل بیت میں ان کے اذکار کا نذرانہ ضرور پیش کیا جائے گا۔

اہل بیت اور مشرق بعید

خانوادہ رسالت کیلئے کسی خطہ ارض میں تبلیغ اسلام کا سوال ہی کیا تھا جبکہ وہ اپنے وطن ہی میں محفوظ نہ تھے اور جانیں بچانے کی خاطر اطراف و جوانب میں چھپتے پھرتے تھے۔ جس کسی کو موقع مل جاتا وہ مسلم حکومت کی سرحدیں پار کر کے ان خطوں میں پہنچ جاتا جہاں کوئی اسلام کے نام پر انہیں واجب القتل قرار نہ دیتا۔

سیستان و مکران کی طرح وہ ہندوستانی علاقوں میں پہنچے اور اکثر زندگیاں
عبادت الٰہی میں گزار کر گمنامی کی موت مرگئے۔ مقامی باشندے یہ تو جانتے ہیں کہ
ایک نیک و پارسا آدمی کی قبر ہے مگر کسی کو یہ نہیں معلوم کہ مرنیوالا کون تھا کہاں
سے آیا تھا؟ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہیں موقع مل گیا۔ انہوں نے مقامی زبانیں
سیکھ کر پہلے انسانیت کا درس عام کیا پھر اسلام سے آشنا کرایا۔ آخر میں محمد وآل محمد
کی حقیقت بتائی۔ یہ لوگ عموماً حلقہ تصوف میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔

ترک وطن کرنیوالے سادات عموماً خشکی کے مسافر رہے۔ تاریخ نے کسی
ادریس اکبر کو مراقش کے سوا کسی اور سمت میں جاتے نہیں دیکھا لیکن حقیقت یہ
ہے کہ ہندوستان کے جنوبی مشرقی اور مغربی ساحلوں پر بہت سے مزارات ایسے
پائے جاتے ہیں جو سادات کرام یا محبان علیؑ کے ہیں۔ اسلامی دور میں حیدر علی اور
ٹیپو سلطان کا قبیلہ نوائط بمعنی ملاح بھی انہیں میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

مشرق بعید میں ملائشیا، جاوا اور سماترا وغیرہ میں بعض قبروں کے کتبے
دستیاب ہوئے ہیں ان کے نام متجسس ذہنوں کیلئے ایک نشاندہی ضرور کرتے ہیں
مگر ان کے بارے میں یقین سے کچھ کہا نہیں جاسکتا کیونکہ اسکے بعد شافعی تاجران
جزائر میں کثرت سے پہنچنے لگے اور انکی متصوفانہ تبلیغ حلقہ اسلام کو وسیع سے وسیع تر
کرتی رہی جس میں پہلے سے پہنچے ہوئے لوگ مدغم ہوگئے کیونکہ شاید انکی زندگیوں
نے وفا نہیں کی یا اسلام کیلئے زمین ہموار کرتے ہی کرتے خدا کو پیارے ہوگئے۔

سماترا کے مسلمانوں کے بارے میں ایک سیاح کا بیان ہے۔

" محرم میں ہندوستانی مسلمانوں کی طرح باقاعدہ پٹے بازی کرتے ہیں،
شہادت حسینؑ کا ذکر سنتے ہیں ان میں قوالیاں بھی ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔" (۱۱۴)

یہ غالباً شافعیت کے اثر سے ہوا ہے مگر تعزیہ داری کے بارے میں کوئی پتہ
نہیں چل سکا البتہ شبیہوں کو بدعت نہیں سمجھا جاتا اس لئے ممکن ہے کہ کسی
جزیرے میں اس کا رواج ہو البتہ برما میں عشرہ محرم منایا جاتا ہے۔

بنگال وآسام کے مختلف مقامات پر یقیناً ایسی قبور کا سراغ ملتا ہے جو صدفی
صد خاندان رسالت سے متعلق افراد کی ہیں۔ سلہٹ میں ایک مزار سید جلال شاہ کا

ہے جس پر گنبد بنا ہوا ہے۔ مزار میں سرخ آنکھوں والے کبوتر بکثرت پائے جاتے
ہیں جو جلالی کبوتر کہلاتے ہیں مگر وہ گنبد کے اوپر جاکر کبھی نہیں بیٹھتے۔ جلال شاہ
کے مزار پر منتیں بھی مانی جاتی ہیں جو بنت رسول کا واسطہ دینے سے پوری ہوتی ہیں۔

اسی طرح کا ایک مزار میرپور مشرقی بنگال میں بھی ہے جو سید علی شاہ
بغدادی کا مزار کہلاتا ہے۔ اسپر عام دنوں میں ایک کالی چادر پڑی رہتی ہے۔ اسکے اوپر
سرخ چادر ڈال دی جاتی ہے لیکن یکم محرم کو سرخ چادر آتار لی جاتی ہے صرف کالی
چادر رہ جاتی ہے۔ ۱۲ صفر کو پھر سرخ چادر ڈال دی جاتی ہے۔

مجاوروں کا کہنا ہے کہ اسکی وصیت سیکڑوں سال پہلے بابا نے کی تھی۔ اسپر
مسلسل عمل کیا جاتا رہا ہے۔ اس مزار پر بھی سیدہ کونین کے حوالے سے دعا قبول
ہوتی ہے۔

اسی طرح بعض مقابر دوسرے مقامات پر بھی پائے جاتے ہیں جن سے
اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب بنی عباس کے طوفان ظلم میں بچ بچاکر کسی طرح ان
مقامات پر پہنچے اور اپنی زندگیاں تمام کرگئے۔ بکھرے گل ریاض پیمبر کہاں کہاں!

ڈھاکہ کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے وہاں بھی شافعی مسلمان زیادہ
پائے جاتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد سے حنفیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور کچھ شیعہ
بھی پائے جاتے ہیں۔ غیر منقسم بنگال میں بھی جابجا شیعہ موجود تھے۔ شاید کوئی
شیعہ عالم وہاں پہنچا ہو اور اس نے مسلک اہل بیت کی تبلیغ کی ہو۔

بزرگوں کے مزارات میں بعض قبور سادات کی معلوم ہوتی ہیں۔ مغل دور
میں ڈھاکہ کا نام جہانگیر آباد تھا جو مرشد آباد کی گورنری میں شامل تھا۔ بنگال و بہار
کے مشترکہ صوبے کے گورنر لگ بھگ ایک صدی تک شیعہ ہی رہے مگر ان میں
سے کسی نے ترویج مذہب کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔

میر جملہ کے عہد تک یہ علاقہ محبان اہل بیت سے خالی تھا۔ شائستہ خاں کے
دور میں میر مراد حاکم جہانگیر آباد تھا تو اس نے ایک رات خواب میں امام حسینؑ کو
دیکھا آپ نے ایک جگہ کا تعین کرکے میر مراد کو حکم دیا کہ اس جگہ امام باڑے کی تعمیر
کرو اور ہمارے ذکر کی مجلس منعقد کرو۔

میر مراد سو کر بیدار ہوا تو فوراً تعمیل کیلئے روانہ ہو گیا۔ سبط پیغمبر کے حکم کو وہ ٹال نہ سکتا اس نے تعمیر شروع کرادی اور امام باڑہ بنکر تیار ہوا تو اس کا نام حسینی دالان رکھا گیا۔

اسکی اطلاع مرشد آباد اور مرشد آباد سے دہلی پہنچی تو مغل بادشاہ نے ایک ضریح بنواکر بعض امراء کو روانہ کیا تاکہ امام باڑے کی نذر کرے اور رسولؐ کے نواسے سے اسکے لیئے دعا مانگے مگر شدید سیلاب کے سبب وہ جہانگیر آباد پہنچ نہ سکا اور ضریح اسکے بجائے حاکم مرشد آباد نے جاکر امام باڑے میں چڑھائی۔ یہ ضریح ابتک موجود ہے۔

اسکے بعد سے شیعان علی ایام محرم میں جمع ہونے لگے اور حسینی دالان میں مجلس شروع ہو گئی جن میں آہستہ آہستہ اہل سنت بھی شریک ہونے لگے پھر اسی حسینی دالان سے عاشور کا جلوس برآمد ہونے لگا جو دھان منڈی میں اختتام پذیر ہوتا تھا۔ ضریح حسینی دالان میں واپس آجاتی اور تعزیے دھان منڈی میں دفن کر دئے جاتے۔

پاکستان بننے کے بعد ۲۰ صفر کا جلوس بھی نکالا جانے لگا۔

ایک بنگالی شیعہ نے بھی اسکے بعد اپنے گھر میں امام باڑہ بنوایا اور اس میں بھی مجلسیں منعقد ہونے لگیں پھر خوجوں کے اور اصفہانی کے امام باڑے بنے اور فی زمانہ ڈھاکہ میں جو محرم ہوتا ہے وہ کسی دوسری جگہ کے محرم سے کم نہیں۔

عزائے امامؑ کا یہ سلسلہ شہروں تک محدود نہیں ہے۔ کوہستانی قبائل میں بھی نوعیت کی تبدیلی کے ساتھ اس کا رواج ہے۔ اراکان کی پہاڑیوں میں بسنے والے قبیلوں کو بھی ماتم کرتے دیکھا گیا ہے اور برما میں تو اس کا انداز ہی مختلف ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جب برما پر جاپانیوں کی بمباری نے شدت اختیار کی اور لوگ جانیں بچانے کیلئے ترک وطن پر مجبور ہوئے تو ایک گروہ لکھنؤ بھی پہنچا اس نے دہکتے ہوئے انگاروں پر چل کر ماتم کیا۔ اسکے بعد ہندوستان کے مختلف حصوں میں اس کا رواج ہو گیا۔

برمیوں نے ایک لمبی خندق کھودی تھی اور اسکو کوئلوں سے بھر کر ایک لمبا آتش کدہ بنادیا تھا۔ اسپر وہ سروپا برہنہ دولہا دولہا کے نعرے لگاتے ہوئے آہستہ آہستہ گزرتے تھے۔ یہ عمل غسل کرنے کے بعد کیا گیا تھا اور پیروں پر کسی قسم کا مسالہ بھی لگایا نہیں گیا تھا لہذا اسکو جذبہ عقیدت کی کرامات یا حضرت قاسمؑ کا معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

اس طرح کے مظاہرے برما سیام اور مشرق بعید کے ہر حصے میں ہوتے ہیں جو شہدائے کربلا کا اعجاز ہے

یہ آگ کا ماتم دکنی ہندوستان میں بھی ہوتا تھا۔ نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی۔ دکن کے قدیم مرہٹوں میں بھی اس کا رواج تھا۔ اس میں ہندو مسلم کی کوئی قید نہ تھی۔ شہدائے کربلا سے عقیدت رکھنے والے پاک و پاکیزہ ہو کر دہکتے انگاروں پر سے گزرتے تھے ہاتھ میں علم ہوتا اور وہ علی دولھا کے نعرے لگاتے۔ ممکن ہے اپنے جذبہ عقیدت کی ازمائش کرتے ہوں اس میں منتیں بھی مانی جاتیں اور مراد برآنے پر اگلے محرم میں پاپیادہ اور سربرہنہ انگاروں کو پھول سمجھ کر انگاروں میں راستہ بنایا جاتا۔ ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں بھی اسکے رواج کا پتہ چلا ہے مگر صرف دولہا کا نام لے کر شاید ان کا عقیدہ تھا کہ کربلا کا دولہا انگاروں کو پھول بنادیتا ہے۔

صراطِ مستقیم

ماتم حسین!

سن اکسٹھ ہجری سے پندرھویں صدی ہجری تک اسلام کے مسلک ہدایت پر کوئی غیر مرئی خط مستقیم کھینچا جائے تو اسیر کوفہ و دمشق کے ایوانہائے تشدد، کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک کی سفاکانہ داستانیں منعکس ہوتی نظر آئیں گی۔ اہل نظر کو جور و ستم کے وہ مناظر دکھائی دیں گے جن سے انسانیت کانپ اٹھے اور اہل سماعت کو ایسی جگر خراش چیخیں سنائی دیں گی کہ حساس دل و دماغ جنکی تاب نہ لاسکیں۔ ان کے پس منظر میں شجاعان روزگار کے وہ نعرے جو صبح عاشور سے عصر تک بلند ہوتے رہے اور دوش ہوا پر شام و عراق اور عرب کی فضاؤں میں گونجے پھر وقت کی طنابیں کھینچتے ہوئے ہر دور میں کربلا کی آواز بازگشت بن گئے۔

مستزاد ہیں جلے ہوئے خیموں کی راکھ پر بیٹھی ہوئی سیدانیوں کے بین، جو شام غریبان کی بھیانک تاریکی سے شروع ہوئے لیکن آجتک افق ماضی سے سنائی دیتے ہیں۔ ان کے بیچ بیچ ایک بچی کی سسکیاں بھی کانوں میں پڑتی ہیں جس نے کبھی سنگدل کوفیوں کے دلوں کو منقلب کر دیا تھا اور بنظر غائر دیکھا جائے تو ماتم حسین کا مرکز اول یہی بچی تھی جس نے کربلا کے باب مظلومیت پر مہر دوام ثبت کر دی۔

سکینہ بنت حسینؑ پر کیچڑ اچھالنے والے یہ بھول گئے کہ اس بچی کی عمر ۶۱ھ میں چار سال سے کم تھی اور ۵ ربیع الاول ۶۱ھ کو وہ دمشق کے قید خانے میں خاک کا پیوند ہو گئی جس نے حضرت عباس کے بعد پانی کا سوال تو نہیں کیا مگر جب شمر ذی الجوشن کا تازیانہ پڑا تو مدد کیلئے چچا کو آواز ضرور دی۔

کربلا کے اسیروں میں زینب کبری ام کلثوم علیا، حضرت زین العابدین اور دیگر مخدرات طاہرہ کی سیرتوں کو یقیناً اہمیت ہے اور ان کے کردار غیر فانی ہیں۔ فاطمہ زہرا کی اولاد مصائب کی ان منزلوں پر پہنچ چکی تھی جہاں وہ پہچانی نہ جاتی لیکن بیرحم بنی امیہ نے اس موقع پر گھناؤنی سازش کا آخری حربہ بھی استعمال کر ڈالا اور مقید خواتین میں پھوٹ ڈالنے کیلئے عورتوں کے گوش گزار کرایا کہ امام حسینؑ ان کے شہید ورثاء کو نہ لاتے تو وہ قتل نہ ہوتے۔ منشاء یہ تھا کہ عورتیں زینب و ام کلثوم کو زندان میں چھوڑ کر چلی جائیں اور اموی حکمران ان کو نواز کر متعلق قبیلوں کو منت گزار بنالیں لیکن باوفا اصحاب حسینؑ کی تربیت یافتہ خواتین ٹس سے مس نہ ہوئیں بلکہ ایسی ہر تحریک پر وہ رسولؐ کی نواسیوں کے قدموں پر جا گریں اور اپنے وارثوں کی وفا و شجاعت کے کارنامے بیان کرنے لگیں۔

حسینی مشن کی تکمیل میں ان باعظمت خواتین کا بڑا حصہ ہے۔ علی کی بیٹیوں کی زبان ان کے منہ میں ہوتی تو وہ بھی شام و کوفہ کے بازاروں کو الٹ کر رکھ دیتیں پھر بھی ان سے جو کچھ ہو سکا وہ انہوں نے کیا۔ اپنے اپنے قبیلوں کا تعارف کرایا۔ رزم کربلا میں اپنے اپنے مردوں کے کارنامے بیان کیے اور اس طرح اہل قبائل کو ایک پیغام بھجوایا کہ تمہارے افراد نے آل رسول کی حمایت میں گردنیں کٹوا کر نام روشن کر دئے۔

یہی بیانات تھے جو انقلاب کا پیش خیمہ بنے اور بعض امویوں کی چھپی ہوئی حمیت میں بھی ایک ابال پیدا ہونے لگا لیکن دمشق کا محضر انقلاب حقیقتاً حسینؑ کی چار سال کی بچی نے لکھا۔ یوں تو اسکی تبلیغی مہم عشرہ محرم سے شروع ہو چکی تھی مگر ایک طرح پر اس کا آغاز سیدانیوں کے قافلے کی کربلا سے روانگی کے بعد ہوا۔ سفر کے دوران سنگدل کوفیوں کے علاوہ کوئی اسکی تڑپ اور بے بسی کا دیکھنے والا نہ تھا مگر ان

میں سے بعض اسکی حالت پر دل تھام کر رہ گئے۔ مردہ ضمیروں میں ایک احساس پیدا ہوا لیکن وہ شمر کو بیرحمی سے روک نہ سکے کیونکہ روکتے تو ان کے مفاد دنیا کو ٹھیس لگتی۔

عصر عاشور سے قبل کربلا میں چھ ماہ کے بھائی نے زبان خشک ہونٹوں پر پھیر کر شاہی درندوں میں ایک ہلچل ڈال دی تھی، رہ کوفہ میں چار سالہ بہن نے بعض دلوں کو ہلا ڈالا۔ نتیجہ وہاں بھی یہی نکلا تھا کہ حرملہ کے تیر سہ شعبہ نے اصغر کو شہید کر دیا تھا، یہاں بھی سکینہ کوفے تک طمانچے پر طمانچے کھاتی رہی البتہ یزید کے دربار میں اور قید خانہ شام میں حسینؑ کی معصوم بیٹی نے اپنے فرض کو ادا کیا اور اس طرح ادا کیا کہ عورتیں اپنے مردوں سے جو کچھ کہتی تھیں وہ تو کہتی ہی تھیں، بچوں نے بھی اپنے بزرگوں کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

"سکینہ کہتی تھی کہ اسکے باپ پیغمبر اسلام کے نواسے ہیں۔"

بزرگ اسکی تردید نہ کر سکتے انہیں اثبات میں جواب دینا پڑا اور بچوں نے وہ کہہ ڈالا جو کوئی غیر سیاسی ذہن کہہ سکتا ہے۔ "ہم جن کا کلمہ پڑھتے ہیں انہیں کے نواسے کو مار ڈالا؟"

عام حالات میں اس تبصرے پر بچے ڈانٹ دئے جاتے مگر جو کچھ ہوا تھا اس سے مرد اور عورتیں سب متاثر تھے۔ دمشق کے وہ کوچہ بازار جنکو قیدیوں کی آمد پر مزین کیا گیا تھا انہیں میں ایک سوگوارنہ فضا پیدا ہونے لگی۔

عورتوں میں زینب و ام کلثوم اپنا تعارف کراتی رہیں اور واقعات کربلا بیان کر کے عورتوں کو رلاتی رہیں اور در زندان پر کھڑے ہو کر سکینہ باپ اور چچا کی محبت کا ذکر کر کے خود بھی روتی رہی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی آبدیدہ کرتی رہی

یہ تھی مجلس حسینؑ کی ابتداء جسکی داغ بیل دو ماہ چند روز کی زندگی میں حسینؑ کی چہیتی بیٹی ڈال گئی اور مجلسوں کی بانی اگر فاطمہ زہرہؑ کی بیٹیوں کو قرار دیا جائے تو سکینہ کی فریاد اور نالہ و شیون ماتم حسین کا نقطہ آغاز ٹھہرے گا اور ہمارا طرز عزاء خواتین کربلا اور سکینہ بنت الحسین کی تاسی کا مصداق ہو گا۔

پہلی مجلس

تاریخ کی روشنی میں پہلی مجلس عزا اہل بیت کی رہائی سے قبل زندان شام میں منعقد ہوئی پھر کربلا میں مشاہد شہداء پر جہاں جابر ابن عبداللہ انصاری نے پہلی بار زیارت قبر حسین کا شرف حاصل کیا۔

پھر ورود مدینہ کے بعد شب و روز مجلس ہی مجلس، ماتم ہی ماتم۔ اب حسینؑ کی لاڈلی بیٹی زندہ نہ تھی اسکی جگہ فاطمہ صغریٰ اور ام سلمہؑ نے لی اور خواتین مدینہ میں جو بھی آیا اس نے ایک شور ماتم بلند کیا۔ ہائے حسین کی صداؤں میں کسی کسی وقت ہائے سکینہ کی آواز بھی بلند ہو جاتی تھی۔

مدینے کے اموی اسکو برداشت نہ کرتے۔ انہوں نے فاطمہؑ کی بیٹیوں پر جبر کرنا شروع کر دیا کہ یہ ماتم بند کریں یا مدینہ چھوڑ دیں مگر زینب غریب کیا کرتی کہاں جاتی!

یہ تھی ابتداء ماتم حسین بند کرانے کی جسکی تقلید آجتک کی جاتی ہے۔

آخر چالیس روز بعد جناب ام کلثوم نے دنیا ہی چھوڑ دی تو زینب کے پاؤں کی وہ زنجیر ٹوٹ گئی تھی جو انہیں مدینے میں روکے ہوئے تھی۔ اور یوں بھی زینب ہمہ وقت ایک کرب، ایک اضطراب میں مبتلا رہتیں۔ امویوں کا تشدد بڑھتا جا رہا تھا۔ زینب ماں کی قبر پر گئیں، نانا کے روضے سے رخصت ہوئیں، بھتیجے کو گلے سے لگایا، عزیزو اقارب اور اہل مدینہ کو خدا حافظ کہا اور مدینے سے اس طرح نکلیں جیسے انسانوں کے جھرمٹ میں کوئی خود اپنا جنازہ اٹھائے نکل رہا ہو۔

اور تھیں بھی وہ کسی میت سے کم نہیں! گوشت جسم میں تھا نہیں، کھال ہڈیوں سے چپک گئی تھی، قدم اٹھانے کی توانائی باقی نہ تھی، امویوں کی تلوار سر پر لٹک رہی تھی۔ مدینے میں رہتیں تو بیان کربلا نہ کرنا، بھائی کو، سکینہ کو، عباس کو علی اکبر کو، عون و محمد کو اور دوسرے شہداء کو یاد کر کے نہ رونا، امکان سے باہر تھا ادھر شاید سکینہ زندان شام سے آواز دے رہی تھی۔

"پھوپھی! میں اکیلی ہوں، چچا کو بھیج دو۔"

لیکن عباس فرات پر شانے کٹا چکے تھے۔ زینب انہیں کیونکر بھیجتیں لہذا کہا ہو گا

"سکینہ! گھبراؤ نہیں، میں آرہی ہوں!"

اور زینب کربلا کی طرف روانہ ہوگئیں۔ سیدالشہداء سے اور عظیم شہیدوں سے زینب نے کیا کہا اور انہیں کیا کیا جوابات ملے؟ اس کا تو علم نہیں لیکن کربلا سے چلتے وقت زینب نے بھائی کی قبر پر کھڑے ہو کر کہا تھا۔

"بھیا! دمشق جارہی ہوں، سکینہ یاد کرتی ہوگی!"

امویوں نے زینب کو مدینے سے نکالا تھا کہ مجلسیں بند ہوجائیں، ماتم نہ ہو مگر ہوا اسکے برعکس، کربلا کے شہیدوں میں ام کلثوم اور زینب کے ناموں کا اضافہ ہوگیا۔ امام زین العابدین، پورا خانوادہ رسالت اور محبان آل رسول سب اپنی اپنی جگہوں پر مجلسیں منعقد کرنے لگے اور خواتین کے بین کسی کے روکے رک نہ سکے۔

دوسری طرف زینب کبریٰ جہاں پہنچیں وہاں مجلس اور حسینؑ کا ماتم امویوں نے مدینے میں پابندی لگائی تھی مگر ذکر کربلا زینب کے سفر کے ساتھ پھیلتا رہا۔ کربلا سے دمشق تک جہاں جہاں آپ نے قیام فرمایا وہاں بنی امیہ کی قساوت اور اولاد فاطمہؑ کی مظلومیت کے چرچے ہونے لگے۔ پہلے صرف زینب خطیب تھیں آہستہ آہستہ انکی جگہ دوسروں نے لے لی۔ ایک بیان کرتا، سب سنتے اور شور گریہ بلند ہوجاتا۔

اس طرح یہ مجلسیں پھیلتی رہیں۔ اموی اور ان کے جانشین روکتے رہے جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ہر دور میں مجلس و ماتم اور ہر دور میں ظالموں کی اولاد سدراہ مگر حق کا راستہ بند کرنے سے کبھی بند نہیں ہوا۔ کربلا ایک صراط مستقیم ہے جسکو حشر تک جانا ہے۔ یزید کسی عہد کا بھی ہو اس صراط مستقیم کو آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ابن خلدون کی ناصبیت، امام غزالی کے فتاوے، ابن تیمیہ کے فقہی اجتہادات اور آخر میں محمد بن عبدالوہاب کی محمدؐ وآل محمدؐ دشمنی نہ کبھی اسکو روک سکی ہے اور نہ روک سکے گی۔ ظالم کی صفائی میں کتنا ہی کچھ کہا جائے کتابوں پر کتابیں لکھی جائیں لیکن مظلومیت اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا!

مدینہ، کربلا، دمشق اور مصر میں تو خود بنت علیؑ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ دوسرے مقامات پر مظلومیت اپنی سرگزشت بیان کرتی ہے پھر بھی غور سے سنا جائے تو اس میں بھی زینب کبریٰ کا لب و لہجہ محسوس ہوتا ہے۔

حسینؑ کی بہن بلاشبہ کربلا کی آواز تھیں۔ ایک بار مدینے سے جانے کے بعد وہ کب واپس آئیں؟ یقین سے کہا نہیں جاسکتا۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ سے زائد آنا نہ ہوا ہوگا کیونکہ دمشق سے آپ کا مصر پہنچنا بھی ثابت ہے اور مصر کہتا ہے کہ زہراؑ کی ناموربیٹی میری خاک میں آسودہ خواب ہے!

اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو جناب زینب ایکبار دمشق سے کربلا ہوتی ہوئی مدینے آئیں اور دوسرے سفر میں کربلا سے دمشق اور دمشق سے مصر گئیں جہاں سے واپس نہ ہوسکیں۔

بنیادی طور پر مصر جانے کے اسباب و عوامل کا پتہ نہیں چلتا۔ ہوسکتا ہے کہ دمشق میں مصر کا کوئی محب اہل بیت ملا ہو اور اس نے اس سرزمین پر کربلا کا پیغام پہنچانے کی ترغیب دلائی ہو اور آپ تیار ہوگئی ہوں کیونکہ اب تو یہی آپ کا مقصد حیات رہ گیا تھا لیکن مصر میں آپ کا مدفون ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

حالات کا جائزہ لیا جائے تو زینب کبریٰ رہا ہو کر مدینہ پہنچنے کے بعد چھ ماہ زندہ رہیں۔ چالیس روز تک ام کلثوم کے ساتھ درد و غم کی داستانیں بیان کرتی رہیں ام کلثوم کے بعد ہفتہ عشرہ مدینے میں گزارا ہی ہوگا کہ عازم سفر ہوگئیں۔

اس طرح کم از کم پونے دو ماہ مدینے کے پہلے قیام میں کٹ گئے۔ باقی رہے سوا چار ماہ اس میں سے ایک ہفتہ مدینے کے دوسرے قیام کا نکال دیا جائے تو صرف چار ماہ رہ جاتے ہیں۔ اس میں کربلا اور دمشق کے دو سفر۔ کسی ایک سفر میں سفر مصر بھی شامل ہے حالانکہ ذاتی طور پر آپ کا مصر جانا سمجھ میں نہیں آتا۔

محسوسات کا سہارا لے کر حقیقت کو سمجھا جائے تو اب زینب کیلئے مدینے کی کشش ختم ہوچکی تھی۔ ام کلثوم کے بعد ام سلمہ اور ام البنین بھی زندگی سے اپنا رشتہ توڑ چکی تھیں۔ باقیات الصالحات کیلئے امام وقت کافی تھے۔ زینب کربلا اور

دمشق میں بٹ کر رہ گئی تھیں ۔ دل و دماغ میں ہلچل ، کرب و بے چینی کا وہ عالم کہ قرار سے کوئی واسطہ ہی نہ رہ گیا تھا ، فاطمہ کی دکھیاری بیٹی روا روی کرتی ہوئی بھائی کی قبر پر پہنچتی کچھ کہتی رہتی ، پھر عباسؑ ، علی اکبرؑ اور ایک ایک کرکے ہر ایک کے مزار پر جاتی تھی ، اندرونی اضطراب میں کمی نہ ہوتی تو سکینہ تصور میں آکر کھڑی ہو جاتی ۔

مورخین نے لکھا ہے کہ امام حسینؑ اس بیٹی کو بہت چاہتے تھے اور حضرت عباس کو بھی وہ بہت پیاری تھی مگر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ زینب کو سکینہ سب سے زیادہ عزیز تھی ۔ شاید اسی لئے اچانک بھائی کی قبر سے اٹھ کر دمشق کی طرف روانہ ہو جاتیں ۔ ممکن ہے دل ہی دل میں کہتی ہوں ۔

" میں آرہی ہوں سکینہ ، میں آرہی ہوں ! "

اس طرح سفر کرتے کرتے ۱۴ رجب ۶۲ھ کو کربلا کی شیر دل خاتون اس دنیا سے سفر کر گئی ۔

نشان قبر کئی مقامات پر پایا جاتا ہے اور اس سلسلے میں مورخین کے مختلف بیانات ہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ حسینؑ کی امانت کو زینب نے دمشق میں تنہا نہ چھوڑا ہوگا اور سکینہ کی قبر پر جاکر اسکو لوریاں دیتے دیتے وہ خود سو گئی ہونگی ۔

پہلا جلوس عزا

حسینؑ کی پہلی ذاکرہ اس خوش اسلوبی سے مجلس کا آغاز کر گئی کہ اس دور میں بھی اس کا انعقاد ہوتا رہا ، جب محبان علیؑ نام بدل بدل کر تقیہ میں زندہ تھے امویوں کے جابر سلاطین محرم کا چاند نکلتے ہی اپنے کارندوں کو سراغ لگانے کیلئے بھیج دیتے اور وہ چھپ چھپ کر سن گن لیتے کہ ذکر کربلا کہاں کہاں ہو رہا ہے اور اس طرح سادات کے پتے لگا کر انہیں تلوار کے گھاٹ اتار دیا جاتا ۔

یہ سلسلہ بنی امیہ اور بنی عباس دونوں کے ادوار میں جاری رہا اور بنی عباس کی حکومت میں منصور دوانیقی اور ہارون رشید نے اسکو عروج پر پہنچا دیا مامون کی پالیسی ان دونوں سے قدرے مختلف تھی مگر اسکے بعد پھر اسلاف کی پالیسی اور جب سے متوکل نے فقہ حنفیہ کو سرکاری مذہب قرار دیا تھا اس وقت سے تو شیعوں کا خون اتنا ارزاں ہوگیا کہ پانی کی قیمت تھی مگر یہ خون مفت بہایا جاتا تھا ۔ پھر بھی

عشرہ محرم میں ہر سیدانی شمعیں جلاکر فرش ماتم بچھاتی اور اپنے بچوں کو کربلا کے واقعات ضرور سناتی تھی ۔

کتنے بچے اور کتنے نوجوان اس سعادت کے جرم میں ماخوذ ہوئے ، ان کا شمار ہو نہ سکے گا ۔ اسکے بعد قبر حسینؑ کی زیارت بھی ممنوع قرار دیدی گئی اور سفاک متوکل نے تو مزار مقدس ہی کو منہدم کردینے کا عزم کرلیا کہ قبر ہی نہ ہوگی تو کوئی زیارت کرنے کہاں جائے گا ! شہادت عظمیٰ کو ، یزید و متوکل جیسے ہزاروں بادشاہ پیدا ہوتے ، تب بھی کالعدم نہ کر سکتے ۔ متوکل بھی یزید کی طرح ختم ہوگیا اور حسین کی عظمت دن دونی رات چوگنی ہوتی رہی ۔

شیعہ جہاں کہیں اور جس حال میں ہوتے عشرہ محرم میں مجلسیں برپا کرتے اور حسینی پیغام کو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کرتے ۔ سادات میں جب محبان علی شامل ہوگئے تو نظیریں اسکی بھی ہیں کہ جن کے دلوں میں آل رسول کی محبت کا شائبہ بھی تھا وہ افکار کربلا بڑی دلچسپی سے سنتے اور پھر دوسروں سے بیان کرتے لیکن ایسا عموماً ان علاقوں میں ہوتا جہاں شیعہ اکثریت ہوتی یا شیعہ حاکم ، جسکی مثالیں بنی عباس کے انحطاطی زمانے میں پائی جاتی تھیں ۔

اور جب سے طاہریوں نے آزادانہ حکومت قائم کرلی تھی اس وقت سے تو ذی الحج کی آخری تاریخوں ہی سے شہادت حسینؑ کا بیان ہونے لگا تھا ۔

پھر علوی اور صفاری حکومتوں میں مجالس کا رواج بڑھ گیا تاہم عباسی خلفاء کے زیر اقتدار علاقوں میں اب بھی ماضی کی سی پابندیاں تھیں اور سادات صرف محفوظ جگہوں پر اپنے جد کا تذکرہ کرتے تھے ۔

شیعوں کو ذکر حسینؑ کی کھلی آزادی تو آل بویہ کے اقتدار میں ملی اور معزالدولہ نے تو کھل کر شیعیت کا اعلان کردیا عباسی خلیفہ بویہی سلطان کے تابع تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں بعض خلفاء بھی حب اہلبیت کے قائل ہوگئے تھے ۔

سنی مورخین نے معزالدولہ کی شیعیت کو مطعون کیا ہے ۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس عظیم فرمانروا کا سنیوں پر احسان ہے کہ اس نے اکثریت کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے خلافت کو باقی رکھا ورنہ خلافت کا تختہ الٹ کر اپنی

آزادانہ بادشاہت کا اعلان لمحات کی بات تھی۔ کون تھا جو معزالدولہ کا مقابلہ کرتا اور عوام مسلح ہو کر آتے تو بویہی لشکر کے سامنے کتنی دیر ٹھہر سکتے۔

بہرحال سنی اسکے احسان مند ہوں یا نہ ہوں لیکن شیعوں پر تو اس نے احسان عظیم کیا ہے کہ سرکاری طور پر عید غدیر کا جشن منوایا اور روز عاشور کو یوم غم واندوہ قرار دیا۔

بلاشبہ اس نے شیعوں میں تبرے کی ابتداء کی مگر یہ جواب تھا امیر معاویہ کے دور سے اس وقت تک کے تبرے کا جسکی مدت ڈھائی سو سال سے زائد رہی تھی

ہماری نظر میں تو عظیم معزالدولہ کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بغداد کو عاشور کے دن سیہ پوش کر دیا اور ماتم حسینؑ کا وہ جلوس نکالا جسکی بنیاد لاواثی میں سکنیہ بنت الحسین نے رکھی تھی اور جسکی نظیریں زینب کبریٰ اور حضرت ام کلثوم نے قائم کی تھیں۔

محرم ۶۱ھ کے دوسرے عشرے میں سیدانیوں کا ایک قافلہ کربلا سے کوفہ لایا گیا تھا۔ اس قافلے میں اونٹوں کی ننگی پیٹھوں پر بیٹھی ہوئی مخدرات عصمت و طہارت کے ہاتھ پس گردن سے بندھے ہوئے تھے، گرد اور ریت میں اٹے ہوئے بال چہروں پر پڑے تھے، اونٹ بے تحاشا دوڑتے تو بچے نیچے گر جاتے، سیدانیاں روتیں پیٹتیں، چیختیں چلاتیں مگر کوئی انکی فریاد سننے والا نہ تھا۔

پھر دس محرم ۳۵۲ھ کو چشم فلک نے ایک منظر دیکھا کہ منصور دوانیقی اور متوکل کا بغداد ایک سوگوارانہ فضا میں ڈوبا ہوا تھا۔ جو شخص گھر سے باہر نکلتا، وہ سیاہ کپڑے پہنے ہوئے، ایک جلوس سیاہ پوشوں کا شاہراہ سے گزر رہا تھا جسکے ایک حصے میں عورتیں بال بکھرائے، سروں پر خاک ڈالے ہائے حسین ہائے حسین کے نعروں میں سینہ کوبی کرتی، باحال پریشان آگے بڑھ رہی تھیں اور اس جلوس کی قیادت اس دور کا باجبروت سلطان معزالدولہ دیلمی کر رہا تھا۔

یہ جلوس فاطمہؑ کے لال اور عترت رسولؐ پر ہونیوالے مظالم کی یاد میں نکالا گیا تھا اور اموی مظالم کے خلاف پہلا مظاہرہ تھا۔ اس مظاہرے کی تاسی ہر اس مقام پر کی گئی جہاں شیعہ آزادی کی سانس لینے کے حالات میں تھے۔ مجلسوں کے ساتھ

باجماعت ماتم کی ابتداء اسی جلوس سے ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سنیوں کی ایک تعداد آل رسولؐ کی حالت کا تصور کر کے حسینی بن گئی اور باقی اتنے مشتعل ہوئے کہ بغداد میں شیعہ سنی فساد ہو گیا۔

یہ سوال اس وقت سے آج تک جواب کا محتاج ہے کہ ایک طبقہ اس مظاہرے کو دیکھ کر غصے میں بے قابو کیوں ہو جاتا ہے؟ کیا اسکے نزدیک یزید نے پیغمبرؐ کی اولاد کے ساتھ جو کچھ کیا وہ حق بجانب تھا؟ اس کا ایک منطقی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ جن لوگوں کو یہ جلوس برا لگتا ہے اگر وہ خود یزید ہوتے تو وہ بھی ایسا ہی کرتے!

مجالس و ماتم سے یہ عناد اور کہا یہ جاتا ہے کہ کیا ہم اہل بیت کو مانتے نہیں؟ ہم بھی کہتے ہیں کہ رسولؐ کا امتی اولاد رسول کا دشمن نہیں ہو سکتا پھر یہ معمہ کیا ہے کہ حسین مرجع عقیدت اور ذکر حسین سے عداوت! شاید یزید بن معاویہ دلوں میں اس طرح گھر کر گیا ہے کہ اسکے سامنے حسینؑ کی عقیدت ماند پڑ جاتی ہے۔ تب ہی تو متبعین کو ہدایت کی جاتی ہے کہ خبردار مجلس میں نہ جانا، اس سے بغض صحابہ پیدا ہوتا ہے۔

صحابہ سے ان کی مراد شاید یزید ہے کیونکہ اسی کی کرتوت مجالس میں بیان کی جاتی ہیں اور وہی قابل نفرت قرار پاتا ہے۔ کوئی فتویٰ دے یا حکم لگائے، مجلسیں تو بعد کربلا سے ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی اور جلوس جو معزالدولہ نے نکالا تھا وہ تو بارگاہ سید الشہداء میں اتنا مقبول ہوا کہ نہ صرف بغداد بلکہ اطراف و جوانب میں اسکی تقلید کی جانے لگی پھر مصر و مراقش، ہند و سندھ اور اکناف و اطراف عالم میں ہر بڑے مقام پر نکلنے لگا جس میں امیر تیمور کے عہد سے تعزیہ کا اضافہ ہو گیا۔

پہلا امام باڑہ

قیاسی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پہلا امام باڑہ بھی بغداد میں معزالدولہ ہی نے بنوایا ہوگا کیونکہ جلوس عزا کہیں سے نکل کر کسی مقام پر اختتام پذیر ہوا ہوگا اور پھر وہاں مجلس سید الشہداء بھی برپا ہوئی ہوگی۔ اصولاً اس مقام کو امام باڑے کا نام دیا جا سکتا ہے لیکن اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا اور نہ اسکے بعد کسی شیعہ فرمانروا کی

طرف سے کوئی امام باڑہ تعمیر کیے جانے کا پتہ چلتا ہے۔ہوسکتا ہے کہ اسکی وجہ کربلائے معلی کی قربت رہی ہو۔

اسکے بعد مراقش پر نگاہ جاتی ہے تو عشرہ محرم میں مسلسل مجلسیں منعقد ہونے کا سراغ تو لگتا ہے مگر مجلسوں کیلئے کوئی مخصوص عمارت بنائے جانے کا تذکرہ کوئی مورخ نہیں کرتا۔ہوسکتا ہے کہ کسی شیعہ مورخ نے لکھا ہو اور آگے چل کر اس کا علم ہوسکے۔سردست ہسٹری آف سیراسنز کے حوالے سے پہلے امام باڑے کی تعمیر کا شرف فاطمئین مصر کے دوسرے خلیفۂ المعز کو دیا جاتا ہے جس نے قاہرہ آباد کرتے وقت محلات کے ساتھ مجلسوں کیلئے ایک علیحدہ عمارت بنوائی جو ہماری زبان میں امام بارگاہ کے نام سے موسوم ہو سکتی ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تحقیق سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ کس مقام پر اور کس دور میں جلوس کی ابتداء ہوئی لیکن مجلسوں کا ہونا اور امام باڑوں کا وجود تیمور سے بہت پہلے پایا جاتا تھا۔ہوسکتا ہے کہ مسلم حکومت کی ابتدا ہی سے کسی شیعہ امیر نے امام باڑہ بنوایا ہو لیکن یہ تاریخی طور پر ثابت نہیں البتہ تغلق عہد میں شیعوں کے ذہنوں میں امام باڑے کا تصور تھا اور قرین عقل ہے کہ جس مقام پر مستقلاً مجالس سیدالشہداء منعقد ہوتی ہوں، اسکو امام باڑہ کہہ دیا جاتا ہو تب ہی تو سلاطین شرقیہ نے جونپور میں قیام سلطنت کے بعد ہی امام باڑے کی تعمیر کرائی پھر مختلف علاقوں میں اسکو مختلف نام دے گئے، کہیں عاشور خانہ کہلایا، کہیں حسین چوک۔

منطقی طور پر سوچا جائے تو یہ خیال کسی امام باڑے کو دیکھ کر ہی پیدا ہوگا اور یہ امام باڑہ کب اور کس نے کہاں دیکھا؟ اسکی مدت طویل بھی ہوسکتی ہے اور مختصر بھی تاہم اس حقیقت میں کوئی شک نہیں ہوسکتا ہے کہ سلاطین الشرق کے اسلاف جب ماتم کربلا برپا کرتے ہوں گے تو اطمینان کی زندگی میں کوئی امام باڑہ بنانے کی آرزو دلوں میں انگڑائی لیتی ہوگی۔یہ آرزو بچوں کو وراثت میں ملی اور انہوں نے حکومت ملتے ہی اس خواب کو پورا کردکھایا۔

اس طرح امام باڑہ اگر آٹھویں ہجری میں کہیں اور پایا نہیں جاتا تھا تو

ہندوستان میں پہلا امام باڑہ سلاطین شرقیہ نے بنوایا۔اس موقع پر دکن کی شیعہ سلطنتوں کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جن کا زمانہ تقریباً یہی ہے اور جو جذبہ ولا میں شرقیوں سے کسی طرح پیچھے نہیں تھیں اور جنکے عاشور خانے آج بھی انکی مودت کا علامیہ ہیں۔

تعزیہ

تیمور صاحبقران کو شیعہ یا سنی کہنا اسکے ساتھ زیادتی ہوگی، وہ تو صرف برائے نام مسلمان تھا کیونکہ اسکے باپ دادا اسلام تو قبول کرچکے تھے مگر خواوس کا تعلق صرف تلوار اور تسخیر ممالک سے تھا تاہم امام حسینؑ سے وہ عقیدت ضرور رکھتا تھا اسی لئے جب موقع ملتا تو یوم عاشور کربلا میں گزارتا تھا اور ہوسکتا ہے کہ معزالدولہ کا مروجہ جلوس اسکی موجودگی میں نکلتا ہو۔

ایک سید عالم سے اسکو بڑی عقیدت تھی اور یہ سید ہر سال تبرک کے طور پر اسکو کچھ نہ کچھ پیش کرتے تھے۔وہ ان تبرکات کو محفوظ رکھتا تھا جن میں خاک پاک سے بنی ہوئی ایک ضریح اور ایک تسبیح بھی تھی اس تسبیح کے دانے عاشور کو سرخ ہوجاتے تھے۔

تیمور جس سال ہندوستان پر حملہ آور ہوا، اس سال اس کا محرم سفر میں کٹا۔دوسرے سال وہ فتوحات میں مصروف رہا تیسرے سال محرم آنے پر اسکے لشکریوں نے مطالبہ کیا کہ کئی برس ہوگئے ہیں انہوں زیارت کربلائے معلی نہیں کی۔خود تیمور کو بھی اس بات کا احساس ہوا اور سوچتے سوچتے اسکو اس نقل روضہ کا خیال آیا جو اسکو سید موصوف نے پیش کی تھی۔چنانچہ اس نے وہ ضریح ایک کھلی عماری پر رکھوائی، تسبیح اسکے اوپر ڈلوائی اور ایک فوجی دستے کے جلو میں اسے لشکر میں گشت کرادیا تاکہ لوگ روضہ نہیں تو نقل روضہ ہی کی زیارت کرلیں۔

غالباً محرم ۸۰۳ھ کا یہ واقعہ ہندوستان کی تاریخ عزا کا سنگ بنیاد ہے۔اس کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں لیکن تعزیے کے سلسلے میں اور کوئی بات سامنے نہیں ہے پھر تیمور اور تیمور کے لشکریوں کی کربلا سے عقیدت مسلم ہے اس لئے اس

روایت کو عموماً یقین کا درجہ دیا جاتا ہے اور قرائن و شواہد بھی اسکی تصدیق کرتے ہیں کیونکہ تیمور کے جانے کے بعد بھی دلی میں شب عاشور مقامی لوگوں نے مٹی کی ضریح نکالی اور یہ نکالنے والے بیشتر سنی المسلک تھے۔

اسکے بعد مٹی اور لکڑی کی ضریحوں کا رواج بڑھنے لگا۔ امیر صاحبقران ضریح کے سامنے ادب سے کھڑا ہوا تھا، لوگ بھی کھڑے ہونے لگے۔ اسکے بعد ہندوستانی ذہن کے تحت امام حسینؑ کی بارگاہ میں حاجتیں طلب کی جانے لگیں جو برائیں پھر مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی ضریحیں نکالنے لگے اور آہستہ آہستہ ضریح نے تعزیے کی شکل اختیار کرلی۔ ایک مخصوص شکل کے تعزیے کو تیموری کہا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تیمور کے قیام ہندوستان میں یہ تعزیہ بنایا گیا ہو۔

جلوس عاشورہ تو جابجا نکلتا ہی تھا۔ اس میں تعزیے کا اضافہ ہوگیا تو رونق بڑھ گئی اور جب امامؑ کی طرف سے حاجت روائی بھی ہوئی تو تعزیہ مرکز عقیدت بن گیا۔ اسکے لئے ہندو مسلم، شیعہ سنی، اچھوت اور برہمن کی کوئی قید نہ تھی۔ امام حسینؑ کی بارگاہ سب کیلئے کشادہ تھی۔ لوگ آتے منتیں مانتے اور انکی مرادیں برآتیں پھر اسی تعزیے نے واقعہ کربلا کو زبان زد کیا تو تعزیہ شور ماتم کا علامیہ بن گیا۔

یہ وہ دور تھا جب محمد بن عبدالوہاب کے پیدا ہونے میں صدیاں باقی تھیں، عالم اسلام پر تصوف کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ صوفیائے کرام محبت اہلبیت کو جزو ایمان قرار دیتے اور غم حسین شعائر دینی میں شامل تھا۔

تعزیہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کیونکر پہنچا؟ اسکی کوئی تاریخ مرتب نہیں ہوسکتی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کے جلوس عاشور میں تعزیہ ایک اہم جزو بن گیا پھر ہندو اور مسلمان راجاؤں کی عقیدت نے اسکے رواج کو آگے بڑھایا۔ آگے چل کر بعض شیعہ حکمرانوں نے اس میں اضافہ کیے، بالخصوص شاہان اودھ نے اسکو اتنی وسعت دی کہ عزائے حسین کو شیعوں کا جزو حیات بنادیا۔

اس طرح جلوس و تعزیہ کیلئے معزالدولہ اور تیمور صاحبقران کے نام لیے جاسکتے ہیں لیکن حقیقتاً اسکے قبول عام میں اہل کربلا کی شجاعت و مظلومی کو بڑا دخل

ہے اور پیغمبر اسلام کے معجز نما نواسے کی عظمت کو بھی جسکے سامنے تاریخ عالم کا کوئی کردار پیش نہیں کیا جاسکتا اور جب برہمنوں نے اپنے علوم سے امام حسین کی صداقت کی تصدیق کی تو ہندوستان کی عورتیں تعزیے کی سامنے چوک بھرنے لگیں۔

شب عاشور سے عصر عاشور تک تعزیے کے سامنے کھڑا رہنا ہندو عورت کی انتہائی عقیدت کا ثبوت ہے۔ وہ اپنے فاقے کو تعزیہ دفن ہونے کے بعد ہی دہلی پر بیٹھ کر اور فاطمہ زہرا کو بیٹے کی موت کا پرسا دے کر توڑتی تھی۔ عقیدت کی یہ معراج بارگاہ حسینی کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ ہندوستان کا یہی مستقبل شاید سیدالشہداء کے پیش نظر ہوگا تب ہی انہوں نے یزیدیوں سے کہا تھا کہ ان کیلئے ہندوستان کا راستہ ہی کھول دیں۔

ابھی کل کی بات ہے کہ عشرہ محرم میں ہر طرف کربلا کی آواز بازگشت سنائی دیتی تھی، اسپر ہندو عقیدت سے سر جھکا دیتے تھے لیکن مسلمانوں کے ایک گروہ نے پہلے کانوں میں انگلیاں دے لیں، اسکو بھی کافی نہ سمجھا تو عزاداری کے مخالف بن کر سامنے آگئے۔

چار سو اڑ کر اگر پھیلا غبار قتل گاہ
ان کو ڈر تھا ساری دنیا کربلا ہوجائے گی

اور وہ مخالفت آجتک جاری ہے لیکن اس کا حاصل اس سے زائد کچھ نہیں ہے کہ تھوڑے سے لوگ عزاداری کو بدعت سمجھ کر کنارہ کش ہوگئے ہیں باقی ہندو مسلمان، سنی شیعہ سب اپنے قدیم مسلک پر قائم ہیں اور محرم کا چاند افق مغرب پر طلوع ہوتے ہی ہر طرف ہائے حسین ہائے حسین کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔

یہ شور ماتم کسی مخصوص ملک اور کسی مخصوص خطے سے متعلق نہیں پورا عالم اسلام اسکی لپیٹ میں آتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں جہاں جہاں حسینی بستے ہیں وہاں مجلس و ماتم شروع ہوجاتا ہے البتہ تعزیے صرف ہندوستان ہی میں رکھے جاتے ہیں۔ اسکے لئے علاقے کی کوئی تخصیص نہیں۔ دامن ہمالہ سے راس کماری تک اور بنگال سے سندھ و مکران تک ہر جگہ امام بارگاہیں سجی جاتی ہیں اور مقامی رواج کے مطابق ضریح یا تعزیے رکھے جاتے ہیں۔

عراق و ایران اور اسی طرح کے دوسرے مقامات پر جلوس میں شبیہیں، علم اور ماتمی دستے ہوتے ہیں جو قمع اور زنجیروں سے ماتم کرتے ہیں اور اپنے کو لہو لہان کر لیتے ہیں ۔ اس مظاہرے کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم کربلا میں ہوتے تو نصرت امامؑ میں اس طرح خون میں نہا کر جہاد کرتے ۔ بعض جگہ ہاتھوں سے ماتم بھی ہوتا ہے، بالخصوص جلوس عاشورہ کا منظر بڑا الم انگیز اور کرب ناک ہوتا ہے : سیاہ پوش اور بکھرے ہوئے بالوں کے ماتمی دستے گرد و غبار میں اٹے ہوئے اور سینہ کوبی کرتے ہوئے اس قافلے کی یاد تازہ کر دیتے ہیں جو رسیوں سے باندھ کر کربلا سے کوفہ لے جایا گیا تھا ۔

ان جلوسوں میں بعض جگہ امام حسینؑ کا گھوڑا بھی ہوتا ہے اور حضرت عباس کا علم بھی ۔ جلوس میں تابوت کی شمولیت اس آرزو کو ظاہر کرتی ہے کہ ہم ہوتے تو شہداء کے جنازے سروپا برہنہ ہو کر اٹھاتے اور ان کی میتیں تین روز تک گرم ریت پر پڑی نہ رہتیں ۔ یہ جلوس عراق و ایران کے تمام مقامات، مسقط، بحرین وغیرہ میں اٹھتے ہیں اور اب تو یورپ و امریکہ کے بعض مقامات پر بھی عاشور کے یہ مظاہر منعقد کیے جاتے ہیں ۔

ہندوستان کے جلوسوں میں مختلف اقسام کے تعزیوں کا اضافہ ہوتا ہے جنکو نقل روضہ کہا جاسکتا ہے اور بعض تعزیے تو ہو بہو روضہ مقدس کی نقل ہوتے ہیں ۔ ایسے تعزیے لکھنؤ میں اور لکھنؤ کے قریب محمودآباد میں اب بھی بنائے جاتے ہیں اور ان کو دیکھ کر آرزوئے زیارت کربلا رکھنے والوں کی تمنا ایک حد تک پوری ہو جاتی ہے

جلوس تبت اور کشمیر میں بھی نکلتے ہیں اور انکی نوعیت بھی ہندوستان کے جلوسوں کی سی ہوتی ہے ۔

بیانات متواترہ اور شواہد مسلسل کے بعد یہ مسلم ہو جاتا ہے کہ تعزیہ پہلے پہل صاحبقراں امیر تیمور نے نکالا لیکن تیمور کی واپسی کے بعد کن کن شہروں میں یہ جلوس نکلتا رہا، اس کا کوئی تحقیقی سراغ نہیں ملتا پھر بھی جب سے برج بھاشا میں شاعری کا آغاز ہوا اور اس میں داستان کربلا سے متعلق منظومات پیش کی گئیں اس

وقت سے اسکی نشاندہی ہوتی ہے کہ مجلسوں اور جلوسوں کا رواج عام تھا، تب ہی تو لوگوں کو متاثر کرنے کیلئے ایسے شعر کہے گئے جن سے سننے والوں کے دل رو پڑیں ۔ اس میں اولیت کا شرف محمد قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ کو حاصل ہے جنہوں نے فارسی سے ہٹ کر مقامی زبان میں بکائے حسینؑ کی ریت قائم کی ۔

اس سے ایک حقیقت اور منکشف ہوتی ہے کہ غم حسینؑ داخل حسنات تھا اس میں شیعہ اور سنی کی قید نہ تھی اور امام حسین محسن اسلام بلکہ محسن انسانیت قرار دئے جاتے تھے ۔ مسلمانوں کیلئے اس میں پیغمبر برحق سے آپ کے نواسے کی نسبت کو یقیناً دخل تھا اور شاید اسی لئے مرثیے کی صنف سخن ہی واقعات کربلا سے مختص ہو کر رہ گئی ۔

مجلسوں کے بارے میں تو مسلم ہے کہ وہ مسلمانوں کی نقل مکانی میں ہمسفر رہیں اور مسلمان جس ملک یا جس مقام پر جا کر قیام پذیر ہوئے وہاں عشرہ محرم میں انہوں نے مجلسیں منعقد کرنا شروع کر دیں اور اس طرح کربلا والوں کی صف ماتم پورے ایشیا میں بچھنے لگی ۔

مجلسوں کی حد تک اگر بنظر غائر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ سلطان محمود کے ساتھیوں میں محبان اہل بیت کی ایک تعداد شامل تھی جن میں شیعہ بحالت تقیہ تھے اور سنی علی الاعلان، ان میں سے جو لوگ پنجاب میں یا کہیں اور رہ گئے وہ عشرہ محرم میں مجلسیں منعقد کرتے رہے ۔

پھر شہاب الدین غوری نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا تو بکثرت لوگ ہندوستان کے مختلف مقامات پر بالخصوص دلی میں بس گئے اور محرم میں مراسم عزا بجالاتے رہے ۔ اس طرح جب تیمور ہندوستان آیا تو مجلسوں کا کافی رواج تھا جن میں روز عاشور کا جلوس شامل ہو گیا اور ضریح کے ساتھ خود تیمور کا علم جلوس کا طرہ امتیاز بن گیا ۔

تیموری وضع کا تعزیہ اور تیموری علم اب بھی بعض شہروں کے جلوس عزا میں نکلتا ہے اور اسکو مقدس سمجھا جاتا ہے ۔ اس لحاظ سے یہ روایت صحیح معلوم ہوتی ہے کہ تیمور نے خود تعزیہ بنوایا تھا اور اسکو جلوس کی شکل میں گشت کرایا تھا ۔ بہر حال

دلی اس کا ابتدائی مرکز تھا جہاں مغل دور میں مجلس و ماتم دونوں کو فروغ ملا۔ اسکے اسباب میں صوفیائے کرام کے التفات اور بعض مغل بادشاہوں کی توجہ کو بڑا دخل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض سنی امراء کو بھی عزائے حسینؑ میں بڑا شغف تھا۔ وہ بڑی دھوم دھام سے جلوس نکالتے تھے جسکے آثار انگریزوں کے عہد میں بھی پائے جاتے رہے اور مغل سلطنت کا زوال ہو جانے کے باوجود عزاداری میں فرق نہیں آیا۔

مثل مشہور ہے کہ عوام فرمانروا کے طور طریقے کی تقلید کرتے ہیں لہٰذا اہلیان دلی کا عزادار بن جانا ناگزیر تھا اور اس کے ساتھ اطراف وجوانب پر بھی اس کا اثر پڑنا چاہئے تھا اس لئے نہ صرف دلی بلکہ نزدیک و دور کی ان گنت بستیوں میں بھی اپنے اپنے طرز پر مظاہرہ غم ہونے لگا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اخبار الاخیار سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت احمد شبانی اور دیگر بزرگوں کا بھی اسی پر عمل رہا ہے۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے احمد یار خان کو ان کے استفتاء کے جواب میں لکھا تھا کہ " سال بھر میں فقیر کے گھر پر دو مجلسیں ہوتی ہیں۔ ایک تو ذکر وفات شریف (نبوی) اور دوسری مجلس ذکر شہادت امام حسینؑ روز عاشورہ۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ خود ذکر شہادت کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔"

قدیم دلی کا محرم

علی جواد زیدی نے اپنی کتاب " دہلوی مرثیہ گو " میں بڑے بڑے ارباب تصوف کے حوالے دئے ہیں اور ربط بیان میں صراحت کی ہے کہ۔

" دلی میں بیان مصائب کی روایت کافی قدیم ہے۔ امیر خسرو نے شہادت دی ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی (ساتویں صدی ہجری) میں بھی دلی میں مجلسیں منعقد ہوتی تھیں جن میں مقتل حسین پڑھی جاتی تھی۔ پورے عشرے میں مخصوص دعاؤں کا ورد ہوتا تھا عبارت میں ماتم اور سینہ چاکی کا بھی اشارہ موجود ہے۔ سکندر لودی عاشور کے روز فقیروں اور درویشوں میں خیرات بانٹتا تھا۔ مجلس و فاتحہ و خیرات کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ عبدالقادر بدایونی، عہد ہمایوں کے علماء و شعرا کے ضمن میں حیدر تونیائی کا یہ شعر درج کرتے ہیں۔

ماہ محرم آمد و شد گریہ فرض عین
گریم خوں بہ یاد لب تشنہ حسینؑ

اور اسی کے ساتھ یہ تشریح کرتے ہیں کہ " لوگ اس کا یہ مطلع جو اس نے عزائے حضرت امام شہید مقبول و مقتول فلذہ کبد رسول مقبولؐ میں نقش بند کیا تھا ایام عاشور میں پڑھا کرتے تھے "۔ فرخ سیر کے عہد کی عزاداری کا ایک ثبوت " سیر المتاخرین " نے پیش کیا ہے۔ غالباً اواخر ۱۱۲۷ھ/۱۷۱۴ء کی بات ہے کہ میر جملہ بہار کی صوبہ داری پر متعین ہو کر دلی سے جانے لگے۔ شہر کے امرا ان کو رخصت کرنے گئے۔ روح اللہ خاں کے بیٹے نعمت اللہ خاں چند دن نہ جاسکے کیونکہ عشرہ محرم کی تعزیہ داری میں مصروف تھے۔ عاشور کے بعد گئے اور یہ معذرت کی کہ اب تک نہ آنے کی وجہ ماتم داری تھی۔ میر جملہ نے طنزاً پوچھا کہ کیا آپ کے یہاں کسی کی موت ہو گئی تھی؟ نعمت اللہ خاں نے جواب دیا کہ نہیں سیدالشہدؑ کا ماتم تھا۔

نواب صدرالدین محمد خاں فائز دہلوی اورنگ زیب کے آخری عہد سے محمد شاہ کے زمانے تک دلی میں مقیم تھے۔ انہوں نے اپنی فارسی تصنیف " احزان الصدور " کے مقدمے میں لکھا ہے کہ ایام عاشورہ میں تمام محبان اہل بیت مشغول عزا ہو جاتے ہیں اور وہ کتب تواریخ جن میں اعدائے دین کے جور و ستم کا بیان ہوتا ہے پڑھتے ہیں تاکہ ان کے ذریعے سے مغموم و مہموم ہوں۔ اس بنا پر یہ خیال ہوا کہ ان عبارات جانسوز کا خلاصہ اور کلمات غم اندوز کا اختصار لکھ دیا جائے۔ اس سلسلے میں " وادی غموم " کے جگر سوختوں میں ہر ایک نے رسالے لکھے ہیں۔ ان کے مطالب پڑھنے سے لکھنے والے کو حسنہ عظیم حاصل ہوتا ہے اس لیے میں (فائز) نے یہ چاہا کہ والدال علی الخیر کفاعلہ کے مصداق اس ثواب میں داخل ہو جاؤں۔ اگرچہ حدیث کی کتابوں میں بعض امور مشتمل احوال شہر بانو و حضرت قاسم و پسران مسلم وغیرہ دوسرے طریقہ سے لکھے ہوئے ہیں لیکن چوں کہ یہ قصے گریہ کا سبب ہوتے ہیں اور اصل مقصود بھی یہی ہے اس لیے ارباب سیر کی متابعت کی گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذکر مصائب کربلا کی کتابیں دلی اور قرب و جوار میں عہد عالمگیری اور اس کے قبل و بعد برابر تصنیف ہوتی رہتی تھیں اور محبان اہل بیت ایام محرم میں مراسم عزا

بجالاتے تھے کم از کم محمد شاہی دور میں ماتم کا بھی رواج تھا۔فضلی نے لکھا ہے۔

پھر ان سارے حاضراں خاطر
صدق سے جو کیے ہیں ماتم شاہ

ایسے لوگ بھی تھے جو نہ صرف ہر سال عزاداری کرتے تھے بلکہ اسے فرض مذہبی جانتے تھے۔ فضلی نے اس کی بھی شہادت دی ہے

اس کا واجب ہے تعزیہ ہر سال

محمد شاہ کے دور میں چوک سعداللہ خاں میں شیریں مقال واعظ چوبی کرسیوں کے منبر پر بیٹھ کر مہینے اور موقع کی مناسبت سے وعظ کہتے تھے چنانچہ "مرقع دہلی کی روایت کے مطابق محرم الحرام میں سرعام ذکر شہادت ہوتا تھا۔ کنور پریم کشور فراقی نے یہ چشم دید شہادت دی ہے کہ سفر میں بھی مراسم عزا بجالائے جاتے تھے چنانچہ جب افراسیاب خاں کی درخواست پر شاہ عالم آگرے کو روانہ ہوئے تو ۲ محرم کو لشکر شاہی سید پور (تعلقہ فتح پور سیکری) میں مقیم ہوا۔ وہاں شاہی اور دکنی دونوں ہی فوجوں نے مل کر "عزائے امامین" (امام حسنؑ و امام حسینؑ) کا انتظام کیا۔ پھر ۲۰ محرم کو اسی سفر میں شاہ عالم نے حکم دیا کہ "حضرت حسین و شہدائے کربلا" کی فاتحہ کے لیے کھانے پینے کی چیزیں پوری احتیاط سے تیار کریں۔

بیان مصائب کے کئی طریقے رائج تھے۔ان میں روضہ خوانی، کتاب خوانی اور واقعہ خوانی کافی مشہور تھے۔ نواب درگاہ قلی خاں نے محمد شاہی دور میں دلی کا سفر کیا تھا انہوں نے سفر کے حالات مرقع دہلی نامی کتاب میں جمع کیے ہیں۔ان کا چشم دید بیان ہے کہ اس دور کی دلی میں (خواجہ سرا) جاوید خاں کے عزاخانے کی طرح بہت سے "عاشور خانے" تھے جن میں مجلسیں ہوتی تھیں کہیں محتشم کاشی اور حسن کاشی کے مرثیے پڑھے جاتے تھے اور کہیں روضتہ الشہدا۔ نواب شرف علی خاں کی طرح دوسرے امراء کے گھروں کے اندر تعزیہ خانے تھے جہاں مراسم عزا بجالائے جاتے تھے۔ مقررہ مقامات پر لوگ ہجوم کی شکل میں آتے اور شور گریہ بلند ہوتا۔ درگاہ شاہ مرداں محمد شاہ بادشاہ دلی کی بیگم نے بنوایا تھا۔ یہ وہی بیگم ہیں جنہیں احمد شاہ نے نواب بائی اور پھر قدسیہ صاحب الزمانی کے خطاب سے نوازا۔ سر سید احمد کی روایت

کے مطابق یہ شیعہ مذہب تھیں۔ ۱۷۴۴ء کے آس پاس ایک پتھر جس پر نقش قدم شاہ مرداں تھا باہر سے لایا گیا اور ایک سنگ مرمر کے حوض میں نصب ہوا۔ ۱۷۴۸ء مطابق ۱۱۶۲ ہجری میں نواب قدسیہ محل نے جاوید خاں خواجہ سرا کے اہتمام سے چار دیواری، مجلس خانہ اور حوض بنوایا اور پھر ۱۸۰۰ء میں عشرت علی خاں نے بھی مجلس خانہ تعمیر کرایا۔ ۱۸۲۱ء میں صادق علی خاں نے نقار خانہ بنوایا۔ سر سید احمد خان لکھتے ہیں کہ اب یہ درگاہ خوب آراستہ ہے ہر مہینے کی بیسویں کو یہاں مجلس ہوتی ہے اور رمضان کی بیسویں کو بہت ہجوم ہوتا ہے محرم میں تعزیے آتے ہیں اور بہت ہجوم ہوتا ہے اور جس میدان میں تعزیے ٹھنڈے ہوتے ہیں اس کا نام کربلا رکھا ہے۔اس کی بھی چار دیواری اشرف بیگ خاں نے بنوادی ہے۔ مرقع دہلی کی روایت زیادہ قریب العہد ہے اس کے مطابق درگاہ شاہ مرداں کی بنیاد عہد محمد شاہی میں پڑی اور نجف خاں اور سادات خاں کی نگرانی میں بنی۔ اس درگاہ کی وسیع عمارت میں لوگ محرم کی بارہویں تاریخ کو (جو زیارت امام حسینؑ کا دن ہے) جمع ہوتے تھے۔ سواریوں کی کثرت اور وضیع و شریف کی اتنی بھیڑ ہوتی کہ راہ مشکل سے مل پاتی۔اس موقع پر اہل حرفہ اپنی دوکانیں سجاتے اور چوکی خانے میں منقبت خواں قصائد عزاء پڑھتے۔ کتاب خوانی کے بڑے بڑے اجتماعات دہلی میں سرعام ہوا کرتے تھے۔بعد کے اردو شعرا میر غالب علی خاں کتاب خوانی میں یکتا اور بے مثال تھے اور میر فضل علی جنون کی کتاب خوانی کے سلسلہ میں قاسم نے کتاب کے باسلیقہ ہونے کا ذکر کیا ملا محمد شوستری خطا واقعہ خوانی میں بے مثال تھے۔

مرثیہ خوانی کا رواج بھی عام تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ رواج اورنگ زیب کے زمانے میں بھی ضرور رہا ہوگا۔میر حسن نے ابوالحسن تاناشاہ کے ندیم شاہ قلی خاں شاہی کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے مرثیے لوگ دکن سے ولایت ہندوستان میں تحفے کے طور پر لایا کرتے تھے۔ یہ تحفے بے سبب تو نہیں لائے جاتے تھے۔ یقیناً عزادار اور مرثیہ خواں مجلسوں میں پڑھتے رہے ہونگے۔

امام حسینؑ کی ذات سے اسلام کے تمام فرقوں کو بھی عقیدت مندانہ شغف تھا اور مجلس عزا شیعہ اور سنی دونوں ہی برپا کرتے تھے۔ عزاداری میں مغل دربار بھی

شامل تھا بلکہ تعزیہ داری کی بنیاد ہی تیمور نے ڈالی تھی۔ کہاجاتا ہے کہ وہ معمولاً ہر سال کربلا جایا کرتا تھا جس سال ہندوستان آیا اس سال وہ کربلا نہ جاسکا تو اس نے کربلا کی ایک شبیہ بنوائی۔ روضہ کربلا کی یہی شبیہ تعزیے کے نام سے مشہور چلی آتی ہے۔ دکن کی حکومتوں پر حملہ کرنے کی وجہ سے اورنگ زیب کے معتقدات کی بہت سی تعبیریں کی جاتی ہیں۔ یہ حملے بنیادی طور پر مذہبی کم بلکہ سیاسی اقتدار کی بالادستی کے مظاہرے کے لیے تھے۔ اورنگ زیب راسخ عقیدے کا سنی تھا لیکن اس کے کئی ممتاز درباری شیعہ تھے۔ نواب اسد خاں وزیر اعظم اور نعمت خان عالی دونوں ہی شیعہ تھے اور اورنگ زیب انکی شیعیت سے آگاہ تھا اورنگ زیب کی چہیتی بیٹی زیب النسا اپنے استاد محمد سعید اشرف مازندرانی سے متاثر ہوکر قلعے میں عزاداری کرنے لگی تھی اورنگ زیب کا جانشین بہادر شاہ اول غالباً خود شیعہ ہوگیا تھا اس دور میں قلعے کے اندر بھی کچھ بیگمات اور شہزادے تعزیہ داری کرنے لگے تھے فرخ سیر کے عہد میں باقاعدہ طور سے قلعے کے اندر تعزیہ داری ہونے لگی تھی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ دلی میں عزاداری اور گھروں کے اندر تعزیہ داری پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ تیمور کے بعد تعزیوں کو ایسی اہمیت حاصل ہوگئی کہ عام راستوں پر ان کے جلوس نکلنے لگے نواب شاہ نواز خاں نے مراۃ آفتاب نما میں ان جلوسوں کے بارے میں لکھا ہے کہ جن میں اوباش بھی جمع ہوجاتے تھے عاشور کے روز یہ لوگ تابوت بنا کر چلتے تھے اور لوگوں کو اپنی شمشیر بازی سے آزار پہنچاتے تھے اسلئے اورنگ زیب نے ان جلوسوں کی ممانعت کردی لیکن اورنگ زیب نے عزاداری پر پابندی نہیں لگائی۔ مجلسیں برابر جاری رہیں اور گھروں میں بلکہ خود قلعے میں تعزیے بھی رکھے جاتے رہے۔ فرخ سیر کے زمانے میں تعزیوں کے جلوس پھر نکلنے لگے صفدر جنگ کے بعد عالمگیر ثانی (۵۹، ۱۷۰۴ء) نے تعزیوں کے جلوس پر پھر پابندی عاید کردی لیکن مشکل سے دو چار برس بند رہنے کے بعد پھر جاری ہوگیا اور آج تک جاری ہے اس میں سبھی اسلامی فرقے شریک ہیں۔

تعزیوں کے علاوہ شاہراہ عام پر سبیلیں بھی رکھی جاتی تھیں اور کم از کم شاہ عالم کے زمانے تک خاصی عام تھیں، مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو بھی سبیلیں رکھ کر

واقعہ کربلا سے ذہنی طور پر متاثر ہونے کا ثبوت دیتے تھے۔ مرزا راجہ رام ناتھ ذرہ جو عہد شاہ عالم میں پیش کاری نظارت پر مامور تھے اور بہت مقرب تھے محرم آتے ہی مصروف عزا ہوجاتے اور سبز پوشی اختیار کرلیتے تھے شربت کی سبیل لگاتے اور بہت خیرات کرتے تھے۔

ایام عزا میں سبز پوشی کا خاصا رواج تھا خواجہ محمد باسط دہلوی بھی جن کے دلی اور نواح میں سیکڑوں مرید تھے ایام عزا میں سبز لباس پہن لیا کرتے تھے۔ علی باسطی نے ان کے آداب تعزیہ داری کا ذکر ایک مثنوی میں کیا ہے اس کا ایک شعر ہے۔

باز در مجلس درآ با رخت سبز
باز ماتم دار شو از تخت سبز

عزاداری کا سلسلہ صرف محرم کے ابتدائی بارہ دنوں تک ہی محدود نہیں رہتا تھا بلکہ چہلم (اربعین) یعنی ماہ صفر کی بیسویں تاریخ تک جاری رہتا تھا۔ اسی بیاض باسطی سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

بار ماتم دار شو تا اربعین
در عزائے ابن خیر المرسلین

منشی فیض الدین نے بزم آخر میں دلی کے دو آخری بادشاہوں کے طریق معاشرت کی تفصیلی حکایت بیان کی ہے اس سلسلے میں ایام عزا کا بھی ذکر آگیا ہے۔ ان کا بیان ہے۔

" محرم کا چاند دکھائی دیتے ہی باجے بجنے لگتے، سبیلیں لگتیں، بادشاہ امامین حسنین کے فقیر بنتے، سبز کپڑے پہنتے گلے میں سبز کفنی جھولی ڈالتے، درگاہ میں جاکر سلام کرتے، نذر دیتے دس دن تک صبح کو کھانا اور شام کو شربت فقرا کو بٹتا، چھٹی کو بادشاہ لنگر میں کھنچتے، دو شدے (علم) بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتے اور کمر میں چاغزی کی زنجیر، دو سید زنجیر پکڑ کر دو چار قدم کھینچتے پھر وہ زنجیر گلے میں ڈال دیتے اور علم سید لے جاتے، ساتویں کو مہندی اٹھتی، بادشاہ بیگمات جشنیں ترکنیاں، خوجے وغیرہ ساتھ چلتے۔ جب مہندی امام باڑے میں پہنچتی، درگاہ میں چڑھادی جاتی۔ آٹھویں کو

بادشاہ حضرت عباسؑ کے سقہ بنتے لال کھاردے کی لنگی باندھ کمر پر مشک رکھ
شربت پلاتے اور مالیدہ پر نیاز دلوا کے تقسیم کراتے دسویں کو نیاز ہوتی۔ بادشاہ ظہر
کے وقت برآمد ہوتے ۔ موتی مسجد میں عاشورے کی نماز پڑھتے ۔ دیوان خاص میں
حاضری نیاز ہوتی ۔ نیاز دلوائی جاتی ۔ خود چکھتے اور شاہزادے اور معززامیر ساتھ دیتے
پھر جامع مسجد سے تبرکات آتے ۔ بادشاہ اور بیگمات زیارت کرتیں شام کو محل کے
تبرکات کی زیارت ہوتی اور گونا وغیرہ بنتا ۔

اکثر سلاطین قلعے میں تعزیہ داری کرتے تھے فقیر پیک بنتے تھے کوئی نشانچی
کوئی نقیب بنتا کوئی تاشہ کوئی ڈھول کوئی جھانجھ تعزیوں کے آگے بجاتا تھا کوئی
مرثیے پڑھتا تھا ۔ مرثیہ خوانوں کو درگاہ سے چار چار طشتریاں بن چکنی ڈلیاں بھنے
ہوئے خربوزے کے بیج اور دھنیے ملا کرتی تھیں ۔ بڑی دھوم سے علم اٹھاتے تھے (۱۱۶)

ہندوستان میں ذکر حسینؑ کا نقطہ آغاز سندھ کے علاوہ کسی دوسرے خطے کو
قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن اسپر بعد زمانی کے پردے پڑے ہوئے ہیں، جونپور اور دکن
وغیرہ قدرے روشنی میں ہیں مگر عزائے حسینؑ کی موجودہ شکل مغل دور میں آہستہ
آہستہ بنتی رہی ۔

اس طرح دلی کو عزاداری کا ابتدائی مرکز قرار دیا جاسکتا ہے پھر جونپور اور
دکن کے نام آتے ہیں ۔یوں تو دکن کی چاروں شیعہ حکومتیں عزادار تھیں لیکن قطب
شاہی فرمانروا اس میں پیش پیش رہے ۔ آخر میں مرشد آباد اور لکھنؤ نے گرانقدر خدمات
انجام دیں شاہان اودھ نے تو حب اہل بیت کو غلو کی حد تک پہنچا دیا تاہم ان کے
خلوص نیت میں شک نہیں کیا جاسکتا اور یہ ان کے غیر معمولی شغف کا نتیجہ تھا کہ
اس دور میں اور اسکے بعد ایام عزا کو ۲۹ ذی الحج سے ۸ ربیع الاول تک وسعت ہو گئی
اور اس کا رواج آجتک شیعہ بساط عقیدت پر پایا جاتا ہے ۔

ایک بدیہی حقیقت اور بھی ناقابل انکار ہے کہ ترویج عزا میں سجادہ ہائے
تصوف کے التفات کو بڑا دخل رہا ۔ انہوں نے مجالس اور جلوس عزا کو ہوسکتا ہے کہ
عرس سے تعبیر کیا ہو لیکن تعزیے کو ہمیشہ بڑی اہمیت دی اور اکثر خانقاہوں میں اب
بھی تعزیے رکھے جاتے ہیں ۔

عقلی طور پر ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے کہ ممکن ہے کسی صوفی نے عرس
کے نظریے سے ضریح کے سامنے قوالی کے بجائے سوزخوانی کرائی ہو جو دکن سے چلی تو
پورے ہندوستان میں پھیل گئی ۔ دکن کے حلقہ تصوف میں یوں تو بہت سے جلی
نام ہیں مگر خیال حضرت گیسو دراز کی طرف جاتا ہے جنکے بارے میں کوئی محقق شاید
موشگافی کر سکے ۔

یہ تمام عناصر عزا دلی کی تعزیہ داری میں موجود تھے جو مغلوں کے انتزاع تک
باقی رہے۔شاید انہیں کو دیکھ کر معروف دشمن اہلبیت محمود احمد عباسی نے کہہ دیا ہو
کہ مغل بادشاہ شیعہ نہیں تو نیم شیعہ ضرور تھے ۔ عباسی کا یہ تبصرہ کسی طرح صحیح
نہیں ہے البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سے اکثر تعزیہ دار تھے بعض کم بعض
زیادہ ۔ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے عہد میں حکومت کی طرح تعزیہ داری بھی
زوال پذیر ہوئی ۔

سلطنت کے انحطاط میں دلی بھی شیعوں سے خالی ہوتی رہی تھی پھر لکھنؤ کے
عروج نے مشاہیر کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ بحالت موجودہ دلی میں عزاداری ہوتی ضرور
ہے مگر ماضی کی گہما گہمی کی جھلک بھی اس میں نظر نہیں آتی تاہم ایک سوگوارانہ شکوہ
پایا جاتا ہے اور جلوس اسی طرح نکلتے ہیں جس طرح دوسرے بڑے شہروں میں ۔

اسکو کربلا کے شہیدوں کا معجزہ ہی کہنا چاہیئے کہ اطراف و اکناف ہند و سندھ
میں کوئی بڑا گاؤں یا قصبہ ایسا نہیں ہے جہاں تعزیہ نہ رکھا جاتا ہو اور جہاں کے ہندو
اور مسلمان تعزیے کو مرجع عقیدت نہ سمجھتے ہوں ۔ دلوں میں اسلام کا نور ہو یا نہ ہو
مگر ذہنوں پر سید الشہداء کا سکہ بیٹھا نظر آتا ہے ۔

باون ڈنڈے کا تعزیہ

دلی ، جونپور ، دکن ، اودھ اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ایک
وقت وہ بھی تھا جب اہل سنت کے تعزیے زیادہ ہوتے تھے ۔ بلاشبہ ان میں
سوگواری سے زائد عظمت امامؑ کا شکوہ پایا جاتا تھا ۔ ڈھول ، باجہ ، پٹا بنوٹ اور اسی
طرح کے دوسرے مظاہرے ہوتے مگر اسکو اس عزم کا اظہار بھی قرار دیا جاسکتا ہے

کہ وہ اس وقت موجود ہوتے تو اس شان سے نصرت امامؑ کیلئے روانہ ہوتے البتہ
ہندووں کے تعزیہ میں ایک المناک عقیدت نظرآتی جو یقیناً شیعوں سے مستعار
لی گئی تھی اس میں ہندوانہ انداز کا وہ اندھا جذبہ پایا جاتا جو کسی بڑے دیوتا کیلئے
ممکن ہے۔ مثال کے طور پر شاہی کے ایک شہر خیرآباد کو لیا جاسکتا ہے جو راجہ
ٹوڈرمل کا وطن تھا اور جہاں آج بھی ٹوڈرمل کی علامت مزار پائی جاتی ہے۔

اس قصبے میں تعزیہ داری کب شروع ہوئی؟ اس کا کوئی تاریخی ثبوت فراہم نہ
ہوسکا مگر ایک بات مسلم ہے کہ مغل دور میں اودھ کا یہ شہر باون محلوں پر مشتمل
تھا لہٰذا ہر محلے سے ایک ڈنڈا منگوا کر تعزیہ بنایا گیا تھا جو آج بھی باون ڈنڈے کا تعزیہ
کہلاتا ہے۔

اس تعزیے کی ساخت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ چار بڑے ستونوں کو جس طرف
سے بھی دیکھا جائے تین ہی ستون نظرآتے۔ یہ تعزیہ تقریباً پورے شہر کے ہر چوک پر
جاتا ہے اور ہر محلے کے مظاہرہ عزا کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ عزاداروں میں ہندو مسلمان
سنی وشیعہ کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ سب اسکے لئے یکساں جذبات رکھتے ہیں۔

بحالت موجودہ اس شہر کی حیثیت ایک چھوٹے سے قصبے کی رہ گئی ہے اور
اس میں شیعوں کی آبادی برائے نام ہے لیکن تعزیہ اسی طرح اٹھتا ہے اور جلوس میں
دودھ کی سبیلیں جابجا پائی جاتی ہیں۔

تعزیہ شہر کے باہر ایک بڑی دہل میں لے جاکر دفن کیا جاتا ہے۔ یہ دہل پہلے
سے کھودلی جاتی ہے اور ہندو عورتیں شب عاشور سے اس میں دودھ کی بالٹیاں لے
جاکر ڈالتی رہتی ہیں۔ دہل کی کرامت یہ ہے کہ اسکی نچلی تہہ دودھ کو جذب نہیں
کرتی یا بہت کم جذب کرتی ہے جس سے دودھ میں مٹی کی آمیزش ہونے نہیں پاتی۔
عورتیں منت مان کر دودھ سے لبالب دہل سے کٹوروں میں دودھ نکال کر استعمال
کرتی ہیں اور جب انکی مراد برآتی ہے تو دودھ کی بالٹیاں اگلے سال دہل میں لاکر ڈالتی
ہیں۔

یہ سلسلہ نہ جانے کب سے چلا آرہا ہے اور لوگوں کی عقیدت کم ہونے کے
بجائے بڑھتی جاتی ہے۔

شہر کی آبادی کم ہونے کا بھی اسپر اثر نہیں ہے کیونکہ اس کمی کو مضافات
سے آنے والے دیہاتی پوری کردیتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ تعزیے کے
جلوس میں ایک میلے کی سی شان ہوتی ہے۔ گلی کوچوں میں آدمی ہی آدمی نظرآتا ہے
لیکن ان سب کے دلوں میں کربلا اور زبان پر امام بابا کا نام ہوتا ہے۔

دکنی قبائل میں عزاداری

ہندوستان کے متمدن شہروں میں مختلف العقائد حلقوں کی عزاداری محتاج
ثبوت نہیں۔ لکھنؤ، اگرہ، لاہور، کراچی، ملتان، ہر مقام اپنی انفرادیت رکھتا ہے بلکہ
یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ چھوٹے سے چھوٹا گاؤں محرم کا چاند نظرآتے ہی مصروف عزا
ہوجاتا ہے۔ اسکے لئے کسی خطہ ارض کی تخصیص نہیں۔ شاہان شرقیہ کی سرزمین
ہو یا سلاطین دکن کا ملک اور آخر میں اودھ کی وہ سلطنت جو گویا عزاداری کے فروغ
ہی کیلئے پیدا ہوئی تھی۔

ان میں سے ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں کیونکہ اندازہ یہ ہوتا
ہے کہ حالات نے جسکو جتنی مہلت دی، اس نے مقاصد کربلا کی اشاعت میں
کوتاہی نہیں کی اس لئے گنگا و جمنا کا دوآبہ ہو یا گومتی اور گھاگھرا کے ساحل، تبت کی
برفپوش پہاڑیاں ہوں یا مکران کی سنگلاخ زمینیں، محرم میں ہر جگہ اور ہر طرف
یاحسین یاحسین کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور مقامی زبانوں میں نوحے اور مرثیے
پڑھے جاتے ہیں۔

گولکنڈہ اور گلبرگہ کے عاشور خانے یا حیدرآباد کا عزاخانہ زہرا کچھ تعجب خیز نہیں،
حیرت ہوتی ہے دکن کے گھنے جنگلوں اور مشرقی گھاٹ کی پہاڑی وادیوں میں بسنے
والے قبیلوں کی امام حسین سے عقیدت دیکھ کر، تہذیب و تمدن سے جنکا کوئی
رشتہ نہیں لیکن کربلا سے ان کا ایک روحانی رابطہ ہے۔ گونڈ، بھیل، پاردی،
کیکاڑی اور لمباڑے قبائل محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی تاڑ کے پتوں کا علم بنا کر اس
تھونپڑی پر نصب کردیتے ہیں جو صرف مراسم عزا کیلئے ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہاڑی
پر بنا ہوا ایک بہت پرانا قلعہ بھی ہے جس کا ایک حصہ صرف محرم میں کھولا جاتا ہے
اور چالیس روز بعد بند کردیا جاتا ہے۔

قبائلی عزاداری کے اجزاء میں تعزیہ اور علم وغیرہ سب شامل ہوتے ہیں مگر پتوں کے سبنے ہوئے جو صنعت کا ایک نمونہ بھی قرار دئے جاسکتے ہیں۔ نوحے اور مرثیے سب انکی زبانوں میں ہوتے ہیں جنکو سن کر زبان داں کے آنسو نہ نکلنا ممکن نہیں۔ پاردی نوحہ: محرم آگیا، تم نے بتایا نہیں۔ میں کالی کفنی پہنوں گا تاڑ کے پتے سے اونچا علم بناؤں گا پھر ماتم کروں گا۔"

"یا علی دولہا، یا علی دولہا، یا علی دولہا!"

علی کے ساتھ دولہا کا استعمال سخن فہمی یا معنی آفرینی کا محتاج ہے کیونکہ یہ نعرہ دکن کے دوسرے حصوں میں بھی لگایا جاتا ہے۔

گونڈوی نوحہ: "ہر سال یہ مہمان آتا ہے مگر بچوں اور عورتوں کو ساتھ نہیں لاتا۔ ارے ٹھیک تو ہے اسکے بچے تو ندی کنارے مار ڈالے گئے ٹوٹ جائیں وہ کٹاریں جو ننھے بچوں کو بھی کاٹ ڈالتی ہیں۔ ارے سچ تو ہے اسکی عورتیں تو قید خانے میں ہیں ٹوٹ جائیں وہ سلاخیں جو بوڑھی عورتوں کو بھی قید کر لیتی ہیں۔"

لمباڑوی نوحہ: "عرب کی شہزادی کا لال تیروں سے چھلنی ہو گیا کیونکہ اسکے پاس تیر تھے کمان نہ تھی۔ وہ بہادر تھا ایک بہادر باپ کا بیٹا جسکے نام کا کنٹھا پہنا جاتا ہے۔ اس کا نام لے کر تیر چھوڑو، بندوق چلاؤ تو نشانہ اڑ جاتا ہے۔

وہ تو اس لئے تیروں سے چھلنی ہو گیا کہ اسکی گود میں چھ مہینے کا بچہ تھا، خون میں ڈوبا ہوا۔ اسکے کاندھے پر جوان بیٹے کی لاش تھی اسکے دامن سے پیاسے اور زخمی بچے لپٹے ہوئے تھے اسکی ستم رسیدہ عورتیں چیخ رہی تھیں اور ہزاروں بھیڑیے اس پر تیر چلا رہے تھے۔ ان پہاڑوں کے اس پار جہاں سے کالے کالے بادل آتے ہیں عرب کی شہزادی کا لال تیروں سے چھلنی ہو گیا!"

دکن کے یہ قبائلی نوحے ان مقامی زبانوں کے نوحوں سے ملتے جلتے ہیں جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں علاقائی طور پر بولی جاتی ہیں۔ ان کا جائزہ لیا جائے تو وہ قلب انسانی کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی، مرہٹی، گجراتی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں رسولؐ کے نواسے کا ماتم نہ کیا گیا ہو اور جس نے ضمیر انسانیت کو جھنجھوڑ کر نہ رکھ دیا ہو۔

گوالیار کی عزاداری

نوحوں کے ساتھ عزاخانوں اور جلوس کے مناظر بھی درد و غم کا ایک تاثر پیدا کرتے ہیں۔ تعزیہ داری کے قبول عام کا بنیادی نکتہ مظلومیت کی وہ داستان ہے جو بن کہے اہل نظر کی سمجھ میں آجاتی ہے اور دل اتنی بے چینی سے دوچار ہو جاتا ہے کہ ذاتی عقیدے اور مذہبی تصورات کا امتیاز باقی نہیں رہتا اور سر خود بخود بارگاہ سیدالشہداء میں جھک جاتا ہے۔

اسیروں کا پہلا جلوس، جب کربلا کوفہ اور کوفے سے شام گیا تھا تو سنگدل شامیوں کے قلوب خود الٹ کر رہ گئے تھے اور یزید نے گھبرا کر سارا الزام لشکر کے سرداروں پر لگا دیا تھا۔ اب یزید کے پیرو اسکی تقلید کرتے ہیں۔ جلوس بدعت ہے، تعزیہ بدعت ہے لیکن حسین کی عظمت نہ یزید کے مٹانے سے کم ہوئی تھی اور نہ یزیدیوں کی کوششوں سے اس پر اثر پڑ سکتا ہے کیونکہ حسین صرف شیعوں ہی کے تو نہیں ہیں سنی اور ہندو بھی انہیں اس طرح مانتے ہیں چنانچہ مہاراجہ گوالیار کا واقعہ مشہور عالم ہے کہ:

جواں سال مہاراجہ کی شادی کا مہورت نکلوایا گیا تو محرم کی نویں تاریخ کا نکلا۔ ہندو خود بھی محرم میں شادی بیاہ نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے پنڈتوں سے درخواست کی کہ کوئی دوسری شبھ گھڑی نکال دیں۔ بعض پنڈتوں نے بچار کیا مگر ایک پنڈت نے کہہ دیا کہ اگر یہ ٹل گیا تو چوبیس سال تک ایسی ساعت نہیں آئے گی لہذا شادی کا فیصلہ کر لیا گیا۔ انتظامات ہو گئے اور مہاراجہ بارات لے کر روانہ ہو گیا

گرمی کا موسم اپنے شباب پر تھا۔ کوہ و صحرا بھاڑ کی طرح تپ رہے تھے در و دیوار سے آگ نکلتے محسوس ہوتی۔ مہاراجہ جیولجی اپنی رانی کی لیکر واپس ہوا تو اچانک کالے کالے بادل آسمان پر نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا، اتنا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔ دن کو کالی رات کا سا منظر ہو گیا۔ اس پر طرفہ ستم یہ ہوا کہ آندھی آگئی، سخت طوفانی آندھی اور بجلی کی کڑک شروع ہو گئی، کڑک کا یہ عالم، گویا صدہا توپیں ایک ساتھ چھوٹ رہی ہوں۔ ہوا کے

جھکڑ اتنے شدید تھے کہ چیزوں کے ساتھ آدمی بھی جگہ سے بے جگہ ہونے لگے۔

کہار اور سپاہیوں نے دولہن کی پالکی ایک جگہ رکھ دی پھر انکو خبر نہ ہوئی کہ وہ کہاں سے کہاں ہو رہے۔ایسے میں ایک مسلمان سردار پاؤں جما کر پالکی کے قریب رہ گیا۔اس کا نام تھا: حسن خاں بھیا!

اتنے میں بڑے بڑے اولے گرنا شروع ہو گئے جن کی ضربوں سے حسن خاں سخت زخمی ہوا لیکن اس نے جگہ نہ چھوڑی۔رانی نئی نویلی دولہن تھی جو فرط حیا میں بولا نہیں کرتی لیکن جب اس نے حسن خاں کا یہ حال دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا۔وہ بے اختیار بول اٹھی۔

"بھیا! تم بھی کسی آڑ میں ہو جاؤ۔"

"میں اپنی خاندانی شرافت کو بدنام نہ کروں گا۔تمہیں تنہا چھوڑ دوں!" یہ کہہ کر حسن خاں اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

اس اثناء میں موسم کی شدت کچھ کم ہونے لگی اور اندھیرا بھی چھٹنے لگا۔ مہاراجہ جیولاجی بھی ایک مقام پر تنہا کھڑا ہوا تھا۔اسکو کوئی خبر نہ تھی کہ رانی کا کیا حشر ہوا اور دوسرے لوگ کدھر گئے؟ بھیانک تاریکی میں کچھ نظر ہی نہ آتا تھا تو خبر کیا ہوتی لیکن اسکو رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا کہ اس نے شب عاشور شادی کر کے کچھ اچھا نہیں کیا۔

سندھیا مرہٹہ رسول اسلام کی اولاد کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ مرہٹوں کا قدیمی تعلق شیعوں سے رہا تھا۔جیولاجی سندھیا بھی جانتا تھا کہ سبط رسول کی شب شہادت کی عظمت کیا ہوتی ہے۔اس نے خیال ہی خیال میں سیدہ کونین کو مخاطب کر لیا۔

"بی بی مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی۔معاف کر دیں مجھے اور بچا لیں اس مصیبت سے میں آپ کے بیٹے کی عزاداری کروں گا!"

بارگاہ ایزدی میں اسکی دعا قبول ہو گئی اور موسم اعتدال پر آنے لگا۔اب جو راجہ نے دیکھا تو حسن خاں خون میں نہایا ہوا رانی کی پالکی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ عام حالات میں ہو سکتا تھا کہ مہاراجہ گوالیار بھاگ جانیوالوں کو سزائیں دیتا مگر وہ

کربلا کے شہید اعظم کیلئے سراپا عقیدت بنا ہوا تھا۔اسکے ذہن میں بس امام حسینؑ کا تصور تھا۔حسن خاں کو اس نے بڑی احسانمندی سے دیکھا اور گوالیار کا عازم ہو گیا۔

جشن شادی کا ماحول سوگواری میں بدل گیا۔گھنٹوں کے اندر ایک تعزیہ بنایا گیا اور محل کے اندر چوک پر رکھا گیا۔مہاراجہ نے جڑاؤ زیورات، کنٹھے، جوشن بازو کنگن سب اتار کر فقیروں کا سبز لباس پہن لیا اور تعزیے کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا پھر رانیوں نے چوک بھری۔ان میں وہ رانی بھی تھی جو ابھی عملی طور پر ازدواجی زندگی میں داخل نہیں ہوئی تھی اسکے بعد سے محل کا یہ حصہ مستقل عزاخانہ بن گیا۔

پہلا روز عاشور گزر کر دوسرا محرم آیا تو گوالیار شغل عزا میں گولکنڈہ اور لکھنؤ کو شرمانے لگا اور اسکے بعد محل کا امام باڑہ قاعدے کے ساتھ تعمیر کیا گیا۔اسکی پشت پر رانیوں، مہارانیوں اور معزز مرہٹہ خواتین کے بیٹھنے کی جگہ بنوائی گئی۔تعزیہ بنانے کا خاص اہتمام کیا گیا۔بانس اور ابرک کا تعزیہ مرہٹہ شان و شوکت کا آئینہ دار تھا۔اسکی آب و تاب سے آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو جاتی۔سائز متناسب مگر اتنا وزنی کہ تین سو کہار مل کر اٹھاتے۔سب سے آگے مہاراجہ سندھیا خود اسکو کاندھا دیتا۔

امام باڑے کی جگمگاہٹ تعزیے سے کم نہ تھی۔جھاڑ، فانوس، مانڈی، کنول اور شمعوں سے آراستہ چاروں طرف قدآدم آئینے آویزاں تھے۔تزئین و آرائش کا یہ انداز ہر روز بدل دیا جاتا۔تعزیہ جب امام باڑے میں رکھ دیا جاتا تو مہاراجہ دست بستہ اسکے آگے ایستادہ ہوتا۔زنانے حصے میں معزز خواتین رانیوں اور مہارانیوں سمیت سبز ساڑیوں میں ملبوس، پیشانیوں پر عود کی راکھ ملے سر جھکائے غم حسین میں بیٹھی نظر آتیں۔

عورتوں کے امام باڑے میں داخل ہونے کا منظر بھی بڑا دردآمیز ہوتا۔ روتے اور بکھرے بالوں کے ساتھ وہ ایک طرف سے عزاخانے کے سامنے آتیں۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر تعزیے کے سامنے خم ہوتیں اور حدود امام بارگاہ شروع ہوتے ہی اسپر ماتھا ٹکا دیتیں، بلا اس کا لحاظ کیے ہوئے کہ اس جگہ لوگوں کے پاؤں پڑے ہوں گے۔فاتحہ ہوتا تو ایک پاؤں سے کھڑی رہتیں۔فاتحہ ختم ہو جاتا تو حسین حسین کہتی

ہوئی چوک کے قریب بیٹھ جاتیں۔

پھر گوالیار، لشکر اور مرار میں تین امام باڑے بن گئے جو مرہٹہ عمائدین کے تھے۔ان سب کی لگ بھگ ایسی ہی کیفیت تھی دس روز تک ہر گلی کوچے میں سبیلیں لنگر خانے جاری رہتے اور انکی اتنی کثرت ہوتی کہ لینے والے کم پڑجاتے۔

مجلسوں میں سوزخوانی، نوحے اور مرثیے پڑھے جاتے۔تقریر کرنے والے بھی باہر سے آتے۔مجلس شروع ہوتی تو مہاراجہ اور تمام مرہٹہ اس طرح دوزانو ادب سے بیٹھتے جیسے کسی بڑے شہنشاہ کے دربار کے ادنی فقیر ہوں۔اندر رانیوں اور دوسری عورتوں کا بھی یہی عالم ہوتا۔تحیر خیز بات تو یہ ہے کہ وہ مصائب کا بیان ہونے پر اس طرح روتے اور پچھاڑیں کھاتے کہ شیعوں کا تاثر ان کے سامنے قابل ذکر نہ رہتا۔

آہستہ آہستہ اکثر مرہٹہ سرداروں نے اپنے امام باڑے گھروں میں بنوالیے۔ وہ اسی طرح بارگاہ سیدالشہداء سے منتیں مانتے جس طرح شیعہ اور دوسرے مسلمان مانتے ہیں۔

ایام محرم میں ریاست کا تمام کاروبار عموماً بند رہتا۔عام لوگ بھی محرم کی مصروفیات، علم اور تعزیوں کے جلوسوں میں جو گہما گہمی ہوتی ہے اسکے سبب عشرے کے آخر دنوں میں کام نہیں کرتے۔

عزاداری کی خصوصیات میں تعزیے کے جلوسوں کو ایک امتیاز حاصل تھا۔ مرہٹے اور مسلمان سب حسینی سپاہی معلوم ہوتے۔جلوس میں لکڑی کی تلواروں سے مظاہرہ حرب و ضرب کیا جاتا۔شیعہ یوں بھی گوالیار میں بہت ہی کم ہیں۔وہ ان مظاہروں میں شرکت نہ کرتے۔

آٹھ محرم کو سرکاری علم اٹھتے جو شہر کا گشت کرتے تھے۔ان میں فوجی دستے، ماہی مراتب، ہاتھی، بیل، گھوڑے، توپ خانہ پورے شاہی خدم و حشم کے ساتھ شامل ہوتے۔ سازوسامان کی شوکت دیکھ کر محسوس ہوتا کہ جیسے کسی شہنشاہ عصر یا فاتح عالم کی سواری نکل رہی ہو۔

شب عاشور مہاراجہ کے تعزیے کے ساتھ عوام کے تعزیے مل کر شان جلوس کو دوبالا کردیتے۔مہاراجہ اپنے تعزیے کو کاندھا دے کر جلوس کی قیادت کرتا، ننگے

پاؤں ننگے سر، سر سے پاتک سبزپوش، گرد و غبار میں اٹا ہوا حسین حسین کہتا بڑھتا۔ قلعہ کے پھاٹک تک تعزیے کو پہنچاکر واپس ہوتا تو عقبی راستے سے دہل پر پہنچ جاتا جہاں رانیاں قبل سے پہنچ جاتی تھیں اور تعزیہ کا انتظار کرتی رہتیں۔

قلعہ کی پشت پر نواب معتمد خاں لک بخش کا پکا تالاب واقع تھا جسے ساگر تال کہتے ہیں۔اسکے جنوب میں ایک بہت بڑی دہل کھود کر تیار رکھی جاتی جسکے ایک طرف زنانہ بارگاہ ہے جس میں غم حسین میں اشکبار رانیاں فرد کش ہوتی تھیں

تعزیہ دہل کے قریب رکھوادیا جاتا تو زنانے حصے میں سوز کی قسم کے بین کیے جاتے اور جب سرکاری تعزیہ کرینوں کے ذریعہ دہل میں اتر جاتا تو ایک طشت میں اندر سے مٹی آتی مہاراجہ آنسو بہاتا ہوا دونوں ہاتھوں سے مٹی ڈالتا پھر رانیاں اندر سے برآمد ہوتیں، طشت کی باقی مٹی وہ اپنے ہاتھوں سے دیتیں اور ایک درد بھری کیفیت میں اس طرح اٹھ کھڑی ہوتیں جیسے اپنے کسی پیارے کو دفنا کر اٹھی ہوں۔

اسکے بعد توپوں کی سلامی دی جاتی جو تعزیہ دفن ہوجانے کا اعلان ہوتا۔

شہنشاہانہ تدفین کے یہ لوازمات سلاطین شرقیہ نے جونپور میں شروع کیے تھے جو دکن میں قلی قطب شاہ کے ہاتھوں نکھارے گئے پھر اودھ میں ان پر خلوص و عقیدت کے پھول چڑھائے گئے۔رامپور و محمودآباد میں اب بھی انکی جھلک پائی جاتی ہے لیکن ان مقامات پر جو بھی مظاہرے کیے گئے وہ تعجب خیز نہیں، حیرت تو ہے مہاراجہ گوالیار پر جو اسلام کو نہیں مانتا تھا لیکن پیغمبر اسلام کے نواسے کیلئے اتنی عقیدت رکھتا تھا کہ سیدہ کونین اسکو مشرف بہ اسلام ہوجانے کی دعا ضرور دیتی ہونگی

امام حسینؑ کیلئے اہل ہنود کی طرف سے یہ نذرانہ عقیدت عوامی سطح پر ہر جگہ پایا جاتا رہا ہے۔مشرقی پاکستان کے جنگی قیدی جب ہندوستان کے قلعہ گوالیار میں لے جاکر رکھے گئے تو ایام محرم میں ایک سکھ صوبدار نے بیان کیا۔

"میرے بچے پیدا ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد مرجایا کرتے تھے۔اس طرح تین بچے ضائع ہوگئے۔جن دنوں میں الہ آباد میں تھا تو میری پتنی (سردارنی) نے میرے پڑوسی شاہ صاحب کی بیوی سے ذکر کیا۔وہ اسکو محرم کی نو تاریخ کو الہ آباد کے

ایک تعزیہ خانے میں لے گئی ۔ وہاں میری پتنی تعزیے کے سامنے رات بھر لوبان
سلگاتی رہی اور سویرے پرشاد وغیرہ چڑھا کر چلی آئی ۔ واہگرو کی کرپا سے میرے بیٹا
پیدا ہوا اور بالکل ٹھیک ٹھاک رہا ۔ اس سے میرا لڑکا (رندھیر) ملٹری اسکول جالندھر
میں پڑھتا ہے ۔ میری پتنی ہر سال محرم کی نو تاریخ کو کسی قریبی تعزیے خانے میں
جاکر رات بھر تعزیے کے سامنے کھڑی رہتی ہے لوبان سلگاتی ہے پرشاد چڑھاتی ہے
دو چار کھٹیاں بتاشے وہاں سے لے کر آتی ہے اور رکھے رہتی ہے ۔ رندھیر جب چھٹی پر
گھر آتا ہے تو اسکو کھلا کر پرارتھنا کرتی ہے ۔ امام صاحب! یہ بچہ آپکی کرپا سے جیا ہے ۔
اسکو آپکی کرپا کی سدا ضرورت ہے" ۔(۱۱۷)

اس طرح کے واقعات گوالیار کے اکثر گھروں میں بیان کیے جاتے ہیں ۔
مرہٹہ عورتیں کہتی ہیں کہ میرا فلاں بچہ امام صاحب کی دین ہے فلاں بچے کیلئے میں
نے منت مانی تھی، وہ پیدا ہوا تو ہر سال اسکو لے جاکر تعزیے کے سامنے دعا کرتی
ہوں ۔ کرامات و معجزات کی اس فضا میں ہندوؤں میں تعزیہ داری کا فروغ ہوا ۔ فی
زمانہ اس میں کچھ کمی آگئی ہے لیکن امام حسینؑ کی معجز نمائی سے آج بھی کسی کو انکار
نہیں ۔

خلاصہ کلام۔

مہاراجہ گولیار کی عقیدت ہندوستان میں ضرب المثل ہے لیکن اس سے
قبل دکن اور اودھ میں بہت سے ایسے امراء گزرے ہیں جنہوں نے شغف عزاء میں
مسلمانوں کو پیچھے چھوڑ دیا ۔ بالخصوص لکھنو میں تو درجنوں نام لیے جاسکتے ہیں جیسے
مہاراجہ ٹکیت رائے ، راجہ جھاؤلال اور دوسرے لوگ ۔ ان کے خلوص کی دلیل یہ
ہے کہ انتزاع سلطنت اودھ کے بعد بھی انکی اولاد میں تعزیہ داری مدتوں تک جاری
رہی اور مالیات کی کمزوری کے ساتھ انحطاط پذیر ہوئی ۔

ہمارے عقیدے میں یہ دعائے جناب سیدہ زہرا ہے کہ انکے لال کا ماتم دنیا
کے گوشے گوشے میں کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ اس میں تعلیمات آئمہ برحق اور مساعی
علمائے عظام کو بھی دخل ہے اور ان شیعہ حکومتوں کے جذبہ ایمان کو بھی جنہوں
نے وقت کے دھاروں کا رخ بدل کر عزاداری کی اشاعت کی اور شیعیت کو فروغ دیا

صوفیائے کرام کی ریاضت مسلسل بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی جنکی خانقاہوں
سے آجتک علیؑ کی افضلیت کے نعرے لگائے جاتے ہیں ۔

مقابر سادات کی اعجاز نمائی بھی ایک اساسی حیثیت رکھتی ہے جس نے
فلسفیانہ اور منطقی ذہنوں کی ہر دلیل کا بطلان کردیا ۔ معجزے بلاشبہ روز نہیں
ہوتے اور نہ اشاعت اسلام بھی اس طریقہ کی رہین منت رہی ہے لیکن ہندوستان
کے جلوس تعزیہ میں حسینؑ کی عظمت کا کمال اور عباسؑ علمدار کا جلال اکثر دیکھنے میں
آیا ہے اور روضہ ہائے مقدس جہاں جہاں نہیں ہیں وہاں نقول روضہ اپنے منصب
کو ادا کرتی رہی ہیں ۔ ہماری مجلسیں اور جلوس پیغام حسینؑ کو ایک سرے سے
دوسرے تک پہنچا رہے ہیں اور ہماری صداقت کا ثبوت بن کر دلوں اور ذہنوں کو
منقلب کر رہے ہیں ۔ اسی میں ہماری بقاء ہے ۔

اپنی بقا کا راز یہ ماتم ہے دوستو!
آواز بازگشت شہیداں کہیں جسے

کتب محولہ

۱- مسند احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۲۹۲ مطبعہ مصر ۱۳۱۳ھ (عربی)

۲- ماخوذ از اصل و اصول شیعہ مترجمہ علامہ ابن حسن نجفی مطبوعہ ادارہ تمدن اسلام کراچی ۱۹۸۲ء

۳- اسپرٹ آف اسلام (اردو ترجمہ از جسٹس امیر علی ص ۵۹۹ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۲ء

۴- ہسٹری آف سیراسنز (اردو ترجمہ) از جسٹس امیر علی ص ۸۵ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء

۵ اسپرٹ آف اسلام (اردو ترجمہ) از جسٹس امیر علی ص ۶۳۸ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۲ء

۶- نہج البلاغہ ص ۱۷۰ مطبوعہ شیعہ جنرل بک ایجنسی لاہور ۱۹۷۶ء

۷- اسپرٹ آف اسلام (اردو ترجمہ) ص ۲۹۰ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۲ء

۸- اسپرٹ آف اسلام (اردو ترجمہ) ص ۲۹۸ مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۷۲ء

۹- صحیح مسلم جلد ۳ ص ۱۴۲، ص ۱۴۳ مطبع المصطفی البابی الحلبی مصر ۱۳۴۹ھ (عربی)

۱۰- عقد الفرید جلد ۲ ص ۱۳۳ مطبعۃ الجمالیہ مصر ۱۳۳۱ھ (عربی)

۱۱- تاریخ اسلام حصہ چہارم جلد دوم ص ۱۳ از شاہ معین الدین ندوی مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۵۲ء

۱۲، ۱۳- تاریخ اسلام حصہ دوم ص ۱۲، ص ۱۹۳ از شاہ معین الدین ندوی مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۵۲ء

۱۴- تاریخ العلامہ ابن خلدون مجلد الثالث القسم الثانی ص ۵۲۰ مطبوعہ دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۷ء (عربی)

۱۵- تاریخ العلامہ ابن خلدون مجلد الثالث القسم الثانی ص ۵۳۵ مطبوعہ دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۷ء

۱۶- تاریخ العلامہ ابن خلدون مجلد الثالث القسم الثانی ص ۵۳۴ مطبوعہ دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۷ء

۱۷ تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ سوم جلد اول ص ۳۱۸، ص ۳۲۳، ص ۲۷۸

۱۸- مطبوعہ المعارف اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۴۹ء

۱۹- تاریخ العلامہ ابن خلدون مجلد الثالث القسم الثالث ص ۴۱۸ مطبوعہ دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۷ء

۲۰- تاریخ العلامہ ابن خلدون مجلد الثالث القسم الرابع ص ۷۰۲ مطبوعہ دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۷ء

۲۱- تاریخ اسلام حصہ سوم جلد اول از شاہ معین الدین ندوی ص ۳۵۰ مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۴۹ء

۲۲- تاریخ العلامہ ابن خلدون مجلد الرابع القسم الثالث ص ۵۹۵ مطبوعہ دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۷

۲۳- تاریخ العلامہ ابن خلدون مجلد الرابع القسم الرابع ص ۷۱۵ مطبوعہ دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۷ء

۲۴- تاریخ ابن خلدون جلد پنجم (ترجمہ) ص ۸۷ مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۸۷ء

۲۵- تاریخ اسلام از ذاکر حسین ص ۸۷ مطبوعہ اقبال پرنٹنگ ورکس کلاں محل دہلی ۱۹۲۶ء

۲۶- تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ سوم ص ۴۱۸ مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۴۹ء

۲۷- تاریخ اسلام از ذاکر حسین ص ۹۰ مطبوعہ اقبال پرنٹنگ ورکس کلاں محل دہلی ۱۹۲۶ء

۲۸- تاریخ العلامہ ابن خلدون مجلد الرابع القسم الرابع ص ۹۲۷ مطبوعہ دار الکتاب اللبنانی بیروت ۱۹۵۷ء (عربی)

۲۹- الکامل (ابن اثیر) الجزء السابع ص ۷ مطبع منیزیہ قاہرہ مصر ۱۳۵۳ھ (عربی)

۳۰- تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ دوم ص ۱۲، ص ۱۳ مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۵۳ء

۳۱- تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ چہارم جلد دوم ص ۱۷ مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۵۳ء

۳۲- تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ چہارم جلد دوم ص ۳۰ مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۵۳ء

۳۳- تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ چہارم جلد دوم ص ۳۶ مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۵۳ء

۳۴- Shorter Islamic Shietes Encyclopedia P289, Beirut Libanon 1969

۳۵- Shorter Islamic Shietes Encyclopedia P290, Beirut Lifanan 1969

۳۶- تاریخ اسلام از شاہ معین الدین ندوی حصہ چہارم جلد دوم ص ۹۷ مطبوعہ المعارف پریس اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۵۳ء

۳۷- الکامل (ابن اثیر) الجزء التاسع ص ۸۳ مطبع منیزیہ قاہرہ مصر ۱۳۵۳ھ (عربی)

۳۸- تاریخ اسلام از ذاکر حسین ص ۱۸۰ مطبوعہ اقبال پرنٹنگ ورکس کلاں محل دہلی ۱۹۲۶ء

۳۹- ہسٹری آف سیراسنز (اردو ترجمہ) ص ۵۳۴ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۵ء

۴۰- ماخوذ از تاریخ اسلام از ذاکر حسین مطبوعہ اقبال پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۲۶ء
تاریخ ابن خلدون جلد پنجم و ششم مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۷۸ء
تاریخ فاطمیین مصر از ڈاکٹر زاہد علی مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی

۴۱- ماخوذ از تزک تیموری اردو ترجمہ از قاضی عبدالکریم، مطبع کریمی بمبئی
امیر تیمور از ہیرالڈ لیمب ترجمہ گلزار احمد مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۶ء
تاریخ فرشتہ (اردو) مطبوعہ نولکشور لکھنؤ
تاریخ اسلام از ذاکر حسین مطبوعہ اقبال پرنٹنگ ورکس کلاں محل دہلی ۱۹۲۶ء

۴۲- تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۵۴۰ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۹۳۳ء

۴۳- شیعان کشمیر از حکیم غلام صفدر ہمدانی ص ۴۵ مطبوعہ علی محمد اینڈ سنز سری نگر کشمیر ۱۹۷۰ء

۴۴- شیعان کشمیر از حکیم غلام صفدر ہمدانی ص ۱۹ مطبوعہ علی محمد اینڈ سنز سری نگر کشمیر ۱۹۷۰ء
۴۵- شیعان کشمیر از حکیم غلام صفدر ہمدانی ص ۹۵ مطبوعہ علی محمد اینڈ سنز سری نگر کشمیر ۱۹۷۰ء
۴۶- ماخوذ از تاریخ فرشتہ اردو حصہ دوم مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۹۳۳ء
شیعان کشمیر از حکیم غلام صفدر ہمدانی مطبوعہ علی محمد اینڈ سنز سری نگر کشمیر ۱۹۷۰ء
اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۸۴ء
۴۷- تاریخ سندھ از مولانا ابوظفر ندوی ص ۴۲ مطبع المعارف اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء
۴۸- تاریخ اسلام از ذاکر حسین دہلوی جلد ۳ ص ۲۲۴ مطبوعہ دہلی ۱۳۳۱ھ
۴۹- تاریخ فرشتہ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ (اردو ترجمہ) ص ۹۰ بحوالہ منتخب التواریخ و تاریخ ابن اثیر
Shia,s Islam in India Pub. By Harnam Publications
New Delhi 1988 P198
۵۰- کتاب المعارف ابن قتیبہ دینوری ص ۲۶، ص ۳۷ مطبع مصر (عربی)
۵۱- تاریخ سندھ از مولانا ابوظفر ندوی ص ۱۵۶ مطبوعہ المعارف اعظم گڑھ ۱۹۴۷
الکامل (ابن اثیر) الجزء الخامس ص ۳۰ مطبع منیریہ قاہرہ مصر ۱۳۵۷ھ (عربی)
۵۲- تاریخ سندھ از مولانا ابوظفر ندوی ص ۲۶۹ مطبع المعارف اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۴۷ء
۵۳- تاریخ سندھ از مولانا ابوظفر ندوی ص ۲۷۳ مطبع المعارف اعظم گڑھ ہندوستان ۱۹۴۷ء
تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۴ ص ۹۹ مطبوعہ مصر
۵۴-۵۶ ماخوذ از تحفۃ الکرام مترجم اختر رضوی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد سندھ ۱۹۵۹
تاریخ سندھ از اعجاز الحق قدوسی مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۴ء
۵۷ تحفۃ الکرام میر علی شیر قانع ترجمہ اختر رضوی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد ۱۹۵۹ء
تاریخ سندھ عہد کلہوڑا از غلام رسول مہر مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۸ء
تاریخ سندھ حصہ دوم از اعجاز الحق قدوسی مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۷۴ء
۵۸- تاریخ فرشتہ اردو ص ۹۲ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ
۵۹-۶۰ تاریخ فرشتہ اردو جلد اول ص ۹۰ سطر ۹ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ تزک تیموری اردو مطبوعہ کریمی پریس بمبئی
۶۱- تاریخ فرشتہ اردو مطبوعہ نولکشور لکھنؤ
جونپور نامہ از مرزا عباس علی بیگ ص ۱۲۹ اردو پبلشرز لکھنؤ ۱۹۷۸ء
۶۲- تاریخ فرشتہ اردو جلد اول ص ۳۳۷ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ
۶۳- ہندوستان پر مغلیہ حکومت ص ۳۰ از مفتی شوکت علی فہمی مطبوعہ دین دنیا پبلشنگ کمپنی دہلی
۶۴ و ۶۵- دربار اکبری از محمد حسین آزاد ص ۳۳۶ و ص ۷۵، مطبوعہ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور
۶۶ تا ۶۹ ہندوستان پر مغلیہ حکومت از مفتی شوکت علی فہمی ص [illegible]
مطبوعہ دین دنیا پبلشنگ کمپنی دہلی
۷۰- احیاء العلوم از امام محمد غزالی حصہ سوم ص [illegible] ص ۱۴۴ ترجمہ محمد احسن صدیقی
اشاعت اول ۱۹۷۸ء دار الاشاعت کراچی

۷۱- ماخوذ از شہزادی زیب النساء بحوالہ عشرہ کاملہ ص ۲۵ از مولوی محمد رضا بلگرامی مطبوعہ
اثنا عشری پریس ۱۳۱۰ھ، شہزادی زیب النساء از مولانا سید آغا مہدی مطبوعہ جمعیت خدام عزا کراچی
۷۲- دربار اکبری از مولانا محمد حسین آزاد ص ۳۲۷ مطبوعہ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور
۷۳- ہندوستان پر مغلیہ حکومت از مفتی شوکت علی فہمی ص ۲۷۶ مطبوعہ دین دنیا پبلشنگ کمپنی دہلی
۷۴ تا ۷۶- تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۴۳۸، ص ۴۷۴ و جلد دوم مطبوعہ نولکشور لکھنؤ
تاریخ جنوبی ہند از محمود بنگلوری مطبوعہ پبلشرز یونائیٹڈ لاہور ۱۹۴۷ء
۷۷ تا ۷۹ تاریخ فرشتہ اردو جلد اول ص ۳۷۷، جلد دوم ص ۱۹۰ و ص ۱۵۸ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ
۸۰- ماخوذ از تاریخ فرشتہ اردو جلد دوم مطبوعہ نولکشور لکھنؤ
ہندوستان پر مغلیہ حکومت از مفتی شوکت علی فہمی مطبوعہ دین دنیا پبلشنگ کمپنی دہلی
۸۱- ہندوستان پر مغلیہ حکومت از مفتی شوکت علی فہمی مطبوعہ دین دنیا پبلشنگ کمپنی دہلی
۸۲- ماخوذ از تاریخ جنوبی ہند از محمود بنگلوری مطبوعہ پبلشرز یونائیٹڈ لاہور ۱۹۴۷ء
۸۳- A Handbook For Travellers in India, Pakistan etc.
Pub. Welliams London 1975 Page 395
۸۴- اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۶۸ جلد ۲، جلد ۲۰، جلد ۱۲
۸۵- سیاسی تاریخ ہند جلد دوم ص ۵ تا ص ۱۱ مولفہ سرجان مالکم ترجمہ ابن حسن دار الطبع
عثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۹۳۳ء
۸۶- تاریخ لکھنؤ حصہ اول ص ۴۴ از محمد باقر شمس مطبوعہ دار التصنیف رضویہ سوسائٹی کراچی
۸۷- تاریخ لکھنؤ ص ۸۲ از محمد باقر شمس مطبوعہ دار التصنیف رضویہ سوسائٹی کراچی
۸۸- تاریخ لکھنؤ از محمد باقر شمس ص ۱۱۸ مطبوعہ دار التصنیف رضویہ سوسائٹی کراچی
۸۹- اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۶۸ء
۹۰- سلاطین ترکیہ از اسٹینلے لین پول ترجمہ نصیب اختر مطبوعہ سعید کمپنی کراچی ۱۹۷۰ء
۹۱- تاریخ الشیعہ از سید طالب حسین رضوی مطبوعہ نیو چالی کراچی ص ۱۵۵
۹۲- ماخوذ از تاریخ نجد و حجاز از مفتی محمد عبد القیوم قادری مطبوعہ ۳۲۵ ییتا محل جامع مسجد دہلی ۱۴۰۸ھ
تاریخ اسلام از ذاکر حسین دہلوی مطبوعہ اقبال پرنٹنگ ورکس کلاں محل دہلی ۱۹۲۶ء
مضمون روضہ حسینی کا انہدام از مولانا سید محمد باقر مشمولہ ماہنامہ اصلاح لکھنؤ ۱۹۹۱ء، ص ۴۹
۹۳- اخبار الاخیار از علامہ عبد الحق محدث دہلوی ص ۲۵ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی
۹۴- مطلع انوار از مرتضیٰ حسین فاضل ص ۳۲۸ مطبوعہ خراسان اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی ۱۹۸۱ء
۹۵- تاریخ تدوین حدیث مطبوعہ پاکستان حسینی مشن راولپنڈی ۱۹۵۷ء، صفحہ ۲۰
۹۶- تدوین حدیث از علامہ سید علی نقی مطبوعہ امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ لاہور، صفحہ ۲۳
۹۷- تاریخ تدوین حدیث از سید مرتضیٰ حسین فاضل مطبوعہ پاکستان حسینی مشن راولپنڈی ۱۹۵۷ء، صفحہ ۸۴

۹۸۔ ماخوذ از تدوین حدیث از علامہ سید علی نقی و تاریخ تدوین حدیث از سید مرتضیٰ حسین فاضل
۹۹۔ تدوین حدیث از سید علی نقی مطبوعہ امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ لاہور، ص ۲۱، ۲۲
۱۰۰۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۷۳ء ص ۳۷۵
۱۰۱۔ اصل و اصول شیعہ ترجمہ علامہ ابن حسن نجفی مطبوعہ ادارہ تمدن اسلام ۱۹۸۶ء ص ۵۵ تا ص ۶۶
۱۰۲۔ ماخوذ از اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور
۱۰۳۔ تاریخ کربلائے معلیٰ از ڈاکٹر عبدالجواد الکلیدار ترجمہ محمد باقر النقوی ۶۳ مطبوعہ اصلاح کھجوہ بہار ۱۹۷۴ء بحوالہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔
۱۰۴۔ تاریخ کربلائے معلیٰ از ڈاکٹر عبدالجواد الکلیدار ترجمہ محمد باقر النقوی ص ۷۱ مطبوعہ اصلاح کھجوہ بہار ۱۹۷۴ء
۱۰۵۔ تاریخ کربلائے معلیٰ از ڈاکٹر عبدالجواد الکلیدار ترجمہ محمد باقر النقوی ص ۱۱۰ مطبوعہ اصلاح کھجوہ بہار ۱۹۷۴ء بحوالہ تحفۃ العالم
۱۰۶۔ تاریخ کربلائے معلیٰ از ڈاکٹر عبدالجواد الکلیدار ترجمہ محمد باقر النقوی ص ۱۱۲ مطبوعہ کھجوہ بہار ۱۹۷۴ء بحوالہ تاریخ عراق لونگریک
۱۰۷۔ تاریخ کربلائے معلیٰ از ڈاکٹر عبدالجواد الکلیدار ترجمہ محمد باقر النقوی ص ۱۰۵ مطبوعہ کھجوہ بہار ۱۹۷۴ء
۱۰۸۔ ماخوذ از زیارت گاہیں مرتبہ اختر حسین رضوی مطبوعہ احباب پبلشرز لکھنؤ۔
۱۰۹۔ ماخوذ از اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور۔
۱۱۰۔ ماخوذ از کتابچہ عبدالعظیم حسنی مطبوعہ ایران (فارسی)
۱۱۱۔ بیبیاں پاک دامناں ص ۳ از پروفیسر ڈاکٹر مسعود رضا خاکی مطبوعہ افتخار بک ڈپو اسلام پورہ لاہور
۱۱۲۔ بیبیاں پاک دامناں ص ۱۲ از پروفیسر ڈاکٹر مسعود رضا خاکی مطبوعہ افتخار بک ڈپو اسلام پورہ لاہور
۱۱۳۔ ماخوذ از حسین حسین مولفہ محمد وصی خاں ص ۱۱۸ مضمون سرزمین ہند میں معجزات مطبوعہ محفل حیدری کراچی ۱۹۷۹ء
۱۱۴۔ تاریخ تمدن انڈونیشیا از نور احمد قادری حصہ اول ص ۲۷۶ مطبوعہ سفارت خانہ انڈونیشیا کراچی ۱۹۵۶ء
۱۱۵، ۱۱۶۔ مضمون قدیم دلی کی عزاداری از علی جواد زیدی مشمولہ شیعہ لکھنؤ ۱۹۸۶ء، ص ۱۱ تا ص ۱۲
۱۱۷۔ مضمون " پاکستانی جنگی قیدی اور ذکر حسین " از شمشاد حسین رضوی مشمولہ رضا کار لاہور ص ۱۶
"حسین حسین" مرتبہ محمد وصی خاں محفل حیدری کراچی ۱۹۷۹ء، مضمون گوالیار کا محرم ص ۱۴۴ تا ص ۱۶۷